March 1992

Rs. 6/-

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

ماہنامہ شگوفہ

جلد ۲۵ ٭ شمارہ ۳ ٭ مارچ ۱۹۹۲ء

سرورق : طالب خوندمیری
کتابت : محمد غالب، محمود سلیم، فضل محمد

طباعت : دائرہ پرنٹنگ پریس
چھتہ بازار۔ حیدرآباد۔

فی پرچہ : ۶ روپے
سالانہ خریداری : ۶۵ روپے
عرب ممالک : ۲۰ ڈالر

خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتہ :
۲۱۔ بیچلرز کوارٹرز معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد
فون آفس : 557716 قیامگاہ : 521064



RANCHHODDAS & SONS
INDIA
PURANDAS
کشمیری قوام

اس تھیلی کے چٹے بٹے

(فہرست)

باونویں

کل ہند صنعتی نمائش

حیدرآباد

یکم جنوری تا ۱۵ فروری ۱۹۹۲ء

ہندوستان کی سب سے بڑی ہمہ مقصدی نمائش ہر سال پہلی جنوری سے ۱۵ فروری تک منعقد کی جاتی ہے۔ ان چھیالیس دنوں میں قریب چھبیس لاکھ افراد نمائش دیکھتے ہیں اور ۱۵ کروڑ روپیوں سے زیادہ کا کاروبار ہوتا ہے۔ اس نمائش سے حاصل ہونے والی آمدنی عثمانیہ گریجویٹ اسوسی ایشن، نمائش سوسائٹی اور معاشی کمیٹی کی جانب سے قائم کردہ مندرجہ ذیل اداروں پر صرف کی جاتی ہے۔

۱- کملا نہرو پالی ٹکنک فار ویمن - اگزبیشن گراؤنڈ
۲- سروجنی نائیڈو ونیتا مہاودیالیہ - اگزبیشن گراؤنڈ
۳- سردار پٹیل کالج سکندرآباد
۴- لال بہادر کالج ورنگل
۵- کستوربا گاندھی کالج فار ویمن سکندرآباد
۶- سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف کامرس حیدرآباد
۷- سری وینکٹیشورا کالج سوریہ پیٹ
۸- سری لکشمی نرسمہا سوامی کالج بھونگیر
۹- وسویشوریا انڈسٹریل ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ سکندرآباد
۱۰- انڈسٹریل ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ نرمل
۱۱- شنکرجی میموریل اسکول اگزبیشن گراؤنڈ

کرشنا جی یادو
معتمد اعزازی

یوسف ناظم

سیماب صفت ماہرِ لغت یعقوب میراں مجتہدی

میں جب بھی حیدرآباد جاتا ہوں، ایک نہ ایک فائدہ ضرور ہو جاتا ہے۔ اس مرتبہ پچھلے دسمبر میں بالکل ناگہانی طور پر ایک ایسے ذخیرۂ الفاظ سے ملاقات ہو گئی جس کا نام ہی انوکھا اور دلچسپ تھا۔ یعنی یعقوب میراں مجتہدی۔ ۱۴ یا ۱۵ / دسمبر ۱۹۹۱ء باغ عام کے جوبلی ہال میں انڈو عرب سوسائٹی کی ایک کانفرنس ہو رہی تھی۔ صدر دروازے پر بیانر لگے ہوئے تھے۔ مجھے کوئی خاص کام نہیں تھا۔ اُدھر سے گزرتے ہوئے ہال میں چلا گیا (کانفرنس ہال میں لوگ بھولے بھٹکے ہی جاتے ہیں۔ جان بوجھ کر تو لوگ کشتی دیکھنے جاتے ہیں) سامعین کی تعداد گو کم تھی۔ لیکن ماحول بہت تعلیم یافتہ اور دانشورانہ تھا۔ تھوڑی دیر بعد مجھے محسوس ہوا کہ میرے جسم میں کسی کی آنکھیں چبھ رہی ہیں۔ دیکھا تو ایک صاحب پورے سوٹ میں ملبوس شکل و صورت سے مانوس مجھے یوں گھور رہے تھے گویا میں باغ عامہ کے بند اور مقفل پنجروں سے بھاگی ہوئی کوئی مخلوق ہوں۔ موصوف کے کان اگرچہ مقرر کی سمت میں تھے لیکن آنکھوں کا مرکز میں تھا۔ آنکھیں ملیں تو ایسا معلوم ہوا موصوف مسکرانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ نہ مسکرانے والے لوگ جب مسکرانے کی کوشش کرتے ہیں تو دوسروں کو تشویش میں اور خود کو تکلیف میں مبتلا کرتے ہیں۔ ہم ہندوستانیوں نے ایک کام یہ اچھا کیا کہ انگریزوں کے اس "ایٹی کیٹ" کو نہیں اپنایا جس کی رو سے دو افراد تعارف کے بغیر لڑ تو سکتے ہیں مل نہیں سکتے۔ تھوڑی دیر میں وہ اور میں ہم کلام ہو گئے (اس سے پہلے ہم سلام ہو چکے تھے) پھر بغل گیر ہونے کا سلسلہ شروع ہوا جو دو منٹ تک جاری رہا۔ موسم خاصا سرد تھا اسلئے گرم جوشی سے کام لیا گیا معلوم ہوا موصوف یعقوب میراں مجتہدی ہیں اور مجھے یہ تو یاد آیا کہ یہ میرے کہنہ شناسا ہیں لیکن یہ یاد نہیں آیا کہ ملاقات کا پہلا حادثہ کب ہوا تھا۔ بہرحال یادداشت نے بتایا کہ موصوف مرحوم جامعہ عثمانیہ کے اس وقت کے گریجویٹ ہیں جب "ٹمیلی شیروانیوں" کو عزت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ یعقوب میراں مجتہدی نے دوسرے دن بتا بھی دیا کہ وہ آج بھی اسی شان کی شیروانی اور نہایت شریفانہ انداز میں پہنتے ہیں اور بٹن اور بک پابندی سے لگاتے ہیں (یہ نہیں کہ شیروانی کے دروازے آج کل کے برقعوں کے نقاب کی طرح چہرے پر کھلے ہوں اور کسی کو کسی شکایت کا موقعہ نہ ہو)

یعقوب میراں مجتہدی نے فارغ التحصیل ہونے کے غالباً فوری بعد دفتر نظامت ترجمہ ...

بلکہ بے حد خشک سرکاری زندگی کا آغاز کیا (عملی زندگی اور سرکاری زندگی میں تھوڑا فرق ہوتا ہے) اور حیدرآباد کی مجلس مقننہ میں مترجم کی حیثیت سے اپنے تکلیف دہ کام کی داغ بیل ڈالی۔ قوانین کا ترجمہ کرنا ان کا ذریعہ معاش اور طریقۂ بود و باش تھا۔ دنیا کی پیچیدہ چیزوں میں قانونی زبان سب سے زیادہ پیچیدہ مانی گئی ہے۔ قانونی زبان کا سمجھ سے (بہت) بالاتر یعنی بالاترین ہونا ضروری مانا جاتا ہے اور جب اس زبان کی عام فہم زبان میں توضیح کی جاتی ہے تو اس میں مزید مشکلات پیدا ہو جاتی ہیں۔ (انگلستان میں کسی کے لئے ۱۲، ۱۵ غیر قانون داں افراد پر مشتمل ایک جیوری کا تقرر کیا جاتا ہے تاکہ یہ جیوری جج صاحب کو اور زیادہ گمراہ کر سکے)

یعقوب میراں مجتہدی قوانین کی ترجمہ کشی میں بخوشی نہیں بہ خوشی مشغول ہو گئے۔ ان کا دل اس کام میں کچھ ایسا لگا کہ انھیں یاد ہی نہیں رہا کہ دنیا میں اس کے علاوہ بھی کچھ کام ہیں جن کی معقول تنخواہ ملتی ہے اور آرام بھی ملتا ہے۔ یعقوب میراں مجتہدی اپنے جوشِ اجتہاد میں گریۂ یعقوب کو دبائے اسی راہ پُرخار پر برہنہ پا چل پڑے (برہنہ سر اس لئے نہیں کہ اس زمانے میں لوگوں کے سروں سے ٹوپی نہیں اتری تھی۔ ٹوپی اچھالنے کا کام بھی بعد میں شروع ہوا) ان کے غیر شاعرانہ مزاج کو راہ کے یہ چھوٹے چھوٹے کانٹے بھی نہیں بھائے۔ ان کے پاؤں کے آبلوں کی طلب کچھ اور تھی۔ یعنی کانٹے بھی ہرے مسالے کے ہوں۔ ان کے سر میں ایک ایسا سودا سمایا کہ بھنک بھی کسی کے کان میں پڑتی تو اس کی نیند اچاٹ ہو جاتی۔ فرہاد نے شوقِ شیرینی میں جوئے شیر کا ذمہ اپنے سر لیا تھا۔ یعقوب میراں مجتہدی نے جوئے خون کا بیڑا اٹھایا اور اپنا خون اس میں بصد شوق استعمال فرمایا۔

میں شاید قانونی زبان لکھ گیا۔ اصل میں یعقوب میراں مجتہدی کو جب اپنے مفوضہ فرائض کی انجام دہی کے دوران کسی انگریزی لفظ کی معقول اور مناسب اردو لفظ کے حصول اور دستیابی میں دقت ہوئی اور راستہ بند نظر آیا تو انھوں نے ایک لغات مرتب کرنے کا عزم کیا اور عزم پر جزم بھی لگا دیا۔ انھوں نے باوجود اس کے کہ ان کا تن و توش اس قابل نہیں تھا کہ ذہنی سامان کا بار اٹھا سکے، موٹے موٹے لغات اٹھائے۔ ان کی ورق گردانی کی اور انھیں تقریباً حفظ کر لیا اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کیا کہ دوسروں کے دسترخوان سے شکم پری کرنے کی بجائے بہتر ہے کہ خود ایک ایسا دسترخوان چنا جائے جس پر ہر طرح اور ہر قسم کا ساز و سامان نسخۂ ترکیب استعمال کے ساتھ موجود ہو۔

قدرت کے قانون کے مطابق ہر شخص جیسے جیسے کیلنڈر بدلتے جاتے ہیں اور سنین گذرتے جاتے ہیں۔ حدودِ ضعیفی میں داخل ہونے لگتا ہے۔ لیکن یعقوب میراں مجتہدی پر اس قانون کا اطلاق نہیں ہوا۔ شاید انھوں نے اپنی زبان دانی کی بنا پر اس میں کوئی قانونی پیچیدگی پیدا کر دی اور کتنے ہی کیلنڈر ان کے در و دیوار کی دھول کھا چکے، خستہ و ناتواں ہو کے پارہ پارہ ہو چکے لیکن موصوف پیسا (Pisa) کے مینارِ خمیدہ Leaning Tower کی طرح جھکے بھی نہیں بلکہ لندن کے بگ بین کی طرح پورے قد کے ساتھ ایستادہ ہیں اور یہ بتاتے رہتے ہیں کہ وقت کو اپنی گرفت میں رکھنے کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ وقت آدمی کا ساتھ دیتا ہے اس پر اثر انداز نہیں ہوتا۔ انھوں نے اپنی لغت کی تیاری میں ۲۵ سال صرف کئے ہیں۔ ۱۹۶۷ء میں انھوں نے اردو انگریزی ڈکشنری کی ترتیب و تدوین کا (بلکہ میں اسے تخلیق بھی کہوں گا) کام شروع کیا۔ تن تنہا۔ وہ اسی کام کے واحد متکلم تھے۔ خود ہی اسم، خود ہی ضمیر اور خود ہی فعل ——— کسی بھی میدان میں اولین کام کی اہمیت ہوتی ہے۔ لیکن مکان کی تعمیر اور مکان کی آرائش میں جو فرق ہے وہی موجودہ مروجہ لغات اور یعقوب میراں مجتہدی کی "شارٹلی کنگ" لغت میں ہوگا۔ لغت اس پر نمایاں الفاظ میں لکھا ہوگا کہ یعقوب میراں مجتہدی نے یہ صلیب تنہا اٹھائی ہے اور یہ صلیب لکڑی کی نہیں لوہے اور فولاد کی تھی۔ [illegible] ادب میں بھی یہی صورت [illegible] یعقوب میراں مجتہدی کی [illegible] ہیں۔ ان کی زیر ترتیب لغت میں الفاظ کی تعداد کسی [illegible] کے برابر ہوگی۔ اور

میں بھی اگر کسی کونے نے مجتہد ہوتا تو ان کی لغت کو لغت نہیں مملکتِ الفاظ یا سلطنتِ الفاظ متحدہ کہتا۔ متحدہ اس لئے کہ میں اس میں اردو اور انگریزی کے الفاظ ہوں گے جو اپنے اپنے رسم الخط کے علاوہ رومن اردو میں بھی ہوں گے (مزا آئے گا) لغات کے صفحات تین ہزار ہوں گے۔ جیبی سائز کے الفاظ نہیں بلکہ فل اسکیپ سائز کے (ممکن ہے اس لغت میں فل اسکیپ کا بھی ترجمہ شامل ہو)۔ میراں صاحب نے (یہ نام محمد تقی میر کا بہاڑا نہیں ہے) اپنی لغت میں ہر ضرورت مند کا خیال رکھا ہے۔ اردو کے جتنے بھی محاورے، ضرب الامثال، روزمرے جن میں متروک ممنوع اور مروج سب شامل ہیں، انگریزی پوشاک میں بھی موجود ہیں یعنی اپنی شیروانی پر انہوں نے ترکی ٹوپی نہیں، انگریزی ہیٹ استعمال کر کے ہمیں بتایا ہے کہ شجر سایہ دار اس نمونے کا بھی ہوتا ہے۔ میراں صاحب نے جب اس بحرِ زخار میں غوطہ لگایا تھا اس وقت وہ لغت نویسی کی ابجد اور اس کے نکات و رموز اور آداب سے قطعی ناواقف تھے۔ یہ سب کچھ انھوں نے ڈوب کر سیکھا۔ انھیں دیکھ کر پتہ چلا کہ ڈوب کر کام کرنے کے محاورے کے معنے کیا ہوتے ہیں) ادھر ڈوبے ادھر نکلے یہ میراں جی اقبالی تصویر ہیں میراں صاحب ہر لفظ کے معنے تلاش کرنے کے لئے جیبی ڈکشنریاں نہیں کھنگال لیتے اُن کی بھوک نہیں مٹتی۔ لوگ کتاب کے کیڑے ہوتے ہیں۔ یہ لغت کے کیڑے ہیں (کتاب اور کتب میں تھوڑا فرق ہوتا ہے۔ لفظ کتاب کی جمع کیجئے تو مختصر ہو کر کتب ہو جاتا ہے جبکہ لُغت کی جمع لغات ہوتی ہے لیکن یہ واحد بھی ہو سکتی ہے) ان کی لغات کی رفتار یہ ہے کہ اب تک غالباً ۱۲ ہزار صفحے ٹائپ ہو چکے ہیں اپنی لغات میں وہ ہر لفظ کی زنانہ و مردانہ نوعیت ظاہر کرنے کے علاوہ اس لفظ کے کوئی سو ڈیڑھ سو مترادفات قلمبند کر کے قاری کی رخصت کا اہتمام کرتے ہیں شروع شروع میں تو ان کی بیگم نے انھیں اس کام سے منع کیا اور جب نہیں مانے تو بحالت مجبوری اُن کی پیٹھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔ کیونکہ میراں صاحب نے انھیں وہ مقولہ سنایا تھا کہ ہر مرد کی کامیابی کے پیچھے ایک زنانہ ہاتھ ہوتا ہے۔ مرحومہ جب تک زندہ رہیں۔ اسی مقولہ پر عمل کرتی رہیں (کاش وہ صبر کا پھل بھی چکھ سکتیں) میراں صاحب نے آلام و اندوہ کے سائے میں اپنے کام کو پورا کیا۔ وہ رستم ہند تو نہیں بنے لیکن رستم لغات بہر حال بن گئے۔ اُن سے اس ملاقات میں معلوم ہوا کہ انھوں نے بی اے کرنے میں کافی تکلف سے کام لیا اور باوجود اس کے کہ وہ ۱۹۲۳ء میں منصۂ شہود پر جلوہ گر ہو گئے بی اے کی ڈگری انھوں نے ۱۹۵۴ء میں حاصل کی (یہ بھی کوئی بی اے کرنا ہوا) انھوں نے غلطی سے بی ایس سی کا رخ کر لیا تھا۔ بعد میں پچھتائے لیکن اس فاش غلطی کی وجہ سے ان کے علم و فضل میں اضافہ ہی ہوا۔ جد و جہد اور محنت شاقہ کے معانی و مطالب سے بھی آگاہ ہوئے اور اب وہ اپنے کام سے اسلئے مسرور و مطمئن ہیں کہ انھیں اپنی لغت کے لئے ایک باوقار پبلیشر کی اعانت حاصل ہو گئی ہے۔ یہ لغت اورینٹ لانگ مین کے زیر اہتمام شائع ہو گی۔ (لانگ لیو میراں جی)

میراں جی کو اپنے شغل سے وہی شغف ہے جو مولوی عبدالحق کو تھا۔ مولوی عبدالحق کام کرنا کام لینا جانتے تھے میراں کام کرنا جانتے ہیں۔ مولوی عبدالحق کے کام ہمہ جہتی تھے یعقوب میراں مجتہدی نے یک جہتی کو مد نظر رکھا۔ یہ میرے تقریباً ہم عمر ہیں لیکن خصوصیات میں کئی شعبے آگے ہیں۔ انھیں کو تاؤ تو نہیں دے سکتا لیکن یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ یہ بجائے خود ترقی اردو بیورو ہیں۔ القاب و انعام سے بے پرواہ۔ (تنخواہ کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا)

میں انھیں دنیا کے لغات کا امیر خسرو بھی کہہ سکتا ہوں۔ امیر خسرو انعام و اکرام سے ہمیشہ محروم رہے ہیں۔ اور ایک نوبت تو یہ آئی کہ وہ اس سے بے نیاز ہو گئے (اسے فضل خداوندی کہا جاتا ہے)

یعقوب میراں مجتہدی رہنے والے ہیں حیدرآباد کے مشہور و معروف محلے چنچل گوڑہ کے اسی لئے وہ لستے چنچل اور مضطرب رہتے ہیں۔ سیماب صفت ماہر لغت۔

میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ نام ان کا دلچسپ ہے اور میں چاہوں گا کہ وہ اپنے نام کا ترجمہ بھی اس نادر اور معرکتہ الآرا لغت میں ضرور شریک کریں۔ نام کے پہلے اور آخری جز کے ترجمے کی حد تک میری اعانت حاضر ہے۔ درمیانی لفظ کا ترجمہ خود انھیں کرنا ہوگا۔

••

یہ ہے بانجے میری جان

پرویز یداللہ مہدی

"بارے رمضان کا کچھ بیاں ہو جائے"

جس طرح رمضان کی عید کے تعلق سے عوام الناس کے ایک بڑے طبقے کا قول ہے کہ عید میں عید رمضان کی عید، اس طرح چاند کے تعلق سے ہمارا قول ہے کہ چاند میں چاند عید کا چاند، تاہم رمضان کی انتیسویں شب کو چاند کی جو اہمیت قدر و منزلت ہوتی ہے تیسویں شب کو نہیں ہوتی بلکہ تیسویں کو اس غریب کی حیثیت کم و بیش گھر کی مرغی دال برابر یا گھر میں شوہر بال برابر کی سی ہو جاتی ہے۔ ہمارے ایک شناسا ہیں اتفاق سے موصوف کا شمار ملک کے چند گنے چنے غالب شناسوں میں ہوتا ہے، چنانچہ غالب شناس کی روشنی میں عید اور چاند کے آپسی تعلق کے بارے میں فرماتے ہیں کہ جو تعلق مرزا غالب کی شاعری اور ان کے ازاربند عرف ناڑے میں پایا جاتا ہے وہی تعلق عید اور چاند میں پایا جاتا ہے۔ عید اور چاند کے اس خالص تعلق کے ہم بھی قائل ہیں۔ عیدین کے موقع پر چاند کی اہمیت اپنی جگہ یقیناً مسلم ہے تاہم جو چاند رمضان شریف کی آمد سعید کی مبارک و مسعود خبر لاتا ہے۔ وہ بھی کم اہم نہیں۔ البتہ یہ اور بات ہے کہ رمضان کا چاند دیکھ کر جہاں نیکو کار بندوں کے چہرے کھل اٹھتے ہیں وہیں بعض پیٹو احباب کے چہرے اس مخصوص چاند کو دیکھ کر ماند پڑ جاتے ہیں ظاہر ہے مسلسل گیارہ مہینے تک جن حضرات کا مقصد حیات ہی مسلسل و متواتر کھانا پینا رہتا ہو رمضان کا چاند دیکھ کر جہاں اس خیال سے انھیں گھڑی بھر کی خوشی ہوتی ہے کہ اس مبارک مہینے کے اختتام پر عید الفطر منائی جاتی ہے وہیں روزوں کا خیال آتے ہی اس گھڑی بھر کی خوشی پر گھڑا بھر اوس پڑ جاتی ہے کیونکہ عید کی خوشیوں تک پہنچنے کے لئے تیس روزوں کے پہاڑ عبور کرتے ہوتے ہیں اور ہر روزہ ان کی نظروں میں پل صراط سے کم نہیں ہوتا۔ چنانچہ رمضان کا چاند دکھائی دیتے ہی ان کے ستارے مہینہ بھر کے لئے گردش میں آجاتے ہیں۔ خیر یہ تو ان احباب کا ذکر تھا۔ جن میں تھوڑی بہت غیرت و حمیت باقی ہوتی ہے لیکن ایسے ہٹے کٹے افراد۔ جو کلی طور پر بے غیرتی اور ڈھٹائی کا جامہ اوڑھ لیتے ہیں اور روزہ خوروں کی صف میں بلا کسی پس و پیش کے شمار کئے جا سکتے ہیں، رمضان کے چاند کا استقبال کرنے میں روزہ داروں سے بھی آگے بڑھ جاتے ہیں۔

اصل میں ان حضرات کی نظر میں رمضان کا چاند عید کے چاند کے مماثل ہوتا ہے۔ چنانچہ اپنے طور پر علی الاعلان رمضان کی پہلی تاریخ ہی سے عید منانا شروع کر دیتے ہیں۔ بیچارے روزہ دار تو صرف ایک دن عید مناتے ہیں جبکہ روزہ خور احباب کے حق میں پورے مہینے تک فقرہ یہ ہوتا ہے کہ ہر روز عید ہر شب شب برات۔ بلکہ ان کے حق میں تو رمضان ہی کے بھاگوں چھینکے کی طرح ٹوٹتا ہے۔ کیونکہ ایک عام مہینے میں تو صرف تین بار پیٹ پوجا کی سہولت

حاصل ہوتی ہے جبکہ رمضان میں سحری و افطار کا اضافہ بھی ہو جاتا ہے گویا پانچوں انگلیاں گھی میں اور سر کڑھائی میں والی مثل پوری طرح صادق آتی ہے۔

کہتے ہیں رمضان کا چاند دیکھ کر تلوار دیکھنی چاہیئے لیکن یہ اس وقت کی بات ہے جب تلوار اور دیگر مہلک ہتھیاروں کے رکھنے پر پابندی نہیں تھی بلکہ لوگ اپنی کمر سے تلوار لٹکائے یوں آزادی سے پھرتے تھے جیسے کمر سے تلوار نہیں آزار بند لٹک رہا ہو۔ بعض جواں مرد تو سنا ہے ننگی تلواریں لئے اس طرح دندناتے پھرتے تھے جیسے آج مختلف احتجاجی جلوسوں اور مورچوں میں لوگ مختلف نعرے بازیوں سے مزین تختیاں ہاتھوں میں لئے پھرتے ہیں۔ تلواروں اور شمشیروں کی کھلے عام نمائش غالباً ان دنوں کی بات ہے جب خلیل خاں فاختہ اڑایا کرتے تھے بلکہ گمان غالب ہے کہ وہ ایک ہاتھ سے فاختہ اڑاتے اور دوسرے ہاتھ سے ننگی تلوار گھمایا کرتے تھے۔

لیکن آج حالات اسی قدر بدل گئے ہیں کہ بیچارے خلیل خاں فاختہ اڑانا تو دور اپنی ناک پر بیٹھی مکھی تک نہیں اڑا سکتے۔ ایسے حالات میں رمضان کا چاند دیکھ کر تلوار دیکھنا کم سے کم شرفاء کے اختیار میں نہیں۔ یوں بھی دور حاضر میں تلوار، دیگر مہلک ہتھیار یا تو محکمہ پولیس کے اختیار میں ہیں یا پھر غنڈوں کی دسترس میں نتیجتاً صرف فسادات کے دوران ایک عام آدمی ان کے دیدار سے مشرف ہونے کی سعادت حاصل کرتا ہے۔ بدنصیب ایک بار کسی غنڈے کی تلوار کے نزدیک سے درشن کر لیتا ہے پھر وہ اپنے متعلقین اور لواحقین کے حق میں دور درشن ہو جاتا ہے۔ مقتول کے متعلقین عمر بھر بس یہ شعر پڑھتے رہ جاتے ہیں سو

وہ صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں
اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

فی زمانہ چونکہ چھری کانٹوں کا دور ہے اس لئے شرفاء کی اکثریت رمضان کا چاند دیکھ کر چھری دیکھنے پر اکتفا کر لیتی ہے۔ حالانکہ آلو پیاز کاٹنے والی چھری کبھی تلوار کا نعم البدل نہیں ہو سکتی۔ اس لئے بہتر تو یہ ہے کہ رمضان کا چاند دیکھ کر پاس پڑوس کی چھت پر کھڑی کسی چھپن چھری کو دیکھ لیا جائے۔ البتہ اس چلتی پھرتی چھری کا کنواری ہونا ضروری ہے۔ لیکن یہ اپنے اپنے نصیب اور وقت کی بات ہے۔ ویسے کنواری اور شادی شدہ چھری میں وہی فرق ہے جو کسی تیز دھاری والی شمشیر آب دار اور زنگ آلود شمشیر بے آب میں ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر ایک شمشیر بے نیام ہوتی ہے تو دوسری شمشیر در نیام۔ علاوہ ازیں رمضان کا چاند دیکھ کر اڑوس پڑوس کی چھتوں، بالکنیوں میں کسی چلتی پھرتی، جیتی جاگتی دو دھاری تلوار کی تلاش میں نظریں دوڑانا خطرے سے خالی نہیں۔ ذرا سی غفلت اور بے احتیاطی بغیر کسی راکٹ کے چاند پر پہونچا سکتی ہے لہٰذا احتیاط لازم ہے۔ بقول شاعر:۔

لازم ہے دل کے ساتھ رہے پاسبان عقل
اس کو کبھی کبھی ایسے میں تنہا نہ چھوڑیئے

روزے سے روز جلیبی

یہ بات نہیں ہے کہ روزنہ خود صرف بمبئی ہی میں پائے جاتے ہیں۔ دنیا میں کوئی خطہ ان سے خالی نہیں

البتہ بمبئی چونکہ فلمی کلاکاروں کی بھی نگری ہے اس لئے یہاں کی آب و ہوا میں دھول دھوئیں و دیگر الا بلا کے ساتھ اداکاری کی ملاوٹ کا فیصد بھی خاصا ہے چنانچہ یہاں کے روزہ خور اسی قدر کامیابی سے روزہ دار ہونے کی اداکاری کرتے ہیں کہ عام آدمی کے لئے روزہ خور اور روزہ دار میں تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ یوں بھی بمبئی کے ماحول کی یہ خصوصیت ہے کہ یہاں انسانوں سے لیکر بے جان اشیاء تک ہر اصلی چیز پر نقلی کا اور نقلی شئے پر اصلی کا دھوکہ ہوتا ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ یہاں کے آوے کا آوا ہی چونکہ الٹا ہے اسلئے روزہ جیسے لوگ خواہ مخواہ روزے سے اور روزہ دار زیادہ تر روزہ خور جیسے دکھائی دیتے ہیں اگرچہ روزہ خور حضرات کسی منجھے ہوئے کلاکار کی طرح روزہ دار ہونے کی ایکٹنگ کا بڑی مہارت کے ساتھ مظاہرہ کرتے ہیں لیکن کبھی کبھی بعض حضرات خود بخود محض اپنی اوور ایکٹنگ (OVER ACTING) کی وجہ سے پکڑے بھی جاتے ہیں ایسے روزہ خواروں کی پہچان بڑی آسان ہے۔ یہ صرف روزہ داروں کی سی صورت بنائے رکھنے پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ بات بے بات میں اپنے بناوٹی روزے کا برملا اظہار کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے اور یوں پکڑے جاتے ہیں خود اپنے ہی کیے پر ناحق۔

روزہ خواروں کی شاندار بلکہ جاندار اداکاری کو ہوا دینے میں شہر کے بیشتر چھوٹے بڑے ہوٹل و بھٹیار خانے اکثر پیش پیش ہوتے ہیں عام مہینوں میں تو طعام خانے کسی بے باک بے پردہ حسینہ کی طرح چاروں طرف سے اپنے اندرونی کوائف کی بھرپور نمائش کرتے ہیں لیکن رمضان کے بابرکت مہینے میں اچانک کسی حیادار خاتون خانہ کی طرح پردے بلکہ پردوں میں چھپ جاتے ہیں ظاہر ہے یہ اسپیشل پردے دھوکے کی ٹٹی ہوتے ہیں۔ جن کی آڑ میں طرح طرح کے پکوان تیار کر کے روزہ خوروں کے پیٹ کی آگ بجھائی جاتی ہے۔ گویا ماہ صیام کے دوران اس قبیل کی ہر پردہ دار ہوٹل زبان حال سے ایک ہی گزارش کرتی ہے۔

پردہ میں رہنے دو پردہ نہ اٹھاؤ
پردہ جو اٹھ گیا تو بھید کھل جائے گا

جب سے بے حیائی اور ڈھٹائی کا شمار اعلیٰ قدروں میں ہونے لگا ہے۔ پردہ کا یہ نام نہاد تکلف بن جاتا رہا۔ چنانچہ اب ماہ رمضان میں خال خال ہی کسی ہوٹل کے باب الداخلہ پر پردہ دکھائی دیتا ہے اور یہ برائے نام پردہ بھی شرم و لحاظ کا نہیں بے شرمی و بے حیائی کا پردا ہوتا ہے۔ اس آبرو باختہ کے گھونگھٹ کی طرح جو گھونگھٹ کی اوٹ سے نینوں کا بان چلا کر کمزور جی کے گھائل اور شہ زوروں کو اپنی طرف مائل کرتی ہے۔

عادی روزہ خور عادی مجرموں کی طرح منصوبہ بندی کے قائل ہوتے ہیں۔ چنانچہ رمضان کے دوران اس ہشیاری سے اپنا روزمرہ کا ٹائم ٹیبل مقرر کرتے ہیں کہ ان کا آزمائشی وقت یا تو انڈر گراؤنڈ ہو کر گزار دیتے ہیں یا پھر ایسے علاقوں میں بتلاتے ہیں جہاں ان کے کھانے پینے پر کوئی قدغن نہیں ہوتی البتہ شام ہوتے ہوتے ان مخصوص مقامات کے ارد گرد منڈلانے لگتے ہیں۔ جہاں افطاری کے تھال دیدہ و دل فرش راہ کئے جیسے ان ہی کے منتظر ہوتے ہیں۔ اسی طرح رمضان میں روزہ خوروں بلکہ روزہ چوروں کی پانچوں انگلیاں گھی میں سر تھال میں پہنچ جاتا ہے بالفاظ دیگر روزہ دار بے چارے ڈال ڈال ہوتے ہیں اور روزہ خوار تھال تھال۔

اک روزہ "روزہ دار"

مرزا غالب کے متعلق یوں تو بے شمار لطیفے مشہور ہیں۔ لیکن اس وقت ہمیں وہ لطیفہ یاد آ رہا ہے جو

اتفاق سے رمضان سے متعلق ہے۔ جب کسی نے مرزا سے پوچھا "مرزا۔ اس مرتبہ آپ نے کتنے روزے رکھے؟"
تو جواب میں مرزا غالب نے برجستہ عرض کیا۔ ایک نہیں رکھا!

اس اعتراف پر قیامت کے روز مرزا کا مواخذہ ہوگا یا نہیں، ہم نہیں جانتے کہ یہ بندے اور خدا کا آپسی معاملہ ہے البتہ اس جملے کی بلاغت کی داد نہ دینا مرزا کی زندہ دلی اور ذہانت کے ساتھ زیادتی کے مترادف ہوگا۔ دور حاضر میں غالب فہموں غالب کے کچھ طرفدار کسی خانگی مجبوری کے تحت ایک آدھا روزہ رکھنے کی ہمت کر ہی جاتے ہیں البتہ ان کا شمار چونکہ ترقی پسندوں میں ہوتا ہے اس لئے ان کی حالت اس ڈھلمل مسافر کی سی ہوتی ہے جو بیک وقت دو کشتیوں میں پاؤں رکھ کر ساحل پر پہنچنے کی کوشش کرتا ہے ایمان چونکہ ایسے اصحاب کو کفر سے روکتا ہے اور کفر پوری قوت سے اپنی طرف کھینچتا ہے اسلئے اکثریت کا انجام یہ ہوتا ہے کہ نہ خدا ہی ملتا ہے نہ وصال صنم کی لذت سے دوچار ہوتے ہیں۔ نتیجتاً نہ ادھر کے رہتے ہیں نہ ادھر کے لیکن ایمان اور کفر کی کشمکش چونکہ ایک ہی چھت کے نیچے چلتی رہتی ہے اسلئے ایسے افراد کو جن کا جھکاؤ دنیا کی طرف ذرا زیادہ ہی ہوتا ہے۔ گھر کے دیگر روزہ دار ممبران کا ساتھ دینے کے لئے کبھی کبھار اخلاقاً روزہ رکھنا پڑتا ہے۔ البتہ ان کا یہ اک روزہ "روزہ" ایک روزہ انٹرنیشنل میچ کی طرح دوسروں کے حق میں بڑا ہی صبر آزما بلکہ فیصلہ کن اور جان لیوا ثابت ہوتا ہے۔ اس ایک روزہ روزے کے اوقات کار ایک ذرا سحری سے پہلے سے شروع ہو کر اک ذرا افطار کے بعد تک کا احاطہ کئے ہوئے ہوتے ہیں کیونکہ سحری کے وقت انھیں بیدار کرنے کے لئے جب تک کہ سارا گھر ڈھول تاشے لیکر اکٹھا نہیں ہو جاتا ان کی آنکھ نہیں کھلتی اور جب کھل جاتی ہے تو پھر اس وقت تک بند نہیں ہوتی جب تک کہ روزہ افطار نہیں ہو جاتا۔ نتیجہ اس ادھم بازی کا یہ ہوتا ہے کہ ان کا یہ اک روزہ، روزہ پورے تیس روزوں کا ہم پلہ ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ اگلے روز سحری کے وقت کوئی انھیں اٹھانے کی ہمت نہیں کرتا اور وہ اپنے بستر پر ہی لیٹے ہوئے پچھلے دن کے ہنگامی ہنگاموں کے بارے میں سوچ کر فاتحانہ انداز سے مسکرانے لگتے ہیں کہ کس آسانی سے روزوں کی بھوک پیاس سے بچ گئے گویا سانپ بھی مرگیا اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹی لیکن انھیں اس بے آواز لاٹھی کا علم نہیں جس کی زد میں آنے والے کو ٹوٹنے سے کوئی نہیں بچا سکتا!!

روزہ بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

روزہ تزکیۂ نفس کا ایک ایسا آزمودہ ذریعہ ہے جو صرف جسمانی صاف صفائی ہی نہیں کرتا بلکہ روزہ دار کے روحانی درجات بھی بلند کرتا ہے لیکن جو لوگ زندگی کے ہر شعبہ میں تصنع بناوٹ اور دکھاوے ہی کو سب کچھ مانتے ہیں وہ تزکیۂ نفس کے اس پاکیزہ ذریعہ کو بھی اپنی نادانیوں کے کارن اس مقام پر لے آتے ہیں۔ جہاں روزے میں سے پاکیزگی اور تقویٰ نکل جاتا ہے اور صرف بناوٹ اور دکھاوا رہ جاتا ہے۔ جن ارباب ذوق کا روزہ محض دکھاوا ہوتا ہے۔ وہ دن کا بڑا حصہ مختلف قسم کے انڈور گیمز (INDOOR GAMES) یعنی درون خانہ کھیلوں میں اپنے آپ کو مشغول کر کے روزہ بہلانے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ بالفاظ دیگر روزے سے زیادہ روزہ بہلانے پر اپنی توجہ اور قوت صرف کرتے ہیں۔ ان گھریلو کھیلوں میں شطرنج گنجفہ اور تاش سرفہرست ہوتے ہیں بلکہ خدا جھوٹ نہ بلوائے ہمنے تو بعض دکھاوے کے روزہ داروں کو دس پیسے، بیس پیسے پوائنٹ کے حساب سے رمی کھیلتے ہوئے بھی

دیکھا ہے۔ جب کوئی شامت کا مارا اعتراض کرتا ہے کہ یہ تو صریحاً جوا ہے تو جواب میں یہ کہہ کر معترض کا منہ ہمیشہ کے لئے بند کردیا جاتا ہے کہ جیتی ہوئی رقم ہم اپنے اوپر خرچ نہیں کرتے بلکہ اُسے مسکینوں اور محتاجوں میں بانٹ دیتے ہیں۔ اب کہیے یہ جوا کہاں ہوا۔

بعض بناوٹی روزہ داران حضرات سے بھی چار جوتے آگے ہوتے ہیں یعنی ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر کیبل ٹی وی (CABLE T.V) کے تعاون سے متواتر تازہ ترین فلمیں دیکھ کر گھر بیٹھے روزہ بہلاتے ہیں البتہ جنھیں یہ سہولت میسر نہیں ہوتی انھیں شہر کے سینما گھروں تک جانے کی زحمت اٹھانی پڑتی ہے اور اسطرح مذکورہ "روزہ دار" بھی "میں مسافر ہوں میری صبح کہیں شام کہیں" کے مصداق کسی تھیٹر میں مارننگ شو اور کسی میں پہلا شو دیکھ کر "روزہ بہلائی" کا کار خیر انجام دے لیتے ہیں لیکن جو ناگشتی روزہ دار محض کمسن اور معصوم روزہ داروں کی تقلید میں دیکھا دیکھی روزہ رکھ لیتے ہیں ان کا روزہ کسی طور کسی صورت نہیں بہلتا اصل میں سحری کے وقت جو جوش و خروش ان کے روزہ کے پس پردہ کارفرما ہوتا ہے۔ وہ دوپہر ہوتے ہوتے غائب ہو جاتا ہے اور پھر جیسے جیسے افطار کا وقت نزدیک آنے لگتا ہے۔ ہوش و حواس گم ہونے لگتے ہیں اور یہ عالم ہو جاتا ہے ایک ایک پل ایک ایک صدی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ گھر کی ایک ایک شئے بدلی بدلی سی نظر آنے لگتی ہے۔

اپنا وفادار کتا خود اپنے اوپر غراتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ مرغیاں کاٹنے کو دوڑتی ہیں بلی شیر نظر آتی ہے بچے دشمن اور بیوی سوتیلی معلوم ہوتی ہے حتیٰ کہ خود اپنے ہی سراپا کو آئینے میں دیکھ کر یہ گمان ہوتا ہے کہ جس شخص کا یہ عکس ہے اسے پہلے ضرور کہیں دیکھا ہے لیکن کہاں یاد پڑتا ہے گویا اپنے ہی گھر میں آدمی اجنبی ہو کر رہ جاتا ہے۔ بقول خورشید احمد جامی ۔ ؎

ہر آئینے میں کوئی اجنبی مقابل تھا
خود اپنے آپ کو پہچاننا بھی مشکل تھا

روزے سے فاقے تک

بھولے بھٹکے روزہ داروں میں بزرگوں کا ایک ایسا طبقہ بھی ہوتا ہے جو عہد جوانی عیش میں کاٹ کر پیری میں آنکھیں موندنے سے پہلے کچھ ثواب کما لینے کی غرض سے صوم و صلوٰۃ کا پابند ہو جاتا ہے ایسے روزہ دار عمر کی اس منزل میں ہوتے ہیں جہاں بھلکڑ پن کے دورے بار بار پڑتے ہیں۔ چنانچہ دن بھر بچوں کی طرح ان کے "روزے" کی نگرانی کرنی پڑتی ہے گویا جس طرح دل کے ساتھ پاسبان عقل کی موجودگی لازمی ہے اسی طرح ان بزرگ نما خورد حضرات کی نقل و حرکت پر کڑی نظر رکھنا ضروری ہے۔

جب سے امریکی خلا بازوں نے چاند کی چٹیل سطح پر اپنے قدم میمنت لزوم کے نشان ثبت کئے ہیں دنیا کا ہر دوسرا شخص یوں اکڑتا پھرتا ہے جیسے آسمان کا چاند اس کے قدموں تلے آگیا ہو۔ جبکہ سچ تو یہ ہے کہ چاند پہ پاؤں رکھنے کی کوشش میں رہی سہی زمین بھی اولاد آدم کے قدموں تلے سے کھسک چکی ہے اور وہ کسی چمگادڑ کی طرح ہوا میں معلق ہو کر رہ گئی ہے۔ یار لوگوں کے ذہنوں میں روزوں کی بھوک پیاس کا خوف اس قدر گھر کر چکا ہے کہ رمضان کی آمد کی خبر سن کر ہی لرزنے لگتے ہیں۔ قدرت نے تو ہمیں بہت ڈھیل دی لیکن جب پیمانہ صبر لبریز ہو کر چھلکنے لگا تو ایسے

معاشی بحران سے دوچار کردیا کہ تین وقت کھانے والوں کو دو وقت اور دو وقت کھانے والوں کو ایک وقت کا کھانا مشکل سے نصیب ہونے لگا گویا نادانستگی میں تیس روزوں کی بھوک پیاس کے علاوہ سیکڑوں فاقے مقدر میں لکھوا لئے۔ اگر یہی حال رہا تو وہ دن دور نہیں جب ہر شخص مجنوں کی طرح یہ شعر الاپتا نظر آئے گا : ؎

خون دل پینے کو اور لخت جگر کھانے کو
یہ غذا ملتی ہے لیلیٰ ترے دیوانے کو

آخر میں ایک اعتراض کا جواب دیتے چلیں۔ روزہ خوروں کے تعلق سے ہماری خامہ فرسائی کچھ معزز حضرات کو شاید ناگوار گذری ہم یہ تو نہیں جانتے کہ ان اصحاب کا شمار روزہ داروں میں ہوتا ہے یا روزہ خوروں میں بہرحال اگر ان کا شمار روزہ داروں میں ہوتا ہے تو ان سے معذرت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ہے پھر اگر روزہ خوروں میں ہوتا ہے تو معذرت سے چونکہ ان کی تشفی نہیں ہوگی اسلئے معذرت کی بجائے وضاحت بہتر ہوگی کہ اس سے ان کی عاقبت اور ہماری عافیت دونوں کے محفوظ رہنے کا زیادہ امکان ہے۔ اصل میں ہم نے جن روزہ خوروں کے بارے میں تھوڑی بہت گل افشانی گفتار کے جوہر دکھانے کی کوشش کی ہے ان کا شمار بجز ان مجبور و لاچار، نادار روزہ خوروں میں ہرگز نہیں ہوتا، جن کی روزہ خوری کی تائید میں مرزا غالب نے بیانگ دہل یہ فرمایا ہے ؎

جس پاس روزہ کھول کے کھانے کو کچھ نہ ہو
روزہ اگر نہ کھائے تو بے چارہ کیا کرے

عابد معز
(ریاض)

شریف بدمعاش

شادی کے بعد لڑکیوں کی آپسی دوستی اکثر ختم ہو جاتی ہے۔ سہیلیوں کے درمیان سسرال، شوہر اور بچے آجاتے ہیں اور پھر وہ ایک دوسرے سے دور ہو جاتی ہیں۔ اس روایت کو توڑنے کے لیے میری بیوی اور ان کی سہیلی صدیقہ نے قسم کھائی تھی کہ وہ شادی کے بعد بھی اپنی پرانی اور بچپن کی دوستی کو باقی اور برقرار رکھیں گے۔ اپنے شوہروں کو دوست بننے پر مجبور کریں گی۔ ہماری شادی کے دوران صدیقہ پیش پیش تھیں۔ مہندی لگائیں، مٹھائی کھلائیں، ڈھولک بجائیں اور سہیلی کی وداعی کے وقت پھوٹ پھوٹ کر روئی بھی تھیں۔ اب چند دن بعد صدیقہ کی شادی مقرر تھی۔ ہنگامہ برپا کرنے کی باری اب میری بیوی کی تھی۔ میری بیوی نے اعلان کیا کہ شادی کی تقریبات میں وہ مجھے ساتھ لے کر شریک ہوں گی۔ میں نے انہیں سمجھایا "مجھے کوئی پہچانتا نہیں اور نہ میری کسی سے واقفیت ہے۔ میں جا کر کیا کروں گا۔ آپ چلی جائیں۔ میری جانب سے مبارک باد پیش کریں، چڑھاوا چڑھائیں۔ مانجھے سے لے کر چھٹی تک رہیں۔ چاہیں تو دلہن کے ساتھ سسرال جا کر وہاں کے طور طریقے سمجھا آئیں۔" جواب ملا "آپ کو چلنا پڑے گا۔ آپ کی پہچان مجھ سے ہوگی۔ کوئی پوچھے تو اپنا تعارف کروائیے کہ میں دلہن کی عزیز ترین ایک جان دو قالب سہیلی کا شوہر ہوں۔ میری بیوی اور دلہن ایک ساتھ پڑھتی تھیں۔ اور میری شادی ہوئے پینتالیس دن گزر رہے ہیں۔" میں چونک پڑا اور چاہتا تھا کہ بیوی سے لڑ پڑوں۔ "تمہاری شناخت مجھ سے ہے یا میری پہچان تم سے ہے۔" یوں بھی ہماری شادی ہوئے صرف پینتالیس دن گزرے تھے پڑوسیوں کو اپنی آوازیں سنانا اچھا نہیں لگا۔ ابھی تو ہم ایک دوسرے کو مرعوب کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ میں نے حامی بھر لی۔ "ٹھیک ہے آپ کا خادم آپ کے پیچھے شادی میں شریک ہوگا۔" بیوی نے ٹوکا "ہر دم پیچھے نہیں کبھی آگے بھی۔"

شادی کا دن آپہنچا، صبح سے ہی شادی میں شرکت کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ میرے لیے سوٹ نکال کر رکھ دیا گیا۔ حکم ہوا کہ استری کر لوں۔ میں نے سوٹ پر استری پھیر لی۔ صبح شیو کرنے منع کر دیا گیا کہ شام میں داڑھی بڑھی ہوئی نظر آنے لگی۔ دوپہر بارہ بجے حکم ہوا کہ شیو کر لوں اور چلنے کی تیاری شروع کر دوں۔ میں نے کہا "ابھی دوپہر ہے۔ سہ پہر باقی ہے۔ شام ہوگی تب ہم چلیں گے۔" بیوی نے کہا۔ "جی نہیں ہم ابھی اور اسی وقت چل رہے ہیں۔ ہم پہلے سے مہمان ہیں شام کی شادی

کے لیے میں نے دوپہر میں سوٹ پہنا۔ سوٹ پہننے کے بعد میری بیوی نے آگے پیچھے گھوم کر دیکھا اور مشورہ دیا کہ شانے سامنے جھکا کر نہ رکھوں۔ شانوں کو پیچھے کرکے سینہ آگے کروں۔ میں نے اثبات میں گردن ہلائی تو بیوی نے ڈانٹا گھامڑ کی طرح گردن مت ہلائیے گا۔ شادی میں زبان سے کام لیجیے۔ اب میں انھیں کیا بتاتا کہ نکاح کے وقت میں نے تین مرتبہ گردن ہلا کر ہی انھیں قبول کیا تھا۔ بیوی نے میرے بال سنوارے۔ بالوں کو نیا اسٹائل دیا۔ مجھے سیمنٹ سے معطل کرنے کے بعد اپنے شوہر کو لے کر شادی میں شرکت کے لیے روانہ ہوئیں۔ میں بیوی کے پیچھے بوجھل قدموں سے ایسے چل رہا تھا جیسے قصائی کے پیچھے بکرا کھنچا چلا جاتا ہے۔

ہم شادی خانہ پہنچے۔ بیوی مجھے بے یار و مددگار مردانے میں چھوڑ کر زنانے میں چلی گئیں اور اپنی سہیلی کو پاکر مجھے بھول گئیں۔ نظر دوڑائی تو پتہ چلا یہ وہی شادی خانہ ہے جہاں چند دن قبل مجھے ایک ہنگامے کے ساتھ لایا گیا تھا۔ آج مجھے کوئی پوچھنے والا موجود نہ تھا۔ ہال میں کوئی نظر نہ آیا۔ کرسیاں ادھر ادھر بکھری پڑی تھیں۔ یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ کل بھی یہاں کسی کی درگت بنی ہے۔ ایک گوشہ منتخب کرکے میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور پاؤں ہلانے لگا۔۔۔۔۔
تنہائی میں پاؤں ہلا کر وقت گزارنا اچھا شغل ہے۔ کچھ وقت گزرا۔ ایک نحیف و ناتواں شخص ہال میں آیا اور بڑبڑاتے ہوئے کرسیاں ترتیب سے رکھنے لگا۔ وقفہ وقفہ سے وہ کھانستا بھی جاتا۔ میں نے جیب سے کیلکولیٹر نکالا اور حساب کیا کہ وہ ایک منٹ میں دو کرسیاں سیدھی کرتا ہے۔ گویا ہال میں موجود کرسیوں کو ترتیب دینے کے لیے چھ گھنٹے لگ جائیں گے، تب تک عقد کا وقت نکل جائے گا۔ چناں چہ وقت کاٹنے اور ایک کمزور شخص کی مدد کی خاطر میں اٹھا اور کرسیاں ٹھیک کرنے لگا۔ وہ شخص جیسے مجھ سے اس نیک کام ہی کی توقع کر رہا تھا۔ دعائیں دینے لگا۔ شکریہ بیٹا، خدا تمھارا بھلا کرے۔ شادی نہیں ہوئی تو جلد ہو جائے اور اگر ہو چکی ہے تو زندگی خوش گوار گزرے۔ میں نے زیر لب کہا بابا خوش گوار زندگی کا نمونہ دیکھ بلکہ بھگت رہا ہوں۔ کچھ لمحے اپنے کام میں جٹا رہا۔ ایک اور بزرگوار نزدیک آتے ہوئے چار قدم پہلے سے برسنے لگے: پتہ نہیں شادی خانے کا کیا نظام اور انتظام ہے۔ چار بجے آ رہے ہیں۔ ابھی اسٹیج باسی پڑا ہے اور آپ سوٹ پہن کر نزاکت سے کرسیاں ایسے جما رہے ہیں جیسے کرسی پر کوئی حسینہ بیٹھی ہے اور احتیاط لازم ہے۔ سوٹ اتاریے اور ہاتھ پاؤں جلدی جلدی چلائیے۔ بزرگوار کا حملہ اچانک اور غیر متوقع تھا۔ میں جواب میں جی جی کرتا رہ گیا اور سوٹ کے بارے میں سوچنے لگا کہ ہم ملک میں سوٹ کیوں پہنتے ہیں۔ شاید ہمارے لیے سوٹ اسٹیٹس سمبل ہے۔ سوٹ پہننے والے کی قدر ہوتی ہے۔ جب سوٹ کا رعب نہ پڑے اور سوٹ سے خاطر خواہ فائدہ نہ ہو تو سوٹ وزنی محسوس ہونے لگتا ہے۔ گرمی کا احساس بھی ہوتا ہے۔ مجھے سوٹ میں گرمی ہونے لگی۔ میں رومال سے پسینہ پونچھنے لگا۔ دو چار منٹ بعد پھر وہی بزرگوار کا گزر میرے سامنے سے ہوا۔ انھوں نے قہر آلود نگاہوں سے مجھے گھورا اور میں نے گھبرا کر ٹائی کی گرہ کھولی اور کوٹ اتار کر ایک کرسی کو پہنا دیا۔ میں تیزی سے کام کرنے لگا۔ کرسیوں کی ترتیب ٹھیک ہوئی تو دیکھا ایک شخص اسٹیج سجانے میں مصروف تھا۔ میں کھڑا اسے کام کرتے دیکھ رہا تھا کہ دور سے وہی پریشان حال بزرگ کو چیختے سنا کیا اب آپ کو اسٹیج ٹھیک کرنے کے لیے دعوت نامہ دے کر بلانا پڑے گا۔ مدد کے لیے میں اپنی بیوی کو بلانا چاہا لیکن آس پاس بلکہ دور تک کوئی نظر نہ آیا۔ بوجھل قدموں سے اسٹیج سجانے چل پڑا۔ میں اسٹیج سجانے والے کی ماتحتی میں کام کرنے لگا۔ برقی قمقمے، رنگین کاغذ کے گملے اور پھولوں کی لڑیاں لیے سے لدا میاں

کا لمحاتی خوشیوں کو سجایا گیا۔ ایک صاحب اسٹیج کو سجانے کا کام دیکھتے رہے۔ عمر ساٹھ کے اوپر، سفید داڑھی، سر پر ٹوپی اور صاف ستھرے کپڑے پہنے تھے میں نے قیاس کیا کہ یہ صاحب بابل ہوں گے۔ میں نے جھک کر سلام کیا اور اپنا تعارف کروانے کی فکر میں تھا کہ بابل نے پوچھا "کیا تم الکٹریشن ہو؟" میں سوال سن کر بوکھلا گیا اور مناسب الفاظ کی تلاش میں تھا کہ بابل کی غلط فہمی دور کردوں، ایک لڑکا آیا اور بابل سے کہنے لگا: "استاد بریانی تیار ہو چکی ہے چل کر دیکھ لیجیے" بابل مجھے حیران اور پریشان چھوڑ کر پکوان کی طرف چل دیئے۔ میں بابل کی تلاش کو بالائے طاق رکھ کر اپنی خفت مٹاتے شادی خانے سے باہر چلا آیا۔

شادی خانے میں خود تماشہ بننے کے بجائے سڑک پر چہل قدمی کرتے ہوئے آس پاس کا تماشہ دیکھنا اچھا لگا۔ ایک جگہ مداری بندر اور بندریا کا تماشہ بتا رہا تھا۔ میں ہجوم میں شامل ہو کر تماشہ دیکھنے لگا۔ بندریا مختلف طریقوں سے بندر کو پریشان کرنے لگی۔ بندر غصے میں بندریا کی پٹائی کرنے جھپٹتا اور بندریا روٹھ کر مداری کے پاس جا بیٹھی۔ مداری نے دونوں میں مصالحت کروائی۔ تماشہ ختم ہوا۔ تالیاں بجیں لوگ پیسے دینے لگے۔ میں نے بھی انعام دینے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا تو پتہ چلا کہ میرا منی پرس غائب ہے۔ جیب کی دو تین مرتبہ تلاشی لی لیکن پرس ہاتھ نہ لگا۔ آس پاس نظر دوڑائی کہ کسے موردِ الزام ٹھہراؤں۔ کچھ سجھائی نہ دیا۔ بے بسی کے لمحات میں تقدیر کو قصوروار ٹھہرایا جاتا ہے سو میں اپنی قسمت کو برا بھلا کہتا بوجھل قدموں سے شادی خانہ واپس ہونے لگا۔ بارات آتی نظر آئی۔ ایک لمحہ کے لیے خیال آیا کہ میں دلہن کی سہیلی کا شوہر ہوں، دروازے پر بارات کا استقبال کرنا چاہیے لیکن میں نے خود کو سنبھالا اور بارات کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ بارات منزلِ مقصود پہ پہنچ کر رک گئی۔ آس پاس کا جائزہ لیا تو پتہ چلا کہ میں کسی دوسری بارات کے ساتھ کسی دوسرے شادی خانے میں پہنچ گیا ہوں۔ احتیاطاً سے اپنے آپ کو بچاتے، میں نئے شادی خانے سے نکل آیا اور اس پرانے شادی خانے جا پہنچا جہاں میری بیوی میرے حشر سے بے نیاز اپنی سہیلی کی شادی میں مگن تھیں۔

میری بیوی کی سہیلی کے ہونے والے شوہر یعنی نوشہ کے دولہا جس سے حسب حکم مجھے دوستی کرنا ہے، شادی خانے میں آ چکے تھے۔ براتی انھیں گھیرے میں بھی لے چکے تھے۔ حسنِ اتفاق سے قاضی صاحب وقت پر موجود تھے اور ضروری کارروائی کے لیے کاغذوں پر جھکے ہوئے تھے۔ میں اپنا چھوڑا ہوا کوٹ تلاش کرنے لگا۔ کوٹ کرسی پر نظر نہ آیا۔ ادھر ادھر نظر دوڑائی تو دیکھا کہ کرسیاں ترتیب سے رکھنے والا نحیف و ناتواں شخص میرا کوٹ پہنے انعام کی آس میں اسٹیج کے پاس کھڑا ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ بدبختی اکیلے نہیں آتی۔ منی پرس اور اپنی شادی کے کوٹ کا غم کھاتے ہی میں ایک کرسی پر نڈھال بیٹھ گیا۔ پرامید نظروں سے ہال کا جائزہ لیا کہ کوئی جان پہچان والا نکل آئے۔ وہ رحمتِ خداوندی بن کر مجھے اس جنجال سے نکالے۔ مایوسی ہوئی۔ ہر تیسرے شخص پر گمان ہوتا کہ میں ان صاحب کو پہچانتا ہوں لیکن یاد نہیں آتا کہ وہ کون ہے اور کہاں ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ دو ایک حضرات کو دیکھ کر میں نے مسکرا کر اپنائیت کا اظہار کیا تاکہ وہ مجھے جانتے ہوں تو پہچان جائیں۔ اس عمل سے بھی مایوسی ہوئی۔

مبارک سلامت کا شور بلند ہوا۔ دولہا سے گلے ملے اور فوٹو اور ویڈیو کا سیشن شروع ہوا۔ لوگ کم ہوئے تو [illegible] اٹھا اور دولہا کو مبارک باد دینے گیا۔ پھر [illegible] بلنگ کا سامنا ہوا [illegible] ہاتھ ملا کر

رہے تھے۔ انھوں نے پوچھا یہاں کیسے؟ میں نے جواب دیا "دلہا کو مبارک باد دینے اور گلے ملنے حاضر ہوا ہوں۔" جواب ملا "اس کی ضرورت نہیں ہے۔ چل کر کھانا کھا لیجئے۔" میں نے ان کا حکم ماننے سے انکار کرتے ہوئے کہا "آپ جو مجھے بھکاری سمجھ رہے ہیں نہیں ہوں۔ میں آپ کا ایک معزز مہمان ہوں۔" اس پر سوال ہوا "آپ کس طرف سے آئے ہیں۔ دلہن یا دولہا کی جانب سے؟" میں نے جواب دیا "دلہن کا مہمان خاص ہوں۔" جواب میں ایک معنی خیز "اچھا" کہا گیا اور کسی نے انھیں دوسری طرف متوجہ کر لیا۔ میں دولہے کو مبارک باد دے کر ایک کرسی پر جا بیٹھا۔ میرے تعاقب میں دو عدد لڑکے آئے اور کچھ فاصلے پر بیٹھ کر کھسر پھسر کرنے لگے۔ چچا نے ان صاحب پر نظر رکھنے کے لیے کہا ہے۔ کہہ رہے تھے کہ صبح سے یہاں منڈلا رہے ہیں۔ بڑا ہاتھ مارنے کا ارادہ لگتا ہے۔ میں نے چچا سے کہا کہ شکل سے شریف لگتے ہیں تو انھوں نے بتایا کہ شریف بدمعاش ایسے ہی ہوتے ہیں۔ بھولی بھالی صورت، اچھے کپڑے اور اچھے اخلاق، مال لوٹ کر چلتے بنتے ہیں۔ بعد میں پچھتانے سے بہتر ہے کہ ان پر نظر رکھی جائے اور رنگے ہاتھوں پکڑا جائے۔ بچوں کی باتیں سن کر مجھے پسینہ آنے لگا۔ محسوس ہوا کچھ ہی دیر میں چوری کا الزام لگا کر پولیس کے حوالے کر دیا جاؤں گا۔ میں اپنے ضامن کو بلوانے کی سوچ رہا تھا کہ میری بیوی مردانے میں جھانکتی نظر آئیں۔ میں ان کی طرف لپکا۔ میرے پیچھے دونوں بچے اور چچا بھی آن پہنچے۔ زندگی بھری آواز میں، میں نے اپنی بیوی کو پکارا۔ چچا کا ہاتھ میرے گریبان کی طرف بڑھ رہا تھا کہ میری بیوی بیچ میں آ گئیں۔ چچا کو سلام کر کے میرا تعارف کروانے لگیں "چچا یہ میرے شوہر ہیں۔" چچا کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے بولے "اچھا تو یہ ہیں۔" میری جان میں جان آئی اور میں نے لقمہ دیا "شریف بدمعاش۔" چچا مجھ سے بغلگیر ہوئے۔ میں نے اپنی بپتا بیوی کو سنائی۔ ستم یہ کہ وہ بھی مجھے شریف بدمعاش کہہ کر ہنسنے لگیں۔

رضا نقوی واہی

غزل

(بہ طرح: کسی کا درد ہو، دل بے قرار اپنا ہے)

خود اپنے ذوقِ نظر پہ مدار اپنا ہے
حریفِ فن نہ کوئی سلجھے دار اپنا ہے

تمام عمر ظرافت کی آبیاری کی
اسی سے باغِ ادب مشکبار اپنا ہے

مزاح و طنز تو تنقید کا ہے اک اسلوب
اسی سے رشتۂ فن استوار اپنا ہے

تضادِ قول و عمل میں جہاں نظر آئے
وہیں نشانے پہ اپنے شکار اپنا ہے

"خلافِ شرع کبھی شیخ تھوکتا بھی نہیں"
مشاہدہ تو یہی بار بار اپنا ہے

"مگر اندھیرے اجالے میں چوکتا بھی نہیں"
اسی تضاد سے فن تابدار اپنا ہے

مرے کلام میں شائستگی کا جوہر ہے
خدا کے فضل سے یہ افتخار اپنا ہے

مرے کلام کی تلخی میں شہد کی ہے مٹھاس
گرفت میں قلمِ خوش عیار اپنا ہے

کسی کا دل نہ دکھے اور بات بن جائے
از ابتدا یہی اب تک شعار اپنا ہے

یہ ارضِ شاد، یہ پرویز شاہدی کا وطن
یہی نگر شجرِ سایہ دار اپنا ہے

اسی دیار میں گزرے ہیں اپنے ستر سال
یہ وہ نگر ہے جہاں اعتبار اپنا ہے

"بیا ورید، گر ایں جا، بود سخن دانے"
برائے نقد و نظر کاروبار اپنا ہے

ادب کے ناقدو، جوئے کم آب کیوں دیکھو
نظر اٹھاؤ، ادھر آبشار اپنا ہے

خود آگہی نے کیا ہے دماغ کو روشن
"کسی کا درد ہو، دل بے قرار اپنا ہے"

٥

صاف صاف — منہ پھٹ ناگپوری

اس کی مرغی بہت پھدکتی ہے
عاشقانہ مزاج رکھتی ہے

بیٹھ جائیں تو کیا ملے منزل
بڑھ کے چلیں تو زمیں سرکتی ہے

اس خلش سے ہے واسطہ دل کا
پھانس کی طرح جو کھٹکتی ہے

سوکھے ہرا ہے سڑکوں پر
کیسی داڑھی میں کتنی تنکی ہے

ہیں ہملے پڑوس میں بیٹھے
پھر یہ چوڑی کہاں کھنکتی ہے

جھنک جاتی ہے میرے گھر کی بیا
چھت کسی اور کی ٹپکتی ہے

ہیں جو کم ظرف میکدہ مشرب
ان کے ساغر سے مے چھلکتی ہے

غزل

نیاز سواتی (پاکستان)

آپ نے دربان کی مٹھی کو گرمایا نہیں — اس لیے تو آپ کا نمبر ابھی آیا نہیں
مے کشی کا شیخ جی نے خود کیا ہے ارتکاب — مے کشی پر شیخ جی کو ہم نے اکسایا نہیں
روز جو جلوہ دکھاتا تھا الیکشن میں ہمیں — وہ الیکشن جیت کر ہم کو نظر آیا نہیں
میں نے نذرانہ دیا تھا کھول کر دل، اس لیے — فائلوں میں اس نے میرا کیس دفنایا نہیں
پھر ضمانت ضبط کروانے کا اس کو شوق ہے — بارہا ہارا ہے لیکن پھر بھی شرمایا نہیں
ہو چکا وقت بھی چھٹی کا اب نزدیک تر — اور دفتر میں بڑا افسر ابھی آیا نہیں

میزباں کی تھی نظر ہر اک نوالے پر نیاز
اس لیے تو سیر ہو کر ہم نے کچھ کھایا نہیں

تضمین بر غزلِ غالب

مفلس فاروقی (بارسی ٹاکلی)

(ترمیم و تصرف کے لیے روحِ غالب سے معذرت)

کبھی دن بھر وہ گھر نہیں آتی — اور کبھی رات بھر نہیں آتی
وہ رہ راست پر نہیں آتی — کوئی امید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

کبھی چٹکلوں پہ ان کے بل پہ ہنسی — کبھی بٹے پہ اور رسل پہ ہنسی
کبھی رخسار اور تل پہ ہنسی — پہلے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی

دانت جب تک ہیں پیٹ میں ہے — سانس جب تک ہے دل میں دھڑکن ہے
کیسی بے چینی کیوں یہ الجھن ہے — موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

جب بھی ہوگا حساب طاعت و زہد — کیسے دوں گا جواب طاعت و زہد
دیکھتا ہوں میں خواب طاعت و زہد — جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

سب تجھے چھوڑ کر گئے مفلس — کچھ ادھر کچھ ادھر گئے مفلس
یار تیرے کدھر گئے مفلس — سب کہاں جا کے مر گئے مفلس
کیوں کسی کی خبر نہیں آتی

مشتاق احمد یوسفی

بسلسلہ گذشتہ

کارِ کابلی والا
اور
الہ دین بے چراغ

بحث و تکرار کے انٹرول میں خاں صاحب پیدل سیر کو نکل جاتے۔ کوہاٹ اور بنوں کے دس پندرہ نیاز مند جو سارے دن واسکٹوں میں پستول رکھے باہر انتظار میں بیٹھے ہوتے، ان کی اردلی میں چلتے۔ یہ خان کے حواری اور مصاحب تو تھے ہی، کمانڈو بھی تھے جو ان کی کٹی ہوئی انگلی کے نصف اشارے پر اپنی کمر سے بارود باندھ کر آتشِ نمرود میں بے خطر کود پڑنے کے لئے تیار رہتے تھے۔ خان صاحب نے ان کے لیٹنے بیٹھنے اور تواضع کے لئے باہر تین چار پائیاں ایک کابلی سماوار رکھوا دیا تھا۔ اس میں دن بھر چائے اونٹتی رہتی، جس کے اخراج کے لئے بشارت کو ٹین کی نالی دار چادروں کا ایک عارضی کاکوس (ٹائلٹ) بنوانا پڑا۔ اس میں وہ استعمال شدہ بلاٹنگ پیپر رکھوا دیتے تھے۔ لوگوں نے کراچی کی کچی روشنائی کی شکایت کی تو انھوں نے گذشتہ دن کا ایک اخبار رکھوانا شروع کر دیا جو ہر حکومتِ وقت کا طرفدار رہا تھا۔ اب یہ ٹائلٹ پیپر کے طور پر استعمال کیا جانے لگا۔ اس میں کم از کم اخبار کے ساتھ زیادتی نہیں تھی۔ دن بھر گپیں، چہلیں اور وزن اٹھانے کے مقابلے ہوتے رہتے۔ جوان اپنے روزگار، کھیل کود، جنگائی، سینما، کھانے پینے اور نشانہ بازی کی باتیں کرتے۔ جب کہ ادھیڑ عمر والے زیادہ چینی کی چائے اور فحش لطیفوں سے خود کو ری چارج کرتے رہتے۔ دونوں کی گرمی سے گھڑی بھر کے لئے گلابی بڑھاپے کی ٹھر دور ہو جاتی تو ٹھرک * سر پہ چڑھ کے ایسی دِوانی باتیں کرنے لگتی کہ جوان سن کے شرما جاتے۔ جس کی مونچھ میں جتنے زیادہ سفید بال ہوتے، یا کمر جتنی زیادہ خمیدہ ہوتی، اس کا لطیفہ اتنا ہی دور مار اور سہ آتشہ ہوتا۔ اس پر مرزا نے ایک دفعہ پھبتی کسی

کماں چنداں کہ خم گردد، خدنگش تیز تر گردد (**)

خاں صاحب کو کبھی کوئی زیادہ ہی لذیذ حکایت سنانی ہوتی تو کٹے میں گڑ یا مصری کی ڈلی دبا کر سی سی کرتے ہوئے چائے پیتے جاتے۔ جھومتے ہوئے فرماتے "یارا جی! سمرقند اور فرغانہ میں اسی طرح پی جاتی ہے!"

---

* ٹھرک (پنجابی) معنی ہوس کی "آنکھوں میں تو دم ہے" والی منزل۔ ہوکا۔ ٹھرک اٹھنا۔
** کمان جتنی زیادہ خمیدہ ہوگی۔ اس کا تیر اتنا ہی زیادہ تیز ہو جائے گا۔

فرصت کا تمام وقت خان صاحب کراچی اور کراچی والوں کو دیکھنے اور جو کچھ دیکھتے اس پر لاحول پڑھنے اور پڑھوانے میں گزارتے فرماتے تھے "کراچی میں سانس لینے کے لئے بھی ذاتی کوشش کرنی پڑتی ہے۔ قبائلی علاقے کی ہوا ہلکی اور شفاف ہوتی ہے خود بخود گولی کی طرح اندر داخل ہو جاتی ہے۔ خصوصاً جاڑے میں۔ صبح کراچی ریڈیو کہہ رہا تھا کہ ہوا میں رطوبت کا تناسب ۹۰ فیصد ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ کراچی کے دعدہ والے ہوا میں صرف دس فیصد دعدہ ملا کر دم دھ بنا لیتے ہیں۔ آپ جن موقعوں پر نعرے شعر اور وظیفے کا ورد کرنے لگتے ہیں وہاں ہم ٹھائیں سے گولی مار دیتے ہیں۔ میں اتنے دن سے یہاں ہوں، شہر میں ایک آدمی کے ہاتھ میں بندوق نہیں دیکھی۔ ہمارے یہاں تو نکاح کے وقت بھی پستول ساتھ رکھتے ہیں کہ پتا نہیں مہر پر گولی کی نوبت آ جائے۔ بعض دلہن کا والد اور رشتے دار ایک دم خبیث، خسیس اور دیوث نکلتا ہے۔ میں تو احتیاطاً چھوٹی مشین گن لے گیا تھا۔ اس سے میرے ماموں نے ۱۹۲۷ء میں خیسورہ کے نزدیک کا طوری خیل علاقے میں ایک پہاڑی کھوہ کی کمین گاہ سے تین گورے مار گرائے تھے۔ جن میں ایک کپتان تھا۔ اس کی صورت بل ڈاگ جیسی تھی۔ اس خنزیر کے بچے نے فقیر ایپی کے بے شمار مرید شہید کئے تھے۔ ماموں نے اس کے کان اور ناک کاٹ کر چیل کوؤں کو کھلا دی۔ دوسرے گورے کی جیب سے جو معمولی سپاہی تھا۔ اس کی خمیدہ کمر ضعیف ماں اور ایک سال کی بڑی پیاری سی بچی کے فوٹو نکلے۔ بچی کے ہاتھ میں گڑیا تھی۔ فوٹو دیکھ کر میرا ماموں بہت رو دیا۔ لاش کے ہاتھ پر سے جو سونے کی گھڑی اس نے اتار لی تھی۔ وہ واپس باندھ دی میت کو سلوٹ کر کے واپس جا رہا تھا کہ چند قدم بعد کچھ خیال آیا۔ وہ پلٹا اور اپنی چادر اتار کے اس پر ڈال دی۔

* سو میں کہہ رہا تھا کہ میں ماموں کی مشین گن سے مسلح ہو کر گیا۔ سوائے بچوں قاضی اور نائی کے اور کوئی نہتا نہیں تھا۔ عین نکاح کے وقت لڑکی والے پسر گئے۔ کہنے لگے مہر ایک لاکھ کا ہو گا۔ اس پر ماموں جھگڑا کرنے لگا۔ وہ شرعی مہر یعنی پونے تین روپے بھر چاندی پر مصر تھا۔ جس کے تیرہ روپے ساڑھے پانچ آنے سکہ رائج الوقت بنتے تھے۔ قبیلے کے ایک دانا بزرگ نے تجویز پیش کی کہ کچھ لڑکی والے کم کریں، کچھ لڑکے والے مہر بڑھائیں۔ دونوں فریق درمیانی اوسط رقم پہ سمجھوتا کر لیں۔ اس پر دوسرا دانا بولا، سردار ہوش کرو۔ تیرہ روپے ساڑھے پانچ آنے اور ایک لاکھ کے درمیان کوئی اوسط رقم نہیں ہوتی۔ ایسے میں اوسط تلوار سے نکلتا ہے۔

زرا تو وہ بڑھا تو میں نے سہرا ہٹا کر باآواز بلند کہا "میں تو پانچ لاکھ کا مہر باندھوں گا۔ اس سے کم میں میرے خاندان کی توہین ہو گی۔ یہ سن کر ماموں سناٹے میں آ گیا۔ میرے کان میں کہنے لگا کیا تو آج پوست پی کے آیا ہے؟ پانچ لاکھ میں تو کلکتے کی گوہر جان اور ایک سو ایک رنڈیوں کا ناچ ہو سکتا ہے۔ میں نے کہا! ماموں! تو بیچ میں مت بول، تو نے زندگی میں بائیں آنکھ میچ کر دائیں آنکھ سے رائفل کی شست باندھ کر فقط اپنے دشمن کا چہرہ دیکھا ہے یا پھر کلدار روپوں پر کوئن وکٹوریہ کا چہرہ دیکھا ہے۔ تو نے دنیا نہیں دیکھی۔ نہ تجھے مردوں کی "پختو" کا کچھ خیال ہے۔ اگر مجھے نا دہندہ ہی ہونا ہے تو بڑی رقم ماروں گا۔ چھوٹی رقم مارنا نارنجیلوں اور دیوثوں کا کام ہے۔

"مجھے آئے اتنے دن ہو گئے کراچی میں ایک بھی دنگا فساد نہیں ہوا۔ * کیا یہاں رشتے دار نہیں رہتے کیا یہاں سب ایک دوسرے کو یتیم لاوارث سمجھ کر معاف کر دیتے ہیں۔ پرسوں کا واقعہ ہے ایک دوست

---

* یہ بات پرانی۔ افسوس! کراچی کو اپنی ہی نظر لگ گئی۔

سے ملنے لانڈھی گیا تھا۔ بس کنڈکٹر نے میری ریزگاری نہیں لوٹائی۔ میں نے اترتے وقت گالی دی تو سنی ان سنی کر گیا۔ میں نے دل میں کہا، بدبخت! میں نے گالی دی ہے، نصیحت تو نہیں کی جو یوں ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دی۔"

اس لطیفے کے بعد بڑی دیر تک ان کے حلق سے کمزور بیٹری والی کار کو بار بار اسٹارٹ کرنے کی آوازیں نکلتی رہیں اور جسم جیلی کی طرح تھلتھلاتا رہا۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ خان صاحب کو کراچی قطعاً پسند نہیں آیا۔ فرماتے تھے، کراچی میں اگر کراچی والے نہ ہوں اور سمندر ڈیڑھ دو سو میل پرے ہٹ جائے تو ٹرک اور گھوڑے دوڑانے کے لئے شہر برا نہیں۔ کراچی کے کچھ حصے انھیں بے حد پسند آئے۔ یہ کچی بستیوں کے وہ علاقے تھے جو تحصیل کوہاٹ سے مشابہت رکھتے تھے۔ جہاں ایک زمانے میں ان کی جوانی نے، بقول ان کے، پوری تحصیل کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

اے گل بتو خرسندم تو بوئے کسے داری

یار زندہ فضیحت باقی

بشارت اور خان صاحب کے مابین حجت و تکرار صرف دفتری اوقات میں یعنی نو سے پانچ بجے تک ہوتی۔ جو باقیات کا فیصلہ ہوئے بغیر کل تک کے لئے ملتوی ہو جاتی، تاکہ تازہ دم ہو کر جھگڑ سکیں۔

صلح ہے اک مہلت سامان جنگ
کرتے ہیں بھرنے کو یاں خالی تفنگ

سنا ہے اگلے وقتوں میں پڑوسنیں اسی طرح لڑتی تھیں۔ لڑتے لڑتے گلا بیٹھ جاتا اور شام پڑتے ہی وہ مرد گھر لوٹنے لگتے جو دن بھر معرض دشنام میں آیا کئے تو دونوں مکانوں کی سرحد یعنی مشترکہ دیوار پر ایک ہانڈی الٹی کر کے رکھ دی جاتی تھی جس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ اندھیرے کے سبب گالی میں third dimension (تیسری جہت) پیدا نہیں ہوتی۔ جس دکان میں ہر وقت جھگڑے اور دنگل کا سماں ہو اور باہر ایک فریق کے دس پندرہ مسٹنڈے حمایتی تما کے گرد پڑاؤ ڈالے ہوں، اس کے گاہک بدکیں نہیں تو اور کیا کریں۔ بقول ہمارے استاد اول، مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی کے جن کی "ریڈر" سے ہم نے دفاع اور آداب فرار کا پہلا سبق سیکھا۔

جب کہ دو موذیوں میں ہو کھٹ پٹ
اپنے بچنے کی فکر کر جھٹ پٹ

کوئی گاہک مارے باندھے ٹھہر بھی جاتا تو خان صاحب اس کے سامنے اپنی ڈوبی رقم کو اس طرح یاد کرتے کہ حسب توفیق خوف زدہ یا آب دیدہ ہو کر بھاگ جاتا۔

بحث بازی کا اثر خان صاحب کی تندرستی پر نہایت خوشگوار ثابت ہوا۔ ان کی زبان اور اشتہا روز بروز کھلتی جا رہی تھی۔ وہ کسی طور لکڑی کی قیمت کم کرنے کے لئے تیار نہیں تھے، اس لئے کہ انھیں گھر بیٹھے سستی پڑی تھی۔ ادھر بشارت بار بار کہتے کہ "اول" لکڑی داغی اور گٹھیل تھی۔ اس پر تیز سے تیز آری کھٹل ہو گئی۔

دوم، سیزن بھی نہیں ہوئی تھی۔ کئی تختوں میں بل آ گیا۔ کوئی بے داغ نہیں نکلا۔ سوم چھیجت* بہت ہوئی۔ چہارم جگہ جگہ کیڑا لگا ہوا تھا۔"

خان صاحب نے لقمہ دیا "پنجم یہ لکڑی چوری کی ہو گئی۔ یہ بھی میرا ہی قصور ہے۔ ششم یہ کہ ہم نے آپ کو لکڑی دی تھی۔ لڑکی تو نہیں دی کہ آپ اس کے جہیز میں ہزار کیڑے نکالتے بیٹھ جائیں۔ آپ تو پان کھا کھا کے بالکل زنانیوں کی طرح لڑنے لگتے ہیں۔"

بشارت نے "زنانیوں" سنا اور سمجھا۔ تڑ سے جواب دیا "آپ بھی تو کابلی والے سے کم نہیں۔"

"یہ کیا ہوتا ہے صیب؟"

بشارت نے کابلی والا کا مطلب بتایا تو وہ غضب ناک ہو گئے۔ کہنے لگے "ہمارے قبیلے میں آج تک کسی نے سود لیا نہ سود دیا۔ خنزیر برابر سمجھتے ہیں۔ جبکہ آپ علانیہ سود دیتے بھی ہیں اور کھاتے بھی ہیں۔ آپ کے گھر کا تو شوربا بھی حرام ہے۔ اس میں آدھا پانی، آدھی مرچیں اور آدھا سود ہوتا ہے۔ اگر آئندہ یہ لفظ منہ سے نکالا تو ٹھیک نہ ہوگا"

یہ کہہ کر انھوں نے عالم غیظ میں میز پر اتنے زور سے مکّا مارا کہ اس پر رکھے ہوئے کپ، چمچے، پن اور مسلے ہوئے مڑے ہوا میں ایک ایک بالشت اونچے اچھلے اور میز پر رکھے ہوئے ٹائم پیس کا الارم بجنے لگا۔ پھر انھوں نے منہ سے تو کچھ نہیں کہا۔ ٹرکش کوٹ کی جیب سے بھرا ہوا ریوالور نکال کر میز پر رکھ دیا۔ مگر تھوڑی دیر بعد نال کا رُخ پھیر کر اپنی طرف کر لیا۔

بشارت سہم گئے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ زہر میں بجھے ہوئے اس تیر کو جو نہ صرف کمان سے نکل چکا تھا بلکہ مہمان عزیز کے سینے میں ترازو ہو چکا تھا۔ اب کیسے واپس لائیں۔ خان صاحب نے اسی وقت اپنے کمانڈو کو حکم دیا کہ فوراً جا کر پشاور کا ٹکٹ لاؤ۔ دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھایا۔ بشارت منت سماجت کرتے رہے۔ خان صاحب بار بار پھر کر دفتر سے باہر جاتے مگر اس انداز سے کہ ہر قدم پر

مُڑ کے تکتے تھے کہ اب کوئی منا کر لے جائے

بشارت نے چار بجے ان کے پیر پکڑ لئے تو وہ گھر چلنے کے لئے اس شرط پر رضامند ہوئے کہ پہلے اپنے ہاتھ سے مجھے پان کھلاؤ!

لیکن اس کے بعد خان صاحب کے روّیہ میں ایک خوشگوار تبدیلی آ گئی۔

بشارت تو خیر اپنے کہے پر نادم تھے ہی بلکہ انگریزی محاورے کے مطابق اپنے ہی عرق میں غرق ہوئے جا رہے تھے لیکن خان صاحب بھی اپنے شدید ردعمل پر کچھ کم خجل نہ تھے۔ طرح طرح سے تلافی اور دلجوئی کی کوشش کرتے۔ مثلاً بشارت کبھی اداس یا مضمحل نظر آتے یا گھمسان کی بحث میں اچانک ایسے بزدلانہ طریقے سے میدان چھوڑ کر بھاگ جاتے کہ خان صاحب ڈان کیوٹے کی طرح اکیلے ہوا میں تلوار چلاتے رہ جاتے، تو ایسے موقع پر وہ ایک عجیب ادائے دلنوازی سے کہتے "حضور والا" کابلی والا بندہ آداب عرض کرتا

---

* چھیجت: ۔ کاٹ چھانٹ یا لادنے اور اتارنے سے مال میں کمی واقع ہونا۔

ہے کہ پان کی طلب ہو رہی ہے۔ پان کھلائیے" انہوں نے اس سے پہلے پان کبھی چکھا بھی نہیں تھا۔ بشارت ندامت سے زمین میں گڑ جاتے۔ کبھی قدرے کھسیانے، کبھی mock-serious انداز (استہزائیہ سنجیدگی) سے ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو جاتے، کبھی یوں بھی ہوتا کہ خان صاحب ان کے ہاتھ چوم کر آنکھوں سے لگا لیتے۔

۱۰

پلنگ زیب خاں

شام کو وہ کھلے صحن میں پلنگ بچھوا کر اس پر مچھردانی لگواتے۔ کچھ دنوں سے کرسی پر بیٹھنا چھوڑ دیا تھا۔ بشارت سے کہتے تھے کہ تم نے مہمان کی شلوار کے لئے کرسیوں کی کیلوں کو ننگا کر رکھا ہے۔ اپنے پلنگ سے مؤدب فاصلے پر ملاقاتیوں کے بیٹھنے کے لئے چار چار پائیاں مع مچھردانی بچھواتے۔ فرماتے تھے کہ اگر فرنٹیر کے بچھوؤں کے پر لگ جائیں تو کراچی کے مچھر بن جائیں گے۔ ساری گفتگو اور بحث مباحثے مچھردانیوں کے اندر بیٹھے بیٹھے ہوتے۔ البتہ کسی کو دورانِ تقریر جوش آ جاتا تو وہ مچھردانی اس طرح ہٹاتا جیسے دولہا نکاح کے بعد سہرا الٹ دیتا ہے۔ کراچی کی دور دراز بستیوں سے ان کے پٹھان دوست، گرائیں اور معتقدین جوق در جوق ملنے آتے۔ ان کی خاطر تواضع اس طرح کرتے گویا یہ سب کچھ اپنے ہی حجرے میں ہو رہا ہے۔ رات گئے تک تام چینی کی نیلی چیچک زدہ چینکیں اور حقے گردش میں رہتے۔ چائے کے رسیا، اونٹتی چوڑا چائے میں مردان کے گڑ کے علاوہ خشخاش کا بورا بھی ڈلواتے۔ جو بھی آتا خان صاحب کے لئے کچھ نہ کچھ نذر ضرور لاتا۔ اخروٹ، چلغوزے، پشاور کے کالے گلاب جامن، شہد کے چھتے، تلہ گنگ اور ڈیرہ اسمٰعیل خان کا سفید تمباکو، قراقلی اور جوان اصیل* مرغ جنھیں خان صاحب بڑی رغبت سے کھاتے تھے۔ دن بھر گھر میں درجنوں اصیل مرغ چھٹے پھرتے۔ سرخ سمنٹ کے فرش پر سبز بیٹ اور بھی کھلتی تھی (کھلتی کو زیر کے ساتھ پڑھیں تب بھی مزہ دے گی)۔ جو مرغ بے وقت یا زیادہ زور سے اذان دیتا اسے خان صاحب سب سے پہلے ذبح کرتے۔ صبح جب سب مرغ باجماعت اذان دیتے تو سارے محلے کو کلغی پر اٹھا لیتے۔ ایک دن ایک ہیمند نوجوان غلطی سے مرغی دے گیا۔ اس دن مرغ آپس میں بڑی خونخواری سے لڑے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ مرغ کسی واضح اور معقول مقصد کی خاطر لڑے۔ ورنہ روزانہ بے مقصد اور بلا وجہ ایک دوسرے بلکہ تیسرے پر بھی جھپٹتے اور کٹ کٹ مرتے رہتے۔ کوئی انھیں لڑنے سے باز رکھنے کی کوشش نہیں کرتا تھا، اس لئے کہ جب وہ آپس میں نہیں لڑتے تھے تو گھر والوں کو کاٹنے لگتے۔ اکلوتی مرغی پر لڑ لڑ کر وہ ایسے لہولہان ہوئے کہ صبح اذان دینے کے لائق بھی نہ رہے۔ ڈربے میں چپکے پڑے ملا کی اذان سنا کئے۔

---

* اصیل مرغ — سرخی مائل گہرے براؤن رنگ کا مرغ۔ بہت لڑاکا اور خونخوار ہوتا ہے۔ اس کا گوشت بہت مقوی سمجھا جاتا تھا۔ مولانا عبدالحلیم شرر لکھتے ہیں کہ "دنیا میں اصیل مرغ سے زیادہ بہادر کوئی جانور نہیں ہے۔ مرغ کی سی بہادری در حقیقت شیر میں بھی نہیں ہے وہ مر جاتا ہے مگر لڑائی سے منہ نہیں موڑتا۔" ان کی تحقیق کے مطابق اس کی نسل عرب سے ہندوستان امپورٹ کی گئی جب کہ "بٹیر بازی کا شوق لکھنؤ میں پنجاب سے آیا۔" معلوم ہوتا ہے بٹیر بازی سے متعلق مولانا نے کوئی روایت نقل کر دی۔ ہم نے تو آج تک اہلِ پنجاب کو بٹیروں کو ایک دوسرے سے لڑوا کے ان کو زخمی یا ہلاک کرتے نہیں دیکھا۔ اپنے ہاتھ سے حلال کر کے کھاتے ہیں۔

خان صاحب اتوار کو سارے دن پلنگ پر نیم دراز ہو کر قبائلی تنازعوں اور بٹوں اور کوہاٹ کی زمینوں کے فیصلے کرتے۔ اب وہ اورنگ زیب خان کے بجائے پلنگ زیب خان زیادہ معلوم ہوتے تھے۔ رات کو البتہ فرش پر سوتے۔ فرماتے تھے کہ اس سے تکبر اور کمر کا درد دور ہوتا ہے۔ ہمارے فرنٹیر میں جاڑے میں شوقین لوگ پیال (یا ایک خشک گھاس) پر سوتے ہیں۔ پیال سے رات بھر جنگلوں اور پہاڑوں کی خوشبو آتی رہتی ہے۔ جس آدمی کو جنگل کی خوشبو آتی اور بھاتی ہے وہ کبھی کسی کی غلامی اور محکومی قبول نہیں کرے گا۔

اس دن یعنی اتوار کو لنچ کے بعد ظہر کی نماز ادا کرتے۔ اگر کھانا بدمزہ ہو یا مرچیں زیادہ ہوں تو موڈ بگڑ جاتا۔ نماز قضا کر دیتے۔ فرماتے کہ دل کا حال جاننے والے کے سامنے مجھ سے تو جھوٹ نہیں بولا جاتا۔ کس دل سے بارہ مرتبہ الحمد اللہ کہوں؟ کمرے میں محفل، تکرار و غیبت بدستور گرم رہتی اور وہ تنہا ایک کونے میں جانماز بچھا کر نماز کے لئے کھڑے ہو جاتے۔ مگر کان اسی طرف لگے رہتے۔ دورانِ نماز کوئی شخص آپس میں ایسی بات کہہ دیتا جو خان صاحب کے مزاج یا موقف کے خلاف ہوتی تو فوراً ــــــ ــــــ عین سجدے کی حالت میں ہوں تب بھی ــــــ نیت توڑ کر اسے پشتو میں گالی دیتے اور پھر سے نیت باندھ کر اور اسی طرف کان لگا کر نماز پڑھنے لگتے۔

نماز کے بعد کرتا اتار کر اجلاس فرماتے۔ بیشتر بنیانوں میں بڑے بڑے چھید ہو گئے تھے فرماتے کیا کروں، میرے سائز کا بنیان صرف روس سے اسمگل ہو کے آتا ہے۔ کبھی کبھی لنڈی کوتل میں مل جاتا ہے۔ تو عیش آجاتے ہیں۔ کوئی کوئی بنیان تو اتنا خوبصورت ہوتا ہے کہ کرتے کے اوپر پہننے کو جی چاہتا ہے۔ خان صاحب گہرا سانس لیتے یا ہنسی کا دورہ پڑتا تو چونی برابر سوراخ پھیل کر پنگ پانگ کی گیند کے برابر ہو جاتے۔ ان پھیلتی سکڑتی جھانکیوں میں سے فربہ بدن گھٹتے بڑھتے پھوڑوں کی طرح اُبلا پڑتا تھا۔ کیسی ہی گرمی ہو۔ کرتا اتارنے کے بعد بھی کلاہ نہیں اتارتے تھے۔ فرماتے تھے۔ جب تک کلاہ سر پہ ہے بندہ خود کو ننگا اور بے حیا محسوس نہیں کرتا۔ انگریز اسی لئے تو عورتوں کو دیکھتے ہی ہیٹ اتار دیتے ہیں۔!

ایک رات حاضر باشوں کی بچا بچائی اور لوڈ شیڈنگ کے سبب دس بارہ سواریوں سمیت زمین بوس ہو گئی پانچ چھ منٹ تک خواتین مچھر دانی اور بانوں کے جال سے خود کو آزاد نہ کرا سکے۔ اس کے اندر ہی مچھلیوں کی طرح ایک دوسرے پر اُچھلتے پھدکتے کلبلاتے رہے۔ چار پائی کا ایک پایہ اور پٹی اور ایک کوہاٹی خان کی کلائی ٹوٹ گئی ہے اس کوہاٹی خان نے شکر ادا کیا کہ خدا نے بڑی خیر کی، گھڑی بچ گئی۔ دوسرے دن اورنگ زیب خان نے اپنے کمرے میں چاندنی بچھوا دی اور اپنے بستر کو گول کر کے گاؤ تکیہ بنا لیا۔ یہ چاندنی ان مشاعروں کے لئے مخصوص تھی جو بشارت کے ہاں اتوار کو اتوار بڑی پابندی سے ہوتے تھے۔ خان صاحب بھی دو مشاعروں میں شریک ہوئے۔ شعر میں ذرا بھی ایچ پیچ ہوتا تو پاس بیٹھنے والے سے دریافت فرماتے کہ یہ کہنا کیا چاہتا ہے؟ وہ سرگوشیوں میں مطلب بیان کر دیتا تو باآواز بلند فرماتے، لا حول ولا قوۃ!

پھٹی چاندنی اور اضافت خور

دوسرے مشاعرہ کے بعد خان صاحب نے بڑی حیرت سے پوچھا، کیا یہاں ہر دفعہ یہی ہوتا ہے؟ جواب ملا، اور کیا! بولے خدا کی قسم! اس چاندنی پر اتنا جھوٹ بولا گیا ہے کہ اس پر نماز جائز نہیں! ایسے جھوٹے شاعروں کی میت کو تو حقے کے پانی سے غسل دینا چاہیئے تاکہ قبر میں کم از کم تین دن تک منکر نکیر نہ آئیں۔ چاندنی پر جہاں جہاں شعرائے کرام نے سگریٹ بجھائے تھے۔ وہاں وہاں چھوٹے چھوٹے سوراخ ہو گئے تھے۔ جنہیں بعد میں شکر خورا اور

دادِ سخن کے دوران انگلی ڈال ڈال کر بڑا کیا گیا تھا۔ چاندنی کی جگہ سے پھٹ بھی گئی تھی۔ خان صاحب نے اس پر نماز کا مسئلہ چھیڑا تو مرزا نے ایک اور فتویٰ دیا۔ کہنے لگے، ورنہ دامنِ یوسف پر صرف زلیخا ہی نماز پڑھ سکتی ہے! اس پر خان صاحب بولے کہ زلیخا کے خاوند کے لئے پشتو میں بہت بُرا لفظ ہے۔ خان صاحب کے لئے شاعروں کا اتنا بڑا اجتماع ایک عجوبہ سے کم نہ تھا۔ کہنے لگے اگر قبائلی علاقے میں کسی شخص کے گھر کے سامنے ایسا مجمع لگے تو اس کے دو سبب ہو سکتے ہیں۔ یا تو اس کے چال چلن پر جرگہ بیٹھا ہے۔ یا اس کا والد فوت ہو گیا ہے۔

کبھی کوئی شعر پسند آ جائے۔ گو کہ ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا تھا، تو "دوئی!" کہہ کر فرطِ سرور سے آنکھیں بند کر لیتے اور جھومنے لگتے۔ شاعر وہ شعر مکرر پڑھنے لگتا تو اسے ہاتھ کے درشت اشارے سے روک دیتے کہ اس سے ان کے لطف میں خلل واقع ہوتا تھا۔

ایک دن ایک نوجوان شاعر نے دفتر سے بازپرس کی کہ تم نے میری زمین میں غزل کیوں کہی؟ اس نے کہا، سودا کی زمین ہے۔ تمہارے باپ کی نہیں! اس شاعر پر یہ الزام بھی لگایا کہ وہ اضافت بہت کھاتا ہے۔ اس پر دونوں میں کافی تلخ کلامی ہوئی۔ شروع میں تو خان صاحب کی سمجھ ہی میں نہ آیا کہ جھگڑا کس بات کا ہے۔ اگر زرعی زمین کا تنازعہ ہے تو زبانی کیوں لڑ رہے ہیں؟ ہم نے جب ردیف، قافیئے اور اضافت کا مطلب سمجھایا تو خان صاحب دنگ رہ گئے۔ کہنے لگے "لاحول ولا۔ میں تو جاہل آدمی ہوں۔ میں سمجھا اضافت خورشاید رشوت یا خنزیر کھانے والے کو کہتے ہیں۔ پھر سوچا نہیں۔ باپ کو گالی دی ہے۔ اس پر لڑ رہے ہیں۔ فرضی زمینوں پر جو تم بیزار ہوتے ہم نے آج ہی دیکھی! کیا اپنی اولاد کے لئے یہی زمینیں ترکے میں چھوڑ کے مریں گے کہ برخوردار! ہم تو چلے۔ اب تم ان آبائی مربعوں کی چوکیداری کرنا۔ ان میں قافیوں کی پنیری لگانا اور اضافتوں کا مربا بنا بنا کے کھانا! پشتو میں اس کے لئے بہت بُرا لفظ ہے۔"

نہ ہوئی غالب اگر عمرِ طبیعی نہ سہی

انھیں خوشی کے عالم میں بارہا گاتے، گنگناتے بھی دیکھا۔ لہراتی، گٹکری لیتی آواز میں طنبورے کے تار کا سا کھرج کا ایک اچل (قائم) سُر بھی تھا جو کانوں کو بھلا معلوم ہوتا تھا۔ اپنے زمانے میں ٹنگ ٹکور (+) کے رسیا رہ چکے تھے۔ مطلب یہ کہ اس حد تک موسیقی میں درک کہ بخوبی جانتے تھے کہ خود بے سُرا گاتے ہیں۔ اکثر فرماتے ہیں کہ ہمارے ہاں شرفا میں اچھا گانے کو عیب سمجھا جاتا ہے۔ میں بگاڑ کے گاتا ہوں۔ بے نقص گائیکی کو صرف گویّں، طوائف، مراثی اور لختئ * کے کیس میں قابلِ معافی سمجھتے تھے۔ انھیں بےشمار ٹپے یاد تھے۔ مگر ایک پشتو گیت ان کا فیورٹ تھا۔ جس کا روئے سخن ابرو شب ماہتاب میں خون کرتے تھے۔ اس کا مکھڑا کچھ اس طرح تھا کہ دیکھو دلدارا! میں نے تیری محبت میں رقیب کو ننگی تلوار سے قتل کر ڈالا۔ کانوں پہ ہاتھ رکھ کر "یا قربان!" کے الاپ کے بعد جس والہانہ انداز سے وہ گاتے تھے اس سے تو یہی ٹپکتا تھا کہ موصوف کو جو لذتِ قتل ملی، وصل میں اس کا عشرِ عشیر بھی

(+) ٹنگ ٹکور۔ (پشتو) راگ رنگ۔

* لختئ (پشتو) ناچنے والے خوبصورت لڑکے۔

نہ ملا۔ اس بول کی ادائیگی وہ ایسے پہلوانی جوش اور اعضا دھند ناری سے کرتے کہ شلوار میں ہوا بھر بھر جاتی۔
فرماتے تھے کہ دشمنی اور انتقام کے بغیر مرد کی زندگی بے مقصد، لاحاصل اور مہمل ہو کر رہ جاتی ہے۔ گویا
زیست مہمل ہے اسے اور بھی مہمل نہ بنا

ایک نہ ایک دشمن ضرور ہونا چاہیے۔ اسلئے کہ دشمن نہ ہوگا تو انتقام کس سے لیں گے؟ پھر برسوں منہ اندھیرے ورزش کرنے، بالٹیوں دودھ پینے اور تکئے کے نیچے پستول رکھ کر سونے سے کیا فائدہ؟ سارے آبائی اور قیمتی ہتھیار بے کار ہو جائیں گے۔ نتیجہ یہ کہ شیر دلیر لوگ بلاموت موت کے بجائے دقے اور قے دست میں فوت ہونے لگیں گے۔ اعمر طبیعی تک تو صرف کوّے جیتے ہیں۔ کہتے کہ جب تک آپ کا کوئی بزرگ بے دردی سے قتل نہ ہو، آپ انتقام کی لذت سے واقف نہیں ہو سکتے۔ صرف منگوں ملاؤں، زنانوں، میراثیوں، لاولدوں اور شاعروں کو کوئی قتل نہیں کرتا۔ اگر آپ کا دشمن آپ کو لائقِ قتل نہیں گردانتا تو اس سے زیادہ بے عزتی کی بات نہیں ہو سکتی۔ اس پر تو خون ہو جاتے ہیں۔ ایسا ن سے ایسے بے غیرت آدمی کے لئے پشتو میں بہت برا لفظ ہے۔ دپشتو کا زطرے پہ اوبو کے نہ ددستیدی۔ (پشتو کا پتھر پانی میں نہیں گھستا)

گھوڑا، غلیل اور انکسار

میوں میرا دادا بڑا جلالی تھا۔ اس نے چھ خون کئے۔ اور چھ ہی حج کئے۔ پھر قتل سے توبہ کرلی۔ کہتا تھا اب میں بوڑھا ہو گیا۔ اب مجھ سے بار بار حج نہیں ہوتا۔ وہ پچانوے سال کی عمر میں برضا و رغبت فوت ہوا۔ جب تک آخری دشمن فوت نہیں ہو گیا۔ اس نے خود کو فوت نہیں ہونے دیا۔ کہتا تھا میں کسی دشمن کو اپنے جنازہ کو کندھا نہیں دینے دوں گا۔ میں اپنی نو جوہر کا سہاگ کٹتے دیکھ سکتا ہوں۔ دادا واقعی بڑے ڈیل ڈول اور رعب داب کا آدمی تھا۔ پیدل بھی چلتا تو یوں لگتا جیسے گھوڑے پر آرہا ہے۔ وہ بڑا جہاں دیدہ اور دانا تھا۔ اس وقت وہ مجھے گھوڑے کے ذکر پر یاد آیا۔ وہ تو کہتا تھا کہ سب سے اعلیٰ سواری اپنی ٹانگیں ہیں۔ گھوڑے کی ٹانگوں کا استعمال صرف دو صورتوں میں جائز ہے۔ اول میدانِ جنگ میں دشمن پر تیز رفتاری سے حملہ کرنے کے لئے دوم، حملہ ناکام ہو تو میدان جنگ سے دگنی تیز رفتاری سے بھاگنے کے لئے! مذاق اپنی جگہ میرا دادا تاتاری شہ سواروں کی طرح تیز دوڑتے ہوئے گھوڑے کی زین کو چھوڑ کر اس کی پیٹ کے گرد چکر لگاتا ہوا دوسری طرف سے دوبارہ زین پر بیٹھ جاتا تھا! میرے پاس اس کی تلوار اور ترمیم پیش قبض ہے۔ ان میں وہی فولاد استعمال ہوا ہے جس سے نادر شاہ کی تلوار ڈھالی گئی تھی۔ ہمارے خاندان میں سو سال کے عرصے میں میں پہلا آدمی ہوں۔ جس نے قتل نہیں کیا ـــــ کم از کم اب تک الحمدللہ! میرے تایا نے بھی قتل نہیں کیا تھا۔ اسلئے وہ جوانی میں ہی قتل کر دیا گیا۔"

خان صاحب گھوڑوں سے بے پناہ شغف رکھتے تھے۔ سیاہ گھوڑا ان کی کمزوری تھی۔ بنّوں میں پانچ چھ گھوڑے اصطبل میں بیکار کھڑے کھاتے تھے۔ سب مُشکی۔ کسی کا تحفۃً دیا ہوا ایک اعلیٰ نسل کا سمند، سیاہ زانو (یا دامی رنگ کا گھوڑا جس کی دم اور سیاہ ہوں) بھی تھا۔ لیکن اسے صرف زانو اور دُم کی حد تک پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اکثر فرماتے ہمارے قبیلے میں جس مرد کا نشانہ خطا ہوتا ہو۔ یا جس کے شجرۂ نسب میں صرف مقتولین ہوں، یا جس کو گھوڑا بار بار زمین پر پٹخ دیتا ہو، اس سے نکاح جائز نہیں۔ گھوڑا میں نے ہمیشہ رکھا۔ اسی زمانے میں بھی جب بے انتہا تنگی تھی اور میں بغیر بریک کی سائیکل پر آتا جاتا تھا۔ باہر ایک مُشکی گھوڑا ہنہناتا رہتا تھا" کسی نے پوچھا "اس میں

کون سی تک تھی۔ خان صاحب ؟ فرمایا "اول تو اپنے گاؤں میں گھوڑے پر ٹنگے ٹنگے پھرنا غرور و نخوت کی نشانی سمجھی جاتی تھی۔ دوئم، گھوڑا ضعیف تھا۔ والد صاحب کی آخری نشانی۔ مجھے میرے دادا نے پالا۔ وہ تکبر اور رعونت کے بہت خلاف تھا۔ کہتا تھا ہمیشہ گردن جھکا کر چلو یہی کھرے پختونوں کا شیوہ ہے۔ میری اٹھتی جوانی، گرم خون تھا۔ ایک دن میں سینہ تانے اور گردن کو اتنا اکڑائے کہ صرف آسمان نظر آتا تھا، اس کے سامنے سے گذرا تو اس نے مجھے روک لیا۔ میرے چھوٹے بھائی کے ہاتھ سے غلیل چھین کر اس نے دو شاخے کو میری گدی میں پیچھے سے پھنسا کر گردن اکڑا کے نہیں چلوں گا۔ پھر غلیل گردن کو اتنا جھکایا کہ مجھے اپنی ایڑی نظر آنے لگی۔ میں نے عہد کیا کہ آئندہ کبھی گردن اکڑا کے نہیں چلوں گا۔ پھر غلیل گردن سے علٰحدہ کر کے بھائی کو واپس کرنا چاہی تو دادا نے سختی سے منع کر دیا۔ کہنے لگا اُسے سنبھال کے رکھ لے۔ کام آئے گی۔ بڑھاپے میں اسے دوسری طرف سے استعمال کرنا۔ ٹھوڑی کے نیچے لگا کر گردن کھڑی کر لینا۔ ●●

پاگل عادل آبادی

غزل

آنا اِدھر تھا ان کو اُدھر تو نہیں گئے
پٹری سے بھائی جان اُتر تو نہیں گئے

کیا بات ہے کہ چائے پلاتا نہیں کوئی
شرفاء تمام شہر کے مَر تو نہیں گئے

وعدہ تھا آدھی رات کو ملنے کا شوخ سے
تھی رات کافی ٹھنڈی ٹھٹھر تو نہیں گئے

ڈھکن کھلا ہوا تھا گٹر کا تمام رات
مولانا پی کے اس میں اُتر تو نہیں گئے

آئے تھے کرنے خودکشی واپس چلے گئے
دریا پہ پیرکیو کو دیکھ کے ڈر تو نہیں گئے

کہنے لگا ہے مجھکو چچا وہ جو آج - کل
کیا بات ہے چچا ترے مَر تو نہیں گئے

بھیجا تھا ان کو میں نے حفاظت کے واسطے
یہ بیل کھیت آپ کا چَر تو نہیں گئے

سب لوگ ٹھیک ٹھاک ہیں سسرال میں کہو
صورت کو تیری دیکھ کے ڈر تو نہیں گئے

بیٹی وہ دینے ہو گئے تیار کیا کہا
پاگل کا نام سن کے مُکر تو نہیں گئے

★

زیرِ لب (منتخب اشعار)

اس عنوان کے تحت ہر مہینہ قارئین کی پسند کے اشعار
شائع کیے جائیں گے۔ (ادارہ)

مرسلہ:
فرحانہ معز (ریاض)

○

اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں
نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے
الکشن، ممبری کونسل صدارت
بنائے خوب آزادی نے پھندے
میاں نجار بھی چھیلے گئے ساتھ
نہایت تیز ہیں یورپ کے رندے
(اقبالؔ)

○

مرسلہ: شکیل فاروق - حیدرآباد

یاد ہونے تو تکیے میں گجرے کی باس ؎ جیسے کیوڑے کا کانٹا کلیجے کے پاس
(سلیمان خطیب)

○

مرسلہ: واصف علی خاں - بمبئی

کمر خمیدہ نہیں بے سبب ضعیفی میں
زمین ڈھونڈ رہے ہیں مزار کے قابل
(دردؔ)

○

مرسلہ: ذی شان (حیدرآباد)

قد کسی بونے کا مجھ سے بھی بڑا ہو جائے گا ؎ جب مرے کاندھے پہ وہ سیدھا کھڑا ہو جائے گا
(طالب خوندمیری)

○

مرسلہ: سید علی (گلبرگہ)

مصرع یہ کہہ کے میر تقی میر مر گئے
اب کے بھی دن بہار کے یوں ہی گزر گئے
(شاہد صدیقی)

○

مرسلہ: محمود علی (حیدرآباد)

عاشق کا ترے ہجر میں یہ حال ہوا ہے ؎ بیٹھا ہے تو بیٹھا ہے کھڑا ہے تو کھڑا ہے
(خواجہ میر دردؔ)

○

مرسلہ: محمد یعقوب، چنچل گوڑہ، حیدرآباد

پڑوسی میرا شرارت پہ جو اتر آیا ؎ میں ایک دن اسے چنچل گوڑہ دکھا دوں گا
(اسمٰعیل ظریف)

○

مرسلہ: محمد مجاہد، رین بازار (حیدرآباد)

میں کھٹ سے ٹارزن کی طرح اُڑ کے آؤں گا
مُنّے کے ابّا کہہ کے صدا دیجیے مجھے
(ظہیر قدسی مالیگانوی)

مشتاق احمد یوسفی

سے

شیخ رحمٰن اکولوی کی بات چیت

(سوالات جوابات مشتاق احمد یوسفی کی کتابوں سے اخذ کیے گئے ہیں)

س :۔ آپ کب اور کہاں پیدا ہوئے ؟

ج :۔ یکم محرم کو ستوا لنا (ٹونک) راجستھان میں۔

س :۔ کیا اپنی تعلیم و تربیت اور خاندانی حالات پر روشنی ڈالنا پسند فرمائیں گے ؟

ج :۔ آبائی مسکن جے پور، تعلیم جے پور، آگرے اور علی گڑھ میں ہوئی اور عمر عزیز کا بیشتر حصہ کراچی میں گزرا۔ اس صدی کی تیسری دہائی میں ایک خاتون نے جو اردو میں معمولی شدبد رکھتی تھیں اس زمانے کے مقبول عام ناول "شوکت آرا بیگم" پڑھا جس کی ہیروئن کا نام شوکت آرا اور معاون کردار کا نام فردوس تھا۔ ان کے جب بیٹیاں ہوئیں تو دونوں کے یہی نام رکھے گئے۔ ایک کردار کا نام ادریس اور دوسرے خدائی خوار کا اچھن تھا، یہ دونوں انھوں نے اپنے چھوٹے بیٹے کو بطور نام اور عرفیت بخش دیے۔ بیچے کل چار دستیاب تھے جب کہ ناول میں ہیرو کو چھوڑ کر ابھی ایک اہم کردار پیارے میاں نامی ولن باقی رہ گیا تھا چنانچہ ان دونوں اور دوہرے رول کا بوجھ بڑے بیٹے ہی کو اٹھانا پڑا، جس کا نام ہیرو کے نام پر مشتاق احمد رکھا گیا۔ یہ سادہ لوح خاتون میری ماں تھی۔ بحمداللہ! ناول کی پوری کاسٹ، باستثنائے شوکت آرا جس کا طفولیت میں ہی انتقال ہو گیا تھا۔ زندہ و سلامت ہے۔ والدہ کی بڑی خواہش تھی کہ میں ڈاکٹر بنوں اور عرب جا کر بدوؤں کا مفت علاج کروں، اس لیے کہ ناول کے ہیرو نے یہی کیا تھا۔ مولا کا بڑا کرم ہے کہ ڈاکٹر نہ بن سکا ورنہ اتنی خراب صحت رکھنے والے ڈاکٹر کے پاس کون پھٹکتا۔ البتہ ادھر دو سال سے مجھے بھی سعودی عرب، بحرین، قطر، عمان اور عرب امارات کی خاک نہیں تیل چھاننے اور شیوخ کی خدمت کی سعادت نصیب ہوتی رہی ہے۔

والد ریاست ٹونک میں پولیٹیکل سکریٹری رہ چکے تھے۔ ریاستی خو بو سے مبرّا پابند شرع، سادہ دل مسلمان تھے، کہنے بے علم نہ تھے۔ جے پور کے پہلے مقامی مسلمان تھے جس نے ۱۹۱۴ء میں بی اے کیا۔ اچھی طرح یاد ہے جو ٹونک میں بڑے کنوئیں کے سامنے ہماری لق و دق حویلی میں ہر بائی نس حافظ سر ابراہیم علی خاں

والی ریاست کے درجنوں لوٹ نشنگ تھے، انھوں نے ہر ایک کی ناک چاقو سے چھیل دی تھی، اس لیے کہ ان کا عقیدہ تھا کہ شبیہ مکمل ہو تو گھر میں فرشتے نہیں آتے ...... یہ پور میونسپلٹی کے چیرمن اسٹیٹ مسلم لیگ اور دیگر مسلم تعلیمی اور ثقافتی اداروں کے صدر اور اسمبلی کی حزب اختلاف کے لیڈر رہ چکے تھے۔ اسمبلی ہی میں سقوط حیدرآباد پر پاکستان کی حمایت میں تقریر کرنے پر انھیں ہندوستان چھوڑنا پڑا.... پاکستان آنے لگے تو پوسٹ آفس سیونگ بنک اکاونٹ میں ساڑھے چار ہزار روپے چھوڑ آئے تھے جو ان کے حساب سے بیس سال کے سود کی رقم بنتی تھی۔ وہ کسی ایسے مسلمان کے ہاں دعوت کھانا تو بڑی بات ہے پانی پینا حرام سمجھتے تھے جس کے متعلق انھیں معلوم ہو کہ وہ اپنے اکاونٹ پر سود لیتا ہے ـــــــ ۲۶ جون ۱۹۵۰ء کو روزے کی حالت میں تشنہ آدم میں اچانک دل کا دورہ پڑا اور وہ بے ہوش ہو گئے۔ کسی عطائی نے نہ جانے کیا سمجھ کر کونین کا انجکشن لگا دیا اور وہ آن کی آن میں سارے بکھیڑوں، بندھنوں سے آزاد ہو گئے۔ سادہ دل بے یار، پابند شرع، فقیر منش اور زبان کے کھرے تھے۔ دل کی بات زبان پر لانے میں انھیں ذرا بھی نہیں سوچنا پڑتا تھا۔ موروثی جائیداد اپنے چھوٹے بھائی کے حق میں دستبردار ہو گئے تھے ـــــــ انتقال سے کچھ دن پہلے وہ چند گھنٹوں کے لیے کراچی آئے تو ٹاٹ کے تھیلے میں اپنا کھانا ساتھ لائے کہ تنگ حوصلہ بیٹے نے جو رزق تلاش کیا اس میں سود کی آمیزش تھی۔

س :۔ بنکنگ کو بطور کیریر آپ نے خود چنا یا اتفاقاً آپ اس سے جڑ گئے؟

ج :۔ بچپن میں ہم کبھی کیریر کے بارے میں سنجیدگی سے سوچتے تھے تو انجن ڈرائیوری کے سامنے بادشاہی بھی ہیچ معلوم ہوتی تھی ـــــــ ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ سود جسے حرام ٹھہرایا گیا ہے اور رہا جس کی حرمت میں ہمیں آج بھی شمہ برابر شبہ نہیں، ہمارا ذریعہ معاش ہی نہیں بلکہ ہر اعتبار سے غالب و کار آفریں، کارکشا و کارساز ثابت ہوگا۔

س :۔ سماج میں مزاح نگار کو کس نظر سے دیکھا جاتا ہے؟

ج :۔ قدیم زمانے میں چین میں دستور تھا کہ جس شخص کا مذاق اڑانا مقصود ہوتا، اس کی ناک پر سفیدی پوت دیتے تھے۔ پھر وہ دکھیا کتنی ہی گمبھیر بات کہتا، کلاؤن CLOWN ہی لگتا تھا۔ کم و بیش یہی حشر مزاح نگار کا ہوتا ہے۔ وہ اپنی فولس کیپ اتار پھینک بھی دے تو لوگ اسے جھاڑ پونچھ کر دوبارہ پہنا دیتے ہیں۔

س :۔ زندگی میں مزاح کی اہمیت؟

ج :۔ مزاح نگار کو جو کچھ کہنا ہوتا ہے وہ ہنسی ہنسی میں اس طرح کہا جاتا ہے کہ سننے والے کو بہت بعد میں خبر ہوتی ہے۔ میں نے کبھی کسی پختہ کار مولوی یا مزاح نگار کو محض تقریر و تحریر کی پاداش میں جیل جاتے نہیں دیکھا۔ مزاح کی میٹھی مار بھی شوخ آنکھ پُرکار عورت اور دلیر سٹے کی طرح کبھی خالی نہیں جاتی۔

س :۔ کہتے ہیں مزاح نگار قنوطیت پسند ہوتا ہے؟ آپ کا کیا خیال ہے؟

ج :۔ قنوطیت غالباً مزاح نگاروں کا مقدر ہے۔ مزاح نگاری کے باوا آدم ڈین سوفٹ پر دیوانگی کے دورے پڑتے تھے اور اس کی یاس پسندی کا یہ عالم تھا کہ اپنی پیدائش کو ایک المیہ سمجھتا تھا چنانچہ اپنی سالگرہ

کے دن بڑے التزام سے سیاہ ماتمی لباس پہنتا اور فاقہ کرتا تھا۔ مارک ٹوین پر بھی آخر عمر میں کلبیت طاری ہو گئی تھی۔

س:۔ مزاح کی کسوٹی؟

ج:۔ مزاح جو سوچ، سچائی اور دانائی سے عاری ہے دریدہ دہنی، پھکڑپن اور ٹھٹھول سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ زر، زن، زمین اور زبان کی دنیا یک رخوں، یک چشموں کی دنیا ہے مگر تتلی کی سینکڑوں آنکھیں ہوتی ہیں اور وہ ان سب کی مجموعی مدد سے دیکھتی ہے۔ شگفتہ نگار بھی اپنے پورے وجود سے سب کچھ دیکھتا، سنتا، سہتا اور سہارتا چلا جاتا ہے اور فضا میں اپنے سارے رنگ بکھیر کے کسی نئے افق، کسی اور شفق کی تلاش میں گم ہو جاتا ہے۔

س:۔ فن پارہ کی تخلیق کے محرکات؟

ج:۔ کوئی لکھنے والا اپنے لوگوں ہم عصروں، ہمدموں، ملکی ماحول و مسائل لوک روایت اور کلچر سے کٹ کر کبھی کوئی زندہ اور تجربے کی دہکتی کٹھالی سے نکلا ہوا فن پارہ تخلیق نہیں کر سکتا۔

س:۔ آپ موضوع کو ٹریٹ TREAT کرتے ہیں یا موضوع آپ کو ٹریٹ کرتا ہے؟

ج:۔ موضوع یا تجربہ اپنا پیرایہ اور لہجہ متعین کرتے چلے جاتے ہیں۔ اقبال، خدا کے حضور مسلمانوں کا شکوہ اپنے استاد فصیح الملک داغ دہلوی کی تھرے چونچلے کرتی زبان میں نہیں لکھ سکتے تھے۔ رسوا کی امراؤ جان ادا اور طوائفوں سے متعلق منٹو کے افسانوں کا ترجمہ اگر مولانا ابوالکلام آزاد کی جناتی زبان میں کر کے انھیں (طوائفوں) کو بالجبر سنایا جائے تو مجھے یقین ہے کہ ایک ہی صفحہ سن کر کان پکڑ لیں اور اپنے دھندے سے تائب ہو جائیں۔

س:۔ آپ کے خیال میں عصرِ حاضر کا سب سے بڑا مزاح نگار کون ہے؟ اس کے فن سے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

ج:۔ ہمارے دور کے سب سے بڑے مزاح نگار ابنِ انشا کے بارے میں کہیں عرض کر چکا ہوں کہ بچھو کا کاٹا روتا ہے، سانپ کا کاٹا سوتا ہے۔ انشا جی کا کاٹا سوتے میں مسکراتا بھی ہے۔

س:۔ پسندیدہ رنگ؟ پسندیدہ خوشبو؟ پسندیدہ راگ؟ پسندیدہ حسن وغیرہ وغیرہ؟

ج:۔ سبھی رنگ پسند ہیں ــــ نوٹ کے رنگ بدلتے رہتے ہیں۔

تیز مہکار نہیں بھاتی ــــ رات کی رانیاں ــــ دونوں قسم کی ــــ دور کسی اور کے آنگن کا سے مہک دیتی ہے اچھی لگتی ہے۔

پکے راگ راگنیوں میں صرف بھیرویں پسند ہے۔ اس لیے کہ محفلِ موسیقی کے آدابِ برخاست کے مطابق اس کے بعد کوئی اور راگ نہیں گایا جاتا۔

جہاں تک حسن کا تعلق ہے وغیرہ وغیرہ پسند ہے۔

س:۔ زندگی کا کوئی ناقابلِ فراموش واقعہ ہے؟

ج : بچپن کی بات ہے۔ شاید اسی لیے اچھی طرح یاد ہے۔ پورے قصبے چاکسو (خورد) میں تجارت وجارت تو بڑی بات ہے کسی مسلمان پنساری کی دوکان نہیں تھی۔ ۱۹۳۳ء میں چند مسلمانوں نے قرض حسنہ اور چندہ جمع کرکے سرمایہ فراہم کیا اور صولت یار خاں ریٹائرڈ سب انسپکٹر پولیس کو مسلمانوں کے محلّے میں پرچون کی دکان کھلوادی۔ صولت یار خاں کو منافع سے تو دل چسپی تھی لیکن حساب کتاب کو وہ مکروہ گردانتے تھے۔ جو چیز جتنی بکتی اس کی قیمت اسی بوری یا کنستر پر سارے دن پڑی رہتی تاکہ حساب میں آسانی ہو۔۔۔ شام کو ہر جنس کی بکری علاحدہ علاحدہ گنتے۔ روکڑ کی میزان نہیں بیٹھتی تو دل نہیں جلاتے تھے۔ بہی کھاتوں میں ایک نئی "مد" بھول چوک لینی کھول لی تھی روزانہ کیش میں جو کمی واقع ہوتی وہ اسی کے متھے مارتے۔ ہوتے ہوتے اس مد میں کافی رقم چڑھ گئی جو تقریباً اصل سرمایے کے برابر تھی۔ شب برات کی صبح مرزا عبدالودود بیگ جن کی عمر اس وقت سات سال ہوگی، ٹکے پیسے کی زعفران لینے گئے۔ زعفران کی پڑیا لے کر انھوں نے صولت یار خاں کو ایک کلدار روپیہ تھمادیا۔ اتفاق سے زعفران کی ابھی بوہنی نہیں ہوئی تھی اور اس کے ڈبے پر ریزگاری نہیں تھی۔ صولت یار خاں نے بندھی بندھائی پڑیا مرزا کے ہاتھ سے چھین کر کہا "ہشت! ہمارے پاس ریزگاری نہیں۔ گوبند بنیے کی دکان سے خرید لے۔" مرزا نے انگلی سے ریزگاری کے ان ڈھیروں کی طرف اشارہ کیا جو تقریباً ہر بوری اور کنستر پر پڑے تھے۔ ارے صاحب وہ تو آپے سے باہر ہوگئے، دھمکی آمیز انداز میں دو سیری اٹھاتے ہوئے بولے "مرغی کے! دوسری ڈھیری میں سے ریزگاری نکال کر تجھے دے دوں تو شام کو حساب کون کرے گا؟ تیرا باپ؟"

عباس متقی (حیدرآباد)

دفترِ شگوفہ

مرزا غالب کے ذہن میں یقیناً "دفترِ شگوفہ" جیسا کوئی مقام تھا جس کی تمنا میں انہوں نے یہ شعر کہا ہوگا۔ دیکھیے اگر دہلی کی تنگ گلیوں میں حجرۂ دگاہ جیسی کوئی ایک عمارت بھی ہوتی تو شاید مرزا اس طفلانہ خواہش سے مزید باز رہتے بلکہ اتنی بلندی پر سکونت کے نتائج و عواقب سے نبرد آزمائی کے بعد دوسروں کو بھی اس خواہش سے باز رکھتے۔ کبھی کبھی ہم سوچتے ہیں کہ آخر شگوفہ کا دفتر اس قدر بلندی پر کیوں قائم ہے۔ کیوں وہ دبیر پورہ جیسے خاموش محلہ کی کسی پرسکون گلی کے کشادہ مکان میں نہیں ہے اس کا ایک فائدہ تو یہ ہوتا کہ ہم اٹھتے بیٹھتے بلکہ کھیلتے کودتے دفتر چلے آتے اور خوب خوب شگوفے کھلاتے یا پھر کھلتے ہوئے دیکھتے۔ دوسرے یہ کہ مزاح نگاروں کو اتنی بلندی پر چڑھ کر مزید برآں اتر کر موضوعِ مزاح بننا نہیں پڑتا۔ اب تو یہ عالم ہے کہ جب کوئی مزاحیہ مضمون تیار ہو جاتا ہے تو اس کے بعد دو انتہائی پُر اور صبر آزما بلکہ حوصلہ شکن مرحلے سامنے منتظر رہتے ہیں۔ پہلا اس مضمون کی صاف نویسی دوسرے "حجرۂ دگاہ" کی تیسری منزل تک اس کو بہ نفسِ نفیس پہنچانا پہلا کام دوسرے کام سے زیادہ پیچیدہ تو دوسرا کام پہلے کام سے زیادہ تکلیف دہ۔ اپنے مضامین بارِ دیگر پڑھنا ہی ایک بور کام ہے پڑھتے ہوئے خطِ شکستہ یہ نستعلیق میں لکھنا گویا اس کو برداشت کرنے کے مترادف ہے۔ تعجب ہوتا ہے کہ جن مضامین کو ہم خود پڑھنے سے اس درجہ کتراتے بلکہ مہینوں گریز کرتے ہیں ہمارے احباب کیوں کر پڑھ لیتے ہیں بہر حال ہر دو کاموں سے نبرد آزمائی ضروری ہے کیا کریں مجبوری ہی کا تو دوسرا نام "شگوفہ" ہے۔

ہم کہ بیسویں صدی کے اواخر کی گیس آلود ہوائیں سانس لیتے ہیں دواؤں کا اُگا اناج کھاتے ہیں اور اس اناج کے طفیل خوب سرکاری اور خانگی دوائیں کھاتے ہیں شاید کچھ واجبی واجبی سے ہو گئے ہیں۔ پطرس کی چھوڑی ہوئی سیکل پر ہم کے پینڈل مارتے ہوئے بجلی کوارٹرس پہنچتے ہیں تو پھر سے بجلی ہو جانے کو جی چاہتا ہے۔ اگر ہم واقعی بجلی ہوتے تو حجرۂ دگاہ آتے ہی اوپر چڑھ جاتے اور اب یہ عالم ہے کہ سیکل کو اسٹانڈ کر کے سیٹ پر دونوں کہنیاں ٹیکے قدرے توقف کرنا پڑتا ہے تاکہ پانچ کلومیٹر کی سیکل رانی کی تھکن اور بہتا ہوا پسینہ دونوں اعتدال پر پہنچیں۔ جب دو چار منٹ گزرتے ہیں تو "ہلا" سر کرنے کی آرزو میں ہم سر اٹھا کر ایکبار منزلِ مقصود کی جانب دیکھ لیتے ہیں کہ آیا دفترِ شگوفہ بند تو نہیں۔ کمزور آدمی کو بہت غصہ جلد آتا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم قسطوں میں شگوفہ پہنچیں اور وہ بے وجہ ہی سہی بند ہو اور ہم غم اور غصہ کی تاب نہ لاکر ہم میں سے

نیچے چھلانگ لگادیں اور دو ایک کو ساتھ لیے بہت اوپر پہنچ جائیں۔ کبھی ایسا بھی ہوا کہ مجرد گاہ کی دوسری منزل کا کواڑ کھلا ہوا تھا جس پر شگوفہ کا گمان ہوا اوپر پہنچے تو تھا ہی شگوفہ کھلا۔ جب نیچے سے کافی غور کیا اور یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچی کہ واقعی دفتر شگوفہ بند نہیں تو باقی ماندہ ہمت کو یکجا کیا۔ دھیرے دھیرے اوپر پہنچنے کی کوشش کرنے لگے۔ نواب میر عثمان علیخاں والیٔ دکن نہایت فراخ دل حکمراں تھے۔ انہوں نے اس دور کے غیر شادی شدہ نوجوانوں ہی کے لیے اس قدر بلند عمارت تعمیر کروائی کیوں کہ اس زمانے کے غیر شادی شدہ واقعی مجرد ہوتے تھے۔ جنکی رگوں میں دوڑتا ہوا گرم خون اس بات کا متقاضی بھی تھا کہ ع "کچھ تو ورزش اسے جوانی چاہیے" اور وہ لوگ یقین ہے کہ ایک ہی جست میں مجرد گاہ سر کر لیتے۔ ہمارا خیال ہے کہ اب اس مجرد گاہ میں کوئی مجرد نہیں سبھی متاہل ملیں گے تو کیوں نہ اس کا نام مجرد گاہ سے "متاہل گاہ" کر دیا جاتے۔ کاش والیٔ دکن مجرد گاہ کی طرز پر اگر "مطلق گاہ" کی تعمیر بھی فرما دیتے تو یقین ہے کہ "دفتر شگوفہ" ہمیں نیچے ہی ملتا اور ہمیں بادلِ ناخواستہ بار بار ٹینزنگ بننا نہ پڑتا۔ الغرض جب پہلی منزل ختم ہوتی ہے تو بھارت نیوز میں دم لیتے ہیں دوسری منزل ختم ہوتی ہے تو "فائن آرٹس اکاڈیمی" کے دفتر میں سہارا لیتے ہیں اور تیسری منزل ختم ہوتی ہے تو خوشی سے اس اختتامی دروازہ کو دیکھ لیتے ہیں جو ایک مدت سے بند تالے کے ساتھ پہرہ دے رہا ہے۔ تیسری منزل ختم ہوتے ہی ہم دفتر شگوفہ نہیں پہنچتے۔ مدیر موصوف سے بات چیت بھی کرنی ہے اور بات چیت کے لیے الفاظ کے علاوہ معتدل اور موزوں تنفس بھی چاہیے اور تیسری منزل پر جانے والا اگر صحت مند بھی ہو تو ضیق تنفس کا شکار ہو جاتا ہے۔ لہٰذا کچھ وقت اترتی چڑھتی گڑبڑ کرتی سانس کو درست کرنے میں لگ جاتا ہے اور پھر دھیرے دھیرے دیوار سے لگے ہوئے' دیوار سے لگے ہوئے اس لیے کہ دوسری جانب جو کبھی ریلنگ بنائی گئی تھی وہ اب ضعیف کی بتیسی ہو گئی ہے ہمیں ڈر لگا رہتا ہے کہ اگر ہم ادھر جائیں گے تو جان سے جائیں گے۔ بہر حال دفتر شگوفہ پہنچتے ہیں۔ داخل دفتر ہوتے ہوئے ہم دعا کرتے ہیں کہ کوئی خالی کرسی جو قدرے آرام دہ بھی ہو نصیب ہو جائے۔ دفتر شگوفہ میں تین قسم کی کرسیاں پائی جاتی ہیں۔ ایک فرسٹ کلاس کرسی جو ہمیشہ مدیر شگوفہ کے قبضے میں رہتی ہے جس پر مدیر موصوف کے علاوہ کوئی اور نہیں بیٹھ سکتا خواہ مدیر شگوفہ غیر حاضر ہی کیوں نہ ہوں۔ دوسری سکنڈ کلاس کرسیاں جن پر پہلے آنے والے قابض ہو جاتے ہیں اور اکثر دفتر کے بند ہونے تک ان کرسیوں کو مقبوضہ کے علاوہ مکفولہ و مملوکہ تک سمجھتے ہیں۔ یہ کرسیاں نہایت آرام دہ ہیں اس پر بیٹھنے کے بعد واقعی بیٹھنے کا احساس بھی ہوتا ہے۔ سکنڈ کلاس کرسیوں میں ایک کرسی میں قدرے گڑھا سا پیدا ہو گیا ہے۔ بعد میں پتہ چلا کہ یہ عموماً کس کے قبضے میں رہا کرتی ہے۔ تیسری' درجہ سوم کی کرسیاں جو عموماً اردو کے ادبی اجلاس میں بچھائی جاتی ہیں جس پر آدمی تو بیٹھ سکتا ہے لیکن بیٹھنے کے بعد بیٹھنے کا احساس نہیں پا سکتا۔ بلکہ بعض وقت تو ان کرسیوں پر بیٹھ کر ہم سوچتے ہیں کہ ہم کرسی پر بیٹھے ہیں یا کرسی بیٹھے ہیں؟ ویسے دنیا جانتی ہے کہ ہم عرصے اکتفا کے مارے ہوئے ہیں۔ جو کرسی مل جاتی ہے اسے ہی تخت طاؤس سمجھ لیتے ہیں اور داغ کی طرح جمے رہتے ہیں۔ اس دوران اگر سکنڈ کلاس کرسی خالی بھی ہو جاتی ہے تو ہم نیت خراب نہیں کرتے۔ شریف آدمی ہیں۔ کاش یہ شرافت زندگی کے دوسرے معاملات میں بھی کارفرما ہو تو ہم خود کو صاحب کردار گردانیں۔

کمال ہے! مصطفےٰ کمال صاحب کے مختصر سے دفتر میں عصر اور مغرب کی نماز تک با جماعت ہوتی ہیں یہ اور بات ہے کہ اس کے لیے بعض چیزوں کو ان کے محور سے ہٹانا پڑتا ہے۔ یہ عموماً اس وقت ہوتا ہے جب مضطر مجاز

یا رؤف خیر جیسی شخصیتیں وہاں موجود ہوتی ہیں۔ مضطر مجاز حقیقت آشنا ادیب اور رؤف خیر خیر سے متدین شاعر۔ جماعت کھڑی ہوتی ہے تو کچھ حضرات احتراماً دفتر سے باہر چلے جاتے ہیں۔ ویسے فقہی مسئلہ ہے نابالغوں پر نماز معاف ہے۔ نماز کی امامت متقی جیسے حضرات فرماتے ہیں اور بعد نماز شگوفہ اور اہل شگوفہ کی دن دونی رات چوگنی ترقی کے لیے دعا کرتے ہیں۔ مدیر شگوفہ سے ہماری خواہش ہے کہ ایک آدھ مصلیٰ کا انتظام فرمادیں کہ ہم خرما و ہم ثواب ہے۔

ہمارے ایک دوست جو خوش حالی کے سبب کافی موٹے اور بدپرہیزی کے سبب صاحب تو ند بھی ہوگئے تھے ہم سے اپنے موٹاپے کی شکایت کی اور کہا کہ کسی علاج کی جانب رہنمائی فرمائیں۔ ہم نے مشورہ دیا کہ آپ مزاح نگاری کریں تو انھوں نے جواب دیا کہ وہ خود موضوع مزاح ہیں مزاح نگاری کیا کریں۔ ہم نے کہا کہ بس آئینہ دیکھیں اور اپنا خاکہ بیان کریں۔ آپ کو اپنے مضامین کی اشاعت کے لیے یقیناً شگوفہ آنا پڑے گا۔ اور دفتر شگوفہ آنے والا کوئی فرد موٹا نہیں رہ سکتا ہاں! پرویز یداللہ مہدی جیسی شخصیتیں اس کلیہ سے مستثنیٰ قرار پاتی ہیں۔ ہماری ترکیب ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔

اس دفتر تبسم میں ایک باریش بزرگ بھی اکثر دکھائی دیتے ہیں۔ اگر دفتر شگوفہ کوئی مملکت قرار پاتی تو وہ اس مملکت کے وزیر ہوتے۔ نہایت پر مزاح شخصیت واقع ہوئے ہیں۔ دفتر جائیں اور ان سے ملاقات نہ ہو تو کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم کسی مشہور ریسٹوران میں داخل ہوئے لیکن چائے نہیں پی۔ جب وہ ترنم سے قہقہہ لگاتے ہیں تو قہقہہ کے ختم ہونے کا انتظار کرنا پڑتا۔ جب نماز کی اقامت کہہ دی جائے تو ہمارا دل چاہتا کہ انھیں زبردستی داڑھی کے جرمانے میں کے طور پر جائے نماز پر ہی نہیں جائے امام پر کھڑا کر دیا جائے۔ لیکن خدا جانے انھیں انکار کیوں ہے۔ شائد سائیڈ سے چلنے کے وہ عادی ہوگئے ہیں۔

جب ہم نے پہلی دفعہ مدیر شگوفہ کو دیکھا تو نظر بھر کر اس ڈر سے نہیں دیکھا کہ کہیں نظر نہ لگ جائے۔ کلین شیو خوش پوشاک، خوش نصیب، شیریں گفتار، ہنس مکھ اور زندہ دل، ایسا لگتا ہے کہ شگوفہ کے اتار چڑھاؤ نے اور دفتر شگوفہ تک عروج و نزول نے انھیں ہر جہت سے متحرک اور فعال شخصیت کا حامل بنا دیا ہے۔ وہ مجرد گاہ کو پل بھر میں طے کرنے کے گویا عادی ہوگئے ہیں۔ اگر پنڈت جواہر لعل نہرو انھیں عالم عروج و نزول میں دیکھتے تو اہرام مصر میں کہا ہوا اپنا ریمارک واپس لے لیتے۔ وہ مقابلتاً ہم سے تیز چڑھتے ہی نہیں اترتے بھی ہیں۔ نہایت شریف آدمی ہیں۔ ہمیں بہت پسند کرتے ہیں اور پسند آتے ہیں۔ موصوف صاحب کمال ہیں۔ نہ جانے بہ یک وقت وہ کیا کیا کرتے ہیں اور کہاں کہاں دیکھے جاتے ہیں۔ اگر ان کے پرچے کا نام شگوفہ ہے تو وہ خود معمہ سے کم نہیں۔

دفتر شگوفہ میں ایک اور حضرت سے میری ملاقات ہوئی ہے جسے سب غالب ثانی کے نام سے واقف ہیں اور تخلص ثانی کہلائے جانے کے امیدوار ہیں۔ عقل مند آدمی ہیں لیکن پتہ نہیں انھوں نے کیوں عقد ثانی کے لیے بیگم اول کے داغ مفارقت کو سہہ لیا۔ کاتبوں (خوش نویسوں) کو ویسے اولاد زیادہ ہوتی ہے۔ انھیں [illegible] تعداد کافی سے زیادہ ہے۔ ہم [illegible] کے عہد سے شاداں اور وہ ہمارے خط سے نالاں، ہم ان کو [illegible] اور [illegible] کو قبول [illegible] ہیں [illegible] اگر ایسا نہ کیا جائے تو ہمارا لکھا پڑھا تو سمجھنے کا سمجھا نہ جائے گا۔ ایک دن کہنے لگے آپ [illegible] نہ کریں خدا نے سن درست کرلیں۔ ہم نے فوراً صاد (ص) کر دیا۔ مدیر شگوفہ کا کہا ہمارا عقیدہ ہے [illegible]

غالب ثانی کے بغیر بہت سے کام بند ہیں

دفتر شگوفہ کی ہر چیز نہ صرف دیکھنے کے لائق بلکہ پڑھنے کے لائق ہوتی ہے۔ بعض چیزیں ایسی ہیں جنھیں دیکھ کر ہمیں اپنی گزری جوانی یاد آتی ہے تو بعض چیزیں ایسی ہیں جنھیں دیکھ کر ہمیں اپنا قریب آتا ہوا بڑھاپا یاد آتا ہے۔ کچھ خوب صورت مرقعے ہیں جو زندگی کی رعنائیوں کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ دفتر شگوفہ میں، مختلف النوع حضرات تشریف لے آتے ہیں۔ زبان و بیان، رنگ و نسل، فکر و خیال، تعلیم و تربیت جدا جدا لیکن سب کے سب زندہ دل، روشن دماغ اور کشادہ نظر، کوئی ادیب تو کوئی شاعر، کوئی تنقید نگار تو کوئی تبصرہ نگار، کوئی مزاح نگار تو کوئی مزاح کار، کوئی معلم تو کوئی متعلم، کوئی محقق تو کوئی افسانہ نویس۔ یہیں سبھوں سے مل کر بہت خوشی ہوتی ہے۔ سب کے سب مسرت کی منزل کے متحرک کاروان میں قہقہوں کے سامان لیے زندہ دلی کے ساتھ رواں دواں۔ خدا کرے یہ کاروان یوں ہی چلتا رہے۔ شگوفہ اور اہل شگوفہ یوں ہی ہنستے، مسکراتے، تبسم بکھیرتے اور قہقہے بانٹتے آگے کی جانب بڑھتے رہیں۔

غزل

(روح شاد عظیم آبادی سے معذرت کے ساتھ)

کہاں اٹھا ہوں خود محفل سے ان کی
پکڑ کر کان اٹھوایا گیا ہوں

نکل بھاگا ہوں منزل سے بھی آگے
کچھ اتنا تیز دوڑایا گیا ہوں

بہت مشکل ہے اب رسّی تڑانا
بہت ہی کس کے بندھوایا گیا ہوں

مگر آنگن ہے میرا یہ جیل خانہ
یہاں میں بار ہا آیا گیا ہوں

عجب دادِ وفا مجھ کو ملی ہے
میاں باٹے سے پٹوایا گیا ہوں

محبوب راہی مانھوی (بلاسپور)

میر حسین علی امام
(کراچی)

سے ہاضمہ

ایک دن ہمارے ایک جاننے والے شخص نے ہم سے دریافت کیا کہ آج کل آپ کی کیا مصروفیات ہیں؟ ہم نے عرض کیا کہ دانشور بن رہے ہیں! وہ صاحب حیران رہ گئے اور مزید حیرت سے دریافت کیا۔ آپ کو کس طرح پتہ چلتا ہے کہ آپ دانشور بن رہے ہیں؟ ہم نے اطمینان سے کسی اور دانشور کا یہ مقولہ سنایا کہ جب کسی کا ہاضمہ خراب ہونے لگے تو سمجھ لو کہ وہ دانشور ہونے لگا ہے پس آج کل ہمارا ہاضمہ خراب ہے اس لیے سمجھ لیں کہ ہم دانشور بن گئے ہیں۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ فکر اور پریشانیاں ہاضمہ پر ناخوشگوار اثرات مرتب کرتی ہے اس لیے ایسے افراد جو بہت سوچ و بچار کرتے ہیں ان کا ہاضمہ عموماً خراب رہتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ادیب کا ہاضمہ کیوں خراب رہتا ہے اور سیاستداں کا کیوں نہیں؟ جبکہ فکر میں دونوں غلطاں رہتے ہیں ادیب انسانیت اور سماج کی فکر (ڈہ) میں اپنا ہاضمہ خراب یا چوپٹ کر لیتا ہے لیکن سیاست داں صرف کاغذی فکر یعنی پریس اور اسمبلی میں بیان دینے کی حد تک فکر کرتے ہیں اور اسمبلی یا پریس میں بیان دینے کے بعد رنگ اور پلاؤ اڑانے میں مصروف ہو جاتے ہیں!

کبھی آپ نے سوچا کہ دانشوری کے خیالات کے علاوہ کس طرح پتہ چلتا ہے کہ ہاضمہ خراب ہونے لگا ہے اس کی آسان ترکیب ہمارے دوست امام صاحب نے یہ بتلائی کہ جب ادیب اپنے کسی افسانہ یا ناول میں دکھلائے کہ کردار کسی سالن کو پسند یا ناپسند کرتا ہے یا کھا کر بیمار ہو گیا ہے تو سمجھ لیں کہ اس بیماری کے دوران ادیب نے یہ افسانہ لکھا ہے۔ اگر بیماری دل کا ذکر ہو تو سمجھ لیں کہ اس بیماری دل کا شکار خود ادیب ہے مشہور جاسوسی ناول نگار ابن صفی ہمیشہ باورچی سلمان کے کردار کی زبان مسور کی دال کے پکنے اور مرکزی کردار عمران کا ہاضمہ کے خراب رہنے کا قصہ بیان کرتے تھے شاید مصنف کے گھر میں زیادہ دال پکتی تھی اس لیے پیش لفظ میں وہ بھی اپنے ہاضمہ کے خراب رہنے کا تذکرہ کرتے تھے۔ مسئلہ یہ ہے کہ اگر کسی کے ہاں دال زیادہ پکتی ہو تو ہاضمہ خراب رہتا ہے اور جس کی دال نہ گلتی ہو تو اس کے پیٹ میں اور زیادہ درد ہوتا اور ہاضمہ زیادہ خراب رہتا ہے۔

بعض بار یہ بحث گرما لیا جائے کہ سیاستداں قوم کے درد میں مبتلا رہتے ہیں تو پھر ان کے ہاضمے کے خراب ہونے کی کوئی خبر کیوں نہیں آتی ہے۔ حالانکہ معمولی چھینک آنے تو بھی صفحہ اول پر خبر شائع ہوتی ہے۔ اگر معمولی سیاستداں خواتین کا

باضمہ کتنا ہی شدید خراب ہو پھر بھی بڑے سیاستداں کی چھینک اُس پر غالب رہے گی کیونکہ بڑے سیاستداں کی چھینک بھی قوم کو پیاری ہوتی ہے اور چھوٹے سیاستداں کے ہاضمہ کو کوئی نہیں پوچھتا۔

ہاضمہ کا خراب ہونا ایک ایسی بیماری ہے کہ کوئی شرم کے مارے نہیں بتاتا صرف مشتاق احمد یوسفی ایک ایسے ادیب ہیں جو اپنے پیٹ کے درد کے متعلق وضاحت سے اور مثالوں کے ساتھ بیان کر گئے۔

ہاضمہ کو اچھا کرنے کے لیے کئی ادویات مشہور ہیں اور بے فکرے خوش خوراک اس لیے خوش خوراکی کے مظاہرے کرتے ہیں کہ زیادہ کھالیا تو کیا غم ہے دو ٹکیہ کار مینا اور جلبیسول سے فائدہ ہو ہی جائے گا یا دو چمچے اینو سے افاقہ ہو جائے گا۔ افسوس اس بات کا ہوتا ہے کہ خوش خوراکی کے مظاہرے دوسروں کے گھر دی گئی دعوت میں ہی ہوتے ہیں اگر اپنے دسترخوان پر ہوں تو پتہ چلے! مزید افسوس اس کا ہوتا کہ سوئم یا چہلم ہو کھانا خوش خوراکی حدیات تک کھانا ہے!

بسا اوقات یہ خوش خوراک دوسروں کے گھر اتنا کھا لیتے ہیں کہ انھیں دو آدمیوں کی مدد سے ان کے گھر پہونچانا پڑتا ہے اور بسا اوقات پلنگ پر ڈال کر۔ آپ ہی بتلایئے اب ایسا کھانا بھی کیا کھانا ہے کہ اپنے قدموں سے اپنے گھر جانا محال ہو جائے۔ کہتے ہیں کہ ان کا پیٹ بھر جاتا ہے بلکہ پھٹنے کے قریب ہوتا ہے لیکن نیت نہیں بھرتی ہے۔ ایک سے ایک عمدہ اور بڑی سے بڑی سوسائٹی کی محافل میں ہم نے دیکھا کہ بڑے سے بڑا افسر اور سیٹھ مزاج لوگ مفلسوں کی طرح کھانے کی طرف لپکتے ہیں۔ ہم جیسے معقول اعتدال پسند کو پلیٹ بھی نہیں ملتی اور اگر مل بھی جاتی ہے تو پہلی ڈشوں کا کھانا نصیب نہیں ہوتا بلکہ دوسری مرتبہ لائی گئی ڈشوں میں سے ایک آدھ بوٹی اور شیرمال کا ایک چوتھائی ٹکڑا لے کر ایک طرف کھڑے ہو جاتے ہیں تو جاننے والے از راہ تفنن کہتے ہیں کہ میر صاحب کسی کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں! بے شک ہم ہمیشہ سے کھاتے پیتے گھرانے کے فرد ہیں لیکن دیگر اشخاص کا اچھا کھانا نصیب ہونے کے باوجود بھی دعوتوں میں یوں لپکنا کیا معنی؟ کیا ہماری نیتیں کھانوں سے نہیں بھرتی ہیں؟ شاید ہم کھانے کے لیے زندہ ہیں اور زندہ رہنے کے لیے کھانے کی ضرورت تو شاید زرچہار ہی کو ہو گی! کبھی کبھی تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ نہ صرف یہ کھانا کھائیں گے بلکہ ساتھ بھی لے جائیں گے۔ گھریلو تقاریب میں تو یہ فیشن ہو چلا ہے کہ گھر کا ایک فرد نہیں آیا تو اس کا بھی حصہ لے جائیں گے۔ پلاسٹک کی تھیلیاں یعنی شاپنگ بیگ کا یہ فائدہ خوش خوراک ماہرین نے خوب اٹھایا ہے ہزاروں من بلکہ ٹن چکن تکہ، کڑاہی گوشت ہماری قوم چکھتے چکھتے سونگھتے سونگھتے ہڑپ کر ڈالتی ہے چکن تکہ سے پیٹ کب بھرا جاتا ہے بلکہ صرف ذائقہ بدلا جاتا ہے۔ لگتا ہے کہ ہماری قوم صرف کھانے کے لیے پیدا ہوئی ہے نہ کمانے کے لیے نہیں! دیگر ترقی یافتہ اقوام کماتی زیادہ ہیں اور کھاتی کم ہیں ہمارے دوست امام صاحب فرماتے ہیں اگر ہر فرد ایک لقمہ کم کر دے تو دس کروڑ اشخاص کے دس کروڑ لقمے یقیناً ایک کروڑ کے ایک وقت کے آدھے پیٹ کو یعنی پچاس لاکھ افراد کے ایک وقت کے ایندھن کو بھر سکتے ہیں۔ بس حساب کرتے چلے جائیں اور لقمہ کم کرتے جائیں تاکہ دیگر افراد کو بھی روٹی میسر آجائے مگر افسوس کہ یہاں تو یہ حال ہے کہ ہمیشہ فکر لگی رہتی ہے کہ میرے بعد یہ مرغ قورمہ بریانی کون کھائے گا۔ اگر دیگ بچ گئی تو کیسے تقسیم ہو گی۔ اگر خدا نخواستہ دیگ کم پڑ گئی تو ہزار منہ ہزار باتیں کہ انتظام گندا تھا کوئی یہ نہیں سوچتا کہ ہم نے ضرورت سے زیادہ کھا لیا ہے یا بن بلائے مہمان زیادہ چلے آئے یا ساتھ لے آئے اور میزبان کو تکلیف دی۔ انتہا یہ ہے کہ پیٹ بھر ٹوٹ کر، ڈٹ کر کھانا کھانے اور زبردستی ڈکار لینے کے بعد فرمائیں گے کہ

گوشت کم تھا یا چاول میں کسک رہ گئی یا میٹھا اچھا نہیں تھا یا مرچی زیادہ تھی وغیرہ وغیرہ ۔ شادی بیاہ، سالگرہ، عقیقہ جیسی تقاریب ہو یا محافل میلاد ہو یا سوئم چہلم کے فاتحہ کا کھانا ——— اعتراض کرنا اور ڈٹ کر کھانا ہماری قوم خوب جانتی ہے ۔

زیادہ کھانے سے ہاضمہ متاثر ہوتا ہے پودینہ، ادرک، الائچی، زیرہ، سونف وغیرہ کھانے سے آرام آجاتا ہے اور پھر خراب اور پھر آرام یونہی زندگی میں کھانے کا سلسلہ اور ہاضمہ کے اچھے اور خراب ہونے کا سلسلہ جاری رہتا ہے ۔ اتنا کھائیں کہ ہضم ہو سکے اپنے پیروں پر چل کر اپنے گھر آسکیں ۔

ہاضمے کو خراب ہونے سے بچانے کے لیے کم کھائیں ورنہ لوگ سمجھیں گے کہ آپ بھی دانشور ہونے لگے ہیں لیکن افسوس ہے کہ ہاضمہ کے خراب ہونے کی خبریں کوئی بھی اخبار نہیں دیتا اور کوئی بھی ادیب دانشور سیاستداں ایسی خبریں شایع نہیں کرواتے ۔ کیا آپ اپنے ہاضمہ کے خراب ہونے کی تشہیر چاہتے ہیں ۔ اگر چاہتے ہیں تو خوب کھایئے ورنہ سنبھل کر اپنا پیٹ سمجھ کر کھائیں کہ کم کھانا عقلمندی کی نشانی ہے اور وقت کا تقاضا اور ہمارا اصرار ہے کہ اب قوم کو عقلمند ہو جانا چاہیئے ورنہ اکیسویں صدی میں ہم چٹوا اور خوش خوراک قوم کے لقب اور خراب ہاضمہ کے ساتھ داخل ہوں تو کتنا باعث شرم ہوگا ۔ کبھی ہم سوچتے ہیں کہ آئندہ صدی جس میں کیپسول کھا کر زندگی گزاری جائے گی اس وقت اقوام عالم کا ہاضمہ کیا ہوگا لیکن اب ہم آئندہ صدیوں، آئندہ نسلوں کے متعلق نہیں سوچیں گے کیونکہ مستقبل کے تعلق سے سوچنے اور فکر کرنے میں ہمارا حال اور حال کا ہاضمہ خراب ہونے کا اندیشہ ہے پس ہر حال میں، حال کا ہاضمہ صحیح رکھنا ہے تاکہ مستقبل بھی خوشگوار بنے ۔

--

فارم IV حسب قاعدہ 8 بابت شگوفہ حیدرآباد

۱۔ مقام اشاعت : ۳۱ مجرد گاہ، معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱

۲۔ وقفۂ اشاعت : ماہنامہ

۳، ۴، ۵ : پرنٹر، پبلشر اور ایڈیٹر کا نام : سید مصطفیٰ کمال ۶۸ - ۷ - ۶ - ۱۷، دبیر پورہ حیدرآباد ۲۳

۶۔ مالک : قیصر کمال ۶۸ - ۷ - ۶ - ۱۷، دبیر پورہ حیدرآباد ۲۳

میں سید مصطفیٰ کمال تصدیق کرتا ہوں کہ مذکورہ بالا اطلاعات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں ۔

دستخط
سید مصطفیٰ کمال

یکم مارچ ۹۲ء

منظور وقار (گلبرگہ)

قارئین

مطالعہ کئی طرح کا ہوتا ہے۔ اخبارات کا مطالعہ، ادبی رسائل کا مطالعہ، فلمی پرچوں کا مطالعہ، رومانی ناولوں کا مطالعہ، جاسوسی و جنسی ناولوں کا مطالعہ، شادی بیاہ، طلاق اور قوت باہ میں اضافہ کرنے والے حکما کے اشتہارات کا مطالعہ، خطوط کا مطالعہ، خفیہ چٹھیوں کا مطالعہ، اگر ہم قارئین کی الگ الگ تفصیل بیان کریں گے تو مضمون شیطان کی آنت کی طرح طویل ہو جائے گا اس لیے ہم صرف ادبی رسائل اور اخبارات کا مطالعہ کرنے والے قارئین کے تعلق سے کچھ معلومات فراہم کرنے کے لیے کچھ لکھ رہے ہیں۔

ادبی رسائل اور اخبارات کے ادبی گوشوں کا مطالعہ کرنے والے قارئین کی آج کل اتنی مانگ ہے جتنی خلیجی ممالک میں ہمارے ملک کے لڑکیوں کی۔ اگر کسی افسانہ نگار کو اس کے افسانوں کا مطالعہ کرنے والے دو چار قاری نصیب ہوتے ہیں تو وہ اپنے آپ کو کرشن چندر اور منٹو کا جانشین سمجھنے لگتا ہے اگر کسی نقاد کو دو چار قاری مل جاتے ہیں تو وہ اپنے آپ کو دنیا کا سب سے بڑا دانشور سمجھنے لگتا ہے۔ اگر کسی مزاح نگار کو آٹھ دس قاری مل جاتے ہیں تو وہ اپنی قسمت پر رشک کرنے لگتا ہے۔

البتہ شعرائے کرام کے نزدیک قارئین کی ایسی کوئی خاص اہمیت نہیں ہوتی کیونکہ شعراء کو قارئین کی نہیں سامعین کی ضرورت ہوتی ہے۔ یوں بھی افسانے تنقید اور مزاح کا مطالعہ کرنے والے خود قلمکار ہی ہوتے ہیں ایک افسانہ نگار ہی دوسرے افسانہ نگاروں کے افسانوں کا مطالعہ کرتا ہے۔ ایک مزاح نگار ہی دوسرے مزاح نگار کے مضامین کا مطالعہ کرتا ہے۔ ایک افسانہ نگار یا مزاح نگار اپنے ہم عصر افسانہ نگار یا مزاح نگار کی تخلیقات کا مطالعہ اس لیے نہیں کرتا کہ وہ قلمکار سے متاثر ہے بلکہ وہ اس نیت سے مطالعہ کرتا ہے کہ افسانوں اور مزاحیہ مضامین میں موجود چھوٹی بڑی خامیوں اور کوتاہیوں کو تلاش کرے اور انھیں پہاڑ بنا کر شہر کے ادبی حلقوں میں نمائش کے لیے رکھ دیا جائے۔

ہم نے اکثر افسانہ نگاروں اور مزاح نگاروں کو اپنے ہی شہر کے قلمکاروں کی تخلیقات کے مطالعہ کے دوران ان کے چہروں پر ایک رنگ آتا تھا اور ایک رنگ جاتا تھا دیکھا ہے دوران مطالعہ آنکھیں پھیل جاتی ہیں بھویں تن جاتی ہیں

چہرہ کبھی پھیلتا ہے تو کبھی سکڑتا ہے۔ ہم نے اس کیفیت میں مبتلا قاری سے اس کی وجہ دریافت کی تو اس نے جواب دیا۔ باوجود کوشش کے ایک عدد خامی بھی نہیں پکڑ پایا کم بخت نے بڑا معیاری افسانہ تخلیق کیا ہے۔ یہ افسانہ میری افسانہ نگاری کے لیے خطرہ ہی نہیں پریشانی کا باعث بن گیا ہے جو قلم کار افسانہ، مزاح اور انشائیے لکھتے ہیں وہ اپنی تخلیقات کے قاری خود ہی ہوتے ہیں ایک افسانہ نگار خود ہی اپنے افسانوں کا باریک بینی سے مطالعہ کرتا ہے۔ خود ہی اپنے افسانوں کے ایک ایک کردار اور واقعات سے لطف اٹھاتا ہے۔

خود ہی اپنے افسانوں پر تبصرہ بھی لکھتا ہے

ہم نے تو بیشتر افسانہ نگاروں کو اپنے منہ میاں مٹھو بنتے دیکھا ہے۔ ایک افسانہ نگار اپنے آپ کو "اردو افسانے کی تاریخ کا روشن مینار کہتا ہے"۔ دوسرا افسانہ نگار خود کو جدید افسانوں کا بانی قرار دیتا ہے۔ ایک افسانہ نگار ہر محفل میں اپنے افسانوں میں موجود علامتوں کا بانی قرار دیتا ہے۔ ایک افسانہ نگار ہر محفل میں اپنے افسانوں میں موجود علامتوں اور تجریدیت کی خوبی اور قوت کی تشہیر کرتا نظر آتا ہے۔ قلم کاروں کے خودستائی کے مرض میں مبتلا ہونے کے یوں تو کئی وجوہات ہیں مگر وجہ یہ بھی ہے کہ آج کل تخلیقات کو نقاد تو بہت بڑی بات ہے عام قاری تک منہ لگانا مترکے مرے کو بگاڑ لینے کے مترادف سمجھنے لگے ہیں۔ اس لیے اکثر قلم کار قاری کی تلاش میں اس طرح بھٹکتے ہوئے نظر آتے ہیں جس طرح بے روزگار نوجوان دولت مند گھرانو کی دل پھینک لڑکیوں کی تلاش میں۔ نقادوں کے تو نخرے ناک پہ رہتے ہیں۔ اس لیے قلم کار عام قاری کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔ عام قاری اکثر ہوٹلوں، پان شاپوں، اصلاح خانوں اور شادی بیاہ کی تقریبات میں مل جاتے ہیں۔ قارئین کی ایک بڑی تعداد مشاعروں اور ادبی اجلاسوں میں بھی مل جاتی ہے مگر یہ قاری عام قاری نہیں معتبر قارئین کہلاتے ہیں۔

قلم کار اپنے قاری کی تعداد میں اضافہ کرنے کے لیے لوگوں میں اپنی شناخت بناتے ہیں۔ ہر محفل میں اپنا تعارف خود ہی کرواتے ہیں۔ ادبی ذوق رکھنے والوں کی امداد بھی اکثر و بیشتر کرتے ہیں۔ ہوٹلوں اور دعوتوں میں اپنے قاریوں کی خاطر مدارات بڑی توجہ سے کرتے ہیں۔ ادبی محفلوں، ہوٹلوں اور پان شاپوں کے قریب قلم کاروں کو قارئین سے اس طرح گفتگو کرتے ہوئے ہم نے بارہا دیکھا ہے۔ مسٹر ملّا! ماہنامہ "بےدم" کے تازہ شمارے میں میرا تازہ افسانہ "تگڑا آدمی" چھپا ہے تم نے پڑھا یا نہیں؟" مسٹر ملّا کا جواب ہوگا۔ "ہاں بجلیے خاں میں نے آپ کا تازہ افسانہ پڑھا واقعی بڑا تگڑا افسانہ ہے۔"

بجلیے خاں خوش ہو کر مسٹر ملّا کا منہ میٹھا کراتے ہیں حالاں کہ مسٹر ملّا ماہنامہ "بےدم" کی دم سے بھی واقف نہیں ہوتے۔ ایک دعوت طعام میں علامہ پاگل پاکھنڈی اپنے ایک قاری سے کہہ رہے تھے شترو میاں روزنامہ "نرم گرم" میں میرا مزاحیہ مضمون "مجھے میری بیوی سے بچاؤ" چھپا ہے پڑھا یا نہیں؟" شترو میاں کا جواب تھا۔ "ہاں علامہ آپ کا وہ مضمون میں نے پڑھا بھی ہے اور اس مضمون کی وجہ تخلیق کو اپنی آنکھوں سے دیکھا بھی ہے کہ اکثر آپ اپنے گھر سے مجھے میری بیوی سے بچاؤ کا نعرہ لگاتے ہوئے نکلتے ہیں۔"

ایک تنک مزاج جواں سال افسانہ نگار اپنے قاری سے محفل میں کہہ رہی تھیں ماہنامہ "بلبل" میں میری غزل شائع ہوئی آپ کو پسند آئی یا نہیں؟ جواں سال قاری کا جواب تھا ہاں متاز آپ کی غزل آپ کی تصویر کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔ مجھے آپ کی غزل

بھی پسند آئی اور آپ کی تصویر بھی۔ دونوں ہی جاذبِ نظر ہیں۔ اس دور میں عام قاریوں کے وارے نیارے ہیں۔ اگر کسی آفس میں کوئی افسانہ نگار یا مزاح نگار کلرک یا آفیسر ہے تو قاری اس کلرک یا آفیسر کے ٹیبل کے قریب پہنچتے ہی بعد سلام کہے گا۔ سر! آپ تو افسانوں کے شہنشاہ ہیں، آپ کی مزاح نگاری تو ملک کے گوشے گوشے کو قہقہہ زار اور لالہ زار کر رہی ہے۔ ان جملوں کو سن کر کلرک ہو یا آفیسر ——— اپنے ادب ذوق قاری سے اس قدر متاثر ہوگا کہ فوراً قاری کو اپنے سامنے والی نشست لینے کی درخواست کر کے چائے کا آرڈر دے گا۔ قاری کا وہ کام جو مہینوں میں ممکن نہ تھا، منٹوں میں ہو جائے گا۔ عام قاری عام طور پر فن کاروں سے زیادہ ذہین ہوتے ہیں وہ شعرا اور ادبا کو ایسے ایسے زرین مشورے دیتے ہیں کہ قاری فن کار، فن کار قاری محسوس ہوتا ہے۔ ہم نے قاری کو اس طرح کے مشوروں سے نوازتے دیکھا ہے۔

مسٹر آغر آپ کے افسانے بھیگے پاپڑ کی طرح پلپلے ہوتے ہیں اپنے افسانوں میں عصری حالات کی روح اور فن افسانہ نگاری کی جان ڈالا کرو، مزاح نگار کو مشورہ دیں گے "مسٹر مال پوری آپ کی تحریروں میں نمک نہیں کے برابر ہوتا ہے۔ آپ اپنی مزاح نگاری کو نمک مرچ ادرک لہسن لگا کر چٹپٹا بنایا کرو۔"

خصوصاً ادبی رسائل کا مطالعہ کرنے والے قارئین کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ کیوں کہ اکثر ادبی رسائل قارئین کی جانب سے روانہ کردہ چندوں اور تعریفی خطوط کی بیساکھیوں کے سہارے ہی چلتے ہیں جو مدیر قلم کاروں کی روانہ کردہ تخلیقات کے جواب میں ایک پوسٹ کارڈ بھی نہیں لکھا کرتے وہ قاری کے نام ہر ماہ دو چار خطوط لکھتے ہیں کہ جناب آپ کا سالانہ چندہ ختم ہو چکا ہے۔ آپ جیسے باذوق احباب کے سہارے ہی ہمارا پرچہ ادبی حلقوں میں "چرچہ" کا باعث بنا ہوا ہے۔ برائے مہربانی سالانہ چندہ روانہ فرما کر ہمارے حوصلوں کو بلند فرمائیں۔ ادبی رسائل کا مطالعہ کرنے والے قارئین ہر ایرے غیرے نتھو خیرے قلم کار کی تخلیقات کا مطالعہ نہیں کرتے۔ وہ ملک کے ممتاز قلم کاروں کی معیاری تخلیقات پر ہی اپنی نظرِ عنایت ڈالتے ہیں۔

اگر کوئی نیا افسانہ نگار ادبی رسائل کا مطالعہ کرنے والے قاری سے کہے گا جناب ماہنامہ "گگڑی" میں میرا افسانہ چھپا ہے۔ آپ نے پڑھا ہوگا" قاری نظرِ حقارت اس افسانہ نگار پر ڈال کر کہے گا ہاں گگڑی میں آپ کا نام دیکھا ضرور ہے میں نے تو صرف انتظار حسین اور قرۃ العین حیدر کے افسانے پڑھ کر ہی پڑھ کر ہی پرچے کو ردی میں ڈال دیا۔ آپ کا افسانہ پڑھنے کی مجھے مہلت ہی نہ ملی"۔

قلم کار حضرات قارئین سے اس قدر مرعوب ہوتے ہیں کہ وہ صدر بُش سے دشمنی کر سکتے ہیں مگر کسی قاری کا دل نہیں دکھا سکتے۔ وہ ہر وقت اس خوف میں مبتلا رہتے ہیں کہ ادھر ان سے کوئی بھول ہوئی کہ ادھر ان کا ایک قاری ہاتھ سے نکل جائے گا۔ چناں چہ قلم کار قارئین کا اس طرح خیال رکھتے ہیں جس طرح دولت مند اپنے بینک بیلنس کا۔ ۷۵

کملاکر راؤ نائیڈو کل
(ڈپٹی کمشنر اکسائز، محبوب نگر)

ممتاز شخصیت
ممتاز احمد

زمانہ جوں جوں ترقی کرتا ہے انسان کی سوچ کی پرواز بھی اُتنی ہی بلندی پر جاتی ہے۔ ہر ایک سوچ میں لگا رہتا ہے کہ وقت جس تیز رفتاری سے دوڑ رہا ہے اُس رفتار سے نہ سہی کم از کم ترقی کی جانب تیز گام ہو جاتے اور اپنے مستقبل کو استحکام بخشے سچ بات تو یہ ہے کہ میں بھی اس بات کا قائل ہوں۔

میرے ایک دوست ہیں اُن کے والدین نے اِن کا نام ممتاز احمد رکھ دیا شاید والدین کو اُمید تھی کہ یقیناً ایک دن دُنیا کی نظر میں ہر لحاظ سے ممتاز ہی ہوگا۔ اور خاندان کا نام روشن کرے گا۔ میرا اور ممتاز کا ساتھ آٹھویں جماعت تک رہا۔ اس کے بعد ممتاز کی بے راہ روی نے تعلیم کو تالا لگا دیا۔ میرے خیال میں تعلیم چھوڑنے کا سبب یہ بھی تھا کہ ممتاز پیدائش سے قدرے بہرہ تھا اونچا سنتا تھا اُونچا بولتا تھا ویسے بھی ہم کلاس میں اُس کو بہت ستایا اور بنایا کرتے تھے خود ممتاز بھی فطرتاً پُر مذاق تھا بے شمار لطیفے یاد تھے لطیفے سُنانے کے بعد وہ ہمارا تاثر معلوم کرنے چہروں کی کتاب پڑھا کرتا تھا۔ کیوں کہ ہماری آواز اُس کے کانوں تک مشکل سے پہونچ پاتی تھی۔

ممتاز کی بے روزگاری پر ترس کھا کر اہلِ خیر محلّے کے حضرات نے ایڑی چوٹی کا زور لگا کر محکمۂ آبپاشی میں ٹی۔ یم کی نوکری دلوادی جس پوسٹ کو آج کل غالباً ورک انسپکٹر کہا جاتا ہے ہمارا ممتاز ٹی یم کیا بن گیا اپنے آپ کو پی۔ یم یعنی پرائم منسٹر تصور کرنے لگا۔ اس کا رہن سہن ہی بدل گیا سفید پائجامہ بنی کی شیروانی اُس دور کے ربر کے چپّل میں اپنے آپ کو وہ ہمیشہ نوشاہ تصور کرتا۔

اللہ کی کرنی ایسی ہوئی کہ آخر کار ایک دن اُس کی شادی اپنے علاقہ کے ایک نیک صفت تاجر پیشہ صاحب کی دختر سے ہو گئی۔ جہاں تک مجھے علم ہے میاں بیوی میں اتنی محبّت تھی اور ہے بھی کہ دنیا رشک کرنے لگے۔ شاید کہ آپسی اس خلوص کو دیکھ کر قدرت نے ممتاز کو چھ لڑکیوں سے سرفراز فرمایا۔ خدا اس کے بعد اولاد کا ایک دم بریک سا لگ گیا مر بیٹے کی چاہت میں میاں بیوی ہمیشہ ترستے رہے۔ دوسروں کے گھروں میں مرد بچوں کو دیکھ کر بڑی مسرّت کا اظہار کیا کرتے تھے کبھی کبھی حسد کا اظہار بھی کیا کرتے تھے۔

اِن باتوں سے ہٹ کر میرا خاص مشاہدہ رہا کہ وہ شیروانی جو کہ ممتاز نے اپنی ڈیوٹی پر چڑھنے کے بعد سلوائی تھی شادی میں وہی کام آئی۔ اور کئی برسوں تک اُن کے جسم سے چپکی رہی خود شیروانی کو ممتاز کے جسم سے شاید اتنا اُنس تھا کہ چھوڑنے کا نام نہ لیتی اور شاید شیروانی کو یہ خوف تھا کہ ایک بار وہ ممتاز کے جسم سے چھوٹ گئی تو یقیناً دوسری شیروانی سوکن بن کر آجائے گی۔ اور یہ بڑی

ناگوار بات ہوگی۔ شیروانی کے اصلی رنگ نے خیرباد کہہ دیا تو ممتاز نے اس کو ناسی رنگ میں رنگوا دیا۔ اور پھر چند برسوں میں وہ رنگ بھی پھیکا پڑ گیا۔ اور بعض جگہ سوراخ پڑنے لگے تو نہایت ڈھنگ سے سلوا کر اور رفو کروا کے کالے رنگ میں رنگوا دیا۔ اب کیا تھا شیروانی کی وجہ سے ممتاز کا شباب پھر سے شباب پر آگیا تھا۔

ممتاز میں ایک اور خصوصیت یہ تھی کہ وہ کسی بھی قیمت پر اپنے دوست احباب اور رشتہ داروں کو شرمندہ ہونے کا موقع ہی نہیں دیتا تھا بلکہ یہ بوجھ ہمیشہ اپنے کندھوں پر لینے کا قائل تھا۔ وہ اس طرح کہ کسی ہوٹل میں دو چار دوستوں یا رشتہ داروں کے ساتھ کچھ کھا پی لیا تو بل خود کبھی ادا نہیں کرتا تاکہ دوسروں کو شرمندگی کا سامنا نہ کرنا پڑے بلکہ اس سلیقے سے ہوٹل سے پہلے سرک جاتا تاکہ ڈھونڈنے والا ڈھونڈتا رہ جائے۔

ایک بار ممتاز نے بڑے پیار سے مجھے بھی اپنی یاری کا واسطہ دے کر نوکری ملنے کی خوشی میں ہوٹل لے گیا۔ اُن دنوں میں خود بھی بے روزگار تھا میں نے لاکھ منع کیا لیکن وہ کہاں ماننے والا تھا بڑے اخلاص سے بولا "ارے کمل تُو میرا جیتا دوست ہے آج نہیں تو کل ملازم ہو جائے گا تب تجھ سے میں مٹھائی کھا لونگا لیکن آج میری باری ہے۔ چل تیرے پسند کی کسی ہوٹل چلتے ہیں"۔ میں اس کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے۔ "کاکا موہن لال کی مٹھائی بھنڈار" کی نشاندھی کر کے وہاں لے گیا۔ دونوں نے دل بھر مٹھائی کھائی جب بل ادا کرنے کی نوبت آئی تو ممتاز نے اپنی شیروانی کے جیبوں کا جائزہ لیتے ہوئے بولا "یار کمل" لگتا ہے پیسہ دوسری شیروانی میں بھول آیا ہوں۔ تو سیٹھ موہن کاکا سے کہدے کہ کل دفتر جاتے ہوئے ممتاز پیسہ ادا کر دے گا۔

میں ممتاز کی اس حرکت سے کچھ پریشان اور کچھ پشیمان ہوا۔ میری جیب بالکل خالی تھی۔ اور ممتاز کے گھر میں اُس کی دوسری شیروانی نہیں تھی جس سے میں بخوبی واقف تھا لیکن موقع کی نزاکت کو دیکھ کر میں نے سیٹھ کاکا سے کہا کہ "کاکا ممتاز کل آفس جاتے ہوئے پیسہ ادا کر دے گا۔ بیچارے کاکا نے جو میری ایمانداری سے واقف تھا ہاں کر دی یقین مانیے اُس کل کا آج تک انتظار رہے پیسے تو میں نے کاکا کو ایک مہینے بعد ادا کر دیے۔ ہر بار بیچارہ ممتاز اس میں شک نہیں یہ کہتا ہے "یار کمل میں تیرا قرض دار ہو کر رہ گیا بہت جلد تیرے پیسے ادا کر دوں گا۔ سچ بات تو یہ ہے کہ میں نے بھی کبھی اُس سے مطالبہ ہی نہیں کیا۔

اب میں ممتاز کی شخصیت کے ایک اہم پہلو پر روشنی ڈالنا چاہوں گا۔ وہ یہ کہ نوکری کے ابتدائی دنوں میں محلے والوں نے دفتر کے طویل فاصلے کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایک نہایت ہی پرانی سیکل اقساط پر اُدھار دلا دی۔ اور اس شرط پر کہ ماہانہ آسان قسطوں میں ہر تنخواہ سے لازمی طور پر قسط ادا کرتا رہے۔ جب یہ سیکل خریدی گئی تھی تو خود اس کے مالک نے اُس کی خستہ حالت سے بیزار ہو کر فروخت کی تھی۔ لیکن جب ممتاز کے یہاں یہ سیکل آئی تو پھر برسوں تک چلتی رہی مجال ہے کبھی اس میں کسی قسم کی ریپئرنگ کی یا ٹائر ٹیوب بدلوانے کی نوبت آئی ہو۔ ایک پیڈل کا راڈ اکھڑ گیا تو اس جگہ لکڑی کا ٹکڑا ٹھونس دیا گیا۔ مڈگارڈ نام کی کوئی چیز دیکھنے میں نہیں آئی ٹائروں میں اتنے گیٹرس لگ گئے تھے کہ جب سیکل چلتی تو اس کی اُچھل کود دیکھنے والے کو گھوڑے کا گمان ہوتا۔ اُس پر ممتاز کے اخلاق کا یہ عالم تھا کہ ہر کسی کو اپنی سیکل پر لفٹ دینے کا جنون طاری رہتا۔

ایک بار میں "لا" کالج جانے کے لیے نکلا تو پیچھے سے ممتاز نے اپنے مخصوص انداز میں سیٹی بجا کر اپنی طرف متوجہ کیا۔ کیوں کہ گھنٹی نام کی کوئی چیز اس کی سیکل میں نہیں تھی "ارے بھئی کمل کہاں جا رہے ہو"۔

"لا کالج جا رہا ہوں" میں نے بے دلی سے کہا۔

"تو اس میں سوچنے کی کیا بات ہے آ میری سیکل پر بیٹھ جاؤ میں بھی اُدھر کی طرف جا رہا ہوں" ممتاز نے بڑی

ہمدردی سے کہا۔

"نہیں ممتاز آج میں ذرا جلدی میں ہوں، پیدل ہی چلا جاؤں گا۔ کسی دن فرصت میں تم سے ضرور لطف لے لوں گا۔" میں نے قدرے شرارتی لہجہ میں کہا۔ بے چارہ ممتاز سٹپٹا گیا اور خاموشی سے اپنی راہ لی۔

ممتاز کی سیکل اس خصوصیت کی بھی حامل تھی کہ جب وہ کسی مقام پر چھوڑ کر فیلڈ کا کام دیکھنے کے لیے صبح چلا جاتا تھا اور شام کو لوٹ کر سیکل کے پاس پہنچتا تو کیا مجال کہ کوئی ممتاز کی سیکل چرانے کی جراءت کرے۔ سیکل کو تالا ازل سے ہی نہیں تھا۔ اس پر بھی کوئی بری نظر نہیں اٹھاتا اگر کسی کی نیت کچھ دیر کے لیے خراب بھی ہو جائے تو کیا مجال کہ ممتاز کی شریف سیکل بے ایمانی کرے اور کسی غیر مرد کے ساتھ نکل جائے دو قدم کوئی دوسرا شخص سیکل لے جانا بھی چاہے تو گیا بڑ کا کوئی نہ کوئی حصہ ریم اور فارک کے درمیان آکر بریک بن کر مدافعت کرتا۔

میرے ممتاز کی اور بہت سی خصوصیات ہیں۔ لیکن بے چارہ عمر کے اس حصے میں پہنچ گیا ہے جس کے بارے میں روشنی ڈالنا مناسب نہیں سمجھتا۔ آدمی عہد پیری میں داخل ہونے کے بعد سنجیدگی کی طرف مائل ہوتا ہے مگر میرے پیارے دوست کے نئے نئے کارنامے بیان کرنے کے بجائے مناسب ہے کہ صبر کر کے خاموش ہو جاؤں اور تنہا لطف اندوز ہوتا ہوں کیوں کہ بے چارہ ممتاز ازل سے ڈی ہیم تھا اور رہے گا۔ بھلے ہی دنیا بدل جائے لیکن میرا پیارا ممتاز ہرگز ہرگز نہیں بدلے گا اور قیامت تک اس کی سیکل اور شیروانی اس کا ساتھ دیتی رہے گی۔ جس کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔



دادا! اب سونے کا وقت ہوا!

صغیر احمد سحر سندیلوی

عالمی ترقیِ اردو سیمینار

اردو کی ترقی و ترویج کے لیے سرکاری اخراجات پر ایک سیمینار محبان اردو کی جانب سے ہو رہا ہے جس کی تشہیر اخبارات میں بہت زور و شور سے ہو رہی تھی۔ دنیا کے بڑے بڑے مفکرین مدبرین اکابرین شعر و ادب ماہرین لسانیات سرکردہ شاعر و ادیب، لاثانی نقادانِ فن سیاست داں اور شائقین علم و فن اس سیمینار میں حصہ لے رہے ہیں اردو کے شہرت یافتہ خدام بھی اس مباحثہ میں اپنے گراں قدر خیالات کا اظہار فرمائیں گے گراں قدر ان معنی میں کہ یہ خدام اردو ایک خطیر رقم ان خیالات کے معاوضے کے بدلے سیمینار منعقد کرنے والوں سے وصول کر کے ہوائی جہاز میں بیٹھ کر اپنے اپنے ملکوں کو روانہ ہو جائیں گے۔ حالانکہ جو خود مخدوم ہو وہ کسی کی خدمت کا فریضہ کیسے انجام دے سکتا ہے۔ ان شہرت یافتہ اردو کے خادموں کی خدمت بلکہ پرورش تک نہایت خلوص دل کے ساتھ اردو کرتی ہے اردو کا احسان ان کے سروں پر تو ہے ان کا کوئی احسان اردو پر نہیں۔

عالمی سیمینار برائے ترقی اردو سیمینار کا انتظار محبان اردو اور دشمنان اردو دونوں ہی شدت سے کر رہے تھے میں دشمنان اردو کا بہت ہی شکر گزار ہوں کہ ان لوگوں کی وجہ سے کم از کم اردو کا تذکرہ زندہ تو رہتا ہے اکثر و بیشتر انھیں کی بدولت ہر سال متعلقہ سیمینار اور کانفرنس وغیرہ تو ظہور میں آجاتی ہیں میں سمجھتا ہوں جتنا نقصان محبان اردو نے اردو کو پہونچایا دشمنان اردو نے نہیں جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے نہ میں محبان اردو میں سے ہوں اور نہ دشمنان اردو میں ہاں اتنا ضرور ہے کہ جس طرح نوجوانان عالم کسی کافر ادا حسینہ پہ مرتے ہیں میں بھی اس کافر کی تیر نظر کا شکار تھا۔ دیکھیے میں پھر بہک چلا، لوگوں کو بھولنے کی بیماری ہوتی ہے مجھے بہکنے کی بیماری ہے یہی وجہ ہے کہ میں سیمینار میں شرکت کرنے کا عزم لے کر گھر سے چلا تھا مگر پہنچ گیا لطافت میاں کے مکان پر لطافت میاں کی حال ہی میں شادی ہوئی تھی مجھے راستہ میں ان کا خیال آگیا سوچا کہ انھیں بھی ساتھ لے لوں خدا گواہ ہے کہ تقریباً نصف گھنٹے تک چیخنے چلانے کے بعد اندر سے جواب ملا کہ ابھی آتا ہوں۔ مجھے زندگی میں پہلی بار تجربہ ہوا کہ نئے شادی شدہ دوست کے ساتھ کسی مجلس میں جانے کا پروگرام نہیں بنانا چاہیے۔ خدا خدا کر کے وہ برآمد ہوتے کہنے لگے معاف کیجئے گا۔ آپ کو بڑی زحمت ہوئی بیگم صاحبہ کسی طرح اجازت ہی نہیں دے رہی تھیں۔ انھیں شک تھا کہ عالمی سیمینار برائے ترقی اردو تو اک بہانہ تھا

محض بہانا اور دراصل میں محفلِ شراب و شباب برپا کرنے جا رہا ہوں رہ تو کہیے کہ وہ اُردو کے جاں نثاروں میں نکلیں اس لیے میں نے جب ان کے سر پہ ہاتھ رکھ کر قسم کھائی کہ میں واقعی سیمنار میں جا رہا ہوں تو انھوں نے خوشی سے اجازت دے دی یہ ان کی اردو نوازی کا بین ثبوت ہے۔

جب میں ان کے ساتھ گیارہ بجے کے قریب جلسہ گاہ میں پہنچا تو ہماری سرکار کے نمایندہ سیاست داں تقریر فرما رہے تھے۔

ہماری سرکار نے اردو کی فلاح و بہبود کے لیے ہر ممکن کوشش کی ہے۔ سرکار اردو کی بہی خواہوں کی ہمیشہ ہی حمایت کرتی رہی ہے۔ سرکار جو بھی امداد و تعاون اردو کے لیے کر سکتی تھی کر رہی ہے اس میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں برتی اردو اکاڈمیاں اور اردو بورڈوں کا قیام سرکار کی اردو نوازی کا ایک ثبوت ہے ہم ہر سال کروڑوں روپیہ ان اداروں کو دیتے ہیں جو اردو کی ترقی کے لیے جان توڑ کوشش کر رہے ہیں ان اداروں کے ذریعہ اردو پڑھنے والے طلبا کو ان کی حوصلہ افزائی کے لیے وظائف دیئے جاتے ہیں غریب مصنفین کی تخلیقات کی اشاعت میں یہ ادارے مالی تعاون کرتے ہیں اب یہ دوسری بات ہے کہ ان اداروں سے غریب مصنفین فیض نہیں اٹھا پاتے بلکہ ذی حیثیت افراد ہی فائدہ حاصل کرتے ہیں پھر یہ ادارے ان اچھی مطبوعہ کتابوں پر انعامات بھی تقسیم کرتے ہیں اور کتب خانوں کو کتابوں کی خریداری کے لیے اقتصادی امداد بھی دیتے ہیں ہماری سرکار نے پانچ ہزار اردو لیکچروں کا بھی تقرر کیا ہے۔ ان اردو لیکچروں کے پاس کوئی کام نہیں ہے کیونکہ اردو کے طلبا ہی نہیں ہیں اس لیے سرکار ان سے بہ مجبوری دوسرے فضول کام لیتی ہے تاکہ ان میں کاہلی کے جراثیم پیدا نہ ہو جائیں اس میں سرکار کا کوئی قصور نہیں قصور ہے تو طلبا اور ان کے والدین کا جو اپنے بچوں کو اردو پڑھنے کی ترغیب نہیں دیتے۔ میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ اردو کی ترقی کے لیے سرکار اس قدر تعاون اور سہولتیں فراہم کرتی ہے لیکن اس کے باوجود اردو ترقی کیوں نہیں کرتی۔

اس کے بعد بیرون ملک سے آنے والے ایک معزز مہمان کو اظہار خیال کرنے کی دعوت دی گئی جو کہ غالباً ایران سے تشریف لائے تھے۔ انھوں نے فرمایا۔

محترم حضرات و خواتین مجھے یہ جان کر بڑی خوشی ہوئی کہ حکومت ہند نے اردو کی ترویج و ترقی کے لیے جو مراعات اور سہولتیں عطا فرمائی ہیں اس کے لیے ہم سب کو سرکار کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ میرے خیال میں اردو کی ترقی میں سب سے بڑا روڑا اس کا فارسی رسم الخط ہے۔ اب ہم ایرانی لوگ بھی اس فارسی رسم الخط کی دقتوں کو محسوس کر رہے ہیں فارسی کو دیوناگری جیسے سائنٹیفک رسم الخط میں لکھے جانے کے مسائل پر دن رات نت نئے تجربات کر رہے ہیں دراصل یہ غیر ملکی رسم الخط جو غالباً عرب سے درآمد کیا گیا ہے فارسی زبان کے لیے قطعی موزوں نہیں قدیم زمانے میں فارسی بھی دیوناگری رسم الخط میں لکھی جاتی تھی لیکن ایران پر عربوں کا تسلط قائم ہونے کے بعد اس کا رسم الخط بھی عربی ہو گیا۔ ایران کی طرف سے ہندوستان میں جو آرین قوم آئی اس نے اپنا دیوناگری رسم الخط قائم رکھا چونکہ یہ رسم الخط اس زبان کی فطرت اور صلب و لہجہ کے لیے نہایت موزوں اور سائنٹیفک تھا اس لیے اسے ترقی اور قیام دوام حاصل ہوا اس لیے میرا محبانِ اردو کو پرخلوص مشورہ ہے کہ وہ بھی اس قسم کے تجربات کریں یعنی اردو کو دیوناگری رسم الخط میں لکھنے کی ابتدا کریں۔ انشا اللہ اس تجربہ سے اردو کو بقائے ابدی حاصل ہوگی اور اس کی مقبولیت میں بھی اضافہ ہوگا۔ خدا

ان کی اس تقریر سے سامعین میں ایک انتشار پیدا ہوا جیسے لوگ ان کی مخالفت میں احتجاج کرنا چاہ رہے ہوں لیکن اتنی بڑی شخصیتوں کے سامنے زبان کھولنے کی کس میں طاقت تھی ؛ میں ابھی انھیں باتوں پر غور و فکر کر رہا تھا کہ مائیک پر ایک اور صاحب تشریف لے آئے سامعین ہمہ تن گوش ہو گئے ۔ غالباً وہ یہ سمجھ گئے کہ موجودہ مقرر ان کی مخالفت میں کچھ کہیں گے ۔ انھوں نے معزز سامعین کو مخاطب کرنے کے بعد فرمایا ۔

کسی زبان کی ترویج و ترقی میں اس کی گرامر (صرف و نحو) کو بہت بڑا دخل ہوتا ہے اردو زبان کی یہ سب سے بڑی بدقسمتی ہے کہ اس کی تمام تر گرامر کا دارومدار عربی کی سخت اور مشکل ترین گرامر پر ہے جو اردو کے لب و لہجہ اور مزاج سے قطعی مناسبت نہیں رکھتی لہٰذا اگر اہل اردو اپنی زبان کی ترقی چاہتے ہیں تو انھیں دیوناگری کی آسان اور سائنٹفک گرامر اختیار کرنا چاہیے اور عربی گرامر کو خیرباد کہہ دینا چاہیے آج کی وسیع تعلیمی دائرے میں کسے اتنی فرصت ہے جو عربی کے صنائع بدائع اور ان کی اصطلاحات بیٹھ کر یاد کریں عروض کی بنیاد بھی عربی عروض پر قائم ہے لہٰذا اس کی سینکڑوں عربی اصطلاحات یاد کرنا تضیع اوقات کے سوا اور کیا ہے دوسرے اردو شعرا کو بھی چاہیے کہ وہ عربی و فارسی کی نامطبوع بحور میں شعر کہنا چھوڑ دیں اور ہندی پنگل شاستر کی مطبوع اور آسان بحور میں شعر کہیں ۔ اگر جہان اردو نے صرف یہ کام کر لیا تو گویا انھوں نے وقت کی بے حد اہم ضرورت کی تکمیل کر لی اسی میں اردو شاعری اور اردو زبان کی بقا کا راز پوشیدہ ہے ۔

اس کے بعد ایک دوسرے صاحب مائیک پر تشریف لائے اور یوں گویا ہوتے ۔

بھائیو! اردو زبان محض زبان ہی نہیں یعنی صرف اظہار خیالات کا ذریعہ ہی نہیں ایک مکمل تہذیب بھی ہے لیکن اردو تہذیب صرف مسلم تہذیب و تمدن کی نمائندگی کرتی ہے جب ہم کسی سے یہ کہتے ہیں تو اس کے پس منظر میں مہمان سے نہایت انکساری کا اور ادب و احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے تمام لوازمات آرائش و آسائش کے ساتھ پرشکوہ تخت طاؤس پر بیٹھنے کی استدعا کرنے کا مفہوم شامل ہے جو مسلم آداب مجلس کی نشانی ہے اس کے برعکس کم اِن سٹ ڈاؤن COME IN SIT DOWN کہہ کر جب مہمان سے بیٹھنے کو کہا جاتا ہے تو انگریزوں کا تحکمانہ لب و لہجہ کا اظہار ہوتا ہے جو انگریزی معاشرے کی جھلک نمایاں ہوتی ہے لیکن اگر اردو زبان مسلم طرز معاشرت کے بجائے ہندوستانی تہذیب اپنا لے تو اس کی ہمہ گیری میں اور چار چاند لگ جائیں گے جس سے اردو کی ترقی کے ہزاروں دروازے کھل جائیں گے مسلم تہذیب تو صرف ہندوستان کے ایک اقلیتی فرقہ تک محدود ہے اس لیے یہ ایک محدود زبان ہو کر رہ گئی ہے اور اس ملک کی اکثریتی فرقہ کی یہ زبان نمائندگی نہیں کرتی لہٰذا اردو کو [illegible] ثقافت پرستی کو چھوڑ کر جدید نئے اقدار اور رجحانات اختیار کرنا چاہیے اس کے علاوہ عربی و فارسی الفاظ کی کثرت عربی و فارسی کی ضرب الامثال تشبیہ استعارات محاورات و روایات کو یکسر بھول جانا چاہیے یہی بات اردو کے حق میں زیادہ مفید ہے مختصر یہ کہ عربی فارسی سے ایک لخت قطع تعلق کر لینا چاہیے یہی عمل اس کی ترقی کی ضامن ہے ۔

ان کی اس تقریر سے سامعین میں واضح طور پر ناگواری اور بیزاری کے آثار ظاہر ہونے لگے میری طبیعت میں بھی انقباض پیدا ہو گیا تھا میں نے لطافت میاں کو اشارہ کیا کہ آؤ چلیں ذرا دیر ہوٹل میں موڈ ٹھیک کر آئیں پھر ہم لوگ کچھ دیر ہوٹل میں بیٹھے رہے اور وہاں ان تقاریر پر تبصرہ کرتے رہے ، خدا جانے یہ عالمی ترقی اردو سیمینار ہے

یا مسلم دور کے ادبی نقوش اور علامات مٹانے کی کوشش۔ جب ان خیالات سے طبیعت اچاٹ ہوگئی تو جلسہ گاہ کا سنگھاس امید کے ساتھ کرتا تھا کہ فضا بدل گئی ہو۔ اصحاب سموم ہوائیں کے بادل چھٹ گئے ہوں جس وقت ہم دوبارہ جلسہ گاہ میں پہونچے ایک صاحب بڑے ہی کروفر سے بول رہے تھے۔

اب اردو کے ہم آواز حروف کا اخراج ہی اردو کو دوسری زندگی عطا کرسکتا ہے۔ مجھ سے پیشتر جو تجاویز اصلاح املا کے متعلق یا تخفیف حروف تہجی کی بابت رکھی گئی ہیں میں انھیں بسر و چشم قبول کرتا ہوں حروف تہجی کی تشکیل اور مقام بدل دینے سے واقعی بہت آسانیاں طلبا کے لیے پیدا ہو جائیں گی مثلاً ث کے بجائے ایک ایسی ہی شکل بنا کر اس پر ایک نقطہ لگا کر اسے نون کہا جائے اس طرح اس کے بجائے ایک ایسی ہی شکل بنا کر اس کے نیچے دو نقطے رکھے جائیں اور اسے ی دیا) کہا جائے اس سے بچوں کو بھی آسانیاں ہوں گیں اور عبارت میں لکھنے پر اس تبدیلی کا کوئی اثر نہ پڑے گا اردو کا املا بھی بہت دقیق ہے یہی وجہ ہے کہ املا کی غلطیاں طلبا تو طلبا پروفیسر تک کر جاتے ہیں اردو املا کی اصلاح سے پہلے اردو کے ماتی آواز حروف بھی نکالنے کی ضرورت ہے۔ اگرچہ ہمیں یہ بات بہت ناگوار ہوگی اسے ہم کو قطعی قابل قبول نہ ہوگی۔ غالب کو گالب ذوق کو جوک اور داغ کو داگ اور مصحفی کو مسہپی کہتے اور لکھتے ہوئے بہت برا لگے گا لیکن وقت کی ناسازگاری کی بنا پر مصلحتاً ایسا کرنا پڑے گا بعض اوقات ایسے مواقع آجاتے ہیں کہ کسی چیز یا کام کے ناپسند ہونے کے باوجود پسندیدہ بنانا پڑتا ہے اگر جسم کے کسی حصہ میں ناسور ہو جاتے تو پورے جسم کو بچانے کے لیے اس ناسور والے عضو کو نکالنا پڑتا ہے چاہے وہ عضو کتنا ہی خوب صورت کیوں نہ ہو کسی بڑے نقصان کے بدلے چھوٹے نقصان کو برداشت کرنا پڑتا ہے اس لیے جس زمانے میں اردو کی مقبولیت میں کمی آ رہی ہو اسے ہر دل عزیز اور مقبول بنانے کے لیے ہمیں اس ناخوشگوار بات کو خوشگوار بنانا پڑے گا چاہے عالم اور جاہل کی زبان کا فرق بھلے ہی مٹ جائے یا ہمارا رشتہ قدیم ادب سے کٹ جائے ہمیں اس کی کچھ پرواہ نہ کرنا چاہیے ایک مرتی ہوئی زبان کو بچانے کے لیے میرے خیال میں ایسا کرنا بہت ہی ضروری ہے۔

رات بھی زیادہ ہو چکی تھی نیند کا غلبہ بھی ہونے لگا تھا ان بے جان اور غیر دلچسپ تقاریر کی وجہ سے دل نہیں لگ رہا تھا ایک طرح کی غفلت سی طاری تھی مجھے یہ خبر نہ تھی کہ ان کی تقریر کب ختم ہوئی میں ہوش میں اس وقت آیا جب ایک نہایت پیاری اور شیریں آواز میرے کانوں سے ٹکرائی میں ڈائس کی طرف دیکھا برقعہ پوش خاتون مائیک کے سامنے کھڑی تھیں اور بڑی ہی دلکش صاف و شستہ لب و لہجہ میں کہہ رہی تھیں۔

میں اس کی بالکل مجاز نہیں ہوں کہ ایسے لیسے ذی علم اور صاحب کمال علما و فضلا کے سامنے زبان کھولنے کی جسارت کروں۔ میں غیر ارادی اور انجانے جذبے کے تحت مائیک پر آنے کے لیے مجبور ہوئی۔ دراصل واقعہ یہ ہے کہ مجھے ایک برجستہ لطیفہ یاد آگیا جو اس موقع محل کے لحاظ سے بہت موزوں ہے کہنے کو تو وہ لطیفہ ضرور ہے لیکن حقیقت اور زیر بحث موضوع سے بھی دور نہیں ہے لیجئے سنیئے۔

ایک حسین و جمیل دوشیزہ تھی جو حسن و جمال کا مرقع تھی اور دلکشی و رعنائی میں اس کا جواب نہ تھا خوش کلامی اور رویدہ زیبی میں وہ لاثانی تھی شیریں زبانی میں وہ منفرد تھی انھیں اوصاف اور خصوصیات کی بنا پر سارا عالم اس پر فدا تھا اس کے چاہنے والوں کی ایک لمبی فہرست تھی سوئے اتفاق وہ عین عالم شباب میں سخت بیمار پڑ گئی اس کی

زندگی کی کوئی امید نہ رہی اس کے چاہنے والے اس کی یہ حالت دیکھ کر فکر مند ہوئے کوئی ڈاکٹر کو لایا کوئی حکیم کو کسی نے وید جی کی خدمات حاصل کیں ایک بڑے ڈاکٹر نے اس کا معائنہ کرنے کے بعد کہا کہ اگر ان کی ناک کاٹ دی جائے تو یہ اچھی ہو جائیں گی ایک حکیم صاحب نے یہ تجویز کیا کہ اگر مریضہ کے کان کاٹ دیئے جائیں تو انھیں صحت ہو جائے گی۔ وید جی نے غور و فکر کے بعد کہا کہ ان کی ساری بیماری کی جڑ ان کی یہ بڑی بڑی سیاہ سرمگیں آنکھیں ہیں اگر یہ نکال دی جائیں تو ان کی زندگی بچ سکتی ہے۔ ایک دوسرے ہومیو پیتھ ڈاکٹر نے تمام امراض اور علامات کا جائزہ لے کر کہا کہ ان کی یہ سیاہ تحدار زلفیں ابھی نائی کو بلا کر ترشوائی جائیں ورنہ یہ نہیں بچ سکیں گی مریضہ ان حضرات کی تجویز بستر مرگ پر لیٹے لیٹے سن رہی تھی اس نے آہستہ آہستہ سر سے چادر ہٹا کر اپنے ان مسیحا نفسوں سے دریافت کیا حضور اگر میں یہ سب کچھ کرنے کے بعد بھی اچھی نہ ہوئی تو کیا اپنے خالق کے پاس یہی بگڑی ہوئی شکل و صورت لے کر جاؤں گی جب میرا خالق مجھے اس کریہہ بدصورت شکل میں دیکھے گا تو وہ کیا کہے گا اور مجھ سے پرسش کرے گا کہ میں نے تو تجھے اپنی تمام مخلوق میں سب سے زیادہ حسین و خوب صورت بنایا تھا تو یہ کیا بن کر میرے سامنے آئی ہے اس لیے میں یہی بہتر سمجھتی ہوں کہ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا جائے اگر مرنا ہوگا تو مر جاؤں گی اور اگر زندگی ہوگی تو اچھی ہو جاؤں گی ان حالات میں تو میرے لیے یہی بہتر ہے کہ مجھے موت آجائے۔ کسی نے پوچھا "محترمہ آپ کا کیا نام ہے؟"

اس نے نحیف سی آواز میں جواب دیا "میرا نام اردو ہے"۔

یہ کہہ کر اس نے چادر سے اپنا منھ ڈھک لیا۔

میں سمجھتی ہوں کہ یہ لطیفہ اس عالمی ترقی اردو سیمینار پر پورا پورا منطبق ہوتا ہے اور میں محسوس کر رہی ہوں کہ اردو کے ساتھ بھی یہی معاملہ درپیش ہے بلکہ صرف اردو زبان ہی نہیں مسلم سماج! ان سارے اسلامی نقوش کو مٹانے کی یہ ایک بڑی گہری سازش ہے۔

چاروں طرف سے تالیوں کی شور میں صدر جلسہ نے سیمینار کے اختتام کا اعلان کر دیا۔

شفیع اقبال
(حیدرآباد)



ہم نے بھی شیروانی پہنی ——

"ہم نے بھی شیروانی پہنی ——" میرا یہ فقرہ سنتے ہی آپ مجھ سے یہ سوال کر بیٹھیں گے کہ شیروانی تو اکثر لوگ پہنتے ہیں۔ آپ نے شیروانی پہن کر کون سا کارنامہ انجام دیا یا کون سا تیر مار لیا۔! لیکن اگلے جملوں میں ہمارے شیروانی پہننے کی اہمیت و افادیت کا ذکر سن کر یقیناً آپ یہ کہنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ میرا یہ فقرہ برجستہ ہے اور بڑی مناسبت و معقولیت رکھتا ہے۔

ایمان داری کی بات تو یہ ہے کہ شیروانی انتہائی مہذب اور شائستہ لباس ہے۔ اگر اسے کوئی چور، اُچکا، ڈاکو یا بدنام ترین شخص بھی پہن لے تو اس کے چہرے سے موسلا دھار شرافت ٹپکنے لگے گی۔ اس لباس کی عظمت بیان کرنے کے لیے بس اتنا کہنا ہی کافی ہے کہ سرسید احمد خاں کی قائم کردہ علی گڑھ یونی ورسٹی کے طلبا اور میر عثمان علی خاں آصفِ سابع کی قائم کردہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد کے طلبا کے لیے شیروانی پہن کر یونیورسٹی میں حاضر ہونے کو لازم قرار دیا گیا تھا۔ اور یہ شرفا شیروانی کے سات بٹنوں کے علاوہ گلے کے ہک بھی لگایا کرتے تھے تاکہ گلا دبا ہوا رہے اور اساتذہ کے سامنے حلق سے زیادہ زور دار آواز بھی نہ نکلنے پائے۔ زمانے کے انقلابات، معاشرہ اور سماج کی تبدیلی اور معاشی اتھل پتھل کے نتیجے میں شیروانی کی اہمیت و افادیت میں نمایاں تبدیلیاں آئیں۔

پچھلی ربع صدی سے شیروانی کا عجیب و غریب اور حیرت انگیز استعمال ہونے لگا ہے اور شیروانی سے مختلف کہاوتیں بھی مشہور ہوگئی ہیں۔ جیسے "باہر شیروانی گھر میں پریشانی" وغیرہ وغیرہ ——!

جی ہاں! یہ کہاوتیں حقیقت پر مبنی ہیں۔ اس کی ہم زندہ مثال پیش کرسکتے ہیں۔ ہمارا مشاہدہ ہے کہ ہمارے محلے کے ایک صاحب ہمیشہ شیروانی زیب تن کیے ہوئے اور بظاہر بڑے وضع دار آدمی لگتے ہیں لیکن اگر اتفاقاً کبھی

ان سے گلے ملنے کی نوبت آجاتی تو ان کی شیروانی سے انتہائی خطرناک بدبو نکل کر ہماری ناک کے راستے دماغ کو چیرتی ہوئی نکل جاتی ہے اور ہم بجلی کے شاک کے انداز میں اچھل کر ان سے دور ہو جاتے اور کچھ دیر بعد محسوس کرتے ہیں کہ ان کی شیروانی کے مکین چند کھٹمل نقل مقام کر کے ہمارے جسم پر سرسرانے لگے ہیں اور ہمارے خون کے پیاسے ہو گئے ہیں۔ بعد میں ہم کو یہ پتہ بھی چلا کہ ان کے گھر میں مفلسی کے باعث پریشانی بسیرا کیے ہوئے ہے۔

دوسری کہاوت اس طرح ثابت ہوتی ہے کہ ایک شاعر دوست کے ساتھ ایک مرتبہ لمبے سفر کا اتفاق ہوا۔ گرما کا موسم تھا۔ ٹرین میں کافی گرمی ہو رہی تھی۔ چند گھنٹوں بعد شاعر صاحب نے بڑی بے چینی سے اطراف طائرانہ نظر دوڑائی۔ کمپارٹمنٹ کے اس گوشے میں ہمارے سوا کوئی اور نہ تھا۔ اس موقع کو غنیمت جان کر انھوں نے شیروانی اتار ڈالی۔ میری آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور یہ منظر بہ یک وقت اور بیک شت میری آنکھوں کے سامنے تھا کہ شاعر کی شیروانی کے اندر گلے میں قمیص کا کالر ٹنکا ہوا ہے اور دونوں ہاتھ کی کلائیوں میں قمیص کے صرف کف بٹن لگے ہیں اور ایک مختصر سی بنیان شاعر صاحب کی نیم عریانی کو چھپانے کی ناکام کوشش کر رہی ہے!

بہرحال ہم تیزی سے بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ ساتھ شیروانی کے استعمال و افادیت میں ترقی و ترویج پر روشنی ڈالتے جائیں گے۔ ایک دہا گزرنے کے بعد ترقی پسند شعرا ادیب اور دانش وروں کے بڑے طبقے نے اسے اپنا امتیازی نشان بنانے کی کوشش کی اور اس کی شان میں اضافہ کرنے کے لیے تین فٹ چوڑے پائینچوں والے پاجامے استعمال کرنے لگے اور سیاہ رنگ کی شیروانیوں کو ہی اپنے لیے مخصوص کر لیا۔ لیکن شیروانی انھیں زیادہ دنوں تک راس نہ آئی ——— پھر ہمارے ملک، جمہوریہ ہند کے صدور نے اسے اپنا اور اپنے عہدے کا امتیازی نشان بنا لیا، لیکن اس پر کوئی قید نہیں لگائی۔ اس جمہوری ملک میں شیروانی پر ملک کے سربراہوں یا لیڈروں کا اجارہ نہیں ہو سکتا، اس پر عوام کا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا کہ صدر جمہوریہ یا کسی لیڈر کا ہو سکتا ہے۔

اب عوام اور سماج میں شیروانی کی اہمیت و افادیت کا اندازہ کیجیے لوگ جب کسی رشتہ دار یا دوست احباب کے ہاں شادی کی دعوت میں جاتے ہیں تو شیروانی ضرور پہن لیتے ہیں۔ کیوں کہ اس کے استعمال میں بڑے فائدے مضمر ہیں۔ ایک تو یہ کہ آپ جب دستر پر بیٹھتے ہیں اور دستر پر بیٹھنے کے بعد اٹھنے تک کے آخری لمحہ سے بھی استفادہ کرتے ہیں تو میزبان کو یہ اندازہ ہی نہیں ہوتا کہ آپ کی شیروانی کے پس پردہ کتنی ذخیرہ اندوزی کی جا چکی ہے۔ دوسرے یہ کہ اگر آپ کو تنہا دعوت دی گئی ہے تو آپ کی شیروانی کی بڑی بڑی جیبوں کے ذریعہ کباب اور گوشت کی خستہ بوٹیاں یا مرغ کی ٹانگوں کی اسمگلنگ کا بھی موقع ہاتھ لگ جاتا ہے ——— اور اس سے ہٹ کر آپ بلا دعوت بھی کسی تقریب میں گھس جائیں تو بے آبرو ہو کر نکالے جانے کے خطرے سے آپ کو شیروانی ہی بچا سکتی ہے۔

اس کے علاوہ شیروانی کی افادیت و اہمیت کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ اب شیروانی مخصوص مقاصد کے لیے ہی استعمال کی جانے لگی ہے یعنی کہیں مشاعرہ ہو رہا ہو تو شیروانی کا استعمال کیا جائے گا۔ جمعہ کی نماز اور مذہبی جلسہ میں شرکت کے لیے بھی شیروانی زیب تن کی جائے گی۔ ادب کے ٹھیکہ داروں، دانش وروں اور معقول شخصیتوں نے تو شیروانی کی اقسام بھی بنا ڈالی ہیں۔ جیسی تقریب ویسی شیروانی۔ یعنی کوئی معمولی تقریب یا جلسہ ہو تو کاٹن کی شیروانی چلے گی۔ کسی جلسے میں مہمانِ خصوصی بنایا جانا ہو تو ٹریکاٹ کے بجائے سلک کی شیروانی

اور سفید ساده پیجامہ ——— اور اگر کسی جلسے یا تقریب کی صدارت دی جارہی ہو تو گہرے رنگ کی ٹوئیڈ وائول وغیرہ کی شیروانی پر چوڑی دار پیجامہ اور عموماً فرئینی لمبے بالوں والی ٹوپی بھی استعمال کی جاتی ہے تاکہ اس تقریب کی تصویر کشی میں صدر ہر زاویہ سے صدر ثابت ہو۔

بہر حال شیروانی کا استعمال تا قیامت جاری و ساری رہے گا کیوں کہ افادیت اور اہمیت کا کوئی اور لباس مقابلہ نہیں کرسکتا۔

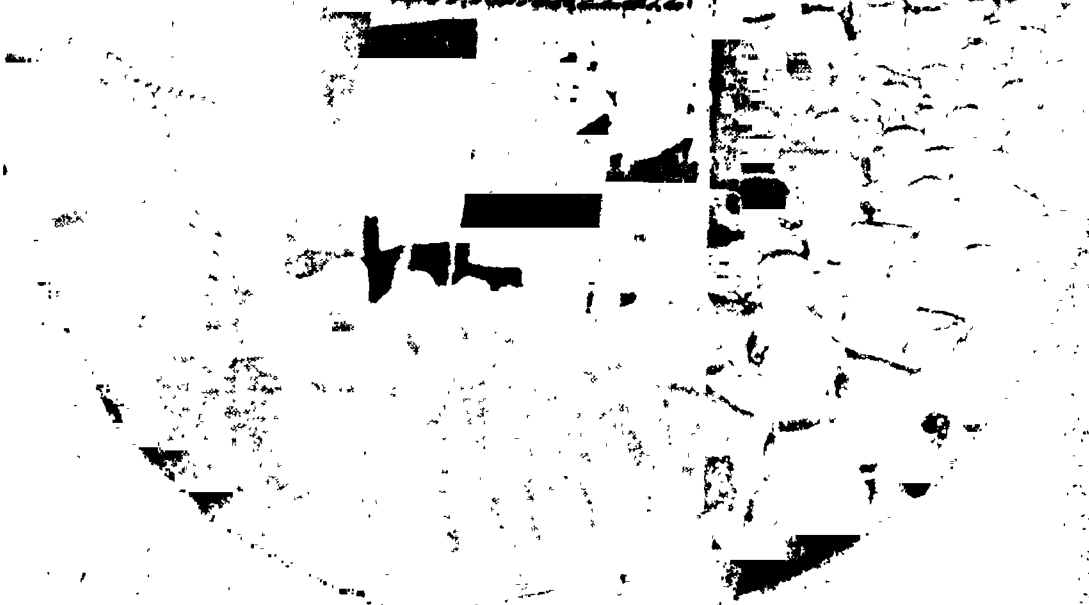
ناخواندگی کا رونا

جگر نظام آبادی

ڈاکیہ اک تار لے کر سیٹھ جی کے گھر گیا
تار لے کر سیٹھ جی سمجھے کہ سالا مر گیا
وہ تھے ان پڑھ تار لے کے پہنچے جب بازو کے گھر
تار کے بازو والے نے جو ڈالی اک نظر
تار پکڑے ہاتھ میں رونے لگا وہ زار زار
سیٹھ بولے کیا لکھا ہے بھائی کہہ دے ایک بار
روتے روتے ہی وہ بولا کیوں کہوں میرے حضور
سمجھے وہ بیمار تھا سالا مرا ہوگا ضرور
وہ بھی اس کے ساتھ ہی رونے لگے زار و قطار
دونوں جب رونے لگے ہونے لگی چیخ و پکار
سیٹھ کو جو روتے دیکھا ان کی بیوی آگئی
تھی بچاری پہلے ہی جاہل بہت گھبرا گئی
بھیڑ اک اطراف ان کے جمع تب ہونے لگی
سیٹھ کی بیوی بچاری چیخ کر رونے لگی
روتے روتے سیٹھ بولے سالا میرا مر گیا
تار یہ آیا ہے دیکھو کیا غضب یہ ہو گیا
تار میں لکھا تھا سالا ٹھیک ہے کل آئے گا
ساتھ اپنے دو کلو اصلی گھی بھی لائے گا
تار کا مضمون پڑھ کر لوگ سب ہنسنے لگے
اور ان کے رونے پہ آوازے سب کسنے لگے
بازو والے نے کہا پڑھنا مجھے آتا نہیں
اور الف بے تے ثے بھی مجھ سے لکھا جاتا نہیں
میں کہاں رویا تھا بھائی تار کی تحریر پہ
میں تو بس رونے لگا تھا اپنی ہی تقدیر پہ
جاہل و ان پڑھ تھا جو میں رو یا جناب
سب کو پڑھنا چاہیے کہتے ہے کم سے کم

مارچ پاسٹ کا پیغام

مرد، عورتیں اور بچے
بزرگ اور آزادی کے سپاہی
یوم جمہوریہ کے موقع پر
جب کندھے سے کندھا ملائے ہوئے آگے بڑھتے ہیں تو
ان کے دل میں صرف ایک ہی خیال
ہوتا ہے — بھارت، ہمارا بھارت
اور اس جذبے کو دیکھنے والے لاکھوں لوگوں کے دلوں میں بھی
صرف ایک ہی جذبہ ہوتا ہے —
مل جل کر رہنے کا جذبہ
ایک ایسا جذبہ جو معاشی یا دیگر چنوتیوں سے
اور بھی مضبوط ہو جاتا ہے
اور یہی جذبہ غریبی کا مقابلہ کرنے اور ترقی کی راہ میں
آگے بڑھنے کے لیے ہمارا حوصلہ بڑھاتا ہے



چنوتیوں کے مقابلے کا عزم
یہی پریڈ کا جذبہ ہے

DAVP

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

ماہنامہ

شگوفہ

حیدرآباد

جلد ۲۵

شمارہ ۵

مئی ۱۹۹۲ء

ایڈیٹر :
ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

ایڈیٹر امدادی :
عابد معز

خصوصی نمائندے

بمبئی ——— [illegible]

دہلی ——— غلام محی الدین

آسٹریلیا ——— ایس ایم [illegible]

کتابت : محمد غالب بفضل محمد

طباعت : دائرہ پرنٹنگ پریس چھتہ بازار

فی پرچہ : ۶ روپے
سالانہ : ۶۵ روپے
بیرونی ممالک سے : ۲۰ ڈالر

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ : ۳۱-[illegible] مارکٹ حیدرآباد

ٹیلیفون 557716 مکان 521064

اِس تھیلی کے چٹّے بٹّے (فہرست)

منیجہ منظور الامین

بردکھاوا

کردار :

عادل ـــــــ ہینڈسم ۔ پیشے سے وکیل
دیبا ـــــــ عادل کی خوبصورت بیوی ۔
سعید ـــــــ عادل کا دوست، سامنے کے دو دانت اونچے ۔
شبنم ـــــــ دیبا کی سہیلی ۔
نارائن ـــــــ عادل کا نوکر

(پہلا سین)

(دیبا کہیں جانے کے لئے تیار ہو رہی ہے۔ اس کا شوہر عادل آئینے میں اس کا عکس دیکھتا ہے)

عادل :- آئینہ بتا رہا ہے عکس دلبر سے ـــ کہیں قتلِ عام کا ارادہ ہے کیا؟ (دیبا ہنستی ہے)

عادل :- یہ ساری تم پر بہت جچتی ہے، واللہ

دیبا :- ہوں، تم کہتے ہو ـــ تبھی تو پہنے جا رہی ہوں باہر۔

عادل (پیچھے سے آکر پکڑ کر) دیکھو دیبا ۔ کہے دیتا ہوں ۔ آج تم کہیں جانے کا نام نہ لینا ۔ ہر چھٹی کے دن غائب ہو جاتی ہو۔

دیبا :- بیکار ناراض ہو رہے ہو۔ کہاں جاتی ہوں میں؟

عادل :- پچھلے اتوار کو کہاں گئی تھیں؟

دیبا :- کیا کروں ـــ اماں کے ساتھ شاپنگ کو جانا پڑا تھا ۔

عادل :- جانا پڑا تھا ـــ اس سے پہلے اتوار کو ؟

دیبا :- انجم کے بچے کو دیکھنے گئی تھی ۔

عادل :- اس سے پہلے .... ؟

دیبا :- کرن کی سالگرہ سے واپس آئی تھیں تبھی سہیلیوں نے ان سے ایک ایک ساری لے لی ۔

عادل :- جی ہاں، Imported تھیں نا ـــ ہمارے اپنے ملک میں تو ۔ صرف بیلوں کی جھولیں بنتی ہیں ۔ وہ آپ کے کس کام کی ۔

دیبا :- جانے کیوں میری سہیلیوں سے جلتے ہو۔

عادل :- ہاں جلتا ہوں ۔ خاص کر یہ سہیلی تو مجھے زہر لگتی ہے جس کے پاس تم جلد جلد جاتی ہو۔

دیبا :- واہ تم نے تو اسے کبھی دیکھا نہیں ۔

عادل :- بیگم دیبا یہ آپ کی سہیلیاں غضب ہیں ۔

دیبا :- کیا بگاڑا ہے انہوں نے تمہارا؟

عادل :- پوچھتی ہو کیا بگاڑا ہے؟ ذرا اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھو ——— شادی سے پہلے تم مجھے زیادہ حاصل تھیں —— حویلی میں آتے جاتے —— روشندان سے تانک جھانک کرتے —— جیسے شادی کے دن ہی میرا ماتھا ٹھنکا تھا۔ جب تم سہیلیوں کے جھرمٹ میں آرسی مصحف کیلئے آئی تھیں۔

دیبا :- تو کیا ہوا ——— میری سہیلیوں نے تم پر تیر ترازو چلائی تھیں کیا۔؟

عادل :- Exactly جو نظریں مجھ پر اٹھ رہی تھیں وہ سادہ اور معصوم ہرگز نہیں تھیں ——— اور میری ڈھال صرف میرے ملنگے سے آبلتا پسینہ۔

دیبا :- بڑے معصوم بنتے ہو ——— جیسے تم نے کچھ کیا ہی نہیں ——— تم بھی تو چھپے رستم ہو۔

عادل :- میں نے کیا کیا؟ —— یہی نا کہ بڑی چابکدستی سے کنی کاٹتا رہا کہ کہیں میری نظر اُن سے الجھ نہ جائے تو آواز آئی ——— جنگلی ہے دیبا تجھے سہنا پڑے گا۔ گلے میں پٹہ ڈال کر۔

دیبا :- (ہنس کر) پھر کیا ہوا؟

عادل :- ہونا کیا ——— وہ پیش گوئی حرف بہ حرف سچ نکلی ——— فرق صرف اتنا رہا کہ کسی منکر ما کالر کی جگہ تمہاری باہوں نے مجھے بس میں کر لیا۔

دیبا :- (خوش ہو کر) عادل۔

عادل :- اور اب شادی کے بعد گھر کے باہر میرے نام کا بورڈ تمہاری پسند کا ہے۔ میرے وارڈ روب میں میرے کپڑے تمہاری پسند کے ہیں ——— چائے کا جو برانڈ میں پیتا ہوں تمہاری پسند کا ہے ——— یہ سر سراتے پردے تمہاری پسند کے ہیں ——— اور تم ——— میں کیا کروں تم مجھے پسند ہو۔

دیبا :- (موقع سے فائدہ اٹھا کر) تو اب میں جا کر باورچی دیکھ کے جاتی ہوں؟

عادل :- (غرا کر) اور جو مجھے ناپسند ہیں وہ ہیں تمہاری سہیلیاں۔ جب میں خود کو سنجیدہ بنا کے رکھتا ہوں تو ایک دوسرے کو کہنیاں مارتی ہیں۔ ہنسوں بولوں تو عجیب عجیب نظروں سے دیکھتی ہیں ——— کبھی کبھی تو دل چاہتا ہے کہ مرد ذات کی اصلیت پر اتر آؤں ——— اور انہیں ایسا سبق پڑھاؤں..

نارائن :- صاب (با آواز) صاب بی بی تو چلی گئیں آپ کس سے بول رہے ہیں۔

عادل :- (چونک کر) چلی گئیں ——— یہ تو ہونا ہی تھا ——— یہ سب آپ کے کرتوت ہیں بابا آدم۔

نارائن :- جی صاب' کچھ کہا ہم سے؟

عادل :- ہاں ——— اگر تم بابا آدم ہو ——— ابھی جاؤ اور آدم بھائی کی دکان سے چائے کی پتی لے آؤ۔ اور ہمیں چائے دو۔

نارائن :- چائے کی پتی تو ڈھیروں پڑی ہے گھر میں۔

عادل (تنک کر) ہاں ——— یہ گھر میں گارے سے نہیں چائے کی پتی سے بنا ہے نا! تم ہمیں وہ چائے دو جو ہم شادی سے پہلے پیا کرتے تھے۔

نارائن : بی بی جی پوچھیں گی . . . .

عادل :- (ڈانٹ کر) جاؤ چائے لاؤ...

نارائن :- ذرا کمرہ تو ٹھیک کر لوں.. .. بی بی جی کہیں گی. . .

عادل :- تمہارے خیال میں میں اس گھر کا نمبر دو شہری ہوں؟ تم مجھے کب سے جانتے ہو۔؟

نارائن :- اس وقت سے جب آپ سارے گھر میں ننگے بھاگا کرتے تھے ——— بڑی بی بی جی کے ہاتھ نہیں لگتے تھے تو میں آپ کو دبوچ کر نکر پہنایا کرتا تھا۔

عادل :- کوئی اور بات یاد دلاؤ نا۔ (خجل)

نارائن :- جب آپ نے اسی کشمیر سے لڑائی ہوئی تھی آپ نے اسی کا کان کاٹ لیا تھا۔

عادل :- (زیر لب) کمبخت! (باآواز) کیا کوئی اور
بات یاد نہیں آتی تمہیں ... مثلاً ...
نارائن : (دل ہی دل میں دانت پیس کر) جیسے چلتی
ہوئی تیلی چھوادی تھی سیکر پاؤں سے ۔
عادل :- بس بس ـــــ اچھا یہ بتاؤ بی بی جی کو کب
سے جانتے ہو ۔؟
نارائن :- (الگ سے) ہوں ـــــ اب وکالت
مجھی پر صاف ہوگی ۔
عادل :- کیا پوچھ رہا ہوں؟
نارائن :- ایک سال سے ۔
عادل (تپائی پر کلام رکھ کر اور کچھ سادگی) وفاداری
مجھ سے زیادہ ان کے ساتھ ہے ۔ بی بی جی کو یہ پسند وہ پسند
کہنا بی بی جی کی پسند کا بنے گا ۔ یعنی جو ان کی پسند وہ تمہاری
پسند ۔
نارائن :- جی نہیں ۔ مثلاً دیوار پر لگی یہ پینٹنگ
مجھے بالکل پسند نہیں ـــ آپ ہی تو اس روز شکلا جی سے
بی بی کی پسند کی اتنی تعریف کر رہے تھے ـــــ اور وہ بھی
سر ہلا رہے تھے ۔
عادل :- آج پتہ چلا کہ ہر مہینے میں تمہیں تنخواہ
اپنی ہی جاسوسی کے لئے دیتا ہوں ۔
(کال بیل بجتی ہے)
عادل :- جاؤ ـــــ جو بھی ہے کہہ دو میں گھر پر
نہیں ہوں ۔
(سعید آتا ہے)
سعید :- آہستہ ایسی بات آواز دبا کر کہا کرو!
تمہاری آواز چار میل دور سے میں نے سن لی ۔
نارائن :- اب میرے لئے کیا حکم ہے؟
عادل : (خفا ہو کر) جاؤ ۔
(نارائن ... چلا جاتا ہے)

عادل :- لے آؤ ۔
نارائن :- بی بی جی والی یا آدم جی والی ۔؟
عادل :- جہنم والی لے آؤ ۔
سعید :- نارائن اس کا مطلب ہے گرم گرم ۔ جاؤ ۔
(نارائن چلا جاتا ہے)
عادل :- اب تم بھی اپنی شان نزول بتاؤ ۔
(سعید آہ بھرتا ہے)
عادل :- یہ صورت پر بارہ کیوں بج رہے ہیں؟
سعید :- (گھڑی دیکھ کر) بارہ کہاں؟ ابھی تو گیارہ
بج کر ساڑھے منٹ ہی ہوئے ہیں ۔
عادل :- (جھنجھلا کر) سعید تم کدھر سے آئے ہو ۔
سعید :- ادھر سے کیوں ۔؟
عادل : واپس بھی وہی راستہ جاتا ہے (غصے سے
اچھلتا ہے)
سعید :- یار چھوڑو مت ـــ بیٹھے رہو ۔
عادل :- میں بیٹھا ہی نہیں کھڑا بیٹھا ہوں ۔
سعید :- بھابی کہاں ہیں ۔؟
عادل :- (بیزار) پکنک پر گئی ہیں سب سہیلیوں کے
ساتھ ـــــ (سختی سے) تم مجھ سے ملنے آئے ہو یا اس سے؟
سعید :- میرے بچپن کے ساتھی ـــــ دوست میں
تم ہی سے ملنے آیا ہوں ـــــ کتنا اچھا ہوا کہ آج بھابی گھر پر
نہیں ہیں ۔
عادل :- اس میں بغلیں بجانے کی کیا بات ہے ۔
سعید :- یار خدا قسم بات ہی کچھ ایسی ہے ۔
عادل :- ارے کمبخت کہیں پولیس تو تیرا
پیچھا نہیں کر رہی ہے؟
سعید :- مذاق چھوڑو یار ـــــ
عادل :- (رازداری کے لہجے) تو کیا آخر تو نے تاج محل
کو گروی ڈال ہی دیا؟

سعید:- عادل ـــ یار ـــ میرے بچپن کے دوست بات یہ ہے کہ ....

عادل:- بس اب فرفر بول جا۔

سعید:- اب کیسے کہوں یار۔

عادل:- پہلے دو چار لمبی سانسیں لے لے۔

سعید:- وہ بات یہ ہے ....

عادل:- اب تو کچھ کہے گا یا اٹھا کر پھینک دوں باہر؟ (ناراضگی کا اظہار کرتا ہے)

سعید:- آج مجھے پھر بر دکھاوے کیلئے بلایا گیا ہے۔

عادل:- تو پھر اپنا تھوبڑا دکھا آؤ نا ـــ یہاں کیوں آئے ہو ـــ؟

سعید:- (مچل کر) یہ بر دکھاوا تیرہویں بار پڑ رہا ہے ـــ میں نہیں جاؤں گا۔

عادل:- تو پچھلے بارہ بر دکھاوے کون سے مبارک ثابت ہوئے تھے جو تیرھواں منحوس ہوگا۔

سعید:- (اٹھ کر) تم میرے زخموں پر نمک چھڑک رہے ہو۔

عادل:- ارے ارے بیٹھ جا ـــ یار اب تو ہی تو ایک تنہا کنوارا رہ گیا ہے ـــ اور سب تو بیویوں کو پیارے ہو گئے ـــ شادیاں کرلیں اور ساتھ چھوڑ گئے۔ بتا اب کیا ارادے ہیں؟

سعید:- ارادے بعد میں بتاؤں گا ـــ پہلے تم مجھے رائے دو۔

عادل:- میری رائے پر عمل کروگے؟

سعید:- بیشک۔

عادل:- دو پیسے کا زہر لا کر کھالے لیکن شادی کے بکھیڑوں میں نہ پڑ (کندھے پر ہاتھ رکھتا ہے)

سعید:- ہشت! تم میرے سے کمینے ہو ـــ میں کہتا ہوں ہشت ـــ ایک تو اب وہ پیسے کا زہر بھی نہیں ملتا ـــ سال بھر پہلے ملتا ہوگا ـــ تب تو نے کیوں نہیں کہا تھا۔

عادل:- یار تم برا مان گئے۔ میں نے تو تجربہ کی بات کہی تھی ـــ اچھا اب آگے کہو۔

سعید:- خدا کی قسم (اس) بار میں جاکر واپس نہیں آؤں گا

عادل:- ٹھیک ہی تو ہے تجربہ ایک ایسی کنگھی ہے جو اس وقت حاصل ہوتی ہے جب انسان گنجا ہوتا ہے۔

سعید:- میں سنجیدہ ہوں۔ تو پڑھو۔ (اخبار آگے بڑھاتا ہے)

عادل:- (پڑھتا ہے) ضرورت رشتہ - ایک شریف پٹھان خاندان کی خوبصورت، تعلیم یافتہ ـــ برسر روزگار لڑکی کیلئے جو امور خانہ داری سے اچھی طرح واقف ہے ـــ خط و کتابت کا پتہ بھی دیا ہے ہوں ـــ اور یہ کیا ہے؟)

سعید:- (خطوط بڑھا کر) یہ وہ خطوط ہیں جو میرے خطوں کے جواب میں آئے۔

عادل:- ہوں تو اس بار تم معاملہ دوستوں کے سپرد کرنے کی بجائے خط و کتابت کے سارے بکھیڑے آپ نے اپنے آپ ہی طے کر لئے ـــ اب کیا بچا ہے۔

سعید:- بس یہیں تو بات اٹکی ہے ـــ اور یہیں مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔

عادل:- میری ہی کیوں؟

سعید:- کیونکہ تم ہینڈسم تو ہو ہی ـــ بلکہ شادی شدہ بھی ہو۔

عادل:- کیا مطلب؟

سعید:- میرے پچھلے تجربے ـــ جہاں جہاں اب تک بر دکھاوے کیلئے گیا ہوں - ان سب سے دو لڑکیاں اب میرے دو دوستوں کی [illegible] ـــ اسلئے اس بار ایک شادی شدہ [illegible]

[illegible]

سعید:- تم نے سنجیدہ نہ ہونے کی [illegible]

یہ میری زندگی کا معاملہ ہے۔

عادل :- اور تم نے یہ کس طرح سمجھ لیا کہ میں بہت ہی پرتھوی راج چوہان ہو سکتا ہوں۔

سعید :- میں جا رہا ہوں۔

عادل :- ارے بیٹھے۔ میرے اکلوتے، خوش نصیب ——— ابھی تک کنوارے دوست اور بتا کیا بات ہے۔ لے میں سنجیدہ ہو گیا۔

سعید :- بَر دکھاوے کیلئے تجھے جانا ہوگا۔

(عادل اچھل پڑتا ہے)

عادل :- عقل نے چکر کھائی ہے کیا ؟

سعید :- یہ کوئی غیر قانونی حرکت نہیں ہوگی۔

عادل :- جی ہاں ! یہی تو ہوتا آیا ہے رہتی دنیا سے۔

سعید :- تمہیں صرف ایک اچھا سوٹ پہن کر میرے ساتھ جانا ہوگا۔ اور ایسا برتاؤ کرو گے کہ جس سے ظاہر ہونے ہی نہ پائے کہ اصلی دولہا کون ہے۔ پھر تم آرام سے کوچ میں چلے جانا اور میں صرف شادی کے دن سہرا باندھے طلوع ہوؤنگا۔

عادل :- لیکن یہ اس لڑکی کے ساتھ ناانصافی ہوگی ——— اور مجھ پر جوتے پڑیں گے تو الگ۔

سعید :- اگر تمہاری ذراسی مدد سے میں ایک لڑکی کا مالک بن سکتا ہوں تو کیا تم میری اتنی مدد بھی نہیں کرو گے۔

عادل :- یار کیا کروں اپنی وکالت آڑے آتی ہے (ذرا تیور بدل کر) یہ سب تیرے ان بڑھ آگے کو نکلے دانتوں کا قصور ہے کہ کوئی لڑکی تجھ سے شادی کرنے تیار نہیں ہوتی ہزار بار کہا کہ دانت ٹھیک کرالے۔ مانتا ہی نہیں۔

سعید :- [illegible] دوست دل ——— دانستہ [illegible] کیلئے ہیں جیسے تم دیکھ لینا [illegible] ہوؤنگا۔ دانستہ تیار ہوؤنگا۔

عادل :- لیکن ذرا تو آنے دو ——

سعید :- اسی لئے تو تمہیں ساتھ لے جا رہا ہوں۔

عادل :- کہ وہ میرے دھوکے میں تم سے شادی کرلے

سعید :- لیکن یہ دھوکا ایک حسین دھوکا ہوگا میرے دوست ——— میری محبت پانے کے بعد وہ تم پر لعنت بھیج کر یکسر بھول جائے گی۔

عادل :- (مری ہوئی آواز) لیکن مجھے ڈر لگ رہا ہے یار ——— دنیا کو اگر پتہ چل گیا کہ میں اس کا شوہر ——— بر دکھاوے کیلئے گیا تھا ——— وہ آج ضرور جلدی لوٹ آئے گی۔

سعید :- تو پھر چل دیئے دوست ——— دیکھ لی یہ کی یاری۔ خدا حافظ۔

نارائن :- صاب ایک بات بتاؤں۔

عادل :- غضب ہو گیا ——— اس نے سب سن لیا۔

سعید :- ڈر کی کوئی بات نہیں ——— نارائن اپنا ہی آدمی ہے۔ بلکہ یہ بھابی کو سنبھال لے گا ——— کیوں نارائن ؟

نارائن :- اور کیا صاب ورنہ تم زندگی بھر ہماری طرح کنوارے رہ جاؤ گے۔ جیسے بی بی جی نے کہا تھا کہ کسی طرح سمجھا بجھا کر صاب کو کھانا کھلا دوں ——— وہ دوپہر میں نہیں شام میں اپنی سہیلیوں کے ساتھ پکچر دیکھ کر لوٹیں گی۔

عادل :- جیو نارائن (سعید کی طرف) اپنا پھر اپنا ہوتا ہے تو لائیے نارائن جی اب ہمیں سمجھا بجھا کر کھانا کھلا دیں۔

سعید :- (جاتے ہوئے) پانچ بجے تیار رہنا۔

(دوسرا سین)

(لڑکی والوں کا گھر۔ کال بیل کی آواز سنکر ایک لڑکی جاکر دروازہ کھولتی ہے۔ عادل سوٹ میں اور سعید بھی اپنی دانست میں خاصے تیار ہوکر آئے ہیں۔ لڑکی نے

(اپنی آنکھوں پر کالا چشمہ لگایا ہوا ہے)

سعید :- (کھنکھار کر) وہ — شبنم عنایت اللہ

لڑکی :- (دونوں کی طرف حیران ہو کر دیکھتی ہے)
جی ہاں — یہیں رہتی ہیں — آپ — شاید وہ اخبار۔۔

عادل :- جی جی — بالکل وہی۔

لڑکی :- آئیے اندر تشریف لائیے — دراصل
آپ میں سے کون —

سعید :- واہ کمرہ کیا اچھا سجا رکھا ہے۔ آپ
اکیلی رہتی ہیں یہاں — (دریشہ خطمی ہو کر لڑکی کو گھورتا ہے)
(عادل اسے ٹیبل کے نیچے پیر کچلتا ہے) کیا آپ یہاں
اکیلی رہتی ہیں؟

لڑکی :- میں اپنی بہن کے ساتھ رہتی ہوں — میں
ابھی آپ کو اس سے ملاؤں گی۔

سعید :- آپ سے مل لیا تو آپ کی بہن سے مل لیا۔
— چشم بددور — (لڑکی کچھ شرما جاتی ہے)

لڑکی :- میں آپ دونوں کیلئے چائے لے آؤں۔
(چلی جاتی ہے)

عادل :- ارے کمبخت یہ وہ نہیں ہے۔ تو بے
کر گھورے جا رہا ہے دانت نکالے۔

سعید :- تو کچھ کہہ لے یار۔ مجھے تو یہی پسند آگئی
دیکھا نہیں اس کے چہرے پر عینک کتنی بھلی لگتی ہے۔

عادل :- کمبخت کہیں کی — یہ بھی کوئی وقت
ہے کالا چشمہ لگانے کا۔ اور بھول مت کہ تو اس کی بہن کو
دیکھنے کیلئے آیا ہے۔

سعید :- کاش! یہ خود اپنی بہن ہوتی۔

عادل :- پھر بھی تیرا کوئی چانس نہیں۔ ہزار بار
کہا دانت ٹھیک کروالے اب تک تیری کم سے کم تین شادیاں
ہو گئی ہوتیں۔

سعید :- (اترا کر) تجھے تو ہر وقت میرے دانتوں
کی فکر رہتی ہے — ایسا ہوتا تو سارے ہاتھی کیوں لگے
ڈنٹسٹ کے پاس کھڑے ہوتے۔

عادل :- بند کر بکواس شاید وہ آرہی ہے۔

سعید :- ہاں آرہی ہے جان چمن چائے کی ٹرالی دھکیلتے
ہوئے — وہ مجھ سے ضرور پوچھے گی۔ آپ کتنی چینی لیں گے
میں کہوں گا آپ بس اپنی انگلی ڈبو دیں۔

عادل :- بند کرے گا اپنی فرسودہ بکواس —
(لڑکی چائے لئے آتی ہے)

لڑکی :- آپ چائے لیں — میں آپ کی ملاقات
شبنم سے کروا دوں گی — زمانہ بہت بدل گیا ہے میں
درمیانی کڑی میں یقین نہیں رکھتی۔ (پسینہ پونچھتی ہے)

سعید :- پریشان خود آپ ہو رہی ہیں۔ ہمیں تو کوئی
اعتراض نہیں۔

لڑکی :- بات یہ ہے کہ شبنم ذرا شرمیلی ہے۔ بڑی مشکل
سے راضی کیا ہے — بہتر ہوگا آپ دونوں بس ایک
دوسرے کو دیکھ لیں۔ باقی باتیں بعد میں طے ہوتی رہیں گی۔ آپ دونوں
چائے لیں۔ تب تک میں اسے دیکھ آتی ہوں کہ تیار ہوئی
یا نہیں — (جاتی ہے)

عادل :- اب کیا ہوگا؟

سعید :- خبردار جو تو نے ہمت چھوڑی — بس صورت
ہی دکھانا تو ہے تجھے —

عادل :- پھر میں ایک منٹ بھی یہاں نہیں ٹھہرونگا
بھانڈا پھوٹ گیا تو وہ جوتے پڑیں گے وہ جوتے پڑیں
گے کہ کسی موچی نے پیر سئے ہوں گے۔ اور میں دیبا
کے گھر آنے سے پہلے وہاں پہنچ جانا چاہتا ہوں۔

سعید :- میں نے کہا نا اسے نادانی سنبھال لے گا

عادل :- تو نہیں جانتا نادانی بڑا ڈبل کراس
ہے۔ وہ دیبا کو لیکر یہاں پہنچ بھی سکتا ہے۔

سعید :- نادانی چپ چاپ کہیں کا۔ ایسی ویسی

حرکت کی اور بھاگ کھڑا ہوا تو میں تجھے کبھی معاف نہیں کروں گا عادل کے بچے۔

عادل :۔ چپ وہ آ رہی ہے۔

(لڑکی آتی ہے)

لڑکی : آپ اندر جا سکتے ہیں۔ پتہ نہیں آپ دونوں میں سے کون .... (puzzled دونوں کی طرف دیکھتی ہے)

سعید :۔ (عادل سے) جاؤ بھی جاؤ ——— (لڑکی سے) یہ ہمارے ہم دوست آپ کی بہن کو ضرور پسند آئے گا۔

(عادل اسے غصہ سے دیکھ کر اندر جاتا ہے)

لڑکی :۔ انسان صرف صورت ہی صورت تو نہیں ہوتا آپ بیٹھئے نا کھڑے کیوں ہیں۔

(لڑکی اپنا چشمہ اتار دیتی ہے۔ اس کی دو آنکھیں دو رنگوں کی ہیں۔ سعید اسے دیکھتا رہ جاتا ہے)

(چوتھا سین)

(شبنم ——— سر ڈھانکے پشت کئے۔ کھڑکی سے باہر دیکھتی کھڑی ہے)

عادل :۔ (کھنکھار کر) سنئیے، آپ ضرور حسین ہوں گی۔ آپ مجھے دیکھ لیں شیطان نہیں ہوں (ابھی وہ بات کرتا ہی رہتا ہے کہ شبنم پلٹتی ہے جو درحقیقت شبنم نہیں دیبا ہے)

دیبا :۔ تم!

عادل :۔ دیبا۔

دیبا (بہت گھبرا کر) عادل ——— عادل میں تمہیں سب سمجھا دوں گی۔ تم مجھے غلط مت سمجھو۔

عادل :۔ (خود سے) دلِ نادان سنبھل ——— پانسہ پلٹ گیا ہے ——— تجھے ڈرنے کی ضرورت نہیں ——— (آواز میں درد بھر کر) دیبا۔ کیا میں اتنا قابل نفرت ہو گیا ——— میں جا رہا ہوں۔

دیبا :۔ (پریشان) عادل میری بات تو سنو۔

(ہاتھ تھام لیتی ہے)

عادل :۔ (تھیٹریکلی) آہ چھوڑ دو دیبا میرا ہاتھ۔ اب کچھ کہنا سننا فضول ہے۔

دیبا۔ عادل خدا کیلئے...

عادل : کیا کہنا چاہتی ہو۔ اب کہنے کے لئے رہ کیا گیا ہے۔ پھر بھی کہو کیا کہنا ہے۔

دیبا :۔ تم جانتے ہو۔ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔

عادل : ٹھیک ہے آگے بڑھو (دیبا آگے بڑھتی ہے) عادل میں نے بات کو آگے بڑھانے کے لئے کہا تھا (دیبا ہنس سکتی ہے) (عادل رومال دیکر) کہو کیا کہنا ہے۔ میں سن رہا ہوں

دیبا : شبنم میری ... تھی لیکن بہت اچھی سہیلی ہے۔

عادل :۔ ایک کا اور اضافہ ہو گیا ... لیا۔

دیبا :۔ اس کی دو آنکھیں دو رنگ کی ہیں۔

عادل :۔ (نعرہ لگا کر) تو وہ شبنم ہے جو ذکر کر رہے ہیں؟

دیبا :۔ ہاں ——— اس کا رشتہ کہیں طے ہی نہیں ہوتا اب تو وہ خلاف شادی کے لئے تیار نہیں ہوتی تھی لیکن ہم سب سہیلیوں نے مل کر اسے مجبور کیا۔ اور ہم نے پلان بنایا تھا کہ اب اگر کوئی لڑکا اسے دیکھنے آئے تو اس کی بجائے مجھے دکھا دیا جائے۔

عادل : اینیا wrong ایک مناسب کام کے لئے غیر مناسب حرکت تھی یہ۔

دیبا : (رو کر) اور تم میرے ہوتے ہوئے دوسری شادی کی تلاش میں آئے ہو۔

عادل :۔ میں مجبور ہو گیا تھا ——— اگر تم چاہو تو اب بھی ہماری اکھڑی ہوئی زندگی سدھر سکتی ہے۔

دیبا :۔ کیسے۔؟

عادل :۔ وعدہ کرو کہ چھٹی کے روز مجھے چھوڑ کر غائب نہیں ہوا کرو گی۔

دیبا :۔ نہیں کبھی نہیں۔

عادل :۔ تو چلو باہر ——— (دونوں ہاتھ میں ہاتھ لئے باہر آتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ شبنم اور سعید نے بھی ایک دوسرے کا ہاتھ تھام رکھا ہے۔ شبنم سعید کے ساتھ اور سعید اس کی آنکھوں میں تکتے جا رہے ہیں۔

دیبا: ۔ سعید بھیا ـــــ سمجھ میں نہیں آتا کیا تماشہ ہے۔

سعید: ۔ تماشہ نہیں بھابی ـــ حقیقت ہے ـــ ہم دونوں شادی کر رہے ہیں۔

دیبا: ۔ مگر آپ عبدالرحمٰن تو نہیں ہیں۔ ورنہ میں آپ کو نام سے پہچان جاتی۔

عادل: ۔ اس آفتی کا نام عبدالرحمٰن سعید ہی تو ہے۔ تم اسے صرف سعید نام سے جانتی ہو۔

دیبا: ۔ اوہ میرا تو سر چکرا رہا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کس نے کس کو بیوقوف بنایا۔

سعید: ۔ بھول جاؤ بھابی ـــ بس یہ سوچو کہ انجام بخیر شد۔

دیبا: ۔ تو شبنم ـــ اب شادی کی تیاری بھی تو کرنی ہوگی۔ اگلے اتوار چلیں گے۔ (عادل بڑبڑاتا رہتا ہے)

(عادل سر تھام کر صوفے پر بیٹھ جاتا ہے)

اسمٰعیل ظریف
(حیدرآباد)

قطعات

شاعرہ بیگم بھی ہے شوہر بھی شاعر ہے حضور
بات اس جوڑے کی اک محفل میں کل اچھی لگی
پہلے بیگم نے سنائی بعد شوہر نے غزل
ہمکو شوہر سے تو بیگم کی غزل اچھی لگی

★

اُن کے کوچے سے گذر ہو تو غزل کہہ لیجئے
یا کوئی پیش نظر ہو تو غزل کہہ لیجئے
ایک محبوب کی چاہت سے بھلا کیا ہوگا
دل میں محبوب نگر ہو تو غزل کہہ لیجئے

★

ویسے یہ بات میں نے کسی سے کہی نہیں
کچھ لوگ کہہ رہے ہیں غزل آپ کی نہیں
بکواسیت کا نام ظرافت نہیں ظریفؔ
جو دل کو گدگدا نہ سکے شاعری نہیں

★

پرویز یداللہ مہدی

بمبئی سے بمبئی جان

سفر تمام ہوا، کام بھی تمام ہوا!

ملک ہندوستان جنت نشان کو رنگا رنگ محض اس لئے نہیں کہا جاتا کہ یہاں کالے گورے سانولے، اونچی ناک والے چپٹی ناک والے، کھلے دہانوں والے۔ بھینچے بھینچے دہانوں والے بلند قامت، پست قامت، میانہ قامت والے لوگ ابتدائے آفرینش سے رہتے چلے آرہے ہیں بلکہ اس کو رنگا رنگ کہنے کا سبب یہ بھی ہے کہ یہاں ہر گھاٹ کے پانی کا مزہ الگ ہے۔ بولی کا ذائقہ کچھ اور ہے محاوروں اور اصطلاحوں کا چٹخارہ جدا ہے۔ مثال کے طور پر صوبہ گجرات کے طول و عرض میں ٹرینوں کی آمد و رفت کے تعلق سے جو اصطلاح بولی جاتی ہے۔ وہ نہ صرف منفرد ہے بلکہ عجیب و غریب بھی۔ اس کا علم ہمیں پچھلے دنوں اس وقت ہوا جب دو دن کے لئے بڑودہ جانے کا اتفاق ہوا (جیسے بڑودہ پہنچ کر ہم پر یہ عقدہ کھلا کہ تاریخی شہر بڑودہ اب "وڈودرہ" کہلاتا ہے)

جس روز ہماری واپسی تھی، اتفاق ہمیں اسٹیشن پہنچنے میں تاخیر ہوگئی۔ سوٹ کیس قلی کے حوالہ کرتے ہوئے دریافت کیا "بمبئی جانے والی ٹرین ہے کہ جا چکی۔؟"

قلی نے جھٹ سے جواب دیا۔ وہ تو پندرہ منٹ پہلے اٹھ گئی۔

قلی کے جواب پر ہم بھونچکے رہ گئے کیونکہ ہم جس کلچر کے پروردہ ہیں اور جو اردو کلچر کہلاتا ہے۔ اس میں یا تو گھر نیلام پہ اٹھتا ہے، آدمی جہاں سے اٹھتا ہے یا پھر دل کہ جان سے اٹھتا۔ یا کم سے کم دل سے دھواں اٹھتا ہے۔ لیکن یہاں تو قلی مہاشے نے سالم ٹرین ہی اٹھا دی تھی۔ ہم نے گڑبڑا کر کہا۔

"بھیا تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ پوری ٹرین کیسے اٹھ سکتی ہے۔ بھلا۔

قلی نے ہمیں نیچے سے اوپر تک دیکھتے ہوئے کہا! جیسے ہر روز اٹھتی ہے؟ ویسا ئی آج بھی اٹھ گئی۔!

ہم نے سٹپٹا کر پوچھا۔ کون اٹھایا۔؟

بولا۔ گارڈ اٹھایا۔ ہری جھنڈی ہلا کے سیٹی بجا کر لیکن چنتا میں پڑنے کی بات نہیں بمبئی کی اور جانے والی اگلی گاڑیاں ہیں ابھی ایک گھنٹے کے بعد گجرات میل ادھر سے اٹھتی ہے جو تم کو چار بجے بمبئی لے جا کے پھینک دے گی۔ پھر

ساڑھے دس کو ایک گاڑی اٹھتی ہے جو تم کو ۱۱ بجے بمبئی لے جاکے پھینک دے گی۔ اس کے بعد ساڑھے گیارہ بجے ایک اور گاڑی اٹھتی ہے جو تم کو آٹھ بجے رات کو بمبئی لے جاکے پھینک دے گی۔ اس کے بعد سوا بارہ بجے ایک پاسنجر۔۔۔۔

ہم نے قلی کی بات کاٹ کر حیرت سے پوچھا کیا یہاں ہماری ٹرینیں بمبئی لے جاکر پھینک دینے والی ہیں؟ کوئی گاڑی صحیح سلامت بمبئی پہنچانے والی نہیں اٹھتی؟ قلی نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ تم ہماری بات ٹھیک سے سمجھے نہیں بابو صاحب! پھینکنے کا مطلب سچی میں پھینکنے کا نہیں ہے۔ اصل میں ہمارے گجرات میں بات کرنے کا ڈھنگ تھوڑا سا نرالا ہے۔ بات کی اہمیت کے واسطے ایک ہی شبد ادھر کا بچہ بچہ بولتا ہے۔

ٹرینوں کی آمدورفت کے تعلق سے مستعمل اس مخصوص گجراتی اصطلاح کا تفصیلی ذکر ہم نے اس لئے کیا کہ جو بات صوبہ گجرات میں محض محاورے بلکہ بقول قلی مہاشے کے "اٹکسٹ" کے طور پر بولی جاتی ہے وہ عملی طور پر بمبئی کی لوکل ٹرینوں پر صد فیصد صادق آتی ہے۔

مسافروں کا بوجھ اٹھانے اور پھر انھیں مطلوبہ اسٹیشنوں پر پھینک دینے کے صفات سے یہ (بدرجۂ اتم) آراستہ ہیں۔ اگر پھینک کا یہ اندوہناک نظارہ دیکھنا ہو تو بھیڑ بھاڑ کے اوقات میں پوری بندر یا چرچ گیٹ اسٹیشن پہنچ جائیے پھر ٹرینوں سے اترتی ہوئی بھیڑ کو دیکھئے ایسا معلوم ہوگا کوئی اندیکھی قوت، کوئی غیبی طاقت مسافروں کو زبردستی ٹرین میں سے کھینچ کھینچ کر پلیٹ فارم پر پھینک رہی ہو اور مسافروں کی اکثریت ایسی ناگفتہ بہ حالت میں دکھائی دیتی ہے جیسے صرف سفر ہی تمام نہیں ہوا کام بھی تمام ہو گیا۔ بقول شاعر ؎

نہ مانس نے کوئی اعلان خاص و عام ہوا
سفر تمام ہوا کام بھی تمام ہوا

آخری وارننگ :-

کبھی کبھی کچھ ڈیرنگ باز جواں مرد لوکل ٹرین کے ڈنڈوں سے لٹک کر سفر کرنے کے بجائے ٹرینوں کی چھتوں پر بھی آسن جمائے سفر کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان پر بیک نظر ماہر کرتب بازوں کا گمان ہوتا ہے۔ لیکن یہ نہ تو کرتب باز ہوتے ہیں نہ شعبدہ باز اصل میں یہ جواں مرد خود کو جواں مرگ ثابت کرنے کا بیڑا اٹھائے ہوئے ہوتے ہیں۔ گویا ان کے لئے ٹرین کا سفر محض بہانہ ہوتا ہے یہ زندگی سے بیزار، موت کے طلب گار لوگ ٹرینوں کی چھتوں کا انتخاب صرف اس نیت سے کرتے ہیں بقول شاعر ؎

ٹرین کی چھت پر بھی بیٹھا چاہیئے
خودکشی کے واسطے کیا چاہیئے

چنانچہ چھت پر بیٹھ کر بھی نیچے نہیں بیٹھتے بلکہ قدم قدم پر بجلی کی ٹرین کو اسطرح چیلنج کرتے رہتے ہیں ؎

سرفروشی کی تمنا اس دل بے کل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے لوکل میں ہے

خیر ٹرین کا سفر چاہے اندرون کمپارٹمنٹ کیا جائے یا بیرون کمپارٹمنٹ ایسے تجربہ کار لوگ جو لوکل ٹرینوں کے سفر میں عمر کے ساتھ اپنے بعض اعضائے رئیسہ و غریبہ بھی گنوا چکے ہیں ان کی یہ متفقہ رائے ہے کہ بمبئی کی مضافاتی ٹرینوں میں

سفر کرنے اور دنیا سے سفر کرنے میں صرف بال برابر کا فاصلہ ہے۔ لہٰذا احتیاط لازم ہے اگر آپ خود خیر و عافیت سے رہ کر اپنے بال بچوں کی خیر و عافیت خداوند کریم سے ٹھیک ور ٹھیک چاہتے ہیں تو چاہے سفر میں ہوں یا حضر میں احتیاط کا جھنڈا اور ٹرین کا ڈنڈا مضبوطی سے تھامے رہیے۔ خدانخواستہ اگر دوران سفر آپ نے جلنے انجلنے میں احتیاط کا دامن چھوڑا تو پھر سمجھ لیجئے کہ زندگی نے آناً فاناً آپ سے منہ موڑا اور موت کے بے رحم ہاتھوں نے مثل لیمو کے آپ کو نچوڑا۔ بالفاظ دیگر وقت سے پہلے ہی استاد ذوق کا یہ شعر آپ پر پوری طرح صادق آجائے گا ؎

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

اس لئے بہتری اس میں ہے کہ لوکل ٹرینوں میں سفر کرتے وقت "جنبش مکن ہشیار باش" والے اگلے وقتوں کے شاہی فارمولے کو اپنا لیجئے اپنی اور اپنے اہل و عیال کی خیریت کو خطرے میں پڑنے سے بچا لیجئے۔

●●

مفلسؔ تابعی
(بارسی ٹاکلی)

تضمین بر غزل غالب

آنکھیں رکھتا ہوں، کان رکھتا ہوں سارے باتوں پہ دھیان رکھتا ہوں
ایک کلّے میں پان رکھتا ہوں میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں
کاش پوچھو کہ مدّعا کیا ہے

دیکھنے میں تو پھول جیسے ہیں رنگ ہے اور نہ بُو ہے، ایسے ہیں
دو ہیں ایسے تو چار ویسے ہیں یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں
غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے

بندۂ زر ترا بھلا ہوگا اے تونگر ترا بھلا ہوگا
روزِ محشر ترا بھلا ہوگا ہاں بھلا کر ترا بھلا ہوگا
اور درویش کی صدا کیا ہے

شرم کی اور حیا کی ہے اُمید کچھ تو ناز و ادا کی ہے اُمید
دردِ دل کو دوا کی ہے اُمید ہم کو اُن سے وفا کی ہے اُمید
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

صابرؔ بہاری
(رانچی)

یہ کہانی پھر کبھی

کیوں پھروں ہوں مارا مارا یہ کہانی پھر کبھی بعدِ شادی ہوں کنوارا یہ کہانی پھر کبھی
کر لیا چکّر گوارا یہ کہانی پھر کبھی کون جیتا کون ہارا یہ کہانی پھر کبھی
اے حسینو مرے پہ آف مری اُمید پر کیوں پھرا ہے جھاڑو تمارا یہ کہانی پھر کبھی
اب کھلی آنکھیں مکاں میں اپنے رہنا ہے کٹھن کس قدر فیشن نے مارا یہ کہانی پھر کبھی
خوں لگا کر ہم ہوئے ہیں دوستو لٹّو مار خاں کس نے گلشن کو سنوارا یہ کہانی پھر کبھی
ہنستے ہنستے رو دیئے صابرؔ بہاری بے کھٹک
پھر نہ سنیئے گا خدارا یہ کہانی پھر کبھی

مشتاق احمد یوسفی

(بہ سلسلۂ گزشتہ)

کار، کابلی والا اور الہ دین بے چراغ

۱۳

روٹی تو کسی طور کما کھائے مچھندر

خان صاحب نے اب خود شیو کرنا اور شلوار میں کمر بند ڈالنا بھی چھوڑ دیا۔ روزانہ خلیفہ آتا تھا۔ جیسا کہ ہم پہلے کہیں بیان کر چکے ہیں۔ خلیفہ کو سائیسی، کوچوانی، ڈرائیوری، کھانا پکانا، بیراگیری، حجامت، باغبانی، پلمبنگ یہ سبھی کچھ کیا نہیں آتا تھا۔ اس فن میں بھی طاق تھا جو ان سب سے زیادہ فائدہ مند ہے۔ ۔ ۔ ۔ مصاحبی اور خوشامد۔ جب سب ہنر دھندے ٹھپ ہو جاتے تو خلیفہ اپنے بنیادی پیشے کی طرف رجوع کرتا۔ اپنے بیٹے کو جو آبائی پیشے سے متنفر و محجوب تھا اکثر نصیحت کرتا کہ بیٹا حجام کبھی بے روزگار نہیں رہ سکتا۔ حجام کی ضرورت ساری دنیا کو رہے گی۔ تا وقتیکہ ساری دنیا سکھ مذہب اختیار نہ کرے اور سکھ یہ کبھی نہیں ہونے دیں گے۔ خلیفہ دن رات خان صاحب کی خدمت میں جٹا رہتا۔ شام کو ان کے دوستوں کا غول کوہستانی ڈیرے ڈالتا تو لپک جھپک اندر سے قہوہ اور چلم بھر بھر کے لاتا۔ ایک دفعہ اپنے گھر سے چار اصیل مرغوں کی، جنھوں نے اذان دینی نئی نئی سیکھی تھی، بریانی بنا کر لایا۔ ان کے متعلق اس کا دعویٰ تھا کہ جب یہ جوان پٹھے علی الصبح گردن پھلا پھلا کر اذان دیتے تو سارے محلے کی مرغیاں بے قرار ہو کر پھڑکنے لگتی تھیں۔ اس نے یہ بھی کہا کہ جب گورنر جنرل ہاؤس میں ان کے عہدے پر فائز تھا تو اس نے اپنی آنکھوں سے خواجہ ناظم الدین کو متوفین کے والد کا روسٹ کھاتے دیکھا۔ پھر مسٹر محمد علی بوگرہ نے عالیہ سے (دوسری) شادی کے بعد متوفی مرغ کی سوگوار بیگمات کے انڈوں کا مقوی حلوہ بنا کر نوش کیا۔ ایک دن کوہاٹ کی اراضی کا ایک تنازعہ طے ہونے کی خوشی میں وہ فریقین کے لئے مسلم روسٹ کر کے لایا۔ ثبوت میں ایک بکرے کی کٹی ہوئی دُم بھی اٹھا لایا تاکہ خان صاحب کو شبہ نہ گزرے کہ بکرے کی بجائے سستی بھیڑ بھون کے بھیڑ دی (اس رعایت لفظی پر وہ دل ہی دل میں بہت خوش ہوا) خان صاحب نے چکھتے ہی بولے کہ ان چھوٹی ران والے بکرے کی اتنی بڑی دم ہو ہی نہیں سکتی۔ ایڈم کے اس پہلو پر خلیفہ کی نظر نہیں گئی تھی۔ چنانچہ ہاتھ جوڑ کے کھڑا ہو گیا۔ پھر خان صاحب کے گھٹنے پکڑ کے اور جھوم جھوم کر ٹانگیں دبانے لگا۔

خان صاحب کو خلیفہ کے پکائے ہوئے کھانوں سے زیادہ اس کی لچھے دار باتوں میں مزہ آتا تھا۔ فرماتے تھے جس بات کو کہنے والا اور سننے والا دونوں ہی جھوٹ سمجھیں، اس کا گناہ نہیں ہوتا۔ وہ اس کی شیخی کو بڑھاوا دیتے تھے۔ وہ ہر دوسرے تیسرے، ان کے تلووں پر روغن بادام کی مالش کرتا۔ کہتا تھا، اس سے دماغ کو تراوٹ پہنچتی ہے۔ ایک دن اچانک خان صاحب کو کچھ خیال آگیا۔ کہنے لگے کیا تیرے خیال میں مغز میرے تلووں میں اتر آیا ہے؟ لیکن خلیفہ ٹھیک ہی کہتا تھا۔ اسلئے کہ سات آٹھ منٹ بعد ہی خان صاحب ریوالور تکیئے کے نیچے رکھے، زور زور سے خراٹے لینے لگتے۔ ہر تین چار منٹ بعد چونکتے اور خراٹوں میں نیا سُر لگا کر پھر سے سو جاتے۔ ایک دن وہ بڑے اونچے سروں میں خراٹے لے رہے تھے کہ پیر دباتے دباتے خلیفہ کا ہاتھ نہ جانے کیوں ان کی جیب میں پڑ گیا۔ آنکھیں کھولے بغیر کہنے لگے کہ بدبخت! نقدی تو میرے کوٹ کے جیب میں ہے۔!

دراصل وہ ان کے منہ لگ گیا تھا۔ خدمت گار، درباری، چلم بھرنے والا، حجام، داستان گو، میر مطبخ، اردلی، گائیڈ، مخبر مشیر ----- وہ ان کا سبھی کچھ تھا۔ تین چار دن آپس میں نہ جانے کیا سکوٹ ہو رہی تھی۔ روزانہ شام کو بھی کسی نہ کسی بہانے بشارت کے ہاں آجاتا۔ ان کی بیگم نے دو تین دفعہ کہا کہ ان کا آنا مصلحت اور نحوست سے خالی نہیں۔

آدم خور شیر کو پہچاننے کی آسان ترکیب

ایک دن صبح اٹھتے ہی خان صاحب نے اچانک یہ تجویز پیش کی کہ اب تک جو رقم آپ نے دی ہے اسے منہا کرنے کے بعد جو رقم واجب الادا بنتی ہے اس کے عوض یہ گاڑی جو عرصہ دراز سے بیکار کھڑی ہے مجھے دے دیجئے۔ بشارت نے کہا، لکڑی کی اصل مالیت کسی طرح سات ہزار سے زائد نہیں۔ جبکہ اس گاڑی کی قیمت، مع نئی باڈی اور نئے پرزوں کے، کسی طرح نو ہزار سے کم نہیں۔ مزید برآں جس انگریز کی سواری میں یہ رہتی تھی اسے سر کا خطاب ملنے والا تھا۔ خان صاحب نے جواب دیا آپ کی گاڑی کم از کم بہت سے بہت پانچ ہزار کی ہوگی۔ جبکہ میری لکڑی نو ہزار کی تھی۔ آپ نے تو پٹرول اور پنکچر جوڑنے کا تمام خرچ، خلیفہ کی تنخواہ اور اس کی زوجہ کا دین مہر بھی کار قیمت میں جوڑ دیا۔ بہت کچھ بحثا بحثی اور گھڑ سودے بازی کے بعد واجب الادا رقم کا فرق گھٹ کر وہیں آگیا جہاں سے قضیہ شروع ہوا تھا۔ یعنی ۳-۹-۲۵۱۳۔ اب خان صاحب اس کلیم کے عوض یہ گاڑی چاہتے تھے۔

"خان صاحب! آپ بزنس کر رہے ہیں یا بارٹر (barter)؟" بشارت جھنجلا کر پوچھا۔

"یہ کیا ہوتا ہے، صیب؟"

"وہی جو آپ کرنا چاہتے ہیں"

"پشتو میں اس کے لئے بہت برا لفظ ہے"

وہ جب پشتو کا حوالہ دے دیں تو پھر کسی کی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ اصل یا ترجمہ کی فرمائش کرے۔ اکثر فرماتے کہ پشتو منت زاری اور فریاد و فغاں کی زبان نہیں۔ نر آدمی کی للکار ہے۔ مطلب ان کا یہ تھا کہ ڈنکے کی چوٹ بات کرنے، کچھار میں غافل سوتے ہوئے شیر کی مونچھیں پکڑ کر جگانے اور پھر اس سے ڈائیلاگ بولنے کی زبان ہے۔ مرزا اس زمانے میں کہتے تھے کہ خان صاحب ان لوگوں میں سے ہیں جو شیر کی مونچھیں اکھاڑنے پر

رہی اکتفا نہیں کرتے، بلکہ اس کے منہ میں اپنا سر دے کر یہ علمی تحقیق کرنا چاہتے ہیں وہ ویجی ٹیرین ہے یا آدم خور۔

"ونٹہ سٹہ"

بشارت نے خان صاحب کی آسانی کے لئے بارٹر کو تبادلۂ جنس کہنا شروع کر دیا۔ پھر اس کا مفہوم سمجھایا۔ طول طویل تشریح سن کر بولے "یارا جی! تو پھر سیدھا سادھا ونٹہ سٹہ کیوں نہیں کہتے جس میں ہر فریق یہی سمجھتا ہے کہ وہ گھاٹے میں رہا۔"

اور یہی بھونڈی مثال برہانِ قاطع ثابت ہوئی۔ اسی پر تصفیہ ہو گیا۔ خان صاحب نے بڑی خوش [illegible] سے اعلان کیا کہ وہ جنسی تبادلے کے لئے تیار ہیں۔ دونوں نے ایک دوسرے کو مبارکباد دی اور اس طرح گلے ملے جس طرح دو دکاندار ملتے ہیں جو ایک دوسرے کے بہنوئی بھی ہوتے ہیں اور سالے بھی۔

لیکن بشارت دل ہی دل میں خوش تھے کہ کھٹارا گاڑی سات ہزار میں بک گئی۔ خان صاحب ان سے بھی زیادہ خوش کہ دلدر لکڑی کے عوض نو ہزار کی کار ہتھیالی۔ دونوں فریق اس صورتحال کو حق کی فتح سمجھ رہے تھے۔ حالانکہ ہم سے دل کی بات پوچھیں تو باطل نے باطل کو پچھاڑا تھا۔ اور کوڑے کرکٹ کا تبادلہ کوڑے کرکٹ سے ہوا تھا۔ خان صاحب کار کو چمکارتے ہوئے کہنے لگے "ہم اس کو طورخم، لنڈی کوتل کا سیر کرائے گا۔ اخروٹ کے درخت کے سائے میں کھڑا کرے گا۔ اس میں کابل سے قراقلی، قالین اور چلغوزے بھر کے لائے گا۔ کابل کے شمال کے ایک چلغوزے میں ایمان سے نکاح کے دس سال بعد معلوم کے برابر طاقت ہوتا ہے۔!"

تصفیہ ہوتے ہی خان صاحب نے تازہ تازہ سیکھی ہوئی لکھنوی اردو اور کانپوری لہجے کے شکنجے سے خود کو ایک جھٹکے میں آزاد کر لیا۔ چرب زبان دشمن پر فتح پانے کے بعد "کیموفلاژ" کی ضرورت نہ رہی۔

ازبس کہ خان صاحب کے نزدیک مشکی سے بہتر دنیا بلکہ پل صراط پر بھی کوئی سواری نہیں ہو سکتی تھی، وہ اس کار کو جو اب ان کی ہو چکی تھی، مشکی کہنے لگے۔

تاریخِ بالوشاہی

بشارت نے چوری چھپے دو رکعت نمازِ شکرانہ ادا کی۔ مگر خان صاحب سے اپنی خوشی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔ وہ ہر چند دائیں روڈ پر سے گزرتے ہوئے تانگوں کے گھوڑوں کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے تھے کہ یہ لمحہ غلبہ و مسرت کا تھا۔ دشمن کے گھر کے چوگرد گھوڑے پر شہ کام* نکلنے کی گھڑی تھی۔ ضبط نہ ہو سکا تو سرو دست مشکی کے زانو یعنی کار کے

---

*شہ کام۔ مجھے مختار مسعود صاحب نے کہ صاحبِ طرز انشاپرداز ہونے کے علاوہ شہسواری میں بھی یدِ طولیٰ رکھتے ہیں بتایا کہ یہ وہ باوقار اور ceremonial چال ہے جو گھوڑا اس وقت چلتا ہے جب بادشاہ اس پر سوار ہو۔ پیدل کا بادشاہ ان نہیں سمجھ پاتا۔ ہمارے جن نوجوان پڑھنے والوں نے کبھی کوئی بادشاہ شاہی گھوڑا یا خود جناب مختار مسعود کی چال نہیں دیکھی وہ "آوازِ دوست" میں ان کے اشہبِ قلم کا طرزِ خرام ملاحظہ فرمائیں۔ اس پر سوار لیلیٰ معنی کے پیٹ کا پانی نہیں ہلتا۔ البتہ قاری گھنٹوں ہنستا رہتا ہے۔

بادام ڈھاکر تھپتھپاکر دل سے حوصلے نکالے۔ انجن کی تھوتھنی پر ہاتھ رکھ کر شاباشی دی۔ ان کا بس چلتا تو اسے (گھاس دانہ) کھلا کر اپنے ہاتھ سے کھریرا کرتے۔ کچھ دیر بعد جیسے ہی ایک تانگے والے نے اسپنسر آئی ہسپتال کے سامنے درخت کے سائے میں گھوڑا کھولا، وہ ایک کراس پر چڑھ گئے۔ اور بشارت کی دوکان کے دو چکر لگائے۔ پھر بشارت ہی سے جگ میں ٹھنڈا پانی منگوایا اور سر پر اس کے تریڑے لئے۔ بعد ازاں سیر بالوشاہی منگوا کر تقسیم کی۔ بشارت کے تین رشتے داروں کے حصے کی کھا کر خود پہنچ گئے۔ بشارت دنگ رہ گئے۔ حد ہوگئی۔ انتہائی بدگمانی کے عالم میں بھی انھیں کبھی ان تینوں پر شبہ نہیں گزرا تھا کہ ایسے متقی اور منافق نکلیں گے۔ درپردہ خاں صاحب سے مل جائیں گے۔ بہرکیف بالوشاہی کے ذریعہ منافقت کا بھانڈا پھوٹنے کی تاریخ میں پہلی مثال تھی۔ ہمارا مطلب ہے بالوشاہیوں کی تاریخ میں!

نیاز مندانِ بتوں نے رائفلیں چلا چلا کر اعلانِ صلح کیا۔ ایک پڑوسی دکاندار دوڑا دوڑا بشارت کو مبارکباد دینے آیا۔ وہ یہ سمجھا کہ ان کے ہاں ایک اور بیٹا ہوا ہے۔

ایک ٹرک ڈرائیور سے جو دکان پر پرمٹ کی لکڑی کی ڈلیوری لینے آیا تھا، خاں صاحب نے خواہش ظاہر کی کہ ذرا ہمیں ہماری کار میں گوردھن داس مارکیٹ کی سیر کرا دو، تمہاری چائے پانی کا بندوبست ہو جائے گا۔ کچھ دیر بعد لوٹے تو کار کی کارکردگی سے بے انتہا خوش تھے۔ کہنے لگے خدا کی قسم! بالکل والد کے تُشکی کی طرح ہے۔

ایک پینٹر کو بلا کر راتوں رات کار پر سیاہ اسپرے پینٹ کروایا تاکہ عادات کے علاوہ شکلاً بھی تشکی سے مشابہت مکمل ہو جائے۔

"Et, tu, Brute!"

دوسرے دن بشارت دکان کے شٹر بند کروا رہے تھے کہ سامنے ایک ٹرک آکر رکا جس میں ڈرائیور کے پہلو میں تھانے کے منشی جی بیٹھے تھے اور پیچھے ان کی چوری شدہ لکڑی کے علاوہ رشوت میں پیش کردہ لکڑی بھی لدی تھی۔ تختوں پر وہی رائفل بردار کانسٹیبل ٹنگا تھا۔ خاں صاحب نے ایک ڈی ایس پی کے توسط سے جو بنوں کا رہنے والا ان کا گرائیں تھا، نہ صرف سارا مال شیر کے منہ سے نکلوایا تھا، بلکہ اس کے دانت بھی تبرکاً نکال لائے تھے۔ ٹرک کے پیچھے پیچھے ایک ٹیکسی میں (جو شارعِ عام پر اپنے عقب سے مقررہ مقدار سے زیادہ دھواں خارج کرنے کی بنا پر ابھی ابھی پکڑی گئی تھی) وکیل صاحب پہنچے تاکہ باہمی رضامندی سے صلح صفائی ہو جائے اور معاملہ رفع دفع ہو۔ ان سے چند قدم کے فاصلے پر وہی ملزم نما موکل ایک ہاتھ میں ایک بریف کیس تھامے اور دوسرے میں قانون کی کتابیں اٹھائے پیچھے چل رہا تھا۔ وکیل صاحب کے ہاتھ میں مٹھائی کے دو ڈبے تھے۔ ایک خاں صاحب کو پیش کیا اور دوسرے کے بارے میں بشارت سے فرمایا کہ میری جانب سے بھابی صاحبہ اور بچوں کو دے دیجیے گا۔

تھانے کے منشی جی نے پوچھا ہمارا خلیفہ کہاں ہے؟ بشارت کو یہ معلوم کر کے بڑا شاک ہوا کہ پولیس لاک اپ میں رات گزارنے کے بعد سے خلیفہ ہفتے میں [illegible] تھانے جاتا ہے اور ایس ایچ او سے لے کر زیرِ حراست ملزموں کی خط حجامت بناتا رہتا ہے۔ تھانے کے اسٹاف میں یا کسی حوالاتی ملزم کے ہاں مستقبل قریب یا بعید میں ولادت ہونے والی ہو یا تھانے کے نواحی علاقے کی جھگیوں میں کوئی عورت بھاری قدموں سے چلتی نظر آجائے تو اس سے پکا وعدہ [illegible] لیتا کہ اگر لڑکا ہوا تو ختنہ میں کروں گا۔ اس کے والد مرحوم کی وصیت تھی کہ بیٹا، اگر تم بادشاہ بھی

بن جاؤ تو اپنے آبائی پیشے کو نہ چھوڑنا۔ دوم، جس کسی سے ملو اس کو ہمیشہ کیلئے اپنا کر کے رکھو یا۔ اس کے ہو رہو۔ سو وہ زندگی بھر سب کا ہو رہا۔

خان صاحب رات دو بجے تک قرضوں اور "پولا" توڑ کر کھیتوں کو پانی دینے کے لئے سرسری مقدمات، جن میں گالی گلوچ کی آمیزش سے پیچیدگیاں پیدا ہو گئی تھیں، نمٹاتے رہے۔ اثنائے سماعت وانفصالِ مقدمات میں لوگ جوق در جوق ان کو خدا حافظ کہنے آتے رہے۔ عدالت ہر ایک کو میلہ رانطے کچیر کہہ کر چائے چلم چلغوزے اور بالوشاہی سے تواضع کرتی رہی۔ صبح چار بجے سے خان صاحب نے اپنا سامان باندھنا شروع کر دیا۔ فجر کی اذان کے بعد ایک اصیل مرغ کو قبلہ رو کر کے قربانی کی۔ اس کا سر بلّی کو اور باقیات گھر والوں کو ناشتے پر کھلائیں۔ دل خود چبایا۔ مسکراتے ہوئے فرمایا کسی بڑی موذی پر فتح حاصل ہو تو ہمارے قبیلے کا دستور ہے کہ مرغے ذبح کرتے ہیں۔ دشمن گیا گذرا ہو تو دنبے پر اکتفا کرتے ہیں۔ ناشتے پر ہی اعلان کیا کہ نشکی مال گاڑی سے نہیں جائے گی بلکہ میں اسے پنجاب کی سیر کراتا، دریاؤں کا پانی پلاتا "بائی روڈ" لے جاؤں گا۔

بچے ان کے جانے سے بہت اداس تھے۔ انھوں نے خود بھی اقرار کیا کہ میرا بھی جانے کو جی نہیں چاہتا۔ مگر کیا کروں، لکڑی کا کاروبار ہی ہے اگر کراچی میں جنگلات ہوتے تو خدا کی قسم تم لوگوں کو چھوڑ کر ہرگز نہ جاتا۔ پھر انھوں نے ڈھارس بندھائی کہ انشاءاللہ دو مہینے بعد پھر آؤں گا۔ ایک بوہری سیٹھ سے وصولی کرنی ہے۔ اکیلا آدمی ہوں۔ بڈھا ہو گیا ہوں۔ ایک وقت میں ایک ہی بے ایمان سے نمٹ سکتا ہوں۔

بشارت کو مسکراتا دیکھ کر خود بھی مسکرا دیئے۔ ارشاد فرمایا۔ کراچی میں اُدھار پر بزنس بیوپار کرنا ایسا ہی ہے جیسے کماد (گنّے) کے کھیت میں کبڈی کھیلنا! جتنا بڑا شہر ہوگا۔ اتنا ہی بڑا کھپلا اور پھڈا ہوگا۔ جس کی چھت زیادہ بڑی ہے اس پر برف بھی زیادہ گرے گی۔

پھر سب سے چھوٹے بچے کو بہلانے کیلئے پائینتی پر لیٹ گئے۔

چلتے وقت انہوں نے بشارت کی بیٹی منیزہ کو جان کی چھپی ہو گئی تھی پانچ سو روپے دیئے۔ یہ اس کی پانچویں سالگرہ کا تحفہ تھا جو آٹھ دن بعد منائی جانے والی تھی۔

۴۷-۹-۳ روپے نوکروں میں تقسیم کئے۔ اس سے قبل گذشتہ شب وہ ایک پٹھان نوجوان گل داؤد خان کو دس ہزار روپے دے چکے تھے تاکہ وہ اپنے چچا پر جس نے اس کی زمینوں پر قبضہ غاصبانہ کر رکھا تھا۔ کوہاٹ جا کر فوجداری مقدمہ دائر کرے اور اس کے سوتیلوں کی جائیداد پر قبضہ کرنے کی ایسی سزا دلوائے کہ سب چچاؤں کو عبرت ہو۔ ان تینوں رقموں کا حاصل جمع ۲۰۵۴۷-۹-۳ روپے بنتا ہے اور یہی وہ رقم تھی جس کا سارا جھگڑا تھا اور جس کی وصولی کے لئے انھوں نے اپنے کمانڈر ادر بہیر و بنگاہ سمیت لشکر کشی کی تھی۔ بلکہ بقول مرزا، غنیم کے قلعے کے قلب میں تمبو تان کر جھنڈا گاڑ رکھا تھا۔

اس قضیے کو تیس سال ہونے کو آئے۔ ہماری ساری عمر حساب کتاب میں گزری ہے۔ مگر ہم آج بھی یہ نہیں بتا سکتے کہ درحقیقت کس کی کس پر کتنی رقم نکلتی تھی اور آخر میں جیت کس کی رہی۔ ہمارا تو یہی سمجھ کا قصور تھا۔ جنھیں ہم حریف سمجھے وہ دراصل حلیف اور دوست نکلے اور — — —

حاسبِ دوستاں در دل۔ *

خان صاحب نوکروں کو دے دلا کر بشارت کے والد کو خدا حافظ کہہ رہے تھے کہ بشارت کیا دیکھتے ہیں کہ ٹھیک نو بجے ایک شخص چلا آ رہا ہے جس کا صرف چہرہ خلیفہ سے ملتا ہے۔ تنگ موری کے پاجامے۔ ململ کے کرتے اور مخمل کی ٹوپی کے بجائے ملیشا کی شلوار اور کرتا۔ سر پر زری کی کلاہ پر مشہدی پگڑی، کامدار واسکٹ۔ پیر میں ٹائر کے تلے والی پشاوری چپل۔ واسکٹ اور کلاہ بالترتیب تین سائز بڑی اور چھوٹی تھی۔ کوٹ کی آستین پر امام ضامن۔ ہاتھ میں بلبن + گھوڑے کی لگام۔ خان صاحب نے مطلع کیا کہ بلبن بھی ایک ٹرک میں بنوں جا رہا ہے۔ ان کے اصطبل میں جہاں پانچ گھوڑے بیکار کھڑے ہنہنا رہے ہیں، وہاں ایک اور سہی۔ ہر جانور اپنے حصے کا رزق ساتھ لاتا ہے۔

خان صاحب نے اعلان کیا کہ مشکی کو خلیفہ ڈرائیو کر کے پشاور لے جائے گا اور تا قیامت واپس نہیں آئے گا جس کے دو سبب ہیں۔ پہلا تو یہ کہ اس کے بزرگ قندھار سے براہ پشاور واردِ ہندوستان ہوئے تھے۔ زادِ سفر میں ننگی تلوار کے سوا کچھ نہ تھا۔ سو یہ بھی کثرتِ استعمال سے گھس گھسا کر استرا بن گئی! دوسرا یہ کہ انھوں نے اس نمک حلال کو ملازم رکھ لیا ہے۔

بشارت کا منہ پھٹا کا پھٹا رہ گیا...

"خلیفے! تم ......!"

"سرکار!....." اس نے اس انداز سے ہاتھ جوڑ کر گھگیاتے ہوئے کہا کہ کسی عذر و وضاحت کی ضرورت نہ رہی۔ اس میں خجالت بھی تھی۔ لجاجت بھی۔ اور بہرطور روٹی کما کھانے کا حوصلہ بھی۔

۱۴

جب عمر کی نقدی ختم ہوئی

خان صاحب کو گئے جانے کے کوئی چھ سات ہفتے بعد ان کا املا کرایا ہوا ایک خط موصول ہوا۔ لکھا تھا کہ "بفضلِ خداوندی یہاں ہر طرح سے خیریت ہے۔ دیگر احوال یہ کہ میں نے اپنے دورانِ قیام میں آپ کو بتانا مناسب نہ سمجھا کہ ناحق آپ تردد کرتے اور صحبت کا سارا لطف کرکرا ہو جاتا۔ پشاور سے میری روانگی سے تین ہفتے پیشتر ڈاکٹروں نے مجھے جگر کا سرطان بتایا تھا۔ دوسرے درجہ میں جس کا کوئی علاج نہیں۔ جناح ہسپتال والوں نے بھی یہی تشخیص کی۔ ڈاکٹروں نے مشورہ دیا کہ ہر وقت اپنا دل پشوری کرتے رہو۔ خود کو خوش رکھو اور ایسے خوش باش لوگوں کے ساتھ زیادہ وقت گزارو۔ جن کی صحبت تمھیں بشاش رکھے۔ بس یہی تمھارا علاج اور خوب ڈٹ کر (میٹھی زندگی) کا نسخہ ہے۔ یارا جی میں بچہ نہیں ہوں۔ جو انھوں نے کہا میں سمجھ گیا۔ اور جو نہیں کہا وہ بھی بخوبی سمجھ گیا۔ یہ مشورہ تو مجھے کوئی طبلہ بجانے والا بھی مفت دے سکتا تھا۔ اس کے لئے ایم آر سی پی اور ایف آر سی ایس ہونے اور جگہ بے جگہ ٹونٹی لگا کر دیکھنے کی ضرورت نہیں

---

* مرزا عبدالودود بیگ دوستوں کو قرض دے دے کر رقم اور دوست دونوں سے ہاتھ دھو چکے ہیں۔ قدرے تصرف کے ساتھ "حاسبِ دوستاں در دل" کہتے ہیں۔

+ بلبن: ملاحظہ ہو "اسکول ماسٹر کا خواب"

"میں نے لنڈی کوتل سے لانڈی تک نگاہ ڈالی۔ آپ سے زیادہ محبتی، خود غرض سے پچنے اور دوسروں کا دل شاد کرنے والا کوئی بندہ نظر نہیں آیا چنانچہ میں ٹکٹ لے کر آپ کے پاس آ گیا باقی جو کچھ ہوا وہ طبیعت کا رنگ اتارنے کا بہانہ تھا۔ جتنے بھی دن آپ کے ساتھ گذرے اتنے دنوں سے میری زندگی بڑھ گئی۔ خدا آپ کو شادمان اور مجھ پر مہربان رکھے۔ آپ کو میری وجہ سے تکلیف ہوئی۔ اس کے لئے معافی مانگنا لکھنوی تکلفات میں شامل ہو گا۔ جو مجھ جیسے جاہل کے بس کا کام نہیں۔ مگر دوستی میں تو یہی کچھ ہوتا ہے۔ میرا دادا کہتا تھا کہ فارسی میں ایک مثل ہے کہ یا تو ہاتھی بانوں سے دوستی مت کرو۔ اور اگر کرلی ہے تو پھر اپنا مکان ایسا بنواؤں جو ہاتھیوں کی ٹکر سہہ سکے۔

"ایک ٹرک والے کے ہمراہ مردان کا دس سیر تازہ گڑ جس میں نئی فصل کے اخروٹوں سے مغز کاری کی گئی ہے۔ سوات کے شہد کے تین چھتے قدرتی حالت میں بعد موم اصلی و مگس مردہ اور ایک صراحی دار گردن والی ٹوکری میں بیس فصلی بٹیریں روانہ کر رہا ہوں۔ یوسفی صاحب کیلئے ان کا پسندیدہ کینٹ والی دکان کا دوسہ ... اور بینڈی کا ہنٹرز بیف ایک نازک سی ہوادار ٹوکری میں ہے۔ چلتے وقت انھوں نے گندھارا تہذیب کے دو تین اعلیٰ نمونوں کی فرمائش کی تھی۔ کچھ تو روانگی کی افراتفری پھر میں جاہل آدمی۔ یہاں اپنے ہی جیسے دو تین دوستوں سے پوچھا۔ انہوں نے مجھے گندھارا کے دفتر بھیج دیا۔ وہ بولے ہم تو نہایت اعلیٰ ٹرک اور genuine پارٹس بیچتے ہیں۔ تمہیں کس کا نمونہ درکار ہے! دوشنبہ کو ایک ٹھیکیدار کا منشی چار سنگ سیاہ کی مورتیاں' نہایت خوبصورت تخت بھائی مردان کی کھدائی سے چادر میں چھپا کر لایا تھا۔ مگر ایک جاننے والے نے جو قدِ آدم سے بڑی مورتیاں اسمگل کر کے امریکہ بھیجتا رہتا ہے' مجھے بتایا کہ یہ بدھ نہیں ہیں۔ بہرحال تلاش جاری ہے۔ بعد سلام ان سے عرض کیجیے گا کہ اس سے بہتر ہو گا کہ دیوار پر کابلی والا کا فوٹو ٹانگ لیں!

"اس بیمار کا کا خانہ خراب ہو۔ عمر کا پیمانہ بریز ہونے سے پہلے ہی چھلکا جا رہا ہے۔ خط لکھوانے میں بھی سانس اکھڑ جاتی ہے۔ ڈر کے مارے ٹھیک سے کھانس بھی نہیں سکتا۔ آپ کی بھابی رونے لگتی ہے۔ مجھ سے چھپ کر وقفے وقفے سے گرج چمک کے ساتھ اشک باری کرتی ہے۔ بہتیرا سمجھاتا ہوں کہ بخت آور! جب تک بالکل بے ہوش نہ ہو جاؤں۔ میں بیماری سے ہار ماننے والا آدمی نہیں۔ بشارت بھائی! ایسے آدمی کے لئے پشتو میں بہت برا لفظ ہے گذشتہ ہفتے یونیورسٹی روڈ پر ایک نیا مکان بنوانا شروع کر دیا ہے۔ دالان میں پشاور کے پچاس یا کراچی کے سو شاعروں کے دو زانو بیٹھنے کی گنجائش ہو گی۔

"باقی سب خیریت ہے۔ خلیفہ دستبستہ سلام عرض کرتا ہے۔ میں نے اسے مسلم کمرشیل بنک میں چپراسی لگوا دیا ہے روزانہ شام کو اور چھٹی کے دن مُشکی وہی چلاتا ہے۔ بہت چنگا ہے۔
مُشکی کو پشتو میں روانی سے گالیاں دینے لگا ہے۔ مگر ابھی پشتو مذکر مونث کی تمیز پیدا نہیں ہوئی۔ سننے والے ٹھٹھے لگاتے ہیں۔ کل ہی میں نے اسے گھرکا ہے کہ جسے تو ہمیشہ مذکر سمجھتا آیا ہے اب اسے مونث بول۔ ہم تجھے پشتو آ جائے گی۔ سب کو درجہ بدرجہ سلام' دعا' پیار اور ڈانٹ ڈپٹ۔

آپ کا چاہنے والا
کابلی والا

مرحوم کی وصیت کی تعمیل کر رہا ہوں۔ گفتگو کا دھرنا مٹی میں جلتی ہوئی آدمی کر گئے اس کا دھندلا عکس پیش خدمت ہے۔

مشکو یہاں آکر پرانے حسابات دیکھے تو پتہ چلا کہ ابھی متفرق مدات میں کچھ لینا دینا باقی ہے ۔ مجھے سفر منع ہے ۔ آپ کسی طرح فرصت نکال کر یہاں شتابی آجائیں تو حساب دوستاں بباک (کچھ عطائے نے اسی طرح لکھا تھا اور کیا خوب لکھا تھا) ہو جائے اور آپ کے کابلی والا کو تھوڑا سی زندگی اور ادھار مل جائے ۔

شیزاب نے مکان اور دالان کا انتظار کرلا کرے ۔ میں نے آپ کیلئے سردست ایک عدد بے چھید چاندنی اور پانچ شاعروں کا انتظام کرلیا ہے ۔ والسلام ۔"

بشارت پہلی ٹرین سے پشاور روانہ ہو گئے ۔

غزل

تمیز پرواز (مدہول)

بیٹی کے رشتے جہیز کی الجھن کب تک آخر؟ آخر کب تک!
روز جلاؤ گے اک دلہن کب تک آخر؟ آخر کب تک!

جس دن سے تم گھر آئی ہو خوشیاں روٹھ گئیں ہیں مجھ سے
دلاور کے جھگڑے روز کی ان بن کب تک آخر؟ آخر کب تک!

لیڈر کے چمچے یہ نکھٹو مرغ مٹن بریانی کھائیں
محنت کش کی غذا میں بیگن کب تک آخر؟ آخر کب تک!

قرضہ لیکر گئے وہ جب سے چین کی بنسی ہاتھ میں ان کے
میرے ہاتھ میں صبر کا دامن کب تک آخر؟ آخر کب تک!

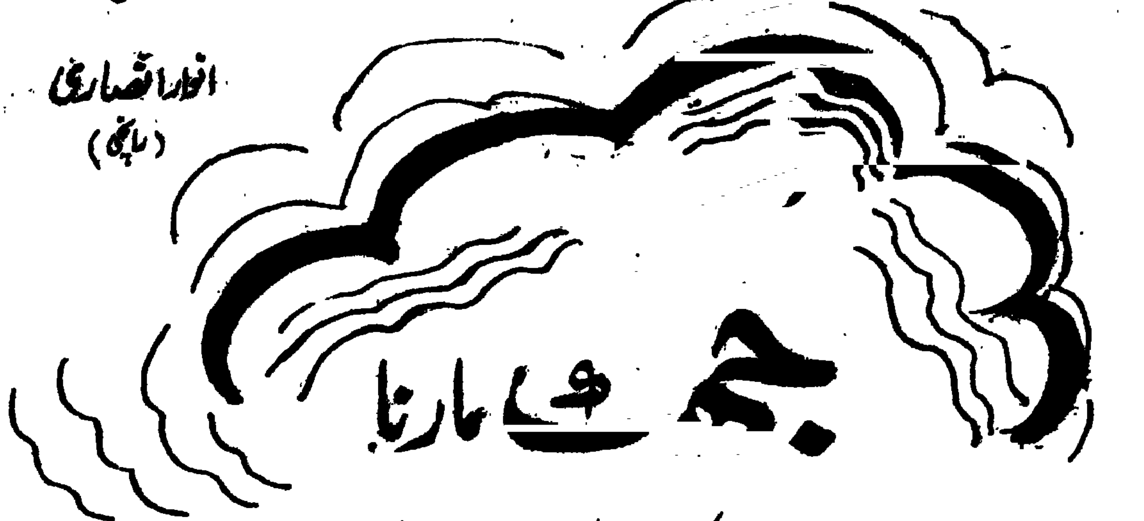
پہلا کے جنتا میں ٹینشن لڑتے ہیں ہر بار ۔ الکشن
بنیں گے لیڈر عقل کے دشمن کب تک آخر؟ آخر کب تک!

میرا آنگن سونا سونا بچوں کی گلکاری سے ہے
پھول کھلیں گے گلشن گلشن کب تک آخر؟ آخر کب تک!

جمع تفریق ضرب تقسیم عبث ہے چھوڑو سب مثبت اپناؤ
ہندو مسلم سکھ شیخ برہمن کب تک آخر؟ آخر کب تک!

ڈھلتی عمر میں سادگی بہتر، بات میری تم مانو پرواز
اپناؤ گے جدید فیشن کب تک آخر؟ آخر کب تک!

انور انصاری
(رانچی)



جھک مارنا

جس طرح رونا، ہنسنا، مسکرانا، روٹھنا، بننا، سنورنا ایک فطری عمل ہے اسی طرح جھک مارنا بھی ایک ایسا ضروری عمل ہے۔ بڑھتی ہوئی خستہ حالی کی وجہ سے جھک مارنے کے عمل میں اضافہ ہو رہا ہے اور آئے دن جھکیوں کی تعداد بڑھ رہی ہے یہی وجہ ہے کہ ہر شعبۂ حیات میں جھک مارنے والے موجود ہیں۔ خواہ آپ نوکری پیشہ ہوں یا تجارت سے وابستہ ہوں، مریض ہوں یا ڈاکٹر ہوں، شاگرد ہوں یا استاد ہوں، سیاسی رہنما ہوں یا کسی انجمن کے معمولی ورکر، ٹکٹ بند شاعر ہوں یا پیشہ ور نقاد ہر جگہ جھک مارنے والوں سے آپ کا واسطہ پڑے گا۔

ملک میں اب تو یہ حال ہے کہ جو لوگ پڑھ لکھ جاتے ہیں وہ روزگار کے دفتروں کو پیٹتے اور بند پاتے ہیں۔ وقت گزارنے کے لیے آوارہ گردی سے بہتر ہے کہ انسان جھک مارے۔ اس سے ملک اور سماج کو کچھ نقصان نہیں ہوگا کیوں کہ جھکی خاموش طبیعت کے انسان ہوتے ہیں۔ پژمردگی، اداسی، کاہلی ان کی سرشت میں داخل ہوتی ہے جھکیوں نے اب بھانپ لیا ہے کہ حکومت کی ٹھنڈی نصیحتوں اور سرد مہری سے انھیں کچھ نہ حاصل ہوگا۔ چنانچہ زندہ رہنے کے لیے اور زندگی کے شب و روز کاٹنے کے لیے جھک مارنا ضروری ہے مصیبت اور پریشانی کے وقت بغیر واویلا مچائے جھک مار کر اپنی تکلیف دور کرتے ہیں۔

آج کل کھلی فضا میں سانس لینا دشوار ہے۔ ہر وقت سر پر یہی خدشہ لگا رہتا ہے کہ نہ جانے کب اور کس وقت دنگا فساد ہو جائے اور چشم زدن میں انسان بے آبرو ہو کر جان بچانے کے لیے تگ و دو کرنے لگے۔ لہٰذا اب سکون اسی میں ہے کہ انسان کھلی فضا میں نکلنا بند کر دے بلکہ اپنے کلبۂ احزاں میں بیٹھ کر جھک مارے۔ جس ملک میں انسان کو امن چین سے رہنا نصیب نہ ہو، دو وقت کی روٹی ملنی دشوار ہو جہاں غیرت اور عزت نفس کو ذلیل و خوار کرنے کا دھندا عام ہو۔ جہاں کی حکومت بے تعلق اور بے حس ہو وہاں کے رہنے والوں کے لیے جھک مارنا سب سے عمدہ مشغلہ ہے۔

ایسے زمانے میں جب کہ ایک طرف سیلاب سے کھیت اُجڑنے لگے ہیں، دوسری طرف سوکھے سے

تیزی سے بربادی ہو رہی ہے، پولیس کی عصبیت دن بہ دن بڑھ رہی ہے اور اقلیتوں کے حقوق کو پامال کیا جا رہا ہے۔ جھک مارنا ایک مفید کام ہے۔

دفتروں میں جہاں بالائی آمدنی نہیں ہوتی ہے وہاں بیشتر ستم رسیدہ کلرک جھک مار کر دن گزار لیتے ہیں۔ تُک بند شاعروں کی ایک بڑی کھیپ بھی جھک مار کر شاعری کرتی ہے اور اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرتی ہے۔ بعض اخبار اور رسائل کے ایڈیٹروں کا منصب بیشتر صرف اشتہارات حاصل کرنا ہے اور اشتہارات کی آمدنی کے بل بوتے پر خوش حالی کا انتظام کرنا ہے۔ کئی کے چند اخبار اور رسائل چھاپ کر اپنا بیشتر وقت جھک مار کر گزارتے ہیں۔

میں اردو ادب کے ایک پروفیسر سے واقف ہوں جو کالج میں بچوں کو پڑھانا اپنے قیمتی وقت کی بربادی سمجھتے ہیں اور کالج کے اسٹاف روم میں جھک مارنا ایک نیک فعل سمجھتے ہیں۔ پروفیسر موصوف کا نظریہ ہے کہ زندگی دن بدن پیچیدہ ہوتی جا رہی ہے۔ اس لیے اسٹوڈنٹس کو اس پیچیدگی سے دور رہنا چاہیے۔ چار دن کی زندگی ہنسی کھیل میں گزار دینی چاہیے۔ جانفشانی، منصوبہ سازی اور دور اندیشی کی کیا ضرورت ہے۔ جھک مارنا تو سب سے سہل اور آسان طریقۂ زندگی ہے۔ جھک مارنے کے لیے نہ تو سخت مقابلے کی ضرورت ہے اور نہ جھکّوں کے راستے بند ہوتے ہیں۔ جھکیوں کو صرف ہلکے وجد کی ضرورت ہے۔ وہ اپنے حال میں مگن رہتے ہیں۔

جھکیوں نے اب یہ فیصلہ کیا ہے کہ اکیسویں صدی میں وہ اپنی قابلیت اور صلاحیت کا نیا اور انوکھا مصرف تلاش کریں گے یعنی چوبیس گھنٹے میں سولہ گھنٹے جھک ماریں گے اور صرف آٹھ گھنٹے سو کر گزاریں گے۔ زندگی کی جدوجہد میں نئے ارادوں اور نئی اولوالعزمیوں کے ساتھ اپنا قدم پیچھے کی طرف بڑھائیں گے۔ جھکی ملک کی نئی رفعتوں کا ساتھ نہ دیں گے۔ بلکہ اپنی روح کو پژمردہ بنا کر سیاسی اور اجتماعی زندگی کو تھپک تھپک کر سلائیں گے۔

یہ بھی دیکھا گیا ہے سروس سے ریٹائر ہونے کے بعد انسان جھک مارنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ گھر کے افراد ریٹائرڈ انسان کو بے کار شے سمجھ کر دو نمبری رشتہ رکھتے ہیں۔ صرف ریٹائرڈ انسان کے پیسوں پر ان کی نگاہیں مرکوز رہتی ہیں۔ بچارا ریٹائرڈ انسان تنہا زندگی گزارتا ہے اور زیادہ وقت جھک مار کر کاٹتا ہے۔

میرے دوست پروفیسر نواب خبطی کا خیال ہے کہ جھک مارنا ایک دماغی خلل ہے۔ پژمردہ، مضمحل، مغموم، اداس، کاہل انسان اس فعل کے مرتکب ہوتے ہیں۔ جب انسان زندگی سے بیزار ہو جاتا ہے اور زندگی کی رنگینی، لطافت اور رعنائی سے اس کی طبیعت اچاٹ ہو جاتی تو انسان جھک مارنے لگتا ہے۔

قارئین باتمکین عنوان سے دھوکہ مت کھائیے اور اپنی غلط فہمی دور کیجیے۔ اگلے زمانے میں جھک مارنا ایک فن تھا۔ نوابوں اور جاگیرداروں کے دروازوں پر پیشہ ور جھکی نمک خوار کی حیثیت سے مالک کے سامنے دم ہلا کر جھک مارا کرتے تھے۔ آج کل یہ پیشہ سیاسی ہستیوں کے چمچوں نے اختیار کیا ہے۔

جھک مارنے کا بیان ختم کرنے سے پہلے مجھے کبیر داس کے دوہے یاد آ رہے ہیں۔

کہت کبیر سن بھئی سادھو بات کہوں میں کھری
خود جھک مار لے مت لے کسی سے نوکری

شاہدہ صدیقی (لکھنؤ)

خوب ہیں ہمارے دوست بھی

کس کس کا ذکر کیجئے کس کس کو یاد کیجئے
کیسے ہیں انکے دوست سب یہ راز ہم سے پوچھئے

ارے بہن کیا بتاؤں! ان کے کیسے کیسے دوستوں سے پالا پڑا ہے۔ بس یہ سمجھو جیسے چڑیا گھر میں بھانت بھانت کے جانور پلے جاتے ہیں۔ ایسے ہی قسم قسم کے دوست بھی جھیلنے پڑتے ہیں اپنے شوہر کے۔

اب سامنے والوں کو ہی لو۔ جب ہم نے یہ گھر لیا تو ان سے سابقہ پڑا۔ ہمارے یہاں ہوتا یہ ہے کہ صبح اٹھتے ہی سب لوگ ضروریات سے فارغ ہوکر۔ اپنے اپنے کونے سنبھال لیتے ہیں۔ جیسے پتی دیو پلنگ پر لیٹے لیٹے ہی۔ باسی اخبار کا ناشتہ کرتے ہیں اور ہم ان کے لیے تازہ ناشتے کی تیاری میں عورت کی مخصوص جگہ کچن میں گھس جاتے ہیں۔ بچے ہم سے ڈر کر۔ یا ہمیں دکھانے کو اپنی اسٹڈی ٹیبل پر براجمان ہوجاتے ہیں جس پر بیٹھ کر وہ پڑھتے کم ہیں لڑتے زیادہ ہیں۔

ایسے میں ایک دن صبح صبح دروازے کی گھنٹی کراہ اٹھی (ویسے بھی سرکاری مکانوں کی گھنٹیاں کوے کی آواز میں بولتی ہیں) اور ہم کوئی جہانگیر تو نہیں کہ سونے کی زنجیر میں چاندی کی گھنٹیاں لٹکوا دیتے۔ اسلئے سرکاری گھنٹی کو ہی ہم چاندی کی گھنٹی سمجھ لیتے ہیں، ہاں تو بات ہو رہی تھی گھنٹی کی۔ جیسے ہی بجی ہم نے ان سب کو باری باری دیکھا لیکن گھنٹی کی آواز پر شوہر کی اخبار پر اور بچوں کی کتابوں پر پکڑ مضبوط ہوگئی تھی اور کوئی بھی اٹھنے کے موڈ میں نظر نہیں آرہا تھا۔ چار و ناچار ہم ہی بڑھے دروازے کی طرف کھول کر دیکھا سامنے والے حضرت دونوں ہاتھ جوڑے اور ان کے بیچ میں اخبار دبائے کھڑے ہیں۔ ہمیں دیکھتے ہی انھوں نے اپنی بغیر رشتی کی بتیسی کی نمائش (جس میں سامنے کے دو دانت بھی غائب تھے) کرتے ہوئے بولے! بھابھی جی آپ کا اخبار! جونے لینے کیلئے جونہی ہاتھ بڑھایا۔ وہ اسے مضبوطی سے پکڑتے ہوئے ذرا سرخیوں پر نظر ڈال لوں یہ کہہ کر سامنے پڑے تخت کی طرف بڑھے۔ چار و ناچار دروازے سے ہٹتے ہوئے ہم نے وہیں سے ہانک لگائی۔ سنیئے۔ سامنے والے بھائی صاحب آئے ہیں۔ جواب ملا۔ اچھا اچھا۔ ورما جی۔ ابھی آیا۔ تبھی وہ صاحب بولے! تازہ تازہ خبروں کے ساتھ چائے کا گرم گرم پیالہ کیا خوب مزہ دیتا ہے ہم ان کا اشارہ سمجھ کچن کی طرف بڑھ گئے۔ پتی دیو بھی کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولے! ہاں۔ لیکن ایک نہیں دو۔ میں جو ناشتہ

بنانے کے موڈ میں تھی۔ چائے بنانے میں لگ گئی اور وہ دونوں مل بانٹ کے کام کرنے کی تھیوری پر عمل کرتے ہوئے ایک صفحہ بانٹ کر پڑھنے لگے۔

اُس دن کے بعد سے اُن صاحب کا روز کا معمول بن گیا۔

ایک دن میں نے جل کر اخبار والے سے کہہ دیا کہ ہمارا اخبار تم سامنے والوں کے یہاں ہی ڈال دیا کرو۔ ہم انھیں سے مانگ کر پڑھ لیا کریں گے تب سے وہ بیٹھک بازی تو بند ہوگئی۔ لیکن اخبار ہمیں روزانہ اس حالت میں وصول ہوتا کہ کبھی اندر کا صفحہ غائب تو کبھی باہر کا کبھی مسلا ہوا تو کبھی پھٹا ہوا۔ لیکن صبر کے علاوہ چارہ بھی کیا تھا۔ ایک اور ان کے دوست ہیں بے حد بھلکڑ ساتھ ہی باتونی بھی۔ بھولنا بھلے ہی ان کی مجبوری ہو۔ لیکن بولنا اُن کا شوق ہے اور وہ بھی بے تکان —— اپنے بولنے کا کوئی موقع وہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ اتنا بولتے ہیں کہ اچھے اچھوں کی بولتی بند ہو جاتی ہے۔ اس بولنے کی دھن میں ہی اصل بات اُن کے ذہن سے پھسل جاتی ہے۔ جیسے گھر سے نکلتے ہیں سبزی لینے اور پہنچ جاتے ہیں کسی دوست کے گھر اور وہاں سے اس وقت تک نہیں ہلتے جب تک صاحب خانہ جماہیاں نہ لینے لگے۔ ہمیں اُن کی اس خوبی کا پتہ اس وقت چلا جب ایک بار رات کے دس بجے انھوں نے ہمارا دروازہ کھٹکھٹایا۔ کھولتے ہی بولے "بھابی جی تھوڑے سے آلو ہوں گے۔ ہم نے پوچھا خیر تو ہے۔ بولے بیوی نے شام کو کہا تھا کہ رات کو بنانے کے لئے کوئی سبزی نہیں ہے ذرا بازار جا کر لے آؤ۔ میں جونہی باہر نکلا نندلال جی مل گئے۔ انھوں نے باتوں میں ایسا الجھایا کہ بے خیالی میں اُن کے گھر پہنچ گئے۔ پھر ان کی پتنی نے بغیر چائے پئے اٹھنے ہی نہیں دیا (اب اتنے خلوص کو میں کیسے ٹھکرا سکتا تھا) بس جو باتیں شروع ہوئیں تو وقت کا پتہ ہی نہیں چلا۔ (پھر جیسے خود سے ہی بولے) یہ نندلال جی بھی بہت باتونی ہیں۔ میں نے ہنس کر کہا آپ سے زیادہ۔ جس پر وہ خود بھی بے اختیار ہنس پڑے۔

اُس دن سے وہ جب بھی ہمارے گھر زیادہ دیر پڑاؤ جماتے۔ میں فوراً ٹوک دیتی ہوں کہ بھابی جی نے کچھ لینے تو نہیں بھیجا۔ اور اکثر ہی وہ سر پر ہاتھ مار کر کھڑے ہو جاتے۔ یا پھر زیادہ دیر ہونے پر ہمارے بچوں کی شامت آتی ——!

ایک دن تو انھوں نے حد ہی کر دی۔ یہ بات ان دنوں کی ہے۔ جب ہمارا نیا نیا پرموشن ہوا تھا۔ ہم یہ خبر اپنی بہن کو دینے جا رہے تھے۔ جو کہ قریب رہتی ہیں۔ رات کے تقریباً ۸ بجے ہوں گے کہ سڑک کی دھندلی روشنی میں یہ حضرت ٹہلتے نظر آئے۔ ہم دونوں نے ہی ایک ساتھ پوچھا۔ ارے آپ یہاں! وہ تو کچھ نہ بولے لیکن ہم لوگوں نے اپنی خوشی اُن پر انڈیل دی جسے سن کر انھوں نے اپنے ہاتھ میں لٹکے جھولے میں سے ایک ڈبہ نکالتے ہوئے کہا تو اسی خوشی میں یہ مٹھائی کھا لیجئے۔ ہم نے حیرت سے پوچھا۔ کیا آپ کو ہمارے پرموشن کے بارے میں پتہ تھا (اور پھر مٹھائی تو ہمیں کھلانی چاہیئے) وہ نفی میں سر ہلاتے ہنستے ہوئے بولے! ہوا یہ کہ آج شام میری بیوی کی کچھ خاص سہیلیاں آئی تھیں۔ انھوں نے مجھے مٹھائی لانے کو کہا۔ میں جب مٹھائی لیکر واپس ہو رہا تھا تو ہمارے ایک پرانے ملاقاتی مل گئے۔ میں نے پوچھا! آپ یہاں کیا کر رہے ہیں۔ بولے حال ہی میں ٹرانسفر ہو کر آیا ہوں۔ سامنے والا گھر لیا ہے آؤ وہیں بیٹھ کر باتیں کریں۔ میں مروت میں زیادہ منع نہ کر سکا۔ اور پھر جب باتیں ہوئیں تو ختم ہونے کو ہی نہیں آئیں۔ ابھی اچانک مجھے یاد آیا کہ مجھے تو گھر مٹھائی پہنچانی تھی۔ اب اتنی دیر ہو گئی ہے۔

سہیلیاں بھی جا چکی ہوں گی اور بیوی یقیناً غبارہ بنی ہوئی ہوں گی۔ اس لئے گھر جانے کی ہمت بھی نہیں پڑ رہی ہے۔ جب ذرا اور رات ہو جائے گی وہ اپنا غصہ بچوں اور گھر کی مختلف اشیاء پر اتار کر دودھ کے اُبال کی طرح بیٹھ چکی ہوں گی تو میں جاؤں گا۔ جس سے اُن کے عتاب کا نشانہ بننے سے بچ جاؤں گا۔ اور پھر ہم تینوں نے وہ مٹھائی وہیں کھڑے کھڑے خوب مزے لے لیکر کھائی۔

اس دن اُن کا کیا حشر ہوا تو ہمیں معلوم نہ ہو سکا۔ لیکن اُن کی شکل ہمیں بہت دن تک نظر نہیں آئی۔

اسی قسم کے دوستوں کی ہماری جمع ہے ان کے پاس جیسے صاحب ہیں۔ جن کا حلیہ دیکھتے ہی میاں لال بجھکڑ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ حالانکہ وہ اپنے آپ کو بزنا ڈ شاہ سے کم نہیں سمجھتے نوکدار داڑھی خم دار مونچھیں۔ سر کے بال کا نپولین کی طرح پونی ٹیل بنا ہوا۔ اور اُن سب پر سفیدی بچی ہوئی۔ بتیسی میں بھی شاہ جہاں آباد کی فصیل کی طرح بہت سے پھاٹک بنے ہوئے۔ اس پر طرّہ یہ کہ حال پر نظر ڈالنے کی بجائے ماضی کی دنیا میں ہی ٹہلتے ہوئے خود کو ابھی اڑ کا تصور کرتے ہیں۔ شیروانی اور ٹوپی جس زمانہ میں بنی ہوں گی تو یقیناً کسی نہ کسی رنگ کی رہی ہوگی۔ لیکن اب ان پر حوادث کی اتنی دھول جم چکی ہے کہ دونوں ہی انھیں کی طرح خزاں رسیدہ لگتی ہیں۔

یوں وہ بہت باصلاحیت۔ باذوق انسان ہیں جس کا انھیں اس حد تک احساس ہے کہ شاعری میں اپنے سے بڑا غالب کو مانتے ہیں نہ میر کو۔ ادیبوں کے ذکر پر پورے غور کیا۔ پوری ادبی دنیا میں وہ اپنے سے اہم کسی کو ماننے کو تیار نہیں۔ ایک دن ہم نے یونہی ازراہ مذاق پوچھ لیا کہ لکھنؤ کے نوجوان شعراء میں سب سے اچھا کلام کس کا ہے۔ فوراً سینہ ٹھونک کر بولے۔ ہمارا ـــ سب نے اپنی ہنسی کو بہت مشکل سے قابو میں کیا۔

اسی طرح ایک دن ہمارے شوہر نے پوچھا کہ اس وقت لکھنؤ میں سب سے بزرگ شاعر کون ہیں؟ ایک جھٹکے سے بول اٹھے۔ ہم۔ جس پر کوئی بھی اپنی ہنسی نہ روک سکا۔ بات جب اُن کی سمجھ میں آئی تو بولے ـــ بزرگی سے میری مراد۔ کلام کی پختگی سے ہے پھر سنجیدہ ہو کر بولے اصل میں ہمارا سماج مردہ پرست ہے۔ اس نے جب غالب کی زندگی میں ان کی قدر نہ کی تو ہماری کیا کرے گا۔ سب نے یک زبان ہو کر کہا۔ بیشک، اگر آپ بھی اپنی قدر کرانا چاہتے ہیں تو جلد از جلد غالب کے پاس پہنچ جائیے۔ پھر دیکھئے گا نا غالب سے زیادہ آپ کی قدر

اس دن کے بعد وہ غالب کے پاس گئے یا نہیں۔ لیکن ہمارے پاس نہیں آئے۔ ••

اعجاز وارثی
(سنبھل)

مشورہ

جب مشکلات زیست سے کچھ مخلصی ملی — بندو میاں کو ایک نئی زندگی ملی
ماضی تھا ورنہ عالم افلاس کا اسیر — کھاتے رہے تھے سینے پہ بیگانگی کے تیر
لمحہ کوئی حیات کا عیش آشنا نہ تھا — ماں باپ کا غریب کو سایہ ملا نہ تھا
احباب خاص تھے نہ کوئی رشتہ دار تھا — البتہ نیک نیتی ان کا شعار تھا
بڑھتا رہا تھا قوتِ بازو کا کارواں — اب اپنا کاروبار تھا اور اپنا اک مکاں
دنیائے غور و فکر نے کھولا اک اور باب — شادی کا خواستگار ہوا عالم شباب
دوشیزہ اک نظر میں تھی لیکن غریب تھی — ہاں حسن کے معاملے میں خوش نصیب تھی
بیوہ بھی ایک تھی جو ذرا سن رسیدہ تھی — مطلب یہ ہے غزل کی بجائے قصیدہ تھی
لیکن وہ خود کفیل تھی گھر اس کے نام تھا — آسودگی زیست کا ہر انتظام تھا
تھی جان مخمصے میں بنائیں کسے ہدف — اک سمت مال و زر تھا، گل تر تھا اک طرف
امداد غیب کہئے اسے یا عطائے عقل — انجام کار انھوں نے کی دانشوروں کی نقل
یعنی جب اک دماغ نہ کر پائے فیصلہ — بہتر ہے ایسے میں کسی دانا کا مشورہ
قصبہ میں اک بزرگ تھے مجموعۂ صفات — ہر دل عزیز و پیکر ایثار و نیک ذات
تھا جن کا ربط و ضبط خواص و عوام سے — مشہور تھے حضور میاں جی کے نام سے
جب حیص بیص میں نہ ملا کوئی راستہ — اک دن میاں جی سے ہی کیا جا کے مشورہ
حضرت نے جب سنی یہ کشاکش کی داستاں — آثار غور و فکر ہوئے چہرے سے عیاں
عالم مراقبہ کا ہوا طاری آپ پر — سائل پہ آنکھیں کھول کے ڈالی پھر اک نظر
بندو میاں کے کاندھے پہ پھر رکھا اپنا ہاتھ — فرمایا اے عزیز خوش اطوار و خوش صفات

دوشیزہ کا تو اپنے لیے کر لے انتخاب
اور بیوہ کا ہمیں دے مکمل پتا شتاب

★

علی عمران
(بمبئی)

دعوتیں

معلوم دنیا کے ہر خطے میں ہر موقعے، خاص و عام پر دعوتوں کا اہتمام ہوتا رہا ہے اور انشاء اللہ آئندہ بھی رہے گا۔ (ہم عزیز و اقربا اور اکثر اغیار) کیلئے دعوتوں کا اہتمام اکثر و بیشتر آپ بھی کرتے ہوں گے اور ہم بھی کرتے ہیں۔ جہاں تک ہمارا خیال ہے (جو تمام ہو ہی نہیں سکتا) دنیا کا کوئی بھی فرد (بعض جانور بھی) شاید ہی اس لت سے مبرا ہو۔

"دعوت" ایک نہایت ہی وسیع و عمیق مفاہیم کا حامل لفظ ہے۔ یوں تو اس لفظ کے سنتے ہی دماغ کی اسکرین پر مختلف النوع کھانوں سے غیر معمولی طور پر سجے دستر خوان یا آج کل کے تقلیدِ مغرب کے دور میں پر تکلف نہیں بلکہ پر تکلف ڈائننگ ٹیبل کا عکس ابھرتا ہے لیکن حقیقتاً "دعوت" صرف طعام و نوش ہی کا نام نہیں ہے بلکہ اور بھی کئی طرح کی دعوتیں برپا ہوتی رہی ہیں مثلاً دعوتِ سخن، دعوتِ مبارزت (ہر میدان میں) دعوتِ نظارہ اور دعوتِ قرآن خوانی وغیرہ (مصلحتاً اختصار سے کام لیا جا رہا ہے ورنہ دعوتوں کی فہرست شیطان کی آنت سے زیادہ لمبی ہے) گو کہ بالا ہر دعوت، دعوتِ طعام و نوش سے بظاہر یکلخت جدا معلوم ہوتی ہے لیکن صاحب، وہ دعوت ہی کیا کہ جس میں کھانے کو کچھ میسر نہ آئے۔ لہٰذا دعوت خواہ کسی بھی طرز کی ہو، حلق تر کرنے یا انتڑیاں گرم کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ ہاتھ آ ہی جاتا ہے۔
(اب اچھا یا برا، اپنی تقدیر پر منحصر ہے)

کہیں محفلِ شعر و سخن برپا ہو، آپ مدعو ہوں اور بدقسمتی سے بطور شاعر مدعو ہوں تو اس محفل سے آپ تہی دست و دامن ہرگز نہیں لوٹیں گے۔ اچھے شعر پر واہ واہ کے ساتھ ناشتہ "چائے" چونکہ شعر و شاعری کی محفلوں کے لیے شام اور رات کا وقت مفید بتایا گیا ہے اس لیے یہاں شام کے ناشتے اور چائے کا ذکر ہو رہا ہے) یا کم از کم بیڑی تو آپ کو ضرور ملے گی کہ شعرائے کرام بڑے بیڑی نواز ہوا کرتے ہیں۔ لیکن اتفاقاً اس موقع پر آپ کے ستارے روبہ زوال ہوں اور آپ کا ایک آدھ شعر سامعین کے طبع نازک پر گراں گزر جائے تو ہوٹنگ کے ساتھ ساتھ ادھر ادھر کے کونوں گوشوں سے کئی شگفتہ گالیاں آپ کے حصے میں ضرور آئیں گی (مارکٹ میں سگلے سڑے ٹماٹر آٹھ تا دس روپے فی کلو فروخت ہو رہے ہیں اس لیے لوگ اس عیاشی کے متحمل ہو نہیں سکتے)

دعوتِ مبارزت میں تو عام طور پر دو ہی باتیں ہوتی ہیں، ہار، جیت۔ اگر آپ مقابلے میں کسی بھی جائز، ناجائز طریقے سے جیت گئے تو شاباشیاں، انعامات اور شہرت تو گویا آپ کا پیدائشی حق ٹھہرا، بصورت دیگر آپ کو شکست کھانی پڑے گی یعنی کھانے کو کچھ تو ملا (آپ خفت مٹانے کے لیے بھلے ہی یہ کہتے پھریں کہ

گرتے ہیں شہسوار ہی میدانِ جنگ میں"

دعوتِ نظّارہ ایک ایسی دعوت ہے کہ اس میں نہ رنگ و نسل کا امتیاز ہے نہ ذات و دھرم کا، عمر کی قید ہے نہ شکل و صورت کی اہمیت، اس میں نہ سماجی حیثیت دیکھی جاتی ہے نہ مالی پوزیشن۔ لیکن اس لنگر میں شریک ہوتا مضبوط دل گردے اور فولادی اعصاب والوں کا ہی کام ہے۔ دعوتِ نظّارہ میں مدعوئین کی اکثر و بیش تر کیسی آؤ بھگت ہوتی ہے اور کھانے کے لیے کیا کچھ نہیں ملتا اس کی تفصیل بتانے کے لیے ہمت ہم میں نہیں ہے آپ چشمِ تصور وا کریں صحیح منظر نظر آجائے گا۔

دعوتوں کے وسیع میدان میں ایک دعوت "قرآن خوانی" کی بھی ہوتی ہے۔ یہ بڑی عجیب بات ہے کہ ہم اپنے اعزا کے ایصالِ ثواب کے لیے ادھر اُدھر سے چند لوگوں کو جمع کر لیتے ہیں یا کسی دینی مدرسے سے رجوع کرتے ہیں (اور ایک روایت ایک رسم پوری کر لیتے ہیں) دعوتِ قرآن خوانی میں شرکت کے لیے اللہ کا کوئی نیک بندہ جلد تیار ہی کب ہوتا ہے، اب یہ میزبان پر منحصر ہے کہ کس طرح اس دعوت سے ہمکنار کرتا ہے اور بلا اجرت اپنا کام نکال لیتا ہے بہرحال حسب دستور نان خطائی، جلیبی یا شربت کا انتظام تو اس میں بھی کرنا ہی پڑتا ہے۔

ہمارے ساتھ تو اکثر کیا بیشتر ہی یہ سانحہ پیش آتا ہے۔ ہم دعوت دیتے ہیں چار افراد کو لیکن شرکا کی گنتی کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ دو سے ضرب ہو کر آئے ہیں۔ آخر میں یہ عقدہ کھلتا ہے کہ سولہ آدمیوں کا کھانا صاف ہو گیا ہے چار و ناچار اس دن ہم، بیگم صاحبہ اور چار عدد بچے پاؤ آملیٹ پر اکتفا کر لیتے ہیں۔ یہ بات تو ہم برسبیل تذکرہ کہہ گئے ورنہ ہم خوب جانتے ہیں کہ موت کی طرح رزق بھی گھر سے نکال کر گھاٹ تک پہنچا دیتا ہے۔

دعوتوں میں کم خرچ بالا نشین" کی بڑی اہمیت ہے اسی لیے لوگ دعوتوں میں بکرے کی بجائے مرغ کو قربان کر دیتے ہیں (مرغ ۲۵ روپے کلو اور بکرا ۴۲ روپے فی کلو ہے) ایک مرتبہ ہم نے بھی اس فارمولے کو آزمانے کی کوشش کی لیکن کھانا تیار ہونے پر معلوم ہوا کہ چار آنے کے مرغ کو بارہ آنے کا مسالحہ لگ چکا ہے لیکن اس میں ہماری اہلیہ قصور وار نہیں، مرغ ہماری ہی ہدایت کے تحت پکایا گیا تھا اور ہم ہرگز نہیں چاہتے تھے کہ احباب بے مزہ یا بدمزہ کھا کر ہمارے نام کی بانگ دیتے پھریں۔

دعوتوں میں اکثر لوگ ہاتھ دھو کر کھانے کے پیچھے پڑ جاتے ہیں اور انھیں بہوتے ٹوپی کا بھی ہوش نہیں رہتا کچھ لوگ اپنی قسمت کی لکیروں میں جا بجا دعوتوں کا اندراج کروا کے دنیا میں تشریف لاتے ہیں اور پھر انھیں لکیروں پر چل کر وہ جہاں بھی جا پہنچتے ہیں وہاں دعوت ہو رہی ہوتی ہے ایسے لوگ کفرانِ نعمت کے مرتکب کبھی نہیں ہوتے انھیں یہ معاملہ بھی ازبر ہوتا ہے کہ "دانے دانے پر لکھا ہے کھانے والے کا نام"

چھوٹی موٹی بین الخانہ دعوتوں میں تو خیر رنہ چاہتے ہوئے بھی تکلفات کا رنگ جھلکتا ہے لیکن بڑی دعوتوں مثلاً شادی عقیقہ، سالگرہ، چلہ چھٹی اور نیاز وغیرہ میں تو جس کی لاٹھی اس کی بھینس کے مصداق معاملہ ہوتا ہے یہاں

تکلف کو منہ کے ساتھ جوتے میں رکھ دینا ہی عقل مندی کی دلیل ہے۔ ایسے موقعوں پر جو شخص جتنی جرأت (بے تکلفی) کا مظاہرہ کرے گا اتنا ہی فائدے میں رہے گا۔ لیکن ایسی دعوتوں میں میزبان بھی بڑی عقل مندی کا ثبوت دیتے ہیں ہر ایک کی فرمائش پوری کرنے سے تو رہے لہٰذا پاس پڑوس کے منچلے اور لاابالی لونڈوں کو کھانے کی تقسیم پر مقرر کر دیتے ہیں (اور خود غائب ہو جاتے ہیں) آپ لاکھ مطالبہ کیجیے کہ "کچھ گرم کھانا لاؤ" (گرم کھانا بھی دعوتوں کی ایک اصطلاح ہے جس کا مطلب ہے بوٹیاں) ان لونڈوں کے کانوں پر جوں نہیں رینگتی بلکہ وہ کھانا چھو کر معنی خیز انداز میں کہیں گے کہ حضور بہت گرم کھانا ہے ابھی دیگ سے نکال لایا ہوں۔" ایسے وقت میں سوائے شرمندگی کے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔

الغرض دعوتوں کا اہتمام کرنا اور دعوتوں میں شریک ہونا ایک ایسا تلخ و شیریں تجربہ ہے کہ انسان نہ چاہتے ہوئے بھی اسے بار بار دہرانے کے درپے رہتا ہے۔



ہوا نے چاشنی میں سیب کی فرمائش کی ہے

غزل

رؤف رحیم

ساغری میں ایک نسخہ آزمانا چاہیے
مار کر استاد کی غزلوں کو گانا چاہیے

ہے کلینز خانگی نوشاد، لیکن شرط ہے
کار ہے درکار اور اک کارخانہ چاہیے

ایک شاعر آرہا ہے ہاتھ میں لے کر بیاض
دوستو اب دُم دبا کر بھاگ جانا چاہیے

بے وقوفی ہوش مندوں سے کبھی ہوتی نہیں
عاشقی کے واسطے اک دل دیوانہ چاہیے

نام کی تشہیر کی کھجلی اگر ہو آپ کو
جشن اپنا اپنے پیسوں سے منانا چاہیے

آپ کو گنجہ بنا دے گا وہ دھپے مار کر
سوچ کر گنجے کے آگے سر جھکانا چاہیے

ہو ولیمہ یا کہ برسی، چاہے ختنہ ہو کہ عقد
شاعری کے واسطے ہم کو بہانا چاہیے

مرغ و ماہی سے بھی لیڈر اب نہیں ہیں مطمئن
جبکہ جنتا کو ہماری "دال کھانا" چاہیے

چاہیے تشہیر اداروں سے لکھا کر مجموعہ
نام سے اور دام سے اپنے چھپانا چاہیے

اک پیالی چائے سے کیا بجھ سکے میری طلب
داعیِ محفل! مجھے تو چائے خانہ چاہیے

شہر میں انسان خود شیطان ہے مسٹر رحیم
بھاگ کے ویرانے میں رہیے گر خزانہ چاہیے

غزل

مرزا کھونچ (بیتیا)

جنگ چھڑی ہے کھاڑی میں
تیل ندارد گاڑی میں

سوپر پاور الجھا ہے
ریگستانی جھاڑی میں

وہسکی میں وہ کیف کہاں
ملتا ہے جو تاڑی میں

زور دار کی ٹکر ہے
پربت اور پہاڑی میں

کاٹ وہی ہے آج تلک
مرزا کی کلہاڑی میں

غزل

ادیب سندیلوی

دیکھ کر عاشقوں کو وہ اپنے
بام پر بلیوں اچھلتے ہیں

مثل بچوں کے آج کے لیڈر
کرسیاں دیکھ کر مچلتے ہیں

چند قطرے شراب کے پی کر
شیخ جی پینترے بدلتے ہیں

ہم نے دیکھا نہیں سنا یہ ہے
آستینوں میں سانپ پلتے ہیں

اب بھی بجلی کی ہے کمی اتنی
ہر مکاں میں چراغ جلتے ہیں

محمد طارق
(کولہاپور)

مدرس اور مدرسی

یوں تو پیشے بے شمار قسم کے ہوتے ہیں۔ ہر پیشہ ور کچھ نہ کچھ ضرور کرتا ہے۔ کم از کم اپنے پیشے سے متعلق ضروری معلومات رکھتا ہے۔ صرف درس و تدریس ہی ایک ایسا پیشہ بن گیا ہے جس میں کچھ نہ کرے تو بھی پیشہ ور پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اس لیے اس پیشے سے وابستہ زیادہ تر لوگ بے اثر ہوتے جا رہے ہیں۔ اتنے بے اثر کہ ان کا کسی پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

بقول نریندر لوتھرؔ "جو شخص کچھ کر سکتا ہے وہ کرتا ہے اور جو کچھ نہیں کر سکتا وہ پڑھاتا ہے۔" اس بات کے پیش نظر ہمارا مشاہدہ ہے کہ جو پڑھاتا بھی نہیں وہ پیشۂ درس و تدریس کو بحسن و خوبی انجام دے سکتا ہے اور باقاعدہ تنخواہ پا سکتا ہے۔

مستقبل میں ہمیں خدشہ ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو جائے کہ مدرس انگوٹھا لگا کر تنخواہ پائیں اور اسکول سے طلبا خالص انگوٹھا چھاپ بن بن کر نکلیں اور انھیں انگوٹھا چھاپ سرٹیفکٹ بھی ملیں فرسٹ کلاس انگوٹھا چھاپ، سکینڈ کلاس انگوٹھا چھاپ، تھرڈ کلاس انگوٹھا چھاپ۔

خیر یہ تو مستقبل کی بات ہے جس کے بارے میں ہم سب لاعلم ہیں اس لیے ہم بلا جھجک مستقبل کے بارے میں جو جی میں آئے بک سکتے ہیں۔ یہی تو ایک زمانہ ایسا ہے جس کے بارے میں من مانی کچھ بھی کہا جا سکتا ہے۔

فی الحال حکومت تعلیم پر توجہ دے رہی ہے۔ جس طرح فیشن تیزی سے بدلتا رہتا ہے اسی طرح بلا ناغہ نصاب بدلا جا رہا ہے۔ تعلیمی ترقی کے نت نئے منصوبے بنائے جا رہے ہیں ـــــ کیسا پڑھایا جائے۔ کب پڑھایا جائے۔ کیا پڑھایا جائے، نہیں پڑھایا جائے وہ پڑھایا جائے یہ سب ابھی تک طے نہیں ہو پایا ـــــ!

کیوں طے نہیں ہوا یہ سوچنا ہمارا کام نہیں۔ حکمرانوں کا کام ہے اور اصولاً جو کام جس کے ذمے ہے وہ اسی کو کرنا چاہیے۔ اسی اصول پر چلتے ہوئے ہمارا دیش کافی ترقی کر رہا ہے ـــــ لیڈر اپنا کام کر رہے ہیں اور اپنے کام میں مصروف، سب اپنے اپنے کام نپٹا رہے ہیں۔ کوئی دوسرا کام نہیں کر رہا ہے۔ جتنا ہم اپنے تا نہیں

کچھ لوگ جو واقعی بے کار ہیں وہ بھی بے چارے کچھ نہ کچھ ضرور کر لیتے ہیں جیسے فساد کرنا، جھگڑا کرنا — ہڑتالیں کرنا۔ مورچے نکالنا وغیرہ وغیرہ......

آرام حرام ہے کہ اس دور میں درس و تدریس کے لیے بھی ماہرین تعلیم کافی غور و خوض کر رہے ہیں۔ ان پر غور و خوض پر حکومت غور و خوض کر رہی ہے۔ مدرس کا ایسے تعلیمی ترقی کے دور میں انگوٹھا چھاپ بن کر بیٹھنا کیسے ممکن ہے بھلا۔ طلبا کی بات اور ہے۔ وہ بیشک انگوٹھا چھاپ رہ سکتے ہیں۔ یہ ان کا اپنا ذاتی معاملہ ہے جس طرح چاہیں رہیں۔ آزاد دیش کے آزاد مستقبل کا ان پر ہی تو انحصار ہے!

مدرس کی بھلائی اسی میں ہے کہ وہ سب کچھ ہو انگوٹھا چھاپ نہ ہو۔ اس بھلائی کو پا کر ہی مدرس سال بھر دو دو دھندے بآسانی کر سکتا ہے۔ آم کے آم اور گٹھلیوں کے دام وصول کر سکتا ہے۔ پھر اس کی پانچوں انگلیاں گھی میں اور اسے اپنا سر کڑھائی میں رکھنے سے کوئی روک نہیں سکتا۔

افادات پیشہ درس و تدریس کو دیکھتے ہوئے بہت سارے نڈر قسم کے لوگ بے خوف و خطر اس پیشہ کو حاصل کرنے کے لیے تن من دھن کی بازی لگاتے ہیں اور پھر من مانی کرتے رہتے ہیں۔ من مانی کرنے کا اس پیشے میں بھرپور موقع ملتا ہے۔

جو جی میں آیا پڑھا دیجیے — موڈ نہیں تو بالکل مت پڑھائیے۔ لائق مدرسین تعلیم کا موڈ سے بہت گہرا سمبندھ بتاتے ہیں۔ گہرائی کا ہم نے ابھی تک اندازہ نہیں لگایا جب لگا لیں گے تب آپ کو ہندسوں میں بتا دیں گے۔ فی الحال ہم یہ بتا رہے ہیں کہ لائق مدرسین طلبہ اور سرپرستوں کے موڈ کے ساتھ ساتھ خود کے موڈ کو بھی شناس کر کے ان میں یکسانیت تلاش کرتے ہیں اور یہ یکسانیت ہمارے سماج سے اس طرح غائب ہو گئی ہے جیسے بازار سے خالص اشیا اور تہذیب نہ سے اچھے اخلاق!

عام طور پر اس پیشے میں ترقی کے امکانات صفر ہیں — قسمت کے دھنی اور دل کے غنی لوگ زیادہ سے زیادہ صدر مدرس بن سکتے ہیں یا نہیں تو آدرش شکشک کا اعزاز حاصل کر سکتے ہیں۔ آدرش شکشک کا اعزاز حاصل کرنے کے لیے مدرس کا "نمونہ" ہونا ضروری ہے!

ایم صلاح الدین
بڑکاکانا (ہزاری باغ)

جس کی بندری وہی نچائے

عیدالاضحیٰ کی نماز ادا کرکے آنے کے بعد جو میں نے سیویاں طلب کیں، تو بیگم نے مسکرا کر کہا۔ "سیویاں؟" کیا آپ خواب دیکھ رہے ہیں؟ یہ بقرعید ہے نہ کہ عیدالفطر۔ اس میں تو آپ کو اس وقت تک منع ہے جب تک آپ کی طرف سے قربانی کا یہ بکرا اللہ کی راہ میں قربان نہ ہو جائے۔"

چونک کر میں نے کہا۔ "کیا مطلب؟ کیا آج میں کچھ نہیں کھاؤں گا؟"

بے حد دلار سے بولیں "میرے ہوم منسٹر ۔ وہ آپ کھائیں گے اور ڈنکے کی چوٹ کھائیں گے لیکن اسی بکرے کے گوشت سے شروع کریں گے۔ سمجھیے آج آپ کا روزہ ہے۔ اس وقت تک جب تک قصاب آکر اسے قربان نہیں کرتا اور آپ پھر اس کے گوشت سے افطار کریں گے۔"

کچا گوشت سے؟ بغیر پکائے ہوئے؟ میں نے گھبرا کر پوچھا۔ اگر شوق ہے تو کچا ہی نوش فرمالیجیے گا۔ میں کب منع کرتی ہوں۔ آخر عہد قدیم میں انسان کچا گوشت ہی تو استعمال کرتا تھا۔"

"میں عہد قدیم کا انسان نہیں ہوں۔ نئے زمانے کا انسان ہوں۔"

"واقعی مجھے یقین نہیں آتا۔" بیگم نے مجھے عجیب نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا مجھے سرٹیفکیٹ پیش کرنا ہوگا اپنے نئے زمانے کا انسان ہونے کا۔؟"

"کیا پتہ؟ خیر زیادہ مت سوچیے۔ میں سرٹیفکیٹ پیش کیے بغیر ہی آپ کو کچا نہیں پکا گوشت کھلاؤں گی مگر ابھی نہیں کیونکہ ابھی تو تحفہ کا گوشت بھی کہیں سے نہیں آیا ہے۔"

سمجھ گیا جناب خوب سمجھ گیا۔ لیکن یہ آپ کا قصاب کب آئے گا؟ کب ذبح کرے گا اسے اور کب میں اپنے پیٹ کی آگ سرد کروں گا؟"

چونک کر بیگم نے کہا "کیا کہا؟ پیٹ کی آگ؟ کیا آپ کے پیٹ میں آگ جل رہی ہے اور آپ نے مجھے کہا نہیں۔ بس ذرا دم لیجیے میں ایک گلاس ٹھنڈا پانی لاتی ہوں۔"

"مگر خدا واسطے اتنا ٹھنڈا پانی نہ لائیے گا جو پیٹ کی آگ کے ساتھ مجھے ٹھنڈا کردے ہمیشہ کے لیے!"

اور پھر میں نے جھٹ کہا۔ ہاں مگر ذرا مجھے یہ تو بتایا جائے۔ جب مجھ سے آج روزہ رکھوانا تھا تو آپ نے مجھے سحری کھانے کے لیے جگایا کیوں نہیں؟

اس روزے میں سحری نہیں ہوتی۔ میرے اللہ۔ آپ کتنے ناصبرے واقع ہوئے ہیں۔ حضور ؐ کے گھر میں مہینوں آگ نہیں جلتی تھی اور آپ ہیں کہ . . . .

ان لوگوں کی بات دوسری تھی وہ لوگ اللہ والے تھے اور پھر۔ خیر خیر قصاب آتا ہی ہوگا۔ آپ نے دعا یاد کرلی ہوگی۔ چھری تیز کرنی ہے نا۔ جانور ذبح آپ ہی کو کرنا ہے۔"

دعا بھی تیسے ہی یاد کرنی ہوگی۔ جانور مجھے ذبح کرنا ہے اور آپ کا کیا کام ہے؟ یہ بھی تو مجھے معلوم ہو"

میں نے چڑ کر بیگم سے پوچھا۔

میرا کام ہوگا قربانی کے گوشت کے تین حصے تقسیم کرنا۔ چلیے دیر نہ کیجیے۔ دعا پر نظر ثانی فرما لیجیے

"نظر ثانی؟ کیسی نظر ثانی؟ یہاں سرے سے دعائیں ہی یاد نہیں۔" "ایں؟ غضب ہوگیا، کیا میری آمد کے قبل کبھی آپ نے قربانی انجام نہ دی؟"

کیسے کر انجام دیتا؟ صاحب نصاب ہی نہیں تھا۔ ان دنوں میں صرف صاحب کتاب تھا یعنی کہ محض ایک طالب علم۔ میں نے شرما کر صفائی پیش کی۔

"اچھا اچھا اب تو آپ صاحب نصاب ہیں ایک ہونہار طالب علم کی طرح جھٹ پٹ دعا یاد کر لیجیے ورنہ میں سمجھوں گی بائیں ہاتھ کے کمال سے آپ نے تمام امتحانات پاس کیے ہیں۔"

"سیتا جی کی طرح میری اگنی پریکشا نہ لیجیے۔ انھوں نے تو اس امتحان کو پاس کر لیا تھا۔ میں شاید پاس نہیں کر سکوں گا۔ پھر آپ ہی غور فرمائیے میری اچھی بیگم صاحبہ، میں کچھ کمپیوٹر تو ہوں نہیں۔ ادھر سوال ڈالا ادھر حل برآمد۔ ادھر دعا پر نگاہ ڈالی ادھر از بر۔ ایک گھنٹہ تو مجھے صرف اس کا صحیح تلفظ ہی ادا کرنے میں لگے گا۔"

استغفر اللہ آپ نے کیسے ایم اے پاس کیا؟ جب ایک چھوٹی سی دعا یاد نہیں کر سکتے۔ آپ کی طرح میں ایم اے پاس ہوتی تو ایک منٹ میں دس دعائیں یاد کر لیتی . . . . . خیر اب زیادہ باتیں بنانے کے لیے منہ وا کرنے کی حاجت نہیں۔ یہ رہی کتاب جو میرے ابا جان نے جہیز میں دیگر اسلامی کتابوں کے ساتھ مجھے دی تھی۔ چلیے اب میرا منہ مت تاکیے۔ میں کوئی اجنبی خاتون نہیں ہوں جو آپ یوں گھور گھور کر دیکھ رہے ہیں۔"

اطلاعاً عرض ہے کہ میں کسی غیر محرم خاتون کو گھور گھور کر نہیں دیکھتا۔ یہ شرعاً ممنوع ہے۔ آپ کی طرح نہیں کہ پھیری والے، سبزی والے، دودھ والے . . . . ."

"دیکھیے، خدا سے ڈریے۔ میں انھیں گھور گھور کر دیکھتی ہوں۔ میں صرف سودا لیتی ہوں اور وہ بھی میں نہ کروں تو آپ یہ چیزیں خود خرید فرمائیں . . . . .

"خیر اس مبارک دن جھگڑا کرنے کی ضرورت نہیں اور دعا یاد کر لیجیے۔ میں جب تک چھری چیک کر لیتی ہوں۔"

یہ کہہ کر انھوں نے میرے ہاتھ میں زبردستی کتاب تھما دی اور خود باورچی خانے میں چھری لانے چلی گئیں۔ اب جو میں دعا پر نگاہ ڈالتا ہوں تو ہوش اڑ گئے۔ مکمل چار سطور پر مشتمل دعا تھی جسے یاد کرنا تو درکنار تلفظ کرنا بھی مشکل ہوگیا۔ زندگی میں پہلی بار اس دعا سے سابقہ پڑا تھا۔ بہرحال کسی طرح ایک آدھ بار غلط یا صحیح دہرایا ہی تھا کہ رمضان علی نے آواز دی . . . . " صاحب ہیں؟"

مجھ پر اتنی گھبراہٹ طاری ہوئی جتنی عہد طالب علمی کے کسی امتحان کے موقع پر طاری نہیں ہوئی تھی۔ ادھر بیگم نے کہا۔ دیکھیے رمضان میاں بھی آگئے۔ پتہ نہیں آپ نے دعا بھی یاد کی یا نہیں؟ آپ سے تو اچھی میں ہوں جسے ہر طرح کی دعائیں یاد ہیں اور کیوں نہ ہو ہمارے ابا جان ہم لوگوں کی دنیا سنوارنے سے زیادہ دین سنوارنے کا فکر کرتے تھے۔ آپ لوگوں کے خاندان کی طرح نہیں کہ بچہ "کلمہ پڑھتے" پیدا ہونے کے بجائے سی اے ٹی کیٹ (Cat) اینڈ بیٹ (Bat) پڑھتا ہوا پیدا ہوتا ہے۔

"اوہ تو گویا آپ پیدا ہوتے ہی کلمہ پڑھنے لگی تھیں۔ گویا آپ پیدائشی مسلمان ہیں۔۔۔
اچھا پیدائشی مسلمان صاحبہ کیوں نہ ذبح کرتے وقت آپ ہی دعا پڑھ دیں۔"

"یہ دعا میرے پڑھنے کی چیز نہیں ہے کیوں کہ قربانی مجھے نہیں آپ کو کرنی ہے۔" انھوں نے مسکرا کر کہا۔

"کیا حرج ہے؟ میرے بجائے آپ ہی میری طرف سے قربانی بھی کر دیں۔ اور دعا۔۔۔۔ (کہ رمضان نے پھر آواز دی) آیا بھئی آیا۔

پھر وہی ہوا جو پہلے سے معلوم تھا یعنی کتاب سامنے رکھ کر دعا مجھے پڑھنی پڑی اور قربانی کے لیے ذبح جو کرنا چاہا ہے تو چھری بجائے بکرے کے نرخرے پر چلنے کے میری انگلی پر چل رہی تھی۔ قصاب نے جو یہ نظارہ دیکھا تو جھٹ چھری پکڑ کر بکرے کے گلے پر چلا دی۔ "جب آپ دعا بھی ٹھیک سے نہیں پڑھ سکتے تو ایم اے کیسے کر لیا؟ بیگم صاحبہ سچ کہتی ہیں۔"

میں جھینپ کر کہا۔ "دعا عربی میں ہے اور میں نے ایم اے انگریزی میں کیا ہے۔ پھر کچھ رک کر گویا ہوا۔ "بھئی اصل بات یہ ہے کہ جس کی بندری وہی نچائے۔" ●●

اقبال شانہ (سعودی عرب)

غزل

جناب کے خیال سے مہک گئی ہے کھوپڑی
بذاتِ خود جب آگئے بہک گئی ہے کھوپڑی

پہنچ گئی ہے منزلوں پہ سوچ رینگتے ہوئے
نہ جانے کیسے راستہ بھٹک گئی ہے کھوپڑی

وہ چکنے چکنے سر پہ جب لگانے تیل آگئے
تو چودھویں کے چاند سی چمک گئی ہے کھوپڑی

وہ بن گئے ہیں شہر کے بڑے عظیم رہنما
سنا ہے جب جناب کی سنک گئی ہے کھوپڑی

ڈبا دیا ہے آپ نے مجھے اندھیری رات میں
دلِ غریب کی طرح دھڑک گئی ہے کھوپڑی

نظے ملی ہم نے اس طرح سنبھالا اپنے آپ کو
سنبھل گیا بدن مگر لڑھک گئی ہے کھوپڑی

عجیب عجیب صورتوں کو گوشہ نشین دیکھ کر
حیا سے چھت کے درمیاں لٹک گئی ہے کھوپڑی

کبھی نہیں ہیں بال یہ سفید میں نے دھوپ میں
کہ فکرِ شعر و شاعری میں پک گئی ہے کھوپڑی

جنابِ شانہ آپ کی بہت کٹھن ہے شاعری
سمجھ گئے تو جان لو بہک گئی ہے کھوپڑی

غزل

ان کے قدموں سے لپٹ کر مرے ارمان گئے
باندھ کر دامن دل سے مرے بہتان گئے

ہم نے دیکھا انھیں ہوٹل میں تھرکتے اسی شام
باپ سے ان کے جو پوچھا کہا مہمان گئے

میں تھا اک نرس کے ہمراہ اپولو میں مگر
اس نے بیگم کو جو دیکھا مرے اوسان گئے

تھے وہ بشعرکی نسل سے مجھے معلوم نہ تھا
آئینہ ان کو دکھایا تو برا مان گئے

آخری عمر میں سوجھی تھی لگن کی ان کو
پھول سہرے کے تھے جھاتھ وہ شمشان گئے

پھل یہ جمہور کے ، جمہور کے ہاتھوں سے ملا
آج اس دور میں میزان کے اوزان گئے

غیر کے ساتھ تھیں اٹھکھیلیاں ان کی بےحس
ہم نے جب راہ میں چھیڑا تو برا مان گئے

بے حس الٰہ آبادی

ڈاکٹر ضیاء الحسن
(ناندیڑ)

جاری ہونا ایک اردو روزنامے کا

گزشتہ ماہ بلیغ الدین ہمارے مطب آئے اور یہ مژدۂ جانفزا سنایا کہ وہ اپنے ہفتہ وار اخبار کو روزنامے میں تبدیل کر رہے ہیں۔ پہلے تو ہمیں ان کے الفاظ پر یقین آیا نہ اپنے کانوں پر۔ ویسے ہائی وے کی ٹریفک کی وجہ سے (جو لیڈروں کے دعووں سے کچھ ہی کم بلند آہنگ ہوتی ہے) ہمارے مطب میں الفاظ کی صحت کو ہمیشہ خطرہ لاحق رہتا ہے۔ ہمارے چہرے پر ابھری بے اعتباری کو انھوں نے اردو اخبار کے پرانے قاری کی طرح پڑھ لیا اور اسے دور کرنے کے لیے پان کی پیک کو نگل کر تقریباً سنجیدہ بلکہ رنجیدہ ہوتے ہوئے بولے — "اخبار کو روزنامہ بنانے کے معاملے میں ہم اگر سیریس ہیں۔ لفظ "سیریس" کو سن کر ہماری بے اعتباری یکلخت دور ہو گئی۔ کیوں کہ 'سیریس' لفظ ہی ایسا ہے جس پر اعتبار کر لینا ڈاکٹر کے فرائض میں سے ایک ہوتا ہے۔

ہم پر یہ راز بھی افشا کیا گیا کہ سابق ایم۔ایل۔اے نور اللہ خاں صاحب جو ہمارے مقامی لیڈر بھی ہیں اخبار کے چیف ایڈیٹر ہوں گے۔ یہ جان کر ہمیں خوشی ہوئی کہ اب خان صاحب نے بھی شہادت گہہ صحافت میں قدم رکھا ہے۔ ہمیں اپنے مطب میں شریک مریضوں کی نیند کا خیال نہ رہتا تو ہم ضرور کوئی نعرہ یا نعرۂ تحسین ضرور لگاتے۔ ویسے بھی وقت بے وقت نعرے لگانا لیڈر کا اور انجکشن لگانا ڈاکٹر کا کام ہوتا ہے۔

ابھی ہم اپنی خوشی کے اظہار کے لیے کوئی مناسب یا غیر مناسب طریقہ اختیار کرنے کے بارے میں سوچ ہی رہے تھے کہ معاً ہماری آنکھوں کے سامنے ان مظلوم ایڈیٹروں کے چہرے تیزی سے آنے لگے جنھوں نے اردو اخبار نکالنے کی جسارتِ بے جا کی تھی۔ اور پھر کچھ عرصے کے بعد انھوں نے خدائے ربّ ذو الجلال کے سامنے گڑگڑا کر توبہ کر لی تھی نیز یہ عہد بھی کر لیا تھا کہ وہ اپنی حیاتِ مستعار میں سب کچھ کریں گے۔ مگر اردو کا کوئی اخبار نہیں نکالیں گے۔ چناں چہ ایک سچے دوست اور خیر خواہ ہونے کے ناطے ہم نے بلیغ الدین کو مشورہ دیا تقریباً اسی طرح کا مشورہ ہم نے کویت پر قبضہ کرنے سے پہلے بھائی صدام حسین کو بھی دیا تھا کہ اے عزیز! خبردار!

تم اپنی جان کو خواہ مخواہ مصیبت میں کیوں ڈالتے ہو؟ تم پر ایسی کیا افتاد آپڑی جو تمھیں روزنامہ نکالنے کی سوجھی تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ مہنگائی کتنی بڑھ چکی ہے، نیوز پرنٹس کی قیمتیں پہلے آسمان سے باتیں کرتی تھیں اب گرم جوشی سے مصافحہ کر رہی ہیں، چھپائی کے ریٹس بڑھ چکے ہیں۔ پہلے تمھیں ایک کاتب کو برداشت کرنا پڑتا تھا اب کئی کاتبوں کو قابو میں رکھنا پڑے گا۔ کیوں کہ اردو اخبارات کے لیے کاتب حضرات کی وہی اہمیت ہے جو بھارت سرکار کے لیے کشمیر کی۔ روزنامہ شروع کرتے ہی تمھاری راتوں کی نیند اور دن کا چین دونوں حرام ہو جائیں گے۔ تازہ خبروں اور اشتہارات کی تلاش میں گاؤں گاؤں، شہر شہر گھومنا پڑے گا۔ دشتِ صحافت کی سیر کے دوران لوہے کے چنے نہیں تو ابلے چنے ضرور چبانے پڑیں گے۔ پھر اردو داں اخبار اور کتابیں خریدنے جیسے فضول کاموں میں اپنے پسینے کی گاڑھی کمائی ضائع نہیں کرتے۔ خیر سے تم ابھی تو کنوارے ہو، ہمارے خیال میں ہفتہ وار کی آمدنی ایک کنوارے شخص کے لیے کافی سے کچھ زیادہ ہی ہوتی ہے۔ اس لیے میری مانو تو روزنامے کے پروگرام کو شادی تک کے لیے ملتوی رکھو۔ بولے۔ "تم بھی عجیب آدمی ہو، بھلا شادی کا روزنامے سے کیا تعلق ۔ ؟ گزشتہ دس سال سے حیدرآباد کے جس روزنامے کا نامہ نگار ہوں، اس کے ایڈیٹر بھی تو اب تک کنوارے ہیں۔ . . . . ." ہم نے کہا پھر بھی ان حالات میں اردو کا کوئی روزنامہ نکالنا خطرے سے خالی نہیں۔ "سگریٹ کا ایک طویل کش لینے کے بعد ہماری سر جیکل ٹرے کو ایش ٹرے کی طرح استعمال کرتے ہوئے بولے۔" خطروں سے کھیلنا تو اب ہماری عادت بن چکی ہے۔" پھر قدرے توقف کرنے کے بعد تفہیمانہ انداز میں ہمیں مخاطب کرتے ہوئے فرمانے لگے۔ . . . . . .

"جس طرح سیریس مریض کو ٹریٹ منٹ دے کر اچھا کرنا قابل ڈاکٹر کی پہچان ہوتی ہے اسی طرح نازک حالات میں اخبار نکالنا باہمت صحافی کی پہچان ہے ورنہ کھانسی اور بخار کا علاج تو کوئی بھی ڈاکٹر کر سکتا ہے۔ . . . . . . وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتے تھے لیکن سخن فہم کمپاونڈر نے "توجہ چاہوں گا" کہتے ہوئے۔ خوب صورت ٹرے میں ایک "ثلاثی" جو ایک کپ چائے ایک عدد برکلے سگریٹ اور پان پہ مشتمل تھی۔ ان کی خدمت میں پیش کردی۔ ٹرے کو دیکھ کر وہ اس طرح خاموش ہو گئے جیسے کوئی بڑا جیدار نکسلائٹ کے ہاتھوں میں تھمی AK-47 رائفل دیکھ کر ہو جاتا ہے۔ ویسے بھی ہم عموماً ان سے بحث کرنے کی ہمت نہیں کرتے۔ کیوں کہ ہمیں یقین ہے کہ ہم ہر طرح مباحثے میں حصہ لے کر فریقِ مخالف کو شکست دے سکتے ہیں۔ مگر بلیغ الدین کو شکست دینا ہم جیسے ڈاکٹروں کے بس کا روگ نہیں ہے۔

بلیغ الدین کو ہم اس وقت سے جانتے ہیں جب صحافت اور سیاست کے جراثیم ان کے جسم میں داخل ہونے کی سر توڑ کوشش کر رہے تھے۔ بعض چشم دید گواہوں کے بموجب اس حملے کی دعوت خود انھوں نے دی تھی (یہ بات ابھی تحقیق طلب ہے) بہر حال کئی دنوں تک یہ جنگ جاری رہی کبھی یہ ان پر حاوی ہوتے تو کبھی وہ ان پر۔ انجام کار بلیغ الدین کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔ اور بہ یک وقت وہ صحافی اور لیڈر بن گئے۔ (گو، ان دن اس وقت اتنا عام نہیں ہوا تھا) یہ شاید پہلی شکست تھی جسے انھوں نے خندہ پیشانی کے ساتھ قبول کیا۔

ان کا نام سید بلیغ الدین ان کے جسامت کے مقابلے میں بھاری بھرکم لگتا ہے۔ اس پر بھی انھوں نے اکتفا نہیں کیا۔ ساتھ میں ایک عدد تخلص ثاقب بھی جوڑلیا۔ اب ان کے نام کے آگے دوسرے مقامی لیڈروں کے نام 'برائے نام' دکھائی دینے لگے ہیں۔

جس طرح ایک اردوداں بغیر کسی مشق کے جنوبی ہند کی سیاسی پارٹی "دراوڑ منیتر کژگم" کا تلفظ ٹھیک سے ادا نہیں کرسکتا۔ ٹھیک ویسا ہی معاملہ مراٹھی داں حضرات کا بلیغ الدین کے نام سے ہے۔ بعض وقت ہمیں اردو زبان سے کہیں زیادہ ترس بلیغ الدین پر آتا ہے۔ جب کبھی جلسے میں کوئی مراٹھی داں ان کا تعارف شری شید بلیگو الدین بتاکب یا بلگو الدین شکیب کہہ کر کراتا ہے۔ ویسے نام کی حد تک وہ مظلوم ہیں جس طرح دنیا کے تمام انسان ہوا کرتے ہیں۔ لیکن ہمیں یقین ہے کہ اگر ان کی پیدائش مرہٹواڑہ میں ہوتی اور خداتعالیٰ نام رکھائی کے دن انھیں قوت گویائی عطا کرتا تو یہ ضرور پالنے میں تبدیلی نام کے لیے احتجاج کرتے۔ ان کے چار لفظی نام کو دیکھ کر ہم نے کئی بار انھیں مشورہ دیا کہ اردو زبان کے ایک نفیس منش انسان گزرے ہیں۔ جو تمھاری طرح اخبار بھی نکالتے تھے اور شاعر و سیاست داں بھی تھے۔ ان کا پورا نام سید فضل الحسن حسرت تھا۔ لیکن آج بھی وہ دنیائے ادب میں حسرت موہانی کے نام سے پہچانے جاتے ہیں۔ تم نام کو مختصر کرنے کی حد تک تو ان کی تقلید کرلو۔ کہنے لگے۔ "اگر میں ہر معاملے میں کسی نہ کسی کی تقلید کرتا جاؤں تو میری اپنی شناخت ختم ہوجائے گی۔ تم تو جانتے ہو اب ہمارے ملک میں شناخت اور تشخص کا مسئلہ کس قدر اہمیت اختیار کرچکا ہے۔ پھر مجھے حسرت کی طرح مشقِ سخن کے ساتھ چکی کی مشقت کی عادت ہے اور نہ ہی چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا آتا ہے۔ تم ہی بتاؤ ایسی تقلید سے کیا حاصل؟

ہمیں یاد ہے کہ جس زمانے میں ملک میں ایمرجنسی نافذ ہوئی ہوتو وہ ہمارے سامنے ایمرجنسی کے فوائد اور نقصانات پر پرزور کوئی نہ کوئی لیکچر ضرور دیا کرتے تھے۔ لیکن اس وقت بھی ہم آج کی طرح سیاست سے بے بہرہ بلکہ مکمل طور پر بہرے تھے۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ ایمرجنسی آخر کیا بلا ہے؟ ہم تو صرف سرکاری اسپتال کے ایمرجنسی وارڈ سے واقف تھے اور اتنا جانتے تھے کہ جو بھی اس وارڈ میں شریک کیا جاتا ہے۔ مشکل ہی سے زندہ واپس آتا ہے۔ ہمارے تصور میں ایمرجنسی زدہ ملک کی تصویر کچھ اس طرح تھی۔ وہ سرکاری اسپتال کے بستر پر بے یار و مددگار پڑا ہے۔ ناک میں آکسیجن کی نلیاں لگی ہیں۔ ایک طرف گلوز لگا ہے تو دوسری طرف خون کی بوتل۔ رائلس ٹیوب سے ناک کے ذریعے غذا دی جارہی ہے۔ نہ بات کرنے کی اجازت ہے نہ اپنی مرضی سے حرکت کرنے کی۔ وہ بے بس ٹنگا ہوں سے ڈاکٹرس کے چہروں اور نرسوں کی ننگی ٹانگوں کو تک رہا ہوگا۔ چناں چہ ہمارا ملک تقریباً ڈیڑھ سال تک اس حالت میں رہا۔ . . . ایک دن بلیغ الدین خوشی خوشی ہمارے گھر آئے اور یہ خبر سنائی کہ ایمرجنسی ختم کردی گئی ہے۔ ہم نے بھی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا۔ "چلو اچھا ہوا جو تمھاری دعائیں کام آگئیں۔ ملک کو صحت کاملہ نہ سہی صحت عاجلہ تو نصیب ہوگئی۔ جلیے اور اس خوشی میں جلد سے جلد کسی جشن کا اہتمام کیجیے۔"

اس کے بعد بلیغ الدین بہت کم نظر آنے لگے جو ملاقاتیں روزنامے کی طرح ہر روز ہوا کرتی تھیں اور جس کے کبھی کبھی ایوننگ اڈیشن بھی ہوجاتے تھے اب رفتہ رفتہ ہفت روزہ اور ماہ نامہ ہونے لگیں۔ ہمیں ڈر تھا کہ

[illegible] سہ ماہی اور پھر سالانہ بن کر آخر میں کہیں بند نہ ہو جائیں۔ بہت دنوں کے بعد وہ کسی شمارے کے Boomerang کی طرح ملے تو کافی رنجیدہ تھے۔ کہنے لگے — "نئی حکومت گر گئی"۔ ہم نے پوچھا — کہیں چوٹ تو نہیں آئی؟ — بولے — "یہ چوٹ دکھائی نہیں دیتی"۔ ہم نے بہ تجسس تمام دریافت کیا۔ یہ چوٹ بھی عشق کے قسم کی ہوتی ہے؟ جھنجھلاتے ہوئے بولے۔ "تم سیاست میں عشق کو کیوں گھسیٹ رہے ہو؟" اس لیے کہ ہمیں بھی عشق ہے اپنے وطن عزیز سے" ہم نے وضاحت کی — فرمانے لگے — "تو سنو، حکومت کے گرنے سے چوٹ ملک کے خزانے پر لگتی ہے اور پھر غریب عوام کے پیٹ پر ...."

ایمرجنسی کے بعد کمیشنوں کا سلسلہ چل پڑا۔ ایک عرصے تک ہم یہ سمجھ نہیں پائے تھے کہ یہ کمیشن کیا ہوتا ہے۔ شاہ کمیشن سے لے کر منڈل کمیشن تک ہم وہ کمیشن سمجھتے تھے جو عام طور پر بروکرس لیا کرتے ہیں لیکن جب درمیان میں بوفورس سودے میں لیے گئے کمیشن پر کمیشن بٹھائے جانے کی بات کی جانے لگی تو ہماری عقل نے کام کرنے سے انکار کر دیا کہ کمیشن پر پھر کمیشن چہ معنی دارد؟ اس پر بلیغ الدین نے ہمیں سمجھایا کہ جس طرح تم نفسیاتی مریضوں کا علاج خوش رنگ Empty Capsules اور Tablets دے کر کرتے ہو اسی طرح اطبائے سیاست قوم کی بیماریوں کا علاج کمیشن تشکیل دے کر کرتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ تمہارے مریض شفایاب ہو جاتے ہیں جب کہ کمیشن کا کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔ اس کے علاوہ بھی انھوں نے ہمیں سیاست کے سیکریٹس بتائے۔ مثلاً لیڈرس لباس کی طرح پارٹیاں کیوں بدلتے ہیں۔ نیتا اور محبوبہ کے وعدے میں بنیادی فرق کیا ہوتا ہے۔ چناؤ جیتنے کے بعد ایم۔ ایل۔ اے اپنے حلقۂ انتخاب کے ووٹرس کو کیوں بھول جاتے ہیں۔ اردو عوام کے ہاتھوں میں اردو اکیڈیمی کا خوش رنگ کھلونا دے کر انھیں کس طرح بہلایا جاتا ہے۔ چیچک اور طاعون جیسے موذی امراض پر قابو پا لینے کے باوجود ملک میں فرقہ وارانہ فسادات پر قابو کیوں نہیں پایا جا سکا وغیرہ وغیرہ۔

بلیغ الدین سفر میں ہوں یا حضر میں، ہوٹل میں ہوں یا سٹی بس میں، وہ مقامی سیاست سے لے کر بین الاقوامی سیاست تک باخبر رہتے ہیں۔ حتیٰ کہ ہمارے مطب میں ... جہاں ہر ریاست کے مریض آتے ہیں وہ سیاستِ حاضرہ پر Discuss کرنے سے نہیں چوکتے۔ تمل ناڈو سے آئے ہوئے مریض سے یہ معلوم کرتے ہیں کہ راجیو گاندھی قتل کیس کے اہم مہرے شیوراسن اور شبھا تو بنگلور سے قریب ایک کمرے میں بند تھے اور چابی بھی نہیں کھوئی تھی پھر ہماری انٹلی جنس نے یہ قیاس کیسے کر لیا کہ وہ دونوں تمل ناڈو کے جنگلوں میں آنکھ مچولی کھیل رہے ہیں۔ ہریانوی مریض سے چودھری دیوی لعل کی صحت کے بارے میں پوچھیے کہ چاروں شانے چت ہونے کے بعد اب کیسا محسوس کر رہے ہیں؟ سردار جی سے پنجاب کے بارے میں جانکاری حاصل کر لیتے۔ بمبئی سے آئے ہوئے ٹیکسی ڈرائیور سے دریافت کرتے کہ بمبئی میں فرض شناس پولس کرکٹ کے پیچ کی حفاظت تو نہیں کر پائی۔ اب اقلیتوں کے املاک کے بارے میں ان کا کیا خیال ہے؟۔ بہر حال وہ تمام ریاستوں کے حالات و کوائف سے ہمیشہ باخبر رہتے ہیں جس طرح ایک صحافی کو رہنا چاہیے۔ ان کی اس مستعدی کی ضرورت ہفت روزہ سے کہیں زیادہ روزنامے کو تھی۔ شاید اسی لیے انھوں نے اپنے ویکلی کو ڈیلی میں تبدیل کر دیا ہے۔ بلیغ الدین نے ہم سے وعدہ کیا ہے کہ ان کے اخبار کی پالیسی آرگنائزیشن سے کہیں زیادہ صاف ستھری ہوگی

محکمۂ آبرسانی چاہے کتنا ہی گندا پانی کیوں نہ سپلائی کرے ، حکمران کی صحافت کبھی پرقائم زدہ نہیں ہوگی۔ وہ عوام کی عدالت میں ہمیشہ سچی رپورٹیں پیش کرتے رہیں گے۔ دیش کے باسیوں کے ناشتے میں باسی روٹیاں ہی کیوں نہ ہوں مگر ان کے اخبار میں تازہ خبریں ہوں گی۔ اگر کوئی ان پر تحریری حملہ بھی کرے تو اہنسا کے علم بردار بنے رہیں گے۔ بہلائے اکثر روزناموں کے .... اندرونی صفحات "ستر" کی تعریف میں آتے ہیں ، جن پر نگاہ ڈالنا بھی ایک شریف انسان گوارا نہیں کرتا۔ بلیغ الدین اپنے اخبار کی ستر پوشی چشم پوشی نہیں کریں گے

بلیغ الدین نے ہفت روزہ کو روزنامہ بنانے کے لیے اتنی محنت کی ہے کہ ہمارا جی چاہتا ہے کہ اس کا سہرا ان ہی کے سر جائے۔ ویسے بھی اخبار کے مدیران اربعہ میں سہرے کے اصل حقدار وہی ہیں۔ باقی تین مدیران سہرا باندھ کر شاید اپنی ازدواجی زندگیوں کو تلخ بنانا پسند نہیں کریں گے۔

ان کے اخبار کی تاریخ رسم اجرا اتنی بار بدل چکی ہے کہ کوئی لیڈر بھی کیا سیاسی پارٹیاں بدلتا ہو۔ اب اگر ۲۱ نومبر ۹۱ء کی تاریخ بھی خدانخواستہ ملتوی ہو جاتی تو ایک دوست کے مطابق اس واقعے کو "گنیز بک آف دی ورلڈ ریکارڈ" میں نہ سہی ناندیڑ کی صحافت کی تاریخ میں ضرور درج کرلیا جاتا۔

بہرحال تھوڑی تاخیر سے سہی آج وہ دن آپہنچا کہ سرزمین ناندیڑ سے ایک نئے اردو روزنامے کا اجرا ہونے جارہا ہے۔ اس اخبار کا نہ تو ذاتی دفتر ہے نہ پریس نہ کوئی بڑا سرمایہ۔ ایسے حالات میں ایک اردو روزنامے کی شروعات یقیناً ایک آزمائش ہے لیکن اس سے بھی بڑی آزمائش اخبار کے صحافی کردار کی ہے۔ اگر اس کے ذمے داروں میں باطل سے لڑنے کا عزم ہو ، ان کا شیوہ حق گوئی و بے باکی ہو اور اگر انھیں بادشاہ کائنات کے سوا کسی کا خوف نہ ہو تو ہمیں یقین ہے کہ ان کا اخبار عوام کے دلوں پر حکومت کرے گا۔ اور اس سے وابستہ لوگ عزت کی نگاہ سے دیکھے جائیں گے۔

●●

زیرِ لب

منتخب اشعار

اس عنوان کے تحت ہر مہینہ قارئین کی پسند کے اشعار شائع کئے جائیں گے (ادارہ)

نصر اللہ خاں، گلبرگہ

بچوں کو میرے یارب جینے کا تو ہنر دے
آنکھیں تو دی ہیں تونے آنکھوں میں کچھ نظر دے
بیٹی ہو چاند بی بی بیٹا ہو ٹیپو جیسا
ورنہ تو میرے مالک، ماؤں کو بانجھ کردے
(سلیمان خطیب)

سلیم احمد، مغل پورہ

ہر قدم پر دل پڑے ہیں حسرت پامال میں
اب زمیں پر پاؤں رکھ کر یار چلتا ہی نہیں
غیر کو تو کر کے ضد کرتے ہیں کھانے میں شریک
مجھ سے کہتے ہیں اگر کچھ بھوک ہو کھا لیجئے
(اکبر)

ساجد علی، حیدرآباد

پہلے تھے اس بُت کے گرد، اب ساتھ ہے بچوں کی فوج
عشق میں دیوانہ تھا، اب فکر میں دیوانہ ہوں
(اکبر)

عبدالعلیم، فتح دروازہ حیدرآباد

چاہتے ہیں خوبرویوں کو اسد
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیئے
(اسد اللہ خاں غالب)

احمد جمیل، بھیونڈی

فیشن یہ چاہتا ہے کہ یہ بھی نہ رہ سکے
تھوڑا بہت جو فرق ابھی مرد وزن میں ہے
(دلاور فگار)

فیاض احمد، رانچی

تحریر میں چستی دے، تقریر میں گرمی دے
جنتا کو جو پھسلالے اور قوم کو بہکا دے
کرسئ وزارت پر اک جست میں چڑھ جاؤں
تدبیر کو پھرتی دے، تقدیر کو جھٹکا دے
(رضا نقوی واہی)

محمود سلیم، حیدرآباد

اپنی جیبوں سے نمازی رہیں سارے ہوشیار
اک بزرگ آتے ہیں مسجد میں خضر کی صورت
(مولانا حالی)

عشق میں ہم بن کے اُلّو رہ گئے
اب تصوّر کے قلعے بھی ڈھ گئے
اُن کے بچے ہم کو ماموں کہہ گئے
"دل کے ارماں آنسوؤں میں بہہ گئے"
(پاپولر میرٹھی)

سعدیہ غوری
(ریاض)

کاک ٹیل

(مزاحیہ شہ پاروں سے اقتباس)

اب کی مرتبہ دہلی کے سفر اور قطب مینار کی چڑھائی کے موقع پر کچھ ایسا اتفاق پیش آیا کہ اول تو خدا خدا کرکے پسینے میں ڈوبے ہوئے اور ہانپتے کانپتے ہم اس جگہ پہنچے جہاں بقول شخصے دو چار ہاتھ لب بام رہ جاتا ہے۔ دوسرے اس مینار کے وہ چھجے ہوئے مقامات دیکھ کر بھی حواس گم تھے جن کو مضبوط لوہے کی پٹیوں سے باندھ دیا گیا ہے۔ پھر بار بار زلزلہ کا خیال آ رہا تھا کہ اگر خدانخواستہ اس وقت زلزلہ آجائے تو کیا ہوگا۔ ان پر طرہ یہ کہ عین تنگ سیڑھیوں پر دیکھتے کیا ہیں کہ ایک پہاڑ، جی ہاں، گوشت اور ہڈیوں کا ایک پہاڑ لڑھکتا ہوا نیچے آرہا ہے۔ سیڑھیوں کی پوری چوڑان میں پھنسا ہوا یہ ہیولہ اس جان ناتواں کے سامنے آکر اس طرح کھڑا ہوگیا کہ ایک سیڑھی درمیان میں خالی اوپر وہ اور نیچے ہم، ایک دوسرے کے سامنے رائی اور پربت کی مناسبت کی زندہ تصویر بنے کھڑے ہیں۔ ہمارے پیچھے نیچے سے اوپر آنے والوں کی ایک فوج اور ان کے پیچھے اوپر سے نیچے آنے والوں کی ایک فوج اور ان کے پیچھے اوپر آنے والوں کا لشکر جرار۔ ان کو ہٹا کر اوپر نکل جاتا

ہمارے کیا غالباً ہوا کے امکان میں بھی نہ تھا۔ اسی لیے قطب مینار کی وہ بالائی چوڑان ان کے جسم کا نہایت تنگ چست لباس بنی ہوئی تھی اور اگر وہ نیچے بڑھیں تو بغیر ہم کو پیسے ان کا آگے بڑھنا ممکن ہی نہ تھا۔ ہم نے گھبرا کر ان کا منہ دیکھا۔ وہ کسی سکھ خاندان کی نازک اندام خاتون تھیں اور غالباً ان کے شوہر نامدار ان کے پشت پر تھے جو اپنی اہلیہ محترمہ کے شانے پر ہاتھ رکھ رکھ کر اپنے کو اچکا رہے تھے کہ دیکھیں آگے قصہ کیا ہے کہ وہ ایک دم سے ٹھہر گئی ہیں ادھر نسیم صاحب نے جو ہمارے پیچھے تھے ہم کو آگے بڑھنے کے لیے دھکیلنا شروع کیا۔ "چلو بھائی سخت حبس ہے ٹھہرو نہیں۔" ہم نے کہا "کیسے چلیں آگے تمھیں دیکھو مینار میں گنبد والا قصہ ہے۔"

..... (مینار میں گنبد)

الہ ... ت تھانوی

●

جب بہ تقریب سفر یار نے بستر باندھا
تو وہ بستر بھی عجب فتنۂ محشر باندھا

کہے اپنی ضخامت میں لحاف دیکھیے
جن میں اسی شوخ نے اک ممی کا کفن تیار تھا
کوٹ میں ٹرنس کے بچی کو بنایا بقچہ تھا
اس نے کس ڈھب سے مونث کو مذکر باندھا
(ریحانہ رشید)

ایک صاحب مقدمے میں باعزت بری ہو جانے کے بعد اپنے وکیل سے اس کے دفتر میں جا کر ملے اور اس کی خدمت کا معاوضہ پوچھا۔ وکیل نے جواب دیا "آٹھ سو روپے" کچھ کہے بغیر ان صاحب نے اپنے بٹوے سے نوٹ نکال کر گننے شروع کیے ابھی پانچ سو روپے ہی گنے تھے کہ برابر کے کمرے سے جس میں دانتوں کا ڈاکٹر پریکٹس کرتا تھا کسی آدمی کی درد بھری چیخ سنائی دی۔ ان صاحب نے نوٹ گننے کا عمل جاری رکھا، مگر اس کے ساتھ سے یہ بھی پوچھ لیا "کیا آپ کے برابر میں کسی وکیل کا دفتر ہے؟"

شیطان کے کمرے میں ہم سب رضائیاں اوڑھے کھانا کھا رہے تھے۔ خالد کہہ رہے تھے: "میری وجہ سے آپ لوگوں کی زندگی میں جو خوشگوار یا دوسری تبدیلیاں آئیں یا ابھی آئیں گی، ان کی مجھے ذرا بھی مجھے ذرا بھی پرواہ نہیں، کیوں کہ میں ایسی جگہ جا رہا ہوں جہاں سے کوئی لوٹ کر نہیں آیا --- میں اب بزنس کرنے جا رہا ہوں۔ عنقریب میں بزنس مین کہلاؤں گا۔ اب میرے سامنے ایک شاندار زندگی ہے۔ آج سے کچھ عرصے کے بعد اگر آپ کو سیکنڈ کے ڈبے میں خشری کوٹ اور تہ بند نما پتلون پہنے کوئی ایسا شخص نظر آئے جس کی شکل مجھ سے ملتی ہو جو سگریٹ کو مٹھی کے اندر دبا کر کش لگا رہا ہو اور چلی

[illegible] جہاں تک ہو ایسے لٹریچر میں [illegible] شوں سڑپ کرکے پیتا ہو، بعد میں ڈکار لیتا ہو تو اس سے مزید ملیے، شاید وہ میں ہی ہوں گا۔ اگر میں ہوا تو میری شادی ابھی ہو چکی ہو گی۔ میں آپ کو زندگی [illegible] گھرے جاؤں گا۔ مرغوں کے شور اور بکریوں کی میں میں سے واضح ہوگا کہ میں سیٹل ہو چکا ہوں۔ آپ ایک فربہ خاتون سے بھی ملیں گے جو کسی زمانے میں اپنے کالج کی ایک حسین ترین چھریری لڑکی تھیں۔ فلاسفی، انگلش یا کسی اور مضمون کی ایم اے تھیں۔ ہم آپ کو بڑی اچھی اچھی باتیں سنائیں گے۔ اپنے رشتہ داروں کی ذرا ذرا سی شکایتیں۔ انتظامی سیاست، مارکٹ کا اتار چڑھاؤ، الکشنوں کے قصے اپنے بچوں کے حالات یہ بچہ بیمار تھا۔ یہ بچہ دانت نکال رہا ہے۔ اسے نیلا تھوتھا عرق گاؤزبان میں ملا کر پلاتے ہیں .... ہم غروب آفتاب کی طرف پیٹھ کیے بیٹھے رہیں گے۔ چاند نکلا تو سردی کے خیال سے اندر چلے جائیں گے۔ ریڈیو لگایا میاں کے ملہار پر بازار کے بھاؤ کو ترجیح دیں گے۔ اگر آپ نے ہماری زندگی پر رشک کیا یا ترس کھایا تو آپ اپنا وقت ضائع کریں گے۔ اسی زندگی کے لیے جی رہا ہوں .... اسی کے لیے آپ جی رہے ہیں ... ... ہم جی رہے ہیں (ٹیکسلا سے پہلے اور ٹیکسلا کے بعد۔ شفیق الرحمٰن)

کہا مجنوں سے یہ لیلیٰ کی ماں نے
کہ بیٹا تو اگر کر لے بی اے پاس
تو فوراً بیاہ دوں لیلیٰ کو تجھ سے
بلا دقت میں بن جاؤں تیری ساس
کہا مجنوں نے یہ اچھی سنائی
کجا عاشق کجا کالج کی بکواس

بڑی بی آپ کو کیا ہو گیا ہے
ہرن پر لادی جاتی ہے کہیں گھاس
یہی ٹھہری جو شرط وصل لیلیٰ
تو استعفا مرا با حسرت و یاس

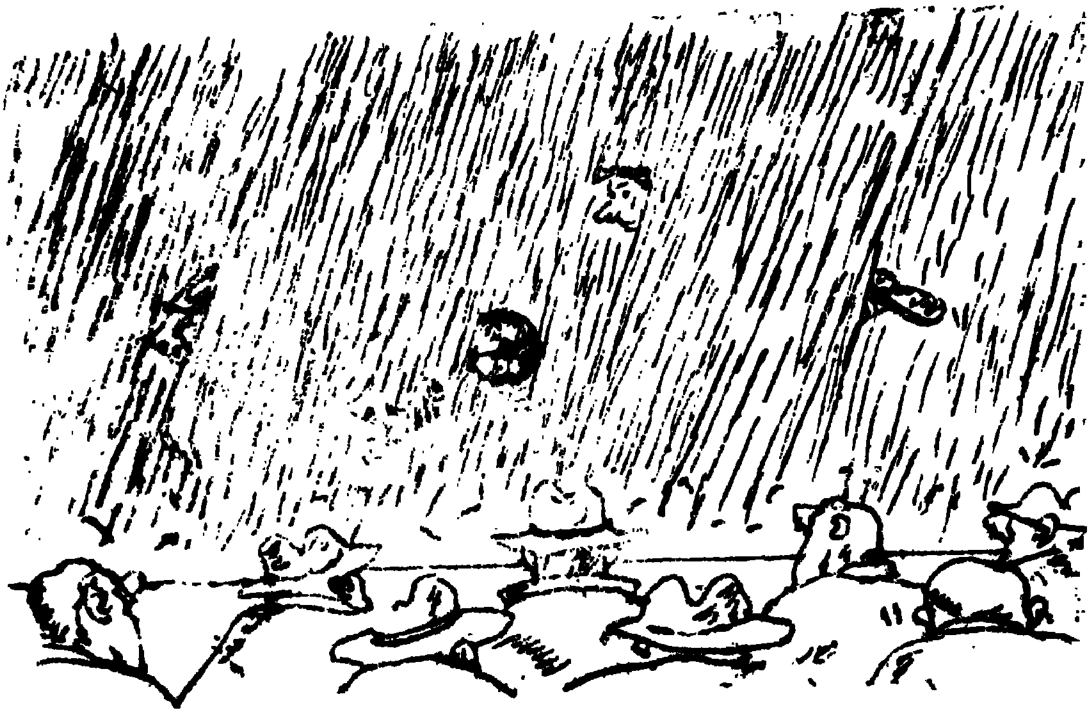
(اکبر الہ آبادی)

چھوٹے سے قصبے میں رات کے وقت سیاسی
... ہونے والا تھا۔ صبح کے وقت ایک شخص قصبے
... سبزیوں کی واحد دکان پر آیا۔ "براہِ مہربانی اپنے

اپنے تمام گلے سڑے ٹماٹر، آلو، چقندر اور گندے انڈے ٹوکرے میں ڈال دیں اور ان کی قیمت بتائیں۔"

سبزی فروش کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔ معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے پوچھا "خیر تو ہے — رات کا جلسہ خراب کرنے کا ارادہ ہے کیا؟"

"نہیں"۔ گاہک نے رازداری کے انداز میں سرگوشی کی "ہم نے رات تقریر کرنی ہے۔"



یہ فٹ بال ہو رہا ہے کہ واٹر پولو

ڈاکٹر لئیق صلاح
(ریڈر اردو گلبرگہ یونیورسٹی)

مولانا محمد علی بہ حیثیت طنز و مزاح نگار

مولانا محمد علی مجاہدینِ آزادی میں ممتاز سمجھے جاتے ہیں۔ انھیں ناساعد حالات سے بھی گزرنا پڑا۔ لیکن اپنی زندہ دلی کے سبب ان سے مقابلہ کرنے کے اہل ثابت ہوئے اور نوجوان نسلوں کو اس امر سے آگاہ کیا کہ کس طرح زندگی سے آنکھیں چار کرنے کے لیے ہمت و جرأت کے ساتھ ظرافت کا ہونا ضروری ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی نے "محمد علی کی ڈائری" میں مولانا کے بھائی شوکت علی کا ایک مضمون "زندگی کی آخری شب" کے عنوان سے شائع کیا ہے جس سے اس بات سے آگہی ہوتی ہے کہ اس مردِ قلندر نے واقعی زندگی کی آخری سانسوں تک قوم کی خدمت کی ہے — "بیماری کی کوئی اطلاع نہیں ملی تھی اور کیسے ملتی! ہفتے کے دن صبح تو ایک گھنٹہ بھر نواب عبدالقیوم سے سرحد کے معاملے پر مفصل گفتگو کی..... اس کے بعد ۱½ گھنٹہ مسئلہ سندھ کے بارے میں، سر شاہنواز بھٹو سے گفتگو کی۔ تیسرے پہر کو بیگم عبدالعزیز صاحب لاہور سے تین گھنٹے متواتر سر جوڑے ..... شارٹ ہینڈ والے کو ہندو مسلم مسئلہ پر اپنے خیالات لکھوائے اور دوسرے دن ۲½ گھنٹے خود اس کے پروف ٹھیک کیے ... دو گھنٹے آرام کیا، جب ۷ بجے غفلت سے ہوشیار ہوئے دماغ درست تھا۔ مگر زبان بند ہو گئی تھی۔ یہ واقعہ قریب ۱۱ بجے شب کا تھا..... اور ۹½ بجے دن کو نہایت سکون کی حالت میں دنیا سے کوچ کر گئے۔[1]

مولانا کی مصروفیات کا یہ حال تھا کہ مرتے دم تک قومی و ملی کاموں میں منہمک رہے۔ جلال کا یہ عالم کہ مولانا رشید احمد صدیقی نے گنج ہائے گراں مایہ میں ان کا تعارف کرواتے ہوئے لکھا ہے کہ تقریر جب کرتے تو ایسا محسوس ہوتا کہ ابوالہول کی آواز اہرامِ مصر سے ٹکرا رہی ہے وہ مروتاً کسی بات کو گوارا کرنے والوں میں سے نہیں تھے۔ جو باتیں دل میں ہوتیں انھیں زبان پر لائے بغیر نہ رہتے۔ بقول آنجہانی وزیر اعظم جواہر لال نہرو "محمد علی کے فکاہی اور طنزی جنون نے دوستوں

[1] مولانا عبدالماجد دریابادی، محمد علی کی ڈائری حصۂ دوم ص ۳۰۲، ۳۰۳

کو دشمن بنالیا۔ چناں چہ یہ حقیقت ہے کہ انھیں اس دنیا سے رخصت ہوئے بارہ چودہ برس کی مدت گزر چکی ہے۔ لیکن بعض دل اب بھی ایسے ہیں جو ان سے صاف نہیں۔" لہ

رئیس احمد جعفری کا خیال بالکل درست ہے کہ ان میں صرف تیزی اور طراری ہی نہیں طرح داری بھی تھی۔ دریاؤں کے دلوں کو دہلانے والے طوفان کے ساتھ جگرِ لالہ میں ٹھنڈک پیدا کرنے والی شبنم سے بھی کام لینے کا سلیقہ تھا۔ "لیکن محمد علی کا ایک کمال یہ بھی تھا کہ وہ روتا تھا اور رلاتا تھا لیکن دوست... رلانے کے دوران میں ہنستا تھا اور وار کرتا تھا لیکن جنگ کی اس گھماگھمی میں بھی اس کے منہ سے پھول جھڑتے تھے۔ اس کا قلم تیغ ابدار کی طرح تھا اور مخالفت۔ کے سر، دل اور جگر کو کھیرے، ککڑی کی طرح کاٹتا جاتا تھا۔ لیکن عین اس حالت میں اس کی بذلہ گوئی اس کی ظرافت، اس کی بذلہ سنجی، خود بسمل سے بھی داد حاصل کر لیتی تھی۔۔۔۔۔ ان انگاروں، ان شعلوں اور ان چنگاریوں کو جب وہ چاہتا تھا گلزار بنا دیتا تھا۔"

مولانا محمد علی، سیاست، مذہب، صحافت اور سوانحی ... کا خزانہ تھے۔ یہ موضوعات ...بظاہر سنجیدہ اور خشک محسوس ہوتے ہیں لیکن مولانا کی مرنجاں مرنج طبیعت ... وہاں بھی ظرافت کا سامان فراہم کر لیتی۔ دنیا والوں کے نزدیک وہ ایک قائد، قومی رہنما، سردارِ ملت نامور صحافی، بہترین خطیب اور مذہبی راہبر تھے۔ لیکن رئیس احمد جعفری نے مطائبات محمد علی کے ذریعے ان کی زندگی کے دوسرے رُخ پر سے پردہ اٹھایا۔

محمد علی انگریزوں کی مصلحت اندیشیوں سے اچھی طرح واقف تھے۔ انگریزوں نے کئی ممالک پر تسلط قائم کر لیا تھا اور جہاں قدم جمے نہیں تھے وہاں انھیں اپنے جال میں پھانسنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ وہ شریفِ مکہ کے دوست تھے اور چاہتے تھے کہ ان کی حکومت وہاں قائم رہے۔ جب کہ مسلمانوں کی اکثریت اس فیصلے کے خلاف تھی۔ مولانا نے بڑے حسین پیرائے میں اظہار کیا ہے۔

(۱۳۔ ڈسمبر ۲۵ء کو مصر و سوڈان کے مسئلے پر دہلی میں تقریر کرتے ہوئے محمد علی نے کہا)

"انگریز حدیث نبوی کا یہ ٹکڑا تو سیکھ گئے ہیں کہ امامت قریش میں ہے لیکن اسے بھول گئے کہ اذان حبشہ میں ہے"

(افریقہ کے تعلق سے وہ بد نیتی کر رہے تھے) (ص ۹۱)

اس دوران میں سر حبیب اللہ حکومتِ ہند کے رکن تھے۔ ۲۵ء میں شریفِ مکہ اور ابن سعود میں لڑائی ہوئی۔ انگریز حجاج کو وہاں جانے سے منع کر رہے تھے۔ کیوں کہ وہاں جانے سے حکومت کے مالی موقف کے مستحکم ہونے کے امکانات تھے۔ اس تعلق سے مولانا محمد علی کے تاثرات ملاحظہ کیجیے جن میں ... بڑا تیکھا طنز کیا گیا ہے۔

"مسٹر حبیب اللہ کی بیش قرار تنخواہ، ان کے خطابات، ان کی پندرہ ضرب توپ کی سلامی ان کو مبارک ہو، مگر ان سب دنیاوی سعادتوں کے علاوہ اگر وہ حمیت اسلامی

لہ بحوالہ رئیس احمد جعفری۔ مطائبات محمد علی۔ ص ۱۹

کا ادعا بھی فرمائیں گے فرد مسلمان سوال کرے گا کہ آپ کے اسلام نے تو آپ کو یہ سب کچھ دلوایا مگر آپ بتائیے کہ آپ نے اسلام کو کیا دلوایا؟" ص ۳۰

جنوری ۱۹۲۷ء کو دہلی میں مرکزی حکومت کی نئی عمارت کا افتتاح عمل میں آیا جس پر تبصرہ مولانا محمد علی نے اپنی رپورٹ میں اس طرح پیش کیا ہے:

"۳۲ کروڑ خدا کی مخلوق مٹھی بھر اجنبیوں کی غلامی میں مبتلا ہے جو سات ہزار میل کے فاصلے سے سات سمندر پار کر کے اس پر حکومت کرتے ہیں۔ عجوبۂ روزگار یہ چیز ہے۔ اگر بابر، اکبر، شاہجہاں یا قطب مینار کی جگہ اس منظر کا تماشا کریں تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔" ص ۲۴۔

مولانا محمد علی نے وائسرائے کی دعا اور اس کی توقعات کا مذاق بھی اڑایا ہے۔ کیوں کہ جو الفاظ زبان سے نکل رہے تھے ان سے بوئے صداقت، خلوص اور سچائی کی کمی محسوس کی۔ وہ ان کی نظر میں مکر و فریب کا ایک حسین جال تھا:

"لاٹ صاحب (وائسرائے) نے دعا فرمائی کہ اس عمارت میں کام کرنے والوں کو عقل و عدل کی توفیق دے۔ ہم سوائے آمین کے کیا کہہ سکتے تھے۔ خدایا اگر ان کو عدل نہیں دیتا تو ہمیں عقل دے کہ اس فریب، عدل سے نجات پائیں۔" ص ۲۶

لارڈ ارون وائسرائے ہند جو مصلحت پسندی میں ید طولیٰ رکھتے تھے اور ان کا مقصد، سب پر یہ ظاہر کرنا تھا کہ:

"حکم حاکم مرگِ مفاجات" لہذا اطاعت اُن کا فرض ہے یعنی یہ کہ احکامات کی تعمیل ان کی مجبوری ہے۔ مولانا نے اس کی تفہیم طنزیہ انداز میں کی ہے:

"اگر نرم دل، نیک نہاد، خلق مجسم، لارڈ ارون، ہم ہندوستانیوں سے فرماتے ہیں کہ تم بڑے ضدی ہو، بڑے مغرور ہو، تم نے ہمارا ناک میں دم کر دیا ہے۔ تم کشتی اور گردن زدنی کرتے ہو۔ لیکن کوئی کہاں تک تم سے لڑے جھگڑے لو یہ تمہارا سوراج۔ اب ہٹو ہمارے سامنے سے پھر اپنا کالا منہ نہیں نہ دکھانا تو ہم سے قسم لے لو جو برا مانتے ہم خوش خوش ان کے در دولت سے چلے جاتے اور پھر کبھی ان کی دہلیز پہ قدم نہ دھرتے مگر انھوں نے ایک گالی بھی نہیں دی۔ کسی کو برا بھلا بھی نہیں کہا۔ نہایت تہذیب، نہایت متانت، نہایت خندہ پیشانی سے فرمایا کہ مجھے آپ حضرات کے ساتھ بے حد ہمدردی ہے۔ کاش میں آپ کی درخواست رد نہ کرتا۔ مگر کیا کروں سخت مجبور ہوں ..... یقیناً فاقہ کشی کی تکلیف آپ کو بے حد محسوس ہوتی ہوگی۔ اور آپ میرا، میرے شرکائے حکومت کی شکم سیری پر ضرور رشک کرتے ہوں گے مگر اطبا کی رائے ہے کہ ہم کو تجھے سے موت آئے لیکن آپ کو یہ مرض مبارک نہ ہونے پائے۔ بلکہ آپ سوکھے ٹکڑے کو ترس ترس کر جان توڑ دیں۔ امید ہے کہ آپ بالکل مطمئن ہو گئے ہوں گے۔ خدا حافظ ــــ اس پر اگر کوئی کچھ تو کیا کہے؟ اگر یہی لارڈ ارون کی ابتدائی سادہ لوحی نہیں ہے بلکہ انتہائی ہوشیاری ہے تو میں بھی ہندوستانیوں سے یہی کہوں گا کہ تمہارا خدا حافظ ہے۔" ص ۳۲

مولانا نے عبدالماجد دریابادی کو لندن سے ایک خط روانہ کیا ۔جس میں ایک پرلطف اور مفید مشورہ دیا ہے:

"میں شوکت صاحب کو بھی لکھنے والا ہوں ۔ وہ بھی اب پھلوں پر گزارہ کریں اور جس طرح ورزش میں لمبی لمبی سانسیں لیا کرتا ہوں وہ بھی لیا کریں۔ میرا وزن سات سیر گھٹ گیا ہے۔ کمر چار انچ کم ہو گئی ہے۔ ان کا (شوکت صاحب کا) وزن تو یقیناً ۲۰-۲۵ سیر گھٹ جائے گا اور وہ تھوڑے ہی عرصے میں کمر پتلی اور صراحی دار گردن کے مصداق ہو جائیں گے۔" ص ۹۲

مولانا عبدالماجد کے نام ایک اور خط میں نغمۂ موسیقی کے بارے میں رقم طراز ہیں کہ:

"گوہر جان بجائے غزلوں کے کلام اقبال سنانے کی خواہش مند ہے مگر وہ اس کے بجائے کلکتہ کے پیارے صاحب سے سننا بہتر سمجھتے ہیں۔ اس خیال کا اظہار متانت اور سنجیدگی سے نہیں، شوخی اور شگفتگی سے ہے ـــــــ" ہندوستانی گانا سننے کو اب بھی دل تڑپا کرتا ہے۔ گوہر جان کی طرف سے شوکت صاحب، دعوۃً لِلّٰہ بھی تو کچھ سن لیا کیجیے، میں قسم کھاتی ہوں سوائے اقبال کے اشعار اور حسرت کی غزلوں کے کچھ نہ سناؤں گی۔ میں نے کہلا بھیجا اب معذور ہوں البتہ جب بھی کلکتہ جاتا ہوں تو پیارے صاحب کا گانا ضرور سن لیا کرتا ہوں۔ اس طرح جنت نگاہ نہ سہی "فردوس گوش" ضرور حاصل ہو جایا کرتی ہے۔" ص ۹۴

حکیم اجمل خاں نے مولانا اور ان کے ساتھیوں کی ضیافت تربوزے سے کی۔ سب لوگ اس کی تعریف کر رہے تھے۔ مولانا محمد علی نے اپنے ایک پنجابی دوست کی طرف اشارہ کر کے کہا "لیکن پنجاب کے "خربوزے" بھی بہت اچھے ہوتے ہیں۔ ص ۱۵۹

حلف اٹھاتے وقت تو معقول اور غیر معقول دونوں قسم کے حضرات انتہائی سنجیدہ ہو جاتے ہیں۔ ایسے وقت بھی مولانا کی رگ ظرافت پھڑک اٹھتی ہے۔ "تارکِ موالات ہوں۔ حکومت کی بے وفائی پر وفاداری کا حلف نہ اٹھانے کا حلف اٹھا چکا ہوں۔" ص ۹۶۔

عام حالات میں انسان اپنی زندہ دلی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ لیکن مصیبتوں میں گرفتار رہ کر اس کو برقرار رکھنا واقعی ایک فن ہے۔ مولانا بے شمار مصیبتوں کا ذکر کس قدر دلچسپ انداز میں کرتے ہیں:

"قومی مصیبتوں نے ذاتی مصائب کو اس طرح نگل لیا ہے جس طرح موسیٰ کے عصا نے ساحروں کے سانپوں کو نگل لیا تھا۔" ص ۱۱۵

▭▭

"نامور مزاح نگار

یوسف ناظم

کے مضامین **البتہ**

قیمت [redacted]

بال کی کھال
(تبصرہ)

بوڑھے کے رول میں

مبصر : عبدالعزیز — صفحات : ۱۰۶
مصنف : محمد اسد اللہ — قیمت : ۳۵ روپے
ملنے کا پتہ : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ - نئی دہلی

اردو میں انشائیہ نگاری کی ایک طویل روایت کے باوجود انشائیہ سب سے زیادہ متنازعہ فیہ قسم کی تحریر تصور کی جاتی ہے۔ عام قاری سب سے پہلا سوال یہ کرتا ہے کہ آخر انشائیہ ہے کیا؟ اور اس کے جواب میں ناقدین نے بھی اتنے بکھیڑے کھڑے کر رکھے ہیں کہ انشائیہ :

ایک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا

بن کر رہ گیا ہے۔ یہ صورت حال خصوصاً اس وقت پیدا ہوئی جب انشائیہ نگاری کی ایک تحریک پاکستان میں وجود میں آئی۔ اس کے تحت لکھے جانے والے انشائیوں کا انداز طنزیہ و مزاحیہ تحریروں سے جداگانہ ہے۔ تخیل، تفکر اور فلسفیانہ خیالات ان مضامین میں عام ہیں۔

محمد اسد اللہ کے انشائیوں کا مجموعہ "بوڑھے کے رول میں" اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ مہاراشٹرا اردو اکیڈیمی کی مالی تعاون سے شائع ہونے والی اس کتاب میں پندرہ انشائیے، جن میں سے تیرہ انشائیے کتاب میں درج اطلاع کے مطابق پاکستان کے معتبر رسائل اوراق، تخلیق اور اردو زبان میں شائع ہو چکے ہیں۔ انشائیہ نگار نے متعلقہ موضوع "اردو انشائیوں کا تاریخی و تنقیدی جائزہ" پر تحقیقی مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری بھی حاصل کر چکا ہے۔ کتاب کا پیش لفظ وزیر آغا نے لکھا ہے اور حرفِ آخر کے تحت مرحوم احمد جمال پاشا نے انشائیہ نگاری کی تحریک اور محمد اسد اللہ کے انشائیوں پر مفصل اظہار خیال کیا ہے۔ وزیر آغا لکھتے ہیں :

> "پاکستان میں انشائیہ نگاری ایک تحریک کی شکل اختیار کر چکی ہے جب کہ بھارت میں تاحال صرف تین انشائیہ نگاروں نے اس میدان میں قدم رکھا ہے تو دو منجھے ہوئے ادیب ہیں یعنی احمد جمال پاشا اور رام لعل نابھوی لیکن تیسرا ایک نوجوان انشائیہ نگار محمد اسد اللہ ہے جس جس نے اپنے جوان جسم پر ایک بوڑھا سر لگا رکھا ہے۔"

اس کتاب میں شامل تحریروں میں انشائیوں کے نام پر شائع ہونے والے مضامین کا سا انداز موجود ہے۔ کہیں کہیں ہلکی پھلکی شگفتگی بھی ہے۔ لائٹ ایسّے کی مناسبت سے ثقیل الفاظ کا استعمال نامناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس سے گریز کر کے ان تحریروں کو عام فہم اور مزیدار بنایا جا سکتا تھا۔ ان انشائیوں میں نکتہ آفرینی اور اچھوتے خیالات تحریر کو قابلِ مطالعہ بناتے ہیں۔ بعض عنوانات بھی دلچسپ ہیں اور انگریزی انشائیوں کے اثرات کی نشان دہی کرتے

ہیں۔ مثلاً ٹائم پاس کرنا، پریس کیے ہوئے کپڑے، بائیسکل کی رفاقت میں، انڈا اور سانڈ، لائین وغیرہ۔

کتاب کی ابتدا میں مانتین، جسے انشائیے کا بانی قرار دیا جاتا ہے کا یہ قول درج ہے:

I myself is the subject of my book.

فرانسیسی ادیب کے اس قول کا اردو ترجمہ پیش کیا جا سکتا تھا لکہ انگریزی میں بھی وہ ترجمہ ہی ہے۔ البتہ اس کی معنویت بڑھ جاتی ہے کہ انشائیہ میں ذاتی احساسات کو بنیادی حیثیت حاصل ہے اور "لوٹتے کے روپ میں" کی بیشتر تحریریں ذاتی احساسات کو فن کاری کے ساتھ پیش کرتی ہیں۔ مصنف نے اسے خود پسندی کا اشتہار نہیں بنایا بلکہ ایک نیا تخلیقی زاویہ پیدا کیا۔

لوٹتے کے روپ میں شامل انشائیوں میں تفکر اور فلسفہ نے انشائیہ نگار سے معنی خیز جملے لکھوائے ہیں۔ مثلاً سفر کی تکالیف کا احساس وہ شہسوار ہے جو گھوڑے کی زین کسنے سے پہلے ہی ایک مسافر کے اعصاب پر سوار ہو جاتا ہے۔

(بائیسکل کی رفاقت میں)

زندگی کی بھیڑ میں گنگناہٹ ایک مل جاتی ہے اور پارس پتھر کی طرح ہمارے آہن صفت مزاج کو مسرت کے سونے میں بدل دیتی ہے۔ (گنگنانا)

ہمارا جسم بھی ایک سویٹر ہی ہے اور زندگی دسمبر سے سرد تر (سویٹر)

بہ حیثیت مجموعی انشائیوں کا یہ مجموعہ تخلیقی توانائی اور ایک نئے اسلوب کے ساتھ تخیل و تفکر کا حسین امتزاج پیش کرتا ہے اور انشائیہ کے نام پر ایک نئی آب و ہوا کا احساس بھی دلواتا ہے۔

کتاب میں کتابت اور طباعت کی خامیاں بھی ہیں۔ قیمت مناسب ہے۔



برادرم باکمال
تسلیم و نیاز

بھائی آپ تو قول و فعل کے پکے نکلے، ویسے آج کل ایسے لوگوں کا فقدان ہے۔ شگوفہ کا قہقہہ زار سالنامہ اپنی آب و تاب کے ساتھ زیرِ مطالعہ ہے۔ بقول میر:

جہاں سے دیکھیے اک شعرِ شور انگیز نکلے ہے

آپ نے جا بجا اپنے کمال سے قیامت کا سا ہنگامہ بپا کر دیا ہے۔ اب شگوفہ زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان نہیں رہا بلکہ زندہ دلانِ ہندوستان کا بن گیا ہے۔ خدا کرے اس کی شان و شوکت اور عظمت میں اضافہ ہوتا رہے۔ آمین

(ڈاکٹر) نورالسعید اختر، بمبئی۔

"شگوفہ" کا سالنامہ دیکھ کر جی خوش ہوا۔ ایسا اچھا شمارہ نکالنے پر مبارک باد پیش ہے۔

ہمیشہ کی طرح اس شمارے میں بھی نظم پر نثر کا حصہ بھاری ہے۔ شگوفہ کی باقاعدہ اشاعت نے بڑے بڑے نقادوں اور پروفیسروں کو بھی مزاح نگاری پر مائل کیا ہے۔ حیدرآبادی مزاح نگاروں کی تو ایک نئی نسل تیار ہو گئی ہے۔ نثر میں خاص طور پر اسداللہ صاحب کا مضمون بہت پسند آیا گو کہ یہ ترجمہ ہے لیکن موضوع کے از کے ہیں اور سیاسی طنز کی وجہ سے اس میں جان آگئی ہے۔ طالب خوندمیری کی شاعری کی میں ہمیشہ سے قائل رہی ہوں، نیاز سواتی صاحب کے قطعات اور چند غزلیں بھی تعریف کے قابل ہیں۔

حلیمہ ... [illegible]

جناب کمال صاحب!

اپریل کا مہینہ خوش قسمت لوگوں کی سالگرہ کا مہینہ ہے۔ اس کا ٹائیٹل بھی خوب صورت اور طباعت بھی لاجواب ہے۔ سرورق پر قیمت چھ روپے نمایاں شائع ہوئی ہے۔ آج کے دور میں ایک چائے کی پیالی (100 ML) ایک روپیہ، سماچائے تین روپے اور ایک پان کی قیمت اوسطاً ایک روپیہ ہے۔ مہنگائی کے دور میں ۵۶ صفحات پر مشتمل خوب صورت سرورق اور نہایت ہی عمدہ تخلیقات کے ساتھ رسالہ پیش کرنے کا ہنر صرف اور صرف آپ ہی جانتے ہیں۔ محترم یوسف ناظم صاحب کی تحریر ہمیشہ کی طرح بہت خوب صورت ہے اس خاکہ پر تبصرہ مجھ جیسے عام قاری کے بس کی بات نہیں۔ صفحہ ۱۱ پر عابد معز (ریاض) ایسے نظر آئے جیسے سماج میں ۱۱۱ والے اصحاب نمایاں نظر آتے ہیں۔ عابد معز پیشے کے اعتبار سے میڈیکل ڈاکٹر ہیں۔ اپنے پیشے کے حساب سے ان کی کسی بھی شخص کی صحت یا اس کی خراب صحت کے اثرات پر پڑنی چاہیے لیکن اس کے برخلاف ان کی نظر نوجوان نانا کے ہاتھ میں معنیوطی سے تھمی ہوئی اردو کی کتاب پر پڑتی ہے تو اس سے صاف ظاہر ہے کہ ان دنوں عابد معز کے ذہن و دل پر اردو اور طنز و مزاح کا دور دورہ ہے۔ عابد معز کا مضمون معیاری دلچسپ اور معلومات سے پُر ہے۔ ان کا جملہ "میں غلطی سے غلط ٹیلی فون نمبر پر غلط لوگوں کی جھڑکیاں سنتا رہا" خوب ہے۔

مختصر یہ کہ عابد معز نے جناب محمد شجاع الدین غوری پر مکمل خاکہ تحریر کیا ہے۔ جس کے مطالعے سے غوری صاحب کی سیدھی سادھی باکردار، اعلیٰ صلاحیتوں اور اچھی عادات و اطوار والی شخصیت کو سمجھنے میں مدد ملی۔

میر فاروق علی
انسپکٹر اکسائز سرکل ملکاجگری

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

ماہنامہ

شگوفہ

حیدرآباد

جلد ۲۵ جون ۱۹۹۲ء شمارہ ۶

فی پرچہ: ۶ روپے
زرِ سالانہ: ۶۵ روپے
بیرونی ممالک سے: ۲۰ ڈالر

خط و کتابت کا پتہ:
۳۱ ۔ بیچلرز کوارٹرز معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد
فون آفس 557716 مکان 521064

اِس تھیلی کے چٹّے بٹّے (فہرست)

ایک طائرانہ نظر سے خوش گزرے

وجاہت علی سندیلوی

یہ لکھنؤ ہے

یہ لکھنؤ ہے، شہرِ نگاراں، نقشِ بہاراں، خطۂ نازک مزاجاں، گہوارۂ شعروسخن، بساطِ رامش ورنگ، مکتبِ اخلاق وادب، سرچشمۂ وضع داری ورواداری، آصف الدولہ کا خواب، جانِ عالم کی جنت کوئی کہاں تک گنوائے کہ لکھنؤ کیا ہے؟ مانا کہ لکھنؤ کی رفعتوں اور عظمتوں کے نقش ونگار پر امتدادِ زمانہ کی بہت کچھ خاک اور دھول پڑ چکی ہے لیکن لکھنؤ پھر بھی لکھنؤ ہے:

نہ کچھ شوخی چلی بادِ صبا کی		بگڑنے میں بھی زلف اس کی بنا کی

لکھنؤ کبھی بادشاہوں کا پایۂ تخت تھا۔ آج یہ آزاد ہندوستان کی سب سے کثیر آبادی والی ریاست کا دارالخلافہ ہے۔ پہلے یہاں سے حکم نامے اور فرمان جاری ہوتے اب یہاں ودھان سبھا اور ودھان پریشد میں قانون بنائے جاتے ہیں۔ لکھنؤ کی بالادستی بہر صورت قائم ہے اور "تعمیل ہو" "تعمیل ہو" کی صدائیں یہیں سے بلند ہوتی ہیں۔

دارالخلافہ ہونے کی پاداش میں یہ سیاست اور حصولِ اقتدار کی ریشہ دوانیوں کا منبع اور مرکز ہے۔ اتر پردیش کی ہر تحریک، ہر جلالی طبع اور ہر فتنہ یہیں جنم لیتا ہے۔ سب سے زیادہ دھرنے یہیں دیے جاتے ہیں۔ اور سب سے زیادہ گھیراؤ اور بھوک ہڑتالیں یہیں کی جاتی ہیں۔ جلسوں اور جلوسوں کے لیے تو یہ ایک بازیچۂ اطفال سا بن گیا ہے۔ وہ دن بڑا منحوس ہوگا جب آپ امین آباد سے حضرت گنج جانے کی کوشش کریں اور اس صرف دو کلومیٹر کی مسافت میں آپ کو مختلف جلوسوں کی وجہ سے تین چار جگہوں پر ٹریفک جام سے دوچار نہ ہونا پڑے۔ جلوسوں کی بہتات کی وجہ سے اکثر کسی سنگم پر ان کے نعرے بدل جاتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ آپ قیصر باغ سے یہ نعرہ لگاتے چلے ہوں "گھوس خور کرم چاری برخاست کرو!" اور حسین گنج میں آپ اپنے کو یہ نعرہ لگاتے ہوئے پائیں گے۔ "کرم چاریوں کے بھتے میں برھوتی کرو!" کیوں کہ ٹیپ کے بند مشترکہ نعروں "یہ دھاندلی نہیں چلے گی، نہیں چلے گی" یا "جو ہم سے ٹکرائے گا چورچور ہوجائے گا" سے مغالطے میں پڑ کر آپ جلوسوں کی مڈبھیڑ کے کسی موقعے پر اُس جلوس سے اِس جلوس میں

بھٹک آئے ہوں گے۔

بھوک ہڑتال کرنا خواہ اس کی غرض اور مقصد کچھ بھی ہو کسی بھی مقام پر ایک بہت دشوار پسندی کا کام ہو سکتا ہے۔ لیکن خصوصیت کے ساتھ اس کا لکھنؤ میں اہتمام واقعی بڑی جیتے ماری اور نفس کشی کا ایک صبر آزما مجادلہ ہے کیوں کہ یہ شہر کام و دہن کی انواع و اقسام کی لذتوں اور نعمتوں کا ایک حد درجہ اشتہا انگیز دسترخوان ہے۔ کشمیری چائے، نان فتانے، بالائی، نہاری کلچے، کباب، مختلف اقسام کے نرگسی کوفتے، قورمہ، مرغ مسلم، بریانی، دم پخت، شیر مال، باقر خانی، رومالی چپاتی، پراٹھے، سموسے، شاہی ٹکڑے، انناس کا زردہ، سیویوں کا مزعفر، رس ملائی، جوزی حلوہ، پستے کی برفی، بالائی کا پان اور نہیں معلوم کیا کیا کچھ :

اک سفینہ چاہیے اس بحر بے کراں کے لیے

زبان تھک جائے اور لکھنؤ کے صرف خصوصی کھانوں کی فہرست ختم نہ ہو اور پھر ہر کھانا اپنی لذت اور رنگ و بو میں لاجواب اور بے مثال کم سے کم ہمارا تو یہی خیال ہے کہ لکھنؤ والوں کی زبان کی لطافت ان کے لہجوں کی گھلاوٹ اور ان کے طرز تخاطب کی حلاوت میں یہاں کے معلموں اور استادوں سے زیادہ یہاں کے باورچیوں اور کباب والوں کا ہاتھ ہے۔

کہتے ہیں کہ دہلی کے ایک شہزادے جنھیں قورمہ بہت مرغوب تھا لکھنؤ کے کسی نواب کے یہاں ایک ہفتے کے لیے مہمان آئے۔ ان کے دسترخوان پر ساتوں دن دونوں وقت قورمہ آیا لیکن ہر قورمے کی لذت اور خوشبو جداگانہ اور وہ انگلیاں چاٹتے کیا کاٹتے رہ جاتے۔ راویانِ حاشیہ آراں کا بیان ہے کہ شہزادے صاحب جب واپس دہلی پہنچے تو وہاں انھوں نے قورمہ کھانا یکسر موقوف کر دیا اور اگر ان کے سامنے کوئی قورمے کا نام لیتا تو وہ ہائے لکھنؤ، وائے لکھنؤ، کہہ کر خاموش ہو جاتے۔

مشہور ہے کہ یہاں کے ایک بگڑے رئیس زادے، ان کی بیوی اور لڑکا سارا دن صرف چائے پانی پی کر جوتے کے تلے کاٹتے۔ شام کو جب رئیس زادے ایک مثالی رومال میں لپیٹ کر یہ تلے دکان دار کو جا کر دے دیتے اور پیسے وصول کرتے تو وہ اس مثالی رومال میں شیرمال، بالائی اور کباب لے کر پلٹتے اور اس وقت ان کے بائیں ہاتھ کی کلائی میں ایک بیلے کا ہار بھی لپیٹا ہوتا۔ یہ ہار والی بات صرف اسی لکھنؤ میں ہو سکتی جہاں "پہلے آپ" "پہلے آپ" پر ٹرینیں چھوٹ جاتیں۔ جہاں مولی کے پتوں پر پیر پڑ جانے سے چھینکیں آنے لگتیں۔ جہاں جس روز نواب صاحب جامہ دار کا انگرکھا پہن کر وثیقہ لینے تانگے پر جاتے سارے محلے میں دھوم مچ جاتی اور سب لوگ حاضر ہو کر آداب اور کورنش بجا لاتے۔ اور یہ صرف نواب صاحب ہی جانتے کہ وثیقے کی رقم صرف ساڑھے اٹھارہ روپیے تھی۔ اس قسم کی نہیں معلوم کتنی روایتیں حقیقتیں بن کر لکھنؤ کے چاہنے والوں کے سینوں میں زندہ اور تابندہ ہیں اور انھیں کی بنا پر وہ صدقِ دل سے فخریہ انداز میں کہتے ہیں :

لکھنؤ پر ہم فدا اور ہم فدائے لکھنؤ

لکھنؤ کے جلیل اور جمیل امام باڑے، عقیدت کے شہ پارے، حسن آباد کا گھنٹہ گھر، پکچر گیلری، رومی گیٹ، قیصر باغ کی بارہ دری، چھتر منزل، ریذیڈنسی، ہنومان مندر، چار باغ، اسٹیشن، کونسل چیمبر، شہیدسمارک

مسلمان بادشاہوں کے بنوائے مندر، ہندو راجاؤں کے تعمیر کردہ امام باڑے۔ گومتی کے کنارے کے گھاٹ اور خوشنما شوالے اور بیسیوں دوسری قدیم اور جدید عمارتیں، ان گنت پارک اور باغات، بارونق بازاریں اور کشادہ سڑکیں نہ صرف لکھنؤ کے حسن میں اضافہ کرتی ہیں بلکہ اس کی تاریخی عظمت میں چار چاند لگاتی ہیں۔ دہلی کے بعد شاید لکھنؤ وہ شہر ہے جہاں قدم قدم تاریخ جغرافیے کی رہنمائی کرتی ہے۔ پرانے زمانے کے یوروپین سیاحوں نے اس کو لندن اور پیرس سے ترجیح دی تھی اور مشرق وسطیٰ کے سیاحوں نے اسے رشک بغداد و اصفہان بتایا تھا۔ کاش کہ ان کے مقولے آج کے لکھنؤ پر بھی صادق ہو جاتے۔

آج جب ہم لکھنؤ کی بے تحاشہ ہما ہمی، شور و غل، چیخ و پکار، دھینگا مشتی اور اکثر مقامات کی گندگی، کیچڑ، کوڑا، غلاظت اور تعفن دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں تو ہمارا دل کٹنے لگتا ہے۔ اور ہم اسے یہ کہہ کر بہلا لیتے ہیں کہ یہ محض ایک خواب پریشاں ہے اور جب ہم جاگیں گے تو ہمارا وہی پرسکون، آہستہ خرام، خوب صورت اور پرشکوہ لکھنؤ ہمارے چاروں طرف ہو گا۔

لکھنؤ نے زمانے کے بڑے اتار چڑھاؤ دیکھے اور گرم و سرد چکھے ہیں لیکن کسی بھی دور میں اس کے بانکپن، جولانیٔ طبع، کج کلاہی اور آب و تاب پر حرف نہیں آیا۔ یہ ایک زندہ شہر ہے اور بڑی خود اعتمادی سے کاروباری تجارتی، صنعتی اور سیاسی مرکز کی حیثیت سے اکیسویں صدی کی طرف گامزن ہے لیکن رتن ناتھ سرشار اور عبدالحلیم شرر کے لکھنؤ کی یادیں اس کے رگ و پے میں ایسی پیوست ہیں جیسے فولاد میں جوہر۔

غزل

سوپر نرلی

رعایا کو کہاں ملتا ہے اب سرکار سے پانی / خریدا جا رہا ہے ان دنوں بازار سے پانی
ٹھکانہ ڈھونڈ لو جا کر اب اس بستی میں دیوانو / جہاں برسے حسینوں کے لب و رخسار سے پانی
اب اس ڈر سے نہیں کروایا جاتا جرم کا اقرار / کریٹ کر مانگ لے مجرم نہ تھانیدار سے پانی
وہ بورنگ ہو کہ نل ہو، ہاتھا پائی پہ اُتر آؤ / نہیں ملتا نجاتی حجت و تکرار سے پانی
اگر تم جان مانگو گے تو دیدے گا خوشی سے پر / نہ مانگو بھول کر اپنے لنگوٹی یار سے پانی
ہوا ہے سود اس کا دو گھڑے اک ماہ کے اندر / لیا تھا قرض اک لوٹا جو ساہوکار سے پانی
نواسہ اس کو حاتم طائی کا تسلیم کر لیں گے / پلا دے جو ہمیں دو گھونٹ بھی اب پیار سے پانی
سُنا ہے آگئے رستے پہ سارے شہر کے عاشق / عزیز اب ان کو ہے محبوب کے دیدار سے پانی
بہت محتاط ہو کر کیجیے گا خرچ اے بیگم! / بڑی مشکل سے لایا ہوں میں لڑ کر جار سے پانی

یہی ہے اب کے فصلِ گل میں سوپر کی دعا یا رب
ہو پھولوں کے عوض ہم کو عطا گزار سے پانی

غزل

تسنیم پروین (مدہول)

نل سے پانی نہ ملا آنکھ میں آیا پانی / تشنہ کاموں کو ترسے اتنا ستایا پانی
کُشتیاں، جوڈو، کراٹے ہوئی ہاتھا پائی / معرکے کر کے کئی یہ جو میں لایا پانی
کر کے رکھتے جو جتن آج وہ کام آجاتا / ہم نے اک بوند بھی یارو نہ بچایا پانی
چور پچھواڑے کی دیوار سے گھر میں گھس کر / مال و زر چھوڑ گیا صرف چُرایا پانی
کردی ہے باس نے اک پل میں ہی رخصت منظور / ایک بوتل جو اُسے ہم نے تھمایا پانی
شادی کرنے کے لیے ہوگئی فوراً راضی / حوض بھر کر جو اسے ہم نے دکھایا پانی
عقد پڑھوانے کو آیا وہ تیمم کر کے / بس ولیمہ میں ہی نوشہ نے نہایا پانی

حاتم وقت کی پروانہ سخاوت دیکھو
چائے پینے کو دی لیکن نہ پلایا پانی

منظور الامین

بڑے منجھولے اور چھٹ بھیّے

ایک زمانہ تھا جب لوگ سچائی اور ایمانداری کی زندگی گزارتے تھے خود روکھی سوکھی کھا کر بسر اوقات کر لیا کرتے تھے، بیکسوں اور بے نواؤں کی آنکھ کے آنسو پہلے خشک کرتے اور اس کے بعد نوالہ اٹھاتے تھے، آج انسان اتنا خود غرض ہو گیا ہے کہ دوسرے کے منہ کا نوالہ خود چھیننا چاہتا ہے نہ صرف نوالہ ہی بلکہ ٹوپی بھی آج کی راج نیتی یہ ہے کہ رام کی ٹوپی زبردستی رحیم کے سر پر رکھی جاتی ہے وہ اسے فٹ آئے یا نہ آئے۔ آج کی سیاست یہ ہے کہ لوگوں کی پگڑی اچھالی جاتی ہے۔ آج کی پالٹکس میں لوگ اپنے سائز سے بڑا جوتا پہننے کی کوشش کرتے ہیں آج کی راج نیتی میں لوگوں کے قمیص تک اتروا دیئے جاتے ہیں اور پھر ان کو برہنہ کرکے ان کی کھال تک کھینچ لی جاتی ہے۔

انسان ویسے ہی بگڑیل حیوان ہے وہ نیتا بن جاتا ہے تو بگڑتا ہی چلا جاتا ہے کہتے ہیں کہ اقتدار انسان کو تباہ کر دیتا ہے اور مکمل اقتدار مکمل طور پر برباد کر دیتا ہے۔ ان دنوں بگڑے انسانوں کی کمی نہیں۔ سچ پوچھئے تو آج کل نیتا اتنے زیادہ ہو گئے ہیں کہ ہر ملک میں قحط الرجال ہو گیا ہے یعنی عام آدمی کی کمی محسوس ہونے لگی ہے بلکہ بات تو اس حد تک بگڑ گئی ہے کہ عام آدمی کو دساور سے منگوانے کی ضرورت پیش آنے لگی ہے۔

نیتا ہر جگہ ایک سے ہوتے ہیں حساب کتاب جوکھار کھنے کی TAPESTRY میں ماہر، روپیہ پیسہ بنانے کی کیمسٹری میں شاطر، ان کے فلسفہ طریقوں میں طول البلد اور عرض البلد یا جغرافیہ بدل جانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا جغرافیہ سے قطع نظر نیتا تاریخ خود بنانا چاہتے ہیں وہ کس حد تک اس میں کامیاب ہوتے ہیں اس کا فیصلہ تو جنتا کی عدالت ہی کرتی ہے، وہ جنتا سے دانستہ یہ وعدہ کر لیتے ہیں کہ فلاں علاقے میں ان کے لیے ایک عالی شان پل بنا دیں گے یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس علاقے میں نہ تو کوئی دریا ہے جس کے اوپر پل بنے اور نہ اس خطے کے راستے ہی ناہموار ہیں پل بنوا دینے کا یہ وعدہ محبوب کے وعدوں کی طرح ہوتا ہے جو وفا ہونے کے لیے نہیں کیا جاتا، ہاں ایک پل ضرور ایسا ہوتا ہے جسے وہ بنانے کی کوشش کبھی نہیں کرتے اور وہ ہے سمجھ داری کا اور رواداری کا پل جسے انگریزی میں BRIDGE OF UNDERSTANDING کہتے ہیں۔

بہرحال جنتا کے لیے کوئی عظیم پل بنے یا نہ بنے دیکھا یہ گیا ہے کہ عام آدمی قیامت تک پل صراط پر ہی چلتا رہتا ہے وہ زندگی کی چکی میں پستا رہتا ہے یہاں تک کہ اس کا میدہ بن جاتا ہے۔

غلطی انسان کی سرشت میں داخل ہے۔ ہمارے جد امجد بھی تو ایک بھول کی پاداش میں زمین پر آئے تھے

اس طرح غلطی انسان کو وراثت میں ملی ہے لیکن غلطی کو حزبِ مخالف کے سر منڈھ دینا اعلیٰ درجے کی نیتا گری ہے۔

ویسے آپ اپنی خود کی غلطی کو مخالف پارٹی کے سر منڈھیں یا مخالف پارٹی کے نیتا کے سر مونڈیں۔ عرفِ عام میں اسے ہی سیاست کہتے ہیں۔ آپ کہیں گے یہ سیاست نہیں۔ سر مونڈنا تو حجامت ہے ذرا سوچیں کہ سیاست اور حجامت میں آخر فرق ہی کتنا ہے۔ حجامت میں کسی شخص یا اشخاص کے استرے سے سر مونڈے یا بال تراشے جاتے ہیں۔ سیاست میں استرے سے بے گناہوں کے سر کاٹے جاتے ہیں۔ حجامت بناتے ہوئے آپ کرسی پر بیٹھے ہیں اور خلیفہ آپ کے آس پاس استرا لیے پروانہ وار گھومتا رہتا ہے۔ سیاست میں کرسی پر کوئی اور بیٹھتا ہے مگر یہ میوزیکل چیئر ہوتی ہے کہ کرسی تو حاضر ہوتی ہے مگر نہ بیٹھ سکنے والا غائب ہو جایا کرتا ہے اس کرسی پر بیٹھنے والا بیٹھے بیٹھے ہی دوسروں کے سر مونڈ دیا کرتا ہے پہلے لوگ آزادی حاصل کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دیا کرتے تھے۔ اس جنگ کے مجاہد اپنے سر کٹوا دیا کرتے تھے۔ ہنستے ہنستے آج کل کے نیتا بھی ہنستے ہیں۔ بلکہ پیٹ پکڑ پکڑ کر ہنستے ہیں اور ہنسی ہنسی ہی میں اپنے حالی موالیوں کے ہاتھ اپنے مخالفوں کے سر کٹوا دیا کرتے ہیں۔

عام کہاوت ہے کہ محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہے، ان دو لفظوں —— محبت اور جنگ —— کے ساتھ ہم آج کی زندگی کا ایک اور لفظ جوڑ دینا چاہیں گے —— وہ ہے سیاست! جی ہاں آج کی سیاست میں بھی سب کچھ جائز ہے۔ حسن کرشمہ ساز کا کمال یہی تو ہے کہ وہ خرد کا نام کبھی جنوں رکھ دے اور کبھی جنوں کا خرد! یہ وہ زمانہ ہے جب لفظوں کو توڑا ہی نہیں جاتا بلکہ مروڑا بھی جاتا ہے۔ لفظوں کے کان بھی اینٹھے جاتے ہیں۔ ان کی ٹانگ بھی گھسیٹی جاتی ہے۔ بے چارہ لفظ ہی کیا اور اس کی بساط ہی کیا! آج کے نیتا الفاظ سے کھیلتے ہیں۔ وہ الفاظ کا استعمال ایسے کرتے ہیں کہ لفظ دھمی سے دھماکہ بن جاتا ہے اور مخالف دھک سے رہ جاتا ہے!

سیاست کا میدان بہت وسیع ہوتا ہے اس میں ہر قسم، ہر رنگ اور ہر نوع کے انسان پائے جاتے ہیں۔ بھان متی نے یہ کنبہ کہیں کی اینٹ اور کہیں کا روڑا لا کر ہی جوڑا ہے اور اس میں داخل ہونے کے بعد گدھا بھی بنا دیا جاتا گھوڑا ہے۔

نیتا کیسے بنا جاتا ہے؟ اکبر الہ آبادی نے آسان سا نسخہ بتایا تھا:

موکل چھٹے ان کے پیچھے سے جب — تو یہ قوم مرحوم کے سر ہوئے
پیچھے پکارا کیے پی نہاں — مگر یہ پلیڈر سے لیڈر ہوئے

تو ملاحظہ فرمایا آپ نے لفظ تو اپنی جگہ لفظ ہی ہے۔ حرف میں بھی وہ طاقت ہے کہ P لگا دیجیے تو پلیڈر ہو جاتا ہے اور P گرا دیجیے تو لیڈر اور لیڈر کی طاقت تو مسلّم ہے۔

فلمی دنیا سنیما ہاؤس کے پردۂ سیمیں یا ٹی وی کے اسکرین تک محدود ہوتی ہے جب کہ راج نیتا کے ستاروں کی زندگی پر ایک دبیز پردا پڑا ہوتا ہے لیکن جب کبھی یہ پردہ اٹھ جاتا ہے تو پھر بھید کھل جاتا ہے اور میں نے پردا جو اٹھایا تو قیامت دیکھی۔

آج کے نیتا کی تعریف یہ ہے کہ وہ سب سے پہلے اپنی جیب بھرتا ہے پھر اپنی اولاد کی اور پھر بھائی بھتیجوں کی

عوام کی نوبت آتی ضرور ہے مگر کم کم، ویسے عوام چیز ہی کیا ہیں؛ کیڑے کوڑے! بعض کیڑے کاٹتے ضرور ہیں مگر وہ مخلوق جس کا نام عوام ہے صرف بھونکتی ہے کاٹتی نہیں —— مگر دن مخلوق تو ہر حال میں خم رہتی ہے!

آج کے نیتا زیادہ تر گفتار کے غازی ہیں، یہ تقریریں ایسی کرتے ہیں جن کا نہ پیر ہوتا ہے اور نہ سر، دل ہوتا ہے نہ جگر، آج ہر جگہ اور ہر سماج میں بڑے سے بڑے کر بھولے اور بھولے سے لے کر چھٹ بھیئے تک ہر قسم، ہر سائز اور ہر شکل کے نیتا موجود ہیں ان کا اپنا SPECIALIZATION ہوتا ہے۔

بعض نیتا صرف ربن کاٹنے کے کام میں لائے جاتے ہیں۔

کچھ بھاشن دلوانے کے لیے، اوٹ پٹانگ بھاشن جس کا سر ہوتا ہے نہ ٹانگ، لیکن بھاشن دیتے ہوئے اگر ان کے حلق کا کوا پھوٹ بھی جائے تو ان کو پرواہ نہیں ہوتی انھیں اپنے منہ میاں مٹھو بننا خوب آتا ہے، لیکن دل ان کا بڑی کا ہوتا ہے غالباً یہی وہ ہستی ہے جس کے بارے میں کہا گیا ہے۔

ہر شاخ پہ الو بیٹھا ہے انجام گلستاں کیا ہوگا

ان کی زندگی طوطا چشمی سے عبارت ہوتی ہے۔

بعض گربہ مسکین ہوتے ہیں! —— بظاہر معصوم و بے ضرر مگر بہ باطن پلید و فتنہ گر!

بعض جلسے میں کئی کئی گھنٹے دیر سے آنے میں ماہر ہوتے ہیں۔

بعض فسادات کروانے کا EXPEREINCE رکھتے ہیں اور ہوتے ہیں مذہب کے اجارہ دار۔

بعض قانونی نیتا، ن' میں کا لفظ لگانے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔

بعض نیتا ایسے بھی دیکھے گئے ہیں جو کبھی کبھار ہی اپنے ملک کے دورے کی تکلیف گوارا کر لیا کرتے ہیں۔

بعض ہوتے ہیں درباری نیتا، خوشامد جن کی سرشت میں داخل ہے ان کی خوشامد کچھ اس طرح کی ہوتی ہے کہ اپنے ممدوح آلو کو رات کا شہباز کہہ کر خوش کرنے کی کوشش کرتے ہیں یہ لوگ جدھر کی ہوا چلتی ہے ادھر کو چلتے ہیں جب ان کا ہائی کمانڈ انھیں قدرے جھکنے کے لیے کہتا ہے تو یہ زمین پر لیٹ جاتے ہیں یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو سیاسی سفر کے لیے ہمیشہ غلط گاڑی پکڑتے ہیں اس لیے منزل پر پہنچ نہیں پاتے۔ بعض نیتا وہ ہوتے ہیں جو کہتے ہیں ہم عوام کو راہ دکھانا چاہتے ہیں لیکن کوئی ہمیں پہلے یہ تو بتا دے کہ عوام کہاں ہیں تاکہ ہم ان کی رہبری کر سکیں۔
ایسے نیتاؤں کا بھی کال نہیں جن کے بارے میں کہا گیا ہے:

قوم کے غم میں ڈنر کھاتے ہیں حکام کے ساتھ۔ رنج لیڈر کو بہت ہے مگر آرام کے ساتھ بعض نیتا ایسے ہوتے ہیں جن کے بارے میں انجیل میں کہا گیا ہے۔

پروردگار انھیں معاف فرما دے کہ انھیں خود ہی خبر نہیں کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں، بعض تو یہاں تک بے خبر ہوتے ہیں کہ انھیں یہ تک پتہ نہیں ہوتا کہ تقریر کرتے ہوئے اگلے لمحے میں وہ کیا کہنے والے ہیں لیکن جب کہہ چکتے ہیں تو انھیں یاد ہی نہیں رہتا کہ انھوں نے کیا فرمایا تھا۔

بعض نیتا وہ ہوتے ہیں کہ جو تقریر تو خود کرتے ہیں لیکن تقریر کے دوران پانی ان کی بیویاں پیتی رہتی ہیں
بعض نیتاؤں کی پبلک لائف تو درج گوشت ہوتی ہے لیکن پرائیویٹ لائف ناگفتنی۔

پھر تو کہاں تک گنائے جائیں ان رہبروں، رہنماؤں اور قائدین اعظموں کی قسمیں، بات کو ختم کرتے ہوئے

آخر میں ان نیتا کا ذکر ہم کرنا چاہیں گے جن کے پیے راوی عیش ہی عیش ۔ لکھتا ہے ۔ جنھی انھوں نے ۔

زندگی پائی ہے کچھ سے اٹھانے کے لیے
گل کھلانے کے لیے کچھ سے اُڑانے کے لیے



ڈاکٹر نورالسعید اختر
(بمبئی)

قاشقی
بروزن
عاشقی

عاشقی اور قاشقی ہم صوت اور ہم قافیہ الفاظ ہیں لیکن دونوں کی طبی شناخت میں بڑا فرق ہے ایک کا مزاج بلغمی ہے تو دوسرے کا معتدل ۔ عاشقی میں انسان ہفت خواں طے کرنے کی جسارت کرتا ہے تو قاشقی میں زمین و آسمان کے قدموں پر سجدہ ریز ہو جاتے ہیں ۔ عاشقی اور قاشقی کی تاریخ بھی ازلی ہے ۔ حضرت آدمؑ کے ساتھ قاشقی کا نزول ہونا ثابت ہوتا ہے ۔ اگر شیطان قاشقی کے ذریعہ آدم کو نہ ورغلاتا تو ہرگز حضرت آدمؑ اس کے جال میں نہ پھنستے اور آج انسان اس کی تباہ کاریوں سے محفوظ رہتا ۔ جوں جوں انسان نے اس دھرتی پر ترقی کی اور مہذب ہوا تیوں تیوں قاشقی نت نئے زاویوں کے ساتھ پروان چڑھتی رہی ۔ زمانۂ جاہلیت میں انسان نے اتنی ترقی نہیں کی تھی کہ وہ قاشقی کے مجرب نسخوں کو آزما سکتا ۔ تہذیب و تمدن کے ارتقائی منازل طے کرنے کے بعد قاشقی کی بوقلمونی اپنا رنگ دکھانے لگی ۔

دنیا میں سب سے پہلے عاشقوں نے قاشقی کا نسخہ استعمال کیا ۔ مجنوں کا قاشق اس کا مشہور زمانہ کتا تھا شاید اسی لیے مجنوں عمر بھر سگ گزیدہ ہونے کی بجائے مردم گزیدہ رہا ۔ بقیہ تمام عشاق دائی کے مرہون منت رہے اور اس کی قاشقی میں اپنا سر کھپاتے رہے حتیٰ کہ فرہاد کو دائی کی غلط بیانی کے عوض اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑا ۔

قاشقی سے بڑا عہدہ کفگیری کا ہوتا ہے چوں کہ بادشاہوں کا چلن زمانے سے اٹھ گیا ہے اس لیے کفگیری کی گرم بازاری ٹھنڈی ہو گئی ہے ۔ اس کا دائرۂ عمل صرف بڑی بڑی دیگوں تک محدود ہو کر رہ گیا ہے ۔ تاہم اس کی افادیت سے کسی کو انکار نہیں ہے ۔ ہم چھوٹی چھوٹی چیزوں کے عادی ہو چکے ہیں اور ہر جگہ منی اسکوٹروں کی طرح منی قاشقوں نے اپنے جوہر دکھانے شروع کر دیے ہیں ۔ لہٰذا چھوٹے سے چھوٹا قاشق وہ کام کر جاتا ہے جو

بڑے بڑے کفگیر نہیں کر سکتے۔ علامہ اقبال کے ایک شعر میں اگر تضمین کی جسارت کی جائے تو معنی قاشق کی ہر دل عزیزی آشکار ہو سکتی ہے:

قاشق کی روشنی ہے کا شانۂ چمن میں
یا شمع جل رہی ہے دنیا کی انجمن میں

فی زمانہ قاشقی کو میعادی ترقی (time bound promotion) بھی نصیب ہو گئی ہے۔ قاشقی کے علم برداروں کو جلیل القدر منصوبوں پہ نافذ کر دیا گیا ہے۔ قاشقِ خرد کا پہلو ہوشی قاشق بزرگ کے عہدے پر دیگر افسروں یا عہدیداروں کے مقابلے میں قبل از وقت ہو جاتا ہے۔ اور اسی طرح قاشق بزرگ آن کی آن میں قاشق عظمیٰ کے عہدے پر سرفراز ہو جاتا ہے۔ بلحاظِ عہدہ یا مقام یہ کہا جا سکتا ہے کہ قاشق خرد کی رسائی صرف کلرکوں یا چپراسیوں تک محدود رہتی ہے۔ قاشق بزرگ کی بڑے افسروں اور مینیجنگ ڈائرکٹروں تک۔ قاشق عظمیٰ تو اپنے وقت کا قطب و ابدال ہوتا ہے۔ اس کی رسائی منسٹروں کے اینٹی چیمبروں، ان کی بیگموں اور شبستانوں تک ہوتی ہے۔ منسٹروں کے جلسوں میں ان کی حاضری مخصوص حاضرینِ جلسہ سے زیادہ ہوتی ہے۔ چھوٹے موٹے شہروں اور دیہاتوں میں بھولے بھالے لوگوں کو ان پر منسٹروں کا گمان ہوتا ہے اور بسا اوقات ان لوگوں کی گلپوشی مہمانِ خصوصی سے زیادہ ضروری سمجھی جاتی ہے۔ اسٹیج پر ان کے لیے علاحدہ کرسیاں بطور خاص سجائی جاتی ہیں، دراصل یہ لوگ منسٹروں کے برے وقتوں کے ساتھی ہوتے ہیں۔ پتھراؤ اور گھیراؤ میں یہ لوگ محافظی دستے کا رول ادا کرتے ہیں اور ضرورت مندوں کے کام منہ بولے داموں پر کرواتے ہیں۔ بے یار و مددگار لوگوں کو سبز باغ دکھانا ان کا فنی کمال ہوتا ہے ان کی ڈکشنری میں "ناممکن" کا لفظ ہوتا ہی نہیں یہ علامہ اقبال کے مومن سے زیادہ باعمل ہوتے ہیں:

قاشق کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہے آفاق

قاشق صاحبان روغنی اشیا سے کوسوں دور بھاگتے ہیں۔ انھیں غالباً دل کے دورے کا خوف ہوتا ہے۔ البتہ ان کے ایک اشارے پر ہزاروں دل کی مختلف بیماریوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہ اس وقت ہوتا ہے جب لوگوں کی جیبوں پر ان کا دستِ غیب دراز ہوتا ہے۔ قاشقی میں چرب زبانی اور دستِ غیب لازم و ملزوم حربے ہیں۔ ان کی لچھے دار باتوں میں Amul بٹر کی چکنائی اور عمدہ قسم کی ملائی کا مزہ ہوتا ہے۔ ان کے سامنے سیکرین کی حلاوت اور شیرینی بے مزہ ہے بلکہ رستمِ زماں کے سارے داؤ پیچ ہیچ ہوتے ہیں۔ ان کی گفتگو دھوبی پچھاڑ سے کم نہیں ہوتی ان کے دستِ غیب کا کمال یہ ہوتا ہے کہ کروڑوں کے وارے نیارے ہونے پر بھی ان کی ساکھ جمی رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی انگلیوں پر افسرانِ اعلیٰ اور دنیا قسم کی قوم ہر قسم کا ناچ ناچتی ہے اور ان کی اشان کے سامنے جن و پری کے کارنامے بے کار ثابت ہوتے ہیں۔

فی زمانہ قاشقی پیشہ بن گئی ہے۔ ہمارا مشورہ ہے کہ اس فن کو ایک Course کے طور پر نصاب میں داخل کر لیا جائے تو بہتر ہے بلکہ اس سے بہتر نتائج فراہم ہوں گے۔ ہو سکتا ہے یہاں وہ شاگرد زیادہ سے زیادہ نمبر حاصل کرے جس نے اس فن کا جادو ممتحن پر جگایا ہو۔ یونیورسیٹیوں میں اس کا علاحدہ

سے شعبہ ہو یا کم از کم کسی چیئر کے تقرر کے لیے قاشقی میں مہارت ضروری قرار دی جائے۔ قاشقی کے صدر شعبہ کی جیب میں ساری یونیورسٹی ہوگی۔ چانسلر اور وائس چانسلر کے اختیارات اس کے سامنے نہ ہونے کے برابر ہوں گے۔ وہ جس کو چاہے گا، وہ آسمان کی وسعتوں کو چھو لے گا۔ سارے ایوارڈ، سیمینار اور ورکشاپ اس کے مرہون منت ہوں گے۔ جب یہ شعبہ پوری طرح سے پھل پھول جائے گا تو اس شعبہ میں تحقیق کا پروگرام بھی بنے گا اور ریسرچ کے موضوع کچھ ایسے ہوں گے۔

(۱) قاشقی کا سیاست میں حصّہ (۲) ادب اور قاشقی

(۳) فن قاشقی کی اخلاقی و سماجی خدمات (۴) فن قاشقی میں صدر شعبہ کی کارگزاریاں

(۵) قاشقی کی تاریخ اور اس کا تنقیدی جائزہ

ان موضوعات پر کام کرنے والوں کو U G C کی بجائے عوام سے بڑے بڑے وظائف ملیں گے۔ I.A.S کی طرف لوگوں کا رجحان کم ہو جائے گا اور قاشقی میں پی ایچ ڈی کو ترجیح دی جائے گی، ممکن ہے حکومت قاشقی میں ڈی لٹ کی ڈگری پانے والے کو صدر الصدور کے عہدے پر فائز کر دے۔ ایک ترقی یافتہ ملک کے لیے یہ تبدیلیاں ضروری ہیں ورنہ ہم اس دوڑ میں پیچھے رہ جائیں گے۔

جب اس فن کے ماہر بڑی بڑی آسامیاں پا کر مختلف شعبوں میں عمل دخل پیدا کر لیں گے تو سارے ملک کا نظام ان لوگوں کی انگلیوں کے اشاروں پر چلے گا۔ دفتروں میں بروقت حاضری نہ دینا، بلا اجازت چھٹیاں لینا اور کام کے اوقات میں قیلولہ معمول بن جائے گا۔ ہر کس و ناکس اس ٹوہ میں رہے گا کہ اپنے سے بہتر پر کس طرح سبقت لے جائے اور کون سا روغن استعمال کرے۔ ہو نہ ہو ہر روز کسی نہ کسی افسر کا برتھ ڈے ضرور منایا جائے گا۔ کیوں کہ ایسی صورت میں اسے قانونی تحائف دینے کا بے خوف و خطر اعلان ہوگا۔ رشوت خوری پر [illegible] کا خوب صورت لحاف ڈال دیا جائے گا۔ اسی ریل پیل میں ماتحتین کے یہاں بھی [illegible] برسے گا۔ ان کے بچے بھی انگریزی میڈیم اسکولوں میں تعلیم پا سکیں گے خواہ وہاں کوئی standard نہ ہو خوش حالی کے چرچے رام راجیہ کی طرح عام ہوں گے۔ مارکٹ پر اس کا صحت مند اثر پڑے گا۔ سستی چیزیں مہنگے داموں فروخت ہوں گی۔ راشن کی دکانوں پر ڈالڈا افراط سے ملے گا، کسی کسی جگہ پر پہلی بار روغن قاز بھی میسّر آئے گا اور دیگر روغنی اشیا خون اور پانی سے مہنگی دستیاب ہوں گی۔

عشق و عاشقی کے میدان میں قاشقی کی گل کاری دیدہ زیب ہوگی۔ غالب کی طرح عشاق محبوب کے پاس تیغ و کفن کے ساتھ ہرگز نہیں جائیں گے:

آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں (غالب)

کیوں کہ اس حلیے سے عاشق کی فرسودگی ظاہر ہوگی وہ ماڈرن اور ہائی فائی نہیں کہلائے گا۔ اس کے برعکس اس کی دستار پر ایک عدد سیمیں قاشق دیدہ زیب انداز میں طرۂ امتیاز ثابت ہوگا۔ اس کے پاس تیغ و تلوار کی نیام میں دنیا کا مجرب ترین روغن (مل سکا تو روغن قاز) ہوگا جس کے پاس جس قدر کم یاب روغن ہوگا اس کی رسائی اتنی ہی بارآور ہوگی۔ روغن کی بوقلمونی پر فراق و وصال کا انحصار ہوگا اور اس کی حد بندیاں دیوارِ چین اور میک موہن لائن سے بھی زیادہ محفوظ ہوں گی۔

آج کل قاشقی کا مخصوص استعمال اسکول اور کالج میں داخلے سے لے کر نوکری ملنے تک کیا جاتا ہے۔

ـــ۔ نیتا اپنے قاشقوں کے لیے ہر قسم کی سہولتیں مہیا کرتا ہے اور ان سے ہر قسم کے پرچار کرواتا ہے۔ تعمیر میں اس کی خرابی کے بجائے اعلیٰ ظرفی مضمر ہوتی ہے۔ نیتا کے بے سروپا دعوؤں کو جن پر خود نیتا کو اعتقاد نہیں ہوتا یہ لوگ سچ کا خول چڑھا دیتے ہیں اور الیکشن کے بعد گدھے کے سینگ کی طرح رفو چکر ہو جاتے ہیں۔ الکشن میں اکثریت والی پارٹی اپنے تمام وعدوں پر خط کھینچ دیتی ہے تاکہ قاشقی کا پودا پھلتا پھولتا رہے۔

قاشقی سے فیض پانا اور فیض یاب ہونا ضروری ہے کیوں کہ بقول شیخ سعدی:

"این سعادت بزورِ باز و نیست"

والی بات ہے۔ ممکن ہے اکبر اعظم کے ملک الشعرا فیضی نے اپنے قصیدوں سے اکبر اعظم پر روغن ملا ہو اور شاید وہ اپنی شاعری کی بجائے اس فن میں مہارت کے عوض شاہی نوازشات کا مستحق دیا گیا ہو۔ ہم اپنا مدعا غالب کے ایک شعر پر تضمین کے ساتھ ختم کرتے ہیں:

قاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب
دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک

عنایت حسین عیدان
(موریشس)

بریانی

آپ مانیں یا نہ مانیں موریشس میں مسلمان بریانی کی وجہ سے بہت مشہور ہیں۔ میں یہ نہیں کہنا چاہتا ہوں کہ یہاں کے مسلمان اپنے دوسرے کاموں کے لیے مشہور نہیں ہیں۔ وہ تو آپ جانتے ہی ہیں۔ ہاں اس پر شاید ہمارا اور آپ کا اتفاق نہیں ہوگا کہ مسلمان ایسے کس کارنامے کی وجہ سے سب سے زیادہ مشہور ہے مگر آپ مجھ سے ضرور متفق ہوں گے کہ مسلمان بریانی سے منسوب ہے کیوں کہ مسلمانوں سے بہتر بریانی پکانے والا (اور کھانے والا کیوں نہیں) اور کون ہوسکتا ہے۔ آپ لاکھ کہیں کہ بریانی جان لیوا ہے یعنی اس کے کھانے سے کالیسٹرل بڑھ جاتا ہے جس سے آگے چل کر دل کی بیماری ہو جاتی ہے اور جان چلے جانے کا اندیشہ بلائے ناگہانی کی طرح رہتا ہے مگر ہم بریانی کے بغیر رہ ہی نہیں سکتے۔ بچّے کے پیدا ہونے کی خوشی میں بریانی۔ کسی کے انتقال کے بعد چالیسواں ہو تو بریانی، شادی کا موقع ہو تو بریانی، عرس یا قرآن خوانی ہو تو بریانی۔ مشاعرہ یا محفلِ غزل و قوالی میں بھی بریانی کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ بھیڑ جمع کرنا ہو تو بریانی کام آتی ہے۔ ووٹ حاصل کرنا ہو تو بریانی کھلائیے اور ووٹ لیجیے۔ اگر رشوت دینا ہے تو بریانی حاضر ہے۔ اور کام بن گیا تو بریانی کھائیے اور کھلائیے۔ کیا کیا کمال دکھاتی ہے بریانی۔ اور ہماری سرکار نے تو بریانی کی اہمیت سمجھ کر بریانی پکانے کے لیے دیگوں کی ڈیوٹی فری (duty free) کر دی ہے۔ اسی لیے اب مسجدوں میں قرآن شریف، قالین، وضوخانہ، بجلی کے پنکھے، نوٹس بورڈ، لاوڈ اسپیکر، امام صاحب، موذن صاحب کے علاوہ دیگوں کا ہونا بھی ضروری ہو گیا ہے۔ خدا نہ کرے کہ مسجد دیکھ کر ایسا سوال کیا جانے لگے کہ آپ کی مسجد میں کتنی دیگیں ہیں۔ بریانی کی اہمیت ہی نے دیگ کو ڈیوٹی فری کروا دیا ہے۔ کاش بیل کا گوشت بھی ڈیوٹی فری ہوتا اور باسمتی چاول بھی۔

ارے ہاں باسمتی ڈیوٹی فری تو نہیں ہے مگر سرکار نے ہمارے لیے اس کا دام بھی گھٹا دیا ہے۔ باسمتی کی بات چل رہی ہے تو یہ بھی معلوم ہو کہ مسلمانوں کے لیے بریانی تیار کرنے کے لیے باسمتی کا چاول ہونا ضروری ہے۔

نالال کا۔ یہ غور طلب بحث ہے کہ موری شیس میں جو باسمتی ملتی ہے وہ باسمتی ہے یا کوئی دوسرا چاول۔ باسمتی کی خاصیت ہے اس کی خوشبو۔ مگر بعض وقت خوشبو نام کی کوئی چیز ہی نہیں ہوتی۔ باسمتی چاول کے علاوہ بریانی میں گوشت بھی پڑتا ہے، آلو بھی پڑتا ہے اور نہ جانے کتنی قسم کے مسالے بھی پڑتے ہیں۔ کتنے قسم کے مسالے اس لیے کہا کہ ہر پکانے والا اور پکوانے والا اپنے ذائقہ مذاق اور حیثیت کے مطابق مسالے استعمال کرتا ہے۔ مثلاً کوئی زعفران استعمال کرتا ہے تو کوئی اس کی جگہ پیلا رنگ یا ہلدی۔ کوئی جائفل استعمال کرتا ہے اور کوئی اسے بالکل استعمال نہیں کرتا۔ کوئی لونگ پیس کر ملاتا ہے تو کوئی اسے ثابت اور کچھ لوگ اسے بالکل نہیں استعمال کرتے۔ دار چینی اور چھوٹی الائچی کا بھی یہی حال ہے۔ دھنیہ اور پودینہ کے پتے کے بغیر تو بریانی اچھی ہی نہیں مانی جاتی۔ کچھ لوگ زیرہ بھون کر استعمال کرتے ہیں اور کچھ لوگ بغیر بھنے ہوئے۔ پیاز، لہسن اور ادرک تو لازمی ہے مگر اس کی مقدار پکانے والا جانتا ہے۔ رہی آلو کی بات تو یہ جان لیجیے کہ کچھ لوگ اسے کچا ڈالتے اور کچھ لوگ اسے تل کر۔ رہی مرچ کی بات۔ وہ تو کم ہی ڈالی جاتی ہے۔ چاہے لال ہو ہری مرچ، پسی ہوئی ہو یا ثابت۔ ہر پکانے والا اپنے ہی معدے کے مطابق مسالہ استعمال کرتا ہے۔ خیر اصل چیز تو بریانی ہوتی ہے۔ اس میں ایک بات یاد رکھنی چاہیے کہ یہ کسی کے بس کی بات نہیں کہ وہ یہ سمجھائے کہ اس میں کون کون سی چیزیں کیوں پڑتی ہیں اور کس خاص مقدار میں اور یہ بھی قابل غور بات ہے کہ اس میں اضافے ہوتے رہتے ہیں۔ ہر کا جی چاہتا ہے وہ اپنی مرضی کے مطابق مسالے ڈالتا رہتا ہے۔ خیر اس معاملے میں الجھنے اور الجھانے کا بالکل میرا مقصد نہیں ہے۔ مجھے بریانی کھانے سے مطلب ہے اور اس کے پکانے کے طریقے سے نہیں۔ آپ کے منہ میں پانی آجائے اور آپ بریانی نہ پکا سکیں تو مجبوری ہے۔ اس سلسلے میں مجھے میرا ایک دوست یاد آرہا ہے۔ اس کو بریانی کھانے کا بہت شوق ہے اور شاید پکانے کا بھی۔ ایک روز میں انھیں کے یہاں گیا تھا۔ اس نے اپنی بیوی سے بریانی پکانے کو کہا اور مجھ سے کہا کہ چلو آج ہم سمندر کے کنارے بریانی کھائیں گے۔

میں نے کہا کہ بریانی پکانے میں تو دیر لگتی ہے۔ اس نے پھر کہا کہ تم مدد کرو تو جلدی ہی پکا لیں گے۔ ایسا کرو کہ تم پیاز کے چھلکے اتارو کیوں کہ تمھارے پاس چشمے ہیں اور میں لہسن اور ادرک کے چھلکے اتارتا ہوں۔ اتنے میں میری بیوی آلو کے چھلکے اتاریں گی۔

پیاز کا لفظ سن کر مجھے آنسو پر نہ جانے کیوں بہت سے اشعار یاد آنے لگے اور آنسو سے غزل کا عاشق، عشق، غم اور محبوب ذہن میں آگئے اور بریانی کی یاد تو کافی دنوں سے ستا رہی تھی۔ اور پچھلے اہم اشعار بھی ایک نیا لطف دینے لگے۔ خیر آلو، پیاز، لہسن، ادرک سب لائے گئے۔ میں پیاز چھیلتا گیا اور آنسو بہاتا گیا۔ اس عرصے میں دوست کی بیوی بار بار پوچھتی رہی کہ اتنی پیاز کافی ہے، اتنا لہسن کافی ہے۔ اتنی ادرک کافی ہے اور میرا دوست بڑے فاتحانہ انداز میں ایک پیاز ہٹا کر یا ایک لہسن ملا کر کہتا کہ ہاں اتنا کافی ہے۔ گویا صرف ایک پیاز یا صرف ایک لہسن سے مقدار میں اور ذائقہ میں بڑا فرق آجائے گا۔ اسی طرح وہ ہر بار پوچھتی رہی کہ یہ چیز کافی ہے یا وہ چیز زیادہ تو نہیں پڑ گئی۔ آخر میں میں نے اپنے دوست سے کہا بھئی تم تو اچھے اور ماہر بھنڈاری ہو۔ بھابی ہر وقت تم سے صلاح مشورہ کر رہی ہے۔" وہ اس انداز سے مسکرائے جیسے اس نے کسی کو بے وقوف بنایا۔ مجھ سے رہا نہیں گیا۔ میں نے کہہ ہی دیا کہ "اگر بریانی ٹھیک ہوگئی تو سارا

(بلند صدر) تمھاری اور خراب ہوگئی تو الزام بھابی پر" اس پر بھی وہ مسکرایا اور کہا "بھئی آخر میں ہی شوہر ہوں"

ویسے تو عورتیں بہت اچھی طرح سے بریانی پکا لیتی ہیں مگر پتہ نہیں پکاتے وقت وہ مردوں سے کیوں صلاح مشورہ کرنا لازمی سمجھتی ہیں۔ اگر اس پر تحقیق کی جائے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے تو تحقیق در تحقیق سے یہی نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ موری شس کے تمام مردوں اور بالخصوص شوہروں کا یہ دعویٰ ہے کہ ان کو بریانی پکانا آتا ہے اور بالعموم ہر مرد کسی نہ کسی طرح کی بریانی پکا لیتا ہے۔ لیکن یہ بات بھی بحث طلب (اور تحقیق طلب بھی) ہے کہ وہ عملاً پکاتے ہیں یا اصولاً ان کو پکانا آتا ہے۔ الغرض ڈرتے ڈرتے کم سے کم یہ اعتراف کرلوں کہ مرد اپنے آپ کو بریانی پکانے میں ایکسپرٹ سمجھتا ہے اور وقت آنے پر وہ اسے ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ علی گڑھ میں مجھے بھی اس کا تجربہ ہوا۔ گرمی کی چھٹیوں کا زمانہ تھا۔ چند ہندوستانی دوستوں کو موریشین بریانی کھلانا تھا کیوں کہ میں نے موریشین بریانی کی بہت تعریف کی تھی۔ اس سے پہلے میں نے کبھی بریانی پکائی نہیں تھی۔ البتہ والدِ مرحوم اور والدہ کو یا دوسرے لوگوں کو پکاتے دیکھا تھا۔ بس جس طرح سے ان کو پکاتے دیکھا تھا اسی طرح سے سب کچھ کیا صرف اتنا زیادہ کیا کہ اللہ میاں سے لگاتار دعا مانگتا رہا کہ یا اللہ بریانی اچھی ہو جائے اور میری عزت بچ جائے۔ خدا نے دعا سن لی اور دوستوں نے خوب مزے مزے سے بریانی کھائی اور خوب تعریف کی۔ یہ دیکھ کر میں نے دوسری بار بریانی پکائی مگر اس بار کھانے والے موریشی دوست تھے۔ اس وقت پتہ چلا کہ میری پکائی ہوئی بریانی کیسی تھی۔ سب لوگوں نے ناک بھوں چڑھا کر بریانی کھائی اور ڈھیر ساری بریانی بچ گئی۔ میں نے اس وقت اپنی صفائی میں یہ کہا کہ اصل بریانی تو لکڑی کے چولھے پر پکتی ہے اور دیگ ہونی چاہیے وغیرہ وغیرہ۔ یہاں تو ساڑھے چار روپے والے ہیٹر پر ایک پتیلی میں بریانی پکائی گئی ہے۔ مجھے اس وقت تو پتہ نہیں کیوں اقبال کا یہ مصرع یاد نے لگا:

بحرِ ظلمات میں دوڑا دیے گھوڑے ہم نے

خیر سب لوگوں نے بریانی کھائی اور میں نے بھی مگر یہ بات دل میں ضرور رہی کہ یہ بریانی اگر ایک پر تکلف تقریب کے لیے ہوتی تو مجھے بھی ویسے کرنا پڑتا جیسا عام طور پر ایسے موقعوں پر بریانی کے خراب ہو جانے پر بھنڈاری کرتا ہے۔ یعنی پیچھے سے غائب ہو جاتا ہے۔ بالفاظ دیگر دیگ چھوڑ کر بھاگ جاتا ہے۔ اس قسم کے واقعات اکثر ہوتے رہتے ہیں۔ ہاں مسلمانوں کے معاشرے میں بھنڈاری کی کافی اہمیت ہوتی ہے۔ بھنڈاری وہ شخص ہے (مرد ہوتا ہے) جو بہت سے لوگوں کے لیے بڑی مقدار میں بریانی پکاتا ہے اور اس کے عوض پیسہ لیتا ہے یا کبھی نہیں لیتا ہے مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ بریانی پکانا ہی اس کا پیشہ ہے۔ یہ تو اس کا پارٹ ٹائم جاب جیسا ہے مگر بعض کے لیے یہ تو شہرت کمانے کا ایک ذریعہ ہے۔ ایسے لوگوں کے لیے یہی کافی ہوتا ہے کہ آپ کہہ دیں کہ بریانی بہت اچھی ہے اور ایسی بریانی آپ نے کہیں نہیں کھائی ہے۔ اس کے علاوہ کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو صرف اپنے رشتہ داروں اور عزیزوں کے لیے پکاتے ہیں۔ ویسے تو ہر گاؤں میں یا ہر شہر میں بھنڈاری ہوتے ہیں اور بھنڈاری کا چرچا ایک علاقے سے دوسرے علاقے تک ہوتا ہے۔ ایک بات بڑی دلچسپ ہے اگر بریانی اتنی

اچھی نہیں ہوئی تو بھنڈاری اکثر خود کو ذمہ دار نہیں سمجھتا۔ کہے گا کہ چاول خراب تھا یا گوشت اچھا نہیں تھا یا آلو بھی اچھا نہیں تھا یا لکڑی خراب تھی۔ یعنی میزبان ہی ذمہ دار ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات میزبان کی وجہ سے بھی بریانی خراب ہو جاتی ہے خاص کر جب بریانی پکانے کے سامان میں فراخ دلی نہیں دکھاتا ہے۔ بھنڈاریوں میں وہی زیادہ کامیاب ہوتے ہیں جو زیادہ سخت اور سنک مزاج ہوتے ہیں۔ اور ایسی طبیعت بریانی پکاتے وقت سود مند بھی ہوتی ہے۔ خاص کر شادی بیاہ کے موقعوں پر پکانے والے تو بھنڈاری صاحب ہیں ہی مگر آپ دیکھیں گے کہ ہر ایک ان کو صلاح مشورہ دے رہا ہے کہ اتنا نمک ڈالو، اتنا گھی ڈالو، اس چیز کی کمی ہے یا اس چیز کی۔ ایسی صورتِ حال میں اگر سادہ مزاج اور نرم دل بھنڈاری ہو تو وہ ہر ایک کو خوش کر کے بریانی خراب کر دیتا ہے۔ گرم مزاج والے بھنڈاری کو اگر صلاح مشورہ دیا جائے یا حکم دیا جائے تو ڈانٹ دیتا ہے یا چلے جانے کی دھمکی دیتا ہے۔ ایسے بھنڈاری کی پکائی ہوئی بریانی بہت ہی لذیذ ہوتی ہے اور اسی کامیابی کی وجہ سے مشہور ہو جاتے ہیں اور ان کو بریانی پکانے کے لیے بلایا جاتا ہے تو سب لوگ ان کی مدد کرتے وقت ان کے ہر حکم کو مانتے ہیں ویسے تو شادی بیاہ کے موقعوں پر جب بریانی پکائی جاتی ہے تو بھنڈاری کی مدد کرنے کے لیے رشتہ داروں کے علاوہ پاس پڑوس کے مرد بھی ہوتے ہیں۔ اب آپ اندازہ لگالیں کہ کیوں مردوں کو یہ احساس ہو وہ بریانی پکانا جانتے ہیں مگر یہ بات بھی غور طلب ہے کہ ہندوستانی موسیقی کے استاد کی طرح بھنڈاری صاحب بھی بریانی پکانے کی ترکیب میں کوئی نہ کوئی راز رکھتا ہے یا کم سے کم وہ سوچتا ہے کہ اس نے ایسا کیا ہے۔

ہمارے ایک بزرگ تھے۔ پیسہ لے کر کھانا پکانے والے بھنڈاری نہیں تھے اسی لیے گوارا نہیں کرتے تھے کہ انھیں بھنڈاری کہا جائے۔ ان کے ساتھ ایک واقعہ ہوا تھا جس کا ذکر وہ اپنے خاص لوگوں میں کرتے تھے۔ بات یہ ہوئی تھی کہ ایک مرتبہ انھیں نے ایک عزیز کی شادی پر بریانی پکائی تھی۔ برات میں آئے ہوئے لوگوں کو کھانا کھلانا تھا۔ جب برات آئی تو یہ دیکھا گیا کہ توقع سے زیادہ لوگ آگئے ہیں اور بریانی کم ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ میزبان گھبرائے ہوئے ان کے پاس آئے مگر ہمارے بزرگ نے ان کو اطمینان دلایا اور کہا "فکر کی بات نہیں۔ بس تم مجھے گھی لا کر دو۔" پھر انھوں نے ڈھیر سارا گھی بریانی میں ڈال دیا۔ تھوڑی سی بریانی کھانے سے لوگوں کا پیٹ بھر گیا اور کچھ بریانی بچ بھی گئی!

بریانی کی شان دیکھنی ہو تو بریانی پکاتے وقت کا نظارہ دیکھیے۔ کیا رونق رہتی ہے اور پھر کھانا کھلاتے وقت کا منظر بھی قابلِ دید ہوتا ہے۔!

قلمی معاونین سے التماس ہے کہ اپنی نگارشات صاف اور
خوش خط لکھیں
ان پر پورا پتہ لکھنا نہ بھولیں

پرویز یداللہ مہدی

چاند پھر نکلا عید پھر ہوئی

جو عید چاند دیکھ کر منائی جاتی ہے وہ عرفِ عام میں عید الفطر یا رمضان کی عید کہلاتی ہے اور جو عید چاند دیکھے بغیر منائی جاتی ہے وہ مولویوں کی اصطلاح میں عید الاضحیٰ اور عوام کی زبان میں عید بقر کہلاتی ہے۔ اتفاق سے ہمارے نام نہاد مولویوں، ملاؤں اور مفتیوں کو چاند سے برائے نام اور بکروں، دنبوں و دیگر قربانی کے جانوروں سے بطورِ خاص دل چسپی ہوتی ہے، ظاہر ہے جو چاند نہ تو انا کی تسکین کا ذریعہ بن سکتا ہے اور نہ جسے انگلیوں پر نچا کر بھولے بھالے عوام کو ٹھگنی کا ناچ نچایا جا سکتا ہے۔ اس سے ہمارے نمائشی مذہبی پیشواؤں کا کیا لینا دینا؟ ان حضرات کی عقابی نظروں میں تو صرف ایک ہی چاند قابلِ دید و قابلِ داد ہوتا ہے، عید الفطر کا چاند، جو مطلع پر تو قدرت کی مرضی سے نمودار ہوتا ہے لیکن اپنی روایت کے لیے مولویوں و مفتیوں کے موڈ کا محتاج ہوتا ہے گویا مطلع پر نمودار ہونے کے باوجود اپنے وجود کو اس وقت تک تسلیم نہیں کروا سکتا جب تک کہ روایتِ ہلال کمیٹی سے اپنے چال چلن کا سرٹی فکیٹ، حاصل نہیں کر لیتا جبکہ بقر عید کا چاند اس کی طرح محتاج و مجبور نہیں ہوتا بلکہ اپنی مرضی کا مختار ہوتا ہے اور خود مختار چیزوں سے مذہب کے نام نہاد ٹھیکیداروں کو بغض للّہی ہوتا ہے۔ چناں چہ بقر عید کی آمد آمد کے ساتھ ہی یہ عزت مآب حضرات اپنی تمام تر توجہ مطلع سے ہٹا کر مقطع پر مرکوز کر دیتے ہیں یعنی چاند ماری و اختر شماری میں سر کھپانے کے بجائے اپنی اپنی عمل داری میں چہل قدمی کرتے ہوئے چوپایوں کے صحیح اعداد و شمار اکٹھا کرنے کے اشتہا آور کام میں پوری تن دہی کے ساتھ لگ جاتے ہیں۔ اور یوں اپنی دل بستگی کا سامان آسمان کے چاند کی جگہ قربانی کے بکروں میں ڈھونڈتے ہیں۔

اردو زبان کی تمام تر جنتریوں اور تقاویم میں بقر عید کے مبارک تہوار کو، بالتخصیص بقر عید، عید قرباں یا پھر عید الاضحیٰ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے لیکن انگریزی زبان کے بیشتر کیلنڈروں میں بقر عید کو بکر عید کے سیدھے سادے اور عام فہم نام سے موسوم کر کے اس باب میں بھی انگریزی والوں نے الگ الگ راہ نکالی ہے۔ اس سے بھولے بھالے عوام میں خواہ مخواہ یہ گمراہ کن غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کہ شاید مسلمانوں کا

اردو داں طبقہ بقر عید اور انگریزی خواں طبقہ بکری عید مناتا ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ دونوں ایک ہی عید مناتے ہیں بلکہ بقر عید ہی ایک ایسی عید ہے جسے ملک بھر کے مکان ایک ہی دن پورے اتحاد و اتفاق کے ساتھ مناتے ہیں۔ اختلاف تو ان میں صرف عید الفطر کے موقع پر پایا جاتا ہے۔ چناں چہ جس دن دلی میں عید منائی جاتی ہے اس دن بمبئی میں عید ہرگز نہیں منائی جاتی بلکہ پورے خشوع و خضوع کے ساتھ روزہ رکھا جاتا ہے لیکن بقر عید میں آپ نے بکرا چاہے عید کے دن صبح صبح خریدا ہو یا آٹھ روز قبل وہ کٹتا عید کے روز ہی ہے یا اور بات ہے کہ کسی زمانے میں اس ملی اتحاد و اتفاق کے پیچھے ایثار و قربانی کا جذبہ کارفرما ہوا کرتا تھا لیکن اب اس آپسی اتحاد و اتفاق کے پس پردہ اسلامی جذبہ کم سے کم اور بکروں کو نوش فرمانے کا جوش زیادہ سے زیادہ پایا جاتا ہے۔ بالفاظ دیگر قربانی کا طریقہ وہی ہے صرف مفہوم بدل گیا ہے۔!

ایک طرف مغربی کلچر ہماری تہذیب، ثقافت، شرافت، یہاں تک کہ اسلاف کی وراثت پر اس تیزی سے غالب آچکا ہے کہ ہم قمری مہینوں اور قمر دونوں سے دور ہو چکے ہیں۔ دوسری طرف انگریزی پریس صحافت، یہاں تک کہ انگریزی کیلنڈر بھی ہماری تہذیب اور ثقافت کو غلط ڈھنگ سے غلط رنگ میں پیش کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تاہم بقر عید کو بکری عید کا نام دینے میں ان کا ہاتھ نہیں ہے، یہ شوشہ تو ہمارا اپنا چھوڑا ہوا ہے۔ اصل میں عامۃ المسلمین کا ایک بڑا طبقہ جو تعلیم کے غیر ضروری دم چھلے سے تا حال محفوظ و مامون ہے وہ اپنی آسانی اور سہولت کی خاطر بقر عید کو بکری عید کے خالص ہندوستانی نام سے یاد کرتا ہے، ہو سکتا ہے بقر عید جیسی خالص عربی اصطلاح کو قومیانے کے پیچھے یہ جذبہ رہا ہو کہ اس بہانے ان شر پسند ارباب سیاست کا منہ بند کیا جائے جو آئے دن بینکوں کی طرح اقلیتوں کو قومیانے کی بات کرتے ہیں، یہ جذبہ لاکھ قابل ستائش سہی، ان کی صداقت سے قطع نظر اقلیتوں کو یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے کہ شر پسندوں کی آنکھوں پر شک کی عینک جنم سے لگی ہوتی ہے، انھیں نہ تو کسی تہوار کا نام بدل کر راہ راست پر لایا جا سکتا ہے نہ جان دے کر ان کی پراگندہ ذہنیت اقلیتوں کے تعلق سے ہمیشہ مشکوک اور زبان سدا یہ شکوہ کرتی رہتی ہے کہ:

پھر بھی تم کو یہ گلہ ہے کہ وفادار نہیں!

یہ عید نہیں آساں:

سچ پوچھیے تو بقر عید اور بکری عید میں وہی فرق ہوتا ہے جو عید کرنے اور عید منانے میں ہوتا ہے۔ عید کرنے والوں کا زیادہ تر وقت قربانی کے جانوروں، انہیں ذبح کرنے والے مولویوں انھیں چھیلنے والے قصائیوں ان کے حصے بخرے ہتیانے والے اڑوسیوں پڑوسیوں، رشتہ داروں، فقیروں اور کھال کے طلب گار فلاحی اداروں کے کارکنوں کی ناز برداریوں و بار برداریوں کی نذر ہو جاتا ہے جب کہ عید منانے والے ٹھنڈے ٹھنڈے اپنی اپنی چھت کے نیچے بیٹھ کر قربانی کا گوشت وصول کر کے عید کی خوشیوں اور مسرتوں کا پورا پورا لطف اٹھاتے ہیں۔

یہ بات صحیح ہے کہ بقر عید میں گہما گہمی رونق اور چہل پہل نہیں ہوتی، ہوتی ہے لیکن اس گہما گہمی میں

میں دوپایوں کا دخل کم اور چوپایوں کا عمل دخل زیادہ ہوتا ہے کیوں کہ بقرعید کے سیزن میں اطراف واکناف کا مطلع اعلیٰ متوسط ادنیٰ ہر قسم اور ہر نسل کے بکروں سے ابر آلود بلکہ بقر آلود ہوتا ہے۔ بعض بکروں کے فیل پیکر جثے اور تن و توش کو دیکھ کر ان پر فیل بچوں کا گمان ہوتا ہے۔ جس پیار لگن اور توجہ کے ساتھ انھیں پروان چڑھایا جاتا ہے ان کی پرورش و پرداخت کی جاتی ہے اگر اس کا عشر عشیر بھی غریبوں محتاجوں اور مسکینوں کے حصے میں آجائے تو دنیا میں کوئی بھی غریب، محتاج اور مسکین نہ رہے سبھی صاحب ثروت ہو جائیں یا پھر تمام صاحب ثروت حضرات غریب، محتاج اور مسکین ہو جائیں۔ اور یوں دنیا میں چہار کھونٹ صرف مساوات ہی مساوات نظر آئے۔

عیدالفطر کی طرح ویسے بقرعید کے بھی تین اڈیشن ہوتے ہیں یعنی یہ بھی تین دن مسلسل و متواتر منائی جاتی ہے۔ تازہ، باسی اور تہواسی۔ اس کے باوجود اس میں عیدالفطر جیسی سہولت اور چھوٹ قطعی حاصل نہیں ہوتی مثلاً رمضان میں آپ نے کسی شرعی یا غیر شرعی عذر کے باعث چاہے ایک روزہ نہ رکھا ہو لیکن عید منانے سے دنیا کی کوئی طاقت آپ کو روک نہیں سکتی جبکہ بقرعید میں قربانی شرط اول و آخر ہے۔ یعنی بکرا خریدنا یا خود بکرا بننا لازمی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ باگ عید رمضان کے موقع پر روزے نماز، زکوٰۃ سے زیادہ دھیان نئے نئے کپڑوں، رنگ برنگی پوشاکوں، شیروانیوں، سوٹوں، فراکوں، جمپروں اور علیپر وغیرہ پر دیتے ہیں جب کہ بقرعید میں موضوع سخن سے ہٹنے کی بلکہ ذرا بھی ادھر ادھر ہونے کی اجازت نہیں، چناں چہ عزت مآب قسم کے صاحب نصاب حضرات مزید نام و نمود کی خاطر موضوع سخن کی نمائش دنوں پہلے ہی شروع کر دیتے ہیں تاکہ اڑوس پڑوس کو پتہ چل جائے کہ بقرعید منانے کا قانونی و شرعی لائسنس آنجناب کی تحویل میں ہے جن لوگوں کو نام و نمود کا کچھ زیادہ ہی ہوکا ہوتا ہے وہ صرف گھریلو نمائش پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ قربانی کے جانوروں کی رسیاں اپنی سعادت مند اولاد کے ہاتھوں میں تھما دیتے ہیں کہ جاؤ نونہالو، ان کا شان دار جلوس نکال کر اہلیان بستی کو نہال کر دو! اس طرح ایک تیر سے دو شکار کرتے ہیں، ایک تو اہالیان بستی کے دلوں پر ان کی دولت و امارت کا سکہ بیٹھ جاتا ہے۔ دوسرے بچوں کی اکثریت بکروں کو گلی کوچوں میں ٹہلانے گھمانے پھرانے میں اس قدر مگن ہوتی ہے کہ نئے نئے کپڑوں اور جوتوں کی طرف ان کا دھیان ہی نہیں جاتا، ظاہر ہے جن بچوں کو سال کے گیارہ مہینے اپنی مرضی کے خلاف ماموؤں کی بکریاں چرانے کا ناپسندیدہ فریضہ انجام دینا پڑتا ہے۔ جب انہی بچوں کو سال میں ایک بار والدین کے بکرے چرانے کی خوشی میسر آتی ہے تو وہ خوشی خوشی اپنی ہر خوشی اس خوشی پر قربان کر دیتے ہیں اور یوں بقرعید کا یہ تہوار جو حضرت ابراہیمؑ کے بے پناہ ایثار اور حضرت اسماعیلؑ کی بے مثال قربانی سے عبارت ہے وہ محض انہی معصوم بچوں کے جذبۂ قربانی کی وجہ سے اس پر آشوب دور میں بھی زندہ و تابندہ ہے۔ ورنہ بڑوں کی اکثریت میں تو ایثار و قربانی کا جذبہ مفقود ہو چکا ہے اسی لیے تو کسی شاعر نے بقرعید کے تعلق سے فرمایا ہے:

یہ عید نہیں آساں اتنا ہی سمجھ لیجے
اک خون کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

سلیم شیخ (محبوب نگر)

قرضہ نامہ

تھا مرا بال بال قرضے میں — ہوگیا انتقال قرضے میں
موت آئے تو پھر بھی جی لیں گے — اب ہے جینا محال قرضے میں
ایک پیسہ بھی ہم چکا نہ سکے — کٹ گیا سال سال قرضے میں
روز بیگم کی تازہ فرمائش — اور ہم ہیں نڈھال قرضے میں
افسروں کا دباؤ سیندھی پہ — کھپ گیا ہے کلال قرضے میں
زندگی با مثال تھی اپنی — ہوگئی بے مثال قرضے میں
لکڑیاں بیچ کر گزارا تھا — اب ہے لکڑی کی ٹال قرضے میں
سچ سے قرضہ کبھی نہیں ملتا — جھوٹ بھی ہے حلال قرضے میں
موت آنے کو پاس ڈرتی ہے — زندگی ہے محال قرضے میں
سیدھا رستہ نظر نہیں آتا — ہے فقط اوندھی چال قرضے میں
اپنی گردن جھکا کے چل پیارے — یوں نہ گردن نکال قرضے میں
گوشت کیا چیز ہے نہیں معلوم — روز پکتی ہے دال قرضے میں
سب سہارے نکل گئے اپنے — غم ہے بس اپنی ڈھال قرضے میں
گوشت کا لوتھڑا ہے جسم مرا — چھل گئی ساری کھال قرضے میں

نوکری خوب سے کی ہے سلیم
کٹ گئے تیس سال قرضے میں

غزل

محمود شریف محمود
(حیدرآباد)

جلوؤں کا اثر جس کے جگر تک نہیں پہنچا — وہ پریم نگر کی تو ڈگر تک نہیں پہنچا
املی کا تو بٹوارہ ہوا سارے نگر میں — صد حیف ارے گھر کو جگر تک نہیں پہنچا
گھر بار کی کیا فکر ہے ہوٹل جو ہے پیاری — دفتر سے وہ سیدھا کبھی گھر تک نہیں پہنچا
ہونی تھی جہاں آٹھ بجے شعر کی محفل — اس وقت وہاں ایک نفر تک نہیں پہنچا

گھوڑے نے سفر طے کیا سو میل کا محمود
دھوبی کا گدھا گھاٹ سے گھر تک نہیں پہنچا

مشتاق احمد یوسفی

مال مسروقہ

شہر دو قصہ*

(۱)

کھنڈر میں چراغاں

کم و بیش پینتالیس برس کا ساتھ تھا۔ نصف صدی ہی کہیئے۔ بیوی کے انتقال کے بعد بشارت بہت دن کھوئے کھوئے سے۔ گم صم رہے۔ جیسے انھوں نے کچھ گم نہ کیا ہو، خود گم ہو گئے ہوں۔ جوان بیٹوں نے میت لحد میں اتاری، اس وقت بھی وہ صبر و ضبط کی تصویر بنے، تازہ کھدی ہوئی مٹی کے ڈھیر پر خاموش کھڑے دیکھا کیے۔ ابھی ان کے بٹوے میں مرحومہ کے ساتھ کی رکھی ہوئی الائچیاں باقی تھیں۔ اور ڈیپ فریزر میں اس کے ہاتھ کے پکائے ہوئے کھانوں کی تہیں لگی تھیں۔ کروشیے کی جو ٹوپی وہ اس وقت پہنے ہوئے تھے وہ اس جنتی بی بی نے چاند رات کو دو بجے مکمل کی تھی تاکہ وہ صبح اسے پہن کر عید کی نماز پڑھ سکیں۔ سب مٹھی بھر بھر کے مٹی ڈال چکے اور قبر گلاب کے پھولوں سے ڈھک گئی تو انھوں نے مرحومہ کے ہاتھ کے لگائے ہوئے موتیا کی چند کلیاں جن کے کھلنے میں ابھی ایک پہر باقی تھا، کرتے کی جیب سے نکال کر انگارہ پھولوں پر بکھیر دیں۔ پھر خالی خالی نظروں سے اپنا مٹی میں سنا ہوا ہاتھ دیکھنے لگے۔ اچانک ایسا ہو جائے تو کچھ عرصے تک تو یقین ہی نہیں آتا کہ زندگی بھر کا ساتھی یوں آناً فاناً بچھڑ سکتا ہے۔ نہیں۔ اگر وہ سب کچھ خواب تھا تو پھر یہ خواب ہی ہوگا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ ابھی یہیں کسی دروازے سے مسکراتی ہوئی آ نکلے گی۔ رات کے سناٹے میں کبھی کبھی تو قدموں کی مانوس آہٹ اور چوڑیوں کی کھنک تک صاف سنائی دیتی۔ اور وہ چونک پڑتے کہ کہیں آنکھ تو نہیں جھپک گئی تھی۔ کسی نے ان کی آنکھیں نم نہیں دیکھیں۔ اپنوں بیگانوں سبھی نے ان کے صبر و استقامت کی داد دی۔ پھر اچانک ایک واشگاف لمحہ آیا کہ یکلخت یقین آ گیا۔ پھر سارے پند اور پشتے اور سارے آنسو بند اور تمام صبر فصیلیں ایک ساتھ ڈھے گئیں۔ وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو دیے۔

لیکن ہر رنج رفتنی ہے اور عیش گزشتنی۔ جیسے اور دن گذر جاتے ہیں۔ یہ دن بھی گذر گئے۔ قدرت نے بقول لاروشی فوکو کچھ ایسی حکمت رکھی ہے کہ انسان موت اور سورج کو زیادہ دیر ٹکٹکی باندھ کر نہیں دیکھ سکتا۔ رفتہ

---

* شہر دو قصہ، A TALE OF TWO CITIES کی الٹ۔ یعنی قصہ دو کہانیوں والے شہر کا۔

رفتہ رفتہ صدمے کی جگہ رنج اور رنج کی جگہ اداسی/تنہائی نے لے لی۔ میں جب میامی سے کراچی پہنچا تو وہ اسی دور سے گذر رہے تھے۔ بے حد اداس، بے حد تنہا۔ بظاہر وہ اتنے تنہا نہیں تھے جتنا محسوس کرتے تھے۔ مگر آدمی اتنا ہی تنہا ہوتا ہے جتنا محسوس کرتا ہے۔ تنہائی آدمی کو سوچنے پر مجبور کرتی ہے وہ جدھر نظر اٹھاتا ہے، آئینے کو مقابل پاتا ہے۔ اسی لئے وہ تنہائی یعنی اپنی ہی صحبت سے گریز کرتا اور ڈرتا ہے۔ تنہا آدمی کی سوچ اس کی انگلی پکڑ کے کشاں کشاں ہر چھوڑی ہوئی شاہراہ ایک ایک پگڈنڈی، گلی کوچے اور چوراہے پر لے جاتی ہے۔ جہاں جہاں راستے بدلے تھے، اب وہاں کھڑے ہو کر انسان پر منکشف ہوتا ہے کہ در حقیقت راستے نہیں بدلتے، انسان خود بدل جاتا ہے۔ سڑک کہیں نہیں جاتی۔ وہ تو وہیں کی وہیں رہتی ہے۔ مسافر خود کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے۔ راہ کبھی گم نہیں ہوتی۔ راہ چلنے والے گم ہو جاتے ہیں۔

پیری میں پرانی ضرب المثل کے مطابق، صد عیب ہوں یا نہ ہوں، ایک عیب ضرور ہے جو سو عیبوں پر بھاری ہے اور وہ ہے ناسٹلجیا۔ بڑھاپے میں آدمی آگے یعنی اپنی منزل نامقصود و ناگزیر کی جانب بڑھنے کے بجائے الٹے پیروں اس طرف جاتا ہے جہاں سے سفر کا آغاز کیا تھا۔ پیری میں ماضی اپنی تمام مہلک رعنائیوں کے ساتھ جاگ اٹھتا ہے۔ بوڑھا اور تنہا آدمی ایک ایسے کھنڈر میں رہتا ہے جہاں بھری دوپہر میں چراغاں ہوتا ہے اور جب روشنیاں بجھانے اور سونے کا وقت آتا ہے تو یادوں کے فانوس جگمگ روشن ہوتے چلے جاتے ہیں۔ جیسے جیسے ان کی روشنی تیز ہوتی ہے۔ کھنڈر کی دراڑیں، جالے اور ڈھنڈار پن اتنے ہی زیادہ اجاگر ہوتے جاتے ہیں۔

سو ان کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا۔

ماضی تمنائی اور برزخِ گم گشتہ

کراچی میں اللہ نے انھیں اتنا دیا کہ خواب و خیال میں بھی نہ تھا۔ اپنے مالوف و متروک دیار کانپور جانے کی انھیں کبھی خواہش نہیں ہوئی۔ مگر اس سانحے کے بعد یکبارگی ایک ہوک سی اٹھی اور انھیں کانپور کی یاد بے تحاشا ستانے لگی۔ اس سے پہلے ماضی نے ان کے وجود پر یوں پنجے گاڑ کر قبضہ نہیں جمایا تھا۔ حال سے گریزاں حاضر و موجود سے منحرف، مستقبل سے مستغنی۔۔۔ اب وہ صرف ماضی میں جی رہے تھے۔ حال میں کوئی خاص خرابی نہیں تھی۔ بجز اس کے کہ بوڑھے آدمی کے حال کی سب سے بڑی خرابی اس کا ماضی ہوتا ہے جو بھلائے نہیں بھلتا۔

"اک عمر سے ہوں لذتِ نسیاں سے بھی محروم"

ہر واقعے، بلکہ ساری زندگی کی فلم الٹی چلنے لگی۔ جٹا دھاری برگد کر دوہ میں آ کر پھننگ کے بل اپنی بھنبھگ جٹائیں اور پاتال جڑیں آسمان کی طرف کر کے سیس آسن میں الٹا کھڑا ہو گیا۔ پینتیس برس بعد انھوں نے اپنے برزخِ گم گشتہ کانپور جانے کا فیصلہ کیا وہ گلیاں، بازار، محلے، آنگن، چارپائی تلے ادھورے چھڑکاؤ سے رات گئے تک جوان پینڈے سے کی طرح سلگتی چھتیں۔ وہ دوانی خواہشیں جو رات کو خواب بن بن کے آتیں اور وہ خواب دن میں پانچ خواہش بن جاتے۔۔۔ سب ایک ایک کر کے بے طرح یاد آنے لگے۔ حد یہ کہ وہ اسکول بھی جنت کا ٹکڑا معلوم ہونے لگا جس سے بھاگنے میں مزہ آتا تھا۔ سب مزوں سب یادوں نے یکبارگی یورش کر دی۔ دوستوں سے چرچراتی چارپائیاں اور بھری بھری بنولیوں سے لدے پھندے نیم کی چھاؤں آموں کے بور اور مہوے کی مہکار سے بوجھل

پروا، املی پر گدرائے ہوئے کتارے اور انھیں للچائی نظروں سے دیکھتی لڑکیاں اور انھیں دلچسپ نظروں سے دیکھتے ہوئے لڑکے، ہرنوں سے بھرے جنگل، چھرّے سے زخمی ہوکر دو تین سو فٹ کی بلندی سے گد سے گرتی ہوئی مرغابی، خس کی ٹٹیاں سنگھاڑوں سے پٹے تالاب، گلے سے پھسلتا مخمل، نالودہ مولسری کے گجرے، گرمیوں کی دوپہر میں جامن کے گھنے پتوں میں چھپے ہوئے گرگٹ کی لپلپاتی حسین زبان، اپنے چوکنے کانوں کو ہوا کے رخ کے ساتھ شیون کئے ٹیلے پر تنہا کھڑا ہوا بارہ سنگھا امڈ گھمڈ جوانی اور پہلے پیار کی گھٹا ٹوپ اداسی، وہ صندل باہیں جو سوتے جاگتے تکیۂ تصور تھیں، "ململ کلف لگے دوپٹے کی کراری مہک دھوم مچاتے دوست۔۔۔ ماضی کے کوہِ ندا سے ایسے بلاوے، ایسی صدائیں آنے لگیں کہ۔

ایک جگہ تو گھوم کے رہ گئی ایڑی سیدھے پاؤں کی

وہ اب بچے نہیں رہے تھے ہمارا مطلب ہے ستّر سے متجاوز تھے۔ لیکن انھیں ایک لحظہ کے لئے بھی یہ خیال نہ آیا کہ یہ تمام رنگین اور رومینٹک چیزیں۔۔۔ جنھیں مرزا عبدالودود بیگ آلاتِ کشاورزی کی مناسبت سے "عہدِ شباب کے آلاتِ نشاط" وغیرہ کہتے ہیں۔۔۔ جنھیں یاد کرکرکے وہ سوسو decibel کی آہیں بھرنے لگے تھے، پاکستان میں نہ صرف بافراط بلکہ کہیں بہتر کوالٹی کی دستیاب تھیں۔ ہاں صرف ایک شئے پاکستان میں مفقود تھی اور وہ تھی ان کی جوانی۔ سو وہ بعد تلاش بسیار بے سود کانپور میں بھی نہ ملی۔

یہ بچے کتنے بوڑھے ہیں، یہ بوڑھے کتنے بچے ہیں

انھوں نے اپنے نارتھ ناظم آباد والے گھر کے سامنے مولسری کا درخت لگانے کو تو لگا لیا۔ لیکن یادوں کی مولسری کی بھینی بھینی مہک، پھبن اور چھب چھاؤں کچھ اور ہی تھی۔ اب وہ انواع و اقسام کے پھول کہاں کہ ہر پھول سے اپنی ہی خوشبو آئے۔ ان پر بھی وہ مقام آیا جو بڑھاپے کے پہلے شب خون کے بعد ہر شخص پر آتا ہے۔ جب دفعتاً اس کا جی بچپن کی دنیا کی ایک جھلک آخری جھلک۔۔۔۔ دیکھنے کیلئے بے قرار ہو جاتا ہے۔ لیکن اسے یہ علم نہیں ہوتا کہ بچپن اور بڑھاپے کے درمیان کوئی غیبی ہاتھ چپکے سے سوگنی طاقت magnifier (محدّب شیشہ) رکھ دیتا ہے۔ دانا کبھی اس شیشے کو ہٹا کر دیکھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ اس کے ہٹتے ہی ہر چیز خود اپنا miniature (تصغیر) معلوم ہونے لگتی ہے۔ کل کے دیو بالکل بالشتیے نظر آنے لگتے ہیں۔ اگر آدمی اپنے بچپن کے locale (جائے ورودِ واردات) سے عرصۂ دراز تک دور رہا ہے تو اسے ایک نظر آخری بار دیکھنے کے لئے ہرگز نہیں جانا چاہئیے۔ لیکن وہ جاتا ہے۔ وہ منظر اسے ایک طلسمی مقناطیس کی مانند کھینچتا ہے اور وہ کھنچا چلا جاتا ہے۔ اسے کیا معلوم کہ طفلِ طلسمات پر جہاں دیدہ آنکھ پڑ جائے تو سارے طلسم ٹوٹ جاتے ہیں۔ بہروپ نگر کی ساری پریاں اڑ جاتی ہیں اور شیش محل پر کالک پُت جاتی ہے۔ اور اس جگہ تو اب مقدس خوشبوؤں کا دھواں ہی دھواں ہے۔ یہاں جو کام دیو کی دہکتی دھنک کمان ہوا کرتی تھی وہ کیا ہوئی؟

یہ دھواں جو ہے یہ کہاں کا ہے؟ وہ جو آگ تھی وہ کہاں کی تھی؟

آدمی کو کسی طرح اپنی آنکھوں پر یقین نہیں ہوتا۔ وہ روپ سروپ کیا ہوا؟ وہ چہکار مہکار کہاں گئی؟ نہیں یہ تو وہ لوہاری منصور کوچے لوہاری دروازہ نہیں جہاں پر ہر چیز اچنبھا لگتی تھی۔ یہ ہر چیز، ہر چہرے کو کیا ہو گیا؟

Was this the face that launch'd a thousand ships? and burnt the topless towers of Ilium?

جس گھڑی یہ طلسم ٹوٹتا ہے۔ ماضی تمنائی کی خواب سرا ڈھے جاتی ہے۔ پھر اس شخص کا شمار نہ بچوں میں ہوتا ہے، بوڑھوں میں جب یہ مقام آتا ہے تو آنکھیں یکایک "کلر بلائینڈ" ہو جاتی ہیں۔ پھر انسان کو سامنے ناچتے مور کے صرف پر دکھائی دیتے ہیں اور وہ انھیں دیکھ دیکھ کے روتا ہے۔ ہر سو بے رنگی اور بے دلی کا راج ہوتا ہے۔

بے حلاوت اُس کی دنیا اور مذبذب اُس کا دیں

جس شہر میں بھی رہنا، اکتائے ہوئے رہنا

سو اس طفلِ بزرگ نے کانپور جا کر بہت گریہ کیا۔ پینتیس برس تک اس پر روئے گئے کہ ہائے! ایسی جنت چھوڑ کر کراچی کیوں آ گئے۔ اب اس پر روئے کہ لاحول ولا قوۃ اس سے پہلے ہی چھوڑ کر کیوں نہ آ گئے۔ خواہ مخواہ عمرِ عزیز کی ایک تہائی صدی خرافات پڑھنے میں گنوا دی۔ رونا ہی مقدر تھا تو اس کیلئے ۳۶۵ معقول وجوہات موجود تھیں اسلئے کہ سال میں اتنے ہی دن ہوتے ہیں۔ اپنی "ڈریم لینڈ" کا چپہ چپہ چھان مارا۔ لیکن

وہ لہر نہ پھر دل میں جاگی، وہ رنگ نہ لوٹ کے پھر آیا

پینتیس برس پرانا ناسٹلجیا یکایک ٹوٹا تو ہر جگہ اجاڑ اور ہر شئے کھنڈر نظر آئی۔ حد تو یہ کہ جس مگر مچھ بھرے دریا کو جس کا اور نہ چھور، وہ ملک بوس برگد کی پھننگ سے بے خطر چھلانگ لگا دیا کرتے تھے۔ اب اسے جا کر پاس سے دیکھا تو ایک مینڈک بھر برساتی نالہ نکلا۔ اور وہ جبر جنگ برگد تو نرا بونسائی پیڑ نکل رہا تھا۔

ماضی کے دشتِ بازگشت میں وہ اپنے ہمزاد کا خیمۂ زنگار گوں نہ پہچان پائے۔

۲

کبوتر خانے کا تجربہ

یونانی کورس (Greek Chorus) بہت طعنہ چھانٹ چکا۔ اب اس کہانی کو خود اس کے ہیرو بشارت کی زبانی سنیئے کہ اس کا مزہ ہی کچھ اور ہے۔

یہ افسانہ اگرچہ سرسری ہے

ولے اس وقت کی لذت بھری ہے

صاحب! میں تو اپنا مکان دیکھ کے بھونچکا رہ گیا کہ واللہ! ہم اس میں رہتے تھے اور اس سے بھی زیادہ حیرانی اس پر کہ بہت خوش رہتے تھے۔ مڈل کلاس غریبی کی سب سے قابلِ رحم اور لاعلاج قسم وہ ہے جس میں آدمی کے پاس کچھ نہ ہو لیکن اسے کسی چیز کی کمی محسوس نہ ہو۔ ماشاءاللہ سے ہم تلے اوپر کے نو بھائی تھے اور چار بہنیں۔ اور تلے اوپر تو میں نے محاورے کی مجبوری کے سبب کہہ دیا۔ ورنہ کھیل کود، کھانے اور لیٹنے بیٹھنے کے وقت اوپر تلے کہنا زیادہ صحیح ہوگا۔ سبھی نام "ت" پر ختم ہوتے تھے۔ عترت، عشرت، راحت، فرحت، عصمت، عفت وغیرہ۔ مکان خود والد نے مجھ

سے بڑے بھائی کی سلیٹ پر ڈیزائن کیا تھا سو سوا سو کبوتر بھی پال رکھے تھے۔ ہر ایک کی نسل اور ذات جدا۔ کسی کبوتر کو دوسری ذات کی کبوتری سے مختلط نہیں ہونے دیتے تھے۔ لکڑی کی بکان تھی۔ ہر کبوتر کا خانہ اس کی جسامت، عادات، چونچ اور دُم کی لمبائی کو ملحوظ رکھتے ہوئے خود بناتے تھے۔ صاحب اب جو جا کے دیکھا تو مکان کی آرکیٹیکچر میں سراسر ان کے اس شوقِ فضول کا عکس اور عمل دخل نظر آیا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ سارا مکان دراصل ان کے کبوتر خانے کا بھونڈا سا چربہ تھا۔

والد بہت دوراندیش اور پراکٹیکل تھے۔ اس اندیشے سے کہ ان کی آنکھ بند ہوتے ہی اولاد جائیداد کے تقاسم پر جھگڑا کرے گی۔ وہ ہر بیٹے کے پیدا ہوتے ہی اس کا علیحدہ کمرہ بنوا دیتے تھے۔ کمروں کی تعمیر میں خرابی کی ایک سے زیادہ صورتیں مضمر تھیں۔ یعنی بہ حفظِ مراتب یہ بھی تھا کہ ہر چھوٹے بھائی کا کمرہ اپنے بڑے بھائی کے کمرے سے لمبائی چوڑائی میں ایک ایک گز چھوٹا ہو۔ مجھ تک پہنچتے پہنچتے کمرے کے حدود اربعہ تقریباً اکڑوں بیٹھ گئے تھے۔ پورے سات سال لگے مکان مکمل ہونے میں۔ اس عرصے میں تین بھائی اور پیدا ہو گئے۔ آٹھویں بھائی کے کمرے کی دیواریں اٹھائی گئیں تو کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ قدمچوں کی نیو رکھی جا رہی ہے یا کمرے کی۔ ہر نومولود کی آمد پر سلیٹ پر سابقہ نقشے میں ضروری ترمیم اور ایک کمرے کا اضافہ کرتے۔ رفتہ رفتہ سارا آنگن ختم ہو گیا۔ وہاں ہمیں ورثے میں ملنے والی کوٹھریاں بن گئیں۔

بورژوایت پر لوذریت کا گمان!

صاحب، کہاں کراچی کی کوٹھی اور اس کے ایرکنڈیشنر اور قالین اور رو بلیک پینٹ اور کہاں یہ ڈھنڈار کہ کھانس بھی دو تو واللہ پلستر جھڑنے لگے۔ چالیس برس سے رنگ سفیدی نہیں ہوئی۔ پھوپھی زاد بھائی کے مکان میں ایک جگہ ترپال کی چھت گیری بندھی دیکھی۔ کراچی اور لاہور میں تو کوئی چھت گیری اور نم گیرہ کے معنی بھی نہیں بتا پائے گا۔ چھت گیری پر تین جگہ نیل پالش سے ضرب کا نشان X بنا ہے۔ مطلب یہ کہ اس کے نیچے نہ بیٹھو۔ یہاں چھت ٹپکتی ہے۔ کانپور اور لکھنؤ میں جس دوست اور رشتے دار کے یہاں گیا اسے پریشان حال پایا۔ آگے جو سفید پوش تھے۔ وہ اب بھی ہیں۔ مگر سفیدی میں پیوند لگ گئے ہیں۔ اپنی عسرت اور خودداری پر کچھ زیادہ ہی فخر کرنے لگے ہیں۔ ایک بھری محفل میں میں نے اس پر چھوٹا سا فقرہ کس دیا تو ایک جونیئر لیکچرار جو کسی مقامی کالج میں اقتصادیات پڑھاتے ہیں بگڑ گئے۔ کہنے لگے "آپ کی امیری امریکہ اور عرب امارات کی دین ہے۔ ہماری غریبی ہماری اپنی غریبی ہے۔ (اس پر حاضرین میں سے ایک صاحب نے قراءت سے الحمدللہ کہا) مقروضوں کے اللّے تللّے آپ ہی کو مبارک ہوں۔ عرب اگر تھرڈ ورلڈ کو عالم الفقیر کہتے ہیں تو ہم انہیں نہیں کہتے" میں مہمان تھا۔ ان سے کیا الجھتا۔ دیر تک فقر و فنا، نانِ جویں اور خودداری اور مفلسی کے دیگر لوازمات کی مدح میں اشعار سناتے رہے۔ دو شعر حضرت ابوذر غفاری پر بھی سنا گئے۔ شرما حضوری میں میں نے بھی داد دی۔ مہمان جو ٹھہرا۔ ہندوستان ہو یا پاکستان، آج کل ہر انٹیلکچوئل کو اپنی بے زری اور بورژوا ویت پر لوذریت کا گمان ہونے لگا ہے۔

کوئی چیز ایسی نہیں جو ہندوستان میں نہ بنتی ہو۔ ایک کانپور ہی کیا۔ ہر شہر کارخانوں سے پٹا پڑا ہے۔ کپڑے

کی ملیں ۔ فولاد کے کارخانے ۔ کاروں اور ہوائی جہاز کی فیکٹریاں، ٹینک بھی بننے لگے ۔ ایٹم بم تو عرصہ ہوا ایکسپلوڈ کر لیا ... سیٹلائیٹ بھی خلاء میں چھوڑ دیا ۔ عجب نہیں چاند پر بھی پہنچ جائیں ۔ ایک طرف تو یہ ہے دوسری طرف یہ نقشہ بھی دیکھا کہ ایک دن مجھے انعام اللہ برملائی* کے ہاں جانا تھا ۔ ایک پیڈل رکشا پکڑی ۔ رکشا والا مرقوق سا تھا ۔ بنیان میں سے بھی پسلیاں نظر آ رہی تھیں ۔ منہ سے بنارسی قوام والے پان کے بھبکے نکل رہے تھے ۔ اس نے انگلی کا آنکڑا (ہُک) سا بنا کر پیشانی پر پھیرا تو پسینے کی تلّی بندھ گئی ۔ پسینے نے منہ اور ہاتھوں پر تیلی سی چمک پیدا کر دی تھی جو دھوپ میں ایسی لگتی تھی جیسے ویسلین لگا رکھا ہو ۔ ننگے پیر سوکھی کلائی پر کلائی سے زیادہ چوڑی گھڑی ۔ ہینڈل پر پروین بوبی ایکٹرس کا ایک سیکسی فوٹو ۔ پیڈل مارتے میں دہرا ہو ہو جاتا اور پسینے میں تر پیشانی بار بار بوبی پر سجدہ ریز ہو جاتی ۔ مجھے ایک میل ڈھو کے لے گیا ۔ مگر گیس کیجئے کتنا کرایہ مانگا ہو گا؟ جناب! کل پچھتر پیسے! اگلا تم پھر کہو میں بولا کے علاوہ چار روپے پچیس پیسے کا ٹپ دیا تو پہلے تو اسے یقین نہیں آیا ۔ پھر باچھیں کھل گئیں ۔ گیرو کے بجوں جیسے پان کے کھودے دانت نکلے کے نکلے رہ گئے ۔ میرے بٹوے کو حریص نظروں سے دیکھتے لگا " بابو جی! آپ پاکستان سے آئے ہیں؟ میں بھی وہاں ۔ مگر پینتیس برس پہلے یہیں ہیرامن کے پُروے میں رہتا تھا ۔" اس نے پانچ کا نوٹ انٹی سے نکال کر لوٹاتے ہوئے کہا ۔

" بابو جی! میں آپ سے پیسے کیسے لے سکتا ہوں ۔ آپ سے تو محلہ داری نکلی ۔ میری کھولی بھی وہیں ہے "

غریب غُرّانے لگے

اور آبادی؟ الاماں! الحفیظ، بارہ ماسی میلے کا سماں ہے ۔ زمین سے اُبلے پڑتے ہیں بازار میں آپ دو قدم نہیں چل سکتے ۔ جب تک کہ دائیں بائیں ہاتھ اور کہنیاں نہ چلائیں ۔ خشکی کی تیراکی کہیے! جہاں کہنی مارنے کی بھی گنجائش نہ ہو وہاں لوگ ایک جگہ سے دوسری جگہ محض بھیڑ کے دھکے سے پہنچ جاتے ہیں ۔ لکھو کھا آدمی فٹ پاتھ پہ سوتے ہیں ۔ وہیں ہر مرحلے سے گزر جاتے ہیں ۔ مگر فٹ پاتھ پر سونے والا کسی سے دبتا ہے نہ ڈرتا ہے ۔ نہ حکومت کو بُرا کہنے سے پہلے مڑ کر دائیں بائیں دیکھتا ہے ۔ ہمارے زمانے کے غریب واقعی میں مسکین ہوتے تھے ۔ اب غریب غُرّاتے بہت ہیں سائیکل رکشا کو تو پھر بھی رستہ دے دیں گے، مگر کار کے سامنے سے ذرا جو ہٹ جائیں ۔ عزیز الدین وکیل کہہ رہے تھے کہ ہمارے ہاں سیاسی بیداری بہت بڑھ گئی ہے ۔ واللہ اعلم! میں نے تو یہ دیکھا کہ جتنی غریبی بڑھتی ہے اتنی ہی ہیکڑی بھی بڑھتی جاتی ہے ۔ بلیک کا پیسہ وہاں بھی اللہ ماروں ہے ۔ مگر کسی کی مجال نہیں کہ امارت کی نمائش کرے ۔ شادیوں میں کھاتے پیتے گھرانوں تک کی خواتین کو تک سوتی ساری اور چپل پہنے دیکھا ۔ مانگ میں اگر سیندور نہ ہو تو واللہ بیوہ کا گمان ہو چہرے پر قطعاً کوئی میک اپ نہیں جب کہ اپنے ہاں یہ حال کہ مرغی کی ٹانگ کے بھی ہاتھ نہیں لگاتے جب تک اس پر روژ نہ لگا ہو ۔ صاحب آپ نے طارق روڈ کے لال بھبوکا چکن تکے دیکھے ہیں؟ کانپور میں میں نے اچھے اچھے گھروں میں دریاں اور بید کے صوفہ سیٹ دیکھے اور بعض تو وہی ہیں جن پر ہم پینتیس سال پہلے اینڈا کرتے تھے صاحب! رہن سہن کے معاملے میں ہندوؤں میں اسلامی سادگی پائی جاتی ہے؟

جو ہونی تھی سو بات ہولی کہارو!

کہنے کو تو آج بھی اردو بولنے والے اردو بولتے ہیں ۔ مگر میں نے ایک عجیب تبدیلی محسوس کی عام آدمی کا ذکر

---

* انعام اللہ کے زمانے میں لاکس پر بہت فخر کرتے تھے کہ ہر لفظی بات برملا کہہ دیتے ہیں ۔ اسی بنا پر ان کا لقب برملائی پڑ گیا ۔

نہیں، اردو کے پروفیسروں اور لکھنے والوں تک کا وہ لہجہ نہیں رہا جو ہم آپ چھوڑ کے آئے تھے کرارا، کھرا پن، وہ کڑی کمان والا کھنکتا ہوا
رہا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ڈھلک کر ہندی کے پنڈتانی لہجے کے قریب آگیا ہے۔ Singsong لہجہ — You know I
mean — یقین نہ آئے تو آل انڈیا ریڈیو کی اردو خبروں کے لہجے کا کراچی ریڈیو یا میرے لہجے سے موازنہ کر لیجئے۔ میں نے یہ سننا کہا تو
انعام اللہ برملا اپنچ پیچ آفنڈ ہو گئے۔ ارے صاحب! وہ تو ذاتیات پر اتر آئے۔ کہنے لگے "اور تمہاری زبان و لب و لہجہ پہ
جو پنجاب دی چھاپ ہے؟ تمہیں نظر نہیں آتی، ہمیں آتی ہے۔ تمہیں یاد ہوگا، ۳ اگست ۱۹۴۷ء کو جب میں تمہیں ٹرین پر سی آف
کرنے گیا تو تم سیاہ رامپوری ٹوپی، سفید چکن کی دلی پاجامہ اور جودھپوری جوتی پہنے ہاتھ کا چلو بنا کر آداب تسلیمات کر رہے تھے۔ کچھ یاد ہے!
گلے میں پان، آنکھوں میں ہیرے کا سرمہ، ململ کے چنے ہوئے کرتے میں عطر گل! ٭ کہو ہاں! اور جس وقت گارڈ نے سیٹی بجائی، تم چنبیلی
کا گجرا گلے میں ڈالے کوپے میں گرم چائے پرچ میں ڈال کر پھونکیں مار مار کے سُڑ سُڑ پی رہے تھے۔ اس وقت بھی تم کراچی کو کرانچی کہہ رہے تھے
کہہ دو کہ نہیں۔ اور اب تین decades of decadence (عشرہ ہائے انحطاط) بعد سر پر سفید بالوں کا ٹوکرا رکھے۔ ٹخنے
تک حاجیوں جیسا جھاڑ جھلا کرتا پہنے۔ ٹانگوں پر گھیر دار شیکرز سے پھڑکاتے، کراچی کے کنکریٹ جنگل سے یہاں تیرتھ یاترا کو آئے ہو تو
ہم تمہیں پنڈت یا لالے دکھلائی دینے لگے! بھول گئے؟ تم یہاں سے اماں! اور اے حضت! کہتے گئے تھے اور اب سائیں!
سائیں! کہتے لوٹے ہو" صاحب! میں مہمان تھا۔ بقول آپ کے، اپنی بے عزتی خراب کروا کے چپکے سے اٹھ کر رکشا میں گھر آگیا۔

جو ہونی تھی سو بات ہولی، کہارو!
چلو رے چلو میری ڈولی، کہارو!

ہم چپ رہے، ہم ہنس دیئے

لکھنؤ اور کانپور اردو کے گڑھ تھے۔ بے شمار اردو اخبار اور رسالے نکلتے تھے۔ خیر، آپ تو مان کے نہیں دیتے۔ مگر
صاحب ہماری زبان سند تھی۔ اب یہ حال ہے کہ مجھے تو سارے شہر میں ایک بھی اردو سائن بورڈ نظر نہیں آیا۔ لکھنؤ میں بھی نہیں! میں نے
یہ بات جس سے کہی وہ آہ بھر کے یا منہ پھیر کے خاموش ہو گیا۔ شامت اعمال، یہی بات ایک محفل میں دہرا دی تو ایک صاحب بپھر
گئے غالباً ظہیر نام ہے۔ میونسپلٹی کے ممبر ہیں۔ وکالت کرتے ہیں نہ جانے کب سے بھرے بیٹھے تھے۔ کہنے لگے "بلند!
ہندوستانی مسلمانوں پر رحم کیجئے۔ ہمیں اپنے حال پر چھوڑ دیجئے۔ پاکستان سے جو بھی آتا ہے۔ ہوائی جہاز سے اترتے ہی اپنا
فادر آف کنیچنج اچھالتا۔ یہی رونا روتا ہوا آتا ہے۔ جسے دیکھو آنکھوں میں آنسو بھرے شہر آشوب پڑھتا چلا آرہا ہے۔
ارے صاحب! ہم نصف صدی سے پہلے کا کانپور کہاں سے لا کے دیں۔ بس جو کوئی بھی آتا ہے۔ پہلے تو ہر موجودہ چیز کا موازنہ
پچاس برس پہلے کے ہندوستان سے کرتا ہے۔ جب یہ کر چکتا ہے تو آج کے ہندوستان کا موازنہ آج کے پاکستان سے کرتا ہے
دونوں مقابلوں میں چابک دوسرے گھوڑے کے مارتا ہے۔ جتاتا ہے اپنے ہی گھوڑے کو!" وہ بولتے رہے۔ میں مہمان
تھا۔ کیا کہتا، ورنہ وہی (سندھی) مثل ہوتی کہ گئی تھی سینگوں کے لئے، کان بھی کٹوا آئی۔
لیکن ایک حقیقت کا اعتراف نہ کرنا بددیانتی ہوگی۔ ہندوستانی مسلمان کتنا ہی نادار اور پریشان
روزگار کیوں نہ ہو، وہ مخلص، باوقار، غیور اور پراعتماد ہے۔

٭ عطر گل: بارش کے پہلے چھینٹوں سے بھیگی مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو کا عطر جو اترتی گرمیوں میں لگاتے تھے اب جسم ٹھہرا کہ پہنچ
کر ہی زمین کی خوشبو میں نہلاتے ہیں۔

عثمان علی عارف (پاکستان)

ہیرو

(۱)
گھر سے نکلا تھا میں یہ دل میں تمنا لے کر
اب تو لاہور میں، میں جاکے بنوں گا ایکٹر
رات دن اسٹوڈیو کے بھی لگائے چکر
اور لاہور کے فٹ پاتھ پہ گھوما اکثر

(۲)
اکثر آتا تھا مرے دل میں یہ رہ رہ کے خیال
ایکٹنگ ایسی کروں جس کی نہ ہو کوئی مثال
میری نوخیز اداکاری پہ آئے نہ زوال
دیکھے اسٹیج پہ جو مجھ کو تو شرمائے کمال

(۳)
میں کہ آواز کا جادو بھی جگا سکتا ہوں
گیت گا گا کے ہر اک دل کو لبھا سکتا ہوں
ہر گلوکار کی میں نقل اڑا سکتا ہوں
گا کے رُشدی کا ہر اک گیت سنا سکتا ہوں

(۴)
دیبا و زیبا و نیلو کا پرستار رہوں میں
اور شمیم آرا کی الفت کا طلب گار رہوں میں
ان کی انجانی محبت میں گرفتار رہوں میں
جرم الفت کی سزا دو کہ خطاوار رہوں میں

(۵)
خواب میں نورجہاں آتی ہے لیکن کم کم
اور تصور پہ مری چھائی ہوئی ہے شبنم
دل مرا گویا حسینوں کی بنا ہے البم
یاد میں ان کی بھرا کرتا ہوں آہیں پیہم

(۶)
یہ اگر چاہیں تو ذرّہ بھی ستارا ہو جائے
اک نظر عاشقِ بسمل پہ خدارا ہو جائے
ان کی نظروں کا جو ادنیٰ سا اشارا ہو جائے
اوج پہ پھر تو مقدّر کا ستارا ہو جائے

غزل

محمود نشتر (حیدرآباد)

لیڈر وکیل اور ڈفر سب مزے میں ہیں
نکلا دیوالہ اپنا اُدھر سب مزے میں ہیں

کل میرے والدین کو گھر سے نکال کر
دیکھا کہ سالی ساس سسر سب مزے میں ہیں

پیری میں جس نان پہ ہے پدر کی بنی ہوئی
باروں میں پی پلا کے پسر سب مزے میں ہے

سربیا، تھائی لینڈ، میاں مارشل ایب
اوکھلی میں ہے عراق کا سر سب مزے میں ہے

بابو آر کے
(ایل پیٹی)

شیر خورمہ پھیکا پھیکا

رمضان کے دوسرے عشرے ہی سے عید کی خریداری نے ہمارا جینا حرام کر دیا تھا مگر گھر کے تمام افراد کے کپڑے لتے، لڑکوں کے جوتے سے لے کر ٹوپی تک اور بچیوں کی ایڑی سے لے کر چوٹی تک بناؤ سنگھار کے سامان خریدتے خریدتے چھٹی کا دودھ یاد آگیا۔ ہم نے عید کے ان تمام لوازمات کے لیے ادھر ادھر ہاتھ پاؤں مارے اور کسی حد طے بھی
تک یہ سارے مرحلے
کرلیے لیکن آخری عشرے میں شیر خورمے نے تو ہماری مالی حالت کے انجر پنجر ڈھیلے کردیے۔

بیگم نے شیر خورمے کے لیے سوکھے میوے اور دوسری چیزوں کی لسٹ ہاتھوں میں تھماتے ہوئے کہا، "اس لسٹ میں میں نے خود ہی کاٹ کسر سے کام لیا ہے ایک بھی چیز کم مت لانا"! ہم نے لسٹ پڑھنی شروع کی۔ پاؤ کلو چرنجی، ۳ کلو خورمے، ادھا پاؤ کلو کشمش ۲ کلو کھوپرا، آدھا کلو اصلی گھی تین کلو شکر وغیرہ وغیرہ۔ ہم نے لسٹ بغور دیکھی اور دل ہی دل میں اس کا اسٹیمنٹ تیار کیا اور ٹھنڈی سانس بھر کر بولے بھئی بیگم شیر خورمے کا پروجیکٹ تو خاصا تگڑا ہے۔ کم زیادہ ہزار کے نزدیک پاس والا معاملہ ہے۔ عید کی خریداری نے ہم کو پہلے ہی نچوڑ کر رکھ دیا تھا اور اب لگتا ہے ہماری ہڈیوں کا بچا کچھا شیرہ یہ شیر خورمہ نکالنے والا ہے۔ پھر ہم نے لسٹ کو دوبارہ دیکھا اور چونکتے ہوئے بیگم سے دریافت کیا۔ تم نے لسٹ میں شیر خورمے کی ہر چیز لکھ ماری لیکن شیر خورمے کے لیے جام جام اور چمچے وغیرہ کیوں بھول گئیں؟ یہ سن کر وہ اکڑ کر بولیں شیر خورمے اور چمچے وغیرہ تو میرے ابو نے تمھیں جہیز میں پہلے ہی دے رکھے ہیں۔ میرے ابو نے تمھیں کوئی ایسا ویسا چل چلاؤ جہیز تھوڑے ہی دیا تھا۔ ہر چیز سلیقے کی اور طریقے کی جہیز میں موجود تھی۔ جہیز کی تعریف سنتے ہی ہمارے اعصاب تن گئے واہ واہ کیا جہیز تھا .... دہی جہیز نا، جس میں ساڑھے تین پاؤں کا ہلکورے کھاتا ہوا پلنگ، بیٹھتے ہی کراہ اٹھنے والا صوفہ تھا۔ آکسیجن کھینچ کر کاربن ڈائی آکسائیڈ دینے والا دلی میڈ فین تھا۔ ڈیڑھ دو درجن جس میں ٹین ٹپر کی پلیٹیں تھیں ..... آج ہم جہیز کا کچا چٹھا کھول دینا چاہتے تھے ..... اور ہاں اسی جہیز میں کچھ بے پیندے کے لوٹے بھی تھے اور

اور چار چھ گلاس تھرڈ کلاس ٹوٹے پھوٹے وہ بھی تھے۔ واہ واہ کیا جہیز تھا بیگم خدا گواہ ہے۔ نواب سالار جنگ
اس جہیز کو دیکھ لیتے تو یقیناً وہ اپنے museum کو پھونک دیتے اور صرف اسی جہیز کو محفوظ کر لیتے۔ یہ
سن کر بیگم جھلا اٹھیں اور چڑ کر بولیں میرے جہیز کی تمام عیب دار چیزیں تو تم نے گنوا دیں اور اچھی نایاب چیزوں
کا تم نے نام بھی نہیں لیا؟ پھر وہ انگلیوں کے کیلکولیٹر ایک کرتے ہوئے بولیں ٹی سیٹ، لیمن سیٹ اور
شیر خورمہ سیٹ کیا اتنے سارے سیٹس تمہیں جہیز میں نہیں ملے تھے۔ ہم نے کہا یہ تو سب کے سب ایسے
تھے۔ کسی سیٹ میں چمچہ نہیں تھا۔ کوئی گلاس سے عاری تھا تو کوئی ٹرے سے خالی تھا۔ اس وقت
بیگم نے گفتگو کا رخ موڑنا چاہا، بولیں۔ اس وقت تم شیر خورمے کا سامان لانے بازار جاؤ گے یا میرے جہیز
میں کیڑے نکالتے جاؤ گے۔ جاؤ جلدی اور سب سامان لے آؤ...... وہ پریشانی سے بولیں کتنے کام
پڑے ہیں۔ میوے تیار کرنے ہیں سیویوں کا چین کرنا ہے۔ دوسری تیاریاں بھی جوں کی توں دھری ہیں۔
یہ سن کر ہم نے کہا اچھا ٹھیک ہے ہم شیر خورمے کے یہ تمام لوازمات ابھی لاتے ہیں...... پہلے ذرا تم اپنا
ایک آدھ گہنا تو دو...... یہ سن کر وہ دم بخود ہو گئیں اور بولیں...... وہ کیوں؟ ہم نے کہا مہنگائی اور
حالات کا یہی تقاضہ ہے بیگم، اس سال گہنے گروی رکھ کر ہی شیر خورمے کے میوے گھروں میں داخل
ہو پائیں گے ورنہ نہیں۔ یہ سن کر بیگم کے چہرے کا رنگ اڑ گیا وہ سٹپٹا کر ہمیں دیکھنے لگیں ہم نے کہا جب
ملک میں ایک سال میں دو مرتبہ الیکشن ہونے لگیں اور اپنے ہی ملک میں بھائی بھائی سے لڑتا رہے خون
بہتا رہے۔ پد یاترائیں نکلتی رہیں رتھ یاترائیں چلتی رہیں اور فسادات ہوتے رہیں تو ایسے حالات میں مہنگائی
تو زوروں پر رہے گی ہی۔ اس لیے اس سال بجائے شیر خورمہ پینے کے دانتوں کا رس پینا ہوگا یا خون کے
گھونٹ پی کر چپ رہنا ہوگا۔

تھوڑے توقف کے بعد ہم نے کہا...... ہم ایسا کرتے ہیں بیگم کہ بازار سے صرف شیر، خورمے
اور شکر لاتے ہیں۔ اب کے برس بجائے کاجو کشمش چرونجی بادام اور کھوپرے کے ہم خالص شیر خورمہ ہی
پئیں گے۔ یہ سنتے ہی بیگم خوش ہو کر اپنے گلے میں پڑے گہنے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا، ویسے میووں والے
اس شیر خورمے کو سارے حکیموں نے دشمنِ معدہ قرار دیا ہے۔ وہ برا سا منہ بنا کر بولیں کاجو، کشمش،
چرونجی، بادام اور کھوپرے جیسے موے میوے میں سوائے قبضیت کے دھرا ہی کیا ہے؟ اس طرح ہم
اس سال عید کے دن واقعی شیر خورمہ بنایا یعنی دودھ میں خورمے ڈال کر اسے آگ پر جوش دے د
ویسے اس شیر خورمے میں بھی خورمے کم تھے اور خمیر زیادہ تھا اسی طرح شیر میں پانی زیادہ اور شیر کم تھا

قاسم ندیم بمبئی

ہاتھ

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے ؛ ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

شاعری بھی عجیب چیز ہے۔ کبھی کسی کے غم میں شاعر کو اس دنیا سے خیرباد کہنے پر مجبور کر دیتی ہے تو کبھی شاعر کی جھولی میں خوشیاں اس قدر ڈال دیتی ہے کہ بے چارہ شاعر خوشیوں کی بھری ہوئی جھولی کا بوجھ ڈھوتے ڈھوتے اس زندگی کو الوداع کہنے سے بھی نہیں چوکتا۔ خیر یہ تو غم اور خوشی کا معاملہ تھا۔ ہندوستانی قانون کے ہاتھوں کی طرح موت کے ہاتھ بھی کسی حد تک لمبائی میں ٹھیک تھے۔ مگر بھلا ہو اس شاعری کا جس نے اب جینے کے ہاتھ بھی ایجاد کر لیے ہیں جو ابدی نیند سلانے میں معاون و مددگار ثابت ہو رہے ہیں۔ یوں تو جسم کے اہم ترین حصوں میں ہاتھوں کا شمار ہوتا ہے اور کہیں نہ ہو اعداد و شمار کے لیے بھی تو ہاتھوں کی مدد درکار ہوتی ہے۔

تختۂ دار تک پہنچانے میں ہاتھوں کا سب سے بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ اسی لیے پھانسی سے پہلے ہاتھوں کو پشت سے باندھ دیا جاتا ہے۔ جلاد اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ جو ہاتھ یہاں تک لا سکتے ہیں وہ یہاں سے نجات دلانے میں بھی دریغ نہیں کریں گے۔

انسان اپنے جذبات، احساسات اور خیالات کا اظہار کرنے میں بھی ہاتھوں کی مدد لیتا ہے۔ آج جتنے بھی لیڈران ہیں ان کی تقاریر سنیے تو لگتا ہے وہ منہ سے کم اور ہاتھوں سے زیادہ کام لے رہے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ آدھے یا پون گھنٹے تک ہاتھ نچانے کے بعد یہ حضرات عوام کو مسلسل پانچ سال نچاتے ہیں۔ بالکل کٹھ پتلی کی طرح مگر عوام بھی کبھی کبھار ہاتھوں کا صحیح استعمال کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اگر کوئی لیڈر یا نیتا عوام کے ہتھے چڑھ جائے تو اس پر پھولوں کے بدلے گندے انڈے نچھاور کرنے میں ہاتھوں کا کافی استعمال ہوتا ہے یا پھر پھول مالا کی چپل مالا ہاتھوں کے ذریعے بھدے سے گلے کی زینت بنائی جاتی ہے۔

مہندی ہاتھوں ہی میں لگائی جاتی ہے اور جو مہندی نہیں لگاتے انھیں خون سے ہاتھ رنگنے کا شوق ہوتا ہے۔ کچھ لیڈران اس سے بالاتر ہیں۔ یعنی وہ صرف ہاتھ رنگنے پر ہی اکتفا نہیں کرتے بلکہ اپنے پورے جسم کو قوم کے قیمتی خون سے شرابور کرتے ہیں۔ اور اسے قوم کی خودکشی کا نام دے دیا جاتا ہے۔ گویا لڑنے والے ہاتھ ہیں اور لڑانے والے بھی ہاتھ ہی ہیں۔ کسی کی شہ رگ پر نشتر پھیرنے والے ہاتھ ہیں تو زخموں پر مرہم

لگنے والے بھی ہاتھ ہی ہوتے ہیں۔

ہاتھ، تلوار اور شجاعت کا رشتہ بہت پرانا ہے۔ مگر جب سے دستی بم، پستول اور بندوقوں کا رواج ہوا ہے، اس وقت سے شجاعت کا لفظ صرف لغت کی زینت بن کر رہ گیا ہے۔ اب وہ مرد مجاہد کہاں جو دشمن کو بھی بھاگنے کا موقع دیتے تھے یا اپنے ہی ہاتھوں اسے جگاتے۔ (ہر چند کہ ان وجوہات کی بنا پر ہمیں اپنے سنہری دور سے ہاتھ دھونا پڑا) ان ہاتھوں میں اور آج کے ہاتھوں میں بہت تضاد ہے۔

تاریخ مرتب کرنے میں ہاتھوں کا بہت بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ آنکھیں دیکھتی ہیں۔ ذہن سوچتا ہے۔ اور ہاتھ تاریخ کے اوراق کو ترتیب دیتے ہیں۔ ان تاریخی اوراق کی حفاظت بھی ہاتھوں کے ذمہ ہوتی ہے اور ان اوراق کی بے حرمتی ہاتھ ہی کرتے ہیں۔ جب بھی کسی متعصب حکمران کو موقع ملتا ہے تو وہ سب سے پہلا کام یہی کرتا ہے کہ تاریخ کے اوراق کو مسخ کر کے نئے اوراق مرتب کرواتا ہے

راستہ دکھانے والے ہاتھ ہوتے ہیں۔ راہ سے بھٹکانے والے ہاتھ بھی ہوتے ہیں۔ چوراہے پر کھڑے ہوئے کانسٹیبل کے ہاتھ کا معمولی غلط اشارہ کئی حادثات کو جنم دے سکتا ہے۔ اسی لیے شہروں کا ٹریفک [illegible] اور بھیڑ بھاڑ کو دیکھتے ہوئے آر ٹی او صاحبان نے ہر چوراہے پر سگنل کا انتظام کر رکھا ہے [illegible] ان کی نظر میں بجلی ہاتھوں سے زیادہ قابل اعتماد رہی ہو۔

پولیس بھی ہاتھ [illegible] کا استعمال کرنے سے نہیں چوکتی پھر بھی بے چاری پر الزام لگایا جاتا ہے کہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی ہے۔ چند معاملوں میں پولیس واقعی فعال ہے۔ جیسے بے گناہوں کے ہاتھوں میں ہتھکڑی پہنانے کا کام انہی کے ذمے ہوتا ہے۔

ہڑتالی مظاہرین پر لاٹھی چارج کا مظاہرہ کون کر سکتا ہے۔ جن آنکھوں کے آنسو زمانے نے خشک کر دیے ہوں۔ انھیں تر کرنے کا کام آنسو گیس کے ذریعے پولیس ہی انجام دیتی ہے۔ لیکن اس معاملے میں پولیس اور مظاہرین سے زیادہ ہاتھوں کا عمل دخل ہوتا ہے۔

ہاتھوں کے معاملے میں عورتیں بھی مردوں کے شانہ بہ شانہ چلتی نظر آرہی ہیں۔ پچھلے دنوں جب عورتوں کو مہنگائی پر غصہ آیا تو انھوں نے فوراً متحد ہو کر بمبئی کی شاہراہوں پر "بیلن مورچے" کا اہتمام کر ڈالا۔ باورچی خانے کا بیلن راستے پر آگیا۔ یہ تو معلوم نہ ہو سکا کہ عورتوں نے اس دوران کیا کھایا مگر مردوں کو صرف دال چاول یا بٹاٹا وڑا کھا کر ہی دن بھر اکتفا کرنا پڑا۔ کیوں کہ گھروں سے تمام بیلن غائب تھے ورنہ مرد بھی روٹی بنا سکتے ہیں۔ ہاتھ، بیلن، عورت اور مرد کا رشتہ تو صدیوں پرانا ہے۔

خلوص دل سے دعا مانگنے میں جو بعد ہاتھ ادا کرتے ہیں انھیں بددعا جیسے مکروہ عمل میں بھی ملوث کر لیا جاتا ہے۔ ہاتھ کبھی سلام کے لیے اٹھتا ہے تو کبھی طمانچہ بن کر گال پر انگلیوں کے نشانات ثبت کر جاتا ہے۔ لیڈر عوام کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہیں۔ ووٹوں کی بھیک مانگتے ہیں۔ بھیک مانگنے والے اور بھیک دینے والے دونوں ہی ہاتھ ہیں۔ سیاہ کارنامے انجام دینے والے ہاتھ جتنے لمبے ہوتے ہیں وہاں تک عام آدمی کی پہنچ [illegible] کے ہاتھ [illegible] اعتبار سے زیادہ لمبے کیوں نہ ہوں۔

پچھلے دنوں ہمارے ملک میں کرکٹریا کی وبا زوروں پر تھی۔ چاروں طرف ریلائنس کپ ٹورنامنٹ کے چرچے ہو رہے تھے۔ اسی کے ساتھ امن کا نعرہ بھی شامل تھا۔ نعرہ چاہے مذہبی ہو، سیاسی ہو یا اخلاقی اسے لگانے کے لیے ہاتھوں کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ اگر جنگِ آزادی کے زمانے میں "انقلاب زندہ باد" کا نعرہ صرف زبان سے ادا کر دیا جاتا تو انگریز کبھی یہاں سے نہ جاتے۔ وہ تو اس نعرہ کے ساتھ ہندوستانی عوام کے ہاتھ اس قوت سے اوپر اٹھتے تھے گویا آسمان سے باکسنگ کر رہے ہوں۔ یہی دیکھ کر انگریزوں کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ اور جاتے جاتے انھوں نے بھارت کے نقشے پر اپنے ہاتھوں سے ایک ایسی ان مٹ لکیر کھینچ دی جس نے اسے دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ کتنے ہی ہاتھوں نے اسے مٹانا چاہا۔ اس جدوجہد میں وہ خود مٹ گئے مگر لکیر ابھی تک قائم ہے۔ غیبی ہاتھ ہی اس لکیر کو مٹا سکتا ہے۔

۵۵۔

محبوب مانجھومی (بلاسپور)

پانی

دیکھتے دیکھتے یوں ہو گیا عنقا پانی
ہے دکھانے لگا کربل کا نظارا پانی

جھوم کر ابر اٹھا، پھر بھی نہ برسا پانی
ہم گنہگاروں سے شاید کہ ہو روٹھا پانی

پانی مانگا جو پڑوسی سے تو جل کر بولا
میں یزیدی ہوں، کسی کو نہیں دوں گا پانی

خوب نیتا نے کہا جب نہیں ملتا پانی
ناریل کا میں پیا کرتا ہوں ٹھنڈا پانی

اک صراحی بھی لبالب نہ بھری لعنت ہے
نل سے تو بوند ہی بس نام کو ٹپکا پانی

ہائے پانی کی یہ قلت کہ کھڑی دعوت میں
ہم نے چمچوں کو دیا ایک ہی چمچہ پانی

اب عدو کوئی ہمارا ہے نہ ہے کوئی رقیب
اُٹھ گیا ان کا جہاں سے نہ ہو دانا پانی

قلتِ آب کا پبلک نے جو رونا رویا
ہنس کے نیتا نے کہا "چھوڑ دیں پینا پانی"

ایک اک بوند کو اس سال بھی ترسے گا گاؤں
جم کے برسا بھی تو شہروں میں ہی برسا پانی

آپ کا گاؤں نہیں ہے یہ ذرا دھیان رہے
شہر بمبئی ہے یہاں بکتا ہے بھیا پانی

پیاس سے مر گیا اک پھول سا بچہ ہے ہے
کاش مل جاتا اسے ایک ہی چمچہ پانی

کون ان لوگوں کے دکھ درد کو سمجھے ہے یہاں
جن کو ملتا نہیں پینے کا مصفّا پانی

کر کے وعدہ جو مکر جاتا ہے اس لیڈر کو
کیوں نہ کوسے اُسے پی پی کے یہ جنتا پانی

خون مل جاتا ہے سڑکوں پہ کنویں خالی ہیں
لیجیے خون سے بھی ہو گیا مہنگا پانی

رات گھر آ گئے پڑوسی نے لجاجت سے کہا
قرضِ حسنہ ہی، دے دیجیے تھوڑا پانی

دیش ہے یوں بھی تباہی کے دہانے پہ کھڑا
حال کیا ہوگا جو اس بار نہ برسا پانی

آپ کس کھیت کی مولی ہیں جنابِ محبوبؔ
ایسے اچھوں کو میاں ہم نے پلایا پانی!

مسکا لگائیے!

صابر بہاری (رانچی)

بنتی نہیں ہے بات تو مسکا لگائیے
بہکی ہیں خواہشات تو مسکا لگائیے

مطلب کی زندگی ہے یہ مطلب کا دور ہے
مطلب جو کھائے مات تو مسکا لگائیے

محنت کی دوڑ دھوپ میں اے جانِ زندگی
ہو جائے دن سے رات تو مسکا لگائیے

مسکا ہے وہ جو ریت سے روغن نچوڑ لے
سب دیکھتے یہ بات تو مسکا لگائیے

صابر نئے جہاں میں نہیں گلتی ہے دال
کھانا ہے شکر سے بھات تو مسکا لگائیے

انوار انصاری
(سانچی)

بم

آج کل ملک میں سیاسی اور سماجی انتشار لانے کے لئے بم ایک عمدہ حربہ ہے۔ اس سے عام بدامنی تو پھیلتی ہی ہے سارا ملک بم کے پیچھے پڑ جاتا ہے۔ پھر بم کی طوفان خیزیوں اور تباہیوں پر تبصرے کا دور شروع ہوتا ہے۔ اصلاحی سرگرمیاں تیز کردی جاتی ہیں۔ تقریروں کا بازار گرم ہوجاتا ہے۔ صرف ایک دو بم سے سکون و جمود کی جگہ ذہنوں میں ہلچل مچ جاتی ہے۔

بیسویں صدی کے آخری دہائی میں اب بم ہی کا بول بالا ہے۔ انگریزوں نے توپ، بندوق، گولی بارود سے اہل ہند کو اپنا غلام بنالیا تھا مگر بم کی وجہ سے اب کئی صوبوں میں لاوا پھوٹ پڑا ہے۔ بموں کا چلنا اب آئے دن کا معمول ہوگیا ہے بموں کی یلغار سے اب ہر طرف خوف و ہراس پھیل گیا ہے۔

سیاسی انتشار اور اختلال کی وجہ سے بم کی افادیت میں اضافہ ہوگیا ہے۔ اب تو سماج میں جہاں کسی کو بے راہ روی نظر آتی ہے وہ صرف ایک بم چلاکر انتقام کی آگ کو سرد کرلیتا ہے۔ سماج دشمن عناصر یہ نہیں سوچتے ہیں کہ ملک کس طرح خوشحال ہوگا بلکہ ان کی خواہش ہوتی ہے کہ بم چلاکر ملک کو زبون حالی اور کسمپرسی کے درواز ... پر لا کھڑا کیا جائے۔ ان بموں کی وجہ سے حکومتوں کا کس بل ٹوٹ رہا ہے۔

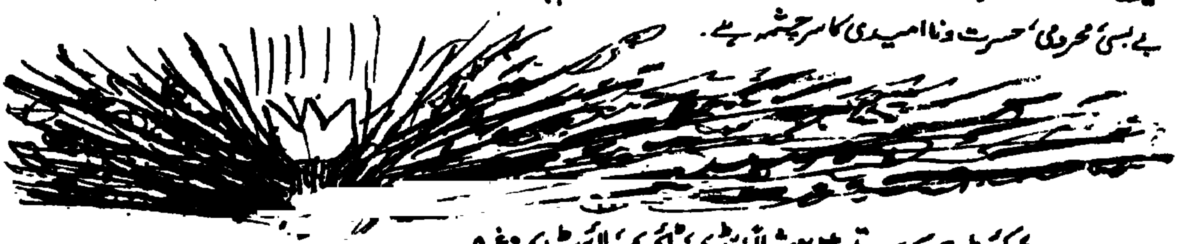
ہندوستان میں عام موسموں کی طرح ایک اور موسم بھی ہوتا ہے اور وہ ہے بموں کا موسم۔ شادی، بیاہ، ختنہ، تقریب، برتھ ڈے پارٹی، سیاسی میٹنگ میں بموں کا پھٹنا۔ اب بعید از قیاس نہیں۔ صرف ایک بم سے محفل کی فضاء بدل جاتی ہے لوگوں کا کھانا پینا بند ہوجاتا ہے۔ ان کی سٹی گم ہوجاتی ہے۔ رونا دھونا واویلا شور شروع ہوجاتا ہے۔

بجلی کی آنکھ مچولی کے کھیل سے جب میرے شہر کے لوگ عاجز آگئے تو نوجوانوں کے ایک طبقہ نے بجلی کے جنریٹر پر بم سے وار کیا اور پھر سارے شہر کی بجلی غائب ہوگئی۔ نل میں پانی آنا بند ہوگیا۔ اندھیرے میں بے کار نوجوانوں کو امید کی ایک کرن نظر آئی اور وہ لوگ چاق و چوبند ہوکر انتظامیہ کا مرثیہ پڑھنے لگے۔ لوٹ مار کا بازار گرم بلکہ سرگرم نظر آنے لگا اور شہر کی جنتا بم کی دہائی دینے لگی۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ۸/اپریل ۱۹۲۹ء کو سردار بھگت سنگھ نے اپنے دوست اور ساتھی کیشو دت کے ساتھ

دہلی اسمبلی میں دو کالے قانونوں کی مخالفت میں دو بموں کا دھماکہ کیا تھا۔ پھر انقلاب زندہ باد کے نعرے لگا کر دونوں نے اپنے آپ کو گرفتار کروایا تھا۔ ابھی حال ہی کی بات ہے یعنی ۲۱/مئی ۱۹۹۱ء کی جب زوردار بم کے دھماکے سے سابق وزیر اعظم راجیو گاندھی کے پرخچے اڑ گئے تھے۔

بم میں یہ طاقت ہے کہ وہ عورت کی کلائیوں کو سونی کر سکتا ہے۔ جوانی کی حرارت کو ختم کر سکتا ہے۔ نوخیز کلیوں کو مسل سکتا ہے۔ زندگی کو بے کیف بنا سکتا ہے۔ یعنی اب بم پوری کائنات اور زندگی پر حاوی ہے گویا بم انسان کی بے بسی، محرومی، حسرت و ناامیدی کا سرچشمہ ہے۔



بم کئی طرح کے ہوتے ہیں مثلاً ایٹم بم، ٹائم بم، لائیٹ بم وغیرہ

ایٹم بم موجودہ زمانے کا نہایت خوفناک ہتھیار ہے۔ اسے دو مرتبہ جاپان کے دو شہروں پر استعمال کیا گیا جس سے ہزاروں افراد ہلاک ہو گئے۔ کئی مربع میل زمین پر بربادی کی جھاڑو پھر گئی۔ پہلے زمانے میں بھی ایسی مہلک چیزیں ایجاد ہوتی رہی ہیں جن کے متعلق لوگوں کا وہی خیال تھا جو آج کل ایٹم بم کے متعلق ہے۔ ٹائم بم وقت کی پابندی سے اپنا کام کرتے ہیں۔ کبھی کبھی اگر وقت سے پہلے اس بم کی شناخت ہو جاتی ہے تو ٹائم بم اپنا اثر اس طرح کھو دیتے ہیں جس طرح بیوی کے سامنے بڑے بڑے سورما دم دبائے بھیگی بلی بن کر کھڑے رہتے ہیں۔ سائنس کی ترقی کی وجہ سے اب "لائیٹ بم" بننے لگے ہیں۔ "لائیٹ بم" سے سیاہ ترین رات کو دور دور تک تابناک بنایا جا سکتا ہے۔

ساون کے مہینے میں بہار میں بیج ناتھ دھام (دیوگھر) جانے والے یاتریوں کا نعرہ ہوتا ہے بول بم بول بم۔ لاکھوں یاتری ایک دوسرے کو صرف بم بول کر مخاطب کرتے ہیں۔ اگر کسی کو کچھ سامان خریدنا ہے تو وہ کہتا ہے کہ بم اس کی قیمت کیا ہے۔ فروخت کرنے والا بیوپاری جواب دیتا ہے لے لیجئے بم قیمت کی فکر نہ کیجئے۔ بم لوگوں کے لئے ریٹ بالکل کم لگا دیا گیا ہے۔ اسی طرح یاتری بم بول بول کر آگے بڑھتے جاتے ہیں۔ بول بم کا نعرہ ہے، تیرا ہی سہارا ہے۔ بول بم لگا دے بیڑا پار۔ تارک بم بھولا بم آئے ہیں تیرے در پہ۔ مذہبی عقیدے سے سرشار ہندو یاتری بول بم کی آواز لگاتے ہوئے میلوں کا سفر پیدل طے کرتے ہیں اور گنگا جل لے کر بیج ناتھ دھام پر چڑھا جاتے ہیں۔

میرے دفتر میں ایک ساتھی تھے۔ نام تو ان کا مسٹر کے پی سنہا تھا مگر وہ بم بابو کے نام سے پورے دفتر میں مشہور تھے۔ بات بات پر مسکرانا اور ہنس کر جواب دینا ان کی طبیعت کا خاصہ تھا بموں جیسی کوئی تخریبی کاروائی کبھی اُن کے ذہن میں نہ آئی بلکہ وہ تو اپنے مزاحیہ جملوں سے لوگوں کا دل موہ لیتے تھے۔ بم بابو عرصہ ہوا دفتر سے ریٹائرڈ ہو چکے ہیں۔

مشرق مغرب اب ہر جگہ بم کا چلن عام ہو گیا ہے۔ بم کی وجہ سے اب حکومتوں کے تار و پود کے بکھرنے کا وقت آن پہنچا ہے مگر حیرت کی بات ہے کہ بغیر ایک بم گرائے دو سپر طاقت بکھر گئی اور اس طاقت اور ترقی کا سارا بھرم نکل گیا۔

بزرگوں سے ہم سنتے آئے ہیں کہ جھگڑوں کا بنیادی سبب کیا ہوتا ہے۔ بزرگ کہا کرتے تھے کہ بیٹے زر، زمین، زن، زور اور زبان سے بچو۔ میرا خیال ہے کہ زور سے مراد یہی بم ہے۔ کیونکہ بم میں وہ زور پوشیدہ ہے جو آن کی آن میں کسی کو بھی موت کے گھاٹ اتار سکتا ہے۔

بم چلانے کے لئے یکسوئی اور تنہائی کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ سکونِ قلب کے ساتھ انسان بم چلا سکے۔ جو بم یکسوئی سے چلائے جاتے ہیں خوب کارگر ہوتے ہیں اور اپنے مقصد کی تکمیل بھی کرتے ہیں جو بم رواداری اور جلد بازی میں چلائے جاتے ہیں اس سے دوہرا خطرہ رہتا ہے۔ ایک تو بم نشانے پر نہیں لگتا ہے دوسرا بد احتیاطی سے بم چلانے والا بھی خود ہلاکت کی زد میں آجاتا ہے۔

بم چلنے سے قربِ قیامت کے منظر کا عکس نظر آنے لگتا ہے۔ یعنی دھواں آگ کی تیز شعاعیں اور جسم پر وار کرنے والے بے شمار ٹکڑے منٹوں میں اپنا کام دکھلا دیتے ہیں۔ ایک سال پہلے کی بات ہے میرے شہر میں کسی ناخوشگوار واقعہ کی وجہ سے کرفیو نافذ ہوگیا لیکن حیرت کی بات ہے کہ کرفیو کے دوران بموں کا پھٹنا بہت بڑھ گیا۔ شہر کے ہر کونے سے بم پھٹنے کی آواز سنائی دینے لگی۔ مجبوراً ایک شاعر کو کہنا پڑا۔

دعائیں کردو ذرا تم کہ خیر ہو جائے
لگا ہے کرفیو اور پھٹ رہا ہے بم دا دا

بم کی افادیت سے انکار کی گنجائش نہیں۔ جب تک دولت کی مساویانہ تقسیم نہ ہوگی۔ بم چلتے رہیں گے غریبی اور امیری، اونچی ذات اور نیچی ذات، پڑھے لکھے اور جاہل کی کھائی کو اگر کم نہ کیا گیا تو یقیناً بم چلیں گے۔ ہر انسان کی ضرورت یکساں ہوتی ہے اگر انسانی ضرورت کی تکمیل نہ ہوئی تو بموں کا چلنا کبھی بند نہ ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ آج ملک الموت بم لیکر لوگوں کے سامنے نمودار ہوتے ہیں اور اصلاح کا موقع دیئے بغیر بم چلا کر اپنے دل کی تسکین کر لیتے ہیں۔

••

جگر نظام آبادی

غزل

مفت جو بھی ہاتھ آئے ڈٹ کے کھانے دیجیے
دبلا پتلا ہوں مجھے بادی بنانے دیجیے

جانتا ہوں میں کہ ہے پانی کی قلت آج کل
سال میں اک بار تو مجھ کو نہانے دیجیے

اپنے ماموں جان سے مجھ کو بھی کچھ امید ہے
گوشت اور ترکاری اُن کے گھر کی لانے دیجیے

آپ کو چائے پلائی ہے بڑے اخلاص سے
کم سے کم دس بارہ غزلیں تو سنانے دیجیے

کوششوں پر کوششیں کیں نوکری ملتی نہیں
داد اپنے دیجیے چپا تو چلانے دیجیے

شعر سننے اور سمجھنے والے باقی ہیں کہاں
مجھ کو فلمی گیت محفل میں سنانے دیجیے

لوگ دیوانہ کہیں، پاگل کہیں کچھ بھی کہیں
اُن کے کوچے میں مجھے چکر لگانے دیجیے

پرویز عالم نعمان چیاآباد

غزل

جب بہے آنسو کا دریا تو غزل ہوتی ہے
بیوی گاتی رہے نغمہ تو غزل ہوتی ہے

مال داروں کے مقدر میں کہاں شعر کہیں
پیٹ پڑھتا رہے کلمہ تو غزل ہوتی ہے

عید کے موقع پہ بیگم کے لیے کچھ نہ سہی
ان کا آجائے جو جھمکا تو غزل ہوتی ہے

لطف تو جب ہے کسی روز پولس کے ہاتھوں
سر پہ پڑ جائے جو ڈنڈا تو غزل ہوتی ہے

لطف سسرال میں آتا ہے بہت کب خاں
کوئی سالی کرے ٹھٹھا تو غزل ہوتی ہے

غزل

شدت گرمی میں لکھنا تو بہت مشکل ہے
سر پہ ہو زلف کا بادل تو غزل ہوتی ہے

یوں تو ہر روز نکھر جاتی ہے وہ پاوڈر سے
ہو اگر آنکھ میں کاجل تو غزل ہوتی ہے

وہ مسکراتے ہوئے ملتی ہے تو چپ رہتا ہوں
بیوی بکتی ہے جب ال بل تو غزل ہوتی ہے

دیکھ کر فلم کوئی گھر میں جب آتی ہے صنم
اور کرتی ہے ریہرسل تو غزل ہوتی ہے

کبھی ہو سکتے نہیں شاعر مخمور و خمار
ہو اگر ہاتھ میں بوتل تو غزل ہوتی ہے

تم نقاب رخ جاناں کو ہٹا دو شکیل
سر سے گر جائے جو آنچل تو غزل ہوتی ہے

قطب سرشار
(محبوب نگر)

نمک پارے

نہ دیکھا غمِ میزباں...

ایک شاعر اپنے شاعر دوست کے گھر پہنچا اور کہنے لگا میں بہت جلدی میں ہوں ادھر سے گزر ہوا تو سوچا تم سے ملتا چلوں، میزبان شاعر نے اظہار تشکر کے بعد دوست کی بھرپور ضیافت کی مہمان شاعر نے چائے سگریٹ سے فراغت کے بعد بار بار عجلت کا اظہار کرتے ہوئے نہایت اطمینان کے ساتھ اپنی تازہ غزل میزبان شاعر کو سنائی اور یہ کہہ کر نو دو گیارہ ہو گیا کہ "سوری میں بے حد عجلت میں ہوں اجازت چاہوں گا"۔ اس پر میزبان شاعر نے ٹھنڈی آہ بھر کر یہ شعر فی البدیہہ کہا:

نہ دیکھا غمِ میزباں حیف ہے
ہمیں داغ اپنا دکھا کر چلے

جب وہ آتا ہے...

ایک طالب علم جو گریجویشن کی سطح سے اپنے اساتذہ کا نہایت ہی اطاعت گزار اور خدمت گزار شاگرد رہا ہے۔ اس کی اس خوش خصالی کے سبب اسے ہر ڈگری کورس میں قابلیت سے زیادہ رینک (Rank) حاصل ہوتا گیا حتیٰ کہ وہ ریسرچ اسکالر بھی ہو گیا اس کا موضوع تھا امجد حیدرآبادی کی رباعیات کا تجزیاتی مطالعہ۔ امجد کی ایک رباعی کے آخری دو مصرعے ہیں:

جب وہ آتا ہے میں نہیں رہتا
میں جب رہتا ہوں وہ نہیں آتا ہے

ان مصرعوں پر ادب کے اس محقق نے اس طرح لکھا۔ بے خودی کے عالم میں بھی مقروض آدمی کے دل و دماغ پر قرض دہندہ کا تصور سوار رہتا ہے اور ہوش کے عالم میں تو بس مقروض اور قرض دہندہ میں جیسے آنکھ مچولی چلتی رہتی ہے۔ جب وہ آتا ہے تو یہ نہیں رہتا اور جب یہ رہتا ہے تو وہ نہیں آتا۔ میں نہیں سمجھتا کہ حضرت امجد کی اس رباعی کے آخری دو مصرعوں کا خود امجد کے تجربے سے کوئی تعلق ہوگا۔ کبھی حضرت امجد کسی کے اس قدر مقروض رہے ہی نہیں جو قرض دہندہ کے ساتھ اس طرح کا سلوک روا رکھتے۔

مرے پاس ہے وہ دولت ...

کسی مشاعرہ کی صدارت ایک شاعر کر رہے تھے ۔ مشاعرے میں شعرا کی تعداد سامعین کی تعداد پر غالب تھی پورے چھ گھنٹے بعد بھی صدرِ مشاعرہ کی باری نہیں آئی ۔ اس دوران صدر موصوف حاجت کے لیے شہ نشین سے اٹھے تو پتہ چلا کہ کسی نے جوتیاں غائب کر دی ہیں بہر حال کسی طرح وہ حاجت سے فارغ ہو کر دوبارہ شہ نشین پر رونق افروز ہوئے ۔ مشاعرہ کے آخری شاعر نے ایک شعر سنانے سے پہلے عرض کیا یہ شعر صدرِ محترم کی نذر کرتا ہوں ۔ شعر تھا :

جسے تم نے پا لیا ہے مری آرزو وہی تھی
مرے پاس ہے وہ دولت جسے تم نے کھو دیا ہے

اس پر صدرِ مشاعرہ چونکے اور شاعر نے اپنی غزل مکمل کر لی تو اسے اپنے پاس بلایا اور سرگوشی کی کہ بھئی اگر تمہارے پاس ہے تو لوٹا دو نا پلیز ۔۔۔۔!

کیا اقبال عظیم شاعر تھے ....؟

علامہ اقبال کی یاد میں سمینار منعقد ہوا تو اس موقع پر ایک شخص تقریر کر رہا تھا جو پیشے کے اعتبار سے وکیل تھا منتظمینِ جلسہ کی مصلحتوں کی بنا پر اس بے چارے کو مجبوراً بولنا پڑ رہا تھا تو وکیل نے اقبال کو جس زاویہ سے پڑھا سمجھا اور پرکھا ہے اس کا اندازہ اس کی اس تقریر سے کیا جا سکتا ہے ۔ وکیل نے کہا کہ علامہ اقبال ایک ممتاز قانون داں بھی تھے دراصل ان کی شاعری میں کہیں بھی کوئی قانونی جھول نظر نہیں آتا تاہم وہ ایک ناکام وکیل تھے اور ایک ناکام وکیل کامیاب شاعر ہو سکتا ہے ۔ کیوں کہ شاعری کی سیمائیں آئی پی سی کی سیماؤں سے آگے شروع ہوتی ہیں مگر یہاں سوال یہ اٹھتا ہے کہ کیا علامہ اقبال ایک عظیم شاعر تھے اس کے لیے ثبوت فراہم کرنے ہوں گے ۔ مورخین، محققین اور اقبال شناسوں کی گواہی کی روشنی میں ثابت ہو جاتا ہے کہ اقبال عظیم شاعر تھے ۔ لیکن چند فاضل نقادوں نے عظمت پر کیچڑ اچھالنے کی کوشش کی ہے لیکن محترم صدرِ جلسہ ! (یور آنر کے انداز میں) اقبال پر کیچڑ اچھالنے والے خود بھی ایسی بلدیہ کی نالی کے کیڑے ہیں جس کے تمام کونسلر نہایت ذہین اور کرپشن کے ماہر ہیں ۔ تو محترم صدرِ جلسہ (وہی یور آنر والا لہجہ) اب بات قطعی طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ اقبال عظیم شاعر تھے ۔ ثبوت کے طور پر اقبال کا کلام پیش ہے :

فروزاں ہے سینے میں شمع نفس
مگر تابِ گفتار رکھتی ہے بس

سعدیہ غوری
(ریاض)

مزاحیہ شہ پاروں سے انتخاب

کاک ٹیل

مغربی برلن کی مرکزی شاہراہ کا نام ہے " KURFURSTEN " اسے اپنے حساب سے پڑھا تو آواز نکلی "کفرستان"۔ اس پر ہمارے ہوٹل کا نام تھا "ہوٹل کفرستان" یعنی کفر کا دم چھلا یہاں بھی ہمارے ساتھ رہا۔ ع

یاروں کو تجھ سے حالی کیا بدگمانیاں ہیں

پہلے تو احتجاج کرنا چاہا کہ اسلامک ری پبلک سے آدمی کے لیے آپ نے اس نام کا ہوٹل کیوں مقرر کیا ہے۔ اس خیال سے چپ ہو گئے کہ اس ہوٹل میں اور سہی، شاہراہ پر بتان کافر سے مڈبھیڑ ہوا کرے گی۔ کیا عجب کوئی موقع تبلیغ کا نکل آئے اور کوئی ان میں راہ راست پر آ کر ہمارے دست حق پرست پر بیعت کرے۔ لیکن اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ کسی کافر کو تو ہم اپنی راہ پر لا سکے ہاں ہمارا ایمان ضرور کئی بار متزلزل ہوا (آوارہ گرد کی ڈائری، ابن انشا)

کیک کی فکر میں سو روٹی بھی گئی — چاہی تھی شئے بڑی سو چھوٹی بھی گئی
واعظ کی نصیحتیں نہ مانیں آخر — پتلون کی چاہ میں لنگوٹی بھی گئی

اکبر الہ آبادی

انکم ٹیکس کے محکمے میں ایک شخص نے خود تشخیصی نظام کے تحت جو کاغذات داخل کئے ان میں اولاد کے خانے میں اٹھارہ بچے تحریر کئے تھے۔ متعلقہ افسر نے غور سے کاغذات کا مطالعہ کر کے اولاد کے خانے پر سوالیہ نشان بنا کر لکھا "یہاں پر آپ سے کچھ غلطی ہو گئی ہے"۔ اور وہ کاغذات درست ہونے کے لیے واپس کر دیئے۔ کچھ ہی دنوں میں وہ کاغذات دوبارہ واپس جمع کرا دیئے گئے۔ اس شخص نے لکھا تھا "اب مجھ سے ایک اور غلطی ہو گئی ہے۔ اب میرے انیس 19 بچے ہیں۔

ٹرین میں جیسا کھانا جن برتنوں اور جس شکل میں پیش کیا جاتا ہے اس سے بچنے کے لیے ستھرے ناشتہ دان میں گھر کا کھانا ہو۔ تھرموس یا صراحی میں صاف پانی ہو۔ ہولڈآل ایسا ہو جیسے اسی سفر کے لیے خرید ا گیا ہو، نہ یہ کہ بستر پرانی ادوان یا میلی گرہ دار نواڑ کے ٹکڑے سے بندھا ہو، ساتھی مسافر ایسے نہ ہوں جن کی بیویاں ہر اسٹیشن پر کورے گرد آلود آبخورے میں دودھ اور پتے میں دہی بڑے خرید کر شوہر کو فراہم کرتی ہوں۔

اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ نوجوان، خوب صورت، خوش لباس اور خوش اطوار بیویاں، سارے کام انجام دینے پر مامور رہتی ہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ گرمی یا برسات کا موسم ہو تو بار بار ہولڈال سے تولیہ نکال کر شوہر نامدار کو مسلسل پسینہ پونچھتے رہنے کے لیے دیتی رہتی ہیں اور شوہر صرف بنیان میں ملبوس، تکیہ لے کر کبھی اوپر کی برتھ پر جا لیٹتا ہے کبھی فوراً ہی نیچے اتر کر غسل خانے میں داخل ہو جائے گا اور وہاں سے نکل کر نچلی برتھ پر جا لیٹتا ہے۔ اس کی یہ اور دوسری اضطراری حرکتیں اس بات کی غمازی کرتی ہیں کہ فرسٹ کلاس میں اسے وہ چین یا فضا میسر نہیں ہے جس کا وہ دراصل عادی ہے تندرست ہٹے کٹے شوہر کا سفر میں بیوی سے خادمہ کا کام لینا بڑی بدتمیزی ہے۔ ہمسفر کی سیرت کا اندازہ اس طرح بھی کرتے ہیں کہ وہ بیوی کے ساتھ کیا اور کیسا سلوک روا رکھتا ہے۔ نیز غسل خانہ استعمال کرنے کے طور طریقوں سے واقف ہے یا نہیں، ایسا تو نہیں کہ فرسٹ کلاس کا کرایہ ادا کر کے وہ یہ سمجھنے لگتا ہے کہ فرسٹ کلاس میں سفر کرنے کے آداب سے بھی وہ بری ہو گیا! شریفوں کا شیوہ تو یہ ہے کہ وہ اول درجہ ہی میں نہیں تھرڈ کلاس میں بھی، فرسٹ کلاس میں سفر کرنے کے آداب کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ ہر اسٹیشن پر مونگ پھلی، پکوڑے، دہی بڑے، کھیرا، ککڑی یا آم وغیرہ کھانے بتاچا نے اور ان کو کمپارٹمنٹ میں ڈال دینے سے مجھے بڑی گھن آتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اس وحشی اور گنوار نے غسل خانہ اور کمپارٹمنٹ ایک کر دیا ہو۔" (.... سرِ یادآیا - رشید احمد صدیقی)

ممی کیا یہ وہی ہے جس کی تم ہو عاشق و شیدا
یہ ہندی ہو کے کیوں انگلینڈ میں جا کے ہوئی پیدا
سوئٹزر لینڈ میں ہے باپ امریکہ میں ماں اس کی
چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں اس کی (راجہ مہدی علی خاں)

ایک فقیر کے پاس آکر ایک کار رکی اور اس میں بیٹھے ہوئے صاحب نے فقیر سے پوچھا۔

"کیا تم شراب پیتے ہو؟"

فقیر نے کہا "نہیں"۔

پھر پوچھا "کیا تم جوا کھیلتے ہو؟"

جواب ملا "نہیں"۔

سوال ہوا "کیا تم سگریٹ پیتے ہو؟"

"نہیں"

"کوئی اور نشہ کرتے ہو؟"

فقیر نے جواب دیا "نہیں"۔

وہ صاحب بولے "تو آؤ میرے ساتھ میں اپنی بیگم کو دکھانا چاہتا ہوں کہ جو لوگ ایسا نہیں کرتے اُن کی کیا حالت ہوتی ہے"

ذہانت علی بیگ
(حیدرآباد)

رؤف رحیم

"خدا خیر کرے" ! رؤف رحیم کا دوسرا مجموعہ کلام بھی کتابت و طباعت و اشاعت و اعانت کی دل دہلا دینے والی رکاوٹوں کو پھلانگتا ہوا۔ بالآخر ناقدین و ناظرین و سامعین و صارفین و شیاطین و شائقین کے ہاتھوں میں آ ہی گیا "خدا خیر کرے" جو رؤف الرحیم بھی ہے اور غفور الرحیم بھی ہے۔ لیکن یہ مجموعہ کلام "خدا خیر کرے" اس کا ہے جو رؤف بھی ہے رحیم بھی ہے یعنی رؤف رحیم کا ہے جو اس کے کل مالک و قابض و تاجر و آجر و صارف ہیں۔

لوگوں کو رؤف رحیم کے نام سے کچھ کنفیوژن ہوتا ہے کہ یہ ایک ہیں یا دو۔ چند دنوں ہمارے ساتھ "سیاست" میں کام بھی کیا۔ اس وقت کا ایک واقعہ بے حد دلچسپ ہے۔ ایک دفعہ فون آیا کہ "رؤف رحیم سے بات کروائیے" میں نے کہا وہ دونوں آج رخصت پر ہیں! ظاہر ہے کہ فون کرنے والا حیران بھی ہوا ہوگا اور پریشان بھی کہ رؤف رحیم "دونوں" کب سے ہو گئے۔ لیکن اس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا کیونکہ ہمارے دفتر میں رؤف اور رحیم نام کے واقعی دو نوجوان تھے اور اتفاق سے وہ دونوں اس دن غیر حاضر تھے۔ فون رکھنے کے بعد مجھے خیال آیا کہ کہیں وہ رؤف رحیم کو تو نہیں پوچھ رہے تھے؟ لیکن اب کیا ہو سکتا تھا جب "چڑیاں چگ گئیں کھیت"

بہر حال "خدا خیر کرے" کہ رؤف رحیم کبھی دوہری شخصیت dual personality جیسی نفسیاتی بیماری کا شکار نہیں رہے۔

سوال یہ ہے کہ رؤف رحیم شاعر کیوں بنے؟ کہ "اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا" مگر اس کا جواب یہ ہے کہ خود بقول ان کے شاعری ان کے خون میں داخل تھی۔ جواب کا دوسرا حصہ یہ ہے کہ شاعر کا بیٹا "شاعر نہ بنے تو کیا بنے؟ جب قاضی کے گھر کا چوہا بھی قاضی ہو سکتا ہے تو پھر شاعر کا بیٹا شاعر کیوں نہیں ہو سکتا۔ ؟

اب یہ سوال بھی بے کار ہے کہ وہ سنجیدہ شاعر پہلے بنے یا مزاحیہ شاعر۔ جس طرح مرغی پہلے یا انڈہ پہلے کا عقدہ آج تک حل نہیں ہو سکا۔ اسی طرح یہ مسئلہ بھی لاینحل رہے گا۔ لیکن میری ناقص رائے یہ ہے کہ چونکہ ان کا نام دو ناموں کا مرکب ہے اس لئے شاید وہ دونوں طرح کی شاعری کرنے لگے یعنی ایک نام سے سنجیدہ اور دوسرے سے مزاحیہ شاعری۔ لیکن افسوس تو اس بات کا ہے کہ وہ دونوں طرح کی شاعری میں ایک ہی نام استعمال کرتے ہیں۔ یہ بھی بڑا کمال اور وصف ہے۔ اور "خدا خیر کرے" ایسا بھی نہیں ہوا کہ انھوں نے محض لوگوں کو یہ باور کرانے کے لئے کہ وہ مزاحیہ شاعر

ہیں اپنا نام بگاڑ لیا ہو یا تخلص میں بھونڈے پن کا مظاہرہ کیا ہو۔

جناب مجتبیٰ حسین، اس وقت برصغیر بلکہ ساری اردو دنیا میں مزاح نگاری کے بے تاج بادشاہ اور قدآور شخصیت ہیں، جن کا نہ صرف "ادبی قد" بڑا ہے بلکہ قلم بھی بڑا ہے وہ میرے بزرگ ہیں۔ انھوں نے رؤف رحیم کے بارے میں تبصرہ کرتے ہوئے۔ اسی کتاب میں لکھا ہے کہ "مزاحیہ شاعری کرنے کیلئے شاعر کے تخلص کا بھی مزاحیہ ہونا قطعاً ضروری نہیں ہے۔ یہ کوشش عموماً وہی شاعر کرتے ہیں جو اردو شاعری کے کلاسیکی سرمایہ سے نابلد اور ناواقف ہوتے ہیں۔ وہ اپنے کلام کے بجائے اپنے مزاحیہ نام یا تخلص کے ذریعہ لوگوں کو ہنسانا چاہتے ہیں۔ رؤف رحیم کا کلام پڑھتے ہوئے مجھے اس بات کی خوشی ہوئی کہ وہ اردو کے کلاسیکی شعراء کی شاعری اور ان کی روایات سے بخوبی واقف ہیں اسی بات نے ان کے لہجے میں ایک اعتماد اور ان کی شاعری میں ایک وقار پیدا کیا ہے"

یہ الفاظ مجتبیٰ صاحب کے ہیں اور مستند ہے ان کا فرمایا ہوا "شاعری میں مذاق کرنا یا مزاح پیدا کرنا کوئی آسان بات نہیں۔ پھکڑپن کو اگر آپ مزاح کہہ لیں تو یہ اپنے اپنے ظرف کی بات ہے۔

افسوس کی بات تو یہ ہے کہ حیدرآباد کی مزاحیہ شاعری، تیسرے درجہ کی عامیانہ مذاق سے اوپر نہیں اٹھ سکی۔ چند ایک استثنائی صداقتوں کو چھوڑ کر ساس، خسر، بیوی، سالی، بچے وغیرہ وغیرہ کب تک اس پھکڑپن کا شکار ہوتے رہیں گے۔ خدارا ان قابل احترام شخصیتوں کو تھرڈ ڈگری کے مذاق کا موضوع نہ بنائیے۔ ماضی میں بھی ان موضوعات کا استعمال ہوا ہے لیکن اس طرح نہیں جس طرح آج ہو رہا ہے۔ رؤف رحیم نے بھی ان شخصیتوں اور رشتوں کو سڑک پر لا پٹخا ہے۔ پھر کسی حد تک رعایت بھی کی ہے۔ کیا سماج میں صرف یہی مسائل رہ گئے ہیں۔

آج کا ہمارا سماج ترقی یافتہ ہونے کے باوجود پسماندہ و درماندہ ہے۔ اپنے آپ کو فخر کے ساتھ مہذب اور تہذیب یافتہ کہلانے والے اس سماج میں آج کا ہمارا سماج ترقی یافتہ ہونے کے باوجود، پسماندہ و درماندہ ہے۔ اپنے آپ کو فخر کے ساتھ مہذب اور تہذیب یافتہ کہلانے والے اس سماج میں آج بھی دلہنیں جلائی جاتی ہیں۔ ٹکنالوجی اور کمپیوٹر کے اس دور میں آج بھی ان افراد کی کثرت ہے جو اپنے ہی جیسے انسانوں کو رکشہ میں بٹھا کر کھینچتے ہیں جن پر کبھی جوانی نہیں آتی اور جو بچپن سے سیدھے بڑھاپے میں پہنچ جاتے ہیں اور خون تھوک تھوک کر مر جاتے ہیں۔ اسٹار ہوٹلوں کے دامن میں آج بھی بھوک سے بے تاب معصوم بچے، کچرے کے ڈھیر سے ہڈی اور روٹی کے ٹکڑے صاف کر کر کے کھاتے ہیں۔ یہ معصوم بچے جن کے ہاتھ کھلونوں کے لئے ترستے ہیں اور جن کی اشکبار آنکھیں اپنی عمر کے بچوں کو اسکول جاتا دیکھ کر حسرت سے تکتی رہتی ہیں۔ کپڑے پہنے ہوئے بچوں کو دیکھ کر جنھیں اپنی بے لباسی کا احساس ہوتا ہے وہی بچے اپنے اور اپنے گھر کے لئے صرف ایک روٹی کی خاطر ہوٹلوں اور گھروں میں برتن مانجھتے اور گالیاں کھا کھا کر جوان ہوتے ہیں بلکہ انھیں جوان بھی نہیں کہا جا سکتا، وہ تو یوں ہی بڑے ہو جاتے ہیں۔ جوانی تو خوشحال اور کھاتے پیتے گھرانوں کے بچوں پر آتی ہے اور اس کا مظاہرہ سڑکوں پر ہر روز بالخصوص اب نئے سال کی شب دیکھنے کو ملے گا۔

کیا یہ مسائل شاعر کو جھنجھوڑنے کے لئے کافی نہیں ہیں۔ ان پر قلم اٹھا کر سماج کی استحصالی قوتوں کے خلاف آواز کیوں اٹھائی نہیں جاتی؟ میں یہ نہیں کہتا کہ کسی نے ان مسائل پر قلم نہیں چلایا۔ ہمارے کئی شعراء ایسے ہیں جنھوں نے ان استحصالی راکھشسوں پر قلم ہی نہیں ہتھوڑے چلائے ہیں۔

خدا خیر کرے بات خواہ مخواہ طویل ہو گئی ۔ بہر حال بات ہو رہی تھی ۔ رؤف رحیم کی اور ان کی شاعری کی ۔ رؤف رحیم نے اپنے ہمعصر شعراء سے متاثر ہو کر "ایسے ویسے" شعر بھی کہے ہیں اور جس کا خود انہیں اعتراف بھی ہے ؎

ہو سکے مجبوب میں لکھتا ہوں فصاحت کے بغیر
ورنہ مصرعے مجھے ایسے نہیں اچھے لگتے

لیکن ان کے بعض اشعار ان کی اعلیٰ ظرفی حالات پر گہری نظر اور سماج کے ان مسائل کے آئینہ دار ہیں جن کی ابھی میں نے نشاندہی کی ہے ۔ یہ چنگاری مگر دبی ہوئی ہے ان کو ہوا دینے کی ضرورت ہے ۔ ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی ۔ ثبوت میں چند شعر ملاحظہ کیجئے ؎

جہیزوں کے لئے بڑھتی رہیں گی تلخیاں کب تک
جلائی جائیں گی سسرال میں یہ لڑکیاں کب تک

یا یہ کہ ؎

بیٹی جوان گھر میں ہے دینا ہے جو جہیز
ماں ہے نڈھال ، باپ حزیں و ملول ہے

یا پھر یہ شعر

کوئی لڑکی جو غریبی میں جواں ہوتی ہے
اس کی تقدیر خدا جانے کہاں ہوتی ہے

یہ شعر بھی ان کے احساس کرب کا ثبوت ہے ؎

میں اپنے شہر کی تاریخ پڑھ رہا تھا رحیم
کہ حرف حرف لہو سے بھرا ملا ہے مجھے

ملک میں کھیلی گئی خون کی ہولی ہر سو
دیکھنا آگ کی برسات کہاں ہوتی ہے

پچھلے برس تو روٹی نے ٹوٹا تھا دل
اب تو منہ پھاڑ کے بھات آ گیا

؎

خون جی بھر کے بہا اس سال میں
ہم ہنستے ہی رہے ہر حال میں

غربت کے موضوع پر بھی رؤف رحیم نے قلم اٹھایا ہے ؎

عید میں گھر سے بہت دور نکل جاتا ہوں
جب بلکتے ہوئے بچے نہیں اچھے لگتے

★

؎

بھوک کی جانب نہ جائے ذہن بچوں کا مرے
اس لئے ٹی وی مرا اب شغل بہلانے کو ہے

اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ رؤف رحیم کے اندر کا شاعر آج کے حالات و ماحول سے بے بہرہ و بے نیاز نہیں ہے لیکن ایسے اشعار آٹے میں نمک کے برابر ہیں ان سے میری یہ خواہش ہے کہ وہ آٹے کو کم اور اس نمک کو زیادہ کریں جب تک مزاح میں حزن کا پہلو بھی شامل نہ ہو جائے بات دل کو نہیں لگتی ۔ دل لگتی بات کہی ہو تو دل میں اتر

جانا پڑتا ہے۔ آج حالت یہ ہے کہ ہمارا ضمیر اتنا زیادہ سو گیا ہے کہ صرف اس کو بیدار کرنا ہی کافی نہیں ہے بلکہ اس کو جھنجھوڑنا اور کچوکے لگانا ضروری اور لازمی ہو گیا ہے کیونکہ ضمیر لمبی نیند سو رہا ہے۔ سماج کو اس کا کینسر دکھانے کیلئے زخموں کو کرید کر ہرا کرنا ضروری ہے ورنہ ہمارا یہ کینسر زدہ سماج اپنی بیماری پر توجہ نہیں کرے گا۔ ان مسائل کے ذمہ دار سرطان آلودہ ذہنوں کی چیر پھاڑ ضروری ہے۔

یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ ایک شخص فاقہ کشی سے مرجاتا ہے اور ایک شخص بہت زیادہ کھانے سے جاں بحق ہوتا ہے۔ ایک شخص کا پیٹ اس لئے خالی ہے کہ اس کی جیب خالی ہے۔ لیکن ایک بھری ہوئی جیب والا شخص اسلئے بھوکا ہے کہ اسے ڈاکٹروں نے کھانے سے منع کیا ہے ایک غریب مفلس و نادار شخص سے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے ڈھانچہ نما، دق زدہ جسم کو فربہ کرنے کے لئے وٹامن آمیز غذائیں استعمال کرے اور زیادہ سے زیادہ کھانا کھائے لیکن ایک دولتمند شخص کو منع کیا جاتا ہے کہ وہ موٹاپے کو کم کرنے اور اپنے جسم کو سڈول رکھنے کے لئے کچھ نہ کھائے، ڈائیٹنگ کرے۔

یہ ہے ہمارا سماج جو تضاد سے بھرپور ہے، جہاں انسان اور انسان کے درمیان تفاوت اور عدم توازن ہے جہاں کوئی مساوات نہیں۔ اسی فرق، تفریق اور افراط و تفریط کو دور کرنے کیلئے شاعر و ادیب جہادِ قلم کرتے ہیں اور ان میں رؤف رحیم بھی شامل ہیں جو نئی نسل کی صف میں سب سے آگے ہے۔

رؤف رحیم اس حقیقت سے بھی واقف ہیں کہ دکھی دلوں کو ہنسانا بھی کارِ خیر ہے جب آدمی کا دل دکھتا ہے تو وہ ہنستا ہے۔ اور دکھی دل کی ہنسی کبھی کبھی زمانے میں انقلاب کا سبب بھی بن جاتی ہے۔

زندہ دلوں کی تنظیم زندہ دلانِ حیدرآباد نے اس کتاب کو شائع کیا۔ کتابیں تو شائع ہوتی ہیں لیکن سب سے بڑا مسئلہ ان کی نکاسی کا ہے۔ یہ ہم سب کی ذمہ داری ہے یہ کوئی مشکل بھی نہیں ہے کیونکہ اردو کی کتابیں بہت سستی ہوتی ہیں اردو کے نام پر دوسروں کو کوسنے کی بجائے ہم پہلے اپنے گریبانوں میں منہ ڈالکر دیکھ لیں۔ ایک مہینے میں ایک کتاب ہی سہی اگر آپ جب گھر میں اردو کی کتاب لیجائیں تو بچے پہچان لیں کہ یہ اردو کی کتاب ہے ایسا زمانہ خدانہ کرے آئے کہ جب بچے اردو کی کتاب دیکھ کر یہ نہ سمجھیں کہ یہ کہیں چینی یا جاپانی زبان تو نہیں۔

رؤف رحیم کی عزت افزائی مت کیجئے اس سے کتاب نہیں بکتی بلکہ ہمت افزائی کیجئے جس سے کتاب بکتی ہے تاکہ وہ ایسے ہی کئی اور مجموعے شائع کرنے کی ہمت کر سکیں۔

●●

وقار خلیل (حیدرآباد)

دلاور فگار کی شاعری

ایک تاثر

اردو ادب میں طنز و مزاح کی روایت ۱۸۵۷ء سے روشن چلی آرہی ہے۔ انگریز سامراج کے خلاف جدوجہد میں اودھ پنچ میگزین کے کارٹونی اور طنزیہ لہجے کی تحریروں نے برٹش سامراج کی سازشوں کو بے نقاب کیا۔ اکبر الٰہ آبادی کی طنزیہ شاعری نے ہندوستانی مزاج اور شعور کو اپنے قدیم ورثے کی افادیت کا احساس دلایا۔ غرض اردو کا دامن طنز و مزاح کے شہ پاروں سے مالا مال رہا۔

عہد جدید میں معروف طنز و مزاح کے شاعروں میں حیدرآباد کے مرزا شکور بیگ، پٹنہ کے رضا نقوی واہی اور یوپی کے معروف شاعر دلاور فگار اپنے شگفتہ لب و لہجے، طنز و تبسم کی کاٹ اور قادر الکلامی کے باعث برصغیر ہند و پاک میں بے نہایت شہرت اور مقبولیت کے حامل ہیں۔

دلاور فگار کا پورا نام دلاور حسین ہے ۸ر جولائی ۱۹۲۹ء کو بداؤں میں پیدا ہوئے۔ آپ نے آگرہ یونیورسٹی سے فارسی میں بدرجۂ اول اور اسی جامعہ سے معاشیات میں ایم اے کی ڈگریاں حاصل کیں۔ انگریزی میں ایم اے پری ویس بھی کیا۔

دلاور فگار کے کئی شعری مجموعے چھپ چکے ہیں، حیدرآباد سے شامت اعمال اور خدا جھوٹ نہ بلوائے، شائع ہو چکے ہیں، دیگر منظوم تخلیقات میں ستم ظریفیاں، آداب عرض، مطلع عرض ہے اور انگلیاں فگار اپنی قابل ذکر ہیں۔

۱۵ر مئی ۱۹۶۶ء کو زندہ دلان حیدرآباد نے دلاور فگار کو ہند پاک کانفرنس کے موقع پر مشاعرہ کی صدارت کے لیے مدعو کیا تھا۔ اس مشاعرہ کا منظوم صدارتی خطبہ آج بھی طنز و مزاح کا ستھرا ذوق رکھنے والوں کو یاد ہے۔ اس خطبۂ صدارت کے یہ چند شعر ملاحظہ ہوں:

یہ طنز و مزاح کے مزائل ⁂ بیکار نہ جانے پائیں زائل

یوں بزم میں قہقہے لگاؤ   خوابیدہ جو ہیں انھیں جگاؤ
بوسیدہ روایتوں کو توڑو   پارینہ حکایتوں کو چھوڑو
آؤ کہ ادب سے کام لیں ہم   گرتے ہوئے فن کو تھام لیں ہم
یہ زندہ دلی ہے قابلِ داد
اے زندہ دلانِ حیدرآباد

ان اشعار میں روانی، بلاغت اور قادرالکلامی کی لہریں موجزن ہیں۔ یہیں نہیں طنز و مزاح کے فرق و آداب پر بھی شاعر نے مدلل تبصرہ بھی کیا ہے۔

دلاور فگار کی ایک طویل نظم ادبی انٹرویو ہے، سوالات بصورتِ نظم نریش کمار شاد نے مرتب کیے اور دلاور فگار نے منظوم جوابات سے اس انٹرویو کو زعفران زار بنایا ہے، اپنے نظریۂ شعر کو فگار نے سلیقے سے نظم کیا ہے یہ چند شعر سنیے:

ہے وہی شعر قدر کے قابل   جس کو سن کر تڑپ اٹھے دل
جس میں انسان کی صفات نہیں   شاعری اس کے بس کی بات نہیں
میری ہر نظم بالضرورت ہے   میرا پیغام آدمیت ہے
خواہ ہندو ہوں یا مسلماں ہوں   میری کوشش ہے لوگ انساں ہوں
آہ کو واہ میں سموتا ہوں   دوسروں کو ہنسا کے روتا ہوں

آہ کو واہ میں سمونے اور دوسروں کو ہنسا کر رونے کا فن بڑا ریاض چاہتا ہے۔ یہ سب کے بس کی بات نہیں۔ دلاور فگار کی پوری شعری حیثیت ریاض سے عبارت ہے۔ اخبار میں چھپی ہوئی معمولی خبر سے وہ اپنی طنزیہ نظم کے لیے مواد تلاشتے اور اپنے فنی و فکری ذہانت سے اسے شاہکار بنا دیتے ہیں۔ ایک مشہور نظم موسیقی سے علاج ہے۔ جسے دلاور فگار نے اخباری نیوز سے اخذ کیا ہے۔ اس میں طنز پورے شباب پر نظر آتا ہے۔ یہ چند شعر جو کسی تبصرے کے محتاج نہیں ہیں ملاحظہ فرمایئے:

اب مداوائے مرض ہو گا نئے انداز سے
اب ہوالشّافی کی آواز آئے گی ہر ساز سے

نامور قوال پورے ڈاکٹر ہو جائیں گے
صرف سازندے جو ہیں کمپاؤنڈر ہو جائیں گے

تھرمامیٹر کی جگہ منہ میں لگا کر بانسری
ڈاکٹر دیکھے گا کیا حالت ہے اب بیمار کی

حضرتِ اجمل کے جادو کا اثر زائل ہوا
آدمی فیاض خاں کے آرٹ کا قائل ہوا

قبض کے مارے ہوئے بیمار کو کر دو خبر
ایک ٹھمری میں ہے اطریفل زمانی کا اثر

ایسے اخباروں میں شائع ہوں گے ایسے اشتہار
جملہ امراضِ خصوصی کی دوا طبلہ ستار
ضعفِ معدہ ہے تو مسِ نگن کی قوالی سنو
خشک کھانسی ہے تو نظمِ حضرتِ حالی سنو
کیا ضروری ہے کہ پیچش کی دوا ہو اسپغول
ادویہ تو اور بھی ہیں بین باجا، بینڈ ڈھول
اختلاجِ قلب کی واحد دوا ہے آج کل
بیگل اتساہی سے سنیے اے مری جانِ غزل
اس طرح نسخہ لکھے گا چارہ ساز نبض بیں
دادرا دس بار، ٹھمری دو عدد اک بھیرویں
صبح دم مثلِ شکیلہ مشقِ قوالی کنند
خاکِ پائے مشتری بائی بوقتِ شب خورند

دلاور فگار کی مقصدی اور طنزیہ نظموں میں طوالت کے باوصف کہیں سپاٹ پن نہیں ملتا۔ نظم جیسے جیسے آگے بڑھتی ہے اس کا اثر و لطف بڑھ جاتا ہے۔ انگریزی الفاظ کو دلاور فگار اپنی نظموں میں اس عمدگی اور روانی سے برتتے ہیں کہ وہ اس آرٹ کے موجد اور خاتم بھی ہیں۔ ایک قطعہ سنیے، اردو کے صدرِ شعبہ کے لباس پر کس عمدگی سے طنز کیا ہے:

اک یونیورسٹی میں کسی سوٹ پوش سے
میں نے کہا کہ آپ ہیں کیا کوئی سارجنٹ
کہنے لگے کہ آپ کو معلوم ہی نہیں
آئی ایم دی ہیڈ آف دی اردو ڈپارٹمنٹ

اردو میں پیروڈی کی روایت کو بہت سے شعرا نے روشن کیا ہے اور علامہ اقبال کے شکوہ و جوابِ شکوہ پر کئی پیروڈیاں لکھی گئی ہیں۔ دلاور فگار نے بھی خوب صورت پیروڈی تخلیق کی ہے۔ آج کے جمہوری ماحول میں گھپلا بازی عام ہوگئی ہے اس پر ذیل کے دو بند میں طنز کیا گیا ہے:

کیا کہا بہرِ مسلماں ہے فقط وعدۂ آب — اپنے ہی دل سے ذرا پوچھ لو تم اس کا جواب
کتنا پانی گیا برباد لگا دو تو حساب — پیاس کیسے بجھے جب شہری کی نیت ہے خراب
روڈ کے نل پہ بھی تم قبضہ جما لیتے ہو
کیسے شہری ہو کہ ٹونٹی بھی چرا لیتے ہو

ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں — اور جو سائل ہیں وہ امداد کے قابل بھی نہیں
یعنی اس قوم کو احساسِ مسائل ہی نہیں — جس سے تعمیر ہو شہری کی یہ وہ گل ہی نہیں

کوئی شہری ہو تو ہم شان کئی دیتے ہیں
ڈھونڈنے والے کو کوٹھی بھی نئی دیتے ہیں

پڑھے لکھے اور ڈگری ہولڈر نوجوانوں کی بے روزگاری ایک اہم مسئلہ ہے۔ دلاور فگار نے نوجوان بے روزگاروں کو مخاطب کرتے ہوئے اس باب میں وقوع پذیر مسائل پر گہرا طنز کیا ہے:

اے نوجوانِ بے عمل — مایوس کیوں ہے آج کل
سروس نہیں ملتی تجھے — سر دیں یہ لعنت بھیج دے
ایم اے کی ڈگری پھاڑ دے — گردِ نحوست جھاڑ دے
بازار میں مجمع لگا — کرتب دکھا، پیسہ کما
یہ بھی نہیں منظور گر — جینے کی یہ تدبیر کر
ہو جا الیکشن میں کھڑا — بن جا سیاسی رہنما
نعرہ لگانا سیکھ لے — اُلّو بنانا سیکھ لے
پبلک کو اپنے ساتھ لے — اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے
رشوت کا کاروبار کر
پبلک کا بیڑا پار کر

ملاوٹ کا چلن آج زندگی کے ہر شعبے میں عام ہے، خالص شئے بازار میں دستیاب نہیں، ایک بند سنیے، طنز کے انداز پر سر دھنیے:

دورِ آمیزش ہے کوئی چیز بھی خالص نہیں
تیل مصنوعی، بٹر امپیور، گھی خالص نہیں
اس ملاوٹ کا بھلا ہو آدمی چکر میں ہے
موبل آئیل پیٹ میں، ہے وہائٹ آئیل سر میں ہے

دورِ آمیزش ہے اب چیز نہیں ملتی ہے کھوٹ
حسن کی پاکٹ میں ہیں زرِ عشق کی انٹی میں نوٹ

فانی کی مشہور غزل پر دلاور فگار کی خوب صورت پیروڈی کی مثال ان چند اشعار کے تناظر میں ملاحظہ ہو:

جنھیں روٹی نہیں ملتی وہ دس بچوں کے ابا ہیں — یہ افلاس اور یہ جوشِ جوانی دیکھتے جاؤ
غریبوں کے لیے روشن امیدوں کے دیے تو تھے — مگر مارے گئے ہم درمیانی دیکھتے جاؤ
فگار اس دور میں بھی طنزیہ اشعار کہتا ہے
تم اس شاعر کی آشفتہ بیانی دیکھتے جاؤ

اب آخر میں چند اور پیروڈی کے اشعار ملاحظہ ہوں:

دین آدھا رہ گیا ایمان آدھا رہ گیا — تول کر دیکھا تو ہر انسان آدھا رہ گیا

وہ سمجھتا تھا کہ یہی اشرف المخلوق ہے — آدمی کو دیکھ کر شیطان اُدھا رہ گیا

سبھی حالی سے ہوئی غالب کی دوگنی منزلت — ہاں مگر مرحوم کا دیوان آدھا رہ گیا

چور صاحب آپ کو تکلیف تو ہوگی ضرور

یہ بھی لیتے جائیں جو سامان آدھا رہ گیا

طنز و مزاح کی پوری شاعری کو دلاور فگار نے اپنے فکر و شعور اور تخلیقی مزاج سے بلندیوں سے ہم کنار کیا ہے اور سسکتے روتے، بلبلاتے ماحول اور معاشرہ کو غور و فکر اور اصلاح سے آشنا کیا ہے۔

زیرِ لب

منتخب اشعار

اس عنوان کے تحت ہر مہینہ قارئین کی پسند کے اشعار شائع کیے جائیں گے

(ادارہ)

محمد نورالجبیر صابری، رانچی

ہم ایسی کل کتابیں قابلِ ضبطی سمجھتے ہیں
کہ جن کو پڑھ کے لڑکے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں (اکبر الہ آبادی)

سارہ تزئین مہدی - حافظ بابا نگر حیدرآباد

اپنی آشفتہ مزاجی پہ ہنسی آتی ہے
دشمنی سنگ سے اور کانچ کا پیکر رکھنا

—

آئے جو میری لاش پہ وہ رُوئے بے نقاب
سب محوِ دیدِ حسن ہیں میت اٹھائے کون

—

جو پہونچی تم نے بھیجی تھی وہ پہونچی ہم تلک پہونچی
مگر پہونچی تو یوں پہونچی کہ پہونچی تک نہیں پہونچی

خالد بن سعید، حیدرآباد

دانت اپنے ہو گئے اپنے کس کو بولوں کیا کروں — اک بچاری منہ میں ہے سو ان نے ہلتا نئیں سکتے (اعجاز حسین کھٹا)

تجلی کوثر صابری، رانچی

ایگزیبیشن ہے ترقی یافتہ ملکوں کی کل — آپ اپنے ملک سے مہنگائیاں لے جائیے (قمر الزماں قمر)

خط دے کے

(مراسلے)

محترم المقام!

سلام مسنون۔

کل حرم میں آپ یاد آگئے۔ مقام ابراہیم کے یہاں بیٹھا خانۂ کعبہ پر نظریں جمایا آپ کے لیے اور آپ کے اہل و عیال کے لیے دعا کرتا رہا۔ اللہ قبول فرمائے۔ آمین

سید عباس متقی مکہ معظمہ

جناب دلیپ سنگھ صاحب کی مجلس مشاورت میں شرکت یقیناً شگوفہ کی تازگی کا باعث ہوگی۔ ان کی ادارت میں بڑا خوب صورت ماہنامہ "ہندوستانی تناظر" شائع ہوتا ہے جو ثقافتی اور معلوماتی مواد پر مشتمل ہوتا ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ وزارت خارجہ اسے اور زبانوں کے ساتھ اردو میں بھی شائع کرتی ہے۔ اردو والوں کا کام ہے کہ اس کی خاطر خواہ پذیرائی کریں۔

غیاث قریشی اورنگ آباد

جناب ایڈیٹر صاحب!

ماہنامہ شگوفہ، حیدرآباد، بھارت، یہاں کی انفارمیشن لائبریری میں آپ کا موقر جریدہ نظر نواز ہوا۔ جیسے حد پسند آیا اور آپ سے رابطہ قائم کیے بغیر نہ رہ سکا۔ کیوں کہ اس دیش میں کوئی اردو رسالہ یا جریدہ تو کیا کوئی اخبار تک میسر نہیں آتا۔ میں اور میرے احباب ایسا معیاری رسالہ پڑھنے کے خواہش مند ہیں۔

محمد عابد حسین، ڈھاکہ

جناب ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال صاحب

گزشتہ دنوں آپ کا ماہنامہ شگوفہ اس وقت نظروں سے گزرا جب میں ڈاکٹر خلیق انجم کے پاس اردو گھر دلی میں بیٹھا ہوا تھا۔ ماہنامہ نہایت ہی دلکش اور دلچسپ ہے اس کی تحریر بھی بہت اچھی ہے:

اللہ کرے زور قلم اور زیادہ

وادی جنت بے نظیر جو کچھ وقت سے جہنم زار کا نقشہ پیش کرتی ہے میں ہندوستان کے رسائل بہت کم آتے ہیں۔ اس لیے اس بات کا کوئی علم نہیں رہتا کہ اردو زبان کی ترقی و ترویج کی خاطر کون کون سے رسائل رواں دواں اپنی منزل کی طرف ہمہ تن مصروف ہیں۔

طارق محی الدین "مدیر چنار"
سری نگر

شگوفہ ماہ مئی و اپریل ۹۲ء نگاہوں سے ہر دو شمارے گزرے۔ کئی رنگوں کے قہقہہ آمیز مضامین و کلام، (غزلیں و نظمیں قطعات وغیرہ) پڑھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ خاکسار کے دو مزاحیہ غزلوں کے انتخاب کا بھی شکریہ۔ کاش یہ بجہ نافن کار بھی اسی اوج پر پہنچ جاتا جس بلندی سے سارے ہندوستان و بیرونی ممالک میں قہقہوں کی بارش ہو رہی ہے اور امروز و شب ہو رہی ہے۔ اس خدمت طنز و مزاح میں ادارہ، زندہ دلان حیدرآباد قابل صد مبارک باد ہے۔ اس مشکل فن کے رہنمائے عظیم، یہ زندہ مردہ حضرات ہیں۔ اکبر الہ آبادی، شوق بہرائچی، ماچس لکھنوی، احمق پھپھوندوی، دلاور فگار، راہی نقوی پٹنہ، آیا فازی پوری، سلیمان خطیب، نذیر دہقانی، جملہ بہاراں شاعر و ادیب، زندہ دلان حیدرآباد خصوصاً جناب حمایت اللہ و اسمٰعیل ظریف وغیرہ۔ یہ حضرات بجائے "پھول" اپنے شعروں سے عوام کا ناشتہ درست کر رہے ہیں۔

بے حس الہ آبادی، حیدرآباد

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

ماہنامہ

شگوفہ

حیدرآباد

جلد ۲۵ شمارہ ۷

جولائی ۱۹۹۲ء

ایڈیٹر:
ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

ایڈیٹر اعزازی: عابد معز

خصوصی نمائندے:

بمبئی — فیاض احمد فیضی
دوبئی — غلام نجم الدین
آسٹریلیا — سید نعیم حسینی

کتابت: محمد غالب ۔ فضل محمد
طباعت: دائرہ پرنٹنگ پریس چھتہ بازار۔

مجلسِ ادارت:

مضطر مجاز
محمد حمایت اللہ
صلاح الدین نیر
طالب خوندمیری

مجلسِ مشاورت:

بھارت چند کھنہ
نریندر لوتھر
مجتبیٰ حسین
یوسف ناظم
دلیپ سنگھ

فی پرچہ: [illegible] روپے
زرِ سالانہ: ۷۰ روپے
بیرونِ ممالک: ۲۰ ڈالر

خط و کتابت و ترسیلِ زر کا پتہ:

ادارہ شگوفہ معظم جاہی مارکیٹ حیدرآباد

فون: 521064 [illegible]

اِس تھیلی کے چٹے بٹے

(فہرست)

زود پشیمان ــــ (مکالمہ)

مال مفت (انشائیے)

یہ ہے بلبیے مری جان

مالِ مسروقہ (ڈائجسٹ)

پوسٹ مارٹم (تنقید)

چورن (منظومات)

رضا نقوی واہی
پٹنہ (بہار)

ٹیلی ویژن

عام معنوں میں جسے ٹیلی ویژن کہتے ہیں
عمرو عیار کی زنبیل کی اولاد ہے یہ
اک ابا لہول جو آہن کی پٹاری میں ہو بند
ایک دجال جو ہے برق کے گھوڑے پہ سوار
جامِ جم اس ستمِ ایجاد کا جدِ اعلیٰ
بی جمالو نے اسے اپنی طرح پالا ہے
اس کے معدے کو کرشموں کا ذخیرہ کہیئے
نقش، اخلاص کی قدروں کا مٹایا اس نے
منتشر اس کے قدم سے ہے سماجی ماحول
صبح سے رات گئے تک وہ مچائے اودھم
کبھی فلمیں ہیں، کبھی ناچ، کبھی ناٹک ہے
منتظر چلئے کے ہیں آپ، مگر گھر والے
عید کے روز کوئی آیا ہے ملنے کے لیے
کوئی بیمار ہے، بازار سے لانی ہے دوا
"آئے عشاق، گئے" وعدۂ فردا لے کر
چترہار کا سرِ شام کھلے جب بھنڈار
ماسٹر جی بھی اسی خول میں رہتے ہیں گھسے
دیگچی چھوڑ کے چولھے پہ ملازم، ماما
والدِ محترم و امی و باجی و بھیا
انکل اقبال نے لقمہ دیا، آئی آواز

ایڈیٹ باکس، اُسے ناقدِ فن کہتے ہیں
دورِ حاضر میں نئی جنتِ شداد ہے یہ
کھولیے اس کی گرہ اور لگائے وہ زقند
کرتا رہتا ہے کمیں گاہ سے ذہنوں کا شکار
اور اسی رشتے سے لاسلکی ہے اس کی خالہ
اس نے اخلاق توازن میں خلل ڈالا ہے
چلتے پھرتے ہوئے سایوں کا جزیرہ کہیئے
اچھے اچھوں کو بد اخلاق بنایا اس نے
ایک اک گھر میں نظر آئے نراجی ماحول
سامنے نظروں کے ہو تاک دھنا دھن پیہم
بے تکی سی کسی لیڈر کی کبھی بک بک ہے
سامنے ٹی۔وی کے صف بستہ ہیں گھیرا ڈالے
اور سب لوگ نظاروں میں ہیں گم لب کو سیئے
فلم بینی میں ادھر ذہن ہے گھر بھر کا لگا
متوجہ نہ ہوا گھر کا کوئی فرد و بشر
اسٹڈی روم سے دوڑ آتی ہے بچوں کی قطار
بول گانوں کا وہ دہراتے ہیں خوش ہو ہو کے
دیکھنے کے لیے آجاتے ہیں یہ ہنگاما
سب پہونچ جاتے ہیں کرتے ہوئے ہی ہی ہو ہو
"ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز

چند روزہ صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے
اس کے دربار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے"

...سرخرو چمچے ہوئے

وقت نے کروٹ جو بدلی نقشے یوں الٹے ہوئے
سرنگوں دیگیں ہوئیں اور سرخرو چمچے ہوئے

پیٹتے رہتے تھے جو بچپن میں مجھ کو بے قصور
وائے قسمت آ گئے چل کر وہ مرے حلقے ہوئے

پیشگی پیسے پر چل ہی تھا ہر پرچے کے ساتھ
امتحاں کے ہال میں تقسیم جب پرچے ہوئے

آپ نے بھی کچھ سنا میخانے میں کل کیا ہوا
حضرت ناصح پڑے تھے فرش پر اکڑے ہوئے

دوسروں کو وعظ کہتے تھے تو لاغر ہی رہے
نیتا بنتے ہی ہمارے شیخ جی دنبے ہوئے

اک طرف جلسے میں بیبیوں لوگوں کی کشتی رہی
خدمت انساں کے اک جانب بڑے چرچے ہوئے

اس قدر بدلا زمانے نے الکشن کا مزاج
ہر گلی کوچے کے ممبر شہر کے غنڈے ہوئے

یہ تو سچ ہے سارے مذہب دیتے ہیں درس خلوص
نام پر مذہب ہی کے لیکن کئی بلوے ہوئے

نصف شب مجھ کو پولیس والے پکڑ کر لے گئے
دشمن جاں ہجر میں آخر مرے نالے ہوئے

سابقہ لطف و کرم کا شکریہ حضرت مگر
آج تیور دیکھے ہم نے آپ کے بدلے ہوئے

اپنی محرومی کا اے اعجاز کیا شکوہ کریں
چشم و ابرو کے تصدق سیکڑوں وعدے ہوئے

اعجاز وارثی (سنبھل)

منہ پھٹ (ناگپور)

جنتا اگر نہ جاگے تو ایسے جگائیے
راتوں میں انقلاب کے نعرے لگائیے

سالوں کی فوج آئے تو مت منہ لگائیے
پائے پکائیے نہ کلیجی پکائیے

جس پارٹی میں مال ملے، مرتبہ ملے
اس پارٹی میں آ کے غریبی بھگائیے

تم سے تو میرے گھر کو سجایا نہ جا سکا
اب ہو سکے تو مقبرہ میرا سجائیے

کہتی ہیں اب کے عید گوا میں منائیں گے
بیگم کے اس خیال کے قرباں جائیے

بچوں کو پھینکنے کا پٹکنے کا شوق ہے
اپنے گھروں میں کانچ کے برتن نہ لائیے

شاید سدھار اس سے کلرکوں میں کچھ تو ہو
تصویر آفسوں میں گدھوں کی لگائیے

سنتا نہیں ہے کوئی تو کوئی چھاپتا نہیں
تعویذ اپنی اپنی غزل کی بنائیے

منہ پھٹ ہے مارکیٹ کا مسجد میں اہتمام
اب ہو چکی نماز مصلیٰ اٹھائیے

محمد عظمت اللہ
(کراچی)

فرشتوں کو بھی موت آجائے گی

(ایک مکالمہ)

(فرشتہ ایک تازہ قبر میں داخل ہوتا ہے۔ اور قبر میں نووارد مزدور یونین کی لیڈر، سوشیل ورکر مرحومہ سے سوالات کرنے لگتے ہیں)

فرشتہ: خاتون میں فرشتہ ہوں اب آپ میرے سوالات کا جواب دینے کے لیے تیار ہو جائیے۔

مرحومہ: اے نامحرم فرشتے تجھے پردے کا کوئی پاس نہیں۔

فرشتہ: محترمہ کیا وہ آپ نہیں تھیں جب آپ تمام نامحرم مزدوروں کے ناجائز مطالبات کو منوانے کو مزدوروں کے ہم ضمیر کے ساتھ نعرے لگاتے ہوئے ایک پٹ سن مل کے اعلیٰ افسر کے کمرے میں داخل ہوئی تھیں اور چیخ چیخ کر بے چارے آفیسر کو برا بھلا کہہ رہی تھیں اور میز پر کھڑے ہو کر لیڈری کر رہی تھیں حتیٰ کہ میز پر چڑھ کر اپنے پیروں اور جوتوں سے زور زور سے مار کر میز کے شیشے کو چکنا چور کر دیا تھا اور انتظامیہ کے خلاف نازیبا نعرے لگا رہی تھیں اس وقت آپ کو پردے کا خیال نہیں آیا۔

مرحومہ: مجھے [illegible] سے پہلے ملک میں [illegible] کا عمل میں جانا شروع کر دیا تھا اور اپنے گناہوں کی معافی اور پردے کی پابندی شروع کرنے والی تھی کہ موت کے فرشتے نے مہلت ہی نہیں دی۔

فرشتہ: بہرحال ہمیں جو حکم ملتا ہے ہم اس کو بجا لاتے ہیں۔

مرحومہ: اسے حکم کے بچے۔ ہمیں بھی اللہ کا حکم ہے کہ پردہ کریں۔ نامحرم سے بات نہ کریں۔

فرشتہ: مرحومہ یہ دنیا نہیں قبر ہے۔ یہاں آپ کو اپنے کیے کا حساب دینا ہوگا۔ یہاں آپ کا احتساب ہوگا۔

مرحومہ: ہم احتساب سے نہیں ڈرتے۔ ہم اپنی زندگی میں کچھ نہیں تو چالیس سال سے احتساب احتساب ہی سنتے آئے ہیں مگر احتساب نہیں ہوتا۔ کیا یہاں بھی وہی چکر چل رہا ہے۔ خیر جانے دو ان باتوں کو مجھے یہ بتاؤ تم نے بغیر دستک دیے، بغیر اجازت کے اندر آنے کی جرات کیسے کی۔

فرشتہ: ہمیں آپ سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں۔
ہم جس کی قبر میں چاہیں بغیر دستک دیئے اندر چلے
جاتے ہیں ہمیں اجازت ہے پوچھ گچھ اور تفتیش کی
مرحومہ: جس پوچھ گچھ کی اجازت ہے اور کیا چھاپہ مارنے
کے اختیارات بھی؟
فرشتہ: جی تو ہمارے فرائض میں شامل ہے۔
مرحومہ: پھر تم میں اور پولیس والوں میں کیا فرق ہے؟
فرشتہ: اوہ کہاں وہ، کہاں ہم۔ ہم تو صرف پوچھ گچھ
ہی کر سکتے ہیں ہاتھ نہیں لگا سکتے۔ خیر آپ ہمیں
پولیس ہی سمجھ لیجیے۔
مرحومہ: اگر پولیس ہی سمجھا جائے تو کیا تمہارے پاس زنانہ کانسٹیبل
کی طرح زنانہ فرشتے نہیں ہوتے؟
فرشتہ: اللہ تعالیٰ نے عورت کو پیغمبر اور فرشتہ نہیں بنایا۔
مرحومہ: تم فرشتے ہو، اللہ کا تمہیں قرب حاصل ہے۔
کیا تم بتا سکتے ہو کہ عورت کو فرشتہ نہ بنانے میں
باری تعالیٰ کی کیا مصلحت پوشیدہ ہے۔
فرشتہ: اللہ کی مصلحت اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ ہمارا
قیاس ہے عورتیں چونکہ مسلسل کام نہیں کر سکتیں۔
وہ باتیں بہت کرتی ہیں۔ چھٹیاں بھی بہت مناتی
ہیں جب کہ ہم فرشتے مسلسل کام کرتے رہتے ہیں۔
مرحومہ: مسلسل کام۔ مسلسل کام سے کیا تمہیں اوور ٹائم ملتا ہے۔
فرشتہ: نہیں ہمیں کوئی اوور ٹائم نہیں ملتا۔
مرحومہ: ظالم بدھو فرشتوں پر گویا بہت ظلم ہو رہا ہے۔
کیا یہاں کوئی لیبر ڈائرکٹر نہیں ہے۔
فرشتہ: جی نہیں ہے۔
مرحومہ: کیا تم نے کوئی یونین نہیں بنائی؟
فرشتہ: اب تک تو نہیں بنائی۔
مرحومہ: خیر میں تم لوگوں کی مدد کرتی ہوں اور ایک یونین
بنا دیتی ہوں۔
فرشتہ: آپ تو باہر کی دنیا والی ہو پھر آپ ہماری یونین
کیسے بنا سکتی ہو۔
مرحومہ: ہمارے ہاں تو یہ سہولت ہے۔ باہر کے لوگ بھی
کا فیکٹری سے، مل سے، کام سے کوئی تعلق نہ ہو، وہ
وہی لوگ یونین بناتے ہیں۔ اسی طرح میں بھی
تم لوگوں کی یونین بنا دوں گی۔
فرشتہ: اگر کوئی اس کو نہ مانے تو۔
مرحومہ: تو تم لیبر کورٹ میں چلے جانا۔
فرشتہ: یہاں تو لیبر کورٹ بھی نہیں ہے۔
مرحومہ: خیر پہلے تم ہڑتال کی تیاری کرو۔ سب ٹھیک
ہو جائے گا۔
فرشتہ: ہمارے سردار نے ایک دفعہ ہڑتال کی تھی تو وہ
راندۂ درگاہ ہو گیا۔
مرحومہ: کچھ بھی ہو اس کو آزادی کی نعمت تو ملی اب وہ جو
چاہتا ہے کرتا پھرتا ہے۔
فرشتہ: آپ کے ملک کو بھی آزادی ملی۔ آپ لوگ بھی
جو چاہتے ہیں وہ کرتے ہیں۔ آپ لوگ آزاد ہیں۔
قانون سے، قاعدوں سے، اصولوں سے، عقائد سے
نظریے، مذہب سے، شرافت سے، روایت سے
حتیٰ کہ اپنے دین سے۔ ایسی آزادی جس میں عیش نہیں
عیاشی کی جاتی ہو، کوئی بھی تعمیری کام نہ ہوتا ہو تو
پھر انسان میں اور شیطان میں فرق مٹ جاتا ہے۔
مرحومہ: خیر ہم کو اور ہمارے ملک کو چھوڑو۔ یہ ہمارے لیڈر
ہیں جو فرق کو مٹانے کا بیڑا اٹھائے ہوئے ہیں۔
مجھے تم یہ بتاؤ تمہارے سردار کے راندۂ درگاہ ہونے
کے بعد نئے سردار کے لیے کوئی نیا الیکشن ہوا۔
فرشتہ: یہاں الیکشن نہیں ہوتا۔
مرحومہ: فکر نہ کرو۔
"سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ"
[illegible] کے عشق کرنا چاہو تو ہم تمہیں راستہ دکھاتے
ہیں۔ یہ بتاؤ کیا یہاں ہوسٹل سیکریٹری کا کام

کرتا ہے۔

فرشتہ : یہاں سیکورٹی ہے جو سوشیل نہیں ہے، یہ سوشیل سیکوریٹی کا محکمہ کیا کرتا ہے۔

مرحوم : عیش کرتا ہے اور عیش کرواتا ہے۔ کیا تمہیں اولڈ ایج بینی فٹ ملتا ہے۔

فرشتہ : یہ کیا چیز ہوتی ہے۔

مرحوم : یہ ایک رقم ہوتی ہے جو ضعیفی میں بڑھاپے کا سہارا کہلاتی ہے

فرشتہ : کہلاتی ہے یا ملتی بھی ہے

مرحوم : اللہ بہتر جانتا ہے۔ سنتے ہیں بڑھاپے میں ملتی ہے۔

فرشتہ : ہم میں سے کوئی بھی، کبھی بھی بڈھا نہیں ہوتا۔

مرحوم : اچھا جوان، تم کتنے عرصے سے کام کر رہے ہو۔

فرشتہ : کروڑہا سال سے۔

مرحوم : پھر تو تمہارا پراویڈنٹ فنڈ بھی خاصا جمع ہو گیا ہوگا۔

فرشتہ : یہ پراویڈنٹ فنڈ کیا بلا ہے۔

مرحوم : یہ فنڈ تنخواہ سے کاٹا جاتا ہے جو لواحقین کے تقریباً خانہ بربادی کے بعد، زندگی بھر صبح سے شام تک AGPR کے دفتر کے چکر لگانے کے بعد بیوہ کی موت سے چند دن پہلے ملتا ہے

فرشتہ : محکمہ AGPR کا نام نہ لو۔ اس محکمہ سے دو اکوڑی ملازمین یہاں آئے ہوئے ہیں، ان کا حساب کتاب لینے ہزاروں فرشتے لگے ہوئے ہیں۔

وہ حساب کتاب کو اتنا لمبا کر دیتے ہیں اور ہر سوال کا جواب اتنا گھما پھرا کر دیتے ہیں کہ اللہ کی پناہ۔ البتہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کو جنت یا دوزخ میں بھیجنے کا تصفیہ کرنے میں فرشتوں کو کئی نوری سال لگ جائیں گے۔

مرحوم : خیر تم اس کو گولی مارو۔ ہم تمہیں بغیر کام کیے عیش کرنے کے آزمودہ نسخے اور طریقے بتائیں گے۔ بس تم یونین بناؤ اور ہڑتال کرو تو تمہیں سوشیل سیکوریٹی، اولڈ ایج بینی فٹ، پراویڈنٹ فنڈ، گروپ انشورنس کی رقم ٹی اے، ڈی۔ اے سب بغیر کام کیے مل جائے گا۔

فرشتہ : محترمہ کام لازوال ہے۔ مسلسل کام کرنے والا امر ہو جاتا ہے، کام عزت ہے، کام میں حرمت ہے، کام میں عظمت ہے، اگر یہاں الیکشن ہوگا لیبر یونین ہوگی، لیبر ڈائرکٹریٹ ہوگا، لیبر کورٹ ہوگا تو ہڑتال ضرور ہوگی۔ ہڑتال ہوگی تو کام نہیں ہوگا۔ کام نہیں ہوگا تو فرشتوں کو بھی موت آجائے گی۔ ●●

غزل

اطہر شیرکوٹی (پاکستان)

پیسے والے آدمی کی قدر و قیمت ہے بہت
کتنا ہی بھونڈا ہو پھر بھی خوب صورت ہے بہت

کچھ خزانے میں نہیں ہے ہم غریبوں کے لیے
اہلِ زر کے واسطے یہ مال و دولت ہے بہت

ہسپتالوں میں غریبوں کی کوئی پرسش نہیں
ڈاکٹر کی آنکھ میں سیٹھوں کی وقعت ہے بہت

ملک میں شاید جہالت ہے ضروری اس لیے
لیڈروں کی لیڈری کو اس کی حاجت ہے بہت

ہے اگر تنخواہ بابو جی کی کم تو کیا ہوا
دفتروں میں کام کم ہے اور رشوت ہے بہت

گھر میں کھانے کے لیے اک وقت کی روٹی نہیں
پر غریبوں کے یہاں بچوں کی کثرت ہے بہت

میرے پیارے شہر کی راتیں سنہری تھیں کبھی
آج کل دن کے اجالے میں بھی وحشت ہے بہت

تھا جواں تو مجھ سے بیگم جی کو بے حد پیار تھا
جب سے بوڑھا ہو گیا ہوں ان کو نفرت ہے بہت

زندگی میں دربدر کی ٹھوکریں کھاتا پھرا
قبر کی چھت کے تلے اطہر کو راحت ہے بہت

غزل

اقبال ہاشمی (حیدرآباد)

آپ سوکھی ہوئی لکڑی کو شجر کہتے ہیں
ہم اسے عارضۂ ضعفِ بصر کہتے ہیں

قبر کہنا ہو جہاں آپ خبر کہتے ہیں
اس لیے آپ کو ہم اہلِ ہنر کہتے ہیں

شعر کہنا تو کجا لکھ کے ہی دکھلا دیجیے
آپ غالب سے بڑا خود کو اگر کہتے ہیں

جس نے آنکھوں پہ چڑھا رکھے ہیں موٹے عدسے
ماہرِ چشم اسے اہلِ نظر کہتے ہیں

چائے پینے کو چلے جاتے ہیں گھر سے دفتر
اور اس سیر کو ہم لوگ سفر کہتے ہیں

آپ تعمیر کے معمار سے جل کر شاید
آج کی تازہ عمارت کو کھنڈر کہتے ہیں

ہم کو تاریخ پڑھانے پہ وہی ہیں مامور
جنگِ آزادی کو جو لوگ غدر کہتے ہیں

جس کو ہم لوگ سمجھتے ہیں طفیلی شاعر
اس کو استادِ سخن نادِ سفر کہتے ہیں

ہاشمی بات ہے اپنے لیے سیدھی سیدھی
بات ٹیڑھی بھی اگر اہلِ ضرر کہتے ہیں

ڈاکٹر ملیق صلاح
(ہیڈ ر گلبرگہ یونیورسٹی)

جانا سکندر کا آبِ حیات کی تلاش میں!

ہماری یادداشت اگر غلط نہ ہو تو یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ جو دعا بچپن میں بطورِ خاص ہم سے کروائی جاتی تھی وہ مینہ برسنے کی تھی۔ نتیجتاً ہم کو اللہ میاں کا کام سوائے مینہ برسانے کے کچھ اور نظر نہیں آتا تھا۔ کیوں کہ دعا صرف برسنے کی نہیں بلکہ نہ برسنے کی بھی کروائی جاتی تھی۔ اس لیے کوئی یہ کہتا کہ اس دنیا میں دو خدا اگر ہوتے تو کیا ہوتا؟ تو ہم فوراً جواباً عرض کرتے کہ دونوں میں لڑائی ہوتی، ایک مینہ برسانا چاہتا اور دوسرا منع کرتا۔

وہ زمانہ برسوں بعد پھر لوٹ آیا۔ ہم پھر مینہ برسنے کی دعائیں مانگنے لگے۔ نہ صرف برسنے کی دعا مانگی جاتی ہے بلکہ خزانہ آب سے جائے قیام تک پہنچنے کی عرضی بھی پیش کی جاتی ہے اور جب نل غرانے لگتے ہیں تو امید پوری ہوتی نظر آتی ہے۔

بچپن کے ساتھ ہی ایک ایک کر کے کچھ اور باتیں بھی یاد آجاتی ہیں جیسے کتے کی کہانی "ایک کہانی میں "کتا" بارش میں بیا کے گھر پناہ مانگ کر امانت میں خیانت کر گیا، اور معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ دوسری کہانی میں کتے کی پیاس کا ذکر ہے۔

"کتا" واقعی معمولی پرندہ نہیں۔ اس کا ذکر تو قرآن میں بھی موجود ہے۔ انسانی زندگی کے آغاز میں انسان نے جو درس پہلے پہل حاصل کیا اس کا معلم کتا ہی تھا مثلاً "ہابیل اور قابیل کی لڑائی" اور ان میں سے ایک کے قتل کے بعد دوسرے کو تدفین کے طریقے سے آگاہ کرنے والا کتا ہی تھا۔

ہاں تو دوسری کہانی میں کتا ایک گھڑے میں کنکر ڈال کر پانی کی سطح کو اونچا کرتا ہے۔ تاکہ پانی کی پہنچ چونچ تک یا چونچ کی پہنچ پانی تک ہو جائے۔ اس طرح کتا پانی پیتا ہے اور کہانی ختم ہو جاتی ہے۔

ہم پانی کے میٹھے کی تنگ امانی سے تمنا نہیں سکتے۔ طغیانی یا طوفان جیسے الفاظ تو خواب و خیال ہو چکے ہیں۔

پانی خطرے کی سطح تک پہنچ جائے یا اس سے اونچا بھی ہو جائے تو خوشی کا باعث ہو سکتا ہے۔ پچھلے زمانے میں لوگ اپنے گناہوں کے کفارے کے لیے سرائے بنواتے یا کنواں کھدواتے تھے اور دنیا والے ان کی عاقبت سے پہلے ہی انھیں نیکی کا سرٹیفکیٹ دے دیا کرتے تھے۔ شعرا اپنے کلام کے ذریعے خراجِ تحسین ادا کرتے تھے (دلی کے ایک مشہور شاعر احسان اللہ خاں بیان کے یہاں ایک مثنوی "تعریف در چاہ مومن خاں" کے عنوان سے ملتی ہے)۔ یہ باتیں اب بھولی بسری ہو گئیں۔ اب سرائے کہاں۔ ہمہ منزل عمارات بنانے کا دور ہے اور کنواں اوروں کے لیے نہیں اپنے لیے کھدوانا ہے۔ جسے بورویل کہتے ہیں۔

آج سے دس بیس سال قبل کی نوجوان نسل بورویل کے نام سے واقف نہیں تھی۔ آج آنکھ کھلتے ہی سمپ اور پیڈ ٹینک اور نل سے سابقہ پڑتا ہے۔ جس گھر میں کنواں ہوگا تو اس گھر کو دقیانوسی سمجھا جاتا ہے۔ لوگ اپنے عیب کو چھپانے کے لیے اسے ڈھانک کر رکھتے ہیں۔ آج ان کا پلہ بھاری ہے۔ وہ بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے گھر میں بورنگ کا انتظام کر لیا ہے۔ کنواں تو پہلے سے موجود تھا۔ صرف موٹر لگوانا پڑا۔

اردو ادب میں پانی سے متعلق بعض محاورے ایسے ہیں جنھیں عقلاً تسلیم کرنا مشکل ہے مثلاً چلو بھر پانی میں ڈوب مرنا۔ موجودہ دور کے لحاظ سے اس میں تھوڑا بہت تصرف کیا جا سکتا ہے۔ یعنی چلو بھر پانی کے لیے مرنا۔ میونسپلٹی کے نل کھلنے کے جو اوقات ہوتے ہیں اس سے کئی گھنٹے قبل Queue کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ صبح یا شام چار بجے کے وقت کا اعلان ہو تو ایک، دو بجے سے لوگ قطار در قطار، باضابطہ فوجیوں کی طرح ایک ایک ادھر ادھر سے بغیر صفیں درست کرنے لگتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ایک دوسرے کو دھکیلنے میں طاقت ور آگے اور کمزور پیچھے ہو جاتے ہیں۔ پھر اس کے ساتھ ہی لڑائی ٹھن جاتی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے موافقین اور مخالفین کی صفیں آراستہ ہو جاتی ہیں۔ اور ہتھیار کے نہ ہوتے ہوئے بھی وہ جلالی انداز کہ اس کی کمی تک محسوس نہیں ہوتی اور اندھیرے میں بعض اوقات داڑھی کو چوٹی سمجھ کر خوب مرمت کی جاتی ہے۔

اردو زبان میں مذکورہ بالا محاورے کی طرح اور بھی کئی محاورے ہیں جن کی نسبت پانی ہی سے ہے۔ مثلاً آنکھ میں پانی بھر آنا۔ پانی پلانا، آنکھ کا پانی مر جانا، گاگر تو خالی ہے اور آنکھ بھر آتی ہے۔ پانی کی قلت اس حد تک ہو گئی ہے کہ ان دنوں دفتر دریا برد نہیں، نذرِ آتش ہو رہے ہیں۔

ہمیں بعض اوقات کچھ شک سا ہونے لگتا ہے کہ ہمارے بعض شاعروں نے پیش قیاسی کی تھی یا منحوس بات زبان سے نکالی تھی۔ کیوں کہ ان کے دور میں دریا کی روانی روکنے کے لیے تبر دا آزما ہونا پڑتا تھا۔ طوفان سے نجات حاصل کرنے کے لیے منتیں مانگی جاتی تھیں۔ نذریں اور قربانیاں دی جاتیں، پھر بھی ہمارے شعرائے کرام "قطرہ میں دجلہ" کو دیکھتے تھے یا قطرۂ دریا میں انھیں دریا کی گہرائی نظر آتی تھی۔ یہ غالباً ان کا تصور تھا۔ دراصل اب قطرے سے "دریا" کی گہرائی کو ناپا جا رہا ہے یا دجلہ نظر نہ آئے تو قطرے ہی کو دریا کہنا پڑتا ہے۔

ہاں! بورویل کے سنا کہ بہت سے فائدے ہیں بعض افراد پمپ نہیں لگواتے۔ عذر کے لیے کئی بہانے ہیں۔ لیکن بات کچھ اور ہوتی ہے وہ رات میں اپنی بیویوں کو رقص کرتے ہوئے دیکھنا چاہتے ہیں یا اسے موٹاپا کم کرنے کا سب سے موثر علاج سمجھتے ہیں۔ وہ لوگ جو بہت دن بعد انھیں دیکھتے ہیں سمجھتے ہیں کہ پچھلی دفعہ جو

ملاقات ہوتی تھی وہ فلاں صاحب کی بیوی تھی اور یہ بیٹی ہے یا فلاں صاحب کی چھوٹی یا دوسری بیوی ہے۔ ماں اور بیٹی کی بات ہو تو معاملہ پیچیدہ نہیں ہوتا۔ لیکن جب کسی خاتون سے یہ دریافت کیا جاتا ہے کہ آپ دوسری بیگم ہیں تو اچھے خاصے گھر میں فتنہ کھڑا ہو جاتا ہے۔ دوست رشتہ دار محلے والے سب یہی سمجھتے ہیں ضرور دال میں کالا ہے۔

ضعیف اور کمزور افراد کا ہینڈ پمپ سے پانی حاصل کرنا واقعی جوئے شیر لانے کے مماثل ہے۔ انہیں ایک روز قبل پمپ تک پہنچنا پڑتا ہے۔ پھر وہ دوسرے دن بخیر و خوبی ایک گھڑے پانی کے ساتھ واپس لوٹتے ہیں۔ بڑی بی اپنے بڑے حضرت کے لیے ہر روز ایک نیا امام ضامن تیار کرتی ہیں کہ یہ سفر کہیں سفر عاقبت نہ ثابت ہو۔

ایک عرصہ بعد ہم اپنے شہر لوٹے، سارے چہرے اجنبی نظر آنے لگے۔ مرد بچے اور خواتین بلا تخصیص نقش فریادی . . . کے مرقعے بن گئے۔ ہمیں کچھ اپنی یادداشت کا قصور یا فتور محسوس ہوا۔ کہیں ہم کسی اور شہر تو نہیں پہنچ گئے۔ یہ تو کاشی، ترپتی یا زائرین حج کا کیمپ محسوس ہو رہا ہے۔ سب کے سر چکنے ہو گئے ہیں۔ بالآخر ڈرتے ڈرتے ہم نے اپنے ایک ساتھی سے دریافت کیا کہ یہ سب کچھ جو دیکھ رہے ہیں یا وہ خواب ہے یا حقیقت۔ تب انہوں نے بتایا کہ پانی کی قلت یہ رنگ لائی ہے۔ لوٹا بھر پانی سر کے لیے بہا دیں تو پیٹ کے لیے کیا؟ اس لیے ان لوگوں نے بہتر یہی سمجھا کہ بالوں کے جنجال سے چھٹکارا پائیں۔ یہی ایک آسان نسخہ ہے۔ "نہ رہے بانس نہ بجے بانسری"۔ اس سے مزید کچھ اور فائدے ہوئے۔ صابن اور تیل کی بھی کفایت ہو گئی۔ حجامت کے پیسے بچ گئے نہ سیلون جانے کی ضرورت ہے نہ بیوٹی پارلر ورنہ ہیر اسٹائل کی نذر ساری کمائی ہو جاتی۔ البتہ تجارتی کمپنیوں کا بہت نقصان ہو گیا ہے۔ شیمپو بنانے والی کمپنیوں کو تالا لگ رہا ہے۔ کپڑے کے بیوپاریوں اور درزیوں کے روزگار میں اضافہ ہو گیا اور شاید وگس بھی زیادہ فروخت ہو رہی ہیں۔ (بھلا ہو اس پانی کا کہ کسی کی آنکھ سے خوشی کے آنسو نکل رہے ہیں اور کوئی دکھ سے رو رہا ہے۔ بہرحال بہنے والا پانی ہی ہے) ہاں سر مونڈھنے کا دوسرا سبب یہ ہے کہ اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ "سر مونڈھتے ہی اولے پڑیں گے"۔ اسی خیال سے تھوڑا سا روان آتے ہی استرے کا ایک پھیرا اور لگوا لیتے ہیں۔

●●

غزل

خادم حسین مجاہد (پاکستان)

کتنی مشکل ہے رپٹ اپنی لکھانے کے لیے
ٹیکس دینا پڑ گیا پورے تھانے کے لیے

ڈیڑھ سو صفحوں کا الفت نامہ جب اس کو دیا
"خوب ردی ہے" وہ بولی انگیٹھی جلانے کے لیے

پاس آ کے بھی تجھے ہم چھو نہیں سکتے کبھی
ڈاکٹر بننا ہے یہ حسرت مٹانے کے لیے

میرے گھر آنا ہے تو پیدل چلے آئیں حضور
ہم گدھا گاڑی نہیں رکھتے ہیں لانے کے لیے

ڈش کلچر تھے جو لندن میں وطن میں آج کل
بن گئے ڈی سی سٹیٹس کو بڑھانے کے لیے

کیا کہیں یہ کس طرح جنگل بھی صحرا بن گئے
ہم تو لے جاتے تھے بس لکڑی جلانے کے لیے

شعر گوئی کی مجاہد جان اب تو چھوڑ دو
بس یہی کافی ہے روتوں کو ہنسانے کے لیے

غزل

محمود شریف محمود

گھر میں آنگن ہی نہیں گھر وہ مگر کہتے ہیں
گھونسلا ایک بنا لیتے ہیں گھر کہتے ہیں

اچھے اچھوں کو وہ سڑکوں پہ نچا دیتا ہے
جس کو انگور کی بیٹی کا اثر کہتے ہیں

اب کوئی عیب کہاں عیب رہا ہے یارو
لوگ پاکٹ بھی اڑانے کو ہنر کہتے ہیں

سر کا بھیجے سے تعلق ہے ضروری لیکن
جس میں بھیجا ہی نہ ہو اس کو بھی سر کہتے ہیں

ہو کے چت کہتے ہیں وہ ٹانگ مری اونچی ہے
زیر ہوتے ہیں مگر خود کو زبر کہتے ہیں

ناپ لیتے ہوئے محمود یہ درزی نے کہا
سیٹھ جی خوب ہیں کمرے کو کمر کہتے ہیں

غزل

مجیب الرحمٰن بزمی (رانچی)

پاس ہو جب مال و زر تو پھر ہنسی اچھی لگے
اس کے عارض کی چھلکتی چاندنی اچھی لگے

شہر میں جب خوب محشر خیز ہنگامے ہوئے
بند کمرے کی مجھے یہ خامشی اچھی لگے

رہنما یہ پوچھتا ہے مجھ سے جب بعدِ فساد
کیا ہوا کیسے ہوا یہ سادگی اچھی لگے

دوستوں نے ہر قدم پر جب مجھے رسوا کیا
تجھ کو اس سے دشمنوں کی دشمنی اچھی لگے

پاس آ کر بیٹھ جاؤ، کون ہو کیا چاہیے
یہ تری قاتل ادا دل کو بڑی اچھی لگے

نت نئے رستوں سے ہو جب رشوتوں کی بارشیں
تیسرے درجے کی بھی پھر نوکری اچھی لگے

یہ جہاں ہے فتنہ پرور جانیے بزمی میاں
بس انہیں مظلوم آنکھوں میں نمی اچھی لگے

شاہد صدیقی
(کلکتہ)

سیل کا چکّر

ہندوستانی تہواروں کا تعلق موسموں سے جڑا ہے۔ انھیں میں سے ہولی دیوالی بھی ہیں۔ ایک طرف ہولی گرمی کے آنے کا پیغام لے کر آتی ہے تو دوسری طرف دیوالی سردیوں کی آمد کی اطلاع دیتی ہے۔ اور یہ دونوں ہی موسم یا تہوار گھروں اور دکانوں کی گہرائی سے صفائی کا نیوتا دیتے ہیں۔ ایسے میں گھروں کی پرانی چیزیں نکال کر باہر پھینک دی جاتی ہیں۔ جو چیزیں تھوڑی بہت بھی کام کی ہوتی ہیں وہ ضرورت مندوں میں بانٹ کر کچھ دوسری دنیا کا انتظام بھی کر لیا جاتا ہے۔ اور اس طرح گھر اور زندگی دونوں میں کچھ نیا پن سا آجاتا ہے۔ یہی حال دکانوں کا بھی ہوتا ہے سو ہر بڑے تہوار پہ دکانوں کی اوور ہالنگ کی جاتی ہے۔ لیکن پرانے مال کے سلسلے میں یہاں کی صورت حال گھروں سے مختلف ہوتی ہے کیوں کہ یہاں پر پرانا مال پھینکنے کے بجائے دکانوں کے باہر بڑے سلیقے سے سجا کر FOR SALE کا سلپ لگا کر فروخت کے لیے رکھ دیا جاتا ہے۔ اس طرح وہ لوگ بھی نئے کپڑوں کے ساتھ تیوہار منانے کے اہل ہو جاتے ہیں جو پورا سال ان کی طرف ایسے دیکھتے ہیں جیسے چکور چاند کو۔

لیکن جوں جوں فیشن برق رفتاری سے بدلنے لگے ہیں نیا مال کچھ جلد ہی پرانا ہو کر باہر آنے لگا ہے۔ یورپ میں جو چیز کام کی نہیں ہوتی اسے وہاں کے لوگ گھر کے باہر رکھ دیتے ہیں۔ اب جس کو ضرورت ہو وہ اٹھا کر لے جائے۔ یہ نہ چوری نہ کہلائے نہ شرمندہ کرے۔ پھر بھی اگر فٹ پاتھ پر اس طرح کا سامان بیچارہ رہ جاتا ہے تو کوڑا گاڑی اسے لے جا کر کوڑا گھر میں ڈال دیتی ہے۔ کہتے ہیں وہاں سے وہ مال ایشیائی اور افریقی ملکوں میں بھیج دیا جاتا ہے۔ اور ایشیا میں بنگال بھی بیچارہ ایک ایسا ملک ہے جو ہمیشہ خدائی اور انسانی عذاب کا شکار رہتا ہے۔ اس لیے انسانیت کے ناطے اس طرح کا مال بنگلہ دیش بھیج دیا جاتا ہے۔ بھیجا تو وہ فری بانٹنے کے لیے جاتا ہے لیکن جعلساز [illegible] مال مفت میں تقسیم نہیں کر سکتے ہیں۔ اس لیے آج کل حال میں بیچنے کے لیے اس کی بولی لگا دیتے ہیں

اس لیے بدصورت مندوں کو ندے سے کر خوبصورت مندوں کو بیچ دیتے ہیں۔ ایسے ہی کسی مصیبت کے زمانے میں ایک بار بہت سا مال بنگلہ دیش آیا۔ اور پڑوسی ہونے کی وجہ سے وہ مال وہاں کم نکلا، ہمارے ملک زیادہ پہونچا۔ پھول کر وہ مال نیا سا لگتے ہوئے خوب صورت بھی تھا اور پائیدار بھی اس لیے ہر طبقے کی نظروں میں بس گیا اور جگہ جگہ فٹ پاتھوں پر ڈھیروں کے روپ میں نظر آنے لگا۔ اس زمانے میں بڑے بڑے شہروں کا یہ حال تھا کہ لوگ منہ اندھیرے اپنی گاڑیوں میں بالکل ویسا ہی پہونچ جاتے کہ جس طرح انگلینڈ میں کرسمس کے موقع پہ کلیرنس سیل کے زمانے میں لوگ۔ آدھی آدھی رات سے دکانوں کے سامنے ڈیرا جمائے رہتے ہیں۔ اسی طرح دن نکلتے ہی ہمارے یہاں کے بڑے بڑے بازاروں کے چوڑے فٹ پاتھوں کے آگے بھی یہی نظارہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ جہاں شام تک سامان فٹ پاتھوں پر چند ٹکڑے ہی بچتے۔ ان کاروں کی بھیڑ سے غریبوں کے ارمان کچل جاتے۔

ہاں تو بات ہو رہی تھی بنگلا دیشی سامان کی جس کی سیل اتنی بڑھی کہ اس کے آگے نئے کی قدر کم ہو گئی۔ دکان داروں سے اپنے مال کی یہ بے عزتی برداشت نہ ہوئی۔ اس لیے اپنے کاروبار کو نیا رنگ دینے کے لیے تہوار کا انتظار کرنا چھوڑ دیا۔ اور موقع بے موقع جگہ بے جگہ سیل کا اہتمام کرنے لگے اور اپنے مال پر بھاری قیمت کی پرچی لگا۔ اس پر پٹا کر اس کو بنا، قیمت گھٹا کر لکھنے کا ایک چلن بنا لیا لیکن اس میں اس بات کا خیال رکھا کہ منافع میں کوئی فرق نہ آئے۔ اپنے سامان کو بیچنے کے لیے دکان داروں نے دوسرا حربہ یہ اختیار کیا کہ ہفتوں پہلے الیکشن کی طرح اس سیل کی اتنی پبلسٹی کرتے کہ شہر کا بچہ بچہ اس کے بارے میں جان جاتا۔ اب تو شہر کا وہ کم پرانا طریقہ تو تقریباً ختم ہو چلا ہے کہ جب رکشا میں لاؤڈ اسپیکر لگا کے سڑکوں پر اعلان کیا جاتا تھا اب تو اس کی جگہ ریڈیو اور ٹی وی نے لے لی ہے۔ پبلسٹی کے لیے میڈیا کے استعمال کا اس سے صحیح مصرف کیا ہوگا اور کسی بھی چیز کی خوب پبلسٹی کرنا تو اب ایک فیشن ہی نہیں۔ دکان داروں اور خریداروں کی ضرورت بھی بن گیا ہے کیوں کہ اس طرح کی کلیرنس سیل کی ضرورت جتنی دکان داروں کو ہوتی ہے۔ اس سے کہیں زیادہ خریداروں کو۔ لوگ باگ تو ایک سیل کے بعد دوسری کا انتظار اسی روز سے کرنے لگتے ہیں جس دن پہلی تاریخ ختم ہوتی ہے۔ اس کی اصل وجہ شاید یہ ہے کہ سیل اب فٹ پاتھوں سے اٹھ کر فائیو اسٹار ہوٹلوں کی زینت بن گئی ہے۔ جہاں داخل ہونے کے لیے عام آدمی کو عام حالات میں اپنے پرس کا کئی بار جائزہ لینا پڑتا ہے۔ لیکن سیل کے بہانے ایک اچھے فائیو اسٹار ہوٹل کو دیکھنے کا موقع بھی مل جاتا ہے۔ رہا سوال خریداری کا تو یہ اپنی پسند اور جیب پر منحصر ہوتا ہے اور گارڈن نے تو سیل کی فیلڈ میں سبھی کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ اب تو جسے دیکھو وہی گارڈن گارڈن نظر آتا ہے ہمارے ایک جاننے والی نے تو وہاں سے اتنا مال خریدا کہ سب لوگ انھیں گارڈن والی کہتے ہیں۔

آج کل سیل کے فیشن نے اتنا زور پکڑا ہے کہ ایک زمانے میں پرانا مال خریدنے کا ٹھیکہ صرف کباڑی کے پاس ہی تھا۔ لیکن اس سیل بازی نے پرانی چیزوں کی خریداری کے شوق کو ایسی ہوا دی ہے کہ اب فریش چیزوں کی طرف طبیعت راغب ہی نہیں ہوتی۔ اب تو اخبار میں بھی نظریں اسی کالم کو ڈھونڈتی ہیں جہاں سیل لکھا ہوتا ہے اور وہ سیل چاہے کپڑوں کی ہو یا جوتوں کی ــ کام کی چیزوں کی ہو یا غیر ضروری اشیا کی۔

بہت بچنے کے باوجود بھی آخر کار ہم بھی اس کا شکار ہو ہی گئے۔ ہوا یہ کہ ایک دن ایک اشتہار پہ نظر پڑی جس پر لکھا تھا۔ ایک جرمن لیڈی اپنے ملک واپس جا رہی ہے وہ اپنا سارا سامان بیچنا چاہتی ہے جن حضرات کو امپورٹیڈ سامان سے خاص لگاؤ ہو وہ اس پتے پہ رابطہ قائم کریں۔ اس اشتہار کو دیکھ کر اور یہ سوچ کر ہماری آنکھوں میں چمک آ گئی کہ سستے میں اپنی گرہستی امپورٹیڈ سامان سے سج جائے گی۔ دوسرے دن پہ رعب پڑنے کا سوانگ اور بہم نوری کوششوں کے ساتھ اپنے شوہر کو وہاں چلنے پر آمادہ کر لیا۔ تنخواہ کیوں کہ ایک دن پہلے ہی ملی تھی اس لیے ان کے پاس بھی پیچھا چھڑانے کا معقول بہانا نہیں تھا۔ امپورٹیڈ سامان سے تھوڑا بہت لگاؤ تو انھیں بھی تھا کیوں کہ جب بھی ان کا کوئی دوست باہر جاتا تو وہ پرفیوم کی فرمائش کرنا نہ بھولتے اور ان کسیل میں ہم کوئی ساڑھیاں لینے تو جا نہیں رہے تھے جو انکار کی گنجائش ہوتی۔ یہاں تو کامن انٹرسٹ کی بات تھی۔ اس لیے وہ بھی تیار ہو گئے۔

اگلے دن صبح جب ہم وہاں پہنچے تو ہم سے بھی زیادہ بے تاب لوگ وہاں پہلے سے موجود تھے۔ کسٹمر کو پھنسانے کے لیے دکان دار جس طرح مختلف حربے استعمال کرتے ہیں یہاں بھی معاملہ کچھ ایسا ہی تھا۔ یعنی انتظار کرنے والوں کے لیے لان میں کرسیاں بھی پڑی تھیں اور کمرے میں پانی کا بھی انتظام تھا۔ ان تیاریوں کو دیکھ کر سامنے چائے والے کی دکان پر بھی چائے کے ساتھ ساتھ گرم گرم سموسے اور جلیبیاں تلی جا رہی تھیں۔ کافی خوش گوار اثر ڈالا ان سب چیزوں نے۔ ٹھیک دس بجے کمرے کا دروازہ کھلا جس میں سے جرمن لیڈی برآمد ہوئی ساتھ ایک انڈین ہاتھ میں رجسٹر تھامے سکریٹری کے فرائض انجام دینے کے لیے تیار تھا۔ جرمن لیڈی ہندوستانی لہجے میں جرمن بولنے کی کوشش کر رہی تھی۔ لیکن سکریٹری جرمن اسٹائل میں ہندوستانی بول رہا تھا۔ نتیجتاً دونوں کی باتیں ہی سمجھ سے بالاتر تھیں۔ اس لیے ہم نے انٹرنیشنل زبان (اشاروں کی زبان) میں بات کرنا شروع کر دی۔ جس میں انھیں بھی آسانی ہو ——— اور ہمیں بھی ——— اندر قدم رکھا تو دیکھا کہ سارا ہال غیر ملکی اشیا سے بھرا ہوا تھا۔ کراکری۔ کٹلری۔ ٹی وی۔ ٹیپ ریکارڈر، ٹی وی۔ وی سی آر، برتن، کپڑے، فرنیچر، تھرماس، میک اپ کا سامان، پرفیومس غرض کہ ہر طرح کی ضروری اور غیر ضروری چھوٹی، بڑی ہر شے وہاں موجود تھی۔ نظریں ایک چیز کو جی بھر دیکھ بھی نہ پاتیں کہ دوسری پر پھسل جاتیں۔ کیا لیں، کیا چھوڑیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

ہم دونوں ہی پہلے سامان کی طرف دیکھتے اور پھر ایک دوسرے کو (اور وہ یقیناً اپنے پرس کو بھی چھو کر دیکھتے ہوں گے) ہر ہر چیز کو دیکھ کر ہم بول اٹھتے یہ بھی لے لیں، وہ بھی جس پر وہ دھیرے سے ہمارے کان میں پھونک دیتے کہ ان ہی پیسوں میں پورا مہینہ گھر کا خرچ بھی چلانا ہے اس لیے جو بھی لینا سوچ سمجھ کر۔ اور ہم اپنا دل مسوس کر یہ سوچتے رہ جاتے کہ کاش ہماری لاٹری ہی نکل آتی تو آج یہ ساری چیزیں ہمارے گھر کی رونق بڑھا رہی ہوتیں۔ خیر بہت۔ سوچ بچار کر دل کو اور پرس کو قابو میں رکھ کر ہم لوگوں نے ایک ٹیپ ریکارڈ، ایک گھڑی، کچھ پرفیومس اور چھوٹی موٹی دو چار چیزوں پر ہی اکتفا کیا۔ ٹیپ ریکارڈ کے ساتھ اس نے انگلش گانوں کا ایک کیسٹ ہمیں فری دے دیا۔ یہ سب چیزیں لے کر ہم خوشی خوشی گھر ایسے لوٹے جیسے قلعہ فتح کر آئے ہوں۔ راستے میں

دلچسپ آم یہ سوچ کر خرید ڈالے کہ "مینگو شیک" بنا کر مکسی کا افتتاح کریں گے۔ بلکہ اس لیے خریدی کہ گانوں کی آواز سن کر جب پڑوسی آئیں گے تو انھیں کھلائیں گے اور گانے سنا سنا کر جلائیں گے۔ (اس کے لیے کچھ غزلوں اور گانوں کے کیسٹ بھی خرید ڈالے جس سے پڑوسی کو پتہ چل جائے کہ میوزک سے لگاؤ صرف انھیں ہی نہیں ہمیں بھی ہے۔ کیوں کہ جب سے ان کی بہو جہیز میں ٹیپ ریکارڈر لے کر آئی تھی تب سے انھوں نے دن و رات زور زور سے بجا بجا کر ہمارا کافی خون جلایا تھا۔

گھر پہنچ کر سب سے پہلا کام ہم نے یہ کیا کہ کونے والی ٹیبل سے بوسیدہ سا ریڈیو اٹھا کر اسٹور میں ڈالا، ٹیبل پر نیا کور بچھایا اور سیل میں خریدا سارا سامان اس پر سجا دیا اور گانا سننے کے لیے جوں ہی ٹیپ ریکارڈر کا پلگ آن کیا تو بھک کی آواز کے ساتھ ٹیک، پنکھا، بجلی، ہر چیز بند ہو گئی۔ ہم سمجھے لائٹ چلی گئی ہے اس لیے تھوڑی دیر صبر کیا لیکن شام ڈھلے جب باہر نکل کر دیکھا تو گھر گھر دیوالی جیسا روشن تھا اور اپنا گھر غریب کی کٹیا بنا تھا۔ گھبرا کر ان سے کہا ذرا پتہ لگائیے کیا بات ہے۔ انھوں نے موم بتی کی روشنی میں سوئچ چیک کیا تو معلوم ہوا فیوز اڑ گیا ہے۔ خیر فیوز جوڑا اور پھر سے ٹیپ ریکارڈر آن کرنے کی کوشش کی لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ ادھر ادھر ہلایا ڈلایا، کافی بیٹھ تھپتھپانے کے بعد وہ چل ہی پڑا۔ ہم خوش اپنا من پسند گیت سننے کے لیے اور (محلے والوں کو سنانے کے لیے) پورے والیوم پر اسے کھول دیا اور صوفے پر لیٹ کر گانوں کا لطف لینے اور محلے والوں کا انتظار کرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد ہمیں سناٹے کا احساس ہوا۔ آنکھیں کھول کر دیکھا ٹیپ بند پڑا تھا۔ ہم سمجھے ایک سائیڈ پورا ہو گیا ہے۔ کھول کر دیکھا تو ٹیپ اس میں پھنسا تھا۔ اب اس سے جوجھنے کا دم ہم میں نہ تھا۔ اس کے بارے میں مزید انکوائری اگلے دن کے لیے اٹھا کر رکھ دی۔ سوچا "مینگو شیک" کا ہی مزہ لیا جائے۔ ساری تیاریوں کے بعد جب مینگو شیک بنانے کے لیے مکسی کا استعمال کرنا چاہا تو اس میں سے ایسی بھیانک آواز نکلی جیسے پن چکی چل رہی ہو۔ ہم حیران، الٰہی یہ ماجرا کیا ہے۔ محلے میں سبھی کے پاس مکسی ہے ایسی آوازیں تو کہیں سے نہیں آتیں۔ یہ دونوں ہی تجربے ایسے تھے کہ اور سامان دیکھنے کی ہمت نہ ہوئی۔

اگلے دن جب دونوں چیزیں ریپیر کے لیے لے گئے تو پتہ چلا کہ وہ لوکل میڈ ہیں، اور اس سے بھی چونکا دینے والی خبر یہ ملی کہ وہ جرمن لیڈی اپنے کسی کام سے یہاں آ کر سال سال اور چھ چھ مہینے رہتی ہے اور استعمال کے لیے سستی سستی چیزیں یہیں سے خریدتی ہے اور جب جانے لگتی ہے تو "میڈ ان جرمنی" کی مہر لگا کر خوب منافع کماتی ہے۔

اس سانحے کے بعد "فار سیل" لفظ سے ہمیں ایسی چڑ سی ہو گئی ہے کہ اب جب بھی اس قسم کے بورڈ پر نظر پڑتی ہے تو ہم اپنی نظریں فوراً گھما لیتے ہیں۔

یوسف امتیاز (ٹورنٹو کینیڈا)

نام میں کیا رکھا ہے

نام میں کیا رکھا ہے کہہ دینا تو بہت آسان ہے مگر ذرا غور کریں کہ اگر نام نہ ہوتا تو غالباً موجودہ کمپیوٹر کی زبان میں خطاب کیا جاتا یا پھر نمبر لگا دیئے جاتے ۔ اگر سچ پوچھو تو نام ہی سب کچھ ہے اگر نام نہ ہوتا تو نام لیوا بھی نہ ہوتا صرف ضمیر لیوا ہوتا ۔ یہ نام ہی تو ہے جو بعض اوقات بہت طویل ہوتے ہیں ۔ یہاں تک کہ آج کل کمپیوٹر کے خانہ پُری والے BOXES میں بھی سما نہیں پاتے اور پھر اگر نام پڑھے نہ ہوتے تو درشن بھی چھوٹے نہ ہوتے ۔ صرف بھولی صورت ہوتی اور دل کھوٹے ہوتے ۔ سارا جھگڑا تو صرف نام ہی کا ہے کہ اس کم بخت نام کی بدولت لوگ کیا کچھ نہیں کر جاتے ۔

کہتے ہیں کہ نام ہی سے شناخت ہوتی ہے اسی نام سے محبت بھی ہوتی ہے اور نفرت بھی یہ ایک ایسا قلعہ ہے جس کے باہر رہنے والے اندر آنا چاہتے ہیں اور اندر رہنے والے باہر جانا ۔ بالکل شادی کے حصار کی طرح نام کمانے کی خواہش کسے نہیں ہوتی بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ نام تو ہو جاتا ہے مگر کمائی صفر ۔ نام ہونے کے ساتھ اس کی بیماریاں بھی لگ جاتی ہیں جب نامور ہو گئے تو اٹھنا بیٹھنا مشکل ہو گیا پیچھے سدا اطراف گھومتے رہتے ہیں آزادی سے آجا نہیں سکتے ۔ پلٹ کر دیکھنا پڑتا ہے کہ کہیں کوئی دیکھ تو نہیں رہا ہے ۔ یہ نام ہی تو ہے جس کے لیے لوگ جھوٹی شان جتاتے ہیں گھر کی ہر چیز فروخت کر دیتے ہیں ۔ بیوی کا زیور رہن رکھا جاتا ہے ۔ اسی نام کی خاطر بڑی بڑی دعوتیں دی جاتی ہیں چاہے بعد ازاں گھر کے برتن پر پڑے ہی کیوں نہ کر رہے ہوں ۔ کہنے کو تو کہتے ہیں کہ بد اچھا بدنام برا مگر ایسی بدنامی کے طفیل جادوگری کی جا سکتی ہے ، ڈنڈے کا زور بتلایا جا سکتا ہے ۔ دھونس جمائی جا سکتی ہے سب زمانہ تبدیل ہو گیا ہے ۔ بعض وقت ایسا بھی ہوتا ہے کہ اسی بدنامی کی وجہ سے کتابیں چھپ رہی ہیں فلم بنائے جا رہے ہیں ۔ کہانیاں لکھی جا رہی ہیں اور گھر بیٹھے دولت آ رہی ہے ۔

ذرا ماں باپ کی مثال لے لیجیے کہ ان کے نزدیک لڑکی کی شکل بھوتنی جیسی ہی کیوں نہ ہو مگر اسے کوثر، زلیخا، سندری، مہ جبیں اور انجیلا ANGELA جیسے نام دیے جاتے ہیں اور اگر لڑکا ہوا تو کیا کہنے چاہے وہ کتنا ہی بدصورت، سیاہ فام کیوں نہ ہو ماں باپ اسے چاند، چندر، قمر، اختر، ہلالی نام دے کر اپنے سینے سے لگا لیتے ہیں چاہے باہر والے اس کو تانتے کا چاند، نظر توڑ جیسے ناموں سے کیوں نہ نوازیں۔ یہاں تک کہ اولاد کو لوگوں کے دیے ہوئے نام یا خود سے نفرت کیوں نہ ہونے لگے۔ بعض اوقات یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ لوگوں کے نام امیر چند، امیر علی، نواب بیگم، لکشمی دیوی دولت رائے، دولت خاں، رئیس احمد، راجکمار پرنس، کنگ، بادشاہ خاں، شہنشاہ حسین، شہزادی بیگم تو ہوتے ضرور ہیں اور شاید ماں باپ نے ایسے نام رکھ کر تاثیر بھی سوچی ہوگی کیا پتہ اس کا مستقبل بھی نام کی طرح چمک دار ہوگا۔ کسی کا نام خوش حال سنگھ ضرور ہو سکتا ہے مگر قسمت نے اوجو خوش حالی کبھی قریب سے ہو کر گزری ہو۔ ساری زندگی افلاس، غربت، غلامی تنگ دستی ہی میں بسر ہو جاتی ہے اور نام ایک بھیانک خواب کی طرح آگے پیچھے گھومتا ہی رہتا ہے۔ کاش نام رکھنے سے پہلے سو فی صد صحیح پیشین گوئی بھی ہو سکتی ورنہ نام کچھ اور تاثیر کچھ۔ کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا ہے کہ نام تو ہوا منصف خاں مگر ساری عمر مجرموں کے کٹہروں یا جیل کی سلاخوں کے پیچھے گزر جاتی ہے۔ ان کا کچھ نہ پوچھیے جن کے نام سوریا، سنہا، شمشیر سنگھ، شیر خاں ہوتے ہیں پر دل اتنا کمزور کہ اندھیرے میں ہلکی سی آہٹ کے ساتھ ہوش و حواس باختہ ہو جاتے ہیں آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا جاتا ہے اور ساتھ ہی لباس اتنا بھیگ جاتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ ابھی ابھی لباس کے ساتھ نہا کر باہر آگئے ہوں۔ ہاتھوں کے طوطے اڑ جاتے ہیں۔

قدیم ریاست حیدرآباد دکن کے اسکولوں میں حساب کے کورس کی کتابوں کے مولف کا نام تھا محمد فاضل اور ہندوستان، پاکستان میں قمیص کی جیب میں ایک یا کئی قلم رکھنے کا فیشن عام ہے۔ جاہلوں اور بے وقوفوں کے لیے اب تک حیدرآباد میں یہ مثل مشہور ہے، "پڑھے نہ لکھے نام محمد فاضل"۔

بعض اوقات یہی نام عہدے کے ساتھ کچھ اس طرح چسپاں ہو جاتا ہے کہ مستقل مذاق بن کر رہ جاتا ہے۔ ہندوستان کی مرکزی کابینہ میں ایک وزیر تھے ـــ جگ جیون رام۔ وہ آزادی سے پہلے وائسرائے کی کونسل میں وزیر ریلوے تھے اور تقسیم کے بعد بھی یہی وزارت ان کی قسمت میں آئی۔ ان کے دور وزارت میں ریل کے اتنے حادثات ہوئے کہ ان کو وزارت چھوڑنی پڑی مگر یار لوگوں نے ان کے نام کی تختی کچھ اس طرح کر دی تھی کہ مسافر جب بھی سفر کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جگ چھوڑ رہے ہیں۔ جیون خطرے میں ہے اور ہونٹوں پر رام رام ہے۔ ایک زمانے میں ایک اور سیاست داں تھے جن کا نام تو پٹھان تھا مگر توبہ کرو اگر ذرہ جسمانی اور ذہنی اعتبار سے ...... پٹھانیت ان کے پاس سے ہو کر گزری ہو۔ ایک اور نیتا تھے جن کی جانب داری کی شکایت عام تھی نام ان کا تھا پھول چند۔ لوگوں نے ان کے نام میں کچھ اضافہ اس طرح کر دیا۔ پھول چند کانٹے زیادہ۔

آدمی اور اس کے مختلف رینکس Ranks میں ایک خاص رعب اور خاص دبدبہ ہے جس سے بے باکی، نڈر پن اور اقتدار کی بو آتی ہے۔ کیا آپ نے کبھی غور کیا کہ سکھوں کے پاس یہی Ranks آزادی کے ساتھ نام کے لیے استعمال کیے گئے ہیں جوان اور حوالدار سنگھ سے لے کر کپتان اور جرنیل سنگھ سب ہی موجود ہیں۔ بعض دفعہ تو

صرف نام سے کسی کی ایک خاص تصویر ابھر کر آگے آجاتی ہے جیسے تیمور خاں، پرتھوی راج کا نام سنتے ہی چھ فیٹ سے اونچا قد، دو سو پونڈ کا مضبوط گٹھیلا جسم، بڑی بڑی مونچھیں جو سوا نو بجا رہی ہوں۔ ذہن میں آتی ہیں۔ لیکن اس نام کے بعض لوگ مچھندر اور لکڑی کا پہلوان ہوتے ہیں جو صرف ایک پھونک سے ہوا میں اڑ جائیں۔

انگریزی زبان میں ایک اظہار بیان ہے NAME OF THE GAME ہوائی کمپنیوں کا نام بھی ایک کھیل بن سکتا ہے چاہے مکمل نام ہو یا صرف INITIAL یونائیٹڈ اسٹیٹس میں آئے دن ایرلائینس کمپنیاں کھلتی بھی ہیں اور بند بھی ہو جاتی ہیں۔ اکثر بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو نگل جاتی ہے۔ بعض ایرلائنس کی شرح بہت دلچسپ ہے مثلاً ٹی ڈبلیو اے T.W.A. کے لیے TEY WALKING ACROSS مشہور تھا۔ اور ساتھ ہی THE WORST AIR LINES یا پھر THANK WE'RE ALIVE نارتھ ویسٹ نارتھ ویسٹ اورینٹ ایرلائنز کے لیے NO WAY AROUND NOT WORKING ابھی کچھ عرصہ پہلے PANAM کا دیوالیہ نکل چکا ہے۔ لوگ واقعی سوچ رہے ہوں گے کہ اب تک ایسا کیوں نہیں ہوا تھا اور اگر ہوا تو کیوں اس بات میں کتنی سچائی، بھی کہا ANOTER MISTAKE ..... PLEASE APOLOGIZE NOW ایسٹرن اپنے زمانے کی بڑی کمپنی تھی جس کی پالیسی تھی EVERY PLANE STARTS TODAY EXCEPT RIGHT AWAY ایلیگنی ALLEGHNY کو لوگ پیار سے AGONY کہتے ہیں۔ یو ایس ایر US AIR کی شرح ہوئی USELESS AIR — ریپبلک کو پائلٹوں نے REPULSIVE کر ڈالا اور ساؤتھ ویسٹ کی گت SOUTH WORST کر دی گئی۔ ویسٹرن کو WORSE THAN WESTERN کے نام سے یاد کیا جانے لگا۔ موجودہ یونائیٹڈ کو UNTTED کر دیا گیا۔ قدیم برطانوی ہوائی ادارے کی BOAC کی تاریخی اہمیت تھی BRING OVER AMERICAN CASH یہ تو کچھ ان ایرلائنز کی بات تھی جو اس دنیا میں نہیں رہے۔ اب ان کے بارے میں بھی سن لیجیے جو آج بھی فضاؤں میں پرواز کر رہی ہیں کچھ کامیاب اور کچھ ناکام اور بعض کو حکومتوں کا سہارا ہے۔

ایک بار پوپ نے TWA سے سفر کیا تو کہا جانے لگا TRAVEL WITH ANGELS فلپائن ایر لائنز PAL کے لیے کہا جاتا ہے PLANE ALWAYS LATE مگر جب سے کارکردگی میں ترقی ہوئی اور جہاز خریدے گئے۔ سروس میں اضافہ ہوا تب سے یہ کہا جانے لگا PLANES ALWAYS LATE برٹش ویسٹ انڈیز ایرلائنز BWIA کو کہا جاتا ہے BUT WILL IT ARRIVE جاپانی ایرلائنز JAL امریکہ کی موجودہ معاشی اور سیاسی صورت حال کا آئینہ ہے JEALOUS AMERICA LOVES۔ اسکینڈی نیویا کی SAS کا مطلب ہے SLOW + STOP پاکستان انٹرنیشنل ایرلائنز PIA کے لیے درخواست ہے PLEASE INFORM ALLAH اس کی دوست حریف ایئر انڈیا AI جواب دیتی ہے ALLAH INFORMED چین کی اشتراکی ایر لائن CAAC کے معنی ہوئے CAN ANYONE ANYWHERE CARE۔ اسپین کی قومی ایرلائنز کا نام ہے آئبیریا IBERIA مطلب ہے I BELIEVE EVERYONE REGRETS IT یا پھر مسافروں کی I BET EACH ROW IS ASSIGNED تعریف میں۔ ہنگری کی ایرلائنز MALEV کے لیے MAKING ANOTHER LOUSES ENDLESS VACATION

ایران ... ڈر کے کیا کہتے - I RUN AWAY NOW

جب ۱۹۴۹ء میں پیسفک ساوتھ ویسٹ ایرلائنز نے اڑنا شروع کیا اس وقت امریکہ کے دو نیوی کے اڈوں کے درمیان آمد و رفت تھی تب پی ایس اے (PSA) POOR SAILOR AIR LINE بن گئی۔ اب حالات تبدیل ہو گئے ہیں - اس لیے اس کی تشریح بھی بدل گئی ہے اب یہ PRETTIEST AIR STEEWARDESSESS AROUND بن گئی ہے۔ کے ایل ایم KLM کے لیے KEEP LOVING ME ملیشیائی ایر لائنز MARVELOUS AIR SERVICE کے لیے مشہور ہے۔

لوگوں کو اپنے گھر کے نام رکھنے کا بہت شوق ہے چاہے وہ نام گھر سے مناسبت رکھتے ہوں یا نہیں کون پرواہ کرتا ہے کہ کھنڈروں کو WHITE HOUSE کا نام دے دیا گیا۔ مکان میں چاہے گھٹنوں برابر خود رو گھاس ہی کیوں نہ اگ آئی ہو۔ چاہے گدھے وہاں لوٹتے ہوں یا ہری گھاس سمجھ کر چرتے ہوں مگر اس کا نام VISTA ضرور دیا گیا ہے۔ گھر چاہے کسی گڑھے ہی میں کیوں نہ ہو وہ بالا حصار کہلایا۔ فیض احمد فیض نے کیا خوب کہا:

تم کوئی اچھا سا رکھ لو ویرانے کا نام

آخر نام اپنی ذاتی پسند ہے جب تک رجسٹرڈ نہ ہو کسی کی جاگیر یا اجارہ داری تو نہیں۔ آخر نام تو نام ہی ہے نام میں کیا رکھا ہے۔ کیونکہ:

فیض ان کو ہے تقاضائے وفا ہم سے جنہیں
آشنا کے نام سے پیارا ہے بیگانے کا نام



قراقرم میں آج کل ٹوپیوں کا فیشن



قانون کی پابندی میں صرف ایک چینی

پرویز یداللہ مہدی

یہ ہے بامبئی میری جان

اِس لائن کے ہاتھوں سے ہرگز نہ مفر دیکھا

بمبئی واسیوں کے تعلق سے دیگر دیس واسیوں کا عام خیال یہ ہے کہ یہاں نچلے اور متوسط طبقے کے افراد کی آدھی زندگی لائین میں لگنے اور باقی زندگی لائین مارنے میں کٹ جاتی ہے غلط فہمی کی وجہ چاہے جو بھی ہو اس بہتان کا ازالہ ضروری ہے جہاں تک بمبئی والوں کی لائین لگنے کی عادت کا سوال ہے اس سے ہمیں قطعی انکار نہیں اس تعلق سے دیگر ارباب کرم کا خیال بڑی حد تک درست ہے۔ اب رہی لائین مارنے کی بات تو بقول شاعر ــ "کچھ تو ہوتے ہیں محبت میں جنوں کے آثار"

"اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنا دیتے ہیں"

اس کے مصداق اس میں حقیقت کی آمیزش کم اور افسانہ کا طمع زیادہ ہے یوں بھی آدمی لائین اس وقت مارتا ہے جب اسے دیگر لائینوں میں لگنے سے فرصت ملے اور بمبئی میں آدمی کو سب کچھ ملتا ہے صرف فرصت نہیں ملتی۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہاں لائین مارنے پر سخت پابندی عاید ہے ہو سکتا ہے کہ کبھی کبھار یہاں تہاں چند افراد لائین میں کھڑے لائین مارنے کے "ناشائستہ فعل" کے مرتکب ہوتے ہوں لیکن حضور لائین مارنے کا یہ عرصہ حیات اکثر نقطہ لمحاتی ہوتا ہے بالکل بے موسم برسات کی صورت اور کالی بارش کی طرح معمولی سا چھڑکاؤ ہلکی سی جھڑی کہیں بڑی کہیں نہیں پڑی۔ اب آپ ہی کہیے چند مشتبہ افراد کی قابل گرفت حرکات و سکنات کی بنیاد پر ایک کلیہ بنا کر ہزاروں لاکھوں بے گناہ معصوم افراد پر لائین مارو ہونے کا لیبل لگا دینا سراسر زیادتی ہے کہ تہمیں بمبئی میں بفضل تعالیٰ قدم قدم پر آدمی کا پالا ہمہ اقسام کی چھوٹی بڑی لائینوں سے پڑتا ہے اور اس سلسلۂ قطار اندر قطار کا آغاز علی الصبح سویرے آنکھ کھلتے ہی بیت الخلاء عرف سنڈاس کی لائین سے ہوتا ہے چاہے بیت الخلاء پرائیویٹ لمیٹیڈ ہو یا پبلک پراپرٹی ہر جگہ کیو سسٹم یہاں کے باشندوں کا مقصد ہے بالخصوص جھونپڑپٹی کے اجتماعی لیٹرین کے صدر دروازے پر صبح سویرے لوٹا بردار مردوں کی لمبی لائنیں ایسا دلخراش منظر پیش کرتی ہیں کہ اگر کوئی تازہ وارد بمبئی یہ ہیبت ناک سین دیکھ لے تو کم سے کم اپنے کلائمکس کو پہنچ جائے۔

یہاں یہ بات خالی از دلچسپی نہیں ہوگی کہ یوں تو بیت الخلاء دیکھنے میں تو سیدھا سادا ہے۔ مگر استعمال میں ذرا پیچیدہ ہو سکتا ہے تاہم اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان پبلک فراغت گاہوں میں مزدوری ضد کو کوئی

تکلیف دہ اسی اختیار کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے تو روزمرہ والا ہی ہوتا ہے صرف استعمال کے آداب ذرا مختلف ہوتے ہیں۔ یعنی صدائے عرفت مزدور منتظر کا مستقل طور پر بیکار سے بھرنا یا کھٹکانا ضروری ہے کیونکہ کثرت استعمال کی وجہ سے ان بیت الخلاء کے دروازے کے لیے محروم ہو چکے ہوتے ہیں۔ اسطرح مستقل طور پر اپنی موجودگی کا احساس دلاتے رہنے سے مزدور منتظر بیرونی حملوں کی یلغار سے محفوظ رہتا ہے۔ معاف کیجئے گا، شاید اس کی لائن کی بات کرتے کرتے ہم خواہ مخواہ آپ کو بیت الخلاؤں کے اندرونی کرائف کی سیر کرا لائے ہیں۔ آیئے دیگر لائنوں کی طرف واپس چلیں اس زور دار بیت الخلائی "بوسٹ شاٹ" کے ساتھ ہی باقاعدہ شوٹنگ کا آغاز ہو جاتا ہے جس ڈگ ڈاک پر لوکیشن (LOCATION) بدلتے چلے جاتے ہیں۔ یعنی دودھ کی لائن، پانی کی لائن، راشن کی لائن، بس کی لائن، آٹو رکشہ ٹیکسی کی لائن عوامی ٹیلیفون کی لائن دفتر کے لفٹ کی لائن غرض یہ کہ لائنوں کا یہ سلسلہ، لامتناہی پو پھٹنے سے جو شروع ہوتا ہے تو رات کا آخری گجر بجنے تک، گھڑی کے کانٹوں کی طرح مسلسل گردش میں رہتا ہے صرف رات کے پچھلے پہر چند گھنٹوں کیلئے منقطع ہوتا ہے اگلی صبح پھر اس سلسلہ روز و شب نقش گر حادثات کا آموختہ شروع ہو جاتا ہے لائنوں کا یہ سلسلہ اس وقت تک مکمل نہیں ہوگا۔ جب تک کہ اس میں ان لائنوں کا ذکر خیر نہ شامل ہو۔ جن سے آدمی کا سابقہ روز تو نہیں پڑتا، کبھی کبھار ہی پڑتا ہے اور جب پڑتا ہے تو آدمی آیت الکرسی یا ہنومان چالیسہ پڑھتا ہے کیونکہ ان لائنوں میں پہلے ہی سے لگے ہوئے پریشان حال لوگ زبان حال سے یہی مژدۂ جاں فزا سناتے ہیں کہ ؎

ہماری لائنوں میں آؤ کہ ہم دکھائیں تمہیں
قضا تمہاری کہ تم پا کہو یقینی ہے

یہ خطرناک لائنیں دراصل آسمانی سلطانی قسم کی ہوتی ہیں۔ جیسے سرکاری و نیم سرکاری ہسپتالوں میں مریضوں کو بھرتی کرانے کی پرچی بنانے کی لائن، دوا کی لائن، مسجدوں، مندروں، گرجاؤں میں دعا کی لائن، پیروں فقیروں، سادھوؤں سنتوں، بابا لوگوں سے گنڈے ڈھکے، تعویذ، پلیتے لکھوانے کی لائنیں وغیرہ وغیرہ۔

بمبئی میں لائنوں کے جال بچھانا چلن کی سب سے بڑی اور بنیادی وجہ یہ ہے کہ یہاں وسائل محدود اور مسائل و مسائل لا محدود ہیں یہ درست ہے کہ کیو سسٹم سے مسائل سلجھنے کی بجائے اور الجھتے ہیں پریشانیاں کم ہونے کی بجائے اور بڑھتی ہیں اس کے باوجود کیو سسٹم کے فیضان سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً کیو سسٹم کی وجہ سے آدمی میں نظم و ضبط کا مادہ پیدا ہو سکتا ہے۔ سب سے فائدہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی آزاد نظم اور پابند نظم کے فرق کو اچھی طرح سمجھنے لگتا ہے۔ کیو میں مسلسل و متواتر کھڑے رہنے کی وجہ سے اس کے رگ پٹھے مضبوط ہوتے ہیں۔ قوت ارادی دو چند ہوتی ہے۔ کیو سسٹم میں صرف یہ خرابی ہے کہ آدمی کا نظم و ضبط آدمی کے روزمرہ نظام الاوقات کو درہم برہم کر دیتا ہے۔ یہاں صرف وہی خوش نصیب کیو سسٹم سے اعلیٰ اور متوسط دونوں طرح سے مستفید ہوتے ہیں جو فیملی پلاننگ کے قائل نہیں ہوتے گویا ان اصحاب کی رائے میں لائنوں سے کما حقہ استفادہ صرف ایسی صورت میں اٹھایا جا سکتا ہے جب گھر میں تھوک کے حساب سے بچوں کی لائن لگی ہو۔ اس کی بہترین مثال ہمارے ایک پڑوسی ہیں جنہوں نے بچوں کے اعداد و شمار کے اعتبار سے اولاد کی قطار لگا رکھی ہے چنانچہ صبح ہوتے ہی اپنی کل اولاد کو ڈھور ڈنگر کی طرح مختلف لائنوں کی طرف ہانکتے ہیں اور یوں دودھ کی لائن، پانی کی راشن کی لائن، بس کی لائن سے بیک وقت بھرپور استفادہ کر سکتے ہیں۔ [illegible] صرف ان کی بنیادی ضروریات ہی پوری ہوتی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

------ بلکہ بچوں کو ہمہ اقسام کی لائینوں میں لگا کر خود مزید بچوں کی لائین لگانے میں جٹ جاتے ہیں لیکن جن کم نصیبوں کو یہ سہولت حاصل نہیں وہ بیچارے ایک چکر ہے میرے پاؤں میں زنجیر نہیں کے مصداق ایک لائین سے دوسری لائین دوسری سے تیسری لائین میں دھکے کھاتے ہوئے اپنی ہی آنکھوں اپنی الف لائین عرف حیات کا دھود کو کٹتا ہوا دیکھتے ہیں اور کچھ کر نہیں پاتے اسی لئے بمبئی کے طول و عرض میں جگہ جگہ نظر آنے والی مختلف النوع لائینوں عرف قطاروں کو دیکھ کر زبان پہ بے اختیار یہ شعر آجاتا ہے ہے ۔

اس لائین کے ہاتھوں سے ہرگز نہ مفر دیکھا
اتنی ہی بڑی ہیئت جتنا کہ ادھر دیکھا

••

چھیڑ غالب سے

لڑکیاں سکرین کے پردے پہ عریاں ہوگئیں
فلمی دنیا کے حسیں بزنس کی پریاں ہوگئیں

بے کسئیِ عشق کا اس طرح عنواں ہوگئیں
پہلے مجبوریہ تھیں اب بچوں کی اماں ہوگئیں

جن پہ شیخ و برہمن کو آج تک کچھ ناز تھا
وہ ہی باتیں گھس گھسا کر دھرم دایاں ہوگئیں

مرغیاں جو ہم چرا لائے تھے دعوت کیلئے
اُن کے دست نازنیں جلکے طبے جاں ہوگئیں

گھر یونہی بڑھتا رہا یہ شور و غل گرد و غبار
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہوگئیں

اُن کے گالوں کو وہ چھو کے آنے والی تتلیاں
لمس پا کر ہاتھ کا میرے گلستاں ہوگئیں

وہ سیاہ زلفیں جو بن کے ناگ ڈستی تھیں ہمیں
آج کنگھی میں الجھ کر خود پریشاں ہوگئیں

رازؔ جو مرگھٹ میں پہنچا ایک مجمع لگ گیا
سن منی شعرا کی سب روحیں غزل خواں ہوگئیں

★

ٹی - این - رازؔ
(بمبئی)

ڈاکٹر اختر بستوی
لکچرر۔ شعبۂ اردو۔ گورکھپور یونیورسٹی

چاول کا مسئلہ بیگمات کی پارلیمنٹ میں

ہو سکتا ہے کہ آپ آدم کو جنت سے نکلوانے کا ذمہ دار شیطان کو سمجھتے ہوں، لیکن میری رائے میں یہ الزام اُس "فتنہ پرور" دانے کے سر جانا چاہیئے جسے گندم کہتے ہیں۔ آدم نے جو گندم کھایا تھا وہ ممکن ہے ایسا نہ رہا ہو جیسا کہ آج کل سستے غلے کی سرکاری دکانوں پر ملتا ہے لیکن تھا تو وہ بھی محض گیہوں، کوئی من و سلویٰ یا پُرتکلف حلوہ تو نہیں تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہمارے مورثِ اعلیٰ کو اس بے وقعت دانے میں ایسی کون سی خوبی نظر آئی جس کی بنا پر وہ اس کے عشق میں اتنے شدت پسند ہو گئے۔
ہماری آپ کی دنیا میں یہ ہوتا ہے کہ اگر کوئی نواب کلن کسی کلوا چمار کی بیٹی سے عشق فرمائیں اور پھر اس کے معاملے میں ایسے وفا شعار بن جائیں کہ شادی رچا لینے کی حماقت بھی کر بیٹھیں تو انھیں رسوا ہونے کے ساتھ ساتھ سماجی حقوق سے بھی محروم ہونا پڑتا ہے اور اسی پر اکتفا نہیں ہوتی بلکہ آئندہ نسلوں کے لئے بھی "چمارن کی اولاد" کا ایسا دُم چھلا لگ جاتا ہے جو پشتہا پشت تک ناطقہ بند کئے رہتا ہے۔ جنت کا دستور بھی شاید اس سے مختلف نہیں کیونکہ آدم کو بھی "بد ذات گندم سے محبت" کرنے کی سزا یہی ملی کہ وہ تمام "فردوسی مراعات" سے محروم کر دیئے گئے اور پھر ان کی اولادوں کے لئے بھی یہ کمبخت ایک مستقل عذاب بن کر رہ گیا۔ یہاں تک کہ سائنس کی سنواری ہوئی موجودہ دنیا میں بھی کارل مارکس سے لے کر کالو بھنگی تک ہر شخص کی فکری اور عملی بھاگ دوڑ کا مرکز یہی "گیہوں" اور اس سے بننے والی "روٹی" ہے۔ چاہے وہ روس اور چین کے انقلابیوں کی میٹنگ ہو یا ہندوستانی سپلائی آفسوں کے سامنے راشن کارڈ بنوانے والوں کا مجمع، ہر جگہ اسی کے چرچے ہیں۔

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ میں کسی مخصوص معاشی یا سیاسی نظریئے کا پروپیگنڈا کرنا چاہتا ہوں اور اسی مقصد کے لئے میں نے یہ تمہید بالکل اسی طرح شروع کی ہے جیسے شیر کی ہڈیوں کا تیل بیچنے والے، جنگل کی حیرت انگیز داستانوں سے اپنی تاجرانہ تقریر کا آغاز کرتے ہیں۔ لیکن یقین کیجئے کہ میں نہ تو کسی ہفتہ وار اخبار کا ایڈیٹر ہوں اور نہ کوئی ناکام پلیڈر کہ اخبار کا سیل بڑھانے یا وکالت چمکانے کے لئے اسی قسم کا سنسنی خیز پروپیگنڈہ کرتا پھروں۔ میں نے تو صرف ایک ایسی بات عرض کی ہے جسے میں اب تک بالکل اسی طرح ایک ٹھوس حقیقت سمجھتا آیا تھا جیسے لوگ گدھے کو ایک بے وقوف جانور سمجھتے ہیں۔ مگر ادھر کچھ دنوں سے اپنے ملک کے بدلے ہوئے حالات کا مشاہدہ کرکے میرا یہ

چنانچہ اس طرح تنزل ہو گیا ہے جیسے دو چار لڑکوں کی غنڈہ گردی دیکھ کر کسی اسکول کے ہیڈ ماسٹر کا طلباء کی ڈسپلن سے اعتماد اٹھ جائے۔ مجھے کچھ ایسا محسوس ہونے لگا ہے کہ اب ہندستانیوں کے لئے "گیہوں" کا مسئلہ سب سے بڑا پرابلم نہیں رہ گیا ہے۔ یہ بات تو ابھی کافی دنوں تک کے لئے ناممکن نظر آتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود اب گیہوں کو شاید ہماری شدید ترین ضرورتوں میں وہ برتری حاصل نہیں رہی جو پہلے تھی۔ اس کی جگہ غالباً چاول نے لے لی ہے۔ شاید آپ یہ سُنکر ایک زوردار قہقہہ لگائیں اور فرمائیں کہ "چاول اور گیہوں میں فرق ہی کیا ہے؟ دونوں کا شمار غلے میں ہوتا ہے" بے شک یہ دونوں بالکل اسی طرح ایک ہی برادری سے تعلق رکھتے ہیں جیسے غلیل اور تیر' ایک ہی قبیل کی چیزیں ہیں لیکن جہاں تک میں سمجھتا ہوں اب تک ہم لوگ چاول کو گیہوں کے مقابلے میں بہت ہی کمتر شئے سمجھتے رہے ہیں۔ اس کی دلیل میں یہ پیش کر سکتا ہوں کہ ہماری زبان میں جس چیز کی تحقیر مقصود ہوتی ہے اسے "دال بھات" سے تشبیہ دیا کرتے ہیں مگر اب ہمیں اس طرح کی غلطی ہائے مضامین کو درست کرنا ہوگا۔ کیونکہ اب تو یہ صورتحال ہے کہ اگر آپ اُس علاقے میں بھی تشریف لے جائیں جہاں یہ تشبیہ مروج ہے تو بچے اپنی توتلی زبان میں ماں سے "ٹوٹی" (روٹی) مانگنے کے بجائے یہ کہتے ہوئے ملیں گے "ماں آو لات میں تاول پتاؤ گی نا!" (ماں آج رات میں چاول پکاؤ گی نا) یہ اُس خطے کی بات ہے جہاں دھان اُسی کثرت سے پیدا ہوتا ہے جتنی کثرت سے چراپونجی میں بارش اور پہلوانوں کے اڈے پر بدن کی مالش ہوتی ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یکایک ہندستان میں چاول کو یہ خصوصی مرتبہ کن وجوہات کی بناء پر حاصل ہو گیا کہ وہ اُس اناج سے بھی بلند و برتر سمجھا جانے لگا جو آدم کا "محبوبِ اولین" تھا اور جس کے عشق نے روزِ آفرینش کی جنت سے لیکر بیسویں صدی کی دنیا تک ہر جگہ آدم اور اُن کی اولادوں کو ٹھوکریں کھلائی ہیں۔ اس کے اسباب معلوم کرنے کے لئے پارلیمنٹ میں باقاعدہ طور پر ایک غیر سرکاری بل لاکر مباحثہ کرانا چاہیئے۔

سیاست دانوں کی بنائی ہوئی جو پارلیمنٹ ہے اس میں تو پتہ نہیں اس مسئلے پر مباحثہ ہو سکے گا یا نہیں لیکن کل مجھے بیگمات کی پارلیمنٹ میں اسی موضوع پر ایک شاندار بحث سُننے کا موقع ملا جو مختصر ہونے کے باوجود نہایت جامع تھی اور جسے میں آپ تک پہونچا دینا ضروری سمجھتا ہوں۔

ہوا یہ کہ کل میں شام کو اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا۔ گھنٹوں کے مطالعے کی تھکن اتارنے کے لئے چائے کی چسکیاں لے رہا تھا کہ سامنے کی کھلی ہوئی کھڑکی سے مجھے اپنے گھر کے آنگن میں خواتین کی پارلیمنٹ آراستہ نظر آئی جس میں خالہ جان' پھوپی جان' بڑی بھابی، نانی اماں، دادی جان اور رشیدن بوا پاندان اور پنکھے سنبھالے ہوئے انتہائی شد و مد کے ساتھ مختلف النوع موضوعات پر اپنے اپنے خیالات کا اظہار فرما رہی تھیں۔ کچھ دیر تک تو چھوٹے چھوٹے متفرق "اندرونی" مسائل زیر بحث رہے جن میں خاندان کی جوان بہوؤں اور بیٹیوں کی آزادانہ روش سے لیکر بعض عزیزوں اور رشتے داروں کی ناکام شادیوں تک متعدد مسئلوں پر رائے زنی کی گئی۔ پھر نصیبن بی کی آمد سے یکایک بیگمات کی پارلیمنٹ کا یہ اجلاس "بیرونی" معاملات کی طرف متوجہ ہو گیا۔ نصیبن بی ہمارے محلہ کی ایک غریب اور معمر بیوہ ہیں جو اپنے بیٹے اسحٰق اور اُس کے بیوی بچوں کے ساتھ پاس ہی کے ایک خستہ حال مکان میں رہتی ہیں وہ اپنا سودا سلف خریدنے کیلئے خود ہی بازار جایا کرتی ہیں۔

اور وہاں سے لوٹ کر گھر گھر پردہ نشین خواتین تک باہر کی دنیا کی خبریں پہنچایا کرتی ہیں۔ پھٹی ہوئی جوتی گھسٹتی ہوئی اور میلا برقع سنبھالتی ہوئی، ہانپتی کانپتی نصیبن بی جس وقت ہمارے گھر میں داخل ہوئیں تو مذکورہ بالا تمام بیگمات ان کی طرف جلدی ہی پُرشوق نظروں میں متوجہ ہو گئیں خالہ جان کتری ہوئی چھالیہ کو پاندان کے ایک خانے میں ڈالتے ہوئے بولیں "اے ہے نصیبن! تم تو اس طرف کا رستہ ہی بھول گئیں۔ منگل منگل آٹھ دن ہو گئے اور تمہاری شکل ہی نہیں دکھائی دی۔"

ہو کیسا غضب ہے شہر اور بازار کی ؟

نصیبن بی نے برقع اتار کر خالہ جان کے پلنگ کی ادوان پر رکھتے ہوئے جواب دیا "کیا پوچھتی ہو بیگم۔ میرا تو جی جلتا ہے شہر اور بازار دونوں سے۔ آگ لگے نگوڑے بازار کو۔ ہر چیز کے دام کنکووں کی طرح اونچے ہی اٹھتے جا رہے ہیں"

"ارے نصیبن بی، اب تو بازار کو آگ لگنے کی بددعا نہ دو۔ تمہارے کہتے کہتے کہیں تو کوئی آگ بجھ نہ جائے۔ موئی جو چیز بھی پہنچواؤ وہ بازار سے غائب۔ دیسی کا سامان سونے کے بھاؤ بھی نہیں ملتا"۔ بڑی آپا باورچی خانے سے ہاتھ پونچھتی ہوئی برآمد ہوئیں اور آنگن میں آکر وہ بھی زنانہ پارلیمنٹ کے اس مباحثے میں شامل ہو گئیں۔

نصیبن بی نے رشیدن بوا کے ہاتھ سے پنکھا لیکر خود زور زور سے جھلتے ہوئے کہا "ٹھیک ہی کہتی ہو بٹیا میں بھی اسحق کے چھوٹے لڑکے کے لئے دودھ کا ڈبہ لینے گئی تھی اس کی بیوی نگوڑی بالکل انگریزن بن گئی ہے۔ بچے کو پلانے کے لئے دودھ ہی نہیں اترتا کمبخت کو۔ مگر دودھ کا ڈبہ کہیں ہو تو ملے۔ موا پورا بازار چھان مارا کسی دکان پر بھی نہیں ملا۔"

بڑی بھابی (جو ہمارے گھر کی واحد تعلیم یافتہ خاتون ہیں کیونکہ انہوں نے پندرہ سال پہلے آٹھویں جماعت کا امتحان پاس کیا تھا) سوشلزم کی بنائی ردک کر بولیں "لوگ کہتے ہیں کہ کسی زمانے میں ہمارے ملک میں دودھ کی نہریں بہا کرتی تھیں مگر اب تو یہاں "خشک دودھ" بھی نہیں ملتا"

پھوپی جان نے اپنے ہاتھ میں سجے ہوئے سادے پان پر چونے کی چمچی پھیرتے ہوئے کہا "تم دودھ ہی کو رو رہی ہو دلہن! یہاں تو حالت یہ ہے کہ چاول جیسی حقیر چیز بھی اکسیر ہو رہی ہے۔

رشیدن بوا زمین پر بیٹھے بیٹھے پہلو بدل کر بولیں "آپ بھی کمال کرتی ہیں مالکن! بھلا چاول کوئی حقیر چیز ہے ؟"

پھوپی جان نے تازہ بنا یا ہوا پان نصیبن بی کی طرف بڑھاتے ہوئے جلے بھنے لہجے میں رشیدن بوا کو جواب دیا "تو موا دال بھات بھی کوئی نعمت ہے"

خالہ جان سروتا لئے ہوئے اپنے داہنے ہاتھ کو سر تک لے گئیں اور دوپٹہ برابر کرتی ہوئی بولیں "آپا تم کچھ بھی کہو بہن۔ کل اسی چاول کی وجہ سے میری عزت چلی گئی۔ میرے جیٹھ کی بڑی لڑکی نجمہ کل شادی کے بعد پہلی بار ہمارے گھر آئی تھی۔ واپسی کے وقت اسے "گود بھرائی" کا چاول دینا ضروری تھا۔ مگر گھر میں چاول کے نام پر جھاڑو پھری ہوئی تھی۔ اسلئے بدّن کو فوراً بازار دوڑایا۔ وہ کلموا گھنٹوں گلی گلی مارا مارا پھر مگر آخر میں جھولا جھلاتا ہوا لوٹ آیا۔ سچ کہتی ہوں میں تو نجمہ کو رخصت کرتے وقت شرم سے گڑی جا رہی تھی کہ لڑکی نے سہاگن ہونے کے بعد پہلی دفعہ اس گھر میں قدم رکھا تو میں اس کی گود چاول سے بھی نہ بھر سکی"

نانی اماں نے تسبیح کے دانے پھرتے پھرتے رک کر فرمایا "ارے یہ تو دنیا کی عزت و آبرو کی بات ہے۔ مجھے تو اب چاول کے ہاتھوں دین کا سلامت رہنا بھی دشوار معلوم ہوتا ہے کچھ دن ہوئے انور میاں کا سب سے چھوٹا لڑکا سخت بیمار ہو گیا تھا اور اس کا اب تب لگا ہوا تھا میں نے منت مانی کہ اگر خدا خیر سے اس کو جیتا رکھے تو مسجد کا طاق گلگلوں اور زردے سے بھرواؤں گی۔ اللہ نے میری التجا سن لی اور بچہ دو ہی دن میں چوکڑیاں بھرنے لگا۔ پھر جب پچھلے جمعہ کو مجھے طاق بھروانے کا خیال آیا تو زردہ بنانے کے لئے چاول کی ضرورت تھی انور غریب خود بازار گیا اور سارا شہر چھان مارا۔ ہر بنیے سے منت سماجت کی۔ مگر مجال جو کسی نے ایک دانہ چاول نہیں دیا۔ آخر مجبوراً صرف گلگلوں ہی سے طاق بھروا دیا۔

اللہ مجھے معاف کرے"

دادی جان اب تک دالان میں نماز پڑھ رہی تھیں۔ سلام پھیر کر انھوں نے جلدی جلدی دعا مانگی اور پھر منہ پر ہاتھ پھیرنے کے بعد جانماز کا کونا الٹ کر چوکی سے اترتی ہوئی بولیں" تم ٹھیک کہتی ہو بہو۔ اس موئے چاول کی وجہ سے ایمان کی بھی خیر نہیں معلوم ہوتی۔ پچھلے بیر کو کونڈا تھا۔ ہمارے یہاں کونڈے کا فاتحہ پوڑی اور کھیر پر ہوتا ہے۔ لیکن اس سال صرف پوڑی ہی پک سکی۔ کھیر مونڈی کاٹی کہاں سے پکتی جب چاول ہی نگوڑا بازار سے منہ کالا کر گیا ہے۔

بیگمات کی پارلیمنٹ میں چاول کے مسئلے پر مباحثہ جاری تھا کہ یکایک بھائی جان کی چار سالہ بچی نکہت دوڑتی ہوئی آئی اور بڑی بھابی سے بولی " امی آج ہماری گڑیا کی شادی ہے۔ پلاؤ پکانے کے لئے تھوڑا سا چاول دے دیجئے" یہ سن کر تمام خواتین نے زبردست قہقہہ لگایا اور نکہت بیچاری اس طرح چور سی بن گئی جیسے اس نے کوئی معیوب بات کہہ دی ہو۔

●●

فاطمہ تاج
(حیدرآباد)

ہم اور ہمارے ڈاکٹر

ہمیشہ زبردستی مسکراتے رہنا یا دانتوں کی بے وجہ نمائش کرتے رہنے کو خوشی نہیں کہتے اس کے باوجود ڈاکٹر ہمیشہ خوش رہنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ ہمیں یہ مسیحائی آج تک سمجھ میں نہیں آئی کہ ہم چاہیں کوئی بھی تکلیف بیان کریں ڈاکٹر پہلے خوش رہنے کی تاکید کرتے ہیں اور بعد میں دوائیں بھی تجویز کرتے ہیں۔ پھر اس کے بعد کچھ پرہیز کی بھی ہدایت کر دیتے ہیں۔ اگر ہم مان لیں کہ ہمیشہ خوش رہنا ہماری صحت کا ضامن ہے تو پھر یہ دوائیں کیوں تجویز کی جاتی ہیں؟ مختلف پرہیز کیوں سمجھائے جاتے ہیں اور تو اور وزن بھی دیکھا جاتا ہے۔ مختلف ٹسٹ وغیرہ بھی کروانے پر ہمیں آمادہ کیا جاتا ہے آخر کیوں؟

کچھ دن پہلے ہم ذرا لوں ہی "گردشِ دوراں" کی زد میں آگئے تھے بات کچھ اہم نہ تھی لیکن حساس طبیعت نے ہمیں یقین دلایا کہ ہم ہی "شہر کے قاضی" ہیں، ہمیں چکر پہ چکر آنے لگے، اختلاج ہونے لگا کچھ عجیب الٹی پلٹی سی حالت ہو گئی۔ ہم ڈاکٹر کے پاس پہنچائے گئے۔ دو چار آلوں کی مدد سے ہمارا معائنہ ہوا، پھر ڈاکٹر صاحب نے فرمایا "گھبرانے کی بات نہیں، بیماری کچھ بھی نہیں ہے بس خوش رہیے!" ڈاکٹر صاحبان خوش رہیے اس آسانی سے کہہ دیتے ہیں جتنی آسانی سے یہ انجکشن کی سوئی چبھو دیتے ہیں اور پھر ہم خوش رہنے کی کوشش ڈاکٹر صاحب کے "مطب" ہی سے شروع کر دیتے ہیں۔ دوا کی تفصیل مسکرا کر پوچھتے ہیں، فیس بھی مسکرا کر ادا کرتے ہیں۔ سلام مسکراتے ہوئے کرتے ہیں اور خدا حافظ جیسے سنجیدہ موقع پر بھی مسکرانے سے گریز نہیں کرتے یعنی اب یہیں سے ہماری خوشیوں کا سفر شروع ہو جاتا ہے ہم بظاہر بڑے خوش ہو کر گھر لوٹتے ہیں اور حسبِ ہدایت پرہیز اور دوا کے مرحلوں سے گزر کر اپنے بستر پہ آرام سے لیٹ جاتے ہیں۔ گھر والے اپنی ذمہ داری پوری کر کے بے فکر ہو جاتے ہیں اور گھوڑے، گدھے سب ہی بیچ کر سو جاتے ہیں۔ ہم بے قرار سے کروٹ پر کروٹ بدلنے لگتے ہیں اور سوچنے لگتے ہیں کہ نہ جانے ہمیں کون سا خطرناک عارضہ لاحق ہو گیا ہے کہ ہمیں

خوش رہنے کی تاکید کی جا رہی ہے۔ یہ تو بالکل آخری خواہش ہوتی ہے۔ انسان زندگی بھر اس خوشی کی تلاش میں دوڑ دھوپ کرتا ہے مگر یہ ملتی ہی نہیں۔ اب ہم کس طرح خوشی ڈھونڈیں؟ کہاں سے لائیں اس ظالم کو!

خوش رہنا تو ہم جیسوں سے بہت مشکل ہے البتہ ہم خوش رکھ سکتے ہیں بہت سے لوگوں کو.....

ایک مرتبہ ہمیں کسی عزیز کی عیادت کے لیے دواخانہ جانا پڑا مریض کے نامرادل نے خوشی کی تلاش میں اپنے آپ کو غم سے متاثر کر لیا تھا وہ بچارے مختلف تاروں اور مشینوں میں الجھے پڑے تھے۔ ان کے بائیں طرف چھوٹا سا ٹی وی بھی تھا جس پر فلم کی بجائے کچھ لکیریں متحرک تھیں۔ اداس چہرہ، کسمپرسی کا عالم، آنکھیں مدد کی طالب، بات کرنے کی اجازت نہیں تھی پھر بھی ہم آہستہ سے مسکراتے ہوئے بول ہی پڑے "خوش رہیے" مرض کچھ بھی نہیں ہے بس خوش رہا کیجیے اور خود بہت زیادہ مسکرانے لگے۔ ہمارے عزیز کے قریب کھڑے ہوئے اداس اقربا نے ہم پر قہر آلود نگاہوں کی بوچھار کر دی اور ہم شرابور ہو کر مسکراتے ہوئے وہاں سے لوٹ آئے۔

یہ مسکرانے کی عادت ہمیں ایسی پڑی ہے کہ ہم کہیں تعزیت ادا کرنے نہیں جا سکتے وہاں بھی مسکراتے رہتے ہیں۔ لوگ ہمیں حقارت و ناگواری سے دیکھتے ہیں، یہی نہیں بلکہ ہماری دماغی حالت پر شک بھی کرتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحبان وزن کے بارے میں ہمیشہ تاکید کرتے ہیں کہ وزن بڑھنے نہ پائے کم رکھیے لیکن ہمیں وزن کم کرنا بالکل پسند نہیں۔ بھلا ہلکے لوگ سماج میں کیسے زندہ رہ سکتے ہیں؟ اگر ہم بھی وزن کا شکار ہو گئے تو ہمارا مضبوط مقام کیسے بنے گا؟ اور خوش رہنے کے سارے راستے بھی مسدود ہو جائیں گے نا؟

ہر طرح کے اسپیشلسٹ ڈاکٹروں کے پاس ہم جا چکے ہیں سب کا متفقہ فیصلہ خوش رہنے پر ٹھہرا ہے اور ہم مسکراتے مسکراتے عاجز آ گئے ہیں، لوگ ہمیں پاگل سمجھ کر نظر انداز کرنے لگے ہیں۔ اب آپ ہی بتائیے کہ ہم ڈاکٹروں کے مشورے پر کس طرح اور کب تک عمل کریں گے؟ ہمارا وہ کون سا عمل ہو سکتا ہے جس سے ہم حقیقی معنوں میں خوش رہ سکیں؟

تبسم بیجا سے ہمیں کئی بار پریشانی اٹھانی پڑی اب کیا بتائیں آپ کو ہم نے ایک فقیر کو راستہ چلتے چلتے ایک سکہ دیا اور مسکرا دیے۔ فقیر نے وہ سکہ دیکھے بغیر ہی واپس کر دیا۔ ہم نے پوچھا تو کہنے لگا آپ کھوٹے سکے خیرات میں دیتے ہیں! ہم نے کہا ہرگز نہیں! تو وہ پوچھنے لگا تو آپ یہ سکہ دینے کے بعد مسکرائے کیوں تھے.....؟

ہم ایک دفعہ آٹو میں کہیں جا رہے تھے جب منزل پر اترے اور کرایہ دینے لگے تو کرایہ دیتے دیتے آٹو والے کو دیکھتے ہوئے مسکرا دیے اس نے بہت دیر تک ہمارے دیے ہوئے نوٹ الٹ پلٹ کیے اور بڑی معنی خیز نظروں سے ہمیں گھورنے لگا، ہم مسلسل مسکرا رہے تھے۔ آٹو والے نے کہا یہ نوٹ جعلی ہیں اور آپ کے پاس کیسے آئے؟ ہم مسکرانا بھول گئے۔ ہم نے کہا جعلی نہیں ہو سکتے۔ ہم نے بینک سے لیے ہیں پھر آٹو والے نے پوچھا تو پھر آپ کی مسکراہٹ کا مطلب؟ ہم خوش رہنے کی عادت ڈال رہے ہیں۔ ہمارے ڈاکٹروں کا مشورہ ہے..... ٹھیک کہا نا؟ ہمیں ڈاکٹروں سے بس یہی شکایت ہے کہ خوش رہنے کی تاکید تو کرتے ہیں لیکن خوش رہنے کی ترکیب نہیں بتاتے.......

یوسف شمسی کاکوی
(بہار)

آتا ہے یاد ”مج“ کو

صاحب ”عشق“ سے اجتناب ممکن نہیں ......

عشق کو بُرا کہہ کر ہم حضرت اقبالؒ سے ٹکر نہیں لے سکتے کیوں کہ ان کے یہاں خاصا ”عشق پرور کلام“ ہے۔ ہاں! اعتراض ہے تو جامعہ کے ”رومان پرور“ احوال پر عشقِ مجازی پر۔ اب تو اللہ رکھے ہم ”استاد“ ہو چکے ہیں۔ لیکن جب بھی نگاہیں جامعہ کے رومان پرور کونوں کھدروں پر پڑتی ہیں تو بہت کچھ یاد آ جاتا ہے۔ اپنی طالب علمی کا سنہرا دور یعنی وہ دور جب ہم جامعہ میں صرف اور صرف طالب علم کی حیثیت سے وارد ہوئے تھے۔ مہینے میں چار اور کبھی کبھی اور ایک اکثر عشق کرنا ہماری ہابی رہی لیکن ہم نے کسی عشق کو اتنی لفٹ نہ دی کہ ”ہابی“ سے ”لابی“ یا خدانخواستہ ”بھابی“ کی نوبت آ جاتی۔ اللہ رکھے بھائی سجان محترم جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ چکے تھے، ان کے واسطے شریکِ حیات کی تلاش تھی...... یہ بعض مرد اتنے سیدھے کیوں ہوتے ہیں؟ عمرِ عزیز کے ۳۰، ۳۵ برس ضائع کر دینے کے بعد صرف ”ایک دلہن“ پر توکل کر کے بیٹھ جاتے ہیں۔ شریعت کی سہولتوں سے بھی استفادہ نہیں کرتے۔

اب تو ناقابلِ دید فلموں اور قابلِ دید لڑکوں نے لفظ عشق کو اتنا بدنام کر دیا ہے کہ کلاسیکی عشاق اچھا ہی ہوا جو اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے ورنہ خود اپنا گلا دبا لیتے۔

دورانِ طالب علمی ہمارے ایک دوست ہوا کرتے تھے شیخ کرامت علی عرف بادو میاں...... بادو میاں کا خطاب ہم نے انھیں پہلے دن پہلی کلاس میں پہلی ملاقات کے دوران عنایت فرمایا تھا۔ کیوں کہ موصوف کے جسم میں چربی بہت زیادہ تھی۔ سونے پر سہاگہ رنگت، شبِ دیجور.... بہت کم عرصے میں ہمارے بہت زیادہ دوست بن گئے۔

اب حالت یہ تھی کہ عشق کا دورہ پڑا ہوا تھا۔ فزکس کی کلاس کے بعد..... عشق، ریاضی کی کلاس کے بعد عشق، ارضیات کی جماعت کے بعد عشق...... اور پریکٹیکل کے بعد ایک عدد اسکرٹ عشق، عشق کا مزہ

بننے کے لیے بادو میاں ایک اچھے آپریٹر کا کام انجام دے رہے تھے لیکن ہم نے ان سے ہمیشہ نامہ بر کبوتر کا کام لیا۔

ایک دن صبح ہم نے انھیں بتایا کہ ہمارا دل نوزی پر آگیا ہے۔ وہ ڈاکٹر لی دمی؟ "گڑیا کر پوچھا" دمی؟
ہم حیران رہ گئے۔

"ہاں ہاں ۔ ۔ ۔ بیبی 'بچھونی' صاحب زادی 'لونڈیا' المیڈیا 'ڈارٹ' دمی ۔ ۔ ۔ سب ایک ہی کینٹگری کے الفاظ ہیں" بولے:

"ہاں وہی ۔ ۔ ۔ ۔ سچ ۔ ۔ ۔ ۔" ہم نے کچھ کہنا چاہا لیکن انھوں نے ہماری بات کاٹ دی اور بولے "بس اب تم ان میں بھی وہ تمام خصوصیات بتا دو گے جو سابقہ حسیناؤں میں موجود تھیں۔ بہرحال میں کوشش کروں گا۔ گھر جاتے ہوئے میرے ڈیپارٹمنٹ میں آجانا!"

سارا دن ہم نے بے چینی سے انتظار کیا اور آخری کلاس دینے کے بعد بادو میاں کے پاس پہنچے۔ یہ دیکھ کر ہماری حرکتِ قلب کچھ عرصے کے لیے بڑھ گئی کہ ان کے پاس ہی نوزی صاحبہ موجود مسکرا رہی تھیں۔ بادو میاں اتنے کارآمد ہو گئے۔ ہم نے سوچا بھی نہ تھا۔ بہرحال ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
کھنکھار کر عرض کیا!
"مس نوزی ۔ ۔ ۔ ۔ مس نوزی ۔ ۔ ۔ ۔ وہ دراصل ۔ ۔ ۔ میں دراصل آپ سے ۔ ۔ ۔ ۔ آہ ۔ ۔ ۔ ۔
ارے ۔ ۔ ۔ ۔ اف مر گیا سالے!"
ایک چیخ ہمارے حلق سے نکلی اور بادو میاں کا پیر پوری قوت کے ساتھ ہمارے پیر پر پڑا۔
گھسیٹ کر کونے میں لے گئے اور جھڑکی بھر کر بولے!
"بے وقوف، احمق، باجی کے نیچے دو نقطے (باجی) پے دال کے بودم (بوم) یہ بھلا اظہارِ محبت کا وقت ہے؟"
"تو اور کس چیز کا وقت ہے؟ تم کس لیے اسے بلا لائے ہو۔"
"میاں ۔ ۔ ۔ ۔ کچھ مانگو ۔ ۔ ۔ ۔ کتاب، کاپی، ربر، قلم ۔ ۔ ۔ ۔ ہفتے دو ہفتے بعد اظہارِ محبت کر لینا ۔ ۔ ۔ ۔ جلدی کیا ہے؟"
"اوہو ۔ ۔ ۔ ۔" ہم معاملے کی تہہ تک پہنچ گئے۔ عشق میں عجلت مناسب نہیں، دیر آید، درست آید۔
بات سے کام لے کر دوبارہ موصوفہ کے پاس آئے۔
"صوفی کو بیت شمسی کہتے ہیں!"
"نوزیہ قمر" گویا چاند نکل کر نکلتی ہی۔
"بہت خوشی ہوئی ہے آپ سے مل کر ۔ ۔ ۔
کیلکولیٹر ہوگا آپ کے پاس؟"
"[illegible] جی، جی ہاں، حیرانی آنکھیں پھیل سی گئیں۔
ہم [illegible] کیلکولیٹر مانگا ہے ہم نے!"

ا[illegible]و میاں نے اپنا سر پکڑ لیا۔
چیخ کر بولے!
"اتفاق سے یہ زولوجی کی طالبہ ہیں جہاں کیلکولیٹر کا کوئی کام نہیں ہوتا۔ ہم جھکا سے گئے۔ بہر حال وہ تھمے
"عشق تو کیلکولیٹر کی نظر ہو گیا، اب اس کا حال سنائیں کیا؟
"Mid Term Exam" کے بعد ہم نے پھر زولوجی ڈیپارٹمنٹ پر ہاتھ صاف کیا اور "مس بھینس" کے آگے بین بجانا شروع کر دی۔
بادو میاں کو اطلاع دی تو جل کر فرمایا! میاں ابھی نوزی کے ساتھ کو تین مہینے بھی نہیں گزرے، کم از کم عدت تو پوری کر لیتے۔ کانٹا بدلنے کی ایسی کیا جلدی تھی؟"
"بکواس نہ فرمائیے .... یہ بتلائیے ....
"نام کیا ہے؟"
"مس بھینس!"
"بھینس .... یہ کیا نام ہوا؟ کیا جسامت کی وجہ سے رکھا گیا ہے؟
"بالکل!"
اس دوپہر ہم نے دکھایا تو چہک کر بولے! "واہ .... مزا آگیا ... بالکل اسم بامسمّٰی، خوب بھئی۔ مبارک ہو!"
"وعلیکم مبارک! پسند آئیں آپ کو؟"
یار .... اسے ہی بنا دو میری بھابی!"
حسرت سے بولے۔
"ابھی بات تو شروع کرنے دو .... جلدی کیا ہے۔ ویسے کل اس سے بات ہو گی! اگلے دن ہم نے صبح سویرے ہی جامعہ آنے" کا ارادہ کیا اور تیاریاں شروع کر دیں۔
بھائی جان محترم نے فرمایا! میاں .... سحری کھانے جا رہے ہو کیا؟"
جی نہیں .... یونیورسٹی جا رہے ہیں!"
منمنا کر جواب دیا۔
"کسی کو بند کر کے آئے تھے کل؟"
"ن .... نہیں تو .... بھائی جان .... پرفیوم لگا لوں آپ کا؟"
انھوں نے گہری گہری نظروں سے کرید کرید کر دیکھا اور کہا!
"منے .... اتنے اندھیرے میں پرفیوم لگا کر یونیورسٹی مت جایا کرو، اتنے میں جنگل پڑتا ہے چڑیلیں پیچھے لگ جائیں گی۔
"بھائی جان .... ہم ہر جنگل عبور کر لیں گے، ہر رکاوٹ کا مقابلہ کر لیں گے، ہر پتھر پہ سے گزر جائیں گے

ہمدردی یار کو گرا دیں گے۔

"تھنے۔۔۔۔۔ کیا نیا نیا ٹریکٹر چلانے لگے ہو؟"

ہم نے اپنا سر پھوڑ لیا۔ اب انھیں کیسے بتلائیں۔ خیر بغیر پرفیوم کے جامعہ آ گئے۔

"ساری کلاسس ختم ہوئیں تو مس بھینس نظر آ گئیں۔ اپنی سہیلیوں کے جلوس میں بیٹھی تھیں۔ حیرت ہے گھاس پر بیٹھی تھیں اور جگالی نہیں فرما رہی تھیں۔ اتفاق سے آج انھوں نے تیز پرفیوم لگا رکھا تھا۔

اس لیے ہم کھنچ کر اس کے پاس پہنچے۔

"آداب!"

"وعلیکم آداب!"

"آداب!" پھر کہا۔

"ارے بیٹھے رہیے۔۔۔۔۔ وعلیکم آداب! فرمائیے!"

لہجے میں اتنی سختی تھی جیسے اپنا ادھار واپس مانگ رہی ہوں۔

"جی میرا نام خاصا بدنام ہے۔ یوسف شمسی کہتے ہیں ما۔

"شکل ہی سے لگتا ہے، سچ بولنے کا شکریہ!" تڑاخ سے بولیں، ہمارے دل کی کلی کھل گئی۔

"واللہ ایسی ہی پٹاخا نما خاتون درکار تھیں۔

"آپ زولوجی میں ہیں؟"

"اور آپ؟"

"نرگس میں!"

"آپے میں نہیں ہیں؟" کھل کھل ہنسیں تو ہم جولیاں بھی قہقہے لگانے لگیں۔

اب تو ہمیں بہت غصہ آیا۔ ڈیریکٹ حملہ کیا۔

"آپ کو بھینس پسند ہے؟ کتنا پیارا جانور ہے!"

"بالکل۔۔۔۔۔ ہر لحاظ سے۔۔۔۔۔ اور آپ کو؟"

"بات کاٹ کر بولیں۔

"زبردستی ہے۔۔۔۔۔"

"کون؟ بھینس یا گائے؟"

"دونوں۔۔۔۔۔ ویسے میں بھینس کے موضوع پر پی ایچ ڈی کروں گا۔"

"کسی بھینسے نے کہا ہوگا آپ سے" ہے نا!" پھر کھل کھلا کر ہنسنے لگیں، ساتھ ہی سکھیاں بھی ٹھٹھے مارنے لگیں۔!!

"ایک شریف۔۔۔۔۔؟"

میں بھی خاموش سرِ بزم ہی تکتا ہوں

کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے

"مدعا تو آپ کے چہرے سے ظاہر ہے۔ براہِ کرم اب تشریف لے جائیے کیوں کہ پروفیسر صاحب دور سے آتے نظر آ رہے ہیں۔ آپ کا شناختی کارڈ تک ضبط کر لیں گے!

"اجی چھوڑیے...... شناختی کارڈ کوئی آپ سے بڑھ کر ہے؟"

"بہر حال.... میں تو آپ کی شناخت نہیں رکھتی نا، آپ پتھر سے سر پھوڑیے شاید صبر آ جائے ویسے ایک شعر میری طرف سے بھی!:

پتھر سے سر پھوڑے گا

دیوانے کو صبر کہاں ہے

بھیا میری منگنی ہو چکی ہے، اگلے برس شادی کا پروگرام ہے، آئیے گا ضرور۔"

"شادی ہال کے اسٹیج پر کرسیاں لگانے!" ایک اچھال۔ چھچھا ہم جولی نے بات پوری کی تو پوری چنڈال چوکڑی نے قہقہے لگائے۔ ہم بھاگے بھاگے بادو میاں کے پاس پہنچے۔

"کر آئے نا مجھے پیر کو بدنام؟ اسے ایک لڑکی قابو میں نہ آئی..... حالاں کہ اتنی دیر میں بڑے سے بڑا سرکش جن بھی قابو میں کر لیا جاتا ہے۔"

"وہ..... وہ..... جن سے بڑھ کر ہے۔ اس کی منگنی ہو چکی ہے!" ہم نے بتلایا۔

"اوہو..... منگنی نہ ہوئی ایک ڈاڑھ کا تعویذ ہو گیا جو ٹوٹ نہیں سکتا۔ میاں فیض کا مصرعہ تو یاد ہی ہو گا!:

دلِ عشاق کی خبر لینا

پھول کھلتے ہیں ان مہینوں میں

ہم نے ہاتھ ملایا۔ گھر آ کر [illegible] کس کے تو نش تیار کیے کیوں کہ تعلیم ان لوازم کے ساتھ ٹھک ٹھک کر چل رہی تھی، پھر کاغذ قلم سنبھال کر محترمہ کو خط لکھا۔ دل کا تمام حال لکھا اور اپنا پورا نام اور پتہ بھی لکھا۔ صبح وہ چٹھی بادو میاں کے سپرد کی۔

کچھ نہ ہوا۔ البتہ چوتھے روز شام کے وقت کسی نے چوبی دروازے پر طبع آزمائی شروع کر دی۔ جو دروازہ دستک سے کھل سکتا تھا اسے ٹھوکروں سے کھولنے لگے۔ بھائی جان محترم نے جا کر دروازہ کھولا۔

"کاشف یہیں رہتا ہے؟" کرخت دار آواز سنائی دی۔

"جی ہاں.... فرمائیے.... میرا چھوٹا بھائی ہے!"

"لیکن آپ تو شکل ہی سے شریف لگتے ہیں۔"

آواز میں غصہ بڑھ گیا تھا۔

اس کے بعد ٹائیٹانک اور مناظرہم نے سطح سمندر سے بلند ہو کر یعنی چھت پر چڑھ کر دیکھے اور دیکھے صورتحال بھانپ گئے تھے۔ ایک اچھے خاصے قبر قبول بزرگ مع دو عدد جوان برادران مسں بھینس، بھائی جان محترم سے محو تکرار تھے۔ بھائی جان پانی پانی ہوئے جا رہے تھے۔ کیوں کہ آج تک ہمارے دروازے پر اس طرح کا کبھی پہلے نہیں ہوا تھا۔

ہمیں وقتی شرم آئی۔ قسمت اچھی تھی کہ قبلہ والد محترم گھر پر نہ تھے ورنہ یہ نفس نفیس علاقے کے تھانے میں پھوڑ کر آتے۔

رات تک بات بہت بڑھ گئی تھی۔

آخری کیل ٹھونک دی گئی اور والدِ مکرم باقاعدہ تھر تھر کانپنا شروع ہو گئے۔ ہمارے "عطر بیز" لباس کو نذرِ آتش کرنے کا حکم دے کر فرمایا!

"برخوردار۔ اسی وقت نکل جاؤ!"

والدِ بزرگوار نے یہ نہیں فرمایا تھا کہ گھر سے "یا کمرے سے"۔۔۔۔۔ بہر حال ہم کمرے سے باہر نکل آئے۔

اس واقعے کے بعد ہم نے تحریری عشق سے توبہ کر لی۔

ایک واقعہ یاد ہے شناختی کارڈ کے لیے تصویر کھنچوانے کا پڑھیے:

ان دنوں امتحان کی وجہ سے دھڑا دھڑ شناختی کارڈ بن رہے تھے۔ ہم نے بھی موقع سے فائدہ اٹھانا چاہا۔ وقت کم تھا اور تصویریں درکار تھیں۔ ہم چاہتے تھے کہ وقت کی کمی کے پیشِ نظر فارم پر انگوٹھے لگا دیں لیکن سب مصر تھے کہ شناختی کارڈ کے حلیے کو بہادر رخ روشن مطلوب ہے۔ بہر حال وقت کم تھا اور ہم چاہتے تھے تصویر ٹائی اور شرٹ میں اچھی سی۔۔۔۔ بلکہ بہت ہی اچھی آئے جو بھی شناختی کارڈ دیکھے بس دیکھتا ہی رہ جائے۔ لیکن صاحب وقت بہت کم تھا اور دورانِ طالب علمی ہم سوٹ زیب تن کرنے کی استطاعت نہ رکھتے تھے (اب بھی یہی حال ہے)

بادو میاں سے مشورہ کیا تو حضرت نے ہمیشہ کی طرح یہ مشکل آسان کر دی۔

فرمایا! خاکسار کے مشورے پر عمل کرو۔ ان شاء اللہ پہلے دھکے میں شناختی کارڈ بن جائے گا۔ چناں چہ ہم ایک اچھا بھلا شلوار قمیص کا سوٹ پہن کر اسٹوڈیو جا پہنچے اور پوچھا! "جناب لباس تبدیل کرنے کا حصہ کہاں ہے؟"

فوٹو گرافر نے ایک نظر ہمارے ہاتھ میں موجود اخباری بنڈل پر ڈالی اور بتلایا!

اس طرف!

شکریہ! پھر کچھ دیر بعد ہم لباس تبدیل کر کے باہر نکل رہے تھے۔ شاید ایک عجیب صورت شریف معلوم ہو رہی تھی۔ فوٹوگرافر صاحب بھی چکرا گئے۔ اور تب کہا۔ اے بھائی سمجھ میں نہیں آیا آپ کو شرق کہیں یا مغرب۔ اللہ ۔۔۔ کے پیرہن کا مطلب کیا ہے! ہم نے کہا کوشش کر دیکھے! ویسے آپ ہی کی کاوش ہے کہ تصویر ۔۔۔

مشتاق احمد یوسفی

/ دوسری قسط /

شہر دو قصہ

نشور واحدی سے لمبی لمبی ملاقاتیں رہیں۔ سراپا نقاہت۔ ان کے ان شاعروں اور ادیبوں کا جماؤ رہتا ہے۔ دانشور بھی آتے رہے مگر دانشور ہیں، دانا نہیں سب یک زبان ہو کر کہتے ہیں کہ اردو بہت سخت جان ہے۔ دانشوروں کو اردو کا مستقبل غیر تاریک دکھائی پڑتا ہے۔ بڑے بڑے مشاعرے ہوتے ہیں۔ سنا ہے ایک مشاعرے میں تو تیس ہزار سے زیادہ سامعین تھے۔ صاحب! مجھے آپ کی رائے سے اتفاق نہیں کہ جو شعر بیک وقت پانچ ہزار آدمیوں کی سمجھ میں آجائے وہ شعر نہیں ہو سکتا۔ کچھ اور سننے میں آیا ہے بے شمار سالانہ سمپوزیم اور کانفرنسیں ہوتی ہیں۔ سنا ہے کئی اردو ادیبوں کو پدم شری اور پدم بھوشن کے خطاب مل چکے ہیں۔ میں نے کئیوں سے پدم اور بھوشن کے معنی پوچھے تو جواب میں انہوں نے وہ رقم بتائی جو خطاب کے ساتھ ملتی ہے! آج بھی فلمی گیتوں، ذو معنی ڈائیلاگ، قوالی اور آپس کی مار پیٹ کی زبان اردو ہے۔ سنسکرت الفاظ پر بہت زور ہے۔ مگر آپ عام آدمی کو سنسکرت میں گالی نہیں دے سکتے۔ اس کے لئے مخاطب کا پنڈت اور دونوں ہونا ضروری ہے۔ صاحب! بقول شخصے، گالی، گنتی، سرگوشی اور گندہ لطیفہ تو اپنی مادری زبان ہی میں مزہ دیتا ہے۔ تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ اردو والے کافی پُرامید ہیں۔ ثقیل ہندی الفاظ بولتے وقت اندرا گاندھی کی زبان لڑکھڑاتی ہے تو اردو والوں کی کچھ آس بندھتی ہے۔

کون شہر سے سمے کے دھارے پر

نشور واحدی اسی طرح تپاک اور محبت سے ملے۔ تین چار گھنٹے گپ کے بعد جب بھی میں نے یہ کہہ کر اٹھنا چاہا اب چلنا چاہیے تو ہر بار ہاتھ پکڑ کر بٹھا لیا۔ میرا جی بھی یہی چاہتا تھا کہ اسی طرح روکتے رہیں۔ حافظہ خراب ہو گیا ہے ایک ہی نشست میں تین چار دفعہ آپ کے بارے میں پوچھا "کیسے ہیں؟ سنا ہے مزاحیہ مضامین لکھنے لگے ہیں۔ بھئی حد ہو گئی!" منحنی اور مٹکا تو آپ جانتے ہیں، سدا کے تھے۔ وزن پچھتر پونڈ رہ گیا ہے۔ عمر بھی اسی ہی ہوگی۔ چہرے پر ناک ہی ناک نظر آتی ہے۔ منحنی پہ یاد آیا۔ کانپور میں چمچہ کیسے۔ اسی سائز کا اب بھی ملتا ہے خاص طور سے فرمائش کر کے منگوائے ہوئی ہوں۔ اپنے سندھ کے ... ان کے پاس ان کی ... ایک دن میرے منہ سے نکل گیا کہ ... کھا لیا نکچھ کے سنترے سے بہتر ہوتا ہے تو نشور تڑپ کر بولے "یہ کیسے ممکن ہے!" ... چند ہیں۔

ت بہت بہتر ہو گئی ہے۔ اس سے گڑ گڑے گھٹے ہوئے لہسن کی پوتی جیسے اوبڑ کھابڑ دانت سب گر چکے ہیں۔ آپ کو
یہ ہو گا کہ شردا ایکٹریس کیا قیامت لگتی تھی۔ مگر بے وقت سا لا مزہ کرکرا کر دیتے تھے۔ سنا ہے پاکستان آنے کے
سامنے کے نکلوا دیئے تھے۔ ایک فلمی رسالے میں اس کا حالیہ فوٹو دیکھا تو خود پر بہت غصہ آیا کہ کاہے کو دیکھا۔ پھر اسی
کے مارے اس کے ریکارڈ نہیں سنے۔ اعجاز حسین قادری کے پاس اس زمانے کے سارے ریکارڈ مع بھونپو والے
فونوں کے ابھی تک محفوظ ہیں۔ صاحب! یقین نہیں آیا کہ یہ ہمارے لئے جدید سائنس، موسیقی اور سامانِ عیش کی انتہا
! انھوں نے اس زمانے کے سر سنگیت سمراٹ سہگل کے دو تین گانے سنائے۔ صاحب! مجھے تو بڑا شاک ہوا کہ آنجہانی کے
سے گلے سے نکلے ہوئے گانوں سے مجھ پر ایسا روحانی لرزہ کیسے طاری ہو جاتا تھا۔ موتی بیگم کا منہ جھریا کر بالکل کشمش ہو گیا ہے
کہنے لگے، میاں! تم اردو پہ کیا ترس کھاتے پھرتے ہو۔ ذرا اپنی صورت تو ۴۷ کے پاسپورٹ فوٹو سے ملا
دیکھو۔

کون ٹھہرے ہے سمے کے دھارے پر
کوہ کیا اور کیا خس و خاشاک

کوئی کل ہند مشاعرہ ایسا نہیں ہوتا جس میں نشور نہ بلائے جائیں۔ غالباً کسی شاعر کو اتنا معاوضہ نہیں ملتا جتنا انہیں ملتا ہے۔ بڑی عزت و توقیر کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ اب تو ماشاء اللہ گھر میں فرنیچر بھی ہے مگر اپنی دیرینہ … پر قائم ہیں۔ طبیعت معمول پر تھی یعنی بہت خراب۔ میں ملنے جاتا تو بان کی کھری چارپائی پر لیٹے سے اٹھ بیٹھتے تو دیکھا کہ پیٹھ پر چارپائی کے بانوں کا نالی دار "پیٹرن" بنا ہوا ہے۔ ایک دن میں نے کہا کہ پلیٹ فارم پر جب … منٹ ہو کر ٹرین اپنے نزد حارت … سے ڈھائی گھنٹے … سے پرورش کر رہی ہے تو بخدا میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کر رہی ہے۔ آ رہی ہے یا جا رہی ہے۔ یا ڈھائی گھنٹے سے محض کلیلیں کر رہی ہے۔ یہ سننا تھا کہ نشور بگڑ گئے۔ جوش میں … پہ بار بار پھسلے پڑتے تھے۔ ایک مشتعل لمحے میں زیادہ پھسل گئے تو بانوں کی جھری میں پیر کے انگوٹھے … تک پھنسا کے فٹ بریک لگایا اور ایک دم تن کے بیٹھ گئے۔ کہنے لگے "ہندوستان میں اردو کو مٹانا آسان نہیں۔ …ستان میں پانچ برس میں اتنے مشاعرے نہیں ہوتے ہوں گے جتنے ہندوستان میں پانچ مہینے میں ہو جاتے ہیں۔ پندرہ … ہزار کا مجمع تو گویا کوئی بات ہی نہیں۔ اچھا شاعر بآسانی پانچ سات ہزار پیٹ لیتا ہے۔ کرایہ ریل، قیام و طعام و داد اس کے علاوہ۔ جوش نے بڑی جلد بازی کی۔ ناحق چلے گئے۔ اب پچھتاتے ہیں" اب میں انھیں کیا بتاتا کہ جوش سات آٹھ ہزار روپے ماہوار ..... اور کار ... دو بنکوں اور ایک انشورنس کمپنی کی طرف سے مسل رہے ہیں۔ حکومت کی طرف سے مشاہرہ اور مکان علیحدہ گو کہ اس کی نوعیت وظیفۂ عتاب کی سی ہے۔

ترنم میں اب نشور کی سانس اکھڑ جاتی ہے۔ ٹھہر ٹھہر کر پڑھتے ہیں۔ مگر آواز میں اب بھی وہی سوز اور کھنک ہے۔ ڈبڈبائی آنکھوں میں وہی چمک۔ تیور اور لہجے میں وہ کھرج اور شدت جو صرف اس وقت آتا ہے۔ جب آدمی زندگی میں … سمجھنے لگے۔ دس بارہ تازہ غزلیں سنائیں۔ کیا کہئے! منہ پر آتے آتے رہ گئی کہ … [illegible] … ایک زمانہ تھا … تب عالم بھی … ہیں!" والی غزل … ہندوستان میں … دیا تھا۔ مگر اب "وہ ملت کبھی ایمان نہ لا سکی، سرمایہ مسلمان ہو نہ سکا" والے

استادِ پردادا کے ڈھنگ سے نہیں برستے۔ سننے والوں کا مزاج بدل گیا ہے۔ سکوتِ سامعین بھی ایک تربیت کی بے صدا بچھ گئی ہے۔ اگر استاد داغ یا نواب سائل دہلوی بھی آ کر اپنی وہ خوب غزلیں پڑھیں جن سے ستر اسّی برس قبل چھتیں اڑ جاتی تھیں تو سامعین کی بدذوقی سے تنگ آ کر اٹھ کھڑے ہوں۔ مگر اب نشور کا رنگ بھی بدل گیا ہے۔ شاعر صاحب بھی ٹوٹ چکے ہیں۔ سدا کے ملنگ ہیں۔ کہہ رہے تھے اب کوئی تمنا کوئی حسرت باقی نہیں۔ میں نے تو انہیں ہمیشہ بیمار، نحیف و نزار، مفلوک الحال اور مطمئن و مسرور ہی دیکھا۔ ان کے وقار و تمکنت میں کبھی کوئی فرق نہ آیا۔ اہلِ ثروت سے کبھی جھک کر نہیں ملے صاحب، یہ نسل ہی کچھ اور تھی اور وہ سانچے ہی ٹوٹ گئے۔ جن میں آشفتہ مزاج کردار ڈھلتے تھے بھلا بتائیے اصغر گونڈوی اور جگر مراد آبادی سے زیادہ متبرک اور خوددار اور کون ہوگا۔ وسیلۂ معاش؟ عینکیں بیچنا! وہ بھی دکان یا اپنے ٹھیے پر نہیں جہاں بھی پیٹ کا دھندا لے جائے۔ نشور سے میری دوستی تو ابھی حال میں چالیس پچاس برس سے ہوئی ہے۔ ورنہ اس سے قبل دوسرا ہی رشتہ تھا۔ میں نے قصائیوں کے محلے میں واقع مدرسہ ضیاء الاسلام میں فارسی ان ہی سے پڑھی تھی۔ افسوس! اب اسی محلے کے قصائی بھی تہمد کی اچکن اور سرخ پیٹنٹ لیدر کے پمپ شوز نہیں پہنتے۔ اس زمانے میں کوئی شخص اپنی برادری کا مروجہ لباس ترک نہیں کر سکتا تھا۔ اس کا حقہ پانی بند کر دیا جاتا تھا۔

دوبارہ رشوت دینے کو جی چاہتا ہے

جانے پہچانے بازار اب پہچانے نہیں جاتے۔ پر ایسے خلیق دکاندار نہیں دیکھے۔ بچھے جاتے تھے۔ دکان میں قدم رکھتے ہی ٹھنڈی بوتل ہاتھ میں تھما دیتے۔ مجھے ایسی ظالم سیلز مین شپ سے واسطہ نہیں پڑا تھا۔ بوتل پی کے دکان سے خالی ہاتھ نکلنا بڑی بے غیرتی کی بات معلوم ہوتی تھی۔ چنانچہ سیلز مینوں کی پسند کی چیزیں خریدتا چلا گیا۔ اپنی ضرورت اور فرمائش کی چیزیں خریدنے کے لئے پیسے ہی نہیں رہے۔ یقین نہیں آیا کہ جہاں اس وقت دھکم پیل، چیخم دھاڑ رہتی ہے اور بدبوؤں کے بگولے منڈلا رہے ہیں۔ یہ وہی کشادہ، صاف ستھری مال ہے، بقول [illegible] صاحب، انگریز نے ہر شہر میں دی مال ضرور بنائی۔ فیشن ایبل اونچی دکانوں والی مال۔ زرداروں کی ذرگزر رہ گئی۔ ابھی کل کی سی بات معلوم ہوتی ہے مال کے کنارے کافی دور تک ببول کی چھال بچھی ہوتی تھی تاکہ کوتوال کے لونڈے کے گھوڑے کو دلکی چلنے میں آسانی رہے۔ دائیں بائیں دو سائیس ننگے پیر ساتھ ساتھ دوڑتے جاتے کہ لونڈا گر نہ جائے۔ وہ ہانپنے لگتے تو وہ ہنسی سے دہرا ہو جاتا۔ ہماری اس سے شناسائی ہو گئی تھی۔ ایک دفعہ ہم پندرہ بیس دوستوں کو ہمراہ لے کے پاس اپنے گاؤں شکار پر لے گیا۔ ہر پانچ آدمی کے لئے ایک علیحدہ خیمہ۔ خیموں کے عقب میں ایک مودب فاصلے پر شاگرد پیشہ کی چھولداری۔ ہم خیمے ہی میں شب باش ہوتے۔ کیا بتاؤں جنگل میں کیسے عیش رہے۔ ایک رات مجرا بھی ہوا۔ صورت اتنی اچھی تھی کہ مجرا غلط سلط پر بھی پیار آنے لگا۔ پیشہ ور شکاری روزانہ شکار مار کے لے آتے تھے جسے باورچی کڑاہیوں اور پتیلیوں کی آگ پر بھونتے۔ ہمارے ذوق میں تو مرغ و ماہی ہضم کرتا اور یہ بتاتا کہ کل کس جانور کا گوشت کھانا پسند کرے گا۔ [illegible] کا گوشت پہلے پہل وہیں چکھا۔ آخری شام چار بھنے ہوئے سالم کالے ہرن دسترخوان پر سجا دیئے گئے تھے۔ ہر ہرن کے اندر ایک تیتر اور تیتر کے پیٹ میں مرغی کا انڈا۔ ہماری تو آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ کہنے لگے کہ خاکسار کا [illegible] کوتوال [illegible] اسی [illegible] ایمان تھا۔ صاحب، آپ راشی، زانی اور شرابی کو ہمیشہ خوش خلق، ملنسار اور منکسر پائیں گے۔ [illegible] وہ تو [illegible]

[illegible] نہیں سکتا۔ اس نے بچوں کو [illegible] کر کے نہیں دیا۔ [illegible] اس کا [illegible]
پاکستان آگیا۔ لوگوں نے کہہ سن کے اسی کے اسکول میں ٹیچر لگوا دیا تھا۔ کوئی تین برس ہوئے میرے پاس آیا تھا۔ کہنے لگا میں بی اے نہیں ہوں۔ تعلیمی تنخواہ میں گزارا نہیں ہوتا۔ سعید آباد سے [illegible] جاتا ہوں۔ دو جگہ بس بدلنی پڑتی ہے آدھی تنخواہ تو بس کے کرائے میں نکل جاتی ہے۔ اپنے ہاں منشی رکھ لیجئے۔ اس کی تین جوان بیٹیاں کنواری بیٹھی تھیں۔ ایک کے کپڑوں میں آگ لگ گئی وہ جل کر مر گئی۔ لوگوں نے طرح طرح کی باتیں بنائیں۔ خود اسے دو اٹیک ہو چکے تھے۔ جنھیں اس نے اسکول والوں سے چھپایا، ورنہ وہ کچی گزری ملازمت بھی جاتی رہتی۔

کوتوال سارے شہر کا غنڈوں سمیت بادشاہ ہوتا تھا۔ مطلب یہ کہ جسے چاہے ذلیل کر دے۔ صاحب مرزا ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ ڈیڑھ سو سال کے پوست کندہ حالات پڑھنے کے بعد ہم اسی نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ تین محکمے ایسے ہیں جو روز اول سے بدنام ہیں۔ اول پولیس دوم پی ڈبلیو ڈی، سوم انکم ٹیکس۔ اب ان میں میری طرف سے اینٹی کرپشن کے محکمے کا اضافہ اور کر لیجئے۔ یہ صرف رشوت لینے والوں سے رشوت لیتا ہے۔ رشوت ہندوستان میں بھی خوب چلتی ہے۔ مجھے بھی تھوڑا بہت ذاتی تجربہ ہے۔ مگر صاحب! ہندو رشوت لینے میں بھی ایسی نمرتا (انکسار) ایسا اخلاق اور اعتدال برتتا ہے کہ واللہ دوبارہ دینے کو جی چاہتا ہے۔

اور صاحب عجز و انکسار کا یہ حال کہ کیا ہندو کیا مسلمان، کیا بوڑھا کیا جوان، سب بڑی نمرتا سے ہاتھ جوڑ کر سلام پرنام کرتے ہیں۔ بڑے بڑے لیڈر تقریر سے پہلے اور تقریر کے بعد اور بڑے سے بڑا سنگیت سمراٹ بھی پکے راگ گانے سے پہلے اور راگ گانے کے بعد انتہائی عاجزی کے ساتھ سامعین کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ میں نے بگوش و بچشم خود ایک مشاعرے میں حضرت علی سردار جعفری کو دس بارہ طویل نظمیں سنانے کے بعد ہاتھ جوڑتے ہوئے ڈائس سے اترتے دیکھا۔ (خیر ایسی واردات کے بعد تو ہاتھ جوڑنے کی وجہ ہماری سمجھ میں بھی آتی ہے)

بازارِ حسن پہ کیا گزری

اور صاحب بھول گنج دیکھ کے تو کلیجہ منہ کو آنے لگا۔ یہاں بازار حسن ہوا کرتا تھا۔ آپ بھی دل میں کہتے ہوں گے کہ عجیب آدمی ہے۔ ڈبل حاجی، ماتھے پر گٹا، مگر پھر پھرا کے طوائف کو مزیدار نوٹوں میں گھسیٹ لیتا ہے۔ کیا کروں، ہماری نسل تو تڑپتی پھڑکتی ہی بوڑھی ہو گئی۔ اس زمانے میں طوائف ادب اور اعصاب پر بری طرح سوار تھی۔ کوئی جوانی اور کہانی اس کے ذکر کے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتی تھی۔ یہ بھی ملحوظ رہے کہ رنڈی واحد بے پردہ عورت تھی جسے آپ نظر بھر کے دیکھ سکتے تھے۔ ورنہ ہر عورت جس سے نکاح جائز ہو منہ ڈھانکے رہتی تھی۔ میں نے دیکھا کہ اب طوائفوں نے گرہستنوں کے سے شریفانہ لباس اور وضع قطع اپنا لی ہے۔ اب انہیں کون سمجھائے کہ لوگ گھر والیوں ہی سے تو گھبرا کے تمہارے پاس آتے تھے۔ گرہستی پھیکے پن اور یک رنگی سے اکتائے ہوئے لوگ اچھی بھلی سرائے میں رات برات بسرام کے لئے آ جاتے تھے۔ سو یہ آسرا بھی ختم ہوا۔

تو میں کہہ رہا تھا کہ بھول گنج میں بازار حسن ہوا کرتا تھا۔ زمانے بھر کی [illegible] کے بعد طوائفوں نے اب [illegible]

والی گلی میں پہنچا دیتی ہے۔ بازار کلاں سے گوبر منڈی بس ایک گز ہے جہاں سے وہاں تک۔ وہ جگہ بھی تنگی جہاں پرانی چوک حسن محل۔
اور میاں تجمل حسین دیوار کی طرف منہ کرکے سیخ سے اترتے کباب کھایا کرتے تھے۔ ویسے چھوڑے دار کباب طوائفوں کے محلے میں
ملتے تھے، کہیں اور نہیں دیکھے۔ سوائے لکھنؤ کے مولوی محلے کے۔ مجرے بھی غضب کے ہوتے تھے اور یہاں آپ کہئے اسلم مردہ
سوائے باکمال کباب یا ڈسکور کیا ہے۔ آپ کے لندن جانے سے پہلے بانگی پیش کروں گا۔ صاحب کباب میں نے باہر کا اور پان
ہمیشہ گھر کا کھایا ہے۔ آپ نے کبھی طوائف کے ہاتھ کی گلوری کھائی ہے؟ مگر آپ تو کہتے ہیں کہ اپنے ختنوں پر مجرے کے بعد آپ نے
رنڈی کا ناچ ہی نہیں دیکھا۔ اور افسوس اسی امپریشن میں ہے کہ مجرا دیکھنے سے پہلے ہر دفعہ اس مرحلے سے گذرنا پڑتا ہے
رنڈی کے ہاتھ کا پان کبھی نہیں رچتا۔ میں نے دیکھا ہے کہ بڈھوں بجز بجاریوں اور شاعروں کو پان نہیں رچتا۔ مگر آپ تاجینک کہ ہونٹ
دیکھ رہے ہیں۔ آداب! میاں تجمل گھر جانے سے پہلے رگڑ رگڑ کے ہونٹ صاف کرتے اور کباب اور پیاز کے بھبکے کو دبانے
کے لئے جنتان کی گولی چوستے۔ حاجی صاحب (ان کے والد) چنیوٹ سے تازہ ولایت تھے اور سیخ کے کباب اور پان کو یو
کی عیاشیوں میں شمار کرتے تھے۔ کہتے تھے کہ برخوردار تمہیں جو کچھ کرنا ہے۔ میرے سامنے کرو۔ لیکن بالفرض محال ان کے
سامنے یہ شغل کیا جاتا تو کلہاڑی سے سر پھاڑ دیتے جوان کے لئے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ وہ ایک عرصے سے بطور ورزش
روزانہ بعد نماز فجر چوبیس سیر کڑی پھاڑتے تھے۔ آندھی پانی ہو تو مردانہ بیٹھک میں دس دس سیر کے رنگین مگدر گھما لیتے
وہ چنیوٹ سے تلاشِ معاش کے لئے نکلے تو ان کے والد یعنی میاں تجمل کے دادا نے انہیں راہ راست سے بھٹکنے سے
روکنے کے لئے ہزار دانہ (تسبیح)، ایک جوڑی مگدر، کلہاڑی اور بیوی زادِ سفر میں ساتھ کر دی۔ اور کچھ غلط نہیں کیا۔ اس لئے
ان آلات سے شغل کرنے کے بعد بدی تو ایک طرف رہی، آدمی نیکی کرنے کے لائق بھی نہیں رہتا۔

مگر خدارا! آپ میری باتوں سے کچھ اور نہ سمجھ بیٹھئے گا۔ بار بار طوائف اور کوٹھے کا ذکر آتا ہے۔ مگر تمام ہوگئے
حل مشکلات کوٹھے پر والا معاملہ نہیں۔ خدا گواہ ہے، بات کبھی پان اور کباب کھانے اور کوٹھے پر جانے والوں کو رشک
کی نگاہوں سے دیکھنے سے آگے نہ بڑھی۔ کبھی میاں تجمل بڑی حسرت سے کہتے ہیں کہ یار! یہ لوگ کتنے "لکی" ہیں! ان کے بڑے
یا تو فوت ہو چکے ہیں یا نابینا ہیں۔

بات یہ ہے کہ وہ زمانہ اور تھا۔ نئی پود پر جوانی آتی تو بزرگ نسل دیوانی ہو جاتی تھی۔ سارے شہر کے لوگ ایک
دوسرے کے چال چلن پر پہرہ دینا اپنا فرض سمجھتے تھے۔

ہم اُس کے پاسباں ہیں وہ پاسباں ہمارا

بزرگ قدم قدم پر ہماری ناقابل استعمال جوانی کی چوکیداری کرتے تھے بکریوں کہنا چاہیئے کہ ہماری لغزشوں
غلطیوں کو پکڑنے کے لئے اپنا سارا بڑھاپا چوکنے وکٹ کیپر کی طرح حالت رکوع میں گذار دیتے تھے۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا
اگر یہی کچھ ہونا تھا تو ہم جوان کاہے کو ہوئے ہیں!

صاحب! اپنی تو ساری جوانی دوانی ڈنٹر پیلنے اور بھینس کا دودھ پینے میں ہی گذر گئی! اب اسے دوانہ پن نہیں
تو اور کیا کہیں؟

کھلی آنکھوں سے گانا سننے والے

بجاتے تو دستہ چلتے لوگ کھڑے ہو جاتے ۔ بجاتے میں آنکھیں بند رکھتے ۔ اس زمانے میں باذوق سننے والے بھی گانا سنتے وقت آنکھیں بند ہی رکھتے تھے تاکہ توجہ صرف سُر پر مرکوز رہے ۔ البتہ طوائف کا گانا کھلی آنکھوں سے سننا جائز تھا ۔ استاد بندو خاں کی طرح والد کے منہ سے کبھی کبھی بے اختیار گانے کا بول نکل جاتا جو کانوں کو بھلا لگتا تھا ۔ شوقیہ باقاعدہ گاتے بھی تھے ۔ مگر صرف اُسی کے سامنے جو خود بھی گاتا ہو ۔ یہ اس زمانے کے شرفاء کا دستور تھا ۔ شاہد احمد دہلوی بھی یہی کہتے تھے ۔ میں نے تو والد کا بالکل آخری زمانہ دیکھا جب وہ صاحبِ فراش ہو چکے تھے ۔ جوانی میں ہیرا بائی کے گانے کے دلدادہ تھے ۔ دادرا، ٹھمریاں یعنی دو سروں میں قیامت ڈھاتی تھی ۔ جیسٹر مجرئی میرا مطلب ہے بیٹھ کر گاتی تھی ۔ ہوسیل کے دائرے میں کہیں اس کا گانا ہو وہ سارا کام دھندا چھوڑ کر پہنچ جاتے اتفاقاً کسی محفل میں نہ پہنچ پائیں تو وہ خود بھی بے کیفی سی رہتی ۔ راجستھانی مانڈ اور بھیرویں ٹھاٹھ صرف ان ہی کے لیے گاتی تھی ۔ دھیوت اور رکھب سروں کو لگاتے وقت ذرا تھم تھم کے انھیں جھلاتی تو ایک سماں باندھ دیتی ۔ جیسی چونچال طبیعت پائی تھی ویسی ہی گائیکی تھی ۔ درباری گاتے گاتے کبھی چنچل سُر لگا دیتی تو ساری محفل پھڑک اٹھتی ۔ آپ کو تو بخوبی علم ہے والد کھرے رئیس نہیں تھے ۔ عمارتی لکڑی کی چھوٹی سی دکان تھی ۔ میری موجودہ دکان کی ایک چوتھائی سمجھیے جو کام چلاؤ ۔ لکڑ منڈی میں کسی کی دکان تین دن تک بند رہے تو اس کا یہ مطلب ہوتا تھا کہ کسی قریبی رشتے دار کا انتقال ہوا ہے لیکن والد صاحب کی دکان سات دن بھی بند رہے تو لوگ فکرمند نہیں ہوتے تھے ۔ سمجھ جاتے کہ ہیرا بائی سے حسنِ سماعت کی داد لینے گئے ۔ تاہم ان کے بندھے ہوئے گاہک لکڑی انھیں سے خریدتے تھے ۔ ہفتے بھر واپسی کا انتظار کرتے بلکہ آخر میں تو یہ ہوا کہ تین چار گاہکوں کو بھی چاٹ لگا دی ۔ وہ بھی ان کی اردلی میں ہیرا بائی کا گانا سننے جانے لگے ۔ جب انھیں پوری طرح چسکا لگ گیا تو سواری کا انتظام، سہرا گانے پر بیل اور ہر اچھے شعر یا مُرکی پر دو پیسہ دینے کے فرائض بھی انہیں کو تفویض کر دیئے ۔ ہیرا بائی روپیہ اُن سے لیتی اور سلام والد کو کرتی تھی ۔ یہ تو مجھے معلوم نہیں کہ اُن دکھیاروں کو موسیقی کی بھی کچھ سوجھ بوجھ پیدا ہوئی یا نہیں ۔ لیکن آخر میں وہ لکڑی خریدنے کے لائق ہی نہیں رہے تھے ۔ ایک نے تو دوالہ نکلنے کے بعد ہارمونیم مرمت کرنے کی دکان کھول لی ۔ دوسرا اس لائق بھی نہ رہا ۔ قرض خواہوں سے آبرو بچا کر بمبئی چلا گیا ۔ سنا ہے بغیر ٹکٹ کے روز تھیٹر دیکھتا اور مختار بیگم اور ماسٹر نثار کا گانا سنتا تھا ۔ مطلب یہ کہ تھیٹر میں پردہ کھینچنے کے فرائض انجام دینے لگا ۔ دن میں ترکی ٹوپی کے پھندنے بیچتا تھا ۔ سنا ہے اس زمانے میں داؤد سیٹھ بھی بمبئی میں پھندنے بیچتا تھا، حالانکہ اس نے تو ہیرا بائی کا گانا بھی نہیں سنا تھا ۔

اور یہ جو آپ ٹھمری، دادرے اور خیال میں ناچیز کا درک اور شغف دیکھ رہے ہیں ۔ یہ بابا ہی کا فیضان ہے ۔ اقبال بانو، ثریا ملتانیکر اور فریدہ خانم اب میری صورت پہچاننے لگی ہیں ۔ مگر میاں تجمل کہتے ہیں کہ صورت سے نہیں ۔ سفید بالوں سے پہچان لیتی ہیں! ارے صاحب! گزشتہ سال جو ڈانس ٹروپ آیا تھا، اس کے شو میں خدا جھوٹ نہ بلائے ہزار آدمی تو ہوں گے ۔ میاں تجمل کا ٹکٹ بھی مجھی کو خریدنا پڑا ۔ تیسرا حج کرنے کے بعد انھوں نے اپنے پیسے سے گانا اور سینما دیکھنا چھوڑ دیا ہے ۔ کہنے لگے اس جمِ غفیر و پُر تقصیر میں ایک آدمی بھی تم جیسا نہیں ۔ میں نے شکریہ ادا کیا تو بولے میرا مطلب ہے تمہاری طرح جھڑ دوس نہیں ۔ ایک آدمی نہیں جس کے تمام بال اور بھویں تک تمہاری طرح ہوں ۔ بھائی میرے! یا تو انھیں کالا کر لو یا ڈانس مجرے سے توبہ کر لو ۔ میں نے کہا "بھائی تجمل! اور سیاہی کے لیے سامعین کی قسمت کی ملامت کا طواف میرے لیے کافی ہے ۔ میں بیک وقت اپنا منہ اور بال کالے نہیں کرنا چاہتا ۔"

کوئی نماز اور فجر قضا نہیں کیا

ویسے آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ والد نیک طینت، پابندِ صوم و صلوٰۃ اور پاکباز آدمی تھے۔ بحمد اللہ! ہم سب بھائی بہن پنج وقتہ نمازی ہیں۔ یہ بھی ان ہی کا فیضان ہے۔ انھوں نے کبھی کوئی نماز اور فجر قضا نہیں کیا۔ ۲۳-۲-۱۹۷۲ء کا ذکر ہے۔ جب ایک پارسی تھیٹریکل کمپنی پہلے پہل کانپور آئی تو ایک مہینے تک ایک ہی کھیل روزانہ ۔ ۔ ۔ بلا ناغہ ۔ ۔ ۔ اس طرح دیکھا گویا پہلی مرتبہ دیکھ رہے ہیں۔ چند ہی روز میں تھیٹر والوں سے ایسے گھل مل گئے کہ ڈائیلاگ میں تین چار جگہ حسبِ منشا تبدیلی کروائی۔ ایک موقع پر داغ کے بجائے استاد ذوق کی غزل راگ ایمن کلیان میں گوائی۔ ہیرو کو سمجھایا کہ تم ڈائیلاگ کے دوران بیک وقت آنکھیں بھی شکاتی ہو اور کمر اور کولھے بھی۔ موقع کی مناسبت سے تینوں میں سے صرف ایک مہلک ہتھیار کا انتخاب کر لیا کرو۔ دو مرتبہ ہیرو کو اسٹیج پہ پہننے کے لئے اپنا صاف پاجامہ دیا۔ منیجر کو آگاہ کیا کہ تم نے جس شخص کو لیلیٰ کا باپ بنایا ہے، اس کی عمر مجنوں سے بھی کم ہے! مصنوعی داڑھی کی آڑ میں وہ لیلیٰ کو جس نظر سے دیکھتا ہے اسے پدرانہ شفقت ہرگز نہیں کہا جا سکتا۔

ایک دن چیف ماسٹر دردِ گردہ سے نڈھال ہو گیا تو ہمارے باوا ہارمونیم بجانے بیٹھ گئے۔ عطرِ حنا میں بسا ریشمی رومال سر پر ڈال لیا۔ اور فرض کر لیا کہ کوئی نہیں پہچانے گا! سرخی مائل سپید رنگ۔ سپید چمک دار دانت۔ پتلے ہونٹ۔ کم ہنستے تھے۔ مگر جب ہنستے تو رخساروں پہ سرخی اور آنکھوں سے چھلکنے لگتے۔ ہر لباس ان پر پھبتا تھا۔ چنانچہ شیریں بات تو فرہاد سے کرتی، لیکن نظریں ہمارے باوا پر ہی جمائے رکھتی تھی۔

تھیٹر سے ان کا یہ شغف والدہ کو شاق گذرتا تھا۔ ہم بہن بھائی سیانے ہو گئے تو ایک دن والدہ نے ان سے کہا کہ "اب تو یہ شوق چھوڑ دیجئے۔ اولاد جوان ہو گئی ہے۔" کہنے لگے "بیگم! تم بھی کمال کرتی ہو۔ جوان وہ ہوئے ہیں اور نیک چلنی کی تلقین مجھے کر رہی ہو!"

انھیں یہ شوق جنون کی حد تک تھا۔ آغا حشر کاشمیری کو شکسپیر سے بڑا ڈرامہ نگار سمجھتے تھے۔ اس موازنے میں دانستہ ڈنڈی مارنے یا تعصب کو ذرا دخل نہ تھا۔ انھوں نے سرے سے شکسپیر پڑھا ہی نہیں تھا۔ اسی طرح ایک دفعہ اپنے دوست پنڈت سورج نرائن شاستری سے اسی بات پر لڑ مرے کہ داغ دہلوی کالی داس سے بڑا شاعر ہے۔ دورانِ موازنہ دلیل میں زور پیدا کرنے کے لئے انھوں نے کالی داس کو ایک ناقابلِ بیان گالی بھی دی جس کا پنڈت جی پر خاطر خواہ اثر ہوا۔ اور انہوں نے (یعنی پنڈت جی نے) نواب سائل دہلوی جانشینِ داغ تک کو کالی داس سے بڑا تسلیم کرنے کے لئے از خود آمادگی ظاہر کی۔ جس دن آغا حشر کاشمیری کے انتقال کی خبر آئی تو والد کی جیبی گھڑی میں بارہ کے دستور کا نیہ تھے۔ دکان پر خریداروں کا ہجوم تھا، مگر اسی وقت دکان میں تالا ڈال کے گھر آ گئے۔ دن بھر منہ اوندھائے پڑے رہے۔ پنڈت جی پرسا دینے آئے تو چادر سے منہ نکال کے بار بار یہی پوچھتے، 'پنڈت جی! مختار بیگم* کا کیا بنے گا؟ بیچاری جوانی کیسے کٹے گی!' آخر کے تئیں پنڈت جی نے جواب دیا، 'خان صاحب' (وہ والد کو نہ جانے کیوں ہمیشہ خان صاحب ہی کہتے تھے) ہر بیچاری کو کوئی تیشہ بردار فرہاد مل جاتا ہے۔ ستی کا سہاگ بھی کبھی اجڑا ہے؟ اس کی مانگ تو سدا سیندور اور ستاروں سے بھری رہے گی۔' والد بچے ہی بچے گھر میں افسردہ اور دل گرفتہ داخل ہوئے، برآمدے کی چقیں ڈال دیں اور والدہ سے کہا 'بیگم، ہم لٹ گئے۔ آج گھر میں چولہا نہیں جلے گا۔' سرِ شام ہی تلافی نہ کھا کے سو گئے۔

---

* یہ آغا حشر کی منظورِ نظر طوائف تھیں۔

پنڈت جی موسیقی سے قطعاً نابلد تھے، لیکن بلا کے ادا شناس اور اتنے ہی غم گسار۔ دوسرے دن صبح تڑکے والد صاحب سے بھی زیادہ دل گرفتہ اور غم زدہ صورت بنائے، آہیں بھرتے آئے۔ شیو بھی بڑھا ہوا تھا۔ گھر سے حلوہ پوڑی اور کاشی پھل کی ترکاری بنوا کر لائے تھے۔ والد کو ناشتہ کروایا۔ ہمیں تو اندیشہ ہو چلا تھا کہ والد کے ڈر کے مارے پنڈت جی کہیں بھدرا نہ کروا لیں۔

آسمان سے اترا کوٹھے پہ اٹکا

معاف کیجیے، یہ قصہ شاید میں پہلے بھی سنا چکا ہوں۔ آپ بور تو نہیں ہو رہے؟ ہر بار تفصیلات میں کچھ فرق آجائے تو حافظے کا قصور ہے۔ غلط بیانی مقصود نہیں۔ باوا سے کبھی ہم نالک دیکھنے کی فرمائش کرتے تو وہ مینجر کو رقعہ لکھ دیتے کہ بچوں کو بھیج رہا ہوں۔ اگلی سیٹوں پر جگہ دیجیے۔ بعد کو میں خود ہی رقعہ لکھ کے باوا کے دستخط بنا دیتا تھا۔ یہ بات ان کے علم میں تھی۔ اسلئے کہ ایک دن جھنجھلا کر کہنے لگے "جعلی دستخط بناتے ہو تو بناؤ کم از کم املا کی غلطیوں سے تو مجھے رسوا نہ کروا۔ صحیح لفظ براہِ کرم ہے براۓ کرم نہیں" ہمیشہ میٹنی شو میں بھیجتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ میٹنی شو میں کھیل کا زہر اخلاق اثر ٹکٹ کی قیمت کی طرح آدھا رہ جاتا ہے۔ سب مجھے بچہ سمجھتے تھے، مگر اندر قیامت کی کُد بُد مچی تھی۔ منی بائی جب اسٹیج پر گاتی تو ایک سماں بندھ جاتا تھا۔ یہ وہ داغ والی منی بائی نہیں جس پر انھوں نے پوری مثنوی لکھ ڈالی۔ غضب کی آواز بلا کی خوبصورت۔ پلک جھپکنے، سانس بھی لینے کو جی نہیں چاہتا تھا کہ اس سے بھی خلل واقع ہوتا تھا کیا شعر ہے وہ اچھا سا؟ "وہ مخاطب بھی ہیں، قریب بھی ہیں" آپ کو تو یاد ہوگا۔ سر

(لقمہ) ان کو دیکھوں کہ ان سے بات کروں

شکریہ۔ صاحب حافظہ بالکل چوپٹ ہو گیا۔ محفل میں اوّل تو شعر یاد نہیں آتا۔ اور آ بھی جائے تو پڑھنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ بالکل بے محل تھا۔ جیسا کہ اس وقت ہوا۔ دُونی خِفّت ہوتی ہے۔ اس وقت دراصل "نظارے کو یہ جنبشِ مژگاں بھی بار ہے" والا شعر پڑھنا چاہتا تھا۔ خیر پھر کبھی۔ اسی لئے آپ نے بڑے تجربے کی بات کہی کہ پچپن کے بعد صرف ایک مصرع پر قناعت کرنی چاہیئے۔ تو صاحب، جس وقت منی بائی استاد داغ کی غزل گاتی تو نہ اسے ہوش رہتا، نہ سننے والوں کو۔

ایک جوش تھا کہ محوِ تماشائے جوش تھا

مانا کہ داغ بحیثیت عاشق، بزا ہوس پیشہ ہوا ہے اور اس کا معشوق زنِ بازاری۔ لیکن پیرایۂ اظہار بازاری نہیں۔ زبانِ محبت میں وصل قطعۂ معنی کی ہے۔ محاورہ اور روزمرہ داغ کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ مگر غضب یہ کیا کہ بچھانے کی چیز کو اوڑھ کر بسترِ ملامت عام پر دراز ہو گئے۔ حضرت داغ جہاں لیٹ گئے، لیٹ گئے۔ بقول آپ کے مرزا عبدالودود بیگ کے کلامِ داغ آسمانِ فصاحت سے اترا کوٹھے پہ اٹکا۔ وہاں سے پھسلا تو کوٹھے پہ آکے ٹکا۔ لیکن یہ فراق گورکھپوری کی سراسر زیادتی ہے کہ وہ اس شخص نے حرمزدگی کو genius کا مقام عطا کر دیا!

---

* مسلم کے مطابق [illegible] کے بعد [illegible] داڑھی اور مونچھ منڈھوانا۔

آپ نے تو خیر وہ زمانہ نہیں دیکھا مگر آج بھی .... کسی بھی محفل موسیقی میں .... داغ کی غزل چھٹ نہیں سکتی
دیکھنے والوں نے داغ کی مقبولیت کا وہ زمانہ دیکھا ہے جب مولانا عبدالسلام نیازی جیسے عالم بے بدل کو شاعری
کا شوق چرّایا تو داغ کے شاگرد ہو گئے۔ عقیدت کا یہ عالم کہ کوئی استاد کا شعر پڑھتا تو سبحان اللہ کہہ کر وہیں سجدے
میں چلے جاتے! تو میں کہہ رہا تھا کہ "زہر عشق" میں منی بائی نے داغ کی پانچ غزلیں گائیں۔ پانچوں لاجواب اور پانچوں کی پانچوں
بے محل۔ صاحب! سن ۴۷ کے بعد رنڈیاں تو ایسی گئیں جیسے کسی نے ٹوکا لگا دیا ہو۔ اب ویسی شائستہ طوائفیں
کہاں مگر یہ بھی سچ ہے کہ اب ویسے قدر داں بھی نہیں رہے نہ غزلوں میں مذاق .... الخ۔ ارے صاحب
آپ سے اس کم بخت الخ کا مطلب پوچھا تھا۔ آج تک بتا نہ دیا۔ اور جو آپ کہتے ہیں کہ آپ کو فکری بالکل نہ
آئی، تو یہ واقعی میں سچ ہے یا محض رسمی کسر نفسی؟

••

محمد عبدالقدیر
(حیدرآباد)

اُف! یہ بس کا سفر

مجھے پورا یقین تھا کہ وہ آئے گی اور ضرور آئے گی مجھے ہی کیا بلکہ میرے ساتھ وہاں جتنے لوگ تھے سب ہی کو اس بات کا یقین تھا کہ وہ آئے گی لیکن وہ یوں آسانی سے آنے والی چیز نہ تھی۔ اسے تو انتظار کرنے والوں سے جیسے والہانہ پیار ہے۔ جب وہ اپنے ہچکولوں کے جھرمٹ میں بے ڈھول اور ناہموار سی سڑک پر جس کی چپکبری سطح دائمی ناسور کی طرح ہمیشہ رستی ہی رہتی ہے، بڑے مست انداز میں جھومتی، گھومتی، کودتی اور پھاندتی ہوئی بس اسٹاپ پر ایک مفلس سی گڑگڑاہٹ کے ساتھ رکتی ہے تو سب کے سب اس کی طرف دوڑتے ہیں۔ اندر سے جو حضرات اترنا چاہتے ہیں ان میں ہر ایک کی یہ دلی تمنا ہوتی ہے کہ بس سے اترنے والا پہلا شخص ہونے کا شرف اسے ہی حاصل ہو اور وہ لوگ جو اپنی محبوب بس کے فراق میں ایک ایک پل کو بڑے کرب و بے چینی کے عالم میں کاٹ رہے ہوتے ہیں، ان کا جھنڈ کا جھنڈ بس کے دروازے کا کچھ اس طرح گھیراؤ کر لیتا ہے جیسے آئے دن وزراء اور ممبران پارلیمنٹ کا گھیراؤ ہوتا رہتا ہے۔ ان سوار ہونے والوں میں سے بھی ہر شخص کی تمنا یہی ہوتی ہے کہ سب سے پہلے وہی اندر داخل ہو۔ ابھی یہ دھکم پیل چل ہی رہی ہوتی ہے کہ بس ایک جھٹکے کے ساتھ آگے کو بڑھ جاتی ہے۔

آخر یہ کیسے ہماری بسوں پر جو ہر اسٹاپ پر صرف چند لمحات میں کئی انسانوں کو اگلتی ہیں اور کئی کو نگلتی ہیں اور پھر نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہیں۔ اس دوران میں کچھ لوگ چڑھ جاتے ہیں تو کچھ چڑھ رہے ہوتے ہیں اور کچھ چڑھتے چڑھتے رہ جاتے ہیں۔ کام کے اوقات میں ہماری بسوں کا عالم دیدنی ہوتا ہے۔ اکثر فٹ بورڈ کی جانب بسیں اس طرح جھک جاتی ہیں جس طرح شاخ ثمر دار پھلوں کے بوجھ سے جھک جاتی ہیں۔ ایسی بسوں میں اکثر [illegible] اختلاج جیسی کیفیات سے دوچار ہوتے ہیں۔ اگر ایسے میں ڈرائیور کو بریک لگانے کی ضرورت آ پڑے تو [illegible] اندرونی حالت کچھ عجیب سی ہو جاتی ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ

[illegible] ہو جاتی ہے

بسوں میں سفر کرنے کا میرا اپنا تجربہ تو یہی ہے کہ صرف چند ... [illegible]
لیا جاتا ہے۔ اکثر بسوں میں سوار ہونے کی نیت سے میں اپنے آپ کو اس بھیڑ کے حوالے کر دیتا ہوں جو
ہوشیاری چابکدستی اور پھرتی سے بس میں سوار ہونے کے
لئے ہر وقت مستعد رہتی ہے۔ اور خود کو اس بھیڑ کے حوالے کرنے کے بعد بلا ارادہ اور بنا کوشش کے
اکثر میں خود کو بس میں پاتا ہوں۔ لیکن اتنا ضرور ہوتا ہے کہ مجھے اپنے پیروں میں بسا اوقات ایک اور
[illegible] پیروں کو بس کے فرش پر ٹکانے کا موقع نہیں ملتا
اور میرے دونوں ہاتھ بس کے ڈنڈے کو تھامنے کی کوشش میں سرگرداں رہتے ہیں۔ جسم
اگر میرے گلے میں میرا لٹکا تھیلا یا بیگ بھی ہو تو پوزیشن کچھ اور مضحکہ خیز بن جاتی ہے۔ اکثر تھیلا
میرے گلے میں صرف ڈوری ہوتی ہے اور سالم بیاگ کسی اور کے قبضے میں اور میں صرف اس ڈوری کو
بڑی بے چارگی سے دیکھ کر اپنے بیاگ کی موجودگی کی تسلی کر لیتا ہے۔ پھر بھی اس بات کو غنیمت سمجھ لیتا
ہوں کہ مجھے بس کے اندر سفر کرنے کا تو شرف حاصل ہو گیا۔ قابل رحم وہ حضرات ہوتے ہیں جو بسوں میں
سفر کرتے ہوئے بھی بس کے باہر رہتے ہیں۔ بسوں کا فٹ بورڈ عجیب و غریب نظارے پیش کرتا ہے۔
کسی کی انگلی سیڑھی پر کسی کا ایک پیر ہوتا ہے کسی کے ایک پیر کا صرف انگوٹھا۔ اور کوئی تو ونڈ اسکرین
کو پکڑے ہوئے ہوا میں جھول رہا ہوتا ہے یعنی سفر کا سفر اور کرتب کا کرتب۔ یہی فٹ بورڈ پاکٹ
ماروں کی تربیت گاہ بھی ہے۔ چالان اور جرمانے کے ذریعے آمدنی۔ پولیس کی آمدنی کا باعث بھی یہی فٹ
بورڈ کے مسافر بنتے ہیں۔

ہماری بسوں کی ایک خصوصیت تو یہ ہے کہ اکثر ریوڑ کی شکل میں چلتی ہیں۔ عموماً ایک ہی نمبر کی اور ایک
ہی روٹ پر چلنے والی بسیں ایک قافلے کی شکل میں ایک مقام سے دوسرے مقام پر گھومتی پھرتی ہیں۔ بسوں
کے اس اتحاد، یک جہتی اور ہم آہنگی پر ہمیں کبھی کبھی رشک آنے لگتا ہے۔ بسوں کی اس متحدہ نقل و حرکت
کے کچھ فائدے بھی ہیں مثلاً اس قافلے کے نکل جانے کے بعد جو مسافر بس اسٹاپ پر رہ جاتے ہیں انہیں خاصی
دیر تک دوسرے قافلے کا انتظار رہتا۔ چنانچہ ان مسافروں میں غیر محسوس طور پر صبر و استقامت
برداشت، رواداری اور مفاہمت پیدا ہونا شروع ہو جاتی ہے۔

عام حالات میں ہم بس پر سوار ہوتے ہیں لیکن کبھی بس بھی ہم پر سوار ہو جاتی ہے ... [illegible]
[illegible]

وغیرہ
، اور کبھی سامنے بھینسوں کے ریوڑ، کبھی اسپیڈ بریکر اور کبھی کوئی بیل بنڈی وغیرہ کے آجانے سے اچانک بریک
ئے جاتے ہیں اس سے مسافر کبھی تو آگے کو اور کبھی پیچھے کی طرف ایک دوسرے پر لڑھکتے چلے جاتے ہیں۔ یہ
وے کھانے کی کیفیت مسافروں پر مسلسل طاری ہوتی رہتی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہم بچے کسی ایسے
ولے میں جھول رہے ہیں جو ہمیں برابر اوپر نیچے کر رہا ہو۔ بسا اوقات پیچھے کی نشست پر بیٹھے ہوئے حضرات
بخود دو دو بالشت اچھلنے لگتے ہیں۔ دو دو ہاتھ اچھلنے میں ان کی مرضی کا دخل نہیں ہوتا۔ یہ بس کی چال کی مرضی پر منحصر
تا ہے اور کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ کوئی آرام سے آخری نشست پر بیٹھا ہے اتنے میں ایک زوردار بریک پڑتا ہے
وہ بے چارہ بلا ارادہ بجلی کی سی سرعت سے آگے جا کر گرتا ہے۔ بسا اوقات یہ کیفیت بس کے درمیان میں
تع کسی ڈنڈے سے ٹکرانے کے بعد ختم ہو جاتی ہے۔ بس کے اندر رہنے والی اس اتھل پتھل کے نتیجے میں مسافروں
ہضمی نظام کبھی تو درہم برہم ہو جاتا ہے اور کبھی اس کے نتیجہ میں اس پر خوش گوار اور صحت بخش اثرات مرتب
تے ہیں۔

اسی طرح جن مریضوں کو بجلی کے جھٹکے دینے کو کہا جاتا ہے۔ انھیں بس کے جھٹکوں سے بھی کسی قدر افاقہ ہو
تا ہے۔ یہ جھٹکے عام انسانوں کے اعصاب پر کبھی تناؤ کا باعث بنتے ہیں اور کبھی بھولا سا بھلا کر تفریح کا
ان بھی فراہم کرتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ہماری بسیں سست و کاہل انسانوں کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر ان میں چستی،
رتی، چالاکی اور ہوشیاری پیدا کر کے انھیں چاق و چوبند بناتی ہیں۔ یہ بات پورے اعتماد سے کہی جا سکتی
کہ اگر کوئی شخص پہلی مرتبہ ہماری بسوں کی مختلف چالوں سے آشنا نہ ہو، (چالوں سے میری مراد دلکی، برغا، سرپٹ
جھٹکا وغیرہ سے ہے) تو ہمیں یقین ہے کہ شام جب وہ اپنے گھر لوٹے گا تو اس کا پور پور اور جوڑ جوڑ درد کا پھوڑا بنا
ہوگا۔ اس کے برعکس جو حضرات اس سفر کے عادی ہو گئے ہیں وہ ایک آدھ دن کسی وجہ سے گھر ہی پر چھٹی منائیں
سفر نہ کرنے کی پاداش میں ان پر بھی یہی کیفیات طاری ہو جاتی ہیں۔

چلتی ہوئی بس کو پکڑنا اور چلتی ہوئی حالت میں بس میں سے اترنا بھی ایک فن ہے۔ اس فن میں مہارت
حاصل کرنے کے لیے بڑی محنت، مشقت اور ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اکثر نوجوان بڑی آسانی سے اس
میں مہارت حاصل کر لیتے ہیں۔ یہ نوجوان اس فن کے نوسیکھے لوگوں کی ہمت افزائی میں بھی اپنا جواب نہیں رکھتے
فٹ بورڈ پر ٹھہرے ہوئے لوگوں کو اکثر بلا لحاظ مذہب و ملت اس نوجوان کے ساتھ اپنی ہمدردی کو وابستہ کرتے دیکھا
گیا جو تیز رفتار بس کو پکڑنے کی سعی میں دوڑ رہا ہوتا ہے۔ اس بھاگ دوڑ سے ہمارے نوجوانوں میں دوڑ کی اچھی خاصی
مشق ہو رہی ہے۔ اگر اس کو جاری رکھا گیا تو . . . .
. . . بین الاقوامی مقابلوں میں ہمارے نوجوان اپنا نام پیدا کر سکتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ فٹ بورڈ پر لٹکنے والے نوجوانو
میں ایسی صلاحیتیں پوشیدہ ہوتی ہیں۔ اگر ان کی مناسب تربیت کی جائے تو وہ جمناسٹک اور مارشل آرٹس وغیرہ
میں بھی مہارت حاصل کر سکتے ہیں۔

یہ امر انتہائی افسوس ناک ہے کہ ہمارے یہاں جب بچہ آنکھ کھولتا ہے اس وقت سے وہ بس کے پیچھے
دوڑنا شروع کرتا ہے۔ اسی حالت میں نوجوانی کی منزل کو پہنچتا ہے اور بس کے پیچھے دوڑتے دوڑتے اپنی عمر کی آخری

منزل کو جا لیتا ہے اور یہ بات بھی بعید از حقیقت نہیں کہ ہمارے یہاں کے لوگوں کی عمر کا ایک بڑا حصہ بس کے انتظار میں اس کے پیچھے دوڑنے میں اور اس میں سفر کرنے میں خرچ ہو جاتا ہے۔

ہماری تہذیبی زندگی میں بسوں کی جو اہمیت و افادیت ہے اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا اندازہ ہمیں اس وقت ہوتا ہے جب کسی ہڑتال بند، راستہ روکو یا اس قسم کے کسی اور احتجاج کے موقع پر جب بسیں بند کر دی جاتی ہیں اس وقت شہر کی تمام گہما گہمی ختم ہو جاتی ہے۔ بس اسٹاپ سونے ہو جاتے ہیں اور تمام لوگ اپنے آپ کو پیدل اور بے بس محسوس کرتے ہیں ۔ ان باتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ بسیں ہماری زندگی کا جزو ہیں جو ہمیں نہ صرف منزل مقصود کو پہنچاتی ہیں بلکہ بعض وقت آخری منزل کو پہنچنے کا ذریعہ بھی ہو جاتی ہیں ●



بال کاٹیں یا چوٹی گوندھیں



کتنی عجیب بات ہے کہ دس سال جیل میں رہ کر یہ کتابیں لکھی ہیں اور ان کے شائع ہوتے ہی حکومت پھر مجھے جیل بھیج دے گی ۔

سنجر ہلال بھارتی
(کلکتہ)

سارے جہاں سے اچھا....

آج دوپہر کی ڈاک سے درجنوں خطوط آئے مگر خریداروں کی مسلسل آمدورفت کے سبب ایک خط بھی پڑھ نہ سکا۔ دکان میں جیسے جیسے خریداروں کی بھیڑ میں اضافہ ہوتا، ابّو کے تدبّر اور بردباری کی داد دینی پڑتی۔ گریجویشن کرنے کے بعد دو سال تک بے کار بیٹھا رہا اور گھر والوں کے اصرار پر سروس کی آس چھوڑ دی۔ ابّو کہتے ــــ بیٹے! پڑھنے لکھنے کا مقصد یہ ہرگز نہیں کہ انسان اپنا مقدّر ملازمت سے وابستہ کرلے۔ پڑھے لکھے نوجوانوں کو سروس کی بجائے بزنس کی طرف اپنی توجہ مبذول کرنی چاہیے۔ بالآخر ابو کے فیصلے کے آگے مجھے سرِ تسلیم خم کرنا پڑا اور گھر والوں کے متفقہ فیصلے کے بموجب مجھ پر ایک جنرل اسٹور چلانے کی ذمّہ داری سونپ جانے لگی۔

"گمراتی! بہتر ہوگا کہ صدر بازار میں دکان کھولی جائے۔" میں نے اپنے خیال کا اظہار کیا۔

"ہرگز نہیں.....! میری حقیر رائے ہے کہ مولانا اسٹریٹ میں دکان کے لیے کوئی جگہ تلاش کی جائے۔" امّی نے اپنا فیصلہ سناتے ہوئے کہا۔

"غلط ــــ غلط ــــ" ابّو نے ویٹو کرتے ہوئے کہا۔

"تو پھر ــــ؟" میں نے جواب طلب نگاہوں سے دیکھتے ہوئے وضاحت چاہی۔

"سنو! دکان ہنومان گنج میں کھلے گی۔" ابّو نے فیصلے کی دیوار میں آخری کیل ٹھونک دی گمراتی کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"بیگم! دراصل میرا خیال ہے کہ دکان کے لیے وہی علاقہ بہتر ہوگا جہاں مسلمانوں کی بڑی آبادی ہو۔" ابو نے وضاحت کی مگر امّی بیکراں استعجاب بنی رہیں جیسے ابو کے فیصلے سے وہ مطمئن نہ ہوں۔

"بیگم! میرے سر کے بال دھوپ میں نہیں پکے۔ دراصل میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جہاں مسلمانوں کی آبادی ہوگی وہاں جہالت ہوگی اور جہاں جہالت ہوگی وہاں منافع زیادہ ہی کمایا جا سکتا ہے۔ لہٰذا بزنس کے لیے ہنومان گنج ہی

میرا انتخاب ہے کیوں کہ وہ بیور مسلم آبادی کا علاقہ ہے۔ تعلیم یافتہ اور حساس علاقوں میں ہی اصلی قیمت نہیں مل سکتی۔ آج کل اجناس کے ڈبوں اور پاکٹوں پر قیمتیں لکھی ہوتی ہیں اور تعلیم یافتہ لوگ انھیں پڑھ کر قیمت ادا کردیتے ہیں جبکہ بنگالیوں کو دیکھیے کتنے فارورڈ ہوتے ہیں کہ وہ ایک پیسے کے لیے ٹرامیں اور بسیں جلا ڈالتے ہیں۔ ابو نے وضاحت کی۔

"مگر ـــ مگر ـــ ..." امی کچھ کہتے کہتے رک گئیں۔

"ہاں ہاں کہیے کیا بات ہے؟" ابو نے زور دے کر پوچھا۔

"مگر ہنومان گنج کا علاقہ متنازعہ بھی بن سکتا ہے۔" امی نے خدشے کا اظہار کیا۔

"سنیے بھی! جب میں حالات کی نبض پر انگلی رکھتی ہوں تو مجھے ایسے محسوس ہوتا ہے کہ اگر کبھی ایڈوانی جی کی توجہ ہنومان گنج کی طرف مرکوز ہو گئی تو پھر وہ اس علاقے کی وجہ تسمیہ کی تفتیش شروع کردیں گے اور پھر وہ دوسرا اجودھیا بن جائے گا۔"

امی نے اپنی دوراندیشی اور دوربینی کا مظاہرہ کیا اور ابو نے بھرپور قہقہہ لگاتے ہوئے: "بھئی! میں تمھاری قیاس آرائی کی داد دیتا ہوں مگر دنیا میں منطق کا کیا علاج ہو سکتا ہے؟" اس طرح ابو نے اپنے فیصلے کی تکمیل کردی اور دکان ہنومان گنج میں کھل گئی۔

آج ہفتے کا آخری دن تھا اس لیے خریداروں کی لائن لگی رہی۔ اتنی طویل مصروفیات کے آئے ہوئے خطوط میرا منہ تکتے رہے اور میں انھیں سرمۂ چشم بناتا رہا۔ دراصل دو مہینے قبل میری ایک غزل دلّی کے ایک ادبی میگزین میں شائع ہوئی تھی جس کے بعد مدیرانِ رسائل کے فرمائشی اور مداحوں کے تعریفی خطوط کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ ہاف ڈے کے باعث آج دو بجے دکان بند کردی۔ گھر آکر خطوط کی طرف متوجہ ہوا۔ ایک خط چھوٹی خالہ اماں کا کناڈا سے آیا تھا۔ انھوں نے لکھا تھا کہ اس بار عید وہ ہمارے درمیان کرنا چاہتی ہیں۔

خط پڑھ کر میرے دل میں مسرتوں کا طوفان اٹھنے لگا۔ خالہ اماں سے مجھے بے پناہ محبت ہے۔ جب میں سات سال کا تھا تو ان کی شادی ہوئی تھی اور کچھ ہی دنوں کے بعد وہ اپنے خاوند کے ساتھ کناڈا چلی گئیں۔ سات برس تک مجھے وہ گود کھلاتی اور چھوٹے بھائی کی طرح پیار کرتی رہیں۔ کناڈا رخصت ہوتے وقت انھیں مائیکے چھوٹنے کا اتنا غم نہ تھا اس سے کہیں سوا وہ میری جدائی سے مضطرب تھیں۔ میں نے لپک کر یہ خوش خبری امی کو سنائی۔ وہ فرطِ انبساط سے اچھل پڑیں: "زاہدہ انڈیا آرہی ہیں! اللہ کرے ایسا ہی ہو۔ بہت ترس گئے اسے دیکھے ہوئے۔ پورے سولہ سال!!"

خالہ اماں کی فلائٹ کی تاریخ جوں جوں قریب آتی گئی میرا اشتیاق بڑھتا گیا۔ آنے والے مسرت آگیں لمحوں کے احساسات سے محبت آمیز اضطراب محسوس کرنے لگا۔ مجھے دیکھ کر وہ کتنی مسرور ہوں گی! کتنا ٹوٹ کر مجھے پیار کریں گی!! میں بھی خالہ اماں کے قدموں پر اپنا سر رکھ دوں گا۔ ان کی خدمت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھوں گا۔

دم دم ایرپورٹ پر خالہ اماں کے ویل کم کے لیے امی بھی میرے ساتھ تھیں۔ جہاز اپنی جگہ آکر ٹھہر گیا۔ تمام مسافر یکے بعد دیگرے باہر آنے لگے۔ امی نے دور ہی سے خالہ اماں کو پہچان لیا اور اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے کہنے لگیں ـــ "نوید بیٹے دیکھو، زاہدہ گرین ساری میں ملبوس ہے۔ وہ دیکھو! جہاز کا آخری زینہ طے کر رہی ہے۔"

اور پھر وہ لمحہ بھی آیا جب امی اور خالہ اماں ایک دوسرے سے اس طرح لپٹ کر مسرتوں کے آنسو بہانے لگیں جیسے

بیان کرنے کے لیے دنیا میں اب تک کوئی زبان ایجاد نہیں ہوئی۔ جب اظہارِ تشکر کے آنسو تھم گئے تب خالہ امّاں نے میرے ہاتھوں کو دیوانہ وار چومنا شروع کر دیا۔

"نوید بھیا ـــــ ارے! تم اتنے بڑے ہو گئے؟" اور میری آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب اُمنڈ پڑا۔

رات کے دو بج گئے مگر ہماری آنکھوں کی نیند اُڑ چکی تھیں۔ خالہ امّاں کینیڈین تہذیب اور رسم و رواج کے قصّے بیان کرتی رہیں اور ہم لوگ سراپا استعجاب بنے سنتے رہے۔ آج ماہِ مبارک کی ۲۵ ویں شب تھی۔ سحری کھا کر سو گیا۔ چھٹی کا دن تھا بے فکری تھی اس لیے صبح ذرا دیر سے آنکھ کھلی۔ خالہ اماں نے دس ہزار روپے تھماتے ہوئے کہا۔

"یہ کئی برسوں کے فطرے اور زکوٰۃ کے روپے جمع ہو گئے ہیں، انھیں حاجت مندوں اور مسکینوں میں تقسیم کر دو۔"

"اتنے روپے آپ نے اندین مسکینوں کے لیے بچا رکھے، خالہ امّاں؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"بیٹے! خدا کی لعنت ہو مغربی ملکوں پر۔ روپے دو روپے ہاتھ میں لے کر صبح سے شام تک پورے شہر میں گھوم جاؤ۔ کیا مجال کہ ایک بھی محتاج اور دستِ طلب دراز کرنے والا مل جائے۔ کم بخت کوئی لینے والا نہیں! اللہ کی پھٹکار ہو ایسے ملکوں پر۔ اپنا ہندوستان دیکھو! کتنا گریٹ ہے؟ کسی بھی مسجد یا مندر کے پاس چلے جاؤ، محتاجوں اور کنگالوں کی قطاریں لگی رہتی ہیں۔ گھر سے نکلو اور ہزاروں روپے دان کر کے چلے آؤ۔ کوئی پرابلم ہی نہیں۔ اللہ محفوظ رکھے میرے ہندوستان کو!! ڈاکٹر اقبال نے کتنی خدا لگتی بات کہی ہے کہ

" سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا"

اقبال واجد
کشن گنج (بہار)

فرقت کاکوروی

کی مزاح نگاری

فرقت کاکوروی (۱۹۱۰-۱۹۷۲ء) بیسویں صدی کے ان ممتاز مزاح نگاروں میں ہیں، جنھوں نے آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد ایک لمبے عرصے تک اپنی مزاح نگاری کے ذریعہ اردو ادب میں طنز و مزاح کا گراں قدر سرمایہ پیش کیا ہے اور ۱۹۳۲ء تک چالیس سال کے طویل عرصہ میں مسلسل زندگی، ادب اور ثقافت کے مسائل پر مزاح کے مختلف اسالیب اور اصناف میں اپنی تخلیقی جمالیات کا اظہار کیا ہے۔

فرقت نے عام مزاح نگاروں کی طرح سے محض ہنسنے ہنسانے کو اپنا شعار نہیں بنایا نہ اپنی تحریروں میں انھوں نے محض تفریحی پہلو پیش نظر رکھا۔ ان کی مزاح نگاری کے تناظر میں ہمیں ادب اور زندگی کی مختلف قدروں کے ٹوٹنے اور بکھرنے کا المیہ نظر آتا ہے اور بعض ایسے روشن مقاصد بھی ملتے ہیں، جن پر محکم ارادے اور عزائم کے ساتھ عمل پیرا ہو کر فرقت نے اپنی مزاح نگاری کو ایک عظیم اصلاح پسند آلۂ کار کی حیثیت دے دی ہے۔ نئے ادبی اقدار کو نشانہ بنانے اور ان کی تبدیلیوں کو قبول نہ کرنے کا اثر یہ ہوا کہ تمام کٹر قسم کے ترقی پسند نقّاد فرقت سے خفا ہو بیٹھے اور انھوں نے ان کے سلسلے میں خاموشی اختیار کی۔ اس لیے آج نئی نسل کے سامنے فرقت کے وہ عہد آفریں کارنامے نہ آسکے جو ماوا اور ناروا، کی شکل میں محفوظ ہیں۔ اگرچہ دونوں کتابیں اب نایاب ہو چکی ہیں۔ 'ماوا اور ناروا' کا مطالعہ محض اس اعتبار سے اہم نہیں ہے کہ اوّل الذکر فرقت کی ان تحریفات کا مجموعہ ہے جو انھوں نے ترقی پسند شاعروں کی نظموں پر کہی ہیں اور آخر الذکر تمام ترقی پسند شعرا کے مزاحیہ تذکرہ کی حیثیت رکھتا ہے بلکہ یہ دونوں کتابیں ترقی پسند تحریک کے تمام پہلوؤں کے روشن مطالعہ کے لیے از حد ضروری ہیں۔

جدیدیت پسند شعرا اور ناقدین بھی فرقت کو نظر انداز کر گئے۔ اس لیے ۱۹۶۰ء، ۱۹۷۰ء سے

متاثر ہوکر اپنے مجموعے "قدمچے" میں تقریباً دو سو ایسی نظمیں کہہ ڈالیں جو یقیناً جدید شعرا و ناقدین کے لیے بار خاطر ثابت ہوئیں۔ "قدمچے" سے ناراض ہونے کی دو وجوہات ہیں؛ اوّل یہ کہ فرقت نے جدید شاعری کی موضوعی اور ہیئتی بے راہ روی کی شدید طور پر نقل اتارنے کی کوشش کیوں کی؟ دوئم یہ کہ انھوں نے اس مجموعے کا نام قدمچے کیوں رکھا؟ ایک صاحب نے قدمچے کی حمایت میں لکھا کہ ماہر امراض سب سے پہلے مریض کو blood test کرانے کا مشورہ دیتا ہے اس لیے فرقت نے بھی ماہر امراضِ شعر کی حیثیت سے جدید شاعری کا blood test ہمارے سامنے پیش کر دیا ہے۔

ترقی پسند حضرات تو فرقت سے خفا تھے ہی، اب جدیدیے بھی ان سے خفا ہو بیٹھے اور ان لوگوں سے فرقت کو سمجھنے میں شدید غلطی ہوئی کہ انھوں نے اپنے دوست کو اپنا دشمن سمجھ لیا۔ ادھر فرقت کی مقبولیت کا یہ حال رہا کہ نئی نسل کو کوئی 'مداوا' اور 'نارسا' کا نام بھی یاد دلانے والا نہ رہا۔ اس لیے فرقت کی مزاح نگاری کا مکمل جائزہ لینے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ان کی جملہ تصنیفات کا نام سرسری طور پر لے لیا جائے۔ فرقت کی موت ۱۹۷۳ء میں ہوئی۔ اس وقت تک ان کی جو کتابیں منظرِ عام پر آ چکی تھیں وہ درج ذیل ہیں:

'مداوا' (ترقی پسند شاعری کی تحریکات کا مجموعہ ۱۹۴۴ء) 'نارسا' (ترقی پسند شعرا کا مزاحیہ تذکرہ) "قدمچے" (جدید شاعری کی تحریف) کفِ گلفروش (مزاحیہ و طنزیہ مضامین کا مجموعہ) 'صید و ہدف' (مزاحیہ اور طنزیہ مضامین کا مجموعہ) شوخیِ تحریر (مزاحیہ نظموں کا مجموعہ) ایک رات میں تین شو (مزاحیہ مضامین اور تحریفات کا مجموعہ) مسکراہٹیں (ہندی) مزاحیہ شرح دیوان غالب (مزاحیہ شرح)

فرقت کی تخلیقی جمالیات کسی مخصوص صنف یا فورم کی محتاج نہیں ہے بلکہ اس کا اظہار کبھی مزاحیہ و طنزیہ نظموں اور مضامین کی شکل میں کبھی نثری اور شعری تحریفات کی شکل میں اور کبھی انشائیوں کی شکل میں ہوا ہے اس لیے فرقت کی مزاح نگاری کا جائزہ لینے کے لیے ضروری ہے کہ ان تمام اصناف کی روشنی میں ان کا مقام متعین کرنے کی کوشش کی جائے جو ان کے تخلیقی اظہار کا ذریعہ بنی ہیں۔

فرقت کے مزاحیہ و طنزیہ مضامین کے پانچ مجموعے کفِ گل فروش، صید و ہدف، ایک رات میں تین شو، مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں اور غالبِ خستہ کے بغیر شائع ہوئے۔ گرچہ یہ مجموعے مزاحیہ و طنزیہ مضامین کے نام سے شائع ہوئے ہیں، لیکن تمام مجموعوں میں بعض تحریریں ایسی بھی ہیں جنھیں ہم انشائیہ کہہ سکتے ہیں بلکہ معیاری انشائیوں کے مقابل رکھ سکتے ہیں۔ کسی نے صحیح کہا ہے کہ ابتدا میں ہمارے یہاں انشائیوں کی حیثیت اس ہاتھی کی سی تھی جس کے متعلق چار اندھے مختلف قیاس آرائیوں میں مبتلا تھے، لیکن گزشتہ ربع صدی میں یہ پورا ہاتھی پاکستان میں دریافت کر لیا گیا ہے۔ کہنے والے نے پہلی بات تو ٹھیک ہی کہی لیکن دوسری بات میں کہ یہ ہاتھی پاکستان میں دریافت کر لیا گیا ہے مبالغہ سے کام لیا ہے۔ پاکستان میں کیوں؟ خود ہندوستان اختر اورینوی، رشید احمد صدیقی، محمد حسن اور سید محمد حسنین سے لے کر صفی مرتضیٰ، ڈاکٹر وہاب اشرفی، علیم اللہ حالی، احمد سجاد، ابوذر عثمانی اور تمنا مظفرپوری تک نہ جانے کتنے نقادوں نے مل کر اس پورے ہاتھی کو دریافت کر لیا ہے۔ آپ خود ستائی کی ازم کے آگے کہا کیجیے کہ ڈاکٹر وزیر آغا صاحب

مگر حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان میں یہ صنف پہچانی گئی، ہندوستان میں پروان چڑھی اور محض لفظوں کے گورکھ دھندوں والی ہجرت کرکے (ورنہ کھگوڑی بن کے) پاکستان چلی گئی اور وہاں پہنچی تو اپنی پیدائش بھول گئی۔ حالاں کہ رشید احمد صدیقی، کنہیا لال کپور، فرقت کاکوروی، علی اکبر قاصد، احمد جمال پاشا، یوسف ناظم، سید محمد حسنین اور کرشن چندر نے تقسیم سے پہلے اور بعد میں مجتبیٰ حسین نے اس صنف کی [illegible] کی ہے اور اس کے خدوخال واحوال واضح کیے ہیں۔

فرقت کاکوروی نے آزادی سے پہلے انشائیہ لکھنا شروع کیا اور آزادی کے بعد تو وہ بہت دور اور دیر تک انشائیہ لکھتے رہے۔ ان کے مزاحیہ و طنزیہ مضامین کے وہ تمام مجموعے جن میں انشائیے بھی شامل ہیں آزادی کے بعد ہی منظر عام پر آئے۔ اس لیے فرقت کے انشائیوں میں آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد کے ہندوستان کی مکمل تصویر ابھرتی ہے۔ فرقت نے لکھنوی تہذیب و تمدن میں آنکھیں کھولیں، تربیت پائی اور معاش کے سلسلے میں ایک عرصے تک دہلی میں رہے بلکہ آخری وقت تک دہلی ہی سے وابستہ رہے، اس لیے ان کے یہاں لکھنوی تہذیب و تمدن اور رسم و رواج کی جھلکیاں بھی دیکھنے کو ملتی ہیں اور دہلی کی ادبی اور ثقافتی فضا کے واضح نقوش بھی۔ ان ثقافتی اور تمدنی نقوش کا پرلطف اظہار فرقت کے تقریباً تمام انشائیوں میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ ان کے اظہار میں انھوں نے مربوط عبارت آرائی کی ہو یا انشائیہ کو مزاحیہ مضمون سے قریب کر دیا ہو بلکہ منتشر اور غیر منظم تاثرات کو ایسی حسین تخلیقی وحدت کے ساتھ پیش کیا ہے کہ فنِ انشائیہ اور انشائیہ ہر دو کا معیار برقرار رہ گیا ہے۔ اپنے انشائیوں میں فرقت زیادہ تر اپنی زندگی اپنے تجربات اور اپنے محسوسات کو کچھ اس انداز سے پیش کرتے ہیں کہ ان کے انشائیے ان کی ذات کا شناختی کارڈ معلوم ہوتے ہیں۔ کسی مشرقی اور غالباً ہماری نقاد نے کہا ہے کہ انشائیہ خط کی طرح اپنی تلاش اور اپنی دریافت ہے۔ اس لیے فن انشائیہ نگاری کے باب میں فرقت انشائیہ کے تمام اصولوں کو اختیار کرتے ہیں۔ فرقت کو انشائیہ کی داخلی جمالیات کا احساس ہے اس لیے انھوں نے اپنے انشائیوں میں اصلاحی پہلو کے در آنے کی پوری گنجائش چھوڑی ہے اور تفریحی پہلو بھی مدِنظر رکھا ہے۔ "بھرا حجاب" "تیسری پائدان کی تہ میں" "جانے کی عجلت" "آئے بھی وہ گئے بھی وہ" "مکان کی تلاش میں" اور "اعتراضات" ان کے کامیاب اور معیاری انشائیے ہیں۔ ان انشائیوں میں طنز و مزاح اور شگفتگی کے ساتھ ایک خاص سنجیدہ معیار اور وقار بھی نظر آتا ہے۔ لیکن افسوس کی بات ہے کہ گزشتہ ربع صدی میں انشائیہ نگاروں پر جو کچھ لکھا گیا اس میں فرقت کے سلسلہ میں بہت کم لکھا گیا ہے۔ اس لیے ان پر بہت کچھ لکھنے کی گنجائش ہے۔ ●

ماہنامہ
شگوفہ
حیدرآباد

زندہ دلان حیدرآباد کا ترجمان

جلد ۲۵ شمارہ ۸

اگسٹ ۱۹۹۲ء

سرورق: طالب خوندمیری
کتابت: محمد غالب ۔ محمود سلیم فیضل محمد

طباعت: دائرہ پرنٹنگ پریس
چھتہ بازار ۔ حیدرآباد

فی پرچہ : ۶ روپے
سالانہ خریداری : ۶۵ روپے
بیرونی ممالک سے : ۲۰ ڈالر

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ:۔
۳۱۔ بیچلرز کوارٹرز ۔ معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد
فون 557716 رہائش: 521064

اس تھیلی کے چٹّے بٹّے

(فہرست)

مالِ مفت (انشائیے)

مالِ مسروقہ (ڈائجسٹ)

یہ ہے بامبے مری جاں

کاک ٹیل

پوسٹ مارٹم (تنقیدی جائزہ)

چورن (منظومات)

آندھرا پردیش ریاستی اقلیتی فینانس کارپوریشن

4-1-825/8 سکنڈ فلور لکشمی اسٹیٹ عابڈز۔ حیدرآباد ۔ ۱۰

حکومت آندھرا پردیش کی جانب سے چلنے والا ادارہ جہاں ریاست سے تعلق رکھنے والے اقلیتی افراد، مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی، جین، بدھسٹ کو قرضہ جات کی فراہمی کی جاتی ہے، یہ قرضہ جات (۱۲) اسکیموں کے تحت دیئے جاتے ہیں۔

۱۔ غربت ہٹاؤ اسکیم ۲۔ خود روزگار اسکیم

۱۔ غربت ہٹاؤ اسکیم :- اس اسکیم کے تحت 10,000 ہزار روپے کی جملہ لاگت کے کاروبار کے لیے جیسے کرانہ اسٹور، سیکل ٹیکسی، بک بائنڈنگ، ترکاری فروشی، اگربتی تیار کرنے کے لیے میوہ فروشی وغیرہ وغیرہ کے لیے قرضہ جات دیئے جاتے ہیں۔ اس جملہ لاگت کا ۲۵ فیصد کارپوریشن سے دیا جاتا ہے اور اس کو ۲۰ آسان ماہانہ اقساط میں بہ شرح ۴٪ کے ساتھ ادا کرنا پڑتا ہے اور ماباقی بنک کے ذریعہ دلایا جاتا ہے اور اس اسکیم میں درخواست گذار کی سالانہ آمدنی 6000 روپے سے کم ہونی چاہیئے۔

۲۔ خود روزگار اسکیم :- اس اسکیم کے تحت 2,00 000 لاکھ روپے کی جملہ لاگت کے کاروبار کے لیے جیسے چھوٹی صنعتیں، گھریلو صنعتیں، کسی بھی قسم کی تجارت، پرنٹنگ پریس میڈیکل شاپ، زیراکس مشین کے لیے، آٹو رکشا، آٹو ٹرالی وغیرہ وغیرہ کے لیے قرضہ جات دیئے جاتے ہیں۔ اس جملہ لاگت کا ۲۰ فیصد کارپوریشن کی جانب سے بطور "مارجن منی" بہ شرح سود ۶½ فیصد پہ دیا جاتا ہے۔ اور اس کو (۳۰) آسان اقساط میں واپس کرنا پڑتا ہے اور باقی رقم بنک سے دلائی جاتی ہے۔

یہ کارپوریشن، تمام ریاست میں اب تک 41890 افراد میں 6,98,59000 روپے مارجن منی جاری کر چکا ہے جس کی جملہ لاگت 29,51,64000 روپے ہے۔

خواہش مند افراد مندرجہ بالا پتہ پر رجوع ہوں۔

محمد لائق علی خاں
مینیجنگ ڈائرکٹر

یوسف ناظم

روٹی کانفرنس

پچھلے دنوں سخت جاڑے کے موسم میں جب درجۂ حرارت صفر ڈگری کو چھوڑ رہا تھا دن کے ۱۱ بجے جزیرۂ سارے گاما کے کارزار ہال میں ایک روٹی کانفرنس منعقد ہوئی جس میں دنیا بھر کے گرسنہ اور پیاسے ملکوں کے نمائندوں کا وہ اژدہام تھا کہ ہال میں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی کیوں کہ اس عالم خاک و باد کے صرف تین یا چار ملک ایسے تھے جنھیں اس کانفرنس میں شرکت کی ضرورت نہیں تھی۔ کانفرنس میں شریک ہونے والے مندوبین کے چہرے یہ بتا رہے تھے کہ یہ اپنے ملک کے صحیح نمائندے ہیں ورنہ اب تک جو بھی عالمی سطح کی کانفرنسیں منعقد ہوئیں ان کے شرکا کے چہرے بشرے سے معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ وہ کسی پسماندہ ملک کی نمائندگی کر رہے ہیں (یہ ناجائز نمائندے ہوا کرتے تھے) چہرے پر بشاشت ہی بشاشت ہوتی تھی۔ قرض لینے جاتے تھے لیکن جس ہوٹل میں قیام فرماتے تھے اس کے بھی مقروض ہو کر واپس ہوتے تھے۔ یہ تو پریس والوں کو بعد میں معلوم ہوا کہ ان کے چہروں پر جو نمک اور رونق تھی وہ روغنِ قاز کی دین تھی۔ کہا جاتا ہے پسماندہ ملکوں میں اور تو کوئی روغن ملتا نہیں ہے لیکن روغنِ قاز کا ذخیرہ وہاں موجود ہے اور وہ بھی اتنا ذخیرہ جیسے وہاں اس تیل کے کنویں ہوں۔ لیکن روغنِ قاز کے کنویں ہو نہیں سکتے تھے ہوتے تو خودکشی کی وارداتیں بھی انھیں کنوؤں میں ہوتیں۔ بہرحال ان پسماندہ ملکوں کے باشندے یہی روغنِ قاز اپنے نمائندوں کو تحفے میں پیش کرتے تھے۔ جس دن بھی ان نمائندوں کو روغنِ قاز کی بوتل نہیں پہنچی تو کوئی دنگا ہو جاتا یا راشن کی دوکانوں پر تالا پڑ جاتا۔ (روغنِ قاز اب پاؤڈر کی شکل میں بھی ملنے لگا ہے) اس روٹی کانفرنس کے نمائندے البتہ صحیح نمائندے تھے۔ سردی سے کانپ رہے تھے۔ کمبل اوڑھے تھے اس لیے نظر بھی آ رہے تھے ورنہ حقیقت میں یہ نمائندے بے حد دبلے پتلے، مہین اور باریک واقع ہوئے تھے۔ انھیں تولا تو جا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ انھیں پھولوں میں بھی تولنے کی کوشش کی جاتی تو پھول کی پتی سے ان کا جگر کٹ جاتا۔ ان کی سقیم حالت کو دیکھتے ہوئے ہر نمائندے کے لئے دو دو مائیکروفون رکھے گئے تھے تاکہ ان کی منحنی آواز کو سہارا ملے۔

روٹی کانفرنس کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ چوٹی کانفرنسیں تو بہت ہو چکیں اور اتنی زیادہ ہو چکیں کہ اب صرف ماؤنٹ ایورسٹ کی چوٹی پر کانفرنس ہونا باقی رہ گیا ہے۔ تجویز تو اس کی بھی پیش کی گئی تھی لیکن شرکائے کانفرنس کو اتنی بلندی پر چڑھانا ممکن نہیں تھا۔۔۔ جب بھی کسی کانفرنس کے نتائج کا جائزہ لیا گیا ایک اور چوٹی کانفرنس کی ضرورت محسوس کی گئی لیکن اب یہ طے کیا گیا کہ مذاق بہت ہو چکا۔ کوئی کام کی بات بھی ہونی چاہیے۔ کیوں کہ دنیا میں غریبی بہت پھیل رہی ہے اور پھیل کر ان بڑے ملکوں کی سرحدوں میں بھی داخل ہو گئی ہے جو دوسرے ملکوں کو ہتھیار، اجناس اور سامان حرب وضرب کبھی قرض کے طور پر اور کبھی سالگرہ کے تحفے کے طور پر دیا کرتے تھے۔ کوئی دوسرا ملک تکلیف میں ہوتا اور ان کے کانوں میں اس کی بھنک بھی پڑ جاتی تو یہاں سے اس حکم کے ساتھ ان کی اپنی فوجیں بھیج دی جاتیں کہ فوراً جاؤ اور اس ملک میں امن قائم کر کے [illegible] رہ جاؤ۔ لیکن اب حالات نے کچھ ایسا رخ اختیار کر لیا کہ خود اس ملک میں روٹی کا قحط الرجال ہو گیا۔

اس کانفرنس میں مختلف اور متعدد ملکوں کے نمائندوں نے متفقہ طور پر اس خیال کا اظہار کیا کہ دنیا میں پہلے اتنی غریبی نہیں تھی لیکن برصغیر میں غریبی ہٹاؤ کے پروگرام پر عمل درآمد شروع ہوا اور اس تحریک میں جیسے جیسے مخلصانہ عناصر اور مدبرانہ کوششیں پیدا ہوتی گئیں۔ وہاں کی غریبی ہٹ کر دوسرے ملکوں میں پھیل گئی۔ ان متفقہ آوازوں کے شور میں ایک لرزتی ہوئی آواز کچھ لوگوں نے سنی کہ یہ سراسر بہتان ہے۔ ہماری غریبی پھیلی ضرور رہی ہے لیکن ہماری سرحد سے باہر نہیں گئی ہے۔ ہم سرحدوں کا بہت خیال رکھتے ہیں اور ضرورت پڑتی ہے تو خاردار تار باندھ دیتے ہیں۔ اس آواز پر کچھ لوگوں کے کان ضرور کھڑے ہوئے لیکن اتنے کھڑے نہیں ہوئے کہ اس جائز نمائندے کی پوری بات اور اس بات کے مضمرات ان کی سمجھ میں آتے۔ یوں بھی بھوکے پیٹ کون کس کی بات سمجھتا ہے۔

اس کانفرنس میں اس تشویش کا بھی اظہار کیا گیا کہ اگر چند ملکوں میں روٹی نہیں پہنچائی گئی تو وہاں کے چالیس لاکھ بچے بھوک کا شکار ہو جائیں گے۔ فوراً سوال اٹھایا گیا کہ اس ملک میں اتنے سارے بچوں کی ضرورت کیا تھی اور یہ بھی پوچھا گیا کہ یہ واقعی اسی ملک کے بچے ہیں یا انھیں بھوک کی خاطر کہیں اور سے درآمد کیا گیا ہے۔ ایک نمائندے نے تو یہ تک کہا کہ بعض ملکوں میں فارن مال کی بہت قدر کی جاتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ بچے بھی۔۔۔۔ لیکن یہ آواز شور میں دب گئی اور اس سوال کا کوئی تشفی بخش جواب نہیں دیا جا سکا۔ لیکن یہ بات بہرحال اصولی طور پر مان لی گئی کہ بچوں کے معاملے میں ان کے ڈومی سائل کے تعلق سے کوئی شبہ ہو تو روٹی کی اہمیت کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس پر کچھ تالیاں بجیں لیکن بے جان۔

کانفرنس کے دوران نظیر اکبرآبادی کی مشہور نظم "روٹی" کے چند بند بھی ترنم سے پڑھے گئے۔ سماں بندھ گیا۔ جب سماں ٹوٹا خواب کی طرح۔ تو ان اشعار کا کئی زبانوں میں ترجمہ بھی پیش کیا گیا۔ سوائے ایک آدھ ترجمے کے باقی سب ترجمے حسب معمول غلط تھے۔ نمائندوں میں سے چند نمائندے جن کا تعلق ادب اور لسانیات وغیرہ سے تھا اٹھ کھڑے ہوئے اور انھوں نے صدر نشین کی توجہ اس نکتے کی طرف مبذول کرانے کی کوشش کی کہ اتنی اچھی نظم کا ترجمے میں ستیاناس مار دیا گیا۔ اس بیان پر کچھ لوگوں نے [illegible] پوائنٹ آف آرڈر [illegible] کہ ستیاناس مارنے کے الفاظ غیر کانفرنسی ہیں اور اس قسم کے الفاظ صرف پارلیمان وغیرہ میں یا میونسپل کارپوریشن [illegible] میں استعمال کیے جا سکتے ہیں۔ متعلقہ نمائندے نے نمائندہ بھائیوں کے بے حد اصرار پر یہ الفاظ واپس لے لیے [illegible]

ہا شکریہ جب بھی موقع ملے گا وہ ان الفاظ کو مناسب جگہ پر استعمال کریں گے۔ ترجموں کے بارے میں بہر حال یہ طے پایا کہ یہ ہمارا موضوع نہیں ہے اور نہ یہ کوئی ادبی کانفرنس ہے۔ اس لیے یہاں صرف ہوش مندی کی باتیں کرنی چاہییے۔ ندوے مان گئے۔

روٹیوں کی تقسیم کے بارے میں البتہ جو مباحث ہوئے وہ بے حد زہریلے تھے۔ کچھ ملکوں کے نمائندوں نے لزام لگایا کہ اکثر ملکوں میں روٹیوں کی بے حرمتی کی جاتی ہے اور کچرے کے ڈبوں میں کچرے سے زیادہ روٹیاں نکلتی یں۔ ان ڈبوں کے اردگرد کوئی کیو تو نہیں بنتی لیکن بنائی جا سکتی ہے۔ ایک تجویز یہ بھی پیش ہوئی کہ اگر روٹیاں اس طرح پھینکی جاتی ہیں تو ان کے لیے علاحدہ ڈبوں کا انتظام کیا جائے اور جانوروں کو ان ڈبوں کے اطراف آنے سے منع کر دیا جائے۔ اس تجویز میں ترمیم یہ پیش ہوئی کہ سارے جانور خواندہ نہیں ہوتے۔ اس لیے ان ڈبوں پر کسی (اچھے) جانور کی صویر بنائی جائے اور اس پر چلیپا لگا دیا جائے۔ نمائندوں نے کہا۔ ہاں ٹھیک ہے اس سے آدمیوں کو بھی فائدہ پہنچے گا۔

روٹی کانفرنس کے دوران ٹی اور کافی بریک کی جگہ "وقفۂ نان" کی گنجائش نکالی گئی۔ نان کا مطلب وہ نہیں جو ہانچ ستاروں والے ہوٹلوں میں باریک کاغذ میں لپیٹ کر پیش کی جاتی ہے اور جس میں مسکہ اور میدہ جھولتا نظر آتا ہے لکہ روٹی کانفرنس جو نان پیش کی گئی وہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کی شکل میں تھی اور صرف نان جویں، اس وقفۂ نان میں بھی ن نمائندے نے جس نے نظیر اکبرآبادی کی نظم کے ستیاناس مارے جانے کی شکایت کی تھی کہا بھی بھائی ہم تو خوشۂ گندم الی روٹی کی توقع کر رہے تھے کہ کم سے کم اس کانفرنس ہی میں ہم اس سے استفادہ کریں گے کیونکہ ڈاکٹر اقبال نے اپنے ایک عر میں خوشۂ گندم ہی پر زور دیا تھا۔ دوسرے نمائندوں نے کہا چپ کرو۔ جو بھی میسّر ہے کھاؤ ورنہ یہ بھی ہاتھ سے نکل جائے گی۔ حالاں کہ یہ چوٹی کانفرنس نہیں تھی لیکن اس کانفرنس کا بھی کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ ●○

ٹی-وی فوبیا

رضا نقوی واہی
پٹنہ (بہار)

مجتبیٰ[1] صاحب سے جب پوچھا گیا جاپان میں
بولے، نکسل واد، فرقہ واریت، آتنک واد
چھوت کی اک اور بیماری ہے مثلِ کالرا
یہ مرض چھایا ہوا ہے قوم کے اعصاب پر
آج کل اس وائرس کی زد میں ہے پورا سماج
عشق نے جس طرح غالبؔ کو نکما کر دیا
سگ گزیدہ ہو، کہ ٹی وی کا مریضِ لاعلاج
بھونکتا ہے سگ گزیدہ جیسے پانی دیکھ کر
کوئی ملنے کے لیے آئے تو ہوتا ہے غضب
اس قدر ہوتی ہے آمد میہماں کی ناگوار
مول لینے کے لیے یاروں سے پکّی دشمنی
چشمِ بد دور اب تو ہے اسٹار ٹی وی کا چلن
دور درشن جب رُکا' اسٹار ٹی وی چل پڑا
ساتھ دادا جان کے بیٹھے سبھی اہل و عیال
پردہ سیمیں پہ گاڑے مستقل اپنی نظر
مسجد و مندر کی اب تکرار بے مفہوم ہے

کون سی بیماریاں مہلک ہیں ہندوستان میں
ہو رہا ہے ریزہ ریزہ جن سے قومی اتحاد
جس کو عرفِ عام میں کہتے ہیں ٹی-وی فوبیا
ایک اک گھر ہے محمد شاہ رنگیلے کا گھر
کر دیا ہے اس نے ٹھپ معمول کا سب کام کاج
ہے اثر انداز یونہی سب پہ ٹی-وی فوبیا
اتفاقی امر ہے، لیکن ہیں دونوں ہم مزاج
ٹی-وی کمرے کی فضا ویسی ہی آتی ہے نظر
تیوریاں اپنی چڑھا لیتے ہیں گھر کے لوگ سب
دفعتاً ہوتا ہے سارا گھر اِلرجی کا شکار
گھر میں ٹی وی سٹ بنا زینت ڈرائنگ روم کی
یعنی گھر میں آ گئیں چھوٹی بڑی دونوں بہن
اس طرح دن رات کا وارا نیارا ہو گیا
دیکھتے رہتے ہیں چلتے پھرتے سایوں کا کمال
ہیں مگن دُنیا و ما فیہا سے ہو کر بے خبر
اب تو ہر گھر کی عبادت گاہ ٹی وی روم ہے

قوم کی تحویل میں بنیادی قدریں جو بھی تھیں
"سب کی سب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں"

○

1۔ نامور مزاح نگار مجتبیٰ حسین مصنف "جاپان چلو..."

ضمیریات

سید ضمیر جعفری
(پاکستان)

کلچے سے "برگر" اچھے ہیں — گھوڑوں سے خچر اچھے ہیں
انڈے بھی ہوں گے اچھے ہی — جس مرغی کے پَر اچھے ہیں
اُس گھر کی دُلہن خوش قسمت — جس گھر کے "دیور" اچھے ہیں
وہ جب پیاری ہے تو اُس کے — سارے "اگر مگر" اچھے ہیں
ہمت ہے تو چلنے والو! — سارے راہ گزر اچھے ہیں
گزرا ہوگا یہ جہلم[۱] سے — اس دریا کے بھنور اچھے ہیں
اپنے ملک کی کیا پوچھے ہو — شہر خراب ہیں گھر اچھے ہیں
قومیں بھٹک گئی ہیں سب کی — سب کے پیغمبر اچھے ہیں
انگریزوں کا دل جیسا ہو — "ریزر" اور "لیزر" اچھے ہیں
شعر اپنے ہیں ایسے ویسے — ہم بس کاریگر اچھے ہیں
لندن، پیرس سے ہیں اپنے
سکھر اور بھکر اچھے ہیں

ستان میں میرا آبائی شہر جو دریا کے کنارے واقع ہے۔

غزل

نسیم سحر جدّہ

رقیبِ رُوسیہ کو راہ کا اک پَل سمجھتے ہیں — جو کانٹا کوئے جاناں میں ہو اُس کو گُل سمجھتے ہیں
سمجھ میں بات آئے یا نہ آئے یار کی ہم کو — ہلا کر سر یہی کہتے ہیں "جی" بالکل سمجھتے ہیں
وہی شلوار ہے اُن کی، وہی نسوار ہے اُن کی — وہ لندن ہو یا جدّہ: خان اسے کابل سمجھتے ہیں
ہمارے بعد رّدی بن بھی شاید بک نہ پائیں گی — بیاضیں ہم جنھیں اپنی متاعِ کُل سمجھتے ہیں
بھلا کیا لطف حاصل کر سکیں گے شانۂ گُل کا — جو گوبھی کو بھی ازقسم ہائے گُل سمجھتے ہیں
کہیں مصنوعی وِگ کا چیتھڑا ثابت نہ ہو جائے — جسے ہم جانِ جاناں کی سیہ کاکُل سمجھتے ہیں
جنھیں دعویٰ ہے گُر لیتے ہیں پَر وہ اُڑتی چڑیا کے — جنھیں طوطا نظر آجائے تو بلبل سمجھتے ہیں
نسیم اب چُپ کا روزہ رکھ کر اُن سے حالِ دل کہیے
کہ وہ اظہارِ اُلفت کو بھی شور و غل سمجھتے ہیں

غزل

طالب خوندمیری

"شگوفہ" مارچ ۹۲ء کے شمارے میں چھپی، حضرت رضا نقوی واہیؔ کی غزل کی زمین میں ——

بہ طرح: "کسی کا درد ہو دل بے قرار اپنا ہے"

مزاح و طنز پہ دار و مدار اپنا ہے
بہت دنوں سے یہی کاروبار اپنا ہے

گرفت میں قلمِ خوش نوشت ہے جب سے
طریقِ واہیؔ و رنگِ فگارؔ اپنا ہے

ضمیرؔ نے بھی نیا رُخ دیا ظرافت کو
یہ پیڑ بھی شجرِ سایہ دار اپنا ہے

نشانِ راہ مِلا ہے اِنہی بزرگوں سے
اِسی لیے تو سفر خوش گوار اپنا ہے

اِنہی کو پڑھ کے سلیقہ مزاح کا سیکھا
اس اِکتساب سے فن تاب دار اپنا ہے

قدم دیارِ ظرافت میں اس لیے رکھا
کہ لگ رہا تھا یہاں انتظار اپنا ہے

ٹھہر ٹھہر کے، بصدِ احتیاط چلنا ہے
کہ راستہ ہی بہت خار دار اپنا ہے

ذرا سا حوصلہ ملنے لگا جو یاروں سے
سمجھ رہے تھے یہاں اقتدار اپنا ہے

مگر جو اس نے بروقت رہنمائی کی
کہ پھر حصارِ خِرَد میں خُمار اپنا ہے

ہزار چاہا اَنا نے بگاڑنا لیکن
دماغ اپنی جگہ برقرار اپنا ہے

اگرچہ ہم سے کوئی کام بھی بڑا نہ ہوا
مگر بڑوں کے برابر وقار اپنا ہے

خدائے پاک کا ہم پر کرم یہ کیا کم ہے
کہ صاحبانِ ہُنر میں شمار اپنا ہے

مشاہدات نے مُنہ پھٹ بنا دیا ورنہ
لحاظ و پاسِ ادب بھی شعار اپنا ہے

نہیں ہے طنز کا مقصد کسی کی بدخواہی
کہ حرف حرف خلوص آشکار اپنا ہے

وہ طنز، جس سے کسی کا سُدھار ہو جائے
کلام تلخ سہی، شاہکار اپنا ہے

مگر ہوائے مخالف کے تند جھونکوں سے
لباسِ لفظ و بیاں تار تار اپنا ہے

نہ قدر دانی کبھی ناقدوں نے کی اپنی
نہ یاں ادب کا کوئی ٹھیکیدار اپنا ہے

کوئی مقام ادب میں نہیں ظرافت کا
ٹھکانہ اب بھی سرِ رہ گذار اپنا ہے

مگر یہ طرز یہ اسلوب خوب ہے طالبؔ
کہ بھوت سب کے سروں پر سوار اپنا ہے

بارہ برس بعد...

مشتاق احمد یوسفی کی سخن طرازیاں

اکادمی ادبیات پاکستان نے "شام ملاقات" کے عنوان سے اسلام آباد میں تقریب منعقد کی۔ تقریب کے مہمان خصوصی اردو کے منفرد ادیب جناب مشتاق احمد یوسفی تھے۔ یوسفی صاحب نے اس تقریب میں جو تقریر کی اس کے چند حصے قارئین کی خدمت میں پیش کیے جاتے ہیں؛

جناب صدر، خواتین و حضرات،

حسن سماعت کا پیشگی شکریہ! صبر و ضبط اور ایک باوقار بے بسی کے ساتھ ناگوار کو گوارا کرنے کے عمل کو تلافی مافات اور مظلوم سامعین کی تالیف قلوب کی خاطر کو آج کل حسن سماعت کہنے لگے ہیں۔ اس کا شکریہ بالعموم اخیر میں ادا کیا جاتا ہے۔ لیکن میں یہ خوش گوار فریضہ ابتدا ہی میں ادا کرنا چاہوں گا۔ اس لیے کہ معلوم نہیں میری تقریر اور اس تقریب کے آخر ہوتے ہوتے التفات دل دوستاں رہے نہ رہے۔ ہمارے ہمدم دیرینہ مرزا عبدالودود بیگ کا قول ہے کہ مصنف کی زبانی اس کی تصنیف سننے سے بعض اوقات بڑا فرق پڑتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ املا کی غلطیوں میں تلفظ کی غلطیوں کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ اور مصنف کی تحریر کے علاوہ اس کی صورت سے بھی نفرت ہو جاتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں مصنف سے۔ کسی بھی مصنف سے ملاقات کا بہترین اور محفوظ ترین ذریعہ "راندے وو" جس کا خوب صورت مگر متروک مرادف "وعدہ گاہ" میر نے کئی اشعار میں استعمال کیا ہے۔ شاعر یا مصنف کی عافیت اسی میں ہے کہ اس کے اور قاری کے درمیان ایک پراسرار فاصلہ رہے۔ میل بھر کا فاصلہ کافی نہیں۔ کتاب بھر کا فاصلہ رہنا چاہیے۔ سادہ دل قاری اپنے پسندیدہ فن کار کو لائف سائز سے بڑا اور بے عیب جینئس یا نابغہ روزگار سمجھ کر اس کے حضور جاتا ہے اور اس کی مایوسی اور حقارت کی کوئی حد نہیں رہتی جب وہ اسے بالکل اپنے جیسا بندہ بشر پاتا ہے۔ گویا سبب تحقیر و مایوسی محض خود سے مشابہت و مماثلت ٹھہرا، اپنے ہم قلم ہم عصروں کا تاثر ایک عربی ضرب المثل ہے کہ ایک قصہ گو دوسرے قصہ گو کو پسند نہیں کرتا۔ القاص لا یحب القاص۔

اسی طرح اچھے مزاح نگار کی پہچان یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کے لطیفوں پر نہیں ہنستے۔ ایک دوسرے سے چھپتے ہیں
میں اکادمی ادبیات پاکستان، جناب غلام ربانی آگرو اور جناب افتخار عارف کا ممنون ہوں کہ یہ دل پذیر منظر صورت نکالی اور مجھے کم و بیش چودہ برس بعد اسلام آباد آنے اور آپ سب سے ملنے اور خود کو متعارف کرانے کا موقع فراہم کیا۔

لندن میں بارہ سال نہایت آسودہ حال بن باس کے بعد فقیر ایک سال قبل پاکستان لوٹا ہے اور بارہ برس سے متعلق جتنے بھی محاورے اور کہاوتیں سنیں ان میں ذم کا پہلو نہیں نکلتا مذمت کا نکلتا ہے۔ مثلاً: بارہ برس پیچھے گھورے کے بھی دن پھرتے ہیں۔ مطلب یہی کہ اب اس جگہ مرغے، مرغیوں کو متوجہ کرنے کے لیے اذانیں نہیں دیتے جہاں اب نعرے لگتے ہیں یا پھر قدرے تصرف کے بعد بارہ برس لندن میں رہے مگر وہی کیا جو دلی میں کرتے۔ اور اب یہ کہتے پھرتے ہیں کہ اکیلا چنا بھاڑ نہیں پھوڑ سکتا۔

بیچ آئے سرِ قریہ زر جوہر پندار
جو دام ملے ایسے مناسب بھی نہیں تھے

اور بارہ برس کی خواری سے متعلق وہ پنجابی ٹپّہ تو آپ نے ضرور سنا ہوگا جو سکندر ـــــ (ہمارا اشارہ سکندر جب گیا، دنیا سے، دونوں ہاتھ خالی تھے والے سکندرِ اعظم سے ہے) کو بھی بوقت روانگی سنا دیا جاتا تو تڑپ کر تابوت سے نکل پڑتا: بارہ برسیں کھٹن گیا تے کھٹ کے لیا ہندا جھاواں (تو بارہ برس کمانے کو گیا اور کما کے لایا جھاواں)
ٹپہ کہنے والے پر حیرت ہوتی ہے۔ ظالم کو ڈیڑھ دو سو برس قبل ہمارے انجام کی خبر کیسے مل گئی۔
معاف کیجیے، میرا پنجابی تلفظ وہ نہیں جو اہلِ زبان حضرات کا ہوتا ہے۔ یعنی آپ حضرات کا۔ آپ کو اس ٹپے کے معنی بتانا ایسا ہی ہوگا جیسے میں اپنے جہاں دیدہ و سرد و گرم چشیدہ پیر و مرشد حضرت ممتاز مفتی کو اقبال کے اس مصرع کا مطلب سمجھانے لگوں کہ:

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ

—

چوتھی اور آخری کہاوت جو بارہ برس سے متعلق یاد آئی وہ ہے: بارہ برس بعد بھی فقیری اور امیری کی بو نہیں جاتی تکبر کی سب سے خطرناک قسم وہ ہے جب فقیر اپنی عاجزی اور انکساری پر گھمنڈ کرنے لگے۔ درویشی ہو یا افسری دونوں کی رعونت اور نشہ اترتے اترتے اترتا ہے۔ یاد رہے کہ اترتا نشہ اور چڑھتی ندی زیادہ تباہی مچاتے ہیں۔ عہدۂ جلیلہ کبھی دفعتاً چھوٹ جاتا ہے اور کبھی رفتہ رفتہ اور سہج سہج چھڑایا جاتا ہے۔ جس طرح ضدی بچے کا دودھ چھڑایا جاتا ہے یعنی ایکسٹینشن کی چسنی سے منہ بند کر کے مزید ایکسٹینشن کا جھنجھنا ہاتھ میں پکڑا دیتے ہیں کہ بیٹھے بجاتے رہو۔

تو عرض یہ کرنا چاہتا ہوں کہ بارہ سال تک خود کو فخریہ غریب الوطن کہنے اور کہلانے کے بعد کراچی لوٹا تو وطن خود کو اجنبی اجنبی سا محسوس کیا۔ اور یوں لگا کہ:

ہوتا ہے ابھی مجھ کو خراب اور زیادہ

نظر کمزور ہو جائے تو ہر شے نئی نئی سی لگتی ہے۔ اور حافظہ کمزور ہو جائے تو ہزار بار پڑھے ہوئے غالب کے اشعار نہ صرف بالکل نئے لگتے ہیں بلکہ ان میں ایسے نئے معنی نظر آتے ہیں جو خود غالب کے وہم و گمان میں نہ تھے۔ اسلام آباد وارد ہوا تو یہاں بھی ہر چیز بدلی بدلی، نا آشنا سی لگی۔ یہاں تک پاسپورٹ فوٹو کا آئینے کے چہرے سے موازنہ کیا تو پاسپورٹ سراسر جعلی لگا۔

صرف ایک چیز میں کوئی تبدیلی نہ پائی۔ پی آئی اے، دورانِ پرواز فائل یعنی پنی کی ٹرے میں جو بریانی نما پلاؤ اور پلاؤ نما بریانی کھلاتی ہے۔ اس کے نہ صرف رسے سی پی اور پھیکا دہی ہے جو یادش بخیر بیس پچیس برس قبل تھا بلکہ مرغی کی ایک ٹانگ بھی ٹھیک ٹرے میں اسی جگہ اور اسی ترچھے زاویہ سے رکھی ہے جہاں ایر مارشل نور خاں دستِ خاص سے رکھ گئے تھے۔ ایر ہوسٹس کے دوپٹے کے لٹکاؤ اور ٹکٹ کی قیمت کے سوا کسی چیز میں کوئی تبدیلی نہ پائی۔

قیمتوں کا ذکر آیا تو ایک تجویز عاجز کے ذہن میں آئی۔ دنیا ابھی تک انفلیشن (افراطِ زر) کا علاج دریافت نہیں ہوا۔ تیسری دنیا کی حکومتیں نوٹ چھاپ چھاپ کر بجٹ کا خسارہ پورا کرتی ہیں۔ نوٹ چھاپنے اور افراطِ زر پر قابو پانے کی ایک ہی پریکٹیکل صورت ہے وہ یہ کہ گورنر اسٹیٹ بنک کو قانوناً اس کا پابند کیا جائے کہ وہ ہر نوٹ پر اصلی دستخط یعنی اپنے قلم اور روشنائی سے دستخط کریں گے۔

چودہ برس قبل اسلام آباد ایک پکچر پوسٹ کارڈ کی مانند خوب صورت تھا۔ آج اس سے بھی زیادہ ہے۔ فراغتے و کتابے و گوشۂ چمنے کی مثالی تصویر۔ حیرت ہوتی تھی کہ ایسی پرفضا جگہ جنرل ایوب خاں نے کیا سوچ کر شاہی منشی خانہ کھڑا کر دیا۔ کوٹ نکھپت یا جیکب آباد میں کیوں نہ بنایا۔ لیکن اب اسلام آباد میں گرہستی پاکیزگی سے اکتائے ہوئے لوگوں کی تفریح اور گردِ مسافرت جھاڑنے کی اور صورتیں پیدا ہو گئی ہیں۔ گرہستی پاکیزگی سے ہماری مراد سرائے عقدِ دوام اور محبت با مشقت ہے۔ شبانہ سہولتوں کی تفصیلات گڈ پریس نے خوب خوب اچھالیں جنھیں نقد لوگ محض اس لیے پابندی سے پڑھتے تھے کہ دیکھیں تو سہی گڈ پریس آج کتنا مزید پست ہوا۔ گڈ پریس! ......
ہم اس پریس کو کہتے ہیں جو ایسی گندی اور جھوٹی خبریں چھاپتا ہے جو بعد میں بالکل سچ نکلتی ہیں۔ ہم ایسے محتاط اور کمزور دل والے لوگ اب مبہم، گھمبیر اور پہلودار بات کہنے لکھنے اور سننے کے اس درجہ عادی ہو گئے ہیں کہ اب کھری بات بھی کھوٹی لگتی ہے۔ بقول آرزو:

سچ بھی برا وہ جس کو سن کر لوگ کہیں تو جھوٹا ہے

ایسے میں ضمیر تو خیر کیا صاف ہوں گے ہمارا تو مافی الضمیر تک صاف نہیں۔ ذرا غور سے دیکھیں تو کھلے گا کہ سچ بھی ہم اس طرح اٹک اٹک کر بولتے ہیں گویا جھوٹ بول رہے ہیں۔ ایسے ہی عافیت پسند اور محتاط لوگوں کے لیے میر کہہ گئے ہیں:

اے آہوانِ صحرا نہ اینڈو حرم کے گرد
کھاؤ کسو کا تیغ کسو کا شکار ہو

بڑی بات کو بڑی بات کہتے ہوئے ہماری زبان اور قلم لڑکھڑانے لگتے ہیں۔ چناں چہ ایک دوسرے کی تعریف و ستائش میں بھی عافیت نظر آتی ہے۔ استاد ذوق کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ ہر قصیدے اور مدحیہ اشعار

کے بعد ایک لوٹے سے خوب کلیاں کرتے تھے۔ ہم پر غسل واجب ہے۔

پولیس کے باب میں خواہ وہ گزیٹڈ پولیس ہو یا غیر گزیٹڈ پولیس، ایک بات گوش گزار کرتا چلوں۔ ہم اور ہماری پولیس ماضی میں اتنی سخت زبان بندی اور قدغن کے عادی رہے ہیں کہ جب ذرا آزادی ملی تو رسمی قیود کو بار بار توڑ کر اور ایک دوسرے کے چٹکی لے کر ہم ٹیسٹ کرتے ہیں کہ کیا ہم واقعی آزاد ہیں۔ جو بچہ پہلے پہلے کھڑا ہونا اور چلنا سیکھتا ہے وہ اتنا ایکسائیٹڈ یعنی جوش میں بھرا ہوتا ہے کہ جو کام بیٹھ کر کرنے کا ہوتا ہے اسے بھی کھڑے کھڑے ہی انجام دیتا ہے۔ زبان کھلتے ہی کھل کے لکھنے کے شوق میں قلم اگر کھل کھیلنے پر اتر آئے تو یہ مقام حیرت کا نہیں، مایوسی امید افزا ہے:

صرف مانع تھی حیا بندِ قبا کھلنے تک
پھر تو وہ جانِ حیا ایسا کھلا ایسا کھلا

اگلے وقتوں میں جب اہلِ غرض کراچی سے اسلام آباد آتے تھے تو ہماری طرح کینٹ کی ایک مشہور دکان پر گائے کے تحفۂ گوشت یعنی ہنٹر زبیف پر ٹوٹ پڑتے تھے کہ ان دنوں بس یہی شئے دستیاب تھی۔ اس کے علاوہ ہم بیگم کے لیے اسلام آباد نرسری سے سیاہ گلاب کی قلمیں اور حضرت ضمیر جعفری کے تازہ کلام کی سوغات سے لدے پھندے لوٹتے تھے۔ اس زمانے میں بیویاں، اسلام آباد جانے والے شوہروں کو رخصت کرتے وقت خیر سے جانے اور جان کی سلامتی کے ساتھ واپس آنے کی دعا دیتی تھیں۔ اب ایمان سلامت لے کر لوٹ آنے کی دعا کرتی ہیں اور اس عفیفہ کو کوستی ہیں جس نے تسکینِ عاجلہ کے نسخے کی ڈور ٹو ڈور ڈلیوری، یعنی دہلیز تا دہلیز ڈلیوری کا انتظام کیا:

درد کی دوا پائی، مرد نطا پایا
وہ دانا اس رمز کو پا گئی کہ سب سے میٹھا پھل، ان چکھا پھل ہوتا ہے۔

اکادمی کا دعوت نامہ وصول ہوا تو ہم نے بیگم سے پوچھا "دو کلو ہنٹر زبیف اور سیاہ گلاب کی دو درجن قلمیں کافی ہوں گی؟" بولیں "نہیں میں ساتھ چلوں گی" چناں چہ وہ ہم رکاب ہیں کہ اسلام آباد میں یہ گل ہائے شب افروز کے کھلنے اور کھلانے کی رُت ہے۔

مشتاق احمد یوسفی،
مکان نمبر ۲/۷۰، ۲۳ ویں اسٹریٹ، فیز ۶-
ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی کراچی۔

انعام الحق جاوید
(اسلام آباد)

گرامر

کس قدر تبدیل گھڑ گھڑی کی گرامر ہو گئی
کل تلک بیوی تھی جو وہ آج شوہر ہو گئی
بلبلِ خوش رنگ دہلی میں مونث تھی مگر
صوبۂ سرحد میں پہنچی تو مذکر ہو گئی

ٹیلی فون

عشق ٹیلی فون پر، بیوپار ٹیلی فون پر
کیا نہیں ہوتا مرے سرکار ٹیلی فون پر
حد تو یہ ہے رات اپریشن کرا کے چل بسا
ڈاکٹر صاحب سے اک بیمار ٹیلی فون پر

مہمانانِ گرامی

گھر پہ آن اُترے ہیں مہمان خدا خیر کرے
سخت مشکل میں ہے پھر جان خدا خیر کرے
صرف مہمان جو ہوتے تو کوئی بات بھی تھی
ہاتھ میں ان کے ہیں دیوان خدا خیر کرے

انشورنس

آج پھر تیری خاطر اے بیگم
فارم بیمے کا بھر رہا ہوں میں
گولڈن چانس ہے تمہارے لیے
تیسری بار مر رہا ہوں میں

کانٹے

پیار میں جان ہار کر پیارے
ہم نے پھولوں کے ہار بانٹے ہیں
میرے پاؤں اور ان کے کانوں میں
مختلف قیمتوں کے کانٹے ہیں

یک نہ شد دو شد

کیوں نہ اس کو میں حضورِ یک نہ شد دو شد کہوں
یہ ستم کچھ کم نہیں ہے دل دکھانے کے لیے
چور صاحب دو عدد ٹی وی اُڑا کر لے گئے
ایک اپنے واسطے اور ایک تھانے کے لیے

علم کا رعب

علم کا رعب ٹھیک ہے لیکن
ڈگریوں کا بھی کچھ اثر ڈالو
کر لیا ہے جو تم نے ایم اے تو
ساتھ ہی میٹرک بھی کر ڈالو

خرگوش

نہیں کچھوے کا اس میں دوش کوئی
کہ سوتا ہی نہیں خرگوش کوئی
میاں! اتنی سلیپنگ پلز کھا کر
ہو کیسے خوار [illegible] کوئی

مشتاق احمد یوسفی

تیسری قسط

شہر دو قصہ

چاندی کا کشتہ اور چنیوٹ کی چلم

خوب یاد آیا۔ ہمارے ایک جاننے والے تھے، میاں نذیر احمد۔ چنیوٹ برادری سے تعلق تھا۔ چمڑے کے کاروبار کے سلسلے میں اکثر بمبئی جاتے رہتے تھے۔ وہاں ریس کا چسکا لگ گیا۔ گھوڑوں سے جو کمائی بچ رہتی، اسی میں غریبانہ گزر بسر کرتے۔ گلنار طوائف کے ساتھ دو بول پڑھوا لیے تھے۔ حج بیت اللہ کے بعد خود تائب ہوئی سو ہوئی۔ میاں نذیر احمد کو بھی بہت سی علتوں سے توبہ کروا دی۔ وہ جو طوائفوں کی صورت پر . . . .

پھٹکار برسنے لگتی ہے اور آواز پھٹا بانس ہو جاتی ہے وہ کیفیت قطعی نہیں تھی۔ میلاد شریف خوب پڑھتی تھی۔ آواز میں غضب کا سوز تھا۔ جب سفید دوپٹے سے سر ڈھلکے لہک لہک کر جامی کی نعت یا انیس کا مرثیہ پڑھتی تھی تو لحن میں ہزار حلاوتیں، ہزار عقیدتیں گھول دیتی۔ ہم چپ چپ کر سنتے۔ محرم میں کالے کپڑے اس پر کھبتے تھے۔ پاکستان آ گئی تھی۔ پرنس روڈ پر ادیب سہارنپوری کے فلیٹ سے ذرا دور چھوٹا سا تین کمروں کا فلیٹ تھا۔ میاں صاحب جاڑے میں بھی ململ کا کرتا پہنتے اور صبح ٹھنڈے یخ پانی سے غسل کر کے لسی پیتے تھے۔ مشہور تھا کہ خود طاقت کے ہوکے میں ڈھیر سارا روپ رس یعنی چاندی کا ادھ کچا کشتہ کھا بیٹھے تھے۔ گلنار کی چھوٹی بہن منی اور منی بھی آفت کا پرکالہ تھیں۔ آپ نے بھی تو ایک دفعہ کسی چھوٹی الائچی اور بڑی الائچی کا ذکر کیا تھا۔ بس کچھ ویسا ہی نقشہ تھا۔ افسوس اب کھانوں میں بڑی الائچی کا استعمال ختم ہوتا جا رہا ہے۔ حالانکہ اس کی مہک اس کا ذائقہ ہی اور ہے۔ آپ تو بغیر بڑی الائچی سے چڑتے ہیں۔ مجھے تو کسی طرف سے بھی کاکروچ جیسی نہیں لگتی۔ تو صاحب منی بیگم کا چہرہ اور بھرے بھرے بازو کچھ ایسے تھے کہ کچھ بھی پہن لے، ننگی ننگی سی لگتی تھی۔ یہ نوہاٹ آتی ہیں! چنی بیگم فارسی کی غزلیں خوب گاتی تھی۔ لوگ بار بار فرمائش کرتے وہ بھی عموماً بیٹھ کر گاتی تھی۔ کبھی داد کم ملتی یا یونہی ترنگ آتی تو یکایک اٹھ کھڑی ہوتی۔ دونوں سارنگیے اور طبلچی * بھی لپک اپنے آزدین پٹکے کس لیتے اور ایستادہ

---

* طبلچی: اس زمانے میں سارنگی اور طبلہ بجانے والے کو سارنگیا اور طبلچی کہتے تھے۔ یعنی طبلہ بجانے کو طبلہ بجانا ہی کہا جاتا تھا۔ طبلہ بجانے والا اپنے ہنر سے شرمندہ نہیں تھا۔ طبلے کو "نوازنے" اور طبلہ نواز کہلانے کی ضرورت ابھی محسوس نہیں ہوئی تھی۔

ہو کر سنگت کرتے۔ محفل میں دو تین چکر رقصاں لگاتی۔ پھر قلب بساط پر کھڑے ہو کر ایک ہی جگہ پھرکی کی مانند تیزی سے گھومنے لگتی ہے زردوزی کی شکارا مارتی پشواز ہر چکر کے بعد اونچی اٹھتے اٹھتے ناف تک پہنچ جاتی۔ یوں لگتا جیسے جگنوؤں کا ایک ہالہ رقص میں ہے۔ لے اور گردش تیز اور تیز ہوتی۔ کرن سے کرن میں آگ لگتی چلی جاتی۔ پھر ناچنے والی نظر نہ آتی۔ صرف ناچ نظر آتا تھا۔

کچھ نہ دیکھا پھر بجز ایک شعلۂ پُر پیچ و تاب

اور جب یکایک رکتی تو پشواز سڈول ٹانگوں پر مرمریں ترچھی لپٹتی چلی جاتی سازندے ہانپنے لگتے اور کھرن (+) پر طبلچی کی تنی ہوئی انگلیوں سے مگت خون اب ٹپکا کہ اب ٹپکا۔

دیکھئے، میں پھر بھٹک کر اسی لعنت مارے بازار میں جا نکلا۔ آپ نے نوٹس لینے بند کر دیئے۔ بور ہو گئے؟ یا میں واقعات کو دہرا رہا ہوں؟ وعدہ ہے، اب کسی طوائف کو خواہ کتنی ہی آفتِ جاں کیوں نہ ہو۔ اپنے اور آپ کے درمیان حائل نہ ہونے دوں گا۔ صاحب ہمارے، تو باتیں ہی باتیں ہیں۔

باتیں ہماری یاد رہیں، پھر باتیں ایسی نہ سنیئے گا

پرسوں آپ لندن چلے جائیں گے۔ میری نے بے ثباتیٔ دنیا پر اپنے شعر میں مجمع یاراں کو "مجلس دوراں" کہا ہے کہ ہر یار سفری اور ہر صحبت گزراں ہے۔ تو صاحب، ذکر میاں نذیر احمد کا ہو رہا تھا۔ میاں صاحب کانپور کے ۱۱۰ ڈگری ٹمپریچر سے گھبرا کر مئی کا مہینہ بڑی پابندی سے چنیوٹ کی ۱۱۰ ڈگری کی گرمی میں گذارتے تھے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ چنیوٹ کی لو کانپور کی لو سے بہتر ہوتی ہے۔ ہم لوگ آپس میں شیکسپیئر کے گیت کی درگت بناتے تھے۔

Blow, blow thou chin.iot "loo"

Thou art not so unkind

As local specimens of mankind

who couldn't care who's who!

میاں صاحب اکثر فرماتے کہ قدرت کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں۔ چنیوٹ کی گرمی میں سال بھر کے جمع شدہ فاسد خیالات پسینے کی راہ خارج ہو جاتے ہیں۔ روزے کبھی نہیں چھوڑے۔ مئی اور جون میں بھی ایک ڈلی لاہوری نمک کی چاٹ کر حقے کے معدے تک اتر جانے والے کش سے افطار کرتے۔ پہلے تین چار مرتبہ یونہی امتحاناً گڑگڑاتے۔ جیسے سنگت کرنے سے پہلے ستار بجانے والے مضراب سے تاروں کی کساوٹ کو اور طبلچی ہتھوڑی سے طبلے کے رگ پٹھوں کو ٹھونک بجا کے ٹسٹ کرتا ہے۔ پھر ایک ہی سسکی بھرے کش میں سارے تمباکو کا انس (ست۔ جان) نکال لیتے، بلکہ اپنی جان سے بھی گزر جاتے۔ سَن۔ سَن۔ سَن سُوں سُوں، سو دُو دُو۔ دُو دُو! ہاتھ پیر ڈھیلے پڑ جاتے۔ ٹھنڈے پسینے آنے لگتے۔ پتلیاں اوپر چڑھ جاتیں۔ پہلے پشت پھر بے سدھ ہو کر وہیں کے وہیں پڑے رہ جاتے۔ گلنار انہیں شربت انار پلا کر نماز کے لئے کھڑا کرتی۔ حقے کی نے پر چنبیلی کے ہار اور نیچہ پر خس لپٹی ہوتی۔ تمباکو تیز اور کڑوا بے بنا پسند کرتے تھے۔ قوام لکھنؤ سے منگواتے۔ چاندی کی فرشال دلی کے ایک سادہ کار سے گھڑوائی تھی۔ مٹی کی چلم اور توا مٹی کی گول ٹکیا جو تمباکو اور انگاروں کے درمیان رکھتے ہیں ہمیشہ چنیوٹ سے آتا تھا۔ فرماتے تھے، بادشاہو! اس مٹی کی خوشبو الگ سے آتی ہے۔

+ کھرن۔ طبلہ کا ساہ حلقہ۔

لاہور میں آج بسنت ہے

میاں نذیر احمد سنکرات کے دن کڑکڑاتے جاڑے میں ململ کا کرتا پہنے، ننگے سر چھت پر پتنگ ضرور اڑاتے۔ یہ بھی ان کا بھولپن ہی تھا کہ ململ کے کرتے کو جوانی کا سرٹیفکٹ اور اشتہار سمجھ کر پہنتے تھے۔ ہم تین چار لڑکے چندی چنے ان کی خوشبودار مروارید کی معجون فقط مٹھاس کے لالچ میں کھاتے، مگر دل ہی دل میں ان کے معجزانہ اثرات کے ہفتوں منتظر رہتے۔ میاں صاحب لحاف صرف اس وقت اوڑھتے جب ملیریا کے جاڑے سے بخار چڑھتا۔ یوپی کے جاڑے کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ حقارت سے کہتے "بادشاہو! یہ بھی کوئی سردی ہے!" دراصل لاہور کے جاڑے کے بعد صرف ملیریا کے جاڑے کے قائل تھے۔ آپ کے مرزا عبدالودود بیگ بھی تو یہی الزام لگاتے ہیں نا، کہ یوپی کے کلچر میں جاڑے کو رنج کے celebrate کرنے کا کوئی تصور نہیں۔ جبکہ پنجاب میں گرمی کے اس طرح چونچلے اور نخرے نہیں اٹھائے جاتے جس طرح یوپی میں۔ صاحب یوپی میں جاڑے اور پنجاب میں گرمی کو محض سالانہ سزا کے طور پر برداشت کیا جاتا ہے۔ پنجاب میں بارش کو فقط اسلئے انگیز کرتے ہیں کہ اس کے بغیر فصلیں نہیں اگ سکتیں۔ جبکہ یوپی میں ساون کا واحد مقصد و مصرف یہ نظر آتا ہے کہ کڑھائی چڑھے گی۔ درختوں پر آم اور جھولے لٹکیں گے اور جھولوں میں کنواریاں بالیاں۔ پنجاب میں درختوں پر آم یا پکھو اور لٹکنے کی ایسی خوشی صرف طوطوں کو ہوتی ہے۔

اور انگلینڈ میں بارش کا فائدہ جو سال کے ۳۶۵ دن ہوتی ہے (بقیہ بیس دن برف باری ہوتی ہے) آپ یہ بتاتے ہیں کہ اس سے شائستگی اور خوش اخلاقی فروغ پاتی ہے۔ مطلب یہ کہ جو گالیاں انگریز بصورت دیگر ایک دوسرے کو دیتے وہ اب موسم کو دیتے ہیں۔

سنکرات کے دن میاں نذیر احمد پیچ ویچ تو کیا خاک لڑاتے، بس چھ سات پتنگیں کٹوا اور ڈور لٹوا کر اپنا..... اور اپنے سے زیادہ دوسروں کا جی خوش کر لیتے تھے۔ ہر پتنگ کٹوانے کے بعد لاہور کے مانجھے کو بے تحاشا یاد کرتے۔ ارے پتنگ کٹتی نہیں تو لوٹ لیا۔ پیچ کانپور میں لڑاتے اور قصے لاہور کے بسنت کے رنگ رنگیلے آسمان کے سناتے جاتے۔ نظر بھی خاصی کمزور ہو چلی تھی، لیکن عینک صرف نوٹ گنتے اور مچھلی کھاتے وقت طوعاً و کرہاً لگا لیتے تھے۔ عینک نہ لگانے کا ایک ضمنی نتیجہ یہ نکلتا کہ جس پتنگ کو وہ حریف کی پتنگ سمجھ کر بے تحاشہ "کھینچ" کرتے وہ دراصل ان کی اپنی ہی پتنگ نکلتی جو چند لمحوں بعد پہلے ہی مخالف رگڑے سے کٹ کر ہوا میں لالچی کی نیت کی طرح ڈانواں ڈول ہونے لگتی۔ ڈور یکایک ڈھیلی پڑ جاتی تو انہیں پتہ چلتا کہ کٹی پتنگ تیری، ڈور اب سمیٹا کر۔ میاں صاحب اکثر فرماتے کہ پتنگ اور کنکوے بنانے میں تو بے شک لکھنؤ والوں کا جواب نہیں لیکن بادشاہو! ہوا لاہور کی بہتر...۔ سچ پوچھو تو پتنگ لاہور کی ہی ہوا میں پیٹا چھوڑے (جھول کھائے) بغیر ڈور پہ ڈور پیتی اور زور دکھاتی ہے۔ پتنگ کے رنگ اور مانجھے کے جوہر تو لاہور ہی کے آسمان پر کھلتے اور نکھرتے ہیں۔ کانپور میں وہ کاٹا اس طرح کہتے ہیں جیسے معذرت بلکہ تعزیت کر رہے ہوں۔ لاہور کے "بوکاٹا" میں پچھڑے ہوئے پہلوان کی چھاتی پر چڑھے ہوئے پہلوان کا نعرہ سنائی دیتا ہے بلکہ پسینے میں شرابور جسم سے چپٹی ہوئی اکھاڑے کی مٹی نظر آتی ہے۔

میاں صاحب کی جرحی لاہور ہی کے ایک زندہ دل بزرگ سے تھی جو مسلم کالج میں لیکچرر تھے۔ عبدالماجد نام تھا شاعری بھی کرتے تھے۔ دونوں نے مل کر پتنگ کو سنبھالنے کا مانجھا اور یا دونوں کی انجمن سلجھی تل چاولی (دو رنگی) ڈور

ایسی پلاتے کہ چرخیاں کی چرخیاں خالی ہو جاتیں اور پتنگ آسمان پر تارا ہو کے لاہور کی چوبرجی پہ جا نکلتی جس نے وہ دن دیکھے تھے۔ جب کوئی شئے سادہ و بے رنگ نظر نہیں آتی۔

غبار گلگوں ہے، آب رنگیں، زمین شہے سرخ اور ہوا شہابی*

(یہاں بشارت کا بیان ختم اور خواب نیم روز شروع ہوتا ہے)

خواب نیم روز

اب چڑھی پتنگ جو کچھ راوی پار دیکھتی ہے، اس کا حال کچھ ان دونوں زندہ دلان لاہور کی کچھ بشارت اور کچھ سہا اس عاجز داستان و داستاں طراز کی زبانی سنیئے۔

لاہور میں آج بسنت ہے۔ آیا بسنت پالا اڑنت۔ جاتی رت نے عجب سماں باندھا ہے۔ بسنتی لباس اور رخساروں پر اترتے جاڑے کی سرخی غضب ڈھا رہی ہے۔ کھیتوں میں چار سو سرسوں پھولی ہے۔ گلاب اور دیر سے کھلنے والے گل داؤدی کی اپنی الگ بہار ہے۔ سرسوں، پتنگ، تتلی، پیرہن، پھول، رخسار ... اک گلستاں نظر آتا ہے گلستاں قریب

ہاں لاہور میں آج بسنت ہے۔ رنگ ہوا سے یوں ٹپکے ہے جیسے شراب چواتے ہیں۔ بسنت اور برسات میں لاہور کا آسمان آپ کو کبھی بے رنگ اکتایا ہوا اور نچلا نظر نہیں آئے گا۔ لاڈلے بچے کی طرح چیخ چیخ کے ہر وقت اپنی موجودگی کا احساس دلاتا ہے اور توجہ کا طالب ہوتا ہے کہ ادھر دیکھو! اس وقت مجھے ایک شوخی سوجھی ہے کیسے کیسے رنگ بدلتا ہے۔ کبھی تاروں بھرا .... بچوں کی آنکھوں کی مانند جگمگ جگمگ۔ کبھی نوری فاصلوں پر کہکشاں افشاں۔ اور کبھی اودی گھٹاؤں سے زر تابداں۔ کبھی تانبے کی طرح تپتے تپتے ایکا ایکی امرت برسانے لگا اور خشک کھیتوں اور اداس آنکھوں کو جل تھل کر گیا۔ ابھی کچھ تھا، ابھی کچھ ہے۔ گھڑی بھر کو قرار نہیں۔ کبھی مہرباں، کبھی قہر بداماں۔ پل میں اگن کنڈ، پل میں نیل جھیل۔ ذرا دیر پہلے تھل، ہیر، صحراؤں کا غبار اٹھائے لال پیلی آندھیوں سے بھرا بیٹھا تھا۔ پھر آپ ہی آپ دھرتی کے گلے میں انہیں ڈال کے کھسک گیا۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ سمندر جھاگ بادلوں کے بجرے پگھلے نیلم میں پھر تیرنے لگے۔ کل شام ڈھلے جب شفق پھولی تو یوں لگا جیسے زمین اور آسمان کا وہ ملگجا سا سنگم جو ڈبکتے سورج کو نگل گیا۔ اب سدا یونہی تمتماتا رہے گا۔ پھر گرم ہوا ایکا ایکی تھم گئی۔ ساری فضا ایسے دم سادھے کھڑی تھی کہ پتا نہیں ہلتا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے بادل گھر آئے۔ اور پچھلے پہر تک بجلی کے ترشول آسمان پر لپکتے، لہراتے رہے۔ پر آج سے پہر نہ جانے کیا دل میں آئی کہ اچانک ایسا موز پنکھی نیلا ہوا کہ دیکھے سے رنگ چھوٹے۔ پہر رات گئے تک اپنی شفاف نیلاہٹیں راوی کی چاندی میں گھولتا رہا۔

لاہور کے آسمان سے زیادہ خوبصورت اور زیادہ خوش رنگ و شوخ ادا تو صرف ایک چیز ہے۔ وہ ہے لاہور کی گل زمین۔ چار سو برس پہلے بھی یہ زمین فلک رنگ ایسی ہی تھی۔ جبھی تو نور جہاں نے کہا تھا:

لاہور را بہ جان برابر خریدہ ایم
جان دادہ ایم جنت دیگر خریدہ ایم

---

* ہوا شفق پوش باغ و صحرا محیط ہے رنگِ لالہ و گل (سراج اورنگ آبادی) اسی پر مرزا کہتے ہیں کہ نوجوانی میں ذرا بھی علی گڑھ دکھائی دیتا ہے۔

سو نورجہاں نے تو جان کے عوض جنتِ لاہور میں دو گز زمین خرید لی۔ مگر زندہ دلانِ لاہور نے اس جائداد کو بھی لاہور کو یاد رکھنے کی طرح یاد نہ رکھا۔ نورجہاں کے قطعۂ جنت میں اب ابابیلوں کا بسیرا ہے۔

لیکن صاحبو! دھنک کے اس پار وہ خوابوں کا شہر تو اب شہرِ دو قصہ ہو گیا اور اس کی تلاش میں جو شہزادہ چوکھی کھونٹ نکل گیا تھا وہ کبھی کا دو لخت ہوا۔ اب یہ بستی اور زمین اور ہے! یہ ہر کس و ناکس پر گئے دنوں کے روپ سروپ کے بھید بھاؤ اور بھاؤ نہیں کھولتی۔ انھیں دیکھنے کے لئے پیری کی آنکھ اور بچپن کی رنگین دوربین★ چاہیئے۔ یہ ہوں تو پھر ہر شہر، شہرِ دو قصہ دکھلائی دیتا ہے۔

خوابِ نیم روز ختم ہوا۔ بقیہ کہانی بشارت کی زبانی ان ہی کے داستان در داستان انداز میں سنیئے۔ طول دینا ہی مزہ ہے قصہ کوتاہ کا۔ جہاں تک قلم اور یادداشت ساتھ دے گی۔ ہم ان کا مخصوص محاورہ اور لہجہ .... اور لہجے کی للک اور ٹنک .... جوں کی توں برقرار رکھنے کی کوشش کریں گے۔ وہ ایک دفعہ کہانی شروع کر دیں تو ان کا جملہ معترضہ اور غیر متعلق جزئیات بھی الگ اپنی کہانی سنانے لگتے ہیں۔ ہنکارا بھرنے کی مہلت بھی نہیں دیتے مرزا ایسے شکنجے میں جکڑے جانے کو کہانی کا ٹھہ کہتے ہیں۔ کولرج کے Ancient Mariner نے جب اپنی آسیبی کہانی شروع کی تو شادی کے جشن اور دعوت میں جانے والا مہمان ایسا مسحور ہوا کہ شادی وادی سب بھول گیا۔ مبہوت کھڑا سنتا رہا۔ بس کچھ ایسا ہی احوال ہمارا بھی ہوا۔

He holds him with his glittering eye
The wedding-Guest stood still
And listens like a three year's child
The mariner hath his will-

۴

میں ابنِ بطوطہ، میرا لکھا مخطوطہ

تو صاحب! میاں نذیر احمد کا مکان بھی دیکھنے گیا۔ کیسی کیسی یادیں وابستہ ہیں، اس مکان سے! مگر اب پہچانا نہیں پڑتا۔ خاصی 'فیس لفٹنگ' ہوئی ہے۔ تین ایرکنڈیشنر چل رہے تھے برآمدے میں ایک سن رسیدہ سردار جی کنگھا ہاتھ میں پکڑے جوڑا باندھ رہے تھے۔ صرف یہی ایسا مکان ہے جو پہلے سے بہتر حالت میں نظر آیا۔ میں نے اپنا تعارف کرایا اور غایتِ آمد بیان کی تو خوشی خوشی اندر لے گئے۔ بڑی خاطریں کیں۔ دیر تک اپنی جنم بھوم گوجرانوالہ کا حال احوال پوچھتے رہے۔ میں گھڑ گھڑ کے سناتا رہا۔ اور کیا کرتا؟ ایک سال پہلے منی بس میں گوجرانوالہ سے گزرا تھا۔ اس ایک اسنیپ شاٹ کو انلارج کر کے اردو کا بیسٹ سیلر سفرنامہ بنا دیا۔ خیر آپ تو ایسے سفرنامے چٹخارے لے کر پڑھتے ہیں۔ یہ تو مانا کہ بقول آتش۔

سفر ہے شرط، مسافر نواز بہتیرے
ہزار ہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے

★ Kaleidoscope : اسے بچپن کی حیرت بین یا دھنک درشن کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ اس میں کانچ کے رنگ برنگے ٹکڑے ہوتے ہیں جو ہر جنبش کے ساتھ طرح طرح کے رنگ، شکلیں اور پیٹرن اختیار کرتے چلے جاتے ہیں۔

لیکن ان سفر نویسوں کی رال سے رقم کی ہوئی داستانوں سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ بس آدمی ایک دفعہ اپنی منکوحہ سے پنڈ چھڑا کے گھر سے نکل پڑے، پھر عیش ہی عیش ہیں۔ قدم قدم پہ شجر سایہ دار۔ ہر شجر میں ہزارہا شاخیں اور ہر شاخ پر چار چار عفیفائیں اس انتظار میں لٹکی پڑی ہیں کہ جیسے ہی ڈان جوآن نیچے سے گزرے اس کی جھولی میں ٹپک پڑیں۔

ہزار ہا زناں امید وار راہ میں ہے

گویا دیس دیس اور شہر شہر ہی نہیں بلکہ خانہ بخانہ، دربدر، کوچہ بکوچہ، کو بہ کو" ان کا سفر جنسی فتوحات کی odyssey بن جاتا ہے۔ جس میں مسافر ہر لمحہ ہر عورت پہ تو اس کا راستہ کاٹے اس کے کیفر (بد) کردار تک ..... یعنی اپنی آغوش تک ..... پہنچا کر دم لیتا ہے۔

روز اک تازہ سراپا نئی تفصیل کے ساتھ

پروفیسر قاضی عبدالقدوس ایم اے، ہر صفحے پر اسٹرپ ٹیز کرتی ہوئی ان مخدرات عصمت آیات کے تذکرے کو ہرزہ سرائی سے تعبیر کرتے ہیں۔ ہرزن سرائی کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ آپ نے بہت اچھا کیا۔ اپنے پندرہ بیس ملکوں اور ایک ہزار صفحوں پر محیط سفرنامے کے نوٹ اپنے سرد خانے بلکہ سترد خانے میں ڈال دیئے۔ ارے صاحب! عجب ہوا چلی ہے۔ ہوائی جہاز کا ٹکٹ خریدتے ہی ..... خواہ وہ دبئی اور سری لنکا ہی کا کیوں نہ ہو ..... ہر ادیب اپنے آپ کو ابن بطوطہ، اپنی تحریر کو مخطوطہ اور حسینوں سے اپنے خیالی مکالمے کو 'ملفوظہ' سمجھنے لگتا ہے مجھے آپ کی اس تجویز سے اتفاق ہے کہ جہاں حکومت پاکستان پاسپورٹ جاری کرنے سے پہلے یہ حلف نامہ لیتی ہے کہ درخواست دہندہ مرزا غلام احمد قادیانی کو کاذب نبی سمجھتا ہے وہاں ادیبوں سے ایک اور حلف نامہ بلکہ مچلکہ لینا چاہیئے کہ واپس آکر سفرنامہ نہیں لکھیں گے اور خود پہ بدچلنی کے الزام نہیں لگائیں گے۔

گوجرانوالہ گوجرانوالہ ہے

سردار جی کرید کرید کے بڑے اشتیاق سے پوچھتے رہے اور میں بڑے وثوق سے گوجرانوالہ کا جھوٹا سچا حال سناتا رہا۔ انھوں نے آواز دے دے کے اپنے بیٹوں، پوتوں اور بہوؤں کو بلایا کہ "ادھر آؤ۔ بشارت جی کو سلام کرو۔ یہ نومبر میں اپنے گوجرانوالہ ہو کے آئے ہیں۔ ادھر میری یہ مصیبت کہ میں نے لاہور کے علاوہ پنجاب کا صرف ایک قصبہ ٹوبہ ٹیک سنگھ قریب سے دیکھا ہے۔ وہاں میرا ایک خورد، اکھن خالہ کا پوتا اگریکلچرل بنک میں تین مہینے کی ملازمت کے بعد گیارہ مہینے سے معطل پڑا تھا۔ بس اسی قصبے کے جغرافیہ پر گوجرانوالہ کو قیاس کر کے ان کی تشنگی رفع کرتا رہا۔ حیرت اس پر ہوئی کہ سردار جی میری فرضی تفصیلات سے نہ صرف مطمئن ہوئے بلکہ ایک ایک کی تصدیق کی۔ میں نے اس نہر کی موجودہ حالت کا بھی خیالی نقشہ کھینچ دیا جس میں سردار جی پل پر سے چھلانگ لگا کے کنواری بھینسوں کے ساتھ تیرا کرتے تھے۔ میں نے ان کے ضمنی سوال کے جواب میں یہ بھی اقرار کیا کہ پل کی دائیں طرف کنال کے ڈھلوان پر جس "ٹاہلی تھلے" وہ اپنی ہرکولیس سائیکل اور کپڑے اتار کر رکھتے تھے وہ جگہ میں نے دیکھی ہے۔ یہاں سے ایک مرتبہ چور ان کے کپڑے اٹھا کے لے گیا مگر سیکل چھوڑ گیا۔ اس واقعہ کے بعد سردار جی نے بہ نظر احتیاط سائیکل لانی چھوڑ دی! میں نے جب یہ ٹکڑا لگایا کہ وہ شیشم اب بالکل سوکھ گیا ہے اور کوئی دن جاتا ہے کہ بوڑھے تنے پر نیلامی آرا چل جائے تو سردار جی پر رقت

طاری ہوگئی۔ حالانکہ ان کا اپنا حال اس شیشم سے کچھ بہتر نہ تھا۔ ان کی منجھلی بہو نے جو بہت شوخ اور خوش شکل تھی۔ مجھ سے کہا کہ "بابو جی کو ابھی پچھلے مہینے ہی ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔ آپ انھیں مت رُلائیں، انکل! اس کا انکل کہنا مجھے ذرا اچھا نہیں لگا اور یہ تو مجھے آپ ہی سے معلوم ہوا کہ نہریں بھینس نہیں سکتی۔ خواہ وہ کنواری ہی کیوں نہ ہو۔

سردار جی میری کسی بات یا شوخ فقرے پر خوش ہوتے تو میرے زانو پر زور زور سے ہاتھ مارتے اور اندر سے لسی کا ایک گلاس اور منگوا کر پلاتے۔ تیسرے گلاس کے بعد میں نے ٹائلٹ کا پتہ پوچھا۔ اپنے زانو کو ان کے دست ستم کش کی زد سے بچایا اور گفتگو میں حد درجہ احتیاط برتنی شروع کردی کہ کہیں بے دھیانی میں کوئی شگفتہ فقرہ منہ سے نہ نکل جائے۔ سردار جی کہنے لگے کہ اِدھر اپنا ٹرانسپورٹ کا بڑا شاندار بزنس ہے۔ سارا ہندستان گھوما ہوں۔ پر گوجرانوالہ کی بات ہی کچھ اور ہے۔ یہاں کی مکئی اور سرسوں کے ساگ میں وہ سواد، وہ سُگند نہیں۔ اور گڑ تو بالکل پھیکا پھوک ہے انھوں نے یہاں تک کہا کہ یہاں کے پانی میں پانی بہت ہے۔ جب کہ گوجرانوالہ کے پانی میں شراب کی تاثیر ہے۔ اس سے ان کی مراد تھی، پانی میں طاقت ہے۔ وہ ہر مفید صحت چیز کو شراب سے تشبیہ دیتے تھے۔ رخصت ہوتے ہوئے میں نے کہا" میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بلا تکلف فرمایئے۔ بولے "تو پھر کسی آتے جاتے کے ہاتھ لاہوری نمک کے تین چار بڑے سے ڈلے بھیج دینا" ان کی تمنا تھی کہ مرنے سے پہلے ایک دفعہ اپنے بیٹوں پوتوں کو ساتھ لیکر گوجرانوالہ جائیں اور اپنے مڈل اسکول کے سامنے کھڑے ہو کر فوٹو بنوائیں۔ تحفے میں مجھے انڈین Raw سلک کا چھوٹا تھان دیا۔ پہلے کا تو منجھلی بہو نے مجھے آداب کیا۔ اس دفعہ انکل نہیں کہا۔

عذاب لکھوں کہ خواب لکھوں

سردار جی نے مجھے سارا گھر دکھایا۔ بہوؤں نے بکھری ہوئی چیزیں بڑے قرینے سے غلط جگہ رکھ دی تھیں۔ جو چیزیں عجلت میں رکھی نہ جا سکیں انھیں سمیٹ کر بیڈ پر ڈال دیا۔ اور اوپر صاف چادر ڈال دی۔ چنانچہ گھر میں جہاں جہاں صاف چادر نظر آئی، میں تاڑ گیا کہ نیچے کاٹھ کباڑ دفن ہے۔ صاحب! Curiosity بھی بری بلا ہے۔ ایک کمرے میں میں نے نظر بچا کر چادر کا کونا سرکایا تو نیچے سے سردار جی کے ماموں کیس کھولے ایک نہایت مختصر کچھا پہنے برآمد ہوئے۔ ان کی داڑھی اتنی لمبی اور گھنگھور تھی کہ اس تکلف کی بھی چنداں ضرورت نہ تھی۔ گھر کا نقشہ کافی بدل گیا ہے۔ گلنار جس محراب دار دریچے کی جِق کے پیچھے سے مقیش کا جھلمل دوپٹہ اوڑھے جھانکا کرتی تھی اب اسے تیغا کردیا ہے۔ دیکھئے آپ پھر مسکرانے لگے۔ صاحب! کیا کروں پرانے لفظ اور محاورے ابھی تک زبان پر چڑھے ہوئے ہیں۔ کسی محراب یا روزن کو اینٹ گارے سے بند کرنے کو تیغا کرنا کہتے تھے۔ صحن اب پختہ کروالیا ہے۔ چنبیلی کی بیل اور امرود کا پیڑ نظر نہیں آیا۔ یہاں میاں صاحب شام کو دو مشکوں سے چھڑکاؤ کروا کے مونڈھے بچھوا دیا کرتے تھے۔ اپنے لئے خراد پر بنے ہوئے چنیوٹ کے رنگین پایوں والی چارپائی ڈلواتے۔ وطن کی یاد زیادہ ستاتی تو ہمیں مقامی گنڈیریاں کھلاتے۔ ان کا گلا لاہور کی گنڈیریوں کو یاد کرکے رندھ جاتا۔ چاندنی راتوں میں اکثر ڈرل ماسٹر کی آواز میں "مرزا صاحباں" اور جگنی چمٹا بجا کے سناتے۔ خود آبدیدہ ہوتے، ہمیں بھی آبدیدہ کرتے۔ گو کہ ہماری "آبدیدگی" کی وجہ کچھ اور ہوتی

کچھ دیر بعد خود ہی اپنے بے سرے پن کا احساس ہوتا تو چھٹا بڑی حقارت سے محون
ہ چھینک کر فرماتے کہ بادشاہو! کانپور کے چھینٹے گانے کی سنگت کے لئے نہیں، چلم بھرنے کے لئے سوٹ ایبل
ہے! میاں صاحب ایک زمانے میں خاصے رنگین مزاج ہوا کرتے تھے۔ مدتوں سے کانپور میں آباد تھے۔ مگر کبھی پان
کھایا نہ تسلیمات، آداب عرض کہا۔ اور نہ کبھی کوئی شعر پڑھا۔ کو ٹھے پر بھی نہیں جہاں ان تینوں کے بغیر گذر اور گذارہ
نہیں ہو سکتا تھا۔

سردار جی سے جھوٹ بول کر باہر نکلا تو سارا نا سٹل جیا جسے آپ یا دش بخیر بھی کہتے ہیں، ہرن ہو چکا تھا۔ پرانا مکان
مانے مجھے انعام اللہ برملائی۔ بے گئے تھے۔ واپسی میں ایک گلی کے نکڑ پر مٹھائی کی دکان کے سامنے رک گئے۔ کہنے لگے۔ میش
اڈوانی ایڈووکیٹ کے ہاں بھی جھانکتے چلیں۔ جیکب آباد کا رہنے والا ہے۔ ستر کا ہے۔ مگر لگتا نہیں۔ اسی کا لگتا ہے۔ جب
سے سنا ہے کہ کراچی سے کوئی صاحب آئے ہیں، ملنے کے لئے تڑپ رہا ہے۔ جیکب آباد اور سکھر کی خیر خیریت معلوم کرنا چاہتا
۔ ستار پر تمہیں کافیاں بھی سنائے گا۔ اگر تم نے تعریف کی تو مزید سنائے گا۔ نہ کی تب بھی مزید سنائے گا کہ یہ ان
بہتر ہیں۔ شاید آپ کو پسند آئیں۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی کا رسالو زبانی یاد ہے۔ ہندی بیکھ لی ہے۔ مگر جوش میں آتا ہے
سب جناتی زبان میں گفتگو کرنے لگتا ہے۔ کھسکا ہوا ہے مگر ہے دلچسپ۔

تو صاحب! اڈوانی سے بھی گفتگو رہی۔ گفتگو کیا monologue کہیے۔ کنہا بھی کہا دوں کو بولنے نہیں
، والا مضمون ہے۔ اس نے یہ تصدیق چاہی کہ جیکب آباد اب بھی ویسا ہی حسین ہے یا نہیں جیسا وہ جوانی میں چھوڑ کر آیا
۔ یعنی کیا اب بھی چودھویں کو پورا چاند ہوتا ہے؟ کیا اب بھی مدینے سے سندھ کی لہروں میں کشش کرتی پلا مچھلیاں دو
اچھالتی ہیں۔ موسم ویسا ہی حسین ہے؟ (یعنی ۱۲۵ ڈگری گرمی پڑتی ہے یا اس پر بھی زوال آگیا؟) اور کیا اب بھی جیٹھ پر
آنے والی ہوائیں لُو سے پکتی ہوئی کھجوروں کی مہکار سے بوجھل ہوتی ہیں؟ بستی میں سالانہ دربار اور میلہ مویشیاں لگتا
ہے کہ نہیں؟ میں نے جب اسے بتایا کہ میلہ مویشیاں میں اب مشاعرہ بھی ہوتا ہے اور دور دور سے شاعر بلائے
تے ہیں تو وہ دیر تک میلے کی بے توقیری پر افسوس کرتا رہا اور پوچھنے لگا کہ کیا اب سندھ میں اچھے مویشی اتنے
ہو گئے؟ اسے گنگا جمنی میدان ذرا نہیں بھاتا۔ کہنے لگا "سائیں! ہم سیدھے، کھرے ریگ مال ریگستانی لوگ
۔ اپنے رشتے، پیار اور سمبندھ پر کائی نہیں لگنے دیتے۔ آپ صفاچٹ آگرو (۱) اور دلدلی میدانوں کے رہنے والے
کیا جانیں کہ ریگستان میں گرم ہوا ریت پر کیسی چلبلی لہریں، کیسے کیسے چتر (۲) بنا بنا کے مٹاتی اور مٹا مٹا کے
ہے۔ سائیں! ہمارا سارا sandscape شہ زور آندھیاں تراشتی ہیں.... جھولو (۳) جھکڑ اور جیٹھ کے میناد
لے سارے ریگستان کو متھ کے رکھ دیتے ہیں۔ آج جو ریگ وادی ہے وہاں سے کل لال آندھی کی دھوم سواری گذری
جلتی دوپہر میں بگولے ڈھول برساتی ریت پہاڑیاں۔ پچھلے پہر کی سبر داتی تحمل بالو پہ دھیمی دھیمی پین پکھاوج

---

(۱) آگرو: (سندھی) دوآبہ
(۲) چتر: نقش و نگار
(۳) جھولو: (سندھی) گرم ہوا۔ لُو۔

جوان بلوان بانکوں کی ہتھیلیوں سمان ریت کی ابھرتی پھڑکتی لہریں۔ ایک لہر جیسی نہیں۔ ایک ڈب (۴) ٹیلا دوسرے سے اور ایک رات دوسری رات سے نہیں ملتی۔ برسات کی راتوں میں جب تھوڑے بادل سندھ کے ریگ ساگر کے اوپر سے آنکھ مچولی کھیلتے گزرتے ہیں تو اداس چاندنی ہر آن عجب طلسمات کھیلتی ہے۔ جس کو سارا ریگستان ایک سال لگتا ہے۔ اس کی آنکھ نے ابھی دیکھنا ہی نہیں سیکھا۔ سائیں! ہم تمہارے پیروں کی خاک، ہم ریت دریا ساگر کی مچھلی ٹھہرے۔ آدھی رات کو بھی ریت کی تہوں میں انگلیاں گڑو کے ٹھیک ٹھیک بتا دیں گے کہ آج پوچھانڈو (۵) کہاں تھا۔ (یعنی ٹیلے کا وہ کون سا حصہ ہے جہاں صبح سویرے سورج کی پہلی کرن پڑی) دوپہر کو ہوا کا رُخ کیا تھا۔ اور ٹھیک اس سمے شہر کی گھڑیوں میں کیا بجا ہوگا۔ دھرتی نے ہمیں پھول پھل اور ہریالی دینے سے ہاتھ کھینچ لیا تو ہم نے دھنک کے سارے چنچل رنگوں کی پچکاری اپنی اجرکوں، رلیوں، اوڑھنیوں، شیشہ کوں پٹولیوں اور آرائشی ٹائلوں پر چھوڑ دی۔"

وہ اپنی آنسو دھار پچکاری چھوڑ چکا تو میں نے باہر آکر انعام اللہ برطانی سے کہا "بھائی میرے! بہت ہو چکی یہ کیسا ہندو ہے جو گنگا کنارے کھڑا ریگستان کے سپنے دیکھتا ہے!

کہیں دل اور کہیں نگری ہے دل کی
یہ ساری عمر کا بن باس دیکھو

ایسا ہی ہے تو اسے اونٹ پر بٹھا کر بیکانیر میں کسی ٹیلے یا کانٹوں بھرے کیکر کے ٹھنٹھ پر بٹھا آؤ کہ اوپر چھاؤں نہیں اور نیچے ٹھاؤں نہیں۔ اب کے تم نے مجھے کسی ماضی میں مبتلا آدمی سے ملایا تو قسم خدا کی، لوٹا ڈور، چٹائی کلیات نظیر اکبر آبادی اور فروٹ سالٹ بغل میں مار بیابان کو نکل جاؤں گا اور کان کھول کر سن لو۔ اب میں کسی ایسے شخص سے ہاتھ ملانے کا بھی روادار نہیں جو میرا ہم عمر ہو۔" صاحب! مجھے تو اس کہولت اور یبوست سے یعنی اپنے آپ سے قے آنے لگی۔ آپ کے مرزا صاحب نے کچھ غلط تو نہیں کہا تھا کہ اپنے ہم عمر بڈھوں سے محض ہاتھ ملانے سے آدمی کی زندگی ہر مصافحے کے بعد ایک سال گھٹ جاتی ہے!

---

(۴) ڈب: (سندھی) ٹیلا

(۵) پوچھانڈو: سندھی لفظ ہے اس کا مترادف عربی میں ہو تو ہو۔

رضوان اللہ
(دہلی)

سندباد کا آخری سفر

سندباد جہازی کا آخری سفرنامہ شریک اشاعت ہونے سے رہ گیا تھا لیکن اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ اس کا مسودہ ایک کباڑی کی دکان پر اس عاجز کے ہاتھ لگا تو خیال ہوا کہ کیوں نہ اس کو زیورِ طبع سے آراستہ کرا دیا جائے تاکہ آئندہ کبھی اردو ادب کے تحقیق کاروں کو اردو نثر پر تحقیق کرنے کی فرصت مل جائے تو وہ اس نثری شہ پارے سے محروم نہ رہیں۔ ابھی تو انھیں غزل ہی کے بخیے ادھیڑنے سے فرصت نہیں کیوں کہ غزل کاروں نے زلفِ محبوب کو اتنا طول دیا ہے کہ اس کا سرا ملتا ہی نہیں۔ اسے سلجھانے والوں کے شانے شل ہو گئے اور یہ ظالم کسی طرح "منّت پذیرِ شانہ" نہیں ہوتی۔ مزید براں ان ناعاقبت اندیشوں نے قبائے محبوب کو تنگ سے تنگ تر کرنے کی کوشش میں بخیہ اتنا مہین کر دیا ہے کہ ادھیڑے نہیں ادھڑتا۔

خیر! تو قصّہ آخری سفر کا یوں مذکور ہے:

صاحبو! ہم نے تو پچھلے سفر کے بعد ہی کان پکڑ کر اور ناک رگڑ کر عہد کر لیا تھا کہ پھر کبھی سفر کا نام نہیں لیں گے لیکن برا ہو اس لالچ کا جو اس سرشت نہاد کی گھٹی میں پڑی ہے۔ ایک عرصہ کے بعد جی نے کہا کہ اب دنیا بدل گئی ہے، لوگ تہذیب یافتہ ہو گئے ہیں، خوش حالی کی وجہ سے کوئی دوسرے کے مال کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا، حکام عمال کو عام لوگوں کی خدمت سے ہی فرصت نہیں کہ تاجروں کے مال پر نظر ڈالیں، سفر کی سہولتیں بڑھ گئی ہیں۔ چلو ایک بار پھر قسمت آزما کر دیکھیں۔

تو صاحبو! اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ جب ہم اپنے بوریے بقچے سنبھالے عازمِ سفر ہوئے تو رات کا آخری سفر سطحِ کبود پر پھیلا رہا تھا۔ ساحل پر بکھری ہوئی کشتیوں میں تھکے ہارے ملاحوں کو بادِ سحر نے تھپکیاں دے دے کر گہری نیند میں ڈالے رکھا تھا۔ ہمیں گزشتہ سفروں میں جو تجربے ہوئے تھے۔ اس بار ان سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کا

کوشش کی گئی چناں چہ حفاظت کے لیے ڈنلپ کے ڈونگے ساتھ رکھے گئے۔ کھانے پینے کی چیزیں پلاسٹک کے ہوا بند ڈبوں میں رکھی گئیں۔ سامانِ تجارت کا مشکل مسئلہ بھی حل کرلیا گیا گو اسے اکٹھا کرنے میں کافی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔

قصہ یوں ہے کہ پہلے تو ہم لوگ گینڈے کے سینگ، ہرن کے نافے، شیر کے ناخن، سانپ کی کھال جیسی ہلکی پھلکی لیکن قیمتی چیزیں لے جایا کرتے تھے لیکن کیا کہیں ان ناعاقبت اندیشوں کو جنھوں نے جانوروں پر ظلم کو ناروا قرار دے کر آدمیوں پر ظلم کو روا کر دیا اور ان چیزوں کو ملک سے باہر لے جانے پر پابندی لگا دی لیکن اللہ بڑا کارساز ہے۔ ہم نے پہلے سے بھی زیادہ ہلکا مال جو قیمت میں بھی ہزار گنا زیادہ تھا کوشش بسیار کے بعد دریافت کرلیا۔ وہ ایک طرح کی زرد و سفید گرد تھی جو ہمارے ہم وطنوں کی گانٹھ کی گرفت سے باہر تھی۔

ہم نے اپنی غذاؤں کے ہوا بند ڈبوں ہی جیسے چند ڈبوں میں اس گرد کی کچھ مقدار محفوظ کرلی اور متوقع گاہکوں کو بطور سیمپل دینے کے لیے اس کی قلیل مقدار اپنے بازوؤں پر بندھے تعویذوں میں رکھ لی۔ ابھی صبح کی خوش گوار ہوائیں چل رہی تھیں کہ ہم نے اللہ کا نام لے کر لنگر اٹھا لیا۔ موسم صاف تھا اور ہوا پانی کے دفتر کی اطلاع کے مطابق اگلے بہتر گھنٹوں تک تیز سمندری ہواؤں کا امکان نہیں تھا۔ ہم سب اپنی تجارتی منفعت کے خواب بنتے ہوئے اونگھنے لگے۔

کچھ ہی گھنٹے اس سفر کے گزرے ہوں گے کہ کوئی چیز بری طرح ہماری کشتی سے ٹکرائی اور آناً فاناً اس کی دھجیاں اڑا دیں۔ ملاح کا صرف ایک لفظ سنائی دیا "تارپیڈو"۔ اگلے لمحہ ہمارے چاروں طرف پلاسٹک کے ڈبے اور ڈنلپ کے ڈونگے تیر رہے تھے۔ ہم نے اپنے حواس بجا رکھے اور لپک کر ایک ڈونگے کو پکڑا اور اس میں اکڑوں بیٹھ گئے پھر جتنی پھرتی کے ساتھ ممکن ہوسکا ہر طرف بھاگتے ہوئے ڈبوں کو پکڑنے لگے جن میں کھانے پینے کی چیزیں تھیں۔ مالِ تجارت کا بھی ایک ڈبہ ہاتھ آگیا۔ دوسرے تاجروں کا حشر اللہ بہتر جانتا ہے۔

ہم دن بھر جھکولے کھاتے رہے یہاں تک کہ آسمان تاروں سے بھر گیا۔ شکر ہے خطرناک مچھلیاں آس پاس نہ تھیں شاید تارپیڈو کی وجہ سے دور چلی گئی ہوں۔ کہتے ہیں کہ نیند کا غلبہ ہو تو سولی پر بھی آجاتی ہے۔ تاروں کی چھاؤں میں ہچکولے کھاتے ہوئے ہماری بھی ذرا آنکھ لگ گئی۔

اچانک آنکھ کھلی تو کیا دیکھتے ہیں کہ ہمارے ہنڈولے کو کوئی کھینچے لیے جاتا ہے۔ صبح کا جھٹ پٹا ہو رہا تھا ایسے میں بالوں سے بھرے ہوئے ایک تھوپے چہرے پر دو ابلی ہوئی آنکھیں صاف معلوم پڑ رہی تھیں۔ میں نے حواس بجا رکھے اور ٹھنڈے مشروب کا ایک ڈبہ اٹھایا اسے ذرا کھولا اور اس میں سے چند قطرے اپنے منہ میں ٹپکا کر اس کا چٹخارہ لیا تو اس وحشی انسان نے بھی اپنا منہ پھاڑا۔ میں نے اس کے منہ میں بھی ایک گھونٹ شربت انڈیل دیا۔ اس نے لمبی سی سرخ زبان نکال کر خوب چٹخارہ لیا تو میں نے

شربت کا ڈبہ اسے پکڑا دیا وہ سارا شربت غٹا غٹ پی کر خوشی سے ہوا میں ہاتھ نچانے لگا اور جھومتا ہوا اچھلے سمندر میں ساحل کی طرف بڑھتا گیا۔ اسی اثنا میں میں نے اپنے تعویذ سے گردے کے کچھ ذرے ٹٹول کر چٹکی میں دبائے اور اس کی زبان پر رکھ دیے۔ چند لمحے بعد ہی وہ جوش و سرمستی کے عالم میں چیخنے لگا۔

کچھ دیر بعد لگا کہ ہم ساحل پر آگئے ہیں۔ اس نے اترنے کا اشارہ کیا۔ وہ ہماری ضیافت کی وجہ سے بالکل رام ہوگیا تھا۔ اس لیے میرے اندیشے کم ہوتے جا رہے تھے۔ ذہن تیزی سے سوچنے کے قابل ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے اس کو ہنڈولا بھی کھینچ کر ساتھ چلنے کا اشارہ کیا اور وہ بخوشی اسے کھینچتا ہوا چلنے لگا اب بالکل سویرا ہوچکا تھا، چڑیوں کے چہچہوں سے جنگل کی فضا گونج رہی تھی۔ آس پاس کسی آدم زاد کا نشان نہ تھا۔

کچھ دور چلنے کے بعد درختوں کے ایک جھرمٹ کے قریب وہ عفریت نما انسان رک گیا اور ہنہنانے لگا۔ اتنے میں سوکھے پتوں پر کسی کے قدموں کی آہٹ جھاڑیوں کے اندر سنائی دینے لگی۔ چند دقیقوں کے بعد کیا دیکھتے ہیں کہ ایک دیوقامت نیم برہنہ وحشی جھاڑیوں سے نکل کر دلیارکی طرح ہمارے سامنے کھڑا ہوگیا۔ اس کے آس پاس اسی قماش کے چند اور وحشیوں نے ایک حلقہ سا بنالیا۔ میں سمجھ گیا کہ یہی ان کا سردار ہے جو اس مختصر سے جزیرہ پر حکمران ہے۔ مجھے پکڑ کر لانے والے نے میرے بارے میں یقیناً کچھ کہہ دیا جس کی وجہ سے ان وحشی چہروں پر بھی مسکراہٹ سی تھی۔

ذرا توقف کے بعد میں مشروب کا ایک ڈبہ ڈولچے میں سے لے کر آگے بڑھا اور اسے کھول کر سردار کی طرف بڑھایا مجھے لانے والے نے پینے کا اشارہ کیا تو وہ غرغر کرکے اسے یک لخت حلق سے اتار گیا اس کے بعد ہی میں نے بڑھ کر گردے کے چند ذرّات اس کی زبان پر ڈال دیے پھر تو سردار کی خوشی کی انتہا نہ رہی وہ ناچنے لگا اور شور مچانے لگا۔ اس کے بعد ہمیں بڑی ملائمت سے اندر جھاڑی کی طرف چلنے کا اشارہ کیا گیا ہم اپنا ڈولچہ بھی ساتھ لے چلے۔ ذرا دور جانے کے بعد سردار کے سارے ساتھی ٹھہر گئے اور سردار نے ہمیں آگے چلنے کا اشارہ کیا۔ جنگل گھنا اور سائے گہرے ہوتے جا رہے تھے۔ کچھ دور جانے کے بعد لکڑیوں کا ایک منڈپ سا بنا ہوا نظر آیا اس میں داخلہ کے لیے ایک دروازہ تھا جس کے قریب پہنچ کر سردار ہنہنایا تو اتنی ہی بھیانک نیم برہنہ ایک عورت نمودار ہوئی اور سردار کے سامنے تن کر کھڑی ہوگئی۔ وہ یقیناً ملکہ تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر کسی قدر حیرت کے آثار نمودار ہوئے۔ جس کا اظہار اس نے سفید دانت اور سرخ مسوڑھے دکھا کر کیا لیکن سردار کے کچھ بتانے پر اس کی تنی ہوئی بھنوؤں کی کمانیں اتر گئیں۔

سردار نے نئے ذائقہ سے ملکہ کو بھی آشنا کرنے کا اشارہ کیا میں نے بڑھ کر گردے کے چند ذرّے اسے چکھا دیے بس وہ تو فرط انبساط سے چنگھاڑنے لگی اور بڑھ کر مجھ سے چمٹ گئی۔ اس کی بساند سے مجھ پر غشی سی طاری ہونے لگی۔ اس نے اس زور سے مجھے دبوچا کہ میری پسلیاں ٹوٹتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ ذرا دیر بعد میں خدا خدا کرکے میں اس قید سے خود کو آزاد کرانے میں کامیاب ہوگیا۔

وہ دونوں جب آپس میں خوش گپیاں کرنے لگے تو میں نے موقع غنیمت سمجھا اور ڈوپٹے میں سے غذا کا ایک ڈبہ نکال کر اپنے پیٹ کی آگ بجھانے لگا جسے وہ دونوں بڑی حیرت سے دیکھتے رہے۔ اس سے فراغت کے بعد انھوں نے ملکہ کے منڈپ سے ملحق ایک اور کنج کی طرف ہماری رہنمائی کی اور وہیں آرام کرنے کا اشارہ کیا۔ میں نے غذا اور شربت کے ڈبے ان کی طرف بڑھا دیے اور گرد کا جو ایک ڈبہ تھا اس کو آہستہ سے کھسکا کر پتوں کے نیچے چھپا دیا تاکہ اپنے بازو بند کے مال میں کمی کو اس میں سے پورا کرتے ہیں۔

ان دونوں کے وہاں سے ہٹتے ہی ہم آرام کرنے کی غرض جو لیٹے تو گہری نیند نے ہمیں آلیا۔ معلوم نہیں کتنے گھنٹے اس عالم میں گزر گئے۔ پاؤں کے قریب سرسراہٹ محسوس ہوئی تو آنکھ کھلی۔ سوچنے لگا کہ یا اللہ میں کوئی بھیانک خواب دیکھ رہا ہوں یا حقیقت ہے لیکن چٹان جیسی ٹھوس حقیقت میرے سامنے تھی۔ ملکہ اپنی تمام جلوہ سامانیوں کے ساتھ موجود تھی۔ اس کی ایک خادمہ نے جو اس سے کم قہر آلود نہ تھی بڑے بڑے پتوں پر کھانے کے کچھ سامان رکھ دیے تھے۔ ان میں کئی طرح کے جنگلی پھل تھے جن میں سے صرف کٹھل کو پہچان سکا اور کچھ بھنی ہوئی چھوٹی بڑی چیزیں تھیں جو گلہری اور خرگوش معلوم ہوتے تھے۔ بھوک کی شدت اور چڑیوں کے چہچہوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ صبح کا وقت ہے یعنی وہ اگلے دن کی صبح تھی۔

ہم نے گوشت کو ہاتھ نہیں لگایا۔ پھلوں میں سے کچھ اتاپ شتاپ کھا کر پیٹ بھرا۔ ملکہ خاموشی کے ساتھ دیکھتی رہی۔ جب ہم کھانے سے فارغ ہوئے تو اس نے اشارے سے گرد کی فرمائش کی۔ ہم نے اس کی یہ فرمائش پوری کر دی۔ وہ ایک بار پھر جست لگا کر ہم سے لپٹ گئی۔ اور ایسا شور برپا کیا کہ الامان الحفیظ۔ کچھ دیر اچھلنے کودنے کے بعد اس نے اپنے ساتھ چلنے کا ہمیں اشارہ کیا۔ ہم چل پڑے۔ کچھ دیر چلنے کے بعد ایک اور [illegible] سے قریب پہنچے تو وہاں ایک وحشی پہرے دار نظر آیا جو ملکہ کو دیکھ کر مودب ہو گیا اور ایک طرف ہٹ گیا۔ ہم اندر داخل ہو گئے یہ ایک وسیع گوشہ تھا جس میں نرم پتوں کے گدیلے بچھے ہوئے تھے۔ اس میں ایک طرف کیا دیکھتے ہیں کہ ایک شخص چپ چاپ بیٹھا ہے جو ہمیں دیکھتے ہی کھڑا ہو گیا۔ چہرے بشرے سے معلوم ہوتا تھا کہ ایک خوب رو جوان رہا ہوگا جو عرصۂ دراز سے اس وحشی ماحول میں قید ہے۔ ہمارا ہی ہم وطن معلوم ہوتا تھا۔ ہمیں دیکھ کر اس کی آنکھوں میں ایک چمک پیدا ہوئی لیکن ہم دونوں نے خاموشی کو راہ دی۔ ملکہ نے ہمیں اشارہ کیا کہ تم یہاں ٹھہر سکتے ہو اور خود باہر چلی گئی۔

ہم اس بدنصیب سے مخاطب ہوئے کہ اے یار یہ کیا ماجرا ہے۔ خدا را ہمیں بھی بتا۔ وہ ہکلا ہکلا کر بولنے لگا کیوں کہ برسوں کی اس قید میں وہ اپنی بولی بھی بھول چلا تھا۔ اس نے اپنی روداد یوں بیان کی۔

ہم اپنے وطن سے ترک سکونت کر کے ایک قریبی جزیرے میں آباد ہو گئے تھے جہاں ساری دنیا کے لوگ سونا اور چاندی لا لا کر انبار کیا کرتے تھے کیوں کہ وہاں اس جنس کو لانے لے جانے پر کوئی پابندی نہ تھی۔ پھر وہاں سے چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں رات کے اندھیرے میں قریب کے ملکوں میں پہنچا دیا کرتے تھے۔ ایسے ہی ایک موقع پر ہماری کشتی طوفان میں پھنس گئی اور راستے سے بھٹک گئی۔ کئی روز تک سمندری ہچکولے کھا کھا کر ہمارے

ساتھی مرتے گئے۔ میں ہی ایک بچ رہا تھا جب اس جزیرے کے لوگ ہماری کشتی کو یہاں پکڑ لائے۔ ملکہ ہماری صورت شکل دیکھ کر بہت مہربان ہو گئی اور ہماری خاطر مدارات کرنے کا حکم دے دیا اور ایک آرام دہ غار میں رکھنے کی ہدایت کی۔ چند دنوں بعد ہم اس جگہ منتقل کر دیئے گئے۔ اور ہماری کشتی پر لدا ہوا سارا سونا چاندی لا کر یہیں ڈھیر کر دیا گیا۔ پتہ نہیں کتنا عرصہ عرصہ اس واقعہ کو گزرا لیکن اتنا یاد ہے کہ پانچ بار زوروں کی سردی پڑی تب سے اب تک پکڑی جانے والی کشتیوں پر جتنا سونا چاندی ہاتھ آتا رہا ہے وہ سب لا لا کر یہیں جمع کیا گیا ہے۔ ملکہ چاندنی راتیں یہیں آ کر گزارتی ہے اس لیے ہمیں کسی گزند کا اندیشہ نہیں لیکن یہ قید حیات تو موت سے بھی بدتر ہے۔ گزشتہ رات ملکہ یہاں آئی تو زبان پر کسی چیز کے ذائقہ کا اشارہ کر رہی تھی اور خوشی سے ناچ رہی تھی۔ اب سمجھ میں آیا کہ تم نے ہی اسے کوئی نیا ذائقہ چکھایا ہوگا۔

میں نے کہا کہ اے یار قسمت نے یاوری کی تو ہم یہاں سے نکلنے کی کوئی تدبیر کر لیں گے۔ تو پہرے میں ہے لیکن میں کسی قدر آزاد ہوں۔ پس اسی وقت ہم نے تمنائے آزادی کی شاخ کو ہرا رکھنے کی تدبیریں سوچنے لگے۔ ہم ہر روز ملکہ کو چند ذرّے گرد کے چکھاتے اور اپنے کنج سے نکل کر قیدی دوست کے گوشے تک چلے جاتے اس طرح ہماری آمد ورفت سے پہرے دار کسی قدر مانوس ہو گئے۔ ہم نے ایک خرگوش کو پکڑ کر اس کی سفید کھال صاف کی اس کو خشک کیا اور ایک لمبی ٹہنی پر لپیٹ کر سفید پرچم کی صورت میں تیار رکھا اور اپنی دعاؤں میں اثر ہونے کا انتظار کرتے رہے۔

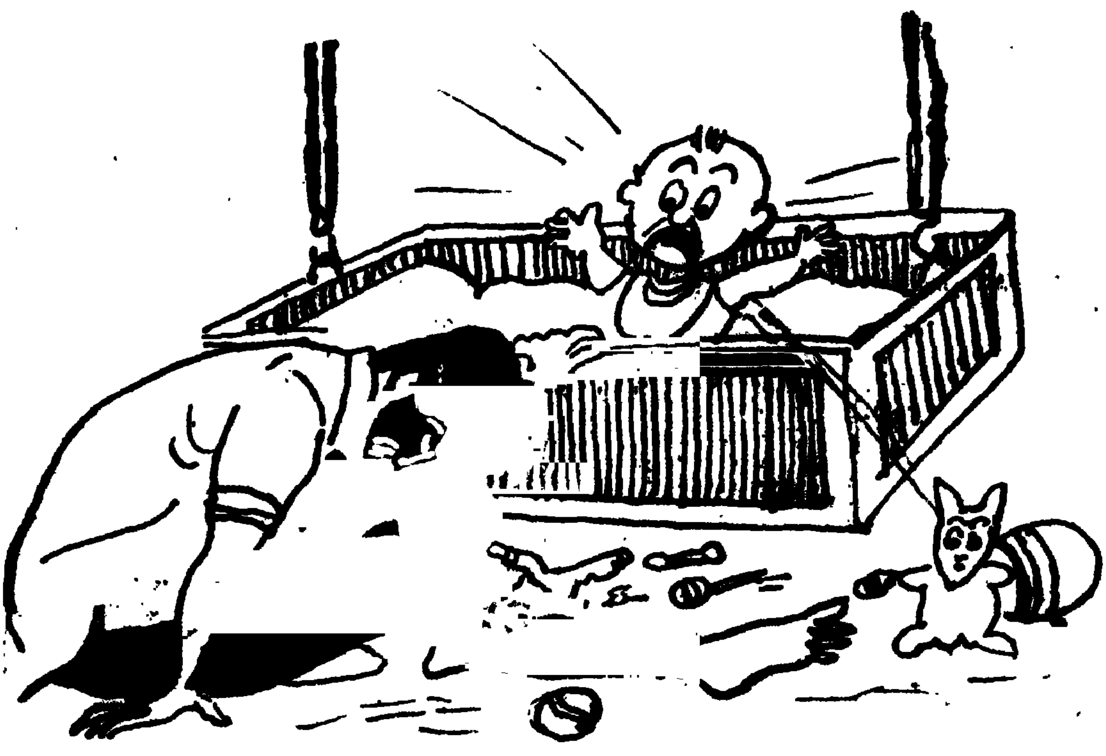
ایک دن ہم دونوں اکھٹا ہی تھے کہ ہوا میں ایک مانوس گھنگھناہٹ سنائی دی۔ دل نے کہا کہ یہ تو آزادی کے دن جیسی گھنگھناہٹ ہے یقیناً فال نیک ہے۔ ہم نے اس یار کو وہاں چھوڑا اور جھپٹ کر اپنی جھونپڑی سے وہ سفید جھنڈا اٹھایا اور ایک اونچے پیڑ پر چڑھ کر اسے لہرانے لگے۔ اس طرف لہرایا جدھر ایک بڑا سا ٹڈا ہوا میں منڈلا رہا تھا۔ اس نے گھنے جنگل پر سفید جھنڈا لہراتے ہوئے دیکھ لیا تو ہماری طرف مائل ہوا۔ اس کے نیچے آنے سے بن واسیوں میں گھبراہٹ پیدا ہوئی۔ اور ادھر ادھر چھپ کر گھات لگانے لگے۔ ہم نے عنوں غاں کر کے ان کا ڈر کم کیا۔

وہ جہاز قریب ہی کھلی جگہ پر اتر گیا۔ ہم اس کے قریب گئے اور جہازی سے اپنا ماجرا بیان کرنے کے بعد سارا سونا چاندی لاد کر فرار ہونے کی تدبیریں طے کر کے واپس آئے۔ جنگل باسی ہماری اس بے خوفی سے حیران رہ گئے۔ ہم نے فوراً اپنا ڈبہ نکالا اور گرد کی اچھی مقدار چٹکی سے سب کی زبان پر رکھنا شروع کر دیا۔ سب خوشی سے ناچنے اور چیخنے لگے ذرا دیر میں سب گر کر بے ہوشی کے عالم میں ڈوب گئے۔ ہم اپنے ساتھی قیدی کے منڈپ میں گھسے اور اس سے کہا کہ جس قدر سونا چاندی لاد کر لے چل سکتا ہے لے چل ...... یہ سب تو چوبیس گھنٹے بعد ہوش میں آئیں گے۔ ہم دونوں قیمتی مال ڈبے میں بھر بھر کر جہاز کے قریب لائے جسے دیکھ کر اکیلا جہازی دنگ رہ گیا۔ پھر اس نے سارا سامان جہاز پر لادنے میں مدد کی۔ اس کا مدد کرنے کے بعد اس کے دل میں بے ایمانی سمائی اور حیلہ کرنے لگا کہ میرا جہاز چھوٹا ہے اب

جیسے ہی اس جہاز کے ڈنڈے جیسی ٹانگوں میں حرکت ہوئی اور وہ اوپر اٹھنے لگا۔ ہم لپک کر اس کی ٹانگ سے لپٹ گئے۔

وہ ناسپاس جہازی سمندر پر کچھ دیر اڑتا ہوا خشکی پر آگیا اور ایک سنسان علاقے میں پہنچنے کے بعد نیچے آنے لگا اور اترنے کے قریب ہی تھا کہ ایک درخت کے اوپر سے گزرا ہم کمال چابک دستی سے اس درخت کی شاخوں میں اٹک لیے اور پھر دیکھتے رہے کہ اس نے ایک غار کے قریب جہاز ٹھہرا کر سارا سونا چاندی اس میں بھرا اور اسے مٹی سے دبا کر رخصت ہو گیا۔ ابھی ہم اس حیرت سے باہر نہیں آئے تھے کہ ایک ہتھیار بند گروہ اس جگہ پہنچا اور مٹی ہٹا کر ساری دولت نکال لے گیا۔

میں درخت سے نیچے اترا اور لڑکھڑاتا ہوا ایک طرف چل پڑا۔ گھنٹوں اسی طرح چلتے رہنے کے بعد کچھ بود و باش کے آثار نظر آنے لگے۔ بعض آنے جانے والوں نے غریب اور ضرورت مند سمجھ کر میری مدد کی۔ بس گرتا پڑتا افتاں و خیزاں کسی طرح وطن عزیز تک پہنچا۔ خدا کا شکر بجا لایا اور پھر کبھی سفر کے لیے پاؤں نہ نکالنے کا عہد کیا اور روکھی سوکھی پر قناعت کرنے لگا۔ ●●



ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

یہ ہے بمبئی میری جان

پرویز ید اللہ مہدی

ہو گرمی یا سردی پسینہ پسینہ

یہ بات نہیں ہے کہ بمبئی کے حدود اربعہ میں موسموں کی آمد و رفت کا قدرتی سلسلہ دیگر مقامات کے موسمی تغیرات سے سر مختلف ہے۔ یہاں بھی موسم بظاہر اپنے چولے بدلتے ہیں۔ یعنی گرمی کے بعد برسات کے بعد سرما اور سرما کے بعد پھر موسم گرما کا آواگون زور ہوتا ہے۔ لیکن موسموں کا یہ تغیر یہ تبدیلی محض زبانی جمع خرچ کی حد تک ہوتی ہے۔ یعنی اوپر ہی اوپر ہوتی ہے۔ بالفاظ دیگر بمبئی کی دی کے بڑے حصے کے سروں کی سطح مرتفع سے کچھ اوپر موسم کی مناسبت سے اگر سردی کا سیزن ہو تو ٹھنڈی ہوا کے جھونکے موسم برسات تو بارش کے چھینٹے اور اگر موسم گرما ہو تو گرمی کے بھبکے زیر ساں اپنا خوب زور دکھاتے ہیں۔ لیکن زیر سر برس کے بارہ مہینے ہی موسم کی حکمرانی ہوتی ہے۔ جو پہلے آدمی کے جسم سے پسینہ، پھر اس کا سارا تیل نکال لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بمبئی کی آبادی اکثریت چوسے ہوئے آم اور نچوڑ کا ہوئی ٹوٹی کی طرح اِدھر اُدھر، یہاں، وہاں لڑکھڑاتی لڑھکتی ہوئی دکھائی دیتی ہے مُبا اہلیان بمبئی کو یہ شرف حاصل ہے کہ بہ یک وقت دو موسموں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو بالائے سر سایہ فگن تا ہے دوسرا وہ جو زیر سر موجزن رہتا ہے اپنی اپنی عملداری میں بہ یک وقت کارفرما یہ دو موسم اصل میں شعر کے دو مرعوں کی طرح ہوتے ہیں۔ ایک مصرعہ اولیٰ، دوسرا مصرعہ ثانی، مصرعہ اولیٰ کے ارکان بحر اور وزن میں تغیر و تبدیلی کرۂ ارض کی گردش یگر سیاروں وستاروں میں رونما ہونے والے تغیرات و تضادات کے نتیجے میں ہوتی ہے جبکہ مصرعہ ثانی میں الٹ پھیر ، وقوع کی مناسبت سے یعنی تنگ کھولی میں ضرورت سے زیادہ آباد ارکان خاندان، لوکل ٹرینوں و بسوں میں دھکم پیل قدم قدم پر ٹریفک جام کے نتیجے میں ہوتی ہے۔ بالفاظ دیگر بالائے سر چھایا ہوا موسم، کسی بدمست کے مزاج رح گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشہ کے مصداق موقع بے موقع بدلتا رہتا ہے۔ لیکن زیر سر پھیلا ہوا موسم کسی سچے شق کے پکے قول و قرار کی صورت ایک ہی روش پر قائم رہتا ہے۔ چنانچہ موسم اولیٰ چاہے کتنا خوشگوار کیوں نہ ہو سم ثانی سدا ناخوشگوار رہتا ہے بلکہ کبھی کبھی تو یہ ناخوشگوار موسم اس حد تک ناگوار ہو جاتا ہے کہ بے چینی اور اضطراب عالم میں آدمی کے حلق سے بے ساختہ ایسی لایعنی قسم کی آوازوں کا اخراج شروع ہو جاتا ہے جنہیں لفظوں کا جامہ پہنانا نا ہی نہیں ناممکن ہے۔ اگر کسی وجہ سے آپ کے کان، ان نادر الوجود آوازوں کی سماعت سے تاحال محروم

بکہ محفوظ ہیں تو پہلی فرصت میں بھیڑ بھاڑ کے اوقات میں کسی لوکل ٹرین یا بس میں سفر کر کے یا کسی اوور لوڈیڈ
(OVER Loaded) کھولی میں کچھ گھنٹے بسر کر کے دیکھئے انشاء اللہ آپ کے کان ہماری بات پر فوراً ایمان لے آئیں گے۔
موسم ثانی کے مضر و ناخوشگوار اثرات سے بمبئی کے کسی باشندے کو مفر نہیں سوائے ان خوش نصیبوں کے جن کے گھروں
دفتروں حتیٰ کہ کاروں میں بھی ایرکنڈیشن لگے ہوئے ہیں۔ اسی لئے تو کہتے ہیں کہ بمبئی کی آب و ہوا ایک نمبر کے معمولی شہریوں
کا سارا رس کس بل بلکہ بھرکس تک نکال لیتی ہے۔ لیکن دو نمبر کے عزت مآب شہریوں کے قدموں میں سارے جگ کی ساری آسائش
ڈال دیتی ہے۔ گویا دو نمبر کے شہری ایک نمبر کے موسم کا پورا پورا لطف اٹھاتے ہیں اور ایک نمبر کے شہری دو نمبر کے موسم میں جلتے
جھلستے کیڑے مکوڑوں کی طرح کلبلاتے رہتے ہیں۔!!

اک محکمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا

عوام الناس کے روزمرہ مسائل و مصائب میں دن دونی رات چوگنی اضافے کی غرض سے ہر شہر ہر قصبے ہر دیہات
میں یوں تو بے شمار سرکاری محکمہ جات بڑی ہی تندہی اور جانفشانی کے ساتھ کام کرتے ہیں لیکن جو محکمہ قیافہ شناسی اور علم نجوم جیسی
قدیم روایات کی پاسداری کا ضامن ہے وہ عرف عام میں محکمہ موسمیات کہلاتا ہے۔ مذکورہ محکمہ اگرچہ دیگر محکمہ جات کی طرح
برس کے بارہ مہینے کام کرتا ہے لیکن اس کی ناقص کارکردگی و نااہلی کا اندازہ صرف موسم باد و باراں کے دوران ہی ہوتا ہے۔
ایک عام اندازے کے مطابق محکمہ موسمیات کی جانب سے مانسون کے دوران جاری کردہ نوے فیصد پیش قیاسیاں
غلط اور باقی دس فیصد بر خود غلط ثابت ہوتی ہیں۔ اسلئے بمبئی کے باشندے محکمہ موسمیات کی موسمی پیش قیاسیوں کو ایک
کان سے سنکر دوسرے کان سے اڑا دیتے ہیں۔ کیونکہ یہ ساری پیش گوئیاں ایک نمبر کے موسم کے تعلق سے ہوتی ہیں اور بمبئی
کے عام باشندوں کی معرکہ آرائی ہر آن صرف دو نمبر کے موسم سے ہوتی ہے۔ ان کے اطراف واکناف تو ہمہ وقت یکساں
موسم رہتا ہے۔ انھیں اس سے کیا غرض کہ آسمان سے دھوپ کے دھواں دھار گولے برس رہے ہیں۔۔۔۔۔
۔۔۔۔ یا بارش کے تیر بھالے یا پھر سردی کے سرسراتے خنجر حالات کے کولھو میں پسے ان کے بدن تو ایک نمبر کے موسم کی ان
تبدیلیوں سے بے نیاز سدا پسینہ اگلتے چپچپاتے رہتے ہیں۔ چنانچہ محکمہ موسمیات کی
انوکھی پیش قیاسیوں کے پیش نظر بمبئی والے اس محکمہ کو نفرت کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ابھی پچھلے دنوں کی بات ہے۔ سرِ راہے اچانک ملاقات
ہو گئی مانسون چونکہ آغاز ہو چکا تھا اسلئے موضوعِ سخن ظاہر ہے محکمہ موسمیات کے علاوہ اور کیا ہو سکتا تھا۔ چنانچہ
منہ بنا کر بولے۔
پتہ نہیں محکمہ موسمیات کے ارباب حل و عقد کو کب عقل آئے گی؟ کب تک اس قسم کی الٹی سیدھی پیش
گوئیاں کرتے رہیں گے۔ ابھی پچھلے ہفتہ کی بات ہے بڑے دعوے کے ساتھ اعلان فرمایا کہ مانسون گوا کے ساحل تک
پہنچ چکا ہے وہ ایک دو روز میں بمبئی پہنچا ہی چاہتا ہے۔ ہم دل ہی دل میں بڑے خوش ہوئے کہ چلو گرمی کی گرما گرمی سے
نجات ملے گی۔ آسمان کی طرف نظریں اٹھائے مانسون کے بادلوں کی راہ تکتے رہے کہ اب بادلوں کے دل کے دل آئیں گے
اور چھاجوں مینہ برسے گا۔ لیکن افسوس پانی تو برسا نہیں جسم کے ایک ایک مسام سے موسلا دھار پسینہ
۔۔۔ رہا۔ البتہ محکمۂ موسمیات کے ارباب مجاز نے اپنی اس غلط بیانی پر اظہار شرمندگی یا نادم ہونے کے

چار روز بعد یہ اعلان فرمایا کہ مانسون کے بادل راستہ بھٹک کر بمبئی آنے کی بجائے کراچی پہنچ گئے ہیں لہٰذا اگلے چند روز مطلع ایک دم صاف رہے گا اس اعلان کے اگلے ہی دن بمبئی میں بارش نے کیا قیامت ڈھائی وہ کسی سے چھپی ڈھکی نہیں ہے۔ بے شمار چالیاں لاتعداد جھونپڑ پٹیاں حتیٰ کہ ریل کی پٹریاں تک زیر آب ہوگئیں۔

اعلان تھا مطلع صاف ہونے کا اور آدھی بمبئی صاف ہوگئی میری رائے میں موسمیات کے بحر ظلمات میں دوڑا کر اپنی توانائیاں اور سرکار کا پیسہ فضول ضائع کرنے کے بجائے اس بات کی تحقیق کرنی چاہیئے کہ اگلے روز لوکل ٹرینوں کے ڈبوں کا درجہ حرارت کیا ہوگا۔؟

بمبئی کی بھیڑ بھاڑ میں پسینے کے علاوہ اور کون کون سے مادے کہاں کہاں آدمی کے جسم سے خارج ہوں گے۔؟
عام آدمی کی موت گھٹن سے واقع ہوگی یا ہارٹ فیل سے؟

●●

حفیظ بنارسی

غزل

آپ اپنی ہنسی اُڑاؤ میاں — دوسروں کو بھی کچھ ہنساؤ میاں
نوچ پنچوں کی مت بڑھاؤ میاں — اپنی شامت نہ خود بلاؤ میاں
ساگ بھاجی ہمیں کھلاؤ میاں — مرغ کی ٹانگ خود اڑاؤ میاں
پیسے والا ہے، بے وقوف بھی ہے — صدرِ محفل اسے بناؤ میاں
میر صاحب تھے حیدرآبادی — ایسی بے پر کی مت اڑاؤ میاں
ورنہ ہو جائے گا خود اپنا خون — تیر اندھیرے میں مت چلاؤ میاں
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی — ایسی عمدہ غزل سناؤ میاں
پھر گدھوں کی برات نکلے گی — آنے والا ہے پھر چناؤ میاں
دیکھیں اب کون ساتھ دیتا ہے — ڈگمگانے لگی ہے ناؤ میاں۔
دیکھو لو اپنی صورتِ زیبا — آئینہ پھر ہمیں دکھاؤ میاں
کچھ شرافت ہمیں بھی آ جائے — ہم کو اردو زبان سکھاؤ میاں

○

نہ سنکٹ میں ہے ہندوستاں نہ پاکستاں خطرے میں — جو سچ پوچھو تو ہیں اکثر سیاست داں خطرے میں
جسے دیکھو وہ دعویٰ کر رہا ہے اب خدائی کا — ہے میرا دھرم خطرے میں مرا ایمان خطرے میں
اگر شادی کے پھندے میں نہ یہ پھنستا تو اچھا تھا — خود اپنی بے وقوفی سے ہے ہر اک انسان خطرے میں
الکشن میں کھڑا ہو کر بہت پچھتا رہا ہوں میں — مری عزت ہے خطرے میں مرا ایمان خطرے میں

غزل

بلبل کاشمیری (لندن)

تمہے کس طرح تیز رفتار کھانسی — کہ اک دم میں آتی ہے سو بار کھانسی
مکرر، مکرر یہ تکرار کھانسی — کیے جاتی ہے وار پر وار کھانسی
وہ بولے کہ بادل گرجتے ہیں باہر — میں بولا کہ اندر ہے سرکار کھانسی
وہ خلوت میں باتیں کریں ہم تو کیسے — خلل ہو گئی موسلا دھار کھانسی
یکایک جو بیت الخلا کھٹکھٹایا — تو اندر سے آئی گرجدار کھانسی
کسی کو بلانا ہو ہلکا سا کھانسو — [illegible] بار کھانسی
مرنے سے تھے سوئے ہوئے سال بچے — [illegible] تار کھانسی

انیس سلطانہ
(بھوپال)

چالیس اور ایک

علی بابا آج بہت خوش تھے اور کیوں نہ ہوتے۔ یار احباب کی تو بات ہی نہ پوچھیے بیگم اور بچے سبھی خوش تھے۔ آج انھوں نے اپنی شادی کی پہلی سال گرہ منائی تھی —— جی ہاں چالیس ویں سال گرہ یعنی چالیس سال بعد پہلی سال گرہ —— !! قاعدہ سے تو پچیس سال بعد سلور جوبلی منانی چاہیے تھی۔ مگر اس وقت انھیں خیال ہی نہ آیا۔ اب یہ جو سرکار نے چالیس ویں سال گرہ منائی تو انھیں بھی خیال آیا۔ چالیس موم بتیوں کی جگمگاہٹ میں اپنے ناتی پوتیوں کی تالیوں کی گونج میں کیک کاٹا گیا اور جب کیک کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرکے سب کو بانٹا گیا تو انھیں پتہ چلا کہ چالیس چھوٹے چھوٹے دہانوں میں زیرہ بن کر رہ گئے۔ آج انھیں اپنی کثیر العیالی پر گونا اطمینان ہوا کہ ان کے بعد ان کا نام لیوا اور پانی دیوا کوئی تو ہوگا۔

چالیس کے ہندسے کی افادیت اور معنویت سے وہ بخوبی واقف تھے۔ سات دن کا ہفتہ ہوتا ہے کوئی بتائے تو بھلا آٹھ دن کا کیا ہوتا ہے مگر یہ لفظ چالیس مختلف موقعوں پر اپنے آپ کو ایسے ڈھال لیتا ہے جیسے خالی جام میں شراب۔ جیسا جام ہوگا، شراب ویسی ہی شکل اختیار کرے گی۔

ابھی ابھی وہ چالیس دن کے بعد واپس آئے تھے اور بیوی فخریہ ایک ایک سے کہتی تھیں "چلہ پہ گئے تھے" مگر بات تھی سال گرہ کی۔ سب آتے جانے والے علی بابا کا مذاق اڑا رہے تھے۔ وہ اپنی چالیس ویں سال گرہ کو فال نیک سمجھ رہے تھے۔ اس عدد سے اتنے مقدس نیز معتبر واقعات موسوم تھے کہ اب تو انھیں دنیا کی تکوین میں بھی چالیس کے ہندسے کی کارفرمائی پوشیدہ ہو رہا تھا۔

آدم و حوا کو اس سرزمین پر پھینک دیا گیا اور چالیس سال تک وہ ایک دوسرے کی جدائی نیز تنہائی کے غم میں روتے رہے۔ آخر چالیس سال بعد رحمت باری کو جوش آیا۔

اب تو نہ جانے کتنے چالیس عدد پر مشتمل واقعات انھیں یاد آ رہے تھے اور وہ اپنے کو حق بہ جانب پا رہے تھے۔

موسیٰ کو طور پر تجلی بھی تو نظر آئی۔ چالیس گواہ ان کے ساتھ تھے حضرت موسیٰ کے زمانے میں قارون کے چالیس اونٹوں پہ چابیوں کی روایت اگر صحیح ہے تو ہندسہ بھی قدرت خداوندی کے رنگ و برتری کی حکمت عملی ظاہر کرتا ہے۔ مرنے پر چالیس دن تک واویلا۔ اور پیدائش کے بعد چلہ کا اہتمام شیخ سعدی کی عمر عزیز کے چالیس سال ان کے حساب سے بے کار گزر گئے تب انھوں نے علم حاصل کرنے پر توجہ دی۔

حکیم لقمان نے اپنی شکل کے چالیس پتلے بنا کر ایک بار تو موت کو بھی چکمہ دے دیا تھا۔

پرتھوی راج چوہان نے بغیر دیکھے چار بانس کے ساتھ ساتھ چالیس گز کی دوری پر نشانہ لگایا تھا۔

اتنی ساری تلمیحات میں جب انھیں اپنی شادی کی چالیس ویں سالگرہ بھی نظر آئی تو انھیں اپنا ذرا قصور نظر نہ آیا۔ بچوں نے ان کو اور اہلیہ کو چالیس ہار پہنائے اور ان کی ہر حرکت کو ویڈیو میں نظر بند کیا جا رہا تھا۔

جب شادی ہوئی تھی تب تو تصویریں کھینچنے کا رواج نہ تھا۔ اگر نوجوان چاہتے بھی تو مجال نہ تھی۔

اس وقت تو وہ اپنی محفل کے بے تاج بادشاہ تھے اور بقول کسے آج اپنے ارمان پورے کر رہے تھے۔ گریجویٹی کا پیسہ ملے زیادہ دن تو ہوئے نہ تھے۔ پیسہ رکھنے کے وہ قائل نہ تھے تو انھوں نے اسی سبیل بھی نکالی تھی جیسے پہلے اپنے مال میں سے چالیسواں حصہ زکوٰۃ نکالا اور اس کے بعد یار زندہ صحبت باقی پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ نہ وہ حاتم تھے نہ حاتم شعار کہ چالیس دروازے بناتے اور سائل ہر دروازے سے بامراد لوٹتے۔ ان کے گھر میں البتہ ایک ہی دروازہ تھا جس پر محلہ کا نمبر ۴۰ اور مکان کا ۱۴۰ ڈالا ہوا تھا۔ باوا دادا کے وقتوں کی ایک تجوری نہایت قوی الجثہ اور بھاری بھرکم داخلی دروازہ کے پاس ہی رکھی رہتی تھی۔ پیسہ تو خیر ہاتھ کا میل ہے۔ چند ضروری کاغذات کے علاوہ تجوری میں کچھ نہ تھا اور وہ بھی انھوں نے کبھی دیکھنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ تجوری کا تالہ وہ آج تک نہ کھول سکے تھے۔ تالہ نیز دروازے سب زنگ آلود ہو چکے تھے۔ مدت بعد تھوڑا پیسہ ہاتھ آیا تو سوچا کہ تجوری میں رکھیں۔ مگر تالا کون کھولتا ——؟

آس پڑوس میں ہر ایک سے کہلوایا کہ تجوری کھولنے میں کوئی مدد کرے۔ مگر کسی کی ہمت نہ ہوئی۔ نتیجہ میں ان کی اہلیہ نے اپنی ٹوٹی پھوٹی پیتل والی صندوقچی میں جو انھیں جہیز میں ملی تھی وہ روپے رکھ کے اپنے تخت کے نیچے رکھ لیے اور لگیں خراٹے لینے۔

پچھلی رات کھڑبڑ سے نیند کھلی۔ دیکھیں تو تجوری کا دروازہ کھلا پڑا ہے بلکہ گھر کا دروازہ ہی کھلا پڑا ہے۔ تجوری تو تھی ہی خالی، مگر گھر میں کچھ تھا . . . . . ان کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ دم سادھے پڑی رہیں اور ساری کارروائی پر نظر رکھی ——کوئی اور نہ تھا—— علی بابا کا بھتیجا تھا جو بازو کے گھر سے آدھی رات کو وقت نکال کر تجوری کھولنے چلا آیا تھا۔ شاید اس کی رات کو ڈیوٹی رہی ہوگی۔ آج بھی کارخانے سے لوٹتے وقت اس نے سوچا کہ چچا کا کام بھی کر چلے ——

—— وہ مطمئن ہو کر سو گئیں۔ کروٹ لینے لگیں تو دیکھا کہ علی بابا جاگ رہے ہیں۔

"تم نے دیکھا ——؟"

"ہاں تم نے بھی دیکھا ——؟"

"بچارہ رات ڈیوٹی کر کے لوٹ رہا ہوگا۔"

علی بابا جھنجھلا ہی تو گئے

اری نیک بخت........

بی بی دم سادھے پڑی رہیں۔ تجوری کھول کر بھتیجہ نے تلاشی بھی لے ڈالی اور جب کچھ ہاتھ نہ آیا تو بڑبڑاتا ہوا کھسک گیا۔ اتنی عقل تو آ ہی گئی تھی کہ وہ کچھ نہ بولیں۔

صبح سب سے پہلے انھوں نے بھتیجہ کا شکریہ ادا کیا اور جشنِ سال گرہ کی دعوت بھی دے ڈالی۔ یہ تھی وہ مختصر روداد جو اس جشن کے سلسلہ میں ان پر سے گزر گئی اور علی بابا ان چالیس چوروں کے بارے میں سوچنے لگے جو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہیں۔

دودھ والا تین چوتھائی پانی ملا کر دودھ دے جاتا ہے۔ پانی کچرا ملا آتا ہے۔ دھنیا برادہ ملا کر استعمال ہوتا ہے۔ چوری کہاں نہیں ہے۔ دوست ملنے سے آنکھ چراتے ہیں۔ اور تو اور چوری چھپے ملاقاتیں ہوتی ہیں۔ کام چوری کی سب کو عادت پڑ چکی ہے۔ کوئی مرجینا ان چوروں سے بچا نہیں سکتی۔ آج کی مرجینا کو آرام کی عادت پڑ چکی ہے اور یا جاگ بھی جائے تو کبھی اندازے کی غلطی، کبھی اپنی نادانی سے ان چوروں کو اور بڑھاوا دیتی ہے۔ علی بابا اپنے چالیس سالوں کا حساب کر رہے تھے۔ انھیں لگ رہا تھا جیسے آج ہی کی بات ہے۔ چالیس چوروں میں گھرے ہوئے علی بابا اس وقت کھل جا سم سم کا منتر بھول چکے تھے۔

زندگی کے طلسم میں گرفتار علی بابا...... اور چالیس دروازوں پر تعینات اس کے پہرہ دار....... ہر طرف سے وار کر رہے تھے.....!

محمد طارق
(الہ آباد)

فساد کا سوال نامہ

فساد ہوا۔
کیوں ہوا ——— ؟ کیسا ہوا ——— ؟ کس نے کس کو مارا؟
مارا تو کیوں مارا ——— ؟!
کتنے قتل ہوئے ——— ؟ ہوئے تو کیوں ہوئے؟
نہیں ہوئے تو کیوں نہیں ہوئے؟!
لوٹ کھسوٹ ہوئی یا نہیں ہوئی ——— ؟!
نہیں ہوئی تو کیوں نہیں ہوئی؟
ہوئی تو کیوں ہوئی ——— ؟ کیا کیا لوٹا گیا؟!
روپیہ پیسہ لوٹا گیا تو کتنا لوٹا گیا ——— کس کس کا لوٹا گیا؟؟
لوٹ کھسوٹ کا حساب کہاں ہے؟
عورتوں کی عصمتیں لوٹی گئیں کہ نہیں ——— ؟! لوٹی گئیں تو کون کون عورتوں کی ——— ؟! کس کی عورتوں کی؟!
کم سن لڑکیوں سے بدسلوکی کی گئی تو ان کی تعداد کتنی ہے؟
کتنی بچیاں اس اذیت سے مر گئیں ——— ؟! وہ کس کی بچیاں تھیں؟!
گھر اجاڑے گئے تو کتنے گھر اجاڑے گئے ——— کس کے گھر اجاڑے گئے ——— ؟!
جن کے گھر برباد نہیں ہوئے تو کیوں نہیں ہوئے ——— ؟
دکانیں کن لوگوں کی جلائی گئیں ——— کس نے جلائیں؟ کیسے جلائیں؟ کتنا پٹرول اور کتنا مٹی کا تیل استعمال کیا گیا؟

قانون ـــــ اور قانون کے محافظوں کے زیر سایہ کون سا ناچ دکھایا گیا ـــــ ؟!

ہندوستانی ناچ دکھایا گیا یا "فارن" کا ناچ ـــ !
دہشت و بربریت کا ننگا ناچ دکھایا گیا کہ ڈسکو ڈانس دکھایا گیا ۔ اگر ناچ دکھایا نہیں گیا تو پھر کھیل کھیلا گیا ہوگا ۔
کون سا کھیل کھیلا گیا ـــــ ؟!

• اولمپک کھیلوں میں سے کوئی کھیل کھیلا گیا یا وہ کھیل کھیلا گیا جنہیں اولمپک کھیلوں میں ابھی شامل نہیں کیا گیا ۔
ـــــ انسانیت سوز خونی کھیل ـــــ یہ کھیل قانون اور قانون کے محافظوں کے سائے میں کیسا کھیلا گیا
بیڈلائٹ کی اپیل کیوں نہیں کی گئی ۔ اس کھیل کے کون کون امپائر تھے ۔

ان سارے سوالوں کے جواب ہم نہیں دیں گے کیوں کہ فساد ہونے کے بعد حسب روایت ان سوالوں کے جواب دینے کے لیے حکومت نے کمیشن بٹھا دیا ہے ۔ بالفرض اگر کمیشن نے جواب نہیں دیا تو اس کے جواب طلبی کے لیے کمیشن پر ایک اور کمیشن بٹھا دیا جائے گا ۔

آپ مطمئن رہیے ۔

ہم تو آپ کو نئے بجٹ کے مطابق فساد کے شہدا کی قیمتیں بتانے جا رہے ہیں ۔

جوان بیٹا ـــــ دس ہزار روپے

بوڑھا باپ ـــــ پانچ ہزار روپے

بوڑھی ماں ـــــ تین ہزار روپے

نابالغ بچہ مرا تو جوان بیٹے ہی کی رقم ملے گی ۔

غیر شادی شدہ لڑکی : ۶ ہزار روپے ۔

شادی شدہ لڑکی مری تو کچھ نہیں ملے گا ۔ آنسو پونچھنے کے لیے رومال بھی نہیں ۔

اس کے علاوہ فساد کے شہدا کو اور ان کے ورثا کو آخرت میں کیا ملے گا ۔ ہم نہیں جانتے کیوں کہ ہمیں آخرت کے بجٹ کا علم نہیں ہے ـــ شاید مذہب کے ٹھیکیدار جانتے ہوں کہ ـــــ

فساد میں "شہید" اور "شہید ساز" کو اور ان کے ورثا کو کیا ملے گا ـــــ ؟!

★★

محمد رفیع انصاری
(بھیونڈی)

میرے مکان کی سیڑھیاں

میرے مکان کی سیڑھیوں کا یہ امتیازی وصف ہے کہ ان پر سے میں اور میرے اہلِ خانہ نہ گھر میں بے تکلفی سے داخل ہو سکتے ہیں اور نہ نکلتے ہیں۔ ان پر گزرنے سے قبل مجھے راستے کی دشواریوں کو اسی طرح دور کرنا پڑتا ہے جیسے 'بند' کے موقع پر ایمرجنسی پیش آنے کی وجہ سے راہ کی رکاوٹوں کو ہٹایا جاتا ہے۔ راستہ صاف کرنے کا یہ ناخوش گوار عمل اب میرے فریضے میں شامل ہو گیا ہے جسے میں پیشانی پر شکن لائے بغیر انجام دیتا ہوں۔

یہ نشانِ امتیاز ان سیڑھیوں کو اس وجہ سے حاصل ہے کہ میرا مکان، شاہ راہ کے عین کنارے پر واقع ہے۔ آنے جانے والے اکیلے دکیلے ان سیڑھیوں کو دیکھ کر ایک دم سے رک جاتے ہیں جس طرح سنسان سرکاری نل کو بہتا دیکھ کر لوگوں کو ہاتھ منہ کی صفائی کا خیال آجاتا ہے اسی طرح ان سیڑھیوں کو دیکھ کر مسافر اطمینان کا سانس لینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ لدے پھندے اسباب کو ان پر بے تکلفی سے رکھ کر اپنی سانسیں درست کرتے ہیں اور جو لدے پھندے نہیں ہوتے وہ ان پر تشریف رکھ کر سفر کے مزے لوٹتے ہیں۔ راہ روؤں کے لیے یہ سیڑھیاں سنگِ راہ نہیں بلکہ سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔

مکان کی چھت مکان کا سر کہلاتی ہے۔ کھڑکیوں کو آنکھوں سے تعبیر کیا جاتا ہے اور دروازے کو دہن کہتے ہیں۔ اب رہی سیڑھیاں تو یہ مکان کی بناوٹ، اس کی سجاوٹ بلکہ اس کی عظمت پر منحصر ہے۔ حویلیوں اور محلات کی سیڑھیاں 'ناک' کی طرح اونچی ہوا کرتی ہیں۔ ہم آپ صرف ان سیڑھیوں کو گن سکتے ہیں انھیں پار نہیں کر سکتے۔ پار کرنے کے لیے ناک کا سوال درپیش ہوتا ہے۔ راجوں مہاراجوں کے دور میں

ان سیڑھیوں پر ناک رگڑنے والوں کو دیکھ کر محلوں میں بسنے والے خوش ہوتے تھے۔ امتدادِ زمانہ کے سبب اب جب کہ یہ عالی شان عمارات اپنے مکینوں سے خالی ہو گئی ہیں۔ ان سیڑھیوں کے دن بھی پھر گئے ہیں جب یہ ڈیوڑھی آباد تھی تو ان پر کوئی نگاہِ غلط انداز نہیں ڈال سکتا تھا اور آج یہ سیڑھیاں بے گھروں کو اپنی ناک رکھنے کے لیے ہمہ وقت اپنی خدمات پیش کرنے کو تیار رہتی ہیں۔ وقت وقت کی بات ہے۔

میرے مکان کی سیڑھیاں نہ محلات اور کوٹھیوں کی سیڑھیوں سے مشابہ ہیں اور نہ ان پر عدالت کی سیڑھیوں کا گمان ہوتا ہے۔ ویسے عدالت کی سیڑھیاں بھی تاریخی اہمیت کی حامل ہوا کرتی ہیں۔ ایک بار جس سے ان کا سابقہ پڑ جائے وہ بس انہی کا ہو کر رہ جاتا ہے۔ جن خوش نصیبوں کو یہ سیڑھیاں راس آجاتی ہیں ان کے لیے بڑی سے بڑی سیڑھیوں میں بھی کوئی کشش نہیں رہتی اور جنہیں یہ راس نہیں آتیں ان کے لیے یہی عدم آباد کی سیڑھیاں ثابت ہوتی ہیں۔

میرے مکان کی سیڑھیاں میونسپلٹی کی سیڑھیوں سے بھی مماثلت نہیں رکھتیں۔ ان سیڑھیوں پر سر کے بل چلنے کی تمنا کرنے والوں کو بہت سی چھوٹی چھوٹی سیڑھیوں کو سر کرنا پڑتا ہے۔ تب کہیں جا کر آدمی ان سیڑھیوں کے بیرون پر تن کر کھڑا ہوتا ہے۔ میونسپلٹی کی سیڑھیوں پر قدم جمانے کے لیے حکمت کی ضرورت ہوتی ہے جو حکمتِ عملی کا مظاہرہ نہیں کر سکتے ان کی پنج سالہ محنت اکارت ہی جاتی ہے۔ یہ سیڑھیاں عوام کے منتخب نمائندوں کے لیے جہاں بیساکھی کا کام دیتی ہیں وہیں ٹیکس بھرنے والوں کے لیے بیڑیاں بھی ثابت ہوتی ہیں۔

اسمبلی کی سیڑھیاں انہی کے قدموں تلے بچھتی ہیں جو اونچی چھلانگ (High jump) لگانا جانتے ہیں۔ اونچی چھلانگ لگانے کے لیے آدمی کا کھلاڑی ہونا شرط ہے۔ ... آدمی جو دھن، من اور تن کا مضبوط ہو۔ وہی جمپ کا مظاہرہ کر سکتا ہے۔ یہ بات ہما شما کے بس ...

اسمبلی کی سیڑھیاں تسخیر کرنے کے لیے اگر اونچی جمپ لگانا ضروری ہے تو ... ینٹ کے زینوں کو ناپنے کے لیے لمبی چھلانگ (Long jump) درکار ہے۔ اس کے لیے آدمی کا محض اسپورٹس مین ہونا ہی کافی نہیں بلکہ اس کا سپر مین (Super man) ہونا لازمی ہے۔

میرے مکان کی سیڑھیاں نہ میونسپلٹی کی سیڑھیوں سے مماثلت رکھتی ہیں اور نہ اسمبلی کی سیڑھیوں سے میل کھاتی ہیں۔ پارلیمنٹ کی سیڑھیوں سے بھلا ان کا کیا علاقہ۔ صوری طور پر گو ان سیڑھیوں کا مذکورہ زینوں سے کوئی مقابلہ نہیں لیکن ان سیڑھیوں پر اسمبلی کا اجلاس بھی ہوتا ہے اور پارلیمنٹ کی بیٹھک بھی۔ دن میں یہ سیڑھیاں اگر شجر سایہ دار کی حیثیت رکھتی ہیں تو نصف شب کے بعد یہ 'دارالشوریٰ' اور 'دارالقضا' کا روپ اختیار کر لیتی ہیں ——— میں خود کو بڑا خوش نصیب تصور کرتا ہوں کہ مجھے اپنے مکان کی سیڑھیوں سے جو خبریں موصول ہوتی ہیں وہ دنیا کے کسی ریڈیو سے نشر نہیں ہوتیں۔ بلاشبہ یہ نشریات مواصلاتی سیاروں کی دسترس سے بالاتر ہیں۔

آٹھ سے اسّی سال کے بچے ان سیڑھیوں کو رونق بخشتے ہیں۔ ایک عرصے تک کرکٹ اور فلم کے موضوعات پر مجھے اپنی معلومات ناقص ... ہونے کا افسوس تھا لیکن ان سیڑھیوں کے وسیلے سے مجھے ان موضوعات پر

... ہوتی ہے کہ ہمارے وہ نوجوان جو پیشتر بزرگوں کے سامنے منہ کھولتے ہوئے جھجکتے
بولنے کا حوصلہ ہے۔ ... سیدھے سوالوں پر چپ سادھے رہتے ہیں جن کے بارے میں غلط قسم کی
بیں گھر والوں کے ...
رائے کا اظہار کیا جاتا ہے۔ مجھے فخر ہے کہ ایسے بے زبانوں کو میرے مکان کی سیڑھیوں ہی نے زبان عطا کی ہے۔
یہ اعزاز صرف ان سیڑھیوں کو حاصل ہے کہ ان پر بیٹھ کر وہ اپنے افکار و خیالات کا بلا تکلف اظہار کرتے ہیں۔ مجھے
یہ جان کر اطمینانِ قلب محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے بچوں کو سیاسی معاملات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ جنرل نالج
معاملے میں ان کے علم کو صفر قرار دیا جاتا ہے۔ اس بات میں بھی مجھے کوئی صداقت نظر نہیں آتی۔ اب تو میں اس
کو افواہ سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔

میں اپنے مکان کی سیڑھیوں سے اٹھنے والے شور و شر کی وجہ سے اکثر نیند میں چونک چونک اٹھتا ہوں
لیکن اگلے ہی لمحے دوبارہ نیند کی آغوش میں چلا جاتا ہوں یہ سوچ کر کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں سیڑھیاں جاگ
رہی ہیں۔ دراصل ان ہی کی بیداری اور آبادی کے پیشِ نظر ابھی تک مجھے اپنے گھر میں اطلاعی گھنٹی لگانے کی
ضرورت محسوس نہیں ہوئی ہے۔ نہ اب مجھے چوروں کا دھڑکا ہے اور نہ مہمانوں کا کھٹکا۔ البتہ مجھے ہمدردی اپنے
ان مخلص دوستوں سے ہے جو راہ کی دشواریوں کو دور کرنے میں تکلف محسوس کرتے ہیں۔ دریچے سے ان کی بے چارگی
دیکھ کر میں دست بستہ عرض کرتا ہوں کہ :

انہی سیڑھیوں سے ہو کر آ سکو تو آؤ
مرے گھر کے راستے میں کوئی راستہ نہیں ہے

بی بی سی لندن کی آخری مجلس برخاست ہونے پر جو گروہ میرے مکان کی سیڑھیوں پر ڈیرہ ڈالتا ہے۔ ا
کے بے لاگ، بے خوف اور بے باک تبصروں کو سن کر میری کیفیت عجیب و غریب ہو جاتی ہے۔ میں سوچتا ہوں
کہ دنیا بھر کے سیاسی مصلح جن پیچیدہ معاملات کی گتھیاں سلجھانے میں ناکام رہے۔ مجلسِ اقوامِ متحدہ جن
مسئلوں کو برسوں سے حل نہ کر سکی جن نازک مسائل کے بھنور میں کتنی حکومتیں پھنس گئیں جن کے حل کی سبیل
نکالتے کتنے حکمران بے راہ رو ہو کر وقت کے صحرا میں کھو گئے۔ کاش وہ ان نازک معاملات پر عجلت سے
کام نہ لیتے ہوئے ذرا ان سیڑھیوں سے بھی رجوع کر لیتے تو ان کے سارے دکھ چٹکی بجاتے آدھی رات ہی کو دور
ہو جاتے۔

میرے مکان کی سیڑھیاں مجھے بہت عزیز ہیں۔ یہ میرے لیے درس گاہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ پہلے پہل
جب میں ان کی اہمیت سے واقف نہ تھا تو سوچتا تھا کہ انھیں توڑ پھوڑ کر رکھ دوں تاکہ ہمیشہ کے لیے ان
بلاؤں سے نجات مل جائے۔ لیکن جب سے آنکھیں کھلی ہیں مجھے ان سے عقیدت ہو گئی ہے۔ کاش میں انھیں
اور وسعت دے سکتا تاکہ کوئی نامراد ان کی تنگ دامنی کا گلہ نہ کرتا۔ وہ لوگ خوش قسمت ہیں جن کے مکانوں
کی سیڑھیاں آباد رہتی ہیں۔ شاد و آباد گھروں کے لیے آباد سیڑھیوں کا وجود ایک نیک شگون ہے۔ شہروں میں
مکانوں کی قلت کا رونا رویا جا رہا ہے۔ سرکار بے گھروں کو مکان دلانے کا لالچ دے کر اپنی بنیادوں کو مضبوط کرنے
کی کوشش کرتی رہتی ہے۔ سرکار کو چاہیے کہ وہ اب مکان کی تعمیر کی بات چھوڑ کر سیڑھیاں بنانے پر سنجیدگی سے غور کرے

ممتاز مہدی
(حیدرآباد)

راستہ

ابھی حال حال یعنی نصف صدی ادھر کی بات ہے کہ لوگ پیدل چلنا خوب جانتے تھے، میلوں پیدل چلتے نہ صرف جاتے بلکہ لوٹ کے بھی پیدل آتے نہ سانس پھولتی تھی نہ کمر جھکتی تھی ۔ نہ وقت کی کمی کا رونا تھا اور نہ کسی ذمہ داری یا مشغلہ سے غافل تھے ۔ اب یہ زمانہ آگیا ہے کہ سگا سوتیلا اپنے ہی محلے میں آخری سانسیں گن رہا ہے اور ہمیں اسے ایک ہی نظر دیکھ لینے کی بھی فرصت نہیں ۔ پیدل چلنا تو گویا جانتے ہی نہیں" ضرورت کے لیے بھی جا رہے ہیں تو کوئی نہ کوئی سواری کی ضرورت محسوس کرتے ہیں ۔ ننگے پاؤں ۔ سوندھی مٹی پر چلنے کا لطف تو کچھ اور ہی ہوتا ہے کہ پاؤں کا سکون سر چڑھ کر بولتا ہے ۔ لیکن اب یہ ہو گیا ہے کہ گلی کوچوں میں تک پتھر جڑ دیئے" گئے ہیں ۔ یہ جڑاؤ پتھر اکثر و بیشتر پیر کے انگوٹھوں کے ناخن اکھیڑ دیتے ہیں ۔ بغیر ناخن والے انگوٹھے گویا ذبح کیے ہوئے آخری سانس گننے والے مرغ کی مانند نظر آتے ہیں ۔ ویسے بھی اکثر گلیوں کے بارے میں ہم یہ اندازہ لگا لیتے ہیں کہ ادھر سے چلیں تو شارٹ کٹ رہے گا لیکن بعد میں معلوم ہوتا ہے کہ ہم نے صرف "مہم جوئی" سے کام لیا ہے اور جس راستے کو بھی اختیار کیا ہے ان راستوں کے ناپ تول میں ہم اناڑی ثابت ہوئے ہیں اور ہمیشہ طویل راستوں پر غلط فہمی یا خوش فہمی کے ساتھ چلتے ہیں ۔

راستے انسانوں کی طرح مختلف النوع ہوتے ہیں ۔ ایک وہ راستہ ہوتا ہے جو بہت دنوں تک انسانوں کی آبادی میں کمی کا انتظار کرتا رہتا ہے اور جب دیکھتا ہے کہ انسان بے شرم ہو گیا ہے، اسے اپنی آبادی کم کرنے کا خیال آتا ہی نہیں ہے بلکہ معاملہ الٹا ہے تو وہ مارے شرم کے یا تو خود پھیل جاتا ہے یا مرغ کی ایک ٹانگ کی طرح صرف ایک ہی رخ پر لوگوں کو چلنے پر مجبور کر دیتا ہے ۔ ہم اسے [illegible] راستہ" کا نام دے دیتے ہیں ۔ بعض راستے ہماری طرح ٹیڑھے میڑھے ہوتے ہیں نہ ناک نہ

لفظ اور فقرہ اتنا ہی زیادہ۔ بعض جو صراط مستقیم کی طرح سیدھے بہت ہی سیدھے سادے ہوتے ہیں اور بعض راستوں کی قسمیں حضرت سلیمان خطیب مرحوم نے اپنی ایک مشہور نظم میں گنوائی ہیں۔

ایک راستہ ہے شادی کا راستہ جو اس پر چلا اوندھے منہ گرا اور جو خوش قسمت نہ چل سکا کف افسوس ملتا رہا۔ بڑا گہرا سماجی بندھن والا راستہ ہے۔ راستہ کیا ہے ایک آگ کا دریا ہے۔ برف کی کشتی میں بیٹھے ہوا کے جھونکوں کی مدد سے راستہ بنا نا ہے۔ سالے کشتی میں سوراخ کرنے کی دھن میں لگے رہتے ہیں۔ سماج پوری کشتی کو ایک جال میں جکڑ رکھا ہے اور فقط آسمان کی طرف کھینچا رہتا ہے پھر اولاد ہمیشہ اسی کشتی سے اچھل جانے کی دھن میں لگی رہتی ہے۔ یہ آپ پر منحصر ہے کہ ہوا کے جھونکوں سے کیسے اپنی برف کی کشتی کو آگ کے دریا میں کھیتے ہیں۔

سیاست کا راستہ بہر رخی ہوتا ہے۔ اس راستے پر چلنے میں کوئی دشواری نہیں صرف جیب گرم ہونی چاہیے۔ اس راستے کی سب سے آخری اونچائی پر پہنچ کر بھی کچھ کہنا دشوار ہوتا ہے۔ چوں کہ گردش میں ستارے آجائیں تو زبردستی اس راستے سے ہٹا کر کبھی گھر تو کبھی راست جہنم میں پہنچا دیا جاتا ہے۔ کیوں کہ جنت سے ابھی کوئی کیس نہیں کہ آیا کالے کوٹ یا سفید پوش افراد وہاں پہنچ پائے بھی ہیں۔ ویسے بہت ہی دور پہنچانے کے لیے ہوائی راستے بھی موجود ہیں۔ لہذا ہوائی سفر کا راستہ کمانے والوں کو امریکہ پہنچا رہا ہے۔ ایسے ایسے راہ رو امریکہ روانہ ہو چکے ہیں کہ ان کے امریکہ کے راستوں پر گھومنے سے پہلے امریکہ کا زوال شروع ہو جانا چاہیے تھا لیکن امریکہ کی قسمت کا ستارہ فی الحال عروج کے راستے پر گامزن ہے۔

کچھ راستے ایسے ہیں جن پر ہم بغیر سوچے سمجھے چلنے لگتے ہیں۔ جیسے مفہوم سمجھے بغیر کسی کی ہاں میں ہاں ملانا۔ انگریزی فلم دیکھتے ہوئے جب سب ہنس پڑیں تو ہنس دینا یا پانی آیا بھاگو کہنے پر بھاگ کھڑا ہونا یا صدام حسین کا چہرہ چاند میں نظر آیا کہنا وغیرہ وغیرہ۔

●●

بابو آر کے
(اچل پور)

الف سے اونٹ

ہمیں جب جانوروں میں سے کسی ایک جانور کو پسند کرنے کے لیے کہا جاتا ہے۔ تب ہم بلا سوچے سمجھے اونٹ کو پسند کر لیتے ہیں اونٹ بچپن ہی سے ہماری پہلی پسند رہا ہے۔ یہ ہمیں اس وقت سے ہی اچھا لگنے لگا تھا جب ہم پہلی جماعت میں الف سے اونٹ اور بے سے بکری کی رٹ لگایا کرتے تھے۔ ہم اونٹ کو قدرت کا شاہکار اس کے بے سروپا سراپے کی وجہ سے سمجھتے ہیں اور صحیح معنوں میں اونٹ کے بے ترتیب اعضا ہی نے اسے شہرت بخشی ہے۔ اونٹ کے تعلق سے بہت دنوں سے ہم یہ پہیلی نہیں بوجھ پا رہے ہیں کہ اونٹ پٹانگ اعضا کی وجہ سے اسے اونٹ کہا گیا ہے یا اس کا نام اونٹ ہے اس لیے دنیا جہاں کے اوٹ پٹانگ اعضا اس سے جوڑ دیے گئے ہیں۔

اونٹ کے ٹیڑھے میڑھے جسم کو دیکھنے کے بعد سب سے پہلے جو بات ذہن میں آتی ہے وہ یہ کہ اس کی پیدائش کے وقت شاید اسکیل پٹی کا چلن عام نہیں ہوا تھا یا پھر اونٹ رے اونٹ تیری کون سی کل سیدھی، اس محاورے کو جنم دینا تھا اس لیے اسکیل پٹی کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ اس کے بعد جب ہم اونٹ کے رخ روشن پر نظر ڈالتے ہیں تو یہاں بھی طبیعت یہ دیکھ کر خوش ہو جاتی ہے کہ گھڑیوں میں "بارہ" دن میں صرف ایک مرتبہ ہی بجتے ہیں جب کہ اونٹ کے رخ پر نور پر دن کے بارہ گھنٹے ہی بارہ بجے رہتے ہیں۔ پیدائش سے لے کر موت تک یہ اپنا نچلا ہونٹ لٹکائے ماتم و گریہ میں مشغول رہتا ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ کس چیز کا ماتم کرتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ ماتم کرنے کے لیے اس کے پاس بے شمار اعضا:

ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں

کی صورت میں موجود ہیں۔ ماتم ..... تو یہ اپنی لمبی گردن کا بھی کر سکتا ہے۔ کہ نباکو بان بھی ماتم کے لیے کچھ کم نہیں۔

اور [illegible] بھی ماتم کا سبب بن سکتی ہے۔ الغرض اونٹ کا ہر عضو ایک دوسرے کی ضد ہونے اور کسی کا پرسانِ حال نہیں ہوتا۔ اونٹ کو دیکھنے کے بعد جو سوالات سر میں سر اٹھاتے ہیں ان کا حال بھی سن لیجیے۔ سب سے اہم سوال تو یہ ہے کہ اس کا نچلا ہونٹ، اوپری ہونٹ سے کوسوں دور جا لگنے پر کیوں مجبور ہوتا ہے؟ [illegible] جسم سے اس کے منہ کو اتنی دور لے جاکر کون سی دور اندیشی کا پتہ دیتی ہے؟ اس کے پیٹ میں تھیلی پانی کے لیے ہے تو پیٹھ کا کوہان کیا روئی کا تنور ہے؟ اتنے لمبے لچکے جسم کا حسرت ناک انجام صرف ایک بالشتیہ دم پر ہی کیوں ہوا؟ وغیرہ وغیرہ۔

اسی اونٹ کو ریگستان کا جہاز بھی کہا گیا ہے۔ یہ عربستان میں بھلے ہی بار برداری کے کام آتا ہو لیکن ہمارے یہاں یہ بار برداری سے زیادہ محاورہ برداری میں مصروف رہتا ہے۔ عام بول چال اور زبان و ادب میں یہ ان گنت محاوروں کا بوجھ بڑی آسانی سے اٹھائے پھرتا ہے۔ محاوروں میں ہم اونٹ کے ساتھ عجیب عجیب طرح کا برتاؤ کرتے ہیں۔ عربستان کا اونٹ بھلے ہی کسی کروٹ بیٹھ جائے لیکن ہمارے محاوروں میں یہ اونٹ کسی بھی کروٹ نہیں بیٹھتا۔ یوں تو ہم دوسری کئی باتوں پر بھی خوش ہوتے ہیں لیکن سب سے زیادہ خوش ہم اس اونٹ کو پہاڑ کے نیچے آتا دیکھ کر ہوتے ہیں۔ کبھی تو ہمیں اس کی داڑھ میں زیرہ نظر آتا ہے تو کبھی ہم اس کے گلے میں بلّی باندھ دیتے ہیں۔ خواہ مخواہ ہر ایرا غیرا اس سے پوچھ بیٹھتا ہے کہ اونٹ رے اونٹ تیری کونسی کل سیدھی، جب کہ کل تو آج کل ہم انسانوں میں سے کسی ایک کی بھی سیدھی نہیں رہ پائی ہے۔ یہ تو کل کی بات ہے جب ہم انسانوں کی کلیں سیدھی ہوا کرتی تھیں اور اونٹوں کی سیدھی۔

عربستان کا ذکر آتے ہی ذہن میں کھجور کا درخت اُگنے لگتا ہے اور ریت پر بھکوسے کھاتا ہوا اونٹ بھی چلنے لگتا ہے یہ بھکوسوں کے ساتھ ہی کھجوریں بھی کھاتا ہے۔ اس کی لمبی گردن کو کھجوروں سے بچانے کے لیے ہی قدرت نے شاید کھجور کے درخت کو اونچا اٹھا دیا ہے یا پھر کھجوروں تک اس کے منہ کو لے جانے کے لیے اس کی گردن لمبی کر دی گئی ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے۔ بہرحال اونٹ کی گردن کی لمبائی اور کھجور کے درخت کی اونچائی یہ دونوں ایک دوسرے کے ہیولی ہیں۔ وہ تو اچھا ہوا بچو کہ عربستان میں کھجور رہتی ہے ..... اگر وہاں ناریل کے درخت ہوتے تب اونٹ کی گردن کی لمبائی بجائے میٹر کے کلومیٹر میں ہوتی اور تب فاصلے میلوں، کلومیٹروں سے نہیں بلکہ اونٹ کی گردن سے شمار کیے گئے ہوتے.....

مشق

مندرجۂ ذیل سوالات کے جوابات لکھو:

۱۔ اونٹ کے اعضا بنانے میں کون سی اسکیل پٹی کا استعمال ہوا؟

۲۔ اونٹ کے کوہان کی وجہ سے پہاڑ کو کوہ کہا گیا یا کوہ (پہاڑ) کی وجہ سے اس کی پیٹھ کوہان کہلائی؟

۳۔ اونٹ رے اونٹ تیری کون سی کل سیدھی" کئی سالوں سے یہ سوال اونٹ سے کیا جا رہا ہے لیکن اونٹ نے آج تک اس کا جواب کیوں نہیں دیا؟

۴۔ اونٹ کی دم لمبی اور گردن چھوٹی ہوتی تب بھی اُسے اونٹ کہا جاتا یا کچھ اور؟

۵۔ سرکس میں تم نے اونٹ کو ایک جھپک چلنے کے علاوہ اور کون کون سے کرتب کرتے ہوئے دیکھا بیان کرو؟

۶۔ چرائے ہوئے اونٹ کو کامیابی کے ساتھ چھپا لینے کے طریقے بیان کرو؟

سعدیہ مفوز
(ریاض)

کاک ٹیل

عوام پر ٹیکس! کیسی باتیں کرتی ہیں آپ! میں نے تو تمباکو اور پان پر ٹیکس لگایا، لیکن عوام تمباکو ہیں نہ پان"

"ظالم! عوام تمباکو یا پان نہ سہی تمباکو پیتے اور پان کھاتے تو ہیں"

"یہ اور بات ہے خیر چھوڑیئے یہ قصہ اور بتلائیے کہ نئے ٹیکس کون کون سے لگائے جائیں؟"

"اچھا تو سگائی کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے"؟

"سگائی؟ کس کی؟ میری یا آپ کی؟"

"ہاہاہا واہ وزیر ٹیکس صاحب! آپ ہیں تو وزیر لیکن معاف کیجئے گا۔ ہیں نرے کاٹھ"

"بس بس آگے مت کہئے میں آپ کا مطلب سمجھ گیا.... سگائی ٹیکس۔ اچھا اس کے علاوہ کوئی اور ٹیکس؟"

"پیدائش ٹیکس"

"بہت خوب! اور؟"

"کفن ٹیکس"

"اور؟"

"بکری ٹیکس"

"اب کونسی چیز باقی رہ گئی ہے جس پر ٹیکس نہیں لگا؟ کوئی ایسی چیز جسے ہر شخص استعمال کرتا ہو؟

"شیشہ اور کنگھی" میں نے فوراً کہا۔

"آپ واقعی ذہین آدمی ہیں۔ اگر ان دونوں چیزوں پر ٹیکس لگا دیا جائے تو معمولی ہو کر بھی ان دونوں کی آمدنی ہو سکتی ہے اور کونسی چیز؟"

"ریشمی غرارہ، حنا، خضاب"

"نہیں ان پر ٹیکس نہیں لگایا جا سکتا"

"کیوں؟"

"اسلئے کہ یہ چیزیں شریمتی جی استعمال کرتی ہیں" وزیر ٹیکس نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔ میرے خیال میں ایسے لاکھوں کروڑ روپیہ کا خسارہ مزید پورا ہو جائے گا اور اگر نہ ہوا تو پھر دھوپ اور پانی پر بھی ٹیکس لگا دیجئے!"

کنہیا لال کپور .... "بال و پر"

یہ موجودہ طریقے راہی ملکِ عدم ہوں گے
نئی تہذیب ہوگی اور نئے سامان بہم ہوں گے
نہ خاتونوں میں رہ جائے گی پردے کی یہ پابندی
نہ گھونگھٹ اس طرح حاجب ہوئے روئے صنم ہوں گے
نئے عنوان سے زینت دکھائیں گے صنم اپنی
نہ ایسا پیچ زلفوں میں نہ گیسو میں یہ خم ہوں گے

اکبر الہ آبادی

ایک صاحب کی کار چوری ہوگئی۔ یہ کار انہوں نے انشور کرا رکھی تھی۔ وہ انشورنس کمپنی کے دفتر میں گئے اور اطلاع دی کہ ان کی کار چوری ہوگئی ہے۔ اس لئے ان کا بیمہ ادا کیا جائے۔ انشورنس افسر نے جواب میں کہا "جناب مجھے افسوس ہے کہ یہ ہمارا قاعدہ نہیں ہے۔"

"آپ کا کیا قاعدہ ہے؟"

"ہم رقم نہیں دیتے بلکہ کار کے بدلے کار دیتے ہیں۔"

"اچھا" ان صاحب نے خوش ہوکر کہا "تو پھر بیمہ پالیسی بدل دیں اور کار کی جگہ میری بیوی کا بیمہ کرلیجیے"

میں گھنٹوں آئینے کے سامنے کھڑے ہوکر اپنے آپ کو پہچاننے کی کوشش کرتا ہوں لیکن میں کبھی اپنے آپ کو پہچان نہیں سکتا بلکہ مجھے ہمیشہ میرے مقابل آئینہ میں ایک بے وقوف سا آدمی کھڑا نظر آتا ہے جبکہ کمرے میں میرے سوا کوئی اور موجود نہیں ہوتا اگر یہ بے وقوف آدمی میں ہی ہوں تو پھر میں اپنے آپ کو پہچان کر دوں بھی کیا؟ چاروناچار چپ ہو جاتا ہوں۔

بزرگوں نے کہہ رکھا ہے کہ خود کو دوسروں کی نظر سے دیکھنا چاہیے اور میری نظر میں دوسروں کی ہمیشہ بری نظر ہوتی ہے۔ اب یہ تو ممکن نہیں کہ میں خود اپنے آپ کو بری نظر سے دیکھوں۔ لہٰذا عرصہ ہوا کہ میں نے آئینہ دیکھنا چھوڑ دیا ہے۔ اب آئینہ صرف اسی صورت میں دیکھتا ہوں جب مجھے اطلاع ملتی ہے کہ میری بیوی کی سہیلیاں اس سے ملنے کیلئے گھر آنے والی ہیں۔ غور فرمائیے تو اس عمل میں بھی کہیں "بری نظر" کی گنجائش نکل آتی ہے۔

جہاں تک میری تعلیم کا تعلق ہے میں یہ عرض کردوں کہ میں نے بدقسمتی سے اتنی ساری تعلیم حاصل کرلی ہے کہ جاہل نہ بن سکا جس کا مجھے افسوس ہے۔ موجودہ دور میں جاہلوں نے اتنی ترقی کرلی ہے کہ مجھے اپنے تعلیم یافتہ ہونے پر شرمندگی سی محسوس ہوتی ہے۔ میں تو ہمیشہ یہ کہتا ہوں کہ اب دنیا میں یونیورسٹیوں کے ذریعہ علم پھیلانے کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہ گئی ہے۔ بلکہ اب تو یونیورسٹیوں کے ذریعہ جہالت کو عام کرنے کا بندوبست ہونا چاہیے۔ جب جہالت ہی کلید کامیابی ٹھہری تو ہاتھ میں ایک ڈگری پکڑے کندھوں پر کسی ستم رسیدہ وکیل کا مانگا ہوا کوٹ ڈالے ایک تصویر دلپذیر کھنچوانے کا کیا فائدہ؟ یونیورسٹی سے نکل کر میں نے جگہ جگہ اپنی علمیت منوانے کی کوشش کی لیکن دنیا نے جواباً مجھ پر اپنی جہالت منوا کر ہی دم لیا۔ اس لئے اچھا جا مزاح نگار بن گیا کہ کچھ نہ کر سکوں تو دنیا کو چڑانے کا سامان ہی دے ڈالوں..."

مجتبیٰ حسین

"میں اور میرا مزاح"

جنت کو گرچہ ناز تھا اپنے مکین پر
تھا ان کی زندگی کا سہارا روٹین پر
ٹی اے وصول کرنے کو اترا زمین پر
لفظ کلرک لکھا تھا لوحِ جبین پر
ابلیس راستے میں بھلا کچھ سکھا دیا
اترا فلک سے تھرڈ میں انٹر لکھا دیا

سید محمد جعفری ... "کلرک"

"تم اپنے خاوند کو سمجھاتی کیوں نہیں ہو، ستر برس کی عمر ہوگئی لیکن اب بھی لڑکیوں کا پیچھا کرتا ہے کیا تمہیں جلن نہیں ہوتی؟"

"مجھے بھلا جلن کیوں محسوس ہو، کتے چلتی کاروں کے پیچھے بھاگتے ہیں لیکن وہ کار ڈرائیو تو نہیں کر سکتے۔"

انور ظہیر خاں
(بمبئی)

بمبئی میں طنز و مزاح کا تیسرا زاویہ ۔۔۔۔ فیاض احمد فیضی

اسم دو شہروں کی نمائندہ ہے۔ اس کا جو ادبی حصار ہے وہ اپنے میں شہری مزاج، ماحول، موضوعات و مسائل کو سمیٹے ہوئے ہے۔ اردو طنز و مزاح پر دیہی اور قصباتی سے زیادہ شہری فضا غالب ہے۔ طنز و مزاح کو پنپنے کے لیے سب سے زرخیز مٹی حیدرآباد دکن کی ہے جہاں اس کی ایک صحت مند روایت ہے اور نسلی ارتقا بھی ۔۔۔۔ پانی اور پہاڑیوں سے گھرے ہوئے بمبئی شہر کی آب و ہوا اردو شاعری اور افسانے کو تو راس آئی مگر یہاں طنز و مزاح پورے طور پر پنپ نہ سکے حالانکہ اس خرابے اور شعور شرابے کے شہر میں طنز و مزاح نگاروں کا ایک تکون پایا جاتا ہے تاہم شاعروں اور افسانہ نگاروں کے مقابلے میں قحط الرجال ہی ہے کہ اس کے دو زاویوں (یوسف ناظم اور پرویز یداللہ مہدی) کا تعلق حیدرآباد سے ہے اور تیسرے زاویے (فیاض احمد فیضی) کا سلسلہ بہار سے ہے جو اب بمبئی کے ہو کے رہ گئے ہیں۔ ۔۔۔ سردست ہمیں فیاض احمد فیضی کے فکر و فن سے بحث ہے جن کے بدن میں لہو گرم ہے مگر مزاج میں گرمی نہیں، قلم میں جولانی ہے لیکن روانی کم ۔۔۔ گزشتہ سولہ برسوں میں انیس ۱۹ مزاحیہ مضامین کا غذ پہ آتارے اور ایک عدد مزاحیہ ڈرامہ (ریڈیائی) بھی سابقہ سولہ سالوں میں انھوں نے جو کچھ لکھا اسے سینت کر رکھا۔ طبعاً نفاست پسند اور سلیقہ مند آدمی ہیں گویا شخصیت نفیس وجیہہ اور کتاب صوری اعتبار سے اتنی ہی معیاری ۔۔۔

فیاض احمد فیضی نے "قندو نقند" میں جو کچھ یکجا کیا، وہ سولہ برس کی قلم کاری کا ثمر ہے۔ انھوں نے کم کم لکھا جو لکھا اپنے طور پر سوچ بچار کے سلیقے سے، نہ کہ ناجی جان سے لکھا۔ ان کے پاس ہنر ہے موضوع کے انتخاب اور اس کے برتاؤ کا بھی اسے مزید صیقل ہونا ہے۔ انھیں اپنے ذہن اور قلم پر اعتماد ہے اس لیے مذکورہ کتاب کسی بزرگ ادیب، بخشے کے نقاد اور نامور ہم عصر اور ہم سر ادیب کی نیک تمنا اور تعریفی دعا سے عاری ہے وہ لوگ جو آرا کی روشنی میں کتاب پڑھنے اور آنکنے کے عادی ہیں۔ انھیں یہاں سخت مایوسی اور دشواری ہوگی۔

فیضی کے یہاں طنز کا فقدان ہے۔ طنز کے بغیر تخلیق اور تخلیق کار کا پورے طور پر سماج سے رشتہ قایم نہیں ہوتا۔ ان کے ہاں مزاح کی رہ گذاریں ہیں طنز کی شاہ راہیں بہت کم جو فرد کے ذہن و دل سے گزر کر سماج کے سینے پر سنگوں کا جال سا پھیلا جاتی ہیں جہاں طنز ہوگا وہاں سنجیدہ معنویت ہوگی، اصلاح کے پہلو ہوں گے۔ فردکی بے حسی، ثرِ صاد و رد کھے پن پر، سماج کی بے ضابطگیوں تضادوں، تضادات، توہمات، ناہمواریوں اور مضحکہ خیزیوں پر حساس

اور بالخصوص قلم کار کے ذہن میں پلنے والی ناگواری ونفرت کے پیچھے جلن کی صورت قطرہ قطرہ تیزاب بن کر ٹپکتی نظر آئے گی۔ ——— فیضی کے یہاں تیزابیت اور تلخی تو ہے مگر اس میں ٹھنڈک کی آمیزش کچھ زیادہ ہی ہے اگر یہ قلیل مضامین میں ہوتو طنز کی کمی نہ کھٹکے اور مضامین کا معیار مزید بلند ہو جائے۔

فیضی کا غالب کا رجحان مزاح کی جانب ہے۔ آج کے پر آشوب دور میں جبکہ مصروفیات نے انسان کا ہو چوس لیا ہے ایک لمحے کا تبسم بھی خیال و خواب ہو جاتا سا ہے تو ایسے حالات میں ہنسنا ہنسانا بدن کی عبادت ہے اور ہنسانے کا ذریعہ فیضی روزمرہ کی زندگی میں قہقہے کے ذرائع ہی قائل ہیں۔ البتہ ہر دم مسکراتے رہنا ان کی سرشت ہے۔ وہ اپنے مضامین میں جا بجا بکھرے جملوں سے لوگوں کے افسردہ اور خشکیں چہروں پر بھینچے ہونٹوں پر مسکراہٹیں سجا دینا چاہتے ہیں مسکان کی شریعت میں قہقہہ حرام نہیں تو حلال بھی نہیں ہے۔ قہقہے کھلنڈرے پن بے فکرے اور تہذیب ناآشنا شخص کی طرف ذہن جاتا ہے لیکن تبسم دھیمی ہنسی، صحبت جمال ہم نشین کی یاد دلاتا ہے۔ یہ سلیقہ شائستگی اور تہذیب سے عبارت ہے۔ فیضی کے مضامین میں یہ ہنر یہ کلچر نظر آتا ہے۔

اگر زبان پر عبور ہے اور حس مزاح فطرت سے ودیعت ہوتی ہے۔ ذہانت کا خزینہ بھی وافر مقدار میں موجود ہے تو مزاح خوب ہنساتا ہے اور قلم کار کو اجال دیتا ہے۔ بشرطیکہ مواد میں تنوع اور محاورے میں ندرت ہو۔ ورنہ قلم گھس گھس کے تحریروں کا ڈھیر لگانے والا ادیب بھی بے توجہی کے بونڈر میں گھر کے رہ جاتے ہیں۔ گو کہ انسان وجود معدوم نہیں ہوتا مگر اس کے تشخص اور مقام کے تعین کے سارے امکانات ختم ہو جاتے ہیں۔ فیضی کے یہاں یقیناً بعض جگہوں پر موضوعی سطحیت اور فنی خامی جھلکتی ہے اس کے باوجود وہ اپنے ہم چشموں اور ہم عمروں میں ممتاز و نمایاں ہیں۔ بڑا فن کار وہ ہے جو اپنے ہم عصروں اور پیش روؤں کو کراس کر جاتا ہے فیضی کے یہاں موضوع کے انتخاب اور اس کی پیش کش کا جو طریقہ کار ہے اس کے سہارے وہ اپنے بعض ہمراہیوں کو OVER TAKE کر کے آگے جا چکے ہیں اسی طریقہ کار کی بنیاد پر ہم ان سے خوب سے خوب تر کی امید وابستہ کر سکتے ہیں۔

فیضی نے جا بجا محاوروں اور کہاوتوں کا استعمال بھی کیا ہے۔ کہاوتوں اور محاوروں کا رشتہ عوام اور سماج سے ہوتا ہے اس سے جہاں زبان آسان اور عوامی ہوتی ہے وہیں فن پارہ قبول عام کی سند حاصل کرتا ہے اگر اس میں گہرائی ہے تو۔ ورنہ فن اور فنکار دونوں وقت کے ہاتھوں اڑائی ہوئی دھول میں گم ہو جاتے ہیں فیضی کے بعض مضامین میں یہ موضوع اور فنی نقد میں عیاں بھی ہیں اور پنہاں بھی۔

طنز و مزاح اور انشائیہ نگاری کے لیے فیضی کے یہاں بے پناہ صلاحیت ہے اور موضوع کا ساتھ دینے والی زبان بھی لیکن اس پر وہ دسترس نہیں جو کہ فن کار کو صاحب طرز بناتی ہے موضوع نیا ہو یا پرانا فن کار کا برتاؤ اسے اہم بناتا ہے۔ مقصدی اور دیرپا ادب میں برتاؤ سب کچھ نہیں مگر بہت کچھ ضرور ہے۔ بسا اوقات فنکار کالس گھسے پٹے موضوع کو بھی نئی تب و تاب بخش دیتا ہے اور بعض اوقات نیا موضوع بھی غلط TREATMENT کی وجہ سے بے وقعت ٹھہرتا ہے۔ تخلیقی ادب میں نئی نسل نے کیا اور کیسے کی بڑی اہمیت ہے جو تخلیق کار اس رمز کو پالیتے ہیں وہ اپنی زندگی کی حسین شاموں اور راحت فزا بھیگی راتوں کو تخلیقی ادب کی نذر کر دیتے ہیں ——— فیضی کا پسینہ ان کی شاموں اور راتوں کا لہو ان کے مضامین میں جہاں تہاں دمکتا ہے۔

فیضی کے بعض مضامین میں یہ وصف ہے کہ وہ فکر اور ذکر کا حصہ بنتے ہیں ——— پھولوں اور ترکاریوں

بہانے خامہ فرسائی کی لیکن پھر بھی ان کی خصوصی توجہ سے محروم رہے۔ فیضی کے جملوں کا اس انداز میں ایسا موضوع نایاب زبان تک ذائقے سے آشنا ہوتی ہے۔ "چھلوں میں رنگ بھرے" یہ اپنی نوعیت کا اردو میں منفرد مضمون ہے۔ اس میں کہیں کہیں انشائیہ کا رنگ و آہنگ بھی در آیا ہے۔ انشائیہ کی جھلک ان کے دوسرے مضامین میں بھی ہے لیکن انھیں مزاح سے نسبتِ خاص معلوم ہوتی ہے۔ طنز سے تھوڑا بہت یارانہ ہے اور انشائیہ سے علیک سلیک اور دریافت حال حال معلوم کرنے والا معاملہ ـــــ "کچھ آداب اسکوٹر چلانے کے" گو کہ اس پر خواجہ حسن نظامی کے انشائیہ نما مضمون "دیاسلائی" کی چھاپ ہے تاہم یہ ایک عمدہ مضمون ہے۔ "یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے" ذہن کی راہ سے دل میں گھر کر لیتا ہے۔ "لڑکیاں میرے شہر کی" اس میں جزئیات نگاری اور واقعہ نویسی کے سہارے معمولی معمولی مشاہدات و محسوسات کو یوں لکھا گیا ہے کہ قاری بڑھتی جوانیوں اور بہکتے سینوں کی دنیا دیکھ لیتا ہے۔ "سفرنامہ چرچ گیٹ" یہ واقعاتی مزاح کا کامیاب نمونہ ہے جس میں فیضی نے طنز کی پٹ ملا کر یہ ثابت کر دیا کہ وہ صرف مزاح نگار نہیں ہیں۔ انھوں نے یہ بھی جتا دیا کہ طنز کی بنیادی شرط درک، احساس، مشاہدے اور تجربے کی دولت ہے۔ افراد کے وظائف و کوائف یا ماحول سے باخبری بھی ضروری ہے اور لہجے میں ایسی کاٹ ہونی چاہیے کہ فرد کے لباس پر جمی گرد اور سماج کے جسم پر میل صاف ہو جائے۔ فیضی نے مضامین کے آخر میں "سفرنامہ چرچ گیٹ" کو رکھا ہے۔ کہیں اس جانب اشارہ تو نہیں یہ ایک سنگ میل ہے۔ اور یہاں سے ایک موڑ آنے والا ہے؟ مذکورہ مضامین کے علاوہ "ہوئے کلرک بن کے رسوا" اور "بی کے کالج" یہ بھی خاصے کی چیز ہیں۔

خاص بات یہ ہے کہ یہاں طنز پیرا گراف میں کم، جملوں میں زیادہ ہے۔ نیز مزاح پیرا گراف میں بہ کثرت جملوں میں بہ قلت۔ طنزیہ جملوں کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

★ "اچھے آدمی کی شناخت یہ ہے کہ بہت میٹھا نہ ہو، ورنہ اس پر سیاسی لیڈر، منافق، عاشق، اسیلز مین یا بیمہ ایجنٹ ہونے کا شبہ ہوتا ہے" (چھلوں میں رنگ بھرے)

★ "ہوٹل والے بڑی آسانی سے ایک سنگترے سے چار گلاس جوس تیار کر لیتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی ترکیب سو سال پہلے کسی کوا نے انھیں بتائی تھی" (چھلوں میں رنگ بھرے۔ سنگترہ)

★ "ویسے ایک اور قسم لڑکیوں کی وہ ہوتی ہے جو اپنی گلی سے پچھلی صدی کا برقعہ پہن کر نکلتی ہیں، کالج پہنچ کر برقعہ اتار کر پرس میں رکھ دیتی ہیں اور پرس میں سے تہہ کیا ہوا ڈوپٹہ نکال کر اوڑھ لیتی ہیں اور جب پکنک پر جاتی ہیں تو ڈوپٹہ، برقعہ اور شرم تینوں کو لپیٹ کر احتیاط سے بیگ میں رکھ دیتی ہیں۔"

(لڑکیاں میرے شہر کی)

★ "یہ لڑکیاں ذرا خطرناک ہوتی ہیں اور اپنے بوائے فرینڈ یا شوہر کو ڈوپٹہ کے پلو کی طرح ہی کبھی کبھی نادانستگی میں گرا سکتی ہیں"۔ (لڑکیاں میرے شہر کی)

★ "یہ ارباب حکومت و سیاست سے دیکھا نہیں گیا۔ اس لیے انھوں نے جوہوں کی وبا پھیلانے پر پابندی دی اور آبادی کم کرنے کے لیے فرقہ وارانہ فسادات کا نیا فارمولہ ڈھونڈ نکالا۔" (ذکر ان چوہوں کا)

★ "کلرکی کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ یہ ملتے ہی آدمی میں ہاتھ پیر ہلانے کا مادہ ہی ختم ہو جاتا ہے اور مزید ایجاد کسی شے کی ضرورت نہیں رہتی"۔ (ہوئے کلرک بن کے رسوا)

★ "ایسا نہیں کہ کلرک آفس میں بیٹھے بیٹھے صرف مکھیاں مارتے ہیں۔ جی نہیں، وہ کبھی کبھی تضیعِ اوقات کی خاطر کام بھی کر لیتے ہیں۔" (ہوئے کلرک بن کے رسوا)

★ "اگر آپ کا کوئی کام نہ بنتا ہو تو کلرک کو چائے پلا کر کام نکال لیجیے۔ بعض کلرک تو صرف چائے کے وعدے پر ہی اتنی پھرتی دکھاتے ہیں کہ ان کی presence of mind پر حیرت ہوتی ہے۔" (ہوئے کلرک بن کے رسوا)

یہ وہ طنزیہ جملے ہیں جن میں طنز کلیاں و نہاں ہے۔ اس سے ظاہر یہ ہوا کہ طنز فیضی کے مزاج میں ہے۔ جو در اصل لاشعور کے گودام میں پڑا ہوا ہے اسے جھاڑنے پونچھنے اور پالش کرنے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے جا بجا طنز و تشنیع کا بینترا آزمایا ہے۔ انھیں اندازہ ہو گیا ہوگا کہ اس کا وار کاری ہوتا ہے۔ طنز نگاری کے لیے جو اسلوبِ بیان درکار ہوتا ہے وہ فیضی کے پاس ہے۔ لہٰذا آئندہ طنز کے شجر پر برگ و بار آنے کے آثار ہیں۔

★ اچھے پھل کا میٹھا ہونا اتنا ہی ضروری ہے جتنا اچھے کریلے کا نیم چڑھا ہونا۔ ایک میٹھا پھل ہزار کھٹے پھلوں سے بہتر ہوتا ہے بشرطیکہ اس میٹھے پھل پر آپ کا نام لکھا ہو۔"

(پھلوں میں رنگ بھرے)

★ "دروازے، کھڑکیوں اور چھت، سبھی جگہوں پر لوگ اس بری طرح چپکے ہوئے تھے کہ چلتی ٹرین کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے چیونٹیاں شکر کے دانے کو اٹھائے چلی جا رہی ہوں۔"

(سفر نامہ چرچ گیٹ)

واقعاتی ظرافت کے لیے ماجرا نویسی اور کردار نگاری پر بھرپور مہارت ہونی چاہیے۔ افسانہ کے بھید بھاؤ اور آدمی کے بھاؤ تاؤ سے واقف ہونا از بس لازمی ہے حقیقت کو افسانہ اور افسانہ کو حقیقت بنانے کا گر آنا چاہیے۔ تب واقعاتی طنز و مزاح خوب پنپتے ہیں۔ فیضی کے یہاں ماجرائی یا حادثاتی طنز و مزاح کے اچھے نمونے ملتے ہیں:

★ "تیل سے چپڑا ہوا آدمی پہلے سے جلا بھنا کھڑا تھا۔ کہنے لگا۔ "آرام سے بڑ بول کرنے کا ہے تو ٹیکسی میں جاؤ۔ ہم کیا کرے گا۔ ادھر یہ بھائی نے سر پیچھے کیا تو ہم کو لگا، تو ہم نے بھی سر پیچھے کیا تو تم کو لگا۔ اب تم کو لگا تو تم بھی سر پیچھے کر لو حساب برابر۔" یہ سن کر کچھ لوگ ہنس دیے۔ وہ طالبِ علم خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا مگر چند ہی سکنڈ میں اس کے ساتھی کو بدلہ لینے کی ترکیب سوجھ گئی کہ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ ایک چپت تیل چپڑے ہوئے آدمی کے سر پر جما دی۔ وہ غصے میں جیسے ہی پلٹا، اس نے جلدی سے کہا "ہم کیا کرے گا۔ ہمارے پیچھے والے کا ہاتھ ہمارے سر پر لگا تو ہمارا ہاتھ تمھارے سر پر لگ گیا۔ اب تم برابر والے سے حساب کر لو۔"

(سفر نامہ چرچ گیٹ)

★ "دوسرے کھلاڑیوں نے قہقہہ لگایا، دونوں فریقین خاموش ہو گئے۔ بمبئی سنٹرل اسٹیشن قریب آ رہا تھا۔ ہمارے کمپارٹمنٹ کے دروازے کے قریب ایک پستہ قد شخص کھڑا بہت دیر سے جمائیاں لے رہا تھا۔ شاید وہ رات بہت جاگا تھا اور صبح ٹرین میں آرام کر رہا تھا، لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اب کی بار جیسے ہی اس نے پورا منہ کھول کر آکسیجن اندر کھینچی۔

ٹھیک اسی وقت ساتھ لٹکے ہوئے لڑکی نے اس کے چہرے کے قریب ایک زوردار چھینک ماری اور اس کے چودہ طبق روشن کردیئے۔ وہ چھینک اس کے کھلے ہوئے منہ میں بم کی طرح پھٹی تھی۔ آس پاس کھڑے سبھی لوگ ساکت وجامد ہوگئے۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ ٹریجڈی ہے یا کامیڈی۔ اسی وقت ٹرین بمبئی سنٹرل پہنچ گئی اور لوگوں کا ہجوم غفیر چھینک اور جماہی دونوں کو اپنے ساتھ بہا کرلے گیا۔ اسٹیشن کی بروقت آمد نے ایک اور جنگ کا خطرہ ٹال دیا تھا۔"

(سفرنامہ چرچ گیٹ)

فیضی نے طنز اور مزاح کو برابر برابر برتنے کی بھی کوشش کی ہے۔ وہ اس طرح کہ کہیں تو طنز اور مزاح دوسے بہاتے لیے جاتے ہیں۔ کہیں نزدیک سے بھی شناخت میں دقت پیش آتی ہے اور بعض مقامات پر تو طنز نے مزاح میں اور مزاح نے طنز میں اپنے وجود کو "من تو شدم تو جاں شدی" کے مصداق گم کردیا ہے۔

★ "لیکن یہ زمانہ کچھ ایسی ملاوٹ کا ہے کہ اصلی چیزیں نہ صرف کم یاب ہیں بلکہ انھوں نے اپنا اثر بھی کھو دیا ہے۔ نقلی چیزوں کی کچھ ایسی عادت ہو گئی ہے کہ اگر کبھی خالص گھی مل جائے تو اسے کھا کر لوگ بیمار ہو جاتے ہیں اور نقلی دواؤں سے بھی صحت یاب ہو جاتے ہیں۔"

(بدنامی سے نیک نامی کی طرف)

★ "ٹیلی فون اور محبوبہ میں مشترکہ بات یہ ہے کہ دونوں کے لیے آدمی برسوں قطار میں کھڑا انتظار کرتا رہتا ہے اور ہاتھ لگ جانے کے بعد عمر بھر سر پکڑ کر روتا رہتا ہے۔"

(اوہ آزادی)

★ "خدا کا شکر ہے کہ آپ کی لوکل ٹرین میں کوئی کنڈکٹر نہیں ہوتا ... شرما سانس درست کرتے ہوئے کہنے لگے "ورنہ اور برا حال ہوتا۔" نہ جانے کتنی ٹرینیں اسٹیشن پر رکے بغیر ہی آگے بڑھ جاتیں۔ کنڈکٹر اپنی مرضی سے خالی ٹرین کو بھی اسٹیشن سے ذرا پہلے یا ذرا آگے رکوا دیتے اور اسٹیشن پر کھڑے مسافر بھی ایک دوسرے کا منہ ہی تکتے رہتے۔"

(سفرنامہ چرچ گیٹ)

فیضی کے یہاں لفظی کفایت شعاری کی کمی ہے۔ تاہم تخلیقی لمحوں میں بعض مقامات پر ان کے قلم سے فقروں اور جملوں کی شکل میں ایسے موتی ڈھلک گئے ہیں کہ جس میں بلا کی آب اور تب و تاب ہے جو فیضی کی ذہانت کا پتہ دیتے ہیں اور اس بات کی پیشین گوئی کرتے ہیں کہ وہ ذرا سا ٹھہر رک کر اور ذہن پر زور دے کر قلم کو جنبش دیں تو مزاح اور طنز کے ساتھ ادب و انشا کا پورا لطف بھی شامل ہو جائے اور تیور یہ کہہ رہے ہیں کہ فیضی کے لیے یہ ناممکن نہیں۔ مثلاً چند جملے پیش ہیں:

★ "لیچی کی طرح کٹھل میں بھی اسی طرح کے نوک دار دانے ہوتے ہیں لیکن لیچی اور کٹھل کا موازنہ کرنا ایسی ہی ہے جیسے ممولے کو شہباز سے لڑا دینا۔ علامہ اقبال کے بعد اس طرح کے مقابلے کا اہتمام کسی نے نہیں کیا۔"

(کٹھل، لیچی، رنگ بھرے - لیچی)

★ "بیوی اور بھینس سے ہمیشہ ہوشیار رہنا چاہیے، پتہ نہیں کب اٹھ کر سینگ مار دے۔"
(کچھ آداب اسکوٹر سیلانے کے)

★ عام آدمی جب کسی کو سگریٹ جلائے دیکھتا ہے تو یہی سمجھتا ہے کہ ایک سرے پر چنگاری اور دوسرے پر چغد ہے۔"
(یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے)

★ "اور اکثر یہی لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ضرور آج گھر میں بیوی سے جنگ ہوئی ہے اور ہم سگریٹ سے چوٹیں سہلا رہے ہیں۔"
(یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے)

★ ہمارے یہاں سب سے مظلوم اور مضحکہ خیز دکھائی دینے والی دو ہی مخلوق ہیں۔ ایک ٹیچر اور دوسری کلرک۔"
(ہوئے کلرک بن کے رسوا)

★ "نیند دلانے کی بدد عاہے۔ بے خوابی پولیس والے کی گالی ہے۔ نیند اور بے خوابی کے درمیان ٹرک ڈرائیور کے لیے پیغام اجل ہے اور شاعر کے لیے شعر کی پیدائش کی پیشگی اطلاع ہے۔"
(نیند کیوں رات بھر نہیں آتی)

★

★ "سچ پوچھیے تو عید کے دوسرے دن سے ہی دال اور دوا کی بکری برسنے لگتی ہے۔"
(عید کی قربانی)

★ "ترقی، تنگی اور ننگی نے ہمیشہ چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔"
(اوہ آزادی!)

★ عورت کی نیت اس کی اداؤں سے اور مرد کی نیت اس کی آنکھوں سے معلوم ہو جاتی ہے۔"
(سفرنامہ جورج گیٹ)

"قند و ز قند" ان کی تخلیقی سفر کا پہلا پڑاؤ ہے۔ منزل نہیں۔ ابھی انھیں فنی سفر کے کڑے کوس طے کرنے ہیں۔ مزاح کی عاری سے طنز کی راہداری میں قدم رکھنا ہے یا مزاح میں رنگ آمیزی کا اور رنگوں کو حسب موقع و ضرورت ہلکا بھاری کرنے کا ہنر سیکھنا ہے۔ واقعہ اور بیانیہ کو سینے سے لگائے ہوئے رمزیہ انداز کو اور چمکانا ہے۔ سنجیدگی میں طنز اور طنز میں سنجیدگی کی پٹ شامل کرنی ہے تاکہ سماجی تنقید کا حق اور فرض ادا ہو سکے۔ پیرایۂ بیان میں خنجر کی انی پیدا کرنی ہے کہ جس کی چبھن دل تک محسوس ہو۔

فیضی اپنے ہم سنوں اور ہم سروں میں تیزی سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ ان کا فنی سفر افقی اور عمودی دونوں سمتوں میں جاری ہے۔ فن کار کے نام اور مقام کا مسئلہ بڑا پیچیدہ ہوتا ہے۔ عمریں بیت جاتی ہیں اور شناخت نہیں بنتی۔ فیضی کے تخلیقی بازوؤں میں قوت نمو بھی ہے اور فن میں آب و تابندگی بھی۔ لہٰذا اپنی پہچان بنانا ان کے لیے مشکل نہیں۔ البتہ تھوڑی سی اور نیم دیوانگی درکار ہے۔

خدا ترے جنون کا سلسلہ دراز کرے

خط

کل رات عابد معز سے بات ہوئی - اب تو وہ حیدرآباد پہنچ بھی چکے ہوں گے - شگوفہ کو پھول بنانے میں ان کا بڑا عمل دخل ہے حکومت انگلینڈ کے حلیف حضور نظام تھے، معز عابد آپ کے حلیف ہیں لیکن اس میں کسی سیاست یا حکمت کا دخل نہیں ہے - یہ خبر کہ آپ کا پرچہ ایک معقول تعداد میں مقدس و متبرک مقامات پر جا رہا ہے (اور پڑھا بھی جا رہا ہے) دل خوش کن ہے -

• یوسف ناظم، بمبئی

جناب کمال صاحب !

آپ کا کمال یہ ہے کہ "شگوفہ" سات سمندر پار ملکوں میں بھی پابندی کے ساتھ ملتا ہے اور اس کا معیار بلند تر ہوتا جا رہا ہے اللہ کرے زور قلم اور زیادہ

• جلیل کاشمیری، لندن

پیارے بھائی مصطفیٰ کمال شگوفوی

گزشتہ 3، 4 ماہ سے شگوفہ برابر مل رہا ہے - اس کیلئے شکریہ ادا نہیں کروں گا کیونکہ روایتی انداز میں شکریہ ادا کرنے سے شکریہ اپنی حقیقت کھو دیتا ہے - ہاں میں آپ کے اس عظیم جذبہ کو سلام ضرور کروں گا جو مزاح نگاروں اور مزاح کے ماروں کو باہم ملانے میں ایک موثر رول ادا کرتا ہے -

جس طرح ایک سوکھے ہوئے درخت کی مسلسل آبیاری سے اس کے انداز زندگی کے آثار پھر سے جنم لینے لگتے ہیں اور اس کی شاخیں ہری بھری ہونے لگتی ہیں اسی طرح شگوفہ سے مسلسل ربط نے میرے اندر کے جراثیم کو بھی ہوا بھی دی ہے اور طبیعت مجھے لکھنے لکھانے کی طرف مائل ہے -

• سید نصرت، ابوظہبی

محترم ڈاکٹر مصطفیٰ کمال !!

" توتو میں میں" کیا خوب ڈرامہ ہے - رفیعہ منظور الامین صاحبہ کو مبارکباد - مشتاق احمد یوسفی صاحب کا کیا کہنا - کچھ نہیں بہت کچھ وہ اپنے زور بیان سے حاصل کر لیتے اور قاری ان کی تحریر دیکھ کر انگشت بدنداں رہ جاتا ہے - مرزا کھونچ کی غزل بھی کامیاب ہے -

وہسکی میں وہ کیف کہاں
ملتا ہے جو تاڑی میں

• ازوار انصاری، رانچی

قابل قدر مدیر محترم !

سلام و گلدستۂ خلوص !

شگوفہ ماہنامہ جون ۱۹۹۲ء پورے آب و تاب کے ساتھ جلوہ افروز ہوا - آج کے اس دور سنگلاخ زمین میں جب کہ فنکاروں کی آواز دب کے رہ جاتی ہے - مدیران کی کاوشیں دم توڑ رہی ہیں - آپ نے اردو کو اپنے لہو سے سینچنے کا جو کام کیا ہے وہ رہتی دنیا تک پائندہ رہے گا - اور آپ کا نام ادب کے کہکشاں میں ہمیشہ درخشاں رہے گا -

اس شمارہ میں ذہانت علی بیگ نے رؤف رحیم کی اچھی شاعری سے تعارف کروایا - مجھے یہ شعر بے حد پسند آیا -

" کوئی لڑکی جو غریبی میں جوان ہوتی ہے "
" اس کی تقدیر خدا جانے کہاں ہوتی ہے "

گرچہ کہ سارے اشعار ذہن کو جھنجھوڑنے والے ہیں - پرویز یداللہ مہدی، ڈاکٹر فرزانہ سعید اختر بے حد پسند آئے -

• پرویز عالم
، دھنباد

اداریہ

اردو کے نامور ادیب، شاعر اور دانشور جناب کنور مہندر سنگھ بیدی کا ۱۹ ر جولائی کو انتقال ہو گیا۔ وہ پچھلے ڈیڑھ سال سے کینسر کے مرض میں مبتلا تھے۔ سحرؔ صاحب کے انتقال سے اردو دنیا کو سخت نقصان پہنچا۔ کنور مہندر سنگھ اردو تہذیب کی نمائندہ شخصیت، لسانی یک جہتی، مذہبی رواداری اور انسان دوستی کی زندہ مثال تھے۔ آزادی کے بعد ملک میں کل ہند اردو تقاریب اور مشاعروں کے انعقاد میں ان کا ہمیشہ تعاون حاصل رہا۔ ہندوستان اور پاکستان ہی نہیں بلکہ ساری اردو دنیا کے ادیب و شاعر ان کا بڑا احترام کرتے تھے۔ ہندوستان کے مختلف شہروں، پاکستان، خلیجی ممالک، برطانیہ، امریکہ اور دوسرے ملکوں میں مشاعروں اور جلسوں کی صدارت کے لیے انھیں بار بار مدعو کیا گیا۔ وہ بڑے شوق سے ادبی تقاریب میں شرکت کرتے اور کبھی کسی طرح کا معاوضہ قبول نہیں کرتے تھے۔ زندہ دلانِ حیدرآباد اور ماہنامہ شگوفہ سے ان کا قریبی تعلق تھا۔ ان کی مزاحیہ نثری و شعری تخلیقات شگوفہ میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہی ہیں۔ وہ شگوفہ کو اپنا رسالہ سمجھتے تھے اور اس کی ترقی و مقبولیت کے آرزومند رہے۔ سحرؔ صاحب نے کہا تھا:

نہ جینا ہاتھ میں اپنے نہ مرنا ؛ بشر کی ابتدا کیا انتہا کیا

لیکن سادگی، خلوص، محبت اور شفقت کے جو انمٹ نقوش انھوں نے ذہن و دل پر چھوڑے ہیں ہمیشہ ان کی یاد دلاتے رہیں گے۔

زندہ دلان حیدرآباد کا ترجمان

ماہنامہ

شگوفہ

حیدرآباد

جلد: ۲۵
شمارہ: ۹

ستمبر ۱۹۹۲ء

فی پرچہ: ۶ روپے
سالانہ خریداری: ۶۵ روپے
بیرونی ممالک سے: ۲۰ ڈالر

سرورق: طالب خوندمیری
کتابت: محمد غالب۔ فضل محمد
طباعت: دائرہ پرنٹنگ پریس چھتہ بازار حیدرآباد ★

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ:
۳۱۔ بیچلرز کوارٹرز
معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد
فون، 557716 رہائش: 521064

ماہنامہ

"شگوفہ"

کا

آئندہ شمارہ

سعودی عرب میں مقیم

اردو کے

طنز و مزاح نگاروں کی تخلیقات

(معہ تصاویر و مختصر تعارف)

پر

مشتمل ہوگا

★ دو رنگی سرورق ★ آفسٹ طباعت

قیمت : ۸ روپے

اِس تھیلی کے چٹّے بٹّے (فہرست)

آندھرا پردیش ریاستی اقلیتی فینانس کارپوریشن

8/825-1-4 سکنڈ فلور لکشمی اسٹیٹ عابڈز - حیدرآباد - ۱۰

حکومت آندھرا پردیش کی جانب سے چلنے والا ادارہ جہاں ریاست سے تعلق رکھنے والے اقلیتی افراد مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی، جین، بدھسٹ کو قرضہ جات کی فراہمی کی جاتی ہے، یہ قرضہ جات (۲) اسکیموں کے تحت دیئے جاتے ہیں:

۱۔ غربت ہٹاؤ اسکیم ۲۔ خود روزگار اسکیم

۱۔ غربت ہٹاؤ اسکیم: اس اسکیم کے تحت 10،000 ہزار روپے کی جملہ لاگت کے کاروبار کے لیے جیسے کرانہ اسٹور، سیکل ٹیکسی، بک بائنڈنگ، ترکاری فروشی، اگربتی تیار کرنے کے لیے، میوہ فروشی وغیرہ وغیرہ کے لیے قرضہ جات دیئے جاتے ہیں۔ اس جملہ لاگت کا ۲۵ فی صد کارپوریشن سے دیا جاتا ہے اور اس کو ۲۰ آسان ماہانہ اقساط میں بہ شرح ۴٪ کے ساتھ ادا کرنا پڑتا ہے اور باقی بنک کے ذریعہ دلایا جاتا ہے اور اس اسکیم میں درخواست گذار کی سالانہ آمدنی 6000 روپے سے کم ہونی چاہیے۔

۲۔ خود روزگار اسکیم: اس اسکیم کے تحت 2,00000 لاکھ روپے کی جملہ لاگت کے کاروبار کے لیے جیسے چھوٹی صنعتیں، کسی بھی قسم کی تجارت، پرنٹنگ پریس، میڈیکل شاپ، زیراکس مشین کے لیے، آٹو رکشا، آٹو ٹرالی وغیرہ وغیرہ کے لیے قرضہ جات دیئے جاتے ہیں۔ اس جملہ لاگت کا ۲۰ فی صد کارپوریشن کی جانب سے بطور مارجن منی کے شرح سود ۶½ فی صد پر دیا جاتا ہے اور باقی رقم بنک سے دلائی جاتی ہے۔

یہ کارپوریشن تمام ریاست میں اب تک 41890 افراد میں 6،98،59000 روپے مارجن منی جاری کرچکا ہے جس کی جملہ لاگت 29،51،64000 روپے ہے۔

خواہش مند افراد مندرجہ بالا پتہ پر رجوع ہوں۔

محمد لائق علی خاں
مینجنگ ڈائرکٹر

آزادی کے تحفظ کی ڈھال

ہند کے عوام نے ذات پات اور مذہب وملت سے بلند ہوکر
اور متحد ہوکر آزادی کی جنگ لڑی۔

—— جذبہ اتحاد ۔ قربانی اور سیکولر نقطہ نظر
انکی جدوجہد کا امتیازی نشان رہے ہیں۔

—— یہی جذبہ ہمیں متحد رکھ سکتا ہے اور ترقی
کی راہ پر آگے لیجا سکتا ہے۔

ہماری آزادی کا محافظ — سیکولرازم



یوسف ناظم

دو آتشہ سے دو آبہ — صابر دت

یہ جان کر حیرت ہوئی کہ صابر دت جیسا دبنگ آدمی بھی کسی بات پر ندامت پسند ہونے پر مائل ہو سکتا ہے۔ وہ بمبئی میں کوئی ۲۲، ۲۳ سال سے فروکش ہیں۔ ان کا اوروں کی طرح حلقۂ احباب نہیں دائرہ احباب ہے جس کا قطر اتنا ہی وسیع ہے جتنا کہ اس برصغیر کا ہے بلکہ دوسرے ملکوں کے حدود کو اپنے گھیرے میں سمیٹ لیتا ہے۔ لیکن انھوں نے گزشتہ دو دہوں میں کسی دن بھی اپنے کسی دوست آشنا، یا شناسا کو یہ نہیں بتایا کہ وہ اور کچھ ہونے کے علاوہ بفضلِ جامعہ، گریجویٹ بھی ہیں۔ حالاں کہ جس زمانے کے یہ بی اے حال حال میں بتائے گئے ہیں۔ اس زمانے میں ہر شخص خواہ اس کے پاس کوئی ڈگری ہو یا نہ ہو اپنے نام کے آگے ایک ڈگری پلیٹ ضرور لگا دیتا تھا حتیٰ کہ نان میٹرک اور انڈر گریجویٹ کو بھی اس دور میں ڈگری ہی کی ایک قسم سمجھا جاتا تھا (کیا زمانہ تھا میٹرک میں فیل ہونا یا اس منزل نامسعود تک پہنچنا بھی جنگ آزادی کا برابری کا کوئی کارنامہ تھا) صابر دت اسی زمانے کے گریجویٹ ہیں۔ اس زمانے میں کچھ ادبی رسائل ایسے بھی تھے جن میں چھپنے کے لیے اپنی ڈگری کا انکشاف اور تحریری طور پر اس کا اعلان ضروری تھا۔ کچھ ادیب تو صرف ڈگری کے سہارے شائع ہوتے تھے ورنہ ان کا کلام دراصل شائع نہیں ضائع کیے جانے کی پوری پوری صلاحیت رکھتا تھا ——— معلوم نہیں صابر دت اپنی ڈگری کے اخفا پر کیوں اتنی ثابت قدمی سے ثابت رہے اور اب جب کہ ڈگریاں کسی شکستہ کشتی سے بھی زیادہ خستہ حال ہو گئی ہیں انھوں نے اس راز کا انکشاف کر دیا۔ ایک اور ستم یہ ہوا کہ وہ صابر دت کی حیثیت سے اتنے شہرہ آفاق (آفات نہیں) ہو گئے ہیں کہ اب کسی کو اس بات کا یقین ہی نہیں آئے گا کہ وہ بنیادی طور پر کلبھوشن دت ہیں۔ اپنی زندگی کا پہلا اچھا یہ کام کیا کہ کشمیر کے علاقہ میرپور میں پیدا ہوئے۔ یہ اس زمانے کی بات ہے کہ جب میرپور میں کوئی بھی پیدا ہو سکتا تھا۔ انھوں نے شعر کہنا کب شروع کیا پتہ نہیں لیکن یہ بات بہرحال طے ہے کہ شعر گوئی کے معاملے میں کم سخن تھے

اور اس لیے صرف قطعات ہی کو ہدف بناتے تھے۔ قطعہ گوئی میں انھوں نے اتنی شہرت حاصل کرلی کہ شہنشاہِ قطعات کہے جانے لگے اور اپنی وضع قطع کے اعتبار سے بھی یہ شاعر قطعات ہی دکھائی دیتے ہیں۔ کہنے کو وہ غزلیں بھی ہیں لیکن صرف اس لیے کہ اس میں دو چار قطعے جمع کردیے جائیں تو غزل ہو جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ غزل کا ہر شعر دوسرے شعر سے مختلف ہوتا ہے۔ ان کا نہیں ہوتا۔

کل بھوشن دت بمبئی میں یوں آئے کہ (غالباً) ۱۹۷۰ء میں انھیں یہاں کسی مشاعرے میں مدعو کیا گیا۔ ان کی عمر اس وقت ہوگی کوئی ۳۰ سال۔ ۳۰ بہاریں ان کے ادھر اُدھر سے گزر چکی تھیں لیکن انھوں نے کسی بہار کو بہت زیادہ قریب آنے نہیں دیا۔ اسی خزاں زدہ حالت میں کہ ہر حال میں مست رہنے کے عادی تھے۔ بمبئی چلے آئے۔ مشاعرہ تو انھیں زیادہ پسند نہیں آیا لیکن بمبئی شہر نے انھیں مسحور کردیا۔ یہ شہر ہے ہی کچھ اسی قسم کا۔ بہتوں کی پناہ گاہ ہے۔ بہتوں کی قتل گاہ۔ لیکن ٹھیریے۔ مشاعرے کے تعلق سے ایک لطیفہ یاد آگیا۔ ایک چھوٹے سے شہر میں جہاں علم کی روشنی تو آتی تو نہیں پہنچی تھی جتنی کہ شعر و شاعری کی دھوم پہنچی تھی۔ اہلِ شوق نے ایک مشاعرہ منعقد کیا اور ویسے ہی شاندار انتظامات کیے جیسے کہ کسی میلے یا شادی کی تقریب کے موقع پر کیے جاتے ہیں۔ دور دور سے شاعر بلائے گئے اور ہر شاعر بے پناہ تالیاں بٹور رہا تھا۔ انھی میں ایک دبلا پتلا شاعر بھی تھا اور شاید پہلی مرتبہ اتنے بڑے مجمع میں اپنا غیر موزوں کلام پیش کر رہا تھا۔ شعر میں تو تھا ہی آواز میں بھی سکتہ تھا۔ سامعین میں جماہیاں، چہ میگوئیاں اور سرگوشیاں شروع ہو گئیں۔ اور اچانک ایک لحیم شحیم شخص اپنے ہاتھ میں عصائے ہدایت تھامے اسٹیج کی سمت میں بڑھنے لگا۔ شاعر لرزہ براندام ہو گیا اور اس نے ڈرتے ڈرتے صاحب عصا سے پوچھا 'خان صاحب کیا مجھ سے کوئی قصور ہو گیا ہے۔ جواب ملا۔ تہیں نہیں تو پڑھتا رہ۔ میں تو اسے ڈھونڈ رہا ہوں جو تجھے یہاں لایا ہے ـــــ اس لطیفے کا اس مضمون سے کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ پیدا کیا جا سکتا ہے۔ یہ لطیفہ تو میں نے اس لیے لکھ دیا ہے کہ آج کل مزاحیہ مضامین میں ایک نہ ایک لطیفہ ہونا ہی چاہیے گویا کہ خود مضمون لطیفہ نہیں ہوتا۔ یوں بھی یہ لطیفہ اس لیے بے موقع ہے کہ وہ غریب شاعر تھا ہی نہیں جب کہ صبا بردت ۱۹۶۶ء میں صاحبِ مجموعۂ کلام ہو گئے تھے۔ پل دو پل کے بعد گو کہ ایک ربع صدی گزر گئی لیکن صبا بردت کا ایک اور مجموعہ موجِ عارض اب تیار ہے (یہ دھمکی نہیں خوش خبری ہے) مجموعے کا نام کس نے تجویز کیا معلوم نہیں ہو سکا۔ ممکن ہے جاں نثار اختر نے یہ کام کیا ہو کیوں کہ وہی تھے جو صبا بردت کو روزانہ ایک مشورہ ضرور دیا کرتے تھے بلکہ شاید دو مشورے یومیہ۔ صبا بردت کہنے کو ساحر لدھیانوی کے گھر میں رہتے تھے لیکن دن کے ۲۴ گھنٹوں میں سے ۲۳ گھنٹے جاں نثار اختر کے مکان پر جالیہ میں پائے جاتے تھے (باقی کا ایک گھنٹہ جو ہوتا "یا ندرہ اور یا ندرہ تا جوہو کے سفر میں خرچ ہوتا تھا) جب انھوں نے ترکِ وطن کیا تھا تو اپنے ساتھ اپنا پائپ لانا نہیں بھولے تھے۔ ہندوستان میں اگر کوئی قدیم ترین پائپ پایا جاتا ہے تو وہ انھی کی ملکیت ہے۔ صبا بردت نے جاں نثار اختر مرحوم کے ساتھ جو جائز، ناجائز تعلق پیدا کیا تھا اسے مرحوم کی آخری سانس تک برقرار رکھا اور دواخانے میں ان کی تیمارداری بلکہ خدمت میں جس طرح لگے رہے۔ ان کی اس 'حرکت' سے ان کا ایک دوسرا ہی روپ سامنے آیا اور میری خود ساختہ غلط فہمیاں اتنی ہی دور ہو گئیں جتنی دور سے صبا بردت متذکرہ بالا مشاعرے میں شرکت کے لیے آئے تھے۔ تبدیلیٔ خیالات کے لیے ایک لمحہ بھی بہت کافی ہوتا ہے۔

صابردت، شہر بمبئی کی تاریخ میں شاید تنہا آدمی ہیں جنھوں نے برسوں تک کچھ نہیں کیا۔ ورنہ اس ناگفتنی شہر میں تو آدمی بہت کچھ اور سب کچھ کرتے کرتے تھک جاتا ہے لیکن پنپتا نہیں ہے۔ صابردت اس لحاظ سے اچھے رہے کہ کچھ نہ کرنے کے زمانے میں بھی پنپے اور اب تو رہتے بمبئی میں ہیں لیکن جہاں جہاں اردو ہے وہاں وہاں یہ پنپ رہے ہیں۔

صحافت سے انھیں دل چسپی تو پہلے بھی تھی لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی دل چسپی سے کسی اور کو کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ اس لیے ان کے وہ دونوں پرچے یعنی روپ اور دلّی والا دونوں بن کھلے غنچوں کی طرح مرجھا گئے جس کا انھیں اس لیے صدمہ نہیں ہوگا کہ اگر یہ پرچے یا ان دونوں میں سے ایک بھی پرچہ سلامت رہتا تو کل بھوشن دت دلّی والا ہی رہتے۔ (یہ شہر محفوظ رہتا)

اختر بھائی مرحوم نے برسوں صابردت کا بغور مطالعہ کیا۔ ان کے بارے میں شاید سوچتے بھی رہے اور آخر ایک دن انھوں نے صابردت کو مشورہ دیا کہ تم ایک ادبی پرچہ شائع کرو اور خود ہی اس پرچے کا نام بھی تجویز کر دیا "فن اور شخصیت"۔ مرحوم کو کیا خبر تھی کہ اپنے گھر میں دیوان پر نیم دراز حالت میں اور وہ بھی غنودگی کے زیرِ اثر انھوں نے جو مشورہ دیا تھا وہ "دولتِ بیدار" بن جائے گا۔ دولتِ بیدار کی ترکیب شاید میر تقی میر کے کلام میں استعمال ہوئی ہے اور اگر اس میں مجھے تسامح ہوا ہے تو یہ کوئی انوکھی بات نہیں۔ صابردت نے بسر و چشم قبول کیا (حالاں کہ اس وقت ان کی آنکھیں کھلی نہیں تھیں وہ تو اب جا کر کھلی ہیں)۔ ۱۹۷۵ء میں صابردت نے اس مشورہ کو عملی جامہ پہنا دیا۔ بہتوں نے (جن کے دانت سلامت تھے) دانتوں تلے انگلی دبالی۔ یہ مہندر ناتھ نمبر تھا۔ فن اور شخصیت کا پہلا نمبر۔ یہ بے حد مقبول ہوا اور صابردت بمبئی کے مستقل باشندے ہو گئے۔ مستند صحافی ہو گئے اور لوگ انھیں اور ان کے پائے کو اس نظر سے دیکھنے لگے جسے ادبی زبان میں نظرِ استحسان کہا جاتا ہے اور مہندر ناتھ نے اس نمبر کو قبول کروانے میں اپنی جان لڑا دی (صابردت کی تھوڑی بہت شہرت اس بنا پر بھی ہے اور جاں نثار اختر نمبر کے بعد تو اس شہرت کو اہلِ ہجو اور صاحبانِ طنز و مزاح نے اور ہوا دی) صابردت نے ۱۹۷۵ء سے لے کر ۱۹۹۱ء تک اتنا سارا کام کر ڈالا ہے کہ اگر اب وہ اپنے منصب ادارت سے سبک دوش ہو جائیں اور صرف اپنے البم کے بارے میں زبانی گفتگو کرتے رہیں اور زبردستی داد حاصل کرتے رہیں (جیسا کہ وہ اب بھی کرتے ہیں) تب بھی انھیں فراموش نہیں کیا جا سکے گا۔ ان کے نمبر اور ان نمبروں کے قارئین اور البم کے ناظرین سب جگہ پھیلے ہوئے ہیں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے صابردت چین سے بیٹھنے والی مخلوق ہی نہیں۔ اب تو نوبت یہ آ گئی ہے کہ بیرون بمبئی ہی سے نہیں بیرونِ ملک سے جو بھی ادیب اور شاعر بمبئی آتا ہے مقاماتِ مقدسہ کی سیاحت میں انھیں بھی شامل کر لیتا ہے۔ صابردت اب تک دس ضخیم اور وزنی نمبر شائع کر چکے ہیں۔ انھیں آرٹ کی بھی پرکھ ہو گئی ہے اس لیے ہر نمبر کا ٹائٹل بھی نمائش کے قابل ہے اور انھیں خود بھی یہ سرورق اتنے پسند آتے ہیں کہ یہ صبح سویرے اٹھ کر سب سے پہلے اپنے سارے سرورق دیکھتے ہیں۔ منہ بعد میں دھوتے ہیں۔ کملیشور، فیض احمد فیض، نرگس دت، ساحر لدھیانوی، طرز لکھنوی، یہ سب ان کے نمبروں کے اسیر ہیں، ان کے نمبر کے سب اسیر ہوئے لیکن صابردت مدیر ہونے کے علاوہ ناشر بھی ہیں۔ موصوف نے ۳ کتابوں (!) کی ناشری کی ہے۔ قرۃ العین حیدر کے دو ناول، کارِ جہاں دراز

ہے اور آخرِ شب کے ہم سفر کے علاوہ عصمت چغتائی کی تصنیف 'ایک قطرۂ خون' انھی کے زیرِ اشاعت کا نتیجہ ہے۔ کتابت کی غلطیوں کی انھوں نے کبھی پرواہ نہیں کی اور اپنی ٹوپی میں نئے نئے سرخاب کے پر لگاتے رہے۔ ان کے قبضے (قبضۂ ناجائز) میں اب بھی اتنا ذخیرہ ہے کہ وہ چاہیں تو اسے خام حالت میں فروخت کرکے مدیر کی بجائے ملک التجار بن جائیں۔

کسی برہمن کی پیش گوئی کے بغیر ۱۹۹۱ کا سال ان کے لیے بہت اچھا رہا۔ اسی سال ان کا البم "تصویرِ بتاں" چھپ کر یوں بازار میں آیا جیسے عروسِ صبح نے آواز دی ہو "اٹھو سونے والو کہ میں آرہی ہوں"۔ یہ مرقع صابر دت ان کے حق میں شربتِ فولاد ثابت ہوا۔ اس البم کی اشاعت کے بعد صابر دت پھولے نہیں سما رہے ہیں۔ لوگ انھیں سڑک پر چلتا دیکھتے ہیں تو بحرِ حیرت میں ڈوب جاتے ہیں کہ سڑک پر چلنے والا شخص بنگال کا جادوگر پی سی سرکار تو نہیں سڑک پر چل رہا ہے لیکن اسکے پاؤں زمین پر نہیں پڑ رہے ہیں۔ یہ تو صابر دت ہیں جو پہلے ہی سے اسی ڈھب سے چلنے کے عادی ہیں۔ کوئی دوسرا اگر ایسا البم شائع کر پاتا تو شاید ہوا ہی میں معلق رہتا۔ اس البم نے صابر دت کو شجرِ ادارت کی پھننگ پر پہنچا دیا اور ساحر پبلشنگ ہاؤز کو اورینٹ لانگ من کے درجے پر۔ بس فرق یہ ہے کہ اورینٹ لانگ من بدیسی ادارہ ہے اور کافی معمر جبکہ ساحر پبلشنگ ہاؤز کے کھانے کھیلنے کے دن ابھی ابھی ختم ہوئے ہیں ___ کسی نے سوچا بھی نہیں تھا کہ صابر دت، انتظام و انصرام میں بھی دخل دے سکتے ہیں ___ آج کل کیا کیا نہیں ہو رہا ہے ___ صابر دت کی خوبی یہ ہے کہ وہ مانتے کسی کو نہیں ہیں ویسے اگر وہ ذرا غور و خوض سے کام لیں تو انھیں خود اندازہ ہو جائے گا کہ ان کے اندر کچھ ایسے جراثیم بھی ہیں کہ جنھیں وہ پنپنے کی اجازت اور سہولت دیں تو خود بھی ساحر کی طرح محبوب نہ سہی مرغوب ضرور ہو جائیں۔

ساحر کی صحبت میں انھوں نے جو دبنگ بن کر رہنا سیکھا اچھا کیا وہیں جاں نثار اختر کی تھوڑی سی بردباری بھی اپنا لیتے ہیں تو اس بوجھ سے دب نہ جاتے۔ ___ ستلج اور گومتی کا یہ آمیزہ انھیں دو آتشہ سے دو آبہ بنا دیتا ___ لیکن اپنے موجودہ رنگ میں بھی اچھے خاصے ہیں بس نمبر شائع کرتے رہیں اور کبھی کبھی ایک البم کہ یہ بھی ضروری چیز ہے۔ تصویرِ بتاں' کی تو خیر ضرورت تھی غالب کے گھر سے جو دوسرا سامان نکلا تھا اسے یہ نہ نکالیں۔

●●

مجتبیٰ حسین

ایک گولڈ میڈل کا سوال ہے بابا!

ہمارے دوست شرما جی کی بیٹی کے رشتے کی بات ان دنوں ہمارے ایک پڑوسی کے بیٹے سے چل رہی ہے۔ لڑکا کرکٹ کا بہترین کھلاڑی ہے اور یہ جو آپ ہمارے سر پر زخم کا گہرا نشان دیکھ رہے ہیں تو یہ اسی کی ہٹ کی ہوئی ایک گیند کی دین ہے اور یہ جو ہمارے گھر کی ساری کھڑکیاں بنا شیشوں کے آپ کو دکھائی دے رہی ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں سے بھی کبھی اس کے چوکے اور چھکے گزر چکے ہیں۔

یہ کھلاڑی چوں کہ ہمارا پڑوسی ہے۔ اس لیے شرما جی نے ہمارے ذمّے یہ کام لگایا ہے کہ ہم اس رشتے کے بارے میں لڑکے سے بات کریں۔ ہم نے سوچا تھا وہ "ٹاس" کے ذریعہ رشتے کا فیصلہ کرے گا مگر ایک اچھے اسپورٹسمین کی طرح وہ شادی کے لیے فوراً تیار ہو گیا۔ اٹھتے اٹھتے ہم نے پوچھا۔

"بیٹا تمھیں جہیز میں کوئی خاص چیز تو نہیں چاہیے؟"

شرماتے ہوئے لڑکے نے کہا

"اور تو کچھ نہیں چاہیے، البتہ ہو سکے تو ایک گولڈ میڈل ضرور دیجیے"

ہم نے کہا کہ تم ایک گولڈ میڈل کی بات کرتے ہو، شرما جی لکھ پتی آدمی ہیں، وہ تو تمھیں چار پانچ گولڈ میڈل دے سکتے ہیں"۔ لڑکے نے کہا میں تو صرف ایک ہی کھیل جانتا ہوں۔ چار پانچ گولڈ میڈل لے کر کیا کروں گا۔؟

ہم نے کہا کہ "یوں سمجھو کہ تمھیں اسی ایک کھیل کے چار پانچ مقابلوں میں گولڈ میڈل مل گئے اور کیا؟"

لڑکے نے کہا معاف کیجیے! میں ایک سچا کھلاڑی ہوں، ایسی بے ایمانی نہیں کر سکتا۔ میں تو ایک گولڈ میڈل پر ہی گزارا کروں گا اور پھر یہ ایک گولڈ میڈل بھی کسے ملتا ہے۔ آپ نے دیکھا نہیں، پورے چالیس پچاس کھلاڑیوں

[illegible]

میں ٹرانسسٹرس، وی سی آر، ٹی وی سیٹس، کیمرہ اور گھڑیاں وغیرہ جو کچھ لانا چاہیں وہ ضرور لے آئیں گے مگر ساتھ میں وہ ایک گولڈ میڈل یا سلور میڈل وغیرہ بھی لیتے آئیں۔ پلین تو لدا پھندا واپس آجاتا ہے لیکن اس میں دو ایک گولڈ میڈل رکھنے کی گنجائش بالکل نہیں ہوتی۔ پلین چلانے والوں کی یہ زیادتی نہیں تو اور کیا ہے کہ وہ ایک مسافر کو بیس کلو گرام سامان لے جانے کی اجازت نہیں دیتے۔"

ہم نے شرما جی کو ان کے ہونے والے داماد کے خیالات سے واقف کرایا۔ شرما جی لڑکے کی ایمان داری سے بہت خوش ہوئے اور رشتے کی بات پکّی کردی۔ چناں چہ اگلے ہفتے اس لڑکے کو کانسے کے رنگ والی لڑکی کے ساتھ ایک گولڈ میڈل ملنے والا ہے۔

ہمیں ذاتی طور پر خوشی اس بات کی ہے کہ شرما جی کی بیٹی کی شادی ہو رہی ہے لیکن دکھ اس بات کا ہے کہ ہمارے ملک میں اب کھیل ایک طرف کو جا رہا ہے تو کھلاڑی دوسری طرف کو جا رہا ہے۔ ایسا نہ کچھ چاہتا ہے۔ تماشائی کچھ چاہتے ہیں۔ کھیل تفریح فراہم کرنا چاہتا ہے اور کھلاڑی تفریح کی آڑ میں گولڈ میڈل حاصل کرنا چاہتا ہے ...... ارے گولڈ میڈل کے لیے ایسی بھی کیا پریشانی ہے۔ ہمیں اس وقت اپنی نوجوانی کے دنوں کے ایک دوست یاد آگئے جنھیں پونا یونیورسٹی میں انگریزی میں درجۂ اول میں پاس ہونے پر گولڈ میڈل ملا تھا۔ یہ خوشی کا موقع تو تھا ہی لیکن بے چارا ہمارا دوست کسی ایسے دوست کی تلاش میں مارا مارا پھرتا رہا جسے وہ خوش خبری سنا سکے۔ دن بھر میں اسے کوئی نہ ملا۔ تھک ہار کر آدھی رات کو سائیکل رکشا میں بیٹھ کر اپنے کمرے پر واپس جا رہا تھا کہ اس کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ کیوں نہ اس رکشا والے کو ہی گولڈ میڈل کے ملنے کی خوش خبری سنا دی جائے۔ اس نے بات سے بات پیدا کرنے کی خاطر رکشا والے سے پوچھا "کیوں میاں رکشا والے! کیا تمھیں زندگی میں کبھی کوئی گولڈ میڈل ملا ہے؟" رکشا والے نے کہا "دیکھو میاں ہم تو سیدھے راستے پر نظر رکھ کر ایمان داری کے ساتھ رکشا چلاتے ہیں، سڑک پر کہیں ادھر ادھر نظر نہیں تاکتے کہ کس جگہ کونسی چیز پڑی ہوئی ہے۔ وہ چاہے گولڈ میڈل ہی کیوں نہ ہو "کوہ نور" بھی سڑک پر پڑا ہوا ہو تو ہم نہ اٹھائیں اپنا گولڈ میڈل تو انھیں کو مبارک ہو جو تاک جھانک کرنے کی عادت رکھتے ہیں"۔

اس واقعہ کے بعد ہمارے دوست نے آج تک کسی کو یہ نہیں بتایا کہ انھیں گولڈ میڈل مل چکا ہے۔ کھلاڑیوں سے بھی ہماری یہ گزارش ہے کہ وہ گولڈ میڈل وغیرہ کے چکر میں نہ پڑیں، کیا رکھا ہے گولڈ میڈل میں کہ اس کی خاطر اتنی تکلیفیں اٹھاؤ، سفارش کرا کے ٹیم میں شامل ہو جاؤ، افسروں کی خوشامد کرو، خراب موسم میں اپنے اپنے جسم کو طرح طرح کی اذیتوں اور جسمانی مشقت سے گزارو کیا آپ نے فلموں میں اسمگلروں کو نہیں دیکھا کتنے آرام سے ایرکنڈیشنڈ کمروں میں رہتے ہیں اور ایک ہی دن میں اتنا گولڈ کما لیتے ہیں کہ اس سے سارے اولمپک کھیلوں کے گولڈ میڈل تیار ہو سکتے ہیں۔ آپ نے کبھی کسی اسمگلر کو گولڈ میڈل کے لیے بنیان اور نیکر پہن کر فیلڈ میں چھلانگ مارتے ہوئے دھونکنی کی طرح ہانپتے ہوئے اپنے جسم سے بغیر ٹونٹی والے پبلک نل کی طرح پسینہ گراتے ہوئے اپنے کوچ کی گالیاں کھاتے ہوئے۔ تماشائیوں کے طعنے سنتے ہوئے دیکھا ہے۔

زندگی کو صحیح ڈھنگ سے دیکھنے کی کوشش کرو تو جینے کا سلیقہ خود بہ خود آجاتا ہے پھر کھیل میں جیت اور ہار تو لگی رہتی ہے۔ ہم تو یہ مانتے ہیں کہ جو آدمی ہارتا ہے جیت اسی کی ہوتی ہے وہ نہ ہارے تو جیتے کون، ہماری مشرقی تہذیب نے تو ہارنے کو ایک فن بنا دیا ہے۔ ہماری تاریخ گواہ ہے کہ ہم نے ہر سطح پر ہارنے کے سو سو جتن کیے، بلکہ دنیا میں

جب اولمپک گیمس شروع بھی نہیں ہوئے تھے تو تب ہی سے ہم نے پوری شان وشوکت اور آن بان کے ساتھ اپنے ہارنے کے لیے پانی پت میں ایک الگ میدان ہموار کر رکھا تھا۔ کسی بھی اولمپک گیم کا ایسا شاندار میدان آج تک نصیب نہ ہو سکا۔ اب تو ہم ہارنے کے لیے دوسرے ملکوں میں جاتے ہیں۔ پہلے تو یہ سہولت ہم نے اپنے ہی ملک میں بہ نفس نفیس فراہم کر رکھی تھی۔ ہارنے کے لیے اتنے جلتی اور اتنی تپسیا کون کرتا ہے۔ ہم نہ ہوتے تو دنیا کو کیسے پتہ چلتا کہ جیت کس کو کہتے ہیں۔ اسی فلسفۂ حیات کو اپنانے کا نتیجہ ہے کہ ہم غریبی میں نام پیدا کرنے روکھی سوکھی کھا کر پڑے رہنے، صبر کے میٹھے پھل کا زندگی بھر ہنسی خوشی انتظار کرنے، مایا کی موہ سے خود کو مکت کرانے اپنے پرانوں کو جلد سے جلد تیاگنے کے لیے اتاؤلے نظر آتے ہیں۔ زندگی میں رکھا ہی کیا ہے۔ سکندر بھی اتنی ساری دنیا کو جیتنے کے بعد اس دنیا سے خالی ہاتھ ہی گیا تھا۔ آپ گولڈ میڈل تھوڑے ہی اپنے گلے میں ڈال کر لے جا سکتے ہیں۔ بعض لوگوں نے سکندر کے انجام کو دیکھا اور سمجھا ہے انھیں گولڈ میڈل کو پانے کے لیے یوں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر زندہ نہیں رہنا چاہیے۔

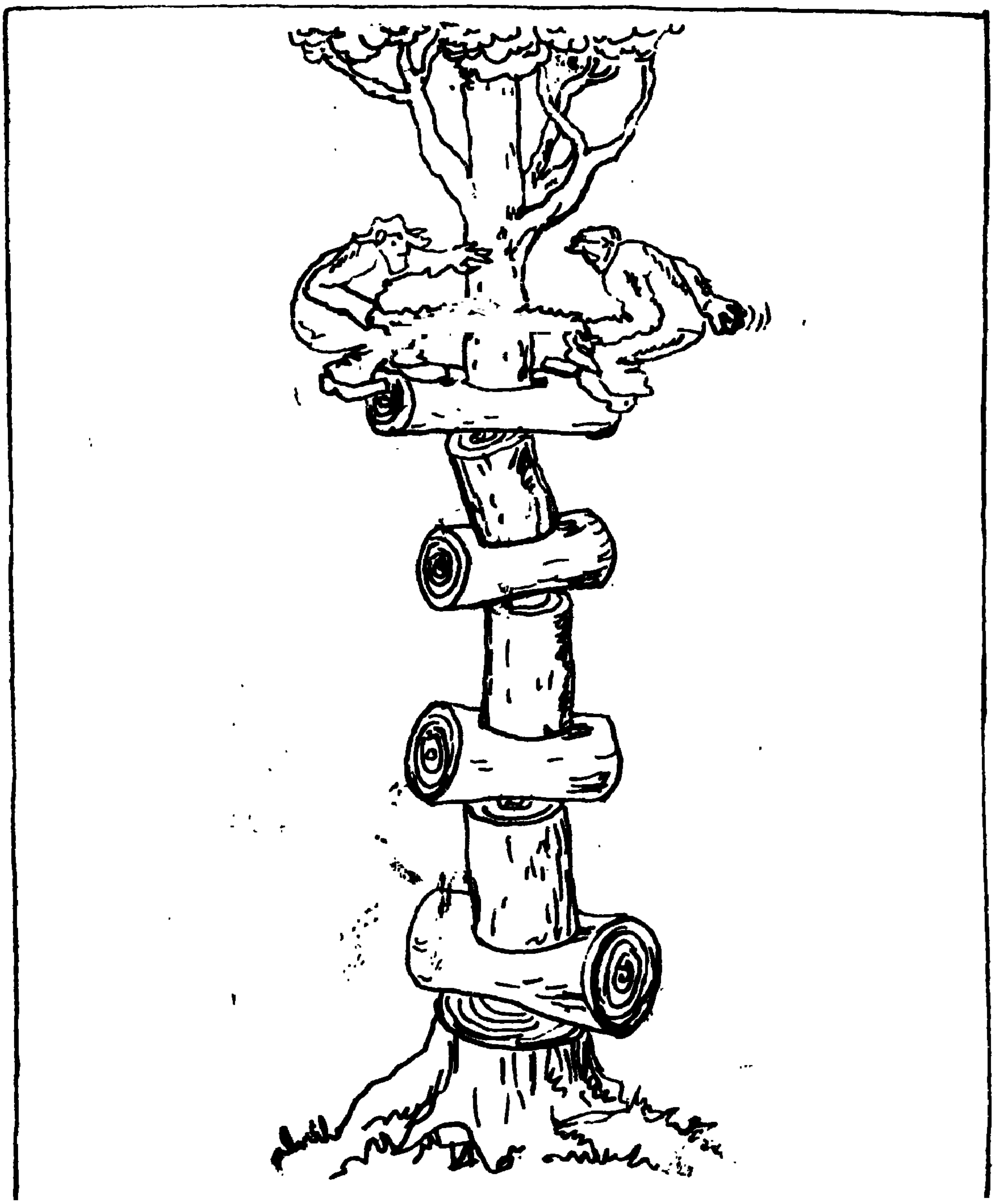
اور سو باتوں کی ایک بات یہ کہ کھیل میں ایک "اسپورٹس مین اسپرٹ" بھی ہوتی ہے جو صرف کھیلوں میں مہارت حاصل کرنے سے پیدا نہیں ہوتی بلکہ کھیلوں کو غارت کرنے سے پیدا ہوتی ہے اور ماشاءاللہ ہمارے ہاں یہ "اسپورٹس مین اسپرٹ" اتنی بھاری مقدار میں موجود ہے کہ جو لوگ اسپورٹسمن نہیں ہیں وہ بھی قدم قدم پر اس کا مظاہرہ کرتے رہتے ہیں۔ مثلاً کسی نوجوان نے کسی راہ چلتی لڑکی کو چھیڑا اور جواب میں اس لڑکی نے لڑکے کے ایک طمانچہ جڑ دیا تو یہ وہی "اسپورٹسمن اسپرٹ" ہوتی ہے جو نوجوان کے ہونٹوں پر فوراً ایک مسکراہٹ بن کر سج جاتی ہے۔

دیکھا کتنے کام کی چیز ہے یہ "اسپورٹسمن اسپرٹ" خود ہماری مثال لیجیے کہ اسی اسپورٹسمن اسپرٹ کے تحت ہم لگاتار تین برس تک میٹرک کے امتحان میں فیل ہوتے رہے لیکن پھر بھی تعلیم کے ہاتھوں ہم نے ہار نہیں مانی۔ ہمارے سماج میں یہ اسپرٹ موجود نہ ہو تو سرکاروں کا چلنا اور سرکاروں کو چلانے والوں کا چلنا دونوں ہی مشکل ہو جائیں۔ کھیلوں میں ہمارے ہارنے کی بات تو جانے دیجیے۔ یہ جاننے کے لیے کہ دنیا میں سب سے زیادہ اسپورٹسمن اسپرٹ کس کے پاس ہے اگر کوئی عالمی مقابلہ منعقد کیا جائے تو یقین مانیے اس مقابلہ کا گولڈ میڈل ہمارے سوائے کسی کو نہیں ملے گا۔ کچھ دل جلے کہتے ہیں کہ شرمندگی اور اسپورٹسمن اسپرٹ میں کوئی خاص فرق نہیں ہوتا۔ سبکی ظاہر ہو جائے تو شرمندگی کہلاتی ہے۔ ورنہ یہ ندامت، تہذیب اور مصلحت کے بوجھ تلے دب کر ظاہر نہ ہونے پائے تو اسے اسپورٹسمن اسپرٹ کہا جاتا ہے۔

پھر کھیلوں کے سلسلے میں ایک گھپلا یہ بھی ہے کہ ترقی یافتہ قومیں اپنے ہی کھیلوں کو عالمی مقابلوں میں شامل کرتی ہیں گلی ڈنڈا کو جو ہمارا قومی کھیل ہے جس کے کھیلنے کے لیے میونسپلٹیوں نے بڑے اہتمام سے جگہ جگہ خستہ حال گلیاں، ٹوٹی پھوٹی سڑکیں اور اجاڑ ویرانے بنا رکھے ہیں۔ کبھی کسی عالمی مقابلہ میں شامل نہ رکھا۔ ذرا اسے شامل تو کرلیں پھر دیکھیں امپائر اور تماشائیوں کی کیا درگت بنتی ہے۔ کبڈی بھی جو اصل میں ایک دوسرے کے کپڑے پھاڑنے کا ایک لاجواب اور دلچسپ کھیل ہے اور جس کی وجہ سے ہمارے ہاں درزیوں کا کاروبار دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہا ہے، کسی عالمی مقابلہ میں جگہ نہ پا سکا۔ معشوق کی یاد میں آسمان کے تارے گننا اور وہ بھی کسی کمپیوٹر کی مدد کے بغیر گننا ہمارا سب سے پرانا اور پسندیدہ کھیل ہے۔

ہمارے بعض محبوب اور پسندیدہ کھیل ایسے ہیں جنھیں عالمی سطح پر کبھی تسلیم نہیں کیا گیا۔ مثال کے طور پر دفتروں میں فائلوں کو نہایت سست رفتاری کے ساتھ چلانا بھی ایک دلچسپ کھیل ہے اسے بھی کوئی تسلیم نہیں کرتا۔ مقابلہ صرف تیز

رفتاری کا ہی نہیں آہستہ چلنے کا بھی ہونا چاہیے اور بھی کئی کھیل ہیں جیسے خوشامد کرنے کا آج تک کوئی عالمی مقابلہ منعقد نہیں ہوا۔ رشوت ستانی، چوربازاری، ملاوٹ اور فسادات کرانے کو بھی ترقی یافتہ قومیں کھیل نہیں مانتیں۔ یہ نہ بڑی زیادتی ہمارے ساتھ۔ کبھی کرا کے دیکھیے ان کا مقابلہ ہم اتنے گولڈ میڈل لے آئیں گے کہ دنیا میں سونے کی جتنی بھی کانیں ہیں وہ خالی ہو جائیں گی۔



رضا نقوی واہی

بارسیلونا اولمپکس

اولمپک کے کھلاڑی بارسیلونا سے جب آئے
سوائے شرمساری کے نہ کچھ بھی ساتھ آیا تھا
سبب پوچھا گیا جب ہار کا کپتان صاحب سے
ہماری وضع داری کو سمجھتے ہیں. جو بھیا ئی
ہماری وضع "قبلہ آپ پہلے" کی جو خوگر ہے
سر راہِ عمل ترکِ روایت ہم نہیں کرتے
ہماری وضع داری جب "سودیشی ریل" جنتی ہے
کمندیں ڈالتے ہیں دوسرے جب چاند تاروں پر
ہماری وضع داری میں ہے فرقہ واریت شامل
مقابل زور آور ہو تو گھٹنے ٹیک دیتے ہیں
اولمپک میں ہماری ہار، فتح وضعداری ہے
ہمیں منظور تھی جب دوسری ٹیموں کی دل داری
ذرا سی جیت کی خاطر رُخ ان کا یوں بدل جانا
یہ خودغرضی ہماری انکساری کے منافی ہے
ہمیں سونے کے تمغے کا لالچ کیوں بھلا ہوتا
خدا رکھے کہ اسمگلر ہمارے یاری یاری سے
اولمپک میں نیا ریکارڈ یوں قائم کیا ہم نے
بھلا اپنی روایت کا گلا کیوں کر دبا دیتے

نگاہیں سب کی نیچی تھیں، سبھی چہرے تھے مرجھائے
طلائی کیا نہ کانسے کا بھی تمغہ ہاتھ آیا تھا
تو چہرے کا پسینہ پونچھ کر رومال سے، بولے
انھیں مطلق نہیں قومی روایت کی شناسائی
وہی جہد و عمل کے راستے میں اپنی راہبر ہے
ٹرینیں چھوٹ جاتی ہیں یہ سبقت ہم نہیں کرتے
تو قومی زندگی کی انفرادی شان بنتی ہے
ہم اپنی وضع داری کو چلاتے ہیں کھٹاروں پر
نہ ہو یہ مشغلہ تو زندگی گزرے. بصد مشکل
مگر کمزور کو ہم ہر طرف سے گھیر لیتے ہیں
یہ وہ نکتہ ہے منطق کا جو ہر نکتے پہ بھاری ہے
سرِ میداں ہماری ٹیم اگر ہاری تو کیا ہاری
ہمیں پیچھے سے دھکے دے کے خود آگے نکل جانا
انھیں موقع دیا بڑھنے کا، بس اتنا ہی کافی ہے
خود اپنی آنکھ میں رتبہ ہمارا گھٹ گیا ہوتا
ٹنوں سونا درآمد کر رہے ہیں ہوشیاری سے
حریفوں کو خوشی کا موقع نہ کیوں دیا ہم نے
اگر ہم جیتتے تو ساکھ خود اپنی مٹا دیتے

ہماری وضع داری پہ کوئی کف در دہاں کیوں ہو
سُبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سر گراں کیوں ہو

شجر ٹکاروی (گیا)

چومکھی غزل

ڈاکیہ اک روز تجھ کو ایسا خط دے گا میاں — جس کو پڑھ کر ہوش سب ہو جائے گا ٹھنڈا میاں
چھوڑ بھی دو اس گلی میں آج سے جانا میاں — ڈر ہے گردن میں نہ پڑ جائے کہیں پھندا میاں
کوئی کچھ سمجھے نہ سمجھے میں نے تو سمجھا میاں — بات یہ سچ ہے کہ ہے کچھ دال میں کالا میاں
کچھ بتاؤ! کرتے ہو کیا آج کل دھندا میاں — دیکھتا ہوں روز کھاتے مرغی اور انڈا میاں
ایک دن میں شہر بھر میں ہو گیا چرچا میاں — واہ تم نے کام ہی کر ڈالا کچھ ایسا میاں
آپ کا قد پانچ فٹ لڑکی کا قد ہے سات فٹ — چاہیئے قد اور لے کر آیئے لمبا میاں
ہوٹلوں میں خوب ہوٹل بازیاں کرتے ہو تم — کھا رہے ہیں رنج و غم گھر میں پڑے ابا میاں

رفتہ رفتہ آگیا ہے شعر اب پڑھنا میاں — سب بڑی چھوٹی نشستوں میں چلے جانا میاں
شاعری اک باعثِ عزت بھی ہے دولت بھی ہے — دیکھتا ہے کون یہ سرقہ ہے یا صدقہ میاں
جانتا ہوں فاعلاتن لکھ نہیں سکتے ہو تم — شعر لیکن لکھ رہے ہو آج کل اچھا میاں
کہہ گئے ہیں شاعرِ ذی فہم کیا سچی لو ذرا — شاعری میں چل نہیں سکتا بہت گھپلا میاں
بات سچ کہہ دوں کہ آجائے شعورِ شاعری — رات دن سیدھا کرو استاد کا جوتا میاں
شاعرانِ علم و فن کے ساتھ مت رہنا میاں — بول ورنہ کھول دے گا ایک ہی مصرعہ میاں

چند ہی دن میں تمہیں ہونا ہے گر نیتا میاں — تو بڑے لیڈر کا بن جایا کرو چمچہ میاں
ووٹ کے موسم میں کھدّر زیب تن کر لیجیو — تاکہ چھپ جائے تمہارے ذہن کا دھبّہ میاں
الٹی سیدھی بات کو دے کر ذرا بھاشن کا روپ — بیچ چوراہے پہ جا کر کچھ نہ کچھ بکتا میاں
لیڈری میں صرف لفّاظی سے چل سکتا ہے کام — کون کہتا ہے ضروری علم کا ہونا میاں
مرحلہ جب سخت آجائے پریشانی بڑھے — ڈھونڈ لینا اک گھنے سا پیڑ کا سایا میاں

ایک دن امڈا تھا جب جذبات کا دریا میاں — آپ ہیں تیراک اچھے میں نے دیکھا تھا میاں
لوگ آ سکتے ہیں دھوکے میں تمہاری شکل سے — دے نہیں سکتے ہو تم اللہ کو دھوکا میاں
"آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں" — رکھ کے داڑھی دے رہے ہو سب کو تم چکما میاں
لسٹ چندے کی دکھانے میں بڑا نقصان ہے — بس یہی کافی ہے تم کرتے رہو چندہ میاں
چند دن کی بات ہے چہرہ شہابی تھا ترا — کیا ہوا! کیا بات ہے؟ کیوں رنگ ہے پھیکا میاں

جب کبھی ہو جنت الفردوس میں جانا میاں
سب ہی کچھ کھانا مگر گندم نہیں کھانا میاں

منظور الامین
(سکندرآباد)

سماج

سماج انسانوں سے بنتا ہے، انسان نیرنگیوں کا مرکب ہے اس لیے انسانی سماج میں بھی ان نیرنگیوں کی جھلکی کا عکس ملتا ہے۔ کہتے ہیں انسان سماجی جانور ہے، شاید یہی وجہ ہے کہ انسانی سماج جانوروں کی سی خصلت کا مظاہرہ بھی کرتا ہے، سماج کے افراد کی نیرنگیوں کی مثالیں عام ہیں۔ مثلاً جانوروں ہی کی طرح انسان اپنے آپ کو لڑائی جھگڑے کی آگ میں جھونکتے بھی ہیں اور ایک دوسرے پر بھونکتے بھی ہیں، ایک دوسرے کو جھنجھوڑتے اور ایک دوسرے کی گردن مروڑتے بھی ہیں۔ ایک دوسرے پر چنگھاڑتے بھی ہیں اور ایک دوسرے پر دھاڑتے بھی ہیں ایک دوسرے کی گرد بھی جھاڑتے ہیں اور ایک دوسرے کو چیرتے پھاڑتے بھی ہیں۔ کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے۔ جتنا میں انسان اور اس کے سماج کو دیکھتا ہوں اتنا ہی زیادہ کتے سے پیار کرنے لگتا ہوں۔

کیا آپ نے کبھی غور کیا ہے کہ جانوروں میں بھی شریف انسان ملتے ہیں مثلاً شیر کوئی انسان جب تک اس شریف ہستی پر حملہ نہیں کرتا وہ اس انسان پر حملہ نہیں کرتا" اس لحاظ سے شیر، قدیم بابل کے حکمران ہمورابی کے ضابطہ اخلاق و قانون پر عمل کرتا ہے ——— یعنی دانت کے بدلے دانت، آنکھ کے بدلے آنکھ وغیرہ۔ دوسرے لفظوں میں انسان جب شیر پر حملہ کرتا ہے تو اسے مار ڈالتا ہے، شیر پلٹ کر جب انسان پر حملہ کرتا ہے تو وہ بھی اسے ختم کر دیتا ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ انسان شیر کو مار کر اس کی کھال سے اپنے ڈرائنگ روم کی دیوار یا فرش کی زینت بڑھاتا ہے۔ جانوروں کا سماج ابھی اتنا ترقی یافتہ نہیں ورنہ شیر بھی انسان کی کھال کھینچ کر غار کی دیوار کو سجا سکتا، ذرا سوچ کر دیکھیں آپ کی اور ہماری کھال شیر کے غار میں کس قدر خوب صورت لگے گی ——— ایک خونیں کھیل میں شیر کی کرتبی، بھدی ٹرافی، انسانوں کی رنگ برنگی کھال ——— کوئی سفید، کوئی

ایک زمانہ تھا جب شیر کے شکار کے بعد شکاری سالم شیر میں بھس بھروا دیا کرتے تھے، پھر اس سالم شیر کو اپنے ڈرائنگ روم میں کھڑا کر کے اسے اپنی فتح کا سمبل بنا کر یار دوستوں کو دکھاتے تھے اور اس میں محسوس کرتے تھے، کاش سماجی ترقی اور تہذیب کی منزلیں طے کر کے شیر مذکور بھی اپنے دوست شیر دل جیالوں کے غار میں دوستانہ شام کی کاک ٹیل میں آتے، ایک فخر کے ساتھ دکھاتا کہ اُدھر غار کے مغربی کونے میں بھس بھرا انسان عبدالرحیم یا رمیش چندر یا کوٹا سنگھ ہے!

انسانی سماج کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ چیتے کی طرح گھات میں بیٹھتا ہے اور جوں ہی کوئی مخالف سامنے آتی ہے وہ جھپٹ پڑتا ہے۔ اتنی سرعت سے کہ لوگ ششدر رہ جاتے ہیں۔ سماج کو ذہن میں رکھ کر اکثر انسان کے اعضائے رئیسہ کا خیال آتا ہے۔ ساتھ ہی اعضائے غریبہ کا بھی۔ واضح ہو کہ غریبہ کی اصطلاح ہم نے "رئیسہ" کے سیاق و سباق میں وضع کرنے کی کوشش کی ہے، رئیسہ میں ہم شامل کرتے ہیں۔ ہاتھ (مس Touch) کان (سماعت) زبان (ذائقہ)، ناک (قوت شامہ) اور آنکھ (بصارت) وغیرہ کو، غریبہ میں جیسے چھنگلی، ناک کی پھننگ، پاؤں کا ٹخنہ وغیرہ۔

ہمارے کم نظر سماج کے ہاتھ میں ایک لٹھ ہوتا ہے جس کو وہ ہر طرف گھماتا رہتا ہے۔ جو انسان بچ نکلتا ہے بچ نکلتا ہے لیکن جو زد میں آجاتا ہے وہ تباہ ہو جاتا ہے۔ ہمارے سماج کا ظالم ہاتھ اگر کسی بے قصور کو چھو لے تو غریب کے لیے دنیا، جو ویسے تو بہت وسیع ہے، تنگ سے تنگ تر ہو جاتی ہے اس طرح اس مس کو ناگ مس سمجھیے جو حد سے زیادہ زہریلا اور رس بھرا ہوا ہوتا ہے ——— دوسرے لفظوں میں: اپنے ہم جنسوں کو ڈس جاتا ہے آدم زاد ناگ!

اب لیجیے سماعت کی بات تو یہ ایک جانی مانی بات ہے کہ خدا نے ہمیں کان دو دیے ہیں اور زبان صرف ایک، تاکہ ہم سنیں دگنا زیادہ اور بولیں اس کا نصف، ہمارے سماج کی شکل یہ ہے کہ وہ سنتا تو نصف ہے بولتا ہے دگنا زیادہ، جہاں تک زبان کے ذائقے کا تعلق ہے سماج غیر رس چیزوں میں بھی ذائقہ تلاش کرتا ہے۔ ایک سے پھیکے واقعہ کو بھی نمک مرچ لگا کر پیش کرنے میں سماج کے chef یا جھٹکے دار بڑی لذت لیتے ہیں اس کی ذرہ برابر بھی پرواہ نہیں ہوتی۔ جو کوئی کہتے کہ صاحب زبان تو بگڑی تھی خبر لیجیے ذہن بگڑا ہے۔ اب رہی سماج قوت شامہ کی بات تو ہم یہی کہیں گے کہ سماج کی ناک بے حد خطرناک واقع ہوئی ہے اس کی سونگھ بہت قوی ہے کئی بار تو جہاں سونگھنے کو بھی کچھ نہیں وہاں یہ سونگھ کر دکھا دیتا ہے۔ انگریزی کا محاورہ Smelling a rat یہ ہمارے سماج کے لیے ہی بنا ہے خواہ کہیں چوہا ہو یا نہ ہو ہمارا سماج یہ ہے کا ہوّا ضرور کھڑا کر دیتا ہے۔

جہاں تک آنکھ کا تعلق ہے ہمارا سماج اماوس کے گھپ اندھیرے میں آدھی رات کو ایک تیرہ و تار کوٹھری میں ایک سیاہ بلی کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے ـــ یہ سیاہ بلی دراصل وہ اپرادھی ہے جس نے کوئی جرم کیا نہ ہو مثلاً وہ بیوہ جو دوبارہ شادی کر لے سماج کو اس ناکردہ گناہ پر لعن طعن کا موقع ملتا ہے، یہ وہ سماج ہے جو کم نظر اور ضعیف البصر ہوتے ہوئے بھی سورج کا مذاق اڑاتا ہے ـــ

انسانی سماج کو ہم ایک کیکڑا بھی کہہ سکتے ہیں کہ جب وہ چلتا ہے تو یہ نہیں پتہ چلتا کہ وہ آگے جا رہا

ہے یا پیچھے، داہنے مڑے گا یا بائیں۔ پس ہمارے سماج کے بارے میں کسی قسم کی کوئی پیش گوئی کرنا ممکن نہیں۔
اب رہی سماج کے اعضائے غزنیہ کی بات تو ان کی گنتی نہ لیگاؤں میں ہے نہ بے گاؤں میں۔
ویسے یہ بات بھی بہت اہم ہے کہ ہمارا سماج بے حس ہوتا ہے۔ کسی پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑے، آفتوں کی یلغار ہو، رنج والم کے جہنم کے دروازے کھل جائیں۔ سماج کی air-Conditioned طبیعت پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ سماج سے متعلق مندرجہ ذیل کلمات ہمیں دل پسند ہیں۔

ہے سماج اس کا احترام کرو حاکمِ دہر ہے سلام کرو
بے گناہوں کو پھانسیاں دے دو شاہ راہوں پہ قتلِ عام کرو



اعجاز واثی (سنبھل)

قطعات

چندہ

وہ رہنما جو غریبوں کی پرورش کے لیے — ہزاروں لاکھوں کی تھیلی قبول کرتے ہیں
انھیں خبر نہیں شاید کہ ان کے حلقہ بگوش — غریبوں ہی سے یہ رقمیں وصول کرتے ہیں

فن کی آبرو

شاعری بھی نذر تزئین و تملق ہو گئی — دشت و صحرا کو ہوا خواہ چمن کہنے لگے
مسندیں کر بیٹھے ارباب تموّل کے سپرد — شعبدہ بازوں کو فن کی آبرو کہنے لگے

خوشامد

کام ہیرے کی کنی سے لیتے ہیں — مدّتوں مطلب کے ادھڑے سیتے ہیں
ان کا انداز خوشامد الاماں — بالغوں کے منہ میں لقمے دیتے ہیں

موقع شناسی

کتنے موقع شناس تھے مرحوم — روپ بہروپ پر ہر آن مرے
سارے پیرہن ہی بدل ڈالے — شیخ پیدا ہوئے پٹھان مرے

اک مسئلہ

اک مسئلے پہ حضرت قاید سے جب کہا — کچھ کیجیے کہ عالم اُمّید و بیم ہے
اک گھونٹ بھر کے چائے کا یوں لب کشا ہوئے — اس کو فرج میں رکھ دو وہ آئس کریم ہے

بیوپار

خلوت کا بیوپار کریں شب کو بیچ دیں — بیعانہ لیں ستارہ کا کوکب کو بیچ دیں
کچھ ایسے لوگ بھی ہیں شرافت کے بھیس میں — دنیا کو جو خرید لیں مذہب کو بیچ دیں

ابن الوقت

ملاحظہ ہو یہ قولِ جنابِ ابن الوقت — گدھے کو باپ بنالینا اک ضرورت ہے
مزہ تو جب ہے کہ حضرت سے پوچھ لے کوئی — گدھا بنانے میں والد کو کیا قباحت ہے

خودنمائی

خودنمائی میں رہا کرتے تھے مرزا پیش پیش — لیکن ان کا عقد جب اک شاعرہ سے کر دیا
اس قدر بڑھ کر ہر موقع پہ ہر تقریب میں — آپ پیچھے رہ گئے بیوی کو آگے کر دیا

یہ ہے بامبے میری جان

پرویز یداللہ مہدی

پھر دیکھ پھواریں، بارش کی

بمبئی میں یوں تو بے بھروسہ چیزوں کی ماشاءاللہ کوئی کمی نہیں۔ ایک ڈھونڈیئے "انیک" مل جاتی ہیں۔ ہم اس ذیل فہرست میں تین ناقابل بھروسہ چیزوں کو دیگر بے بھروسہ اشیاء کے مقابلہ میں مسلمہ حیثیت حاصل ہے۔

ایک عورت کی بات، دوسرے فلم والے کی ذات، تیسرے بمبئی کی برسات چنانچہ ان ارکان ثلاثہ کے آمیزے سے یہاں یہ نیا محاورہ گھڑ لیا گیا ہے کہ بمبئی میں برسات کا، عورت کی بات کا، فلم والے کی ذات کا کوئی بھروسہ نہیں۔ تینوں پر مرزا غالب کا شعر پوری طرح صادق آتا ہے۔ ؎

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکہ یہ بازیگر کھلا

البتہ اول الذکر کو ثانی الذکر اور آخر الذکر پر اس اعتبار سے فوقیت حاصل ہے کہ عورت کی بات کبھی کبھی سچ ثابت ہوتی ہے۔ فلم والے کی ذات لاکھ پردوں میں چھپی ہونے کے باوجود کہیں نہ کہیں کھل جاتی ہے۔ لیکن بمبئی کی برسات اپنی آمد جانے کا پہلے سے کچھ اتا پتا نہیں دیتی بس چھم سے آجاتی ہے اور چھما چھم برس کے عوام الناس کو غفلت میں شرابور کر دیتی ہے پانی سے نہیں ان کے اپنے پسینے سے۔ صبح میں جو شخص سوکھے چھوارے کی صورت گھر سے نکلتا ہے۔ وہ بارش کی اس اچانک یلغار کے نتیجے میں گیلے آلو بخارے کی شکل میں بھاری قدموں سے گھر واپس لوٹتا ہے۔

البتہ بمبئی کی جملہ شادی شدہ و غیر شادی شدہ دوشیزائیں بارش میں دھل دھلا کر اپنی اصل شکل میں واپس آجاتی ہیں۔ نتیجتاً شوہروں اور عاشقوں کو انھیں پہچاننے میں پہلے پہل بڑی دقت ہوتی ہے اور جب پہچان لیتے ہیں تو پھر صدمے سے بے ہوش ہو جاتے ہیں اور جو پہلے ہی بے ہوش ہوتے ہیں یا نہ شرطیہ ہوش میں آجاتے ہیں کیونکہ معمولی شکل و صورت والی حسینہ کے حسن کو کرشمہ ساز بنانے والے میک اپ کا ملمع بارش کی مہربانی سے اتر چکا ہوتا ہے۔

یہی وجہ ہے مختلف تفریحی مقامات پر مصروفِ راز و نیاز" دکھائی دینے والے بکثرت جوڑے بارش کے موسم میں قال قال ہی دکھائی دیتے ہیں اور تھوڑے بہت جوڑے دکھائی بھی دیتے ہیں تو وہ غیر قانونی نہیں، قانونی جوڑے ہوتے ہیں جو پنڈتوں، قاضیوں اور پادریوں کی باتوں میں آکر بلا سوچے سمجھے وقتی طور پر دو سے ایک تو ہو جاتے ہیں۔ لیکن شادی کے کچھ عرصے بعد ہی ایک سے پھر دو ہونے کی کوششوں میں جی جان سے لگ جاتے ہیں۔ برکھا بہار میں ان

بے جوڑ، جوڑوں کی تفریحی مقامات پر موجودگی کا سبب رومانس لڑانا نہیں بلکہ اپنی جان بچانا ہوتا ہے کیونکہ ان کی رہائش گاہوں کی حالت اس قدر مخدوش ہوتی ہے کہ بارش میں ان کے ڈھ جانے کا پورا پورا اندیشہ ہوتا ہے۔ لہٰذا اپنی عافیت کی خاطر یہ مجبور و لاچار جوڑے کھلے میں چلے آتے ہیں یوں بھی کسی عمارت کے ملبے کے نیچے دب کر مرنے سے بارش میں بھیگ کر جان دینا زیادہ بہتر ہوتا ہے۔

اس سے ایک فائدہ تو یہ ہوتا ہے کہ لاش پوری طرح مسخ نہیں ہوتی۔ دوسرے متعلقین کو لاش کی شناخت کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔ ان جوڑوں کے علاوہ کچھ چھڑے بلکہ چھٹے ہوئے افراد بھی اس بھیگے ہوئے موسم میں بھیگی بلیوں کی طرح تفریحی مقامات کے اطراف و اکناف منڈلاتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان ارباب ذوق کو بھیگنے سے زیادہ "پھسلنے" کی تمنا بھری برسات ان گھروں کی محفوظ چار دیواری سے کھلی پھلواری میں کھینچ لاتی ہے۔

چنانچہ یہ چکنے گھڑے بارش کی پھسلن سے بچتے بچاتے چکنے چہروں کی پھسلن پر خوشی خوشی پھسلتے ہیں، پھسلتے ہی چلے جاتے ہیں۔ بقول نظیر اکبر الہ آبادی۔ ؎

کیچڑ سے ہر مکاں کی تو بچتا بہت پھرا
پر جب دکھائی دی کھلے بالوں کی اک گھٹا
بجلی بھی چمکی حسن کی مینہ برسا ناز کا
پھسلن جب ایسی آئی تو پھر کچھ نہ بس چلا
آخر کو واں نظیرؔ بھی آکر پھسل پڑا

ایسا نہیں ہے کہ بمبئی میں صرف پھسلن کے شوقین چھڑے چھانٹ افراد اور مخدوش کھولیوں میں زندگی کے دن پورے کرنے والے مجبور جوڑے ہی بارش کے موسم میں اپنا زیادہ تر وقت زیر آسماں بتاتے ہیں متوسط اور نچلے متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے بے شمار افراد اور لاتعداد جوڑے جن کی رہائش گاہیں اتفاق سے پکی اور محفوظ ہوتی ہیں وہ بھی اس موسم میں سڑکوں گلیوں، شاہراہوں پر چہل قدمی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ کیونکہ بمبئی میں گھر سے باہر نکلے بغیر کام نہیں چلتا۔ یہ اور بات ہے کہ کسی کو روٹی روزی کا چکر گھر سے باہر لے آتا ہے تو کسی کو مس روزی کا جلوا۔ جو لوگ روٹی روزی کے چکر میں گھر سے باہر نکلتے ہیں۔ وہ اپنی گردش پوری کرکے بھیگتے بھاگتے، واپس اپنے محور پر لوٹ آتے ہیں۔

لیکن مس روزی کے شکار اس راکٹ کی مانند بھٹکتے رہتے ہیں جو کسی تکنیکی خرابی کے باعث اپنے مدار پر کبھی واپس نہیں آتا۔ سدا خلاؤں میں چکراتا رہتا ہے۔ یہی نہیں کچھ عقل کے اندھے تو بارش کے نان اسٹاپ سلسلے کا مین سوئچ (MAIN SWITCH) گھٹاؤں میں ڈھونڈھنے کی بجائے مس روزی کی زلفوں میں تلاش کرتے ہیں۔ بطور دلیل کے طور پر یہ شعر پیش کرتے ہیں۔ ؎

کس نے بھیگے ہوئے بالوں سے یہ جھٹکا پانی
جھوم کر آئی گھٹا، ٹوٹ کے برسا پانی

کبھی کبھی کسی شعر کی غلط تشریح ترسیل کا المیہ پیدا کر دیتی ہے اور یہ اس کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ مس روزی کے مداحوں کو یہ پتہ ہی نہیں کہ صرف وہی بال گھٹاؤں کا نعم البدل ہوتے ہیں جو سر سے کمر کے نیچے تک پھیلے ہوتے ہوں۔

ان ہی میں پانی کا ذخیرہ جمع کرنے اور پھر جھٹک دینے کی صلاحیت پائی جاتی ہے۔ جبکہ مسز موزی کا باب کٹ بہرحال
کسی صورت اس کا متحمل نہیں ہو سکتا۔
بلکہ سچائی تو یہ ہے کہ "باب کٹ" بالوں کو جھٹکنے پر پانی نہیں پریشانی و پشیمانی ٹپکتی ہے۔ بارش کے چھینٹوں اور
چھیڑخانیوں سے کماحقہ' لطف اندوز ہونے کے لئے برسات میں بھیگنا اور پھسلنا ضروری ہے۔ پھر بھی کچھ نادان لوگ اپنے
فلیٹوں کی کھڑکیوں اور بالکنیوں میں کھڑے ہو کر دور ہی سے بارش کا نظارہ دیکھ کر لطف اندوز ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسے
ناسمجھوں کو محفوظ فاصلے سے محظوظ ہوتا دیکھ کر بارش کی بوچھار میں بھیگتے ہوئے عوام الناس، دل ہی دل میں یہی دعا کرتے ہیں

اے موجِ ہوا ان کو بھی ذرا، دو چار تھپیڑے ہلکے سے
کچھ لوگ فقط کھڑکی میں کھڑے بارش کا نظارہ کرتے ہیں

ارسطو اور مزاح —— نئی تحقیق

ارسطو کی "بوطیقا" کے پہلے حصے سے

اسکالرز تو صدیوں سے واقف ہیں جس کے پیش لفظ ہی میں ارسطو نے واضح کر دیا تھا کہ وہ کامیڈی یا طربیہ سے اپنی کتاب کی دوسری جلد میں بحث کرے گا لیکن کوئی نہیں جانتا تھا کہ یہ کتاب اس نے لکھی بھی تھی یا نہیں۔ یہ بھی شبہ کیا جاتا رہا کہ قرون وسطیٰ کے عیسائی پادریوں نے اس کو تباہ بھی کر دیا ہو وہ لوگ مزاح، طربیہ اور طنز کے سخت مخالف تھے۔ حال ہی میں ایک فرانسیسی اسکالر پروفیسر رچرڈ جانکو کو پیرس کی ایک لائبریری میں ایک مخطوطے کے کچھ حصے ملے ہیں جو دسویں صدی میں ایک عیسائی راہب کی تصنیف ہے۔ جس نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ یہ اوراق ارسطو کی شہرۂ آفاق کتاب بوطیقا کی دوسری جلد کے کچھ حصے ہیں۔ فرانسیسی اسکالر جانکو کہتا ہے کہ مخطوطے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ارسطو مزاح کو تکلف پسندی اور اقتدار کے خلاف ایک اہم ہتھیار سمجھتا تھا۔

غزل

منہ پھٹ ناگپوری

ہم کوی سمیلنوں میں کیا گئے ۔۔۔ گھر کے بچّے بھیروں پر آ گئے
چار جن کے پاس ہیں وہ بھی ہیں کیا ۔۔۔ ایک ہی بیوی سے ہم گھبرا گئے
لڑکیاں لڑکے بنیں لڑکے لڑکیاں ۔۔۔ لوگ اس تہذیب سے گھبرا گئے
آپ بس مسکا لگاتے رہ گئے ۔۔۔ پانے والے منتری پد پا گئے
ان کو بھاتی ہیں خوشامد خوریاں ۔۔۔ بات جب سچی کہی بھنا گئے
اپنے چہرے کے مہاسے دیکھ کر ۔۔۔ آئینے کے سامنے چکرا گئے
کیوں نہ اپنے سر کو پیٹے وہ غریب ۔۔۔ جس کے گھر میں سالی سالے آ گئے
ہے یہی اپنی صحت مندی کا راز ۔۔۔ ہم نے کتنے ہی ادارے کھا گئے
اک نہ اک رونق رہی گھر میں مرے ۔۔۔ بھائی آئے ان کے جب چاچا گئے
بھاڑ جھونکی ہم نے منہ پھٹ عمر بھر ۔۔۔ لوگ دو غزلیں سنا کے چھا گئے

انعام ۔۔۔ اسماعیل ظریف (حیدرآباد)

۱

امتحاں کے بعد اک لڑکے نے پوچھا باپ سے
درجۂ اوّل سے ، گر ہو جاؤں گا میں کامیاب
اس خوشی میں آپ کیا دیں گے مجھے انعام میں
کامیاب ہو جاؤ گے سائیکل دلا دی جائے گی
فیل گر ہو جاؤ گے رکشا دلا دوں گا تمھیں

٥

مشورہ

کہا لڑکے نے اپنی منچلی محبوب سے اک دن
میں کرنا چاہتا ہوں مشورہ شادی کے بارے میں
شریک زندگی میں ایسی لڑکی کو بناؤں گا
جو جھاڑو تک لگا سکتی ہو گھر میں اپنے ہاتھوں سے
کہا لڑکی نے یہ سن کر بہت اچھا ارادہ ہے
خیالات اور جذبات بے شک ہیں بہت اچھے
تمھیں کل ہی ملا دوں گی میں اپنی نوکرانی سے

٥

فرحت زیدی
(الٰہ آباد)

کلچر کا مظاہرہ

بھارت کی ٹیم بارسلونا کو جب گئی
یوں تو کھلاڑی اپنے چنندہ تھے سب کے سب
اچھے کھلاڑیوں کی نہیں ملک میں کمی
چننے کے واسطے ہیں بہت سی کمیٹیاں
اسّی کروڑ لوگوں کا اپنا یہ دیس ہے
کچھ تو کھلاڑی اچھے تھے اور آزمودہ تھے
کچھ بھی ہو چن چنا کے بنی اک بھلی سی ٹیم
جانے سے پہلے مل لیے کچھ لیڈروں سے بھی
القصّہ یہ نمائندے بھارت وشال کے
دیکھا وہاں پہنچ کے کہ دنیا کے سارے دیس
آئے ہیں سب مقابلہ کرنے کے واسطے
مقصد سبھی کا ایک ہے یعنی مقابلہ
امریکہ کی ہے ٹیم کہ جم غفیر سا
یوں ہاتھ کھول خرچ کرے ہے وہی جناب
مل جل کے چند ملکوں کی تھی کھچڑی ٹیم بھی
لگتا تھا جیسے آئے ہوں یہ کوہ قاف سے
اک ٹیم جس میں گورے بھی تھے اور کالے بھی
پر ان کے ایٹی کیٹس نے خود ہی بتا دیا
صنعت گروں کے ملک کا یوں تھا مظاہرہ
جاپان سے یا جرمنی سے جو بھی آئے تھے
المختصر خصوصیتیں سب کی تھیں عیاں
بھارت کی کوالٹی ہے وہ کون سی ایسی پائندہ

کچھ تمغے جیت لائے گی سب کو امید تھی
مت پوچھیے کہ کیسے ہوئے تھے وہ منتخب
گیارہ جو ڈھونڈ ملتے ہیں گیارہ ہزار بھی
معیارِ انتخاب الگ سب کے بے گماں
معیار کا یہ فرق تو ہے نیچرل سی شئے
کچھ کے رسوخ تگڑے تھے کچھ اجمودہ تھے
اسّی کروڑ لوگوں کی مظہر منی سی ٹیم
اخبار اور رسالوں کے ایڈیٹروں سے بھی
سینہ کو سدھارے بڑی آن بان سے
یکجا ہوئے ہیں گو کہ ہے الگ سب کی بولی بھیس
دنیا کو امن و پیار سے بھرنے کے واسطے
لیکن خصوصیت ہے سبھی کی جدا جدا
کتنا کثیر خرچ ہوا ہوگا ملک کا
جس کی گرہ میں دام ہوں بے حد و بے حساب
جس کے کھلاڑیوں کی صحت ایسی ٹھیک تھی
بکھرے ہوئے شگوفے تھے مرحوم روس کے
پہچان میں نہ آتی تھی مخلوط ایسی تھی
یورپ کی سرزمیں سے تھا ان کا واسطہ
ہر فرد اپنے دیش کا تھا اشتہار سا
اک کیمرہ وہ بھی ساتھ لائے تھے
تب انڈیا کے لوگوں نے بھی سوچا ناگہاں
اپنی خصوصیات کی جو ہو نمائندہ

کرنے پہ غور دھیان میں آیا معاملہ — کلچر ہمارے ملک کا سب سے عظیم تھا
ایثار، پیار، دوست نوازی خلوصِ دل — کلچر میں اپنی تھیں یہ سبھی چیزیں مشتمل
کرنا ہے ان خصوصیتوں کو اب آشکار — اپنا ہر اک عمل بنے کلچر کا اشتہار
ہاکی ہو، ملکھ بازی ہو، کشتی کہ آرچری — شوٹنگ ہو، ٹینس ہو یا پھر بازی ریس کی
دو چار راؤنڈ کھیلی سبھی کھیل اپنی ٹیم — لیکن بالآخر ہوتی گئی فیل اپنی ٹیم
سطحی نظر کے لوگوں نے ناکام کہہ دیا — کلچر کے جو دھنی ہیں وہ بولے کہ مرحبا
اخلاص، پیار، دوستی کیا ہے دکھا دیا — اخلاص کا زمانے میں سکّہ بٹھا دیا
ہاکی ہو یا ہو ریس یا کوئی مقابلہ — بھارت نے اک مظاہرہ ایثار کا کیا
کچھ تو تکلّفات کی خو بو سبھی میں تھی — ممکن ہے ان میں لوگ ہوں کچھ لکھنؤ کے بھی

بولے کہ "دل دکھانا ہے کلچر میں اپنے پاپ
گر جیتنا ہی ٹھہرا، تو سرکار پہلے آپ"

اُلّو

مغربی ہو کہ مشرقی اُلّو — دن میں ملتا نہیں کبھی اُلّو
آپ اگر دیکھنا ہی چاہیں تو — دیکھ سکتے ہیں دن میں بھی اُلّو
کوئی اُلّو کبھی بشر نہ بنا — روز بنتے ہیں آدمی اُلّو
چاہے ایران میں رہے برسوں — پڑھ نہیں سکتا فارسی اُلّو
ایک اُلّو بتا گیا ہم کو — کر نہیں سکتا شاعری اُلّو
اس کے پٹھّے کہاں کہاں پر ہیں — یہ بتاتا نہیں کوئی اُلّو
کام اپنا اگر بنانا ہے — ڈھونڈیئے آپ بھی کوئی اُلّو
آج پھر وہ جگہ ہوئی گلزار — بولتے تھے جہاں کبھی اُلّو

میں نے رحمانؔ جب یہ شعر پڑھے
داد دینے لگے سبھی اُلّو

رحمانؔ ربّانی
(کانپور)

خلش جعفری (بمبئی)

....جیسے گنگا نہا لیے!

ہم گنگا اشنان کرنے بنارس نہیں گئے تھے وہ ہمارا پہلا پڑاؤ تھا، وہاں سے ہمیں برلا جی کی صنعتی نگری رینوکوٹ جانا تھا۔ پلیٹ فارم پر اتر کر ابھی ہم سیڑھیاں چڑھ ہی رہے تھے کہ وہ پتہ نہیں کہاں سے ایک ان جان میزبان کی طرح نمودار ہوا۔ اور صاحب کہہ کر اس نے ہمارے ہاں سے بریف کیس اُچک لینے کی کوشش کی لیکن بریف کیس ہم اس کے تو کیا کسی حقیقی رشتے دار کے حوالے بھی نہ کرتے کہ اس میں ہمارا سارا "زادراہ" بند تھا۔ ہم ابھی سوچ ہی رہے تھے کہ بنارس تو کیا ہمارا دور دراز کا بھی کوئی رشتے دار نہیں کہ خود اس نے ہماری مشکل حل کر دی! صاحب میں آپ کو بنارس کے پانڈوؤں سے بچانا چاہتا ہوں، میری ایک چھوٹی سی ٹیکسی ہے۔ آپ جس وقت اور جہاں چاہیں میرے ساتھ چلیں جو کچھ مجھے دے دیں گے قبول کر لوں گا اب کون ہے جو اس کی شرافت کا قائل نہ ہو جاتا، سو ہم بھی ہو گئے اور ہمارے رسمی اقرار کے بغیر ہی اس نے خود کو ہمارا گائیڈ اور ٹیکسی ڈرائیور مقرر کر ڈالا!

بنارس میں دو روز کے قیام کے بعد جب ہم رینوکوٹ روانہ ہو رہے تھے اس وقت ہمیں اپنے بے وقوف بن جانے کا احساس ہوا! حیرت تو خیر نہیں ہوئی سخت غصہ اس بات پر آیا کہ آخر ہم اتنی آسانی سے کیسے بے وقوف بن گئے۔ پھر یہ سوچ کر غم و غصہ دونوں پی گئے کہ ایسا پہلی بار تو نہیں ہوا تھا! اس وقت سے اب تک گنگا میں "لاکھوں مکعب فٹ پانی بہہ" چکا ہوگا لیکن آج تک یہ بات ہمارے پلے نہیں پڑی کہ دو روز تک صبح و شام ہمیں بنارس کی سیر کرانے والے کا نام ہم نے آخر کیوں نہیں پوچھا اور اس پر بھی حیرانی ہے کہ خود اس بندۂ خدا نے بھی ہمارا نام دریافت کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی! سچی بات تو شاید یہی ہے کہ بے وقوف بن جانے والے لوگوں کے نام ہوا ہی نہیں کرتے! بھولی بھالی شکل، گورے رنگ کا وہ نوجوان اب بھی کبھی کبھار خواب میں درشن دے جاتا ہے۔

خدا بھلا کرے اس ٹکٹ کلکٹر کا جو الہ آباد سے بنارس تک ہمارا ہم سفر تھا۔ بنارس میں ہمارے قیام کا مسئلہ اس نے یہ کہہ کر چشم زدن میں حل کر دیا کہ سر ریلوے کے ریٹائرنگ روم میں چلے جائیں، بہت عمدہ ہیں۔ ریلوے کے ساتھ بہت عمدہ کی صفت سن کر یقین نہیں آیا تو اس نے پھر زوردار سفارش کی، جا کر دیکھ تو لیں سر! اگر آپ اوّل درجے یعنی فرسٹ کلاس میں سفر کریں تو ریلوے کے سارے عملے کے نزدیک آپ خود بہ خود معزز بن جاتے ہیں۔ سفر کے اختتام تک سر بنے رہتے ہیں! خیر تو جب ہمارے خود ساختہ گائیڈ اور سرخ وردی والے قلی نے ہم کو ہمارے مختصر سے سامان کے ساتھ ریلوے کے ریٹائرنگ روم میں "ڈپازٹ" کر دیا تو بڑی حیرت انگیز مسرت ہوئی۔ صاف ستھرا کشادہ کمرہ، نرم نرم گدّوں والا ڈبل بیڈ، گھنٹی کا بٹن دباتے ہی خدمت گار حاضر اور کرایہ صرف بیس روپے یومیہ! ہم بے حد خوش کہ بمبئی سے بنارس تک فرسٹ کلاس میں سفر کی جو عیاشی کر چکے ہیں اس کی تھوڑی سی تلافی یہاں قیام سے ہو جائے گی۔ پھر معاً خیال آیا کہ یہ سب کچھ شریمان کملاپتی ترپاٹھی کی "نوازش" ہے۔ وہ ریل منتری رہ چکے ہیں (اب آنجہانی ہو چکے) بہت ممکن بنارس کو یہ ان ہی کی دین ہوگی، ہر ریل منتری کا آخر کچھ فرض منصبی تو ہوتا ہے اسے اپنے حلقے میں کچھ نہ کچھ تو کروانا پڑتا ہے، سنا ہے جب مادھو راؤ سندھیا ریل منتری تھے اور ان کی بیٹی کی شادی ہوئی تو انھوں نے گوالیار کے ریلوے اسٹیشن کو کا دلہن بنا دیا تھا۔! ترپاٹھی تو بنارس کے پنڈت تھے۔ انھوں نے وارانسی کی زیارت اور گنگا اشنان کے لیے آنے والے زائرین کے لیے ایک عمدہ آرام گھر تعمیر کر دیا تو لوگوں نے انھیں دعائیں ہی دی ہوں گی۔ ہم نے بھی انھیں دعا دی اور ہماری اہلیہ محترمہ تو اس بندوبست پر اس قدر خوش ہوئیں کہ کہنے لگیں، اب آٹھ دس دن اور یہیں قیام کریں گے! آخر خواتین خانہ بھی تو صبح و شام چولھے چکی اور برتن بھانڈوں کی فکر سے کبھی کبھار آزاد ہونا چاہتی ہیں!

ٹیکسی والے کو شام پانچ بجے کا وقت دیا تھا لیکن وہ ساڑھے چار بجے ہی سے کمرے کے باہر کھڑا ریٹائرنگ روم کے ملازم سے "تبادلۂ خیالات" کر رہا تھا۔ شاید اس کی ٹوہ لینا چاہتا ہو کہ بمبئی سے آنے والی 'مرغی' کتنی موٹی ہے۔ اس کا اندازہ خدمت گاروں سے زیادہ صحیح اور کون لگا سکتا ہے۔ وہ صاحب کے ہر بل ہی سے نہیں ان کی ہر حرکت سے ان کی حیثیت کا اندازہ لگا لیتے ہیں!

اس کی ٹیکسی ۱۹ ویں صدی کی لگتی تھی جس میں ہارن کے طور پر ربر کا بڑا سا بھونپو لگا ہوا تھا۔ بھونپو کی آواز سے راہگیر چونکتے بھی اور بدکتے بھی تھے! سب سے پہلے وہ ہمیں ایک قدیم مندر لے گیا۔ یہ ایک چھوٹے سے تالاب کے کنارے واقع تھا۔ بائیں جانب اس کی جو سیڑھیاں تالاب کے پانی کو چوم رہی ہیں ان پر کافی کے کچھ سپاہی چپ چاپ بیٹھے تھے۔ (راما نند ساگر کی رامائن کا شکریہ جس نے ہمیں راشٹر بھاشا کے بہت سے الفاظ سکھا دیئے ہیں) تھوڑی دیر ہم ان کو اور وہ ہمیں دیکھتے رہے۔ آج تک یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ بندر کو دیکھ کر حضرت ڈارون کی یاد کیوں آجاتی ہے اور یہ بات بھی سمجھ میں نہیں آتی کہ بندروں کا ارتقائی عمل آخر رک کیوں گیا؟ بس یہ سوچ کر اطمینان سا ہو جاتا ہے کہ ہمارے یہاں انسان نما بندر بھی تو بڑی تعداد میں موجود ہیں جو ۲۰ ویں صدی کے آخری عشرے میں بھی ارتقائی عمل سے نہیں گزر سکے!

پوجا استھل پر ایک کم سن پنڈت پوجا کی تھال لیے ہمارے استقبال کے لیے تیار بیٹھا تھا اور مندر کے دروازے پر پوجا کے سامان برائے فروخت کے ساتھ ایک اور پنڈت براجمان تھا ـــــ مورچہ نشین زائرین کو

دیکھ کر ان دونوں کے چہرے تمتمانے لگے تھے لیکن جب ہم نے قدم آگے بڑھائے ہی نہیں تو وہ دونوں ہمیں گھورنے لگے ہم ان کی اور بندروں کی نظروں کی تاب نہ لا سکے اور فوراً گاڑی میں سوار ہو گئے۔ گائیڈ کے لیے اشارہ تھا کہ ہم مندر میں پرویش کے بجائے آگے بڑھنا چاہتے ہیں؛ اس وقت بے ساختہ میر کا ایک شعر یاد آ گیا ؎

میر کے دین و مذہب کو پوچھتے کیا ہو ان نے تو
قشقہ کھینچا، دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

کیا میر نے کسی ایسے ہی مندر کے خوابناک نظارے کے بعد یہ شعر کہا ہوگا؟ ہماری مشکل یہ تھی کہ ہم اس موضوع پر نہ اپنے گائیڈ سے اور نہ ہی اہلیہ محترمہ سے کچھ کہہ سن سکتے تھے۔

کچھ دیر گاڑی بنارس کی بھری پری سڑک اور بارونق بازاروں میں گھومتی پھرتی رہی اور پھر ایک کشادہ سڑک پر ایک عظیم الشان عمارت کے سامنے رک گئی! اتر کر دیکھا تو یہ بھی ایک مندر تھا —— عظیم الشان برلا مندر۔ اس کی شان دیکھنے اندر گئے تو زائرین کا بڑا ہجوم تھا اور ہر مرد و زن اپنے اپنے لیے کچھ نہ کچھ مانگ رہا تھا! پتہ چلا یہ کئی منزلہ برلا مندر ہے —— برلا جی کو کارخانے اور مندر تعمیر کروانے کا بڑا شوق ہے ایک عدد تو انھوں نے رینوکوٹ کے قریب جنگل میں تعمیر کروا رکھا ہے۔ کیوں نہ ہو ان جیسے خوش نصیب ہی دین و دنیا دونوں کا ثواب دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہے ہیں! وہاں سے باہر نکلے تو ہم نے صاف صاف کہہ دیا کہ اب کوئی مندر نہیں، بس سیدھے گنگا کے گھاٹ پر جائیں گے۔ گنگا تو ہر وقت گنگا ہی رہتی ہے۔ وہاں سے دونوں جانب کئی گھاٹ نظر آ رہے تھے۔ پرانے زمانے میں شاید لوگ ان مختلف گھاٹوں کا پانی پی کر ہی گھاٹ گھاٹ کا پانی پینے کی سند حاصل کیا کرتے ہوں گے —— ہر جگہ غوطے لگانے اور پوجا کرنے والوں کا ہجوم تھا۔ کچھ پانڈوں نے ہمیں بھی گھیرنے کی کوشش کی لیکن ہم نے مسکرا مسکرا کر نہایت نرم و سرد لہجے میں ان کی خدمات حاصل کرنے سے انکار کر دیا اور گھاٹ کی اوپری سیڑھیوں پر بیٹھ کر بڑی دیر تک گنگا کے آزاد اور شانت پانی کو اور اس پر بہتی ہوئی سبک رفتار کشتیوں اور ان میں سے بعض بعض میں بیٹھی ہوئی گوری گوری میموں اور صاحبوں کو دیکھتے رہے۔

صبح بنارس دیکھنے کا تہیہ کر کے سوئے تھے اس لیے جلدی اٹھ گئے، صبح کے وقت تو یہ عالم تھا کہ گھاٹ جانے والی سڑک پر موٹر کا گزر ممکن نہیں تھا اسے فاصلے پر ہی چھوڑ دینا پڑا۔ زائرین کے ہجوم اور پانڈوں کی یلغار سے بچتے بچاتے گھاٹ کی سیڑھیوں پر پہنچے تو ہمارے گائیڈ نے کہا، سر آپ کے لیے چڈی لایا ہوں۔ اس طرف کو آ کر اسے پہن لیں اور گنگا اشنان کر لیں۔ پھر اس نے کہا..... ماں جی آپ..... میں نے اسے سمجھایا کہ ٹھنڈے پانی میں ڈبکیاں لگائیں تو بخار آ جائے گا! اسے بڑی مایوسی ہوئی —— اس سے بھلا ہم یہ کیسے کہتے کہ کئی صدیوں سے کروڑوں لوگ گنگا میا میں اپنے کردہ اور ناکردہ گناہوں کو دھوتے رہے ہیں اور بیسویں صدی میں اس کے ساحلوں پر جتنی صنعتی ترقی ہوئی ہے اس کی ساری غلاظت بھی اس کے وسیع دامن میں ڈال دی گئی ہے جس کے باعث اب مقدس گنگا بھی اس قدر آلودہ ہو چکی ہے کہ سرکار کو اس کی صفائی کروانا پڑ رہا ہے۔

ہم نے اپنے گائیڈ کو اس کے حال پر چھوڑ دیا اور چھوٹی سی کشتی میں بیٹھ کر گھنٹہ بھر سیر دریا کرتے رہے! اس شام ہم نے ہندو یونیورسٹی دیکھی۔ طویل طویل رقبے پر عمارتوں کا ایک طویل طویل دو رویہ سلسلہ، درمیان میں ہرے بھرے پودے، پیڑ، سبزہ..... افسوس اس کا تھا کہ یونیورسٹی بند تھی۔ اس کے آخری سرے پر پہنچے تو ایک چھوٹے سے خوب صورت، بہار نو سے معمور ایک عدد مندر..... وہاں بھی موجود.....! وہاں سے لوٹ رہے تھے تو ایک عمارت پر

شطرنج کے کھلاڑی کا بورڈ آویزاں دیکھا۔ موقع کو غنیمت جانا، گاڑی رکوائی اور معلوم کیا کہ ٹکٹ مل رہے ہیں تو پتہ چلا کہ نہ صرف مل رہے ہیں بلکہ رعایتی داموں پر! ٹکٹ خرید کر اوپر گیلری میں پہنچے تو دیکھا کہ ہماری ہی طرح کے آٹھ دس اور باذوق بیٹھے ہوئے ہیں فلم دیکھ کر مزہ آیا لیکن یہ دیکھ کر کوفت ہوئی کہ بنارس نے پریم چند اور ستیہ جیت رے دونوں کی کچھ زیادہ قدر نہیں کی۔

تیسرے دن صبح سامان ٹیکسی میں لاد کر پہلے مدن پورہ گئے، یہ بنارسی ساڑیوں کا مرکز ہے۔ ہمارے گائیڈ پہلے ہی سے ایک "کرخندار" کو جانتے تھے، ان کا کارخانہ دیکھا اور پھر دکان میں انھوں نے ہمارے سامنے ساڑیوں کا جو انبار لگانا شروع کیا تو اہلیہ محترمہ تو ان میں غرق ہو گئیں، ہم شرم سے پسینہ پسینہ کہ خریدنے کے نام پر دو ایک سے زیادہ کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ خدا خدا کر کے دو ساڑیاں پسند کی گئیں اور قیمت بھی کسی طرح طے پا گئی۔ اب جو وہاں رقم کی ادائیگی کے بعد بس اسٹانڈ پہونچے تو پتہ چلا کہ رینوکوٹ کی بس کب کی جا چکی ہے۔ دوسری اور آخری بس دوپہر کے بعد کسی وقت جائے گی۔ ہمارے گائیڈ کو تو بس کی روانگی کا وقت بھی نہیں معلوم تھا، ہم اس پر بری طرح خفا ہوئے اور وہ رونی صورت بنا کر معذرت کرتا رہا، ریلوے کا رٹائرنگ روم اب ملنے سے رہا۔ ہم ٹکٹ کہاں سے لائیں گے کیسی معقول ہوٹل میں پچاس، پچھتر سے کم پر کیا کمرہ ملے گا۔ اتنے ہی کھانے پینے پر صرف ہو جائیں گے اور پھر مزید ایک دن کے لیے ہم ٹیکسی والے کے اسیر ہو کر رہ جائیں گے۔ لہٰذا پرائیویٹ ٹیکسی کے متعلق دریافت کروایا تو وہ دو مسافروں کے انتظار ہی میں تھی اس سے معاملہ طے پا گیا۔ اب سب سے آخر میں ٹیکسی والے کا حساب کرنا تھا۔ کہاں تو اس نے دو روز تک زبان بھی نہیں کھولی تھی اب جو منہ پھاڑا تو ہمارے پیروں تلے زمین کھسکتی دکھائی دی۔ اگر یہ ذات شریف مناسب رقم لینے کو تیار نہیں ہوتے اور انھوں نے بھرے بس اسٹانڈ پر تکرار شروع کر دی تو "عزت سادات" خاک میں مل جائے گی۔ اہلیہ محترمہ کو تو اس کی بھنک بھی نہیں پڑنی چاہیئے۔ لہٰذا ہم انھیں بس اسٹانڈ کے کینٹین تک لے گئے ان کی خدمت میں ایک پیالی چائے پیش کی اور کسی نہ کسی طرح بس چوک جانے کی غلطی ان کے سر منڈھ کر ان کی مطلوبہ رقم سے تقریباً نصف پر معاملہ طے کر کے ان سے پنڈ چھڑایا اور جب رینوکوٹ جانے والی پرائیوٹ ٹیکسی میں سوار ہوئے تو ایسا محسوس ہوا جیسے گنگا نہا لیے۔

••

سید رحیم الدین توفیق
(حیدرآباد)

گھڑی میں لاگا چور

صبح صبح اچانک آنکھ کھلی تو یہ الفاظ کان میں پڑے۔ "تیری گھڑی میں لاگا چور مسافر جاگ ذرا" ہم بڑبڑا کر اٹھ بیٹھے دیکھا تو تمام "گھڑیاں" صحیح سلامت تھیں۔ دراصل آج کل ایسے خطرناک چور پیدا ہو گئے ہیں کہ لوگ خواب میں بھی چونک اٹھتے ہیں۔ جب نیند کا خمار ٹوٹا تو پتہ چلا کہ یہ ریڈیو سیلون ہے اور پرانے فلمی گیتوں کا پروگرام چل رہا ہے واہ کیا گاتا ہے۔ کتنی گہری اور سچی بات کہی ہے۔ کہنے والے نے اب کہاں ہیں۔ ایسے بامقصد گانے جو نصیحت سے دل بہلائیں یا دل بہلاتے ہوئے نصیحت دیں۔ دل بہلائی دل بہلائی اور نصیحت کی نصیحت۔ اس گانے میں مسافر کو اس چوری کی اطلاع دی گئی ہے جو رفتہ رفتہ ہوتی ہے۔ گھڑی میں مال کم ہوتا جاتا ہے اور مسافر کو خبر بھی نہیں ہوتی کہ وہ کتنی ہلکی ہو چکی ہے۔ بالکل ہمارے سرکاری گوداموں کی طرح جہاں سال میں ایک بار چیکنگ پر ہی پتہ چلتا ہے کہ کافی مال کم ہو چکا ہے یا پھر چور اپنی غفلت سے لاپرواہی یا Over con-fidence کی وجہ سے پھنس جائے تو پتہ چلتا ہے کہ کتنے دن سے یہ چور گھڑیوں میں لگا ہے۔

اس کا سنجیدہ پہلو شاید یہ ہے کہ گھڑی انسان کی عمر ہے اور وقت چور جو رفتہ رفتہ زندگی کی گھڑیاں چوری کر رہا ہے۔ اور پھر انسان تو اس دنیا میں مسافر ہے ہی اس کو غفلت سے بیدار کیا جا رہا ہے کہ عمر گھٹ رہی ہے۔ اسے یونہی نہ گنوا دے بلکہ بتلائے اور کچھ مفید کام کر لے۔

اس گانے پر ہمیں ایک اور زریں کہاوت یاد آگئی۔ "سویا سو کھویا جاگا سو پایا" کتنی اچھی اچھی کہاوتیں ہیں ہماری زبان کے خزانے میں جو مشورہ بھی ہیں اور نصیحت بھی۔ مگر آہ اپنی نادانی سے ہم ان زریں اقوال کی قدر نہیں کرتے اور نہ کوئی فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ناسمجھی کا یہ حال ہے کہ مدد کے لیے پولیس کے پاس بھاگتے ہیں۔ سچ ہے چراغ تلے اندھیرا۔ پولیس میں شکایت درج کرنے کا کیا فائدہ ہوتا ہے۔ اول تو گھڑی کا پتہ ہی نہیں

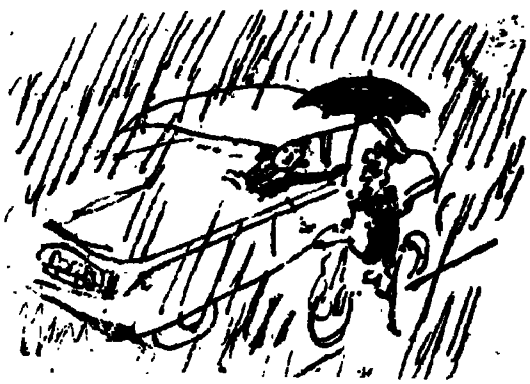
چلتا اور اگر چلتا ہے تو اس وقت تک گھڑی کا آدھا وزن کم ہو چکا ہوتا ہے اور باقی آدھی پولس والے اپنے کارنامے کی یادگار سمجھ کر رکھ لیتے ہیں اگر ہم مذکورہ نصیحت پر عمل کریں تو اتنی پریشانی اٹھانی نہیں پڑے گی۔ گھڑی بھی محفوظ رہے گی اور تھانے کے چکر بھی نہیں لگانے پڑیں گے ۔ اس کہاوت کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ اس میں کتنی سچائی ہے اس کے ثبوت ہر رات دن ملتے رہتے ہیں۔ صبح کا اخبار اٹھایئے تو ایسی کئی خبریں آپ کی معلومات میں اضافہ کرنے کا انتظار کر رہی ہوں گی کہ کوئی پردیسی شہر آیا ٹھکانہ نہ ملنے کی وجہ اسٹیشن پلیٹ فارم پر گھڑی سرہانے رکھ کر سو گیا ۔ صبح آنکھ کھلی تو گھڑی غائب۔ بس میں ذرا سی غفلت ہوئی اور پاکٹ غائب ۔ اسی وقت پتہ چلا جب کنڈکٹر نے ٹکٹ کے پیسے مانگے یا پھر کسی دکان پر قیمت چکانے کا وقت آیا بس میں بیٹھے ہوئے جھونکے لگے ذرا سی جھپکی آئی جھٹکے سے جاگے تو بازو کی سیٹ خالی، ساتھ والا معہ بریف کیس جس میں ہزاروں روپے تھے پچھلے کسی اسٹاپ پر اتر چکا تھا۔ گھر کے مکین صبح جاگے تو دیکھا مال والے کمرے کی پچھلی دیوار میں آمد و رفت کا نیا راستہ بنا ہوا ہے۔ اور کمرہ کرائے کے لیے "خالی" ہے۔ ویسے جاگنے سے کچھ نہیں پاتے لیکن مال کو لٹنے سے بچا لیتے ہیں ۔ معاشیات کی اصطلاح میں یہی "پاتا" ہے کہ بچت کمائی ہے saving is gain اس نصیحت سے چور اور ساہو ایک ساتھ برابر کا فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ چوروں کے لیے تو یہ ایک انمول مشورہ ہے کہ یہ رات کے راجہ ہیں اور ان کا دھندا ہی رات کا دھندا ہے۔ رات اللہ نے سونے کے لیے بنائی ہے۔ اگر انھوں نے رات کا وہی استعمال کیا جس کے لیے یہ بنائی گئی ہے تو پھر یہ فاقوں مرنے لگیں گے۔

بچوں کو امتحان کے زمانے میں خاص طور سے یہ نصیحت کی جاتی ہے کیوں کہ نصابی کتابیں نیند لانے کا تیر بہدف نسخہ ہیں ۔ ان کو چھوتے ہی نیند آنے لگتی ہے ۔ پڑھنا تو بعد کی بات ہے ۔ کسی صحت مند انسان کے بس کا روگ نہیں کہ مسلسل جاگتا رہے جب تک کہ اس کو نیند نہ آنے کا مرض لاحق ہو جائے اور اس کہاوت پر عمل کرنے کے لیے نیند کا آنا پہلی شرط ہے نیند صحت اور تندرستی کے لیے بہت ضروری ہے لیکن اس کہاوت میں اس سلسلے میں کوئی رہنمائی نہیں کی گئی ہے ۔ نہ نظام الاوقات دیا گیا ہے۔ بس کہنے والے نے کہہ دیا ہے کہ ہمیں نہیں معلوم نیند پیاری ہے تو مال کی قربانی کرو۔

اگر اس کہاوت کو چوکسی کے معنوں میں لیں تو سوائے جاسوس ۔ سی آئی ڈی ۔ چور اور چوکی دار کے کوئی بھی اس پر عمل نہیں کر سکتا اور نہ کرتا ہے حتیٰ کہ پولس بھی نہیں کرتی ۔ وہ چاروں بھی اس لیے مجبور ہیں کہ ان کے پیشہ کا دارومدار ہی چوکسی پر ہے ۔ اس سے کم پر کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکتا۔

اس کہاوت کا پرچار چوکیدار بہت زور و شور سے کرتے ہیں ۔ جاگتے رہو کہ جہاں صدا سے گھر والے تو کیا جاگتے کہ وہ اس کے عادی ہو گئے ہیں اور یہ صدا ان کے لیے لوری کا کام کرتی ہے ۔ ہاں اگر چور کہیں موقع کی تاک میں چھپے ہوئے اونگھ رہے ہوں تو چونک جاتے ہیں۔ جاگنے کے ساتھ ساتھ انھیں چوکی دار کی طرف سے یہ اشارہ بھی مل جاتا ہے کہ بھیا میں آگے جا رہا ہوں اور اب کافی دیر تک ادھر پلٹ کر نہیں آؤں گا۔ آپ اپنا کام کر سکتے ہیں ۔ اگر گھر والے جاگ جائیں تو یہ آپ کی قسمت میں اس سے زیادہ آپ کی کوئی خدمت نہیں کر سکتا۔

آج کل تو شہروں میں زبردست ڈاکے پڑ رہے ہیں - اب تو ڈاکوؤں نے جگانے کی ذمہ داری بھی اپنے ذمے لے لی ہے - جہاں پہ وہ مکینوں کو جگا کر ان کے سامنے مال لے جا رہے ہیں اور مکین بے بسی سے ہاتھ ملتے انھیں دیکھتے رہ جاتے ہیں - ان کے ذہن میں بار بار یہ خیال آتا ہے کہ سویا سو کھویا اور جاگا سو بھی کھویا بلکہ بہت ہی تکلیف سے کھویا - اگر یہ ذرا بھی مزاحمت کرتے ہیں تو پھر ڈاکو انھیں اس قابل نہیں چھوڑتے کہ یہ پولس میں رپورٹ لکھائیں یا شور مچائیں - بے بسی سے تماشہ دیکھنے پر ہی جان کی خیرت ہے - لہذا جان بچی سو لاکھوں پائے



آپ کی چھتری کا شکریہ - لیکن محترمہ گاڑی تیز چلانے پر چالان کرنا ہی پڑے گا -

واجد ندیم
(شکاگو)

شوہر یا شوفر

ان دو لفظوں میں کس قدر مماثلت ہے۔ ہم وزن اور ہم قافیہ۔ لفظی طور پر تو تھوڑا فرق ہے اور وہ بھی صرف ایک حرف کا یعنی ہ اور ف کا لیکن معنوی طور پر جائزہ لیں تو کوئی فرق نہیں ہے۔ یعنی جو شوہر ہے وہی شوفر بھی ہے جو آدمی شوہر بن کر اپنے خاندان کی گاڑی چلاتا ہے وہی شوفر بن کر اپنے گھر کی گاڑی ڈرائیو DRIVE کرتا ہے۔ اب ہم اوروں کا کیا ذکر کریں اپنا ہی ذکر کرتے ہیں۔ اوروں کا ذکر کریں گے تو ابھی خاصی دوستی میں فرق آجائے گا اور ہمارے عزیز دوست اٹھ لے کر ہمارے پیچھے دوڑیں گے۔

اپنے ملک میں ہم اچھے خاصے شوہر تھے ـــــ اور صرف شوہر۔ ہماری سرگرمیاں الگ اور گھر کے باہر اور بیوی کی الگ اور گھر کی حد تک محدود۔ کبھی مل کر کہیں آنا جانا بھی ہوتا تو کرایہ کے آٹو رکشا یا موٹر میں آتے جاتے اور بڑے ہی آن بان سے اپنے شوہر ہونے کی شان نبھاتے۔ لیکن امریکہ آکر پتہ چلا کہ ہمارا ایک ہمزاد بھی ہے ہم وزن اور ہم قافیہ۔ جو اب تک نہ جانے کہاں روپوش تھا امریکہ آتے ہی نمودار ہو گیا۔

امریکہ آکر تو ہمارا مقصد اولین تو صرف خاندان کی گاڑی چلانا تھا لیکن چند ہی مہینوں میں جب ہماری بیوی گھر کی چار دیواری میں محدود ہو کر رہ گئیں اور دوسروں کو دیکھ دیکھ کر ان کا دل بھی چاہنے لگا کہ اپنی سرگرمیاں بڑھائیں تو انھوں نے ہم سے تقاضہ شروع کر دیا کہ کیوں نہ ہم ایک عدد کار خرید لیں۔ پہلے تو ہم نے بہتر ا ٹالنے کی کوشش کی اور سمجھایا کہ ہمیں کار کی چنداں ضرورت نہیں ہے کیونکہ امریکہ کی سرکار نے ریلوں اور بسوں کا اتنا اچھا انتظام کر رکھا ہے کہ ہم بڑی آسانی سے اپنی نوکری پر جاتے اور آتے ہیں۔ اب رہ گیا مسئلہ خرید و فروخت کا ـــــ وہ بھی ہمارے لیے مشکل نہیں تھا کیونکہ جہاں ہم رہتے ہیں آس پاس ساری دکانیں موجود ہیں اور ضرورت کی ہر چیز مل جاتی ہے۔ لیکن وہ بھی کہاں ماننے والی تھیں۔ دراصل انھیں ہماری شخصیت آدھی نظر آرہی تھی اور انھیں ہماری شخصیت کو مکمل کرنے کی فکر

ہوئی تھی۔ ہم نے سوچا کہ اس سلسلے میں دو ایک دوستوں سے کیوں نہ مشورہ کر لیا جائے۔ دوستوں نے ہماری ہمت افزائی کی۔ دراصل وہ چاہتے تھے کہ جو بدنما داغ ان کے لگ چکا ہے اس سے ہم کیوں محفوظ رہیں کسی نے کہا "امریکہ میں رہیں بغیر کار کے۔ یار کمال کرتے ہیں آپ بھی" کسی اور نے کہا "اللہ نے دیا ہے گاڑی لے لیں اور خوب گھومیں پھریں" بظاہر تو یہ لوگ ہماری ہمدردی کر رہے تھے لیکن جی ہی جی میں خوش ہو رہے تھے کہ ایک شوہر، شوفر بننے جا رہا ہے۔ ہاں ایک دوست نے البتہ ہمیں خبردار کیا اور وہ بھی ساری بات کھول کر کہنے سے رہے پھر بھی اتنا کہا "میاں اچھا خاصہ بغیر گاڑی کے گزر بسر ہو رہی ہے تو پھر گاڑی خریدنے کی کیا ضرورت ہے" ایک طرف ہمارے یہ مہربان ہم کو اس دلدل میں پھنسنے سے روک رہے تھے تو دوسری طرف ہمارے سارے دوست نما دشمن ہمیں بڑی ہی محبت سے اس دلدل میں دھکیل رہے تھے اور پھر بیوی کا اصرار الگ ـــــ آخر ہم کیسے بچے رہتے۔ بچار و ناچار ہم نے ایک عدد گاڑی خرید ہی لی ہم کو کیا پتہ تھا کہ ہم ایک اچھے خاصے شوہر سے شوفر بن جائیں گے۔ لیکن یہاں آ کر چند ہی دنوں میں پتہ چل گیا کہ بیویوں نے شوہروں کا قافیہ اس قدر تنگ کر رکھا ہے کہ شوہر سے شوفر بن جائیں تو پھر بھی غنیمت ہے ورنہ خدا جانے وہ کیا کیا بنا دیں۔ ہم نے تو اچھے شوہروں کو مرغا بنتے بھی دیکھا ہے۔

بہرحال ہم نے ایک گاڑی خرید لی اور اپنے ایک دوست کو راضی کر لیا کہ وہ ہمیں ڈرائیونگ سکھا دیں گے وقت مقررہ پر ہمارے دوست آ گئے اور ہم چلنے لگے تو ہماری بیگم نے کہا کہ "ہم بھی چلیں گے" ہم نے انھیں سمجھایا کہ جب ہم اچھی طرح سیکھ لیں گے تو خود ہی لے چلیں گے۔ ہم کو ڈر تھا کہ پہلی بار ڈرائیونگ سیکھنے جا رہے ہیں غلطیاں تو ہوں گی ہی اور یہ خواہ مخواہ ہی ہمارا مذاق اڑائیں گی۔ ویسے بھی وہ ہم کو ایک ناکارہ آدمی سمجھتی تھیں یوں بھی کون ایسی بیوی ہے جو اپنے شوہر کو عقل مند اور ہوشیار یا کارآمد سمجھتی ہے اور بعضوں کا تو کہنا ہے کہ عقل مند اور کارآمد سمجھنا تو الگ بات ہے اگر وہ انھیں آدمی ہی سمجھ لے تو یہ ان کے لیے غنیمت ہے۔

شوہروں کی بے چارگی اور بے بسی پر ہمیں وہ کراماتی بزرگ یاد آ گئے جن کو ان کی بیوی بھی خاطر میں نہ لاتی تھیں۔ وہ اپنی کراماتوں سے لاکھ ان پر رعب جمانے کی کوشش کرتے لیکن بیوی پر ان کا کوئی جادو نہیں چلتا۔ ایک دن انھوں نے اللہ تعالیٰ سے التجا کی کہ ان کو کوئی بہت ہی اونچی کرامت عطا کرے جس سے وہ اپنی بیوی کو مرعوب کر سکیں۔ اللہ نے ان کی من کی مراد یعنی ہوا میں اڑنے کا ایک موقع عطا کر دیا۔ چنانچہ ایک رات وہ ہوا میں اڑتے رہے اور من ہی من میں خوش ہوتے رہے کہ اب تو ان کی بیوی ان کی شخصیت سے مرعوب ہو جائے گی۔ دوسرے دن انھوں نے اپنی بیوی سے پوچھا "کل رات جو شخص ہوا میں اڑ رہا تھا۔ پتہ ہے کون تھا" پھر اپنے سینے پر ہاتھ مار کر کہا "وہ میں تھا" یہ سن کر بجائے مرعوب ہونے کے ان کی بیوی نے ان پر ایک حقارت کی نظر ڈالی اور کہا "اچھا تو یہ تم تھے ..... جب ہی تو ٹیڑھا ٹیڑھا اڑ رہے تھے"!

تو خیر صاحب اپنا تماشا آپ بنننے کے لیے ہم اپنے استاد کے ساتھ ڈرائیونگ سیکھنے چلے اور ہماری بیوی بھی ہمارے ساتھ گئیں۔ ایک اسکول کے بڑے پارکنگ لاٹ میں ہم نے اپنی ٹریننگ شروع کی اور استاد کی ہدایتوں پر عمل کرتے رہے وہ جہاں کہتے ہم رک جاتے اور جہاں کہتے ہم آگے بڑھ جاتے۔ ان کی ہدایت کے مطابق اسکول کا

پوری تیاری کرلی۔ اور بڑے ہی اعتماد کے ساتھ اپنا داہنا ہاتھ داہنی سیٹ کے BACK پر رکھا اور پلٹ کر دیکھتے ہوئے جیسے ہی ہم نے ایکسیلیٹر پہ پاؤں رکھا۔ گاڑی آگے بڑھ کر دیوار سے ٹکرا کر رک گئی۔ ہماری بیوی تو جیسے اس موقعہ کی منتظر ہی تھیں۔ کہنے لگیں "خوب .... یہ دیوار نہ ہوتی تو آپ گاڑی کیسے روکتے اور بالآخر انھوں نے ہمارے استاد کو نا اہل سمجھا اور استادی کے منصب جلیلہ پر خود ہی فائز ہو گئیں اور ہدایتیں دینا شروع کر دیں۔ دیکھئے سامنے درخت ہے" "وہ دیکھئے سامنے ٹرک آ رہا ہے" اب بھلا بتایئے کہ اتنا بڑا درخت اور اتنا لمبا چوڑا ٹرک ہمیں نظر نہیں آئے گا اور جب ہم نے یہی بات ان سے کہی تو کہنے لگیں "ارے تو کیا ہوا ..... میں نے احتیاطاً بتا دی .... اسکول کی دیوار بھی تو آپ کو نظر نہیں آئی تھی" اب تو آہستہ آہستہ یہ ہونے لگا کہ استاد سے ہدایتیں کم ملنے لگیں اور بیگم سے زیادہ۔ داہنے جانب ہمارے استاد بیٹھے تھے اور ہمارے پیچھے ہماری بیگم یعنی ہاتھ دھو کر وہ ہمارے پیچھے پڑ گئی تھیں۔ وہ آگے کو جھکی ہوئی ہم کو ہدایتوں پر ہدایتیں دیئے جا رہی تھیں "سگنل گرین ہے نکل چلو" "سگنل لال ہے ٹھہر جاؤ" بیگم کی ہدایتوں پر عمل کرتے کرتے ہمارا یہ حال ہو گیا کہ ہر نئے ایکشن ACTION پر انتظار رہتا کہ بیگم کوئی ہدایت دیں اور ہم عمل کریں۔ جیسے سگنل لال ہے اور ہم کھڑے ہیں پھر سگنل گرین ہوا پھر بھی ہم کھڑے ہیں۔ جب تک بیگم یہ نہ کہہ دیں کہ ہاں چلو۔ اب ہم پر سٹی آف شکاگو کے قانون سے زیادہ بیگم کا حکم چلتا تھا۔ لال اور ہری لائٹوں کے پابند نہ رہے بلکہ بیگم کے ہاں یا نہ کے پابند ہو گئے۔

اس طرح ہم نے ڈرائیونگ کی ٹریننگ مکمل کر لی اور لائسنس یافتہ ڈرائیور بن گئے اور وہ زمانہ یاد کر کے افسوس کرتے جب ہم سردی میں بسوں کے انتظار میں کھڑے ٹھٹھرتے ہوتے اور عمر عزیز کا بیشتر حصہ بسوں کے انتظار میں گنوا دیا۔

پہلے کچھ دنوں تک تو آزادی سے ڈرائیونگ کے مزے لیتے رہے روزانہ بڑی ہی شان سے نوکری پر جاتے اور بڑی آن بان سے گھر واپس ہوتے۔ جب آہستہ آہستہ ہماری بیگم کو یہ یقین ہو گیا کہ ہم نے ڈرائیونگ پر اس قدر قابو پا لیا ہے کہ ہم سے ان کی جان کو کوئی خدشہ نہیں تو پھر کہیں ہمارا آنا جانا مشکل ہو گیا۔ وہ ہر دم ساتھ ہوتیں۔ روزانہ نوکری سے واپسی کے بعد ان کا ہمارا جھگڑا ہوتا وہ ہم سے منٹ منٹ کا حساب لیتیں۔ "جاب آپ کا ۵ بجے ختم ہوا اور پینتالیس منٹ تک گھر کی ڈرائیو ہے تو سینتالیس منٹ کس طرح ہو گئے"۔ ہم نے انھیں لاکھ سمجھایا کہ یہ سب کچھ تو ٹرافک پر منحصر ہے لیکن کسی طرح یہ بات ان کی سمجھ میں نہ آئی۔ جاب سے واپس ہوئے تو ہم ان کو تیار پاتے دن بھر اخبارات کی ورق گردانی کر کے وہ اپنا پروگرام بنا لیتیں کہ فلاں چیز فلاں جگہ سیل SALE پر لگی ہے۔ پہلے تو ہم یہ سمجھتے تھے کہ سیل پر چیزیں مل جائیں گی تو کچھ بچت ہو جائے گی لیکن چند ہی دنوں میں پتہ چل گیا کہ بیس پچیس میل دور جا کر پچاس ساٹھ سینٹس بچانا کون سی عقلمندی ہے جبکہ اس سے زیادہ پٹرول کا خرچ ہو جاتا ہے اور کئی دفعہ تو ایسا ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ تو چیزیں خریدنے کے لیے جاتے اور دوسری مرتبہ انھیں لوٹانے کے لیے۔ اس طرح پھرتے پھرتے ہم شکاگو اور شکاگو کے اطراف کے ہر گلی کوچے سے

مسافت سب کچھ ان کو ازبر ہوگیا ہے ہم بھی ان کی فرمائش پر انھیں چکمہ دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ فلاں اسٹور بہت دور ہے تو وہ فوراً اس کا فاصلہ، وقت مسافت اور راستے میں کتنے اسٹاپ لائٹس ہیں اور وہ کس کس وقت پر لال اور ہرے ہوتے ہیں سب بتا دیتی ہیں۔ اب تو ہمارے پاس لوگوں کے کال CALL آنے لگے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ ذرا بھابی سے بات کرایئے۔ ہم ان سے پوچھتے ہیں کہ بھئی آخر آپ کون ہیں آپ ان کے دیور کب سے بن گئے ہیں جبکہ امریکہ میں ہمارا کوئی بھائی نہیں ہے۔ آخر آپ بھابی کو کیسے جانتے ہیں تو جواب ملتا۔ جی۔ میں بھابی کو جانتا نہیں۔ لیکن ان سے ایک پتہ پوچھنا ہے" یعنی ہمارا گھرا چھا خاصہ انفارمیشن بیورو بن گیا تھا۔

آخر ہم شوہر کے علاوہ آدمی بھی ہیں کبھی کبھی جھنجھلا جاتے تو ہماری بیگم ہم سے کہتیں۔ آپ سے کبھی اتنا بھی نہیں ہوا کہ خود سے کہیں لے جاتے ہوتے۔ دس مرتبہ کہتی ہوں تو کہیں چلنے تیار ہوتے ہیں" اور شاید انھوں نے اس موقع کو غنیمت جانا اور ہمیں سنا دیا کہ اس مرتبہ وکیشن VACATION میں انھوں نے نیو یارک جانے کا پروگرام بنا لیا ہے۔ ہم نے کہا " بیگم ... میں نے کبھی لانگ ڈسٹنس ڈرائیو LONG DISTANCE DRIVE نہیں کی ہے خاص آپ نے ۸۰۰ سو میل دور جانے کا پروگرام بنا لیا۔ اس پر بیگم نے کہا " میں جب بھی پروگرام بناتی ہوں آپ پس وپیش کرتے ہیں۔ آپ نے کبھی پہلے لانگ ڈسٹنس ڈرائیو نہیں کی ہے تو کیا ہوا..... کوئی اپنی ماں کے پیٹ سے لانگ ڈسٹنس ڈرائیو کر کے آتا ہے" اس پر ہم لاجواب ہو گئے۔ ہم نے کہا " بیگم ابھی ہمارے جانے میں ۲ ہفتے باقی ہیں کیوں نہ تم لائسنس حاصل کر لو کیونکہ ڈرائیور کی سیٹ پر تو میں بیٹھتا ہوں لیکن حقیقت میں چلاتی تم ہو" بیگم نے کہا " نہ بابا مجھے تو ڈر لگتا ہے اور پھر یہ گاڑی تو آپ ہی کو چلانی ہے" میں نے پوچھا " کیوں بھئی مجھے کیوں چلانی ہے۔ میں آپ کا شوہر ہوں کوئی شوفر تو نہیں" بیگم نے کہا " شوفر میں نے آپ کو کب کہا آپ شوہر ہیں یعنی صدر خاندان۔ اور صدر خاندان کی حیثیت سے اس کشتی کے ناخدا اور ہماری گاڑی کے ڈرائیور" اتفاق سے اسی شام ہم بیٹھے ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ ویٹ نام کے بارے میں کوئی معلوماتی پروگرام چل رہا تھا۔ ایک سین میں دکھایا گیا کہ ایک ویٹ نامی اپنے پورے خاندان کو سیکل پر بٹھائے چلا جا رہا ہے۔ سامنے ڈنڈے پر ایک بچہ بیٹھا ہے۔ پیچھے سیٹ پر اس کی بیوی ایک بچے کو گود میں لیے بیٹھی ہے اور سیکل کے ہینڈل سے کچھ سامان بندھا ہے۔ بیگم کی جیسے ہی اس سین پر نظر پڑی کہنے لگیں " دیکھئے کس طرح شوہر اپنی بچوں کو سیکل پر لیے جا رہا ہے۔ دیکھئے پورے خاندان کا بوجھ سیکل پر کھینچ رہا ہے۔ آخر وہ صدر خاندان ہے اپنی ذمہ داریوں کو سمجھتا ہے" ہم نے کہا " بیگم تمھیں کیا معلوم بیچارہ کس مصیبت میں گرفتار ہے۔ یہ سب تماشہ تو تم ٹی وی کے اسکرین پر دیکھ رہی ہو۔ حقیقت میں تو صدر خاندان بن کر وہ پچھتا رہا ہوگا اور اس لمحہ کو کوس رہا ہوگا جس نے زندگی میں یہ دن دکھلایا۔ دیکھتی نہیں ہو اس کے چہرے پر کیسی مردنی ٹپک رہی ہے" بیگم کہاں رکنے والی تھیں فوراً کہا " جی نہیں ...... سیکل رکھتے ہوئے بھی اس کے چہرے سے خوشحالی اور مسرت ٹپک رہی ہے اور کار رکھتے ہوئے بھی آپ کے چہرے سے مفلسی ٹپکتی ہے" ہم نے کہا " سچ ہے بیگم۔ اللہ کسی کو مفلس بنائے لیکن مفلس کی صورت نہ بنائے"

خدا خدا کرکے ہماری پہلی لانگ ڈسٹنس ڈرائیو کی گھڑی آ ہی گئی۔ نیند ویسے بھی غائب تھی ہم رات بھر بیٹھے نقشے سمجھتے رہے۔ یہاں سے نکلنا ہے ...... یہ ایکسپریس وے لینا ہے ...... یہ ہائی وے لینا ہے ...... یہاں پہنچ لیں گے ...... یہاں رات کا قیام ہوگا وغیرہ وغیرہ۔ ادھر ہماری بیگم بڑے ہی آرام سے خواب استراحت کے مزے لے رہی تھیں۔ کیوں کہ یہ مصیبت تو ہم کو ہی جھیلنی تھی ــــــ ہم صدر خاندان جو ٹھہرے ــــــ دو ایک گھنٹوں کے لیے ہم سوئے بھی تو نیویارک کے سفر کو خواب میں دیکھتے رہے۔ صبح صبح ذرا آنکھ لگی تھی کہ بیگم نے جگا دیا کہنے لگیں" اس طرح سوتے رہے تو بس پہونچ گئے نیویارک" سامان تو ہم نے رات ہی کو گاڑی میں رکھ دیا تھا بس تیار ہوکر گاڑی میں سوار ہونے چلے تو پتہ چلا کہ بیگم اپنا میک اپ کر رہی ہیں ہم نے اس موقع کو غنیمت جانا اور کہہ دیا" بیگم ــــــ ہم سے تو آپ نے کہا تھا کہ صبح کوئی کام نہیں ہوسکے گا اور سونے سے پہلے کرلو۔ اچھا تھا آپ اپنا میک اپ بھی سونے سے پہلے کرلیتیں"۔

بحرحال ہمارا نیویارک کا سفر شروع ہوا۔ ہم نے بیگم سے کہہ رکھا تھا کہ راستے میں سوتی نہیں بلکہ جاگتی رہیں۔ ہم نے نقشہ میں دیکھ رکھا تھا کہ ہائی وے 94 EAST کے بعد ہائی وے 80 EAST لینا ہے ہم آنکھیں پھاڑے ہائی وے کے سائن دیکھتے رہے اور بار بار اپنی بیگم کو خبردار کرتے رہے کہ سائن دیکھتے رہیں۔ راستہ میں ایک جگہ اشارہ ملا کہ آگے ہائی وے 80 ملے گا۔ اور کچھ ہی دیر کے بعد ہائی وے 80 آگیا۔ اتنے میں سامنے ایک دوراہا نظر آنے لگا جس میں سے ایک 80 EAST اور دوسرا 80 WEST تھا۔ اس سے پہلے کہ ہم سائن دیکھتے اور کوئی فیصلہ کرپاتے ہماری گاڑی ان دو راستوں میں سے ایک پر چل پڑی۔ جب کافی دور جانے کے بعد بھی کوئی سائن نظر نہیں آتی تو ہم نے یہہ کہہ کر اپنے دل کو سمجھالیا کہ پہلے بھی ایسا ہوا ہے اور ہم صحیح راستے پر ہیں لیکن تقریباً ۴۰ میل دور جانے کے بعد جو سائن نظر آئی اس پر 80 WEST لکھا تھا۔ ہم نے بیگم سے کہا کہ" بیگم ہم بجائے نیویارک کے کیلی فورنیا پہونچنے والے ہیں۔ وہ دیکھو "80 WEST" اس پر بیگم نے کہا" میں آپ سے پہلے ہی کہتی تھی گاڑی بائیں لین (LANE) میں رکھیئے"۔ ہم نے کہا" بیگم آپ تو خواب خرگوش کے مزے لے رہی تھیں۔ آپ کو کیا پتہ کہ کب دوراہا آیا اور کب ہم نے بائیں کے بجائے دائیں لین (LANE) میں گاڑی لے لی۔" ہم نے مزید کہا" جہاں زندگی بھر ہم نے آپ کی مانی ہے اب بھلا کیسے نہ مانتے" خیر صاحب ۴۰ اور ۴۰ جملہ ۸۰ میل کا چکر کاٹ کر صحیح راستے پر آگئے اور جوں توں کرکے نیویارک کا سفر پورا ہوگیا۔

نیویارک سے واپسی پر ہم نے سوچا کہ اسی طرح کچھ دن اور گذریں تو ہمارا شوہر سے شوفر بن جانا یقینی ہے تو کیوں نہ ہم اس فساد کی جڑ ہی کو کاٹ دیں۔ چنانچہ نہایت خاموشی سے ہم نے اپنی گاڑی فروخت کردی اور اپنی بیگم سے ایک معقول یا نامعقول سا بہانہ کرلیا۔ اب ان کے پاس بھی سوائے خاموشی کے اور کوئی چارہ نہ تھا۔ ابھی کچھ دن نہیں گذرے تھے کہ ہمارے ایک دوست جو شکاگو کے مضافات میں رہتے ہیں ہمیں اپنے ہاں آنے کی دعوت دی، ہم نے ان سے معذرت چاہ لی اور کہا کہ ہم آہستہ آہستہ شوہر سے شوفر بنتے جا رہے تھے کہ دیکھئے اپنی گاڑی بیچ دی ہے پہلے تو خاموشی سے ہماری مظلومیت کی داستان سنتے رہے اور جب اچھی طرح

محسوس کرلیا کہ اس کشتی میں ہم بھی سوار ہیں جس میں وہ خود ہیں تو ذرا اور کھل گئے۔ پہلے تو زمانے کی نفسا نفسی کا رونا رویا اور امریکہ کی مادی زندگی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ دنیا بڑی مادّہ پرست ہوگئی ہے۔ ہم نے ان سے کہا ماشاءاللہ آپ ریاضی میں ماہر ہیں۔ ذرا مادہ سے تشدید کی تفریق کردیں تو اس مسئلہ کا صحیح جواب مل جائے گا۔ وہ حیران ہوئے تو ہم نے کہا "بھئی دنیا مادّہ پرست نہیں مادہ پرست ہوگئی ہے"۔ انھوں نے بھی حامی بھری اور پھر بڑے ہی اطمینان سے اپنی خانگی زندگی کا دکھڑا سنایا۔ ہم حیرت سے ان کی بے بسی اور بے چارگی کی داستان سنتے رہے اور ہماری زبان سے YOU TOO ایسے نکل گیا جس طرح شکسپیر کے ڈرامے میں سیزر کی زبان سے نکلتا ہے۔ اس پر ہمارے دوست نے کہا "تم مجھے کیا کہتے ہو۔ یہاں کون ہے جو اپنی بیوی سے نہیں ڈرتا۔ ہم نے ان سے کہا "تم ٹھیک کہتے ہو"۔ آؤ اب مل کے آہ و زاریاں کرلیا اور جس طرح کسی شاعر نے عندلیب سے کہا تھا کہ وہ نالے تُو ہائے گل پکارے تو یہ ہائے دل پکارے گا۔

ایک نوجوان کو جس کی شادی ہونے والی تھی اس کے ایک شادی شدہ اور تجربہ کار دوست نے یہی "گربہ کشتن روز اول" کا مشورہ دیا اور کہا کہ پہلے ہی دن سے اپنی بیوی پر رعب جمائے رکھنا ہمیشہ بہتر رہتا ہے بہت ہی مفید اور تیر بہدف علاج ہے۔ نوجوان کو یہ بات بڑی پسند آئی اور اس نے گربہ کشتن کا پورا انتظام کرلیا چنانچہ وقت مقررہ پر بلی نے میاؤں میاؤں کرتے ہوئے دودھ کی گلاس میں منہ ڈالا اور نوجوان نے غصہ کا مصنوعی اظہار کرتے ہوئے کمر سے سونتی ہوئی تلوار میان سے کھینچنی شروع کی۔ دلہن بیٹھی یہ تماشا دیکھ رہی تھی۔ اس نے جھٹ کمر سے پستول نکالا اور ایک ہی گولی میں بلی کا صفایا کردیا۔ اور نوجوان میان سے تلوار کھینچتے ہی رہ گئے۔ نوجوان دولہا کو پتہ نہیں تھا کہ دلہن نے بھی یہ مثل سن رکھی ہے۔ راوی لکھتا ہے کہ آگے چل کر ان کی زندگی بڑی ہی خوشگوار گزری۔

یوں تو دانشوروں نے شوہروں کی دو حصوں میں تقسیم کی ہے۔ ایک بیوی سے نہیں ڈرنے والے اور دوسرے بیوی سے ڈرنے والے۔ لیکن ہماری تحقیق میں پہلی قسم میں آج تک کوئی دریافت نہیں ہوا۔ اور شاید کوئی ایک آدھ دریافت ہو بھی جاتا لیکن امریکہ آکر یہ موقع بھی ختم ہوگیا اس لیے ہم نے دوسری قسم کی درجہ بندی اس طرح کی ہے جس طرح ہمارے ساتھ کام کرنے والے ایک آفریقی دوست نے آفریقہ کے موسموں کے بارے میں کی۔ انھوں نے کہا کہ امریکہ میں چار موسم ہوتے ہیں گرمی، پت جھڑ، سردی اور بہار لیکن آفریقہ میں تین ہوتے ہیں۔ ہم نے پوچھا کون سے تو انھوں نے کہا کہ ایک گرمی دوسرا زیادہ گرمی اور تیسرا بہت زیادہ گرمی۔ اسی طرح ہم نے بھی شوہروں کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک بیوی سے ڈرنے والے، دوسرے بیوی سے زیادہ ڈرنے والے اور تیسرے بہت زیادہ ڈرنے والے۔ اب ذرا آپ ان کے خصوصیات بھی سن لیجئے (۱) ڈرنے والے شوہروں کا جوائنٹ اکونٹ JOINT ACCOUNT ہوتا ہے جس میں دونوں کو جمع اور تفریق کی اجازت ہوتی ہے۔ زیادہ ڈرنے والے شوہروں کا کونٹ الگ اور بیوی کا الگ ہوتا ہے اور بہت زیادہ ڈرنے والوں میں صرف بیوی ہی کا اکونٹ ہوتا ہے۔ شوہر کو جمع کی اجازت ہوتی ہے تفریق کی نہیں۔

(۲) ڈرنے والوں میں شوہر کے پاس ڈرائیونگ لائسنس ہوتا ہے اور بیوی کے پاس نہیں اور صرف شوہر گاڑی چلاتا ہے اور بیوی آرام سے گھومتی ہے۔ زیادہ ڈرنے والوں میں دونوں کے پاس لائسنس ہوتا ہے۔ لیکن صرف شوہر ہی شوفر بنا رہتا ہے اور بیوی گاڑی نہیں چلاتی۔

(۳) ڈرنے والوں میں میاں بیوی کے درمیان کبھی کبھی جھگڑے بھی ہوتے ہیں لیکن بات منظر عام پر نہیں آتی۔ زیادہ ڈرنے والوں میں جھگڑے ہوتے ہیں اور بات منظر عام پر بھی آجاتی ہے اور کہیں کہیں طلاق بھی ہوجاتی ہے اور زیادہ ڈرنے والوں میں کبھی بھی کوئی جھگڑا نہیں ہوتا۔

شوہروں کی تقسیم اور درجہ بندی تو یہاں پوری ہوتی لیکن شوہروں کی خصوصیات جن کا ہم نے ادپر ذکر کیا یہاں پر پوری نہیں ہو جاتیں ویسے بھی مضمون کی طوالت کا ڈر کم ہے اور دوستوں کی دشمنی میں بدلنے کا ڈر زیادہ۔

اب قارئین سے ادباً اور معذرت کے ساتھ درخواست ہے کہ اپنا اپنا جائزہ فرمالیں اور دیکھیں کہ وہ کون سے درجے میں فٹ ہوتے ہیں اور اس مضمون کو پڑھ کر اپنے اپنے رویے میں تبدیلی لانے کی کوشش نہ کریں کیوں کہ وہ ان کے حق میں نقصان دہ ہوگی۔ ہم سے سبق لیجیے ہم یہ مضمون لکھ کر آج تک پچھتا رہے ہیں ●

مشتاق احمد یوسفی

بسلسلۂ گزشتہ

شہر دو قصّہ

۵

ملا عاصی بھکشو

کانپور میں جی بھر کے گھوما۔ ایک ایک سے ملا۔ ایک زمانہ آنکھوں کے سامنے سے گزر گیا۔ مگر حاصلِ سفر ملا عاصی عبدالمنان سے ملاقات رہی۔ ایسے ہی ہمدم دیرینہ سے ملاقات کے بارے میں ذوق نے کہا ہے:

بہتر ہے ملاقاتِ مسیحا و خضر سے

عبدالمنان کے نانا خطوں میں اپنے دستخط سے پہلے عاصی لکھا کرتے تھے انھوں نے اُچک لیا اور ساتویں کلاس سے اپنا عاصی عبدالمنان لکھنا شروع کر دیا۔ آٹھویں کلاس میں ہی داڑھی نکل آئی تھی۔ میٹرک تک پہنچتے پہنچتے ملا عاصی کہلانے لگے۔ اور یہ ایسا چپکا کہ اب صرف اسی نام سے پہچانے اور پکارے جاتے ہیں۔ تختی پر بھی Aasi A Mannan لکھا ہے۔
قد و قامت۔ اکہرا گٹھا ہوا بدن۔ کھلتا ہوا گندمی رنگ۔ درمیانہ قد۔ کوزہ دست یعنی غیر معمولی لمبوترے ہاتھ جیسے بندر کے ہوتے ہیں۔ کوٹ ہینگر کے سے ڈھلکے ہوئے کندھے۔ گھنے بال اب سفید ہو گئے ہیں مگر گھنگھرالا پن باقی ہے۔ باہر نکلی ہوئی بلی جیسی گول گول آنکھیں۔ دائیں آنکھ اور دہانے کے دائیں کونے میں بچپن سے tick تھا۔ اب بھی اسی طرح پھڑکتے رہتے ہیں۔ داڑھی نکلنے کے دس سال بعد تک ۔۔۔ پر نہیں لگنے دیا۔ سچ پوچھیے تو داڑھی سے بہت بہتر لگتے تھے۔ لمبی گردن موٹا اور گول مٹول چہرہ۔ جس روز داڑھی منڈوا کر آئے تو ایسے لگے گویا نیچے پر چلم رکھی ہے اس سے پہلے ہر مہینے چاند کی پہلی تاریخ کو نرخرے سے ملحق داڑھی کا تلا منڈوا کر آتے تو کہتے "کنٹھی بنوا کے آیا ہوں" اُدھر یہی اصطلاح رائج ہے۔ آپ نے بھی تو انٹرمیڈیٹ میں باچھوں تک مونچھیں رکھی تھیں۔ اگلی کتاب میں وہ والا فوٹو چھپوا دیں تو اللہ مزہ آ جائے۔ ملا عاصی خود کہتے ہیں ۔۔۔ بالغ ہونے کے بعد میں نے کبھی نماز نہیں پڑھی۔ البتہ میں نماز کے وقت پھنس جاتا اور لوگ ۔۔۔ کرتے تو نماز پڑھا دیتا تھا۔ داڑھی کا یہ بڑا ہینڈی کیپ تھا۔

ہو تنگ آکے منہ ٹوادی" جب سے انہوں نے بدھ ازم کا ڈھونگ رچایا لوگوں نے مُلا بھکشو کہنا شروع کردیا۔ ابھی تک سے (د) صاف نہیں بول سکتے۔ مگر ان کے منہ سے اچھا لگتا ہے۔ لہجہ مصری کی ڈلی۔ لاابالی اور سنکی جیسے جب تھے اب بھی ہیں بلکہ اپنے مدارج کچھ زیادہ ہی بلند کرلئے ہیں قریب سے دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ زندگی ایسے بھی گذاری جا سکتی ہے۔ سارے کام چھوڑ چھاڑ کر سائے کی طرح ساتھ رہے! لطف آگیا۔ کیا بتاؤں۔ ایسی ندیا محبت۔ ایسا برکھا پیار۔ یقین جانئے سن ۷۷ء میں جیسا چھوڑ کے آئے تھے ویسے کے ویسے ہی ہیں۔ پچھتر سے کچھ اوپر ہی ہوں گے۔ لگتے نہیں۔ میں نے پوچھا اس کا کیا راز ہے؟ بولے 'کبھی آئینہ نہیں دیکھتا۔ ورزش نہیں کرتا۔ کل کے بارے میں کبھی نہیں سوچتا۔ آخری دعوے میں انھوں نے قدرے کسرِ نفسی سے کام لیا۔ اسلئے کہ کل تو بعد کی بات ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ تو آج کے بارے میں بھی نہیں سوچتے جس وضع سے زندگی شروع کی اسی طرح گذارے لے گئے۔ بڑی گرمجوشی سے ملے۔ سینے سے کیا لگایا یکلخت twenties میں پہنچا دیا۔ ایسا لگا گویا اپنے ہی جوان ہمزاد سے ملاقات ہوگئی۔ ویسے مجھے آپ کی رائے سے اتفاق ہے کہ بعض لوگ اس طرح سینے لگتے ہیں کہ اس کے بعد آپ وہ نہیں رہتے جو اس سے پہلے تھے لیکن آپ نے جس چیز قنات 'بزرگ' کی مثال دی اس سے مجھے قطعی اتفاق نہیں۔ دل نہیں ٹھکتا۔ آپ آج بھی ملا عاصی کو ہر ایک کا کام اور ہر طرح کا کام کرنے کے لئے تیار پائیں گے۔ سوائے اپنے کام کے۔ شہر میں ہر افسر سے ان کی یاد اللہ ہے۔ کسی کو آدھی ملاقات کو بھی سفارش کی ضرورت ہو تو وہ ساتھ ہو لیتے ہیں۔ کوئی بیمار بے آسرا ہو تو دوا دارو، ہاتھ پیر کی خدمت کے لئے پہنچ جاتے ہیں ہومیوپیتھی میں بھی درک رکھتے ہیں۔ ہومیوپیتھک دواؤں میں تاثیر ہو یا نہ ہو۔ ان کے ہاتھ میں شفا ضرور ہے۔ مریض گھیرے رہتے ہیں۔ مشورے اور دوا کا کچھ نہیں لیتے۔

جوانی میں بھی ایسے ہی تھے۔ الہ دین کے جن کی طرح ہر خدمت کے لئے حاضر۔ بلا کے منتظم۔ سن ۴۱ء کا واقعہ ہے گرمیوں کے دن تھے۔ میاں تجمل حسین کو دور کی سوجھی۔ کس لئے کہ ان کے والد کلکتے گئے ہوئے تھے کہنے لگے' یار ملّا! مجرا دیکھے مدتیں ہوگئیں۔ آخری مجرا جمال صاحب کے بیٹے کی شادی پر دیکھا تھا۔ سات مہینے ہونے کو آئے۔ دس بارہ جنے مل کے چندہ کرلیں گے۔ بس تم بلی کی گردن بلکہ پاؤں میں گھنگھرو باندھ کے لو الاؤ تو واللہ عیش آجائیں۔

بولے یار! کمال کردیا! پہلے کیوں نہ کہا؟ بس ایک جاجم کا بندوبست تم کرلو۔ باقی سب میری ذمہ داری۔ پر ایک بات ہے چندے میں ہمیشہ خرد برد اور آپس میں لڑائی جھگڑے کا احتمال رہتا ہے۔ خیر نیک کام میں تو لڑائی جھگڑا بالکل روا ہے اور رائج بھی۔ پر کارِ بد میں مکمل اعتماد اور اتفاق رائے کی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر یارو! یہ تو بتاؤ' چندے کی رنڈی کس کس کی کورنش بجا لائے گی؟

سنیچر کو دیکھا کہ عشاء کے بعد ملّا عاصی سچ مچ اپنی "ذمہ داری" کو اِکّے میں بٹھائے لئے چلے آرہے ہیں خود اِکّے کے پَر (تختے کا باہر نکلا ہوا کنارہ) پہ ٹکے ہوئے تھے۔ پاندان، طبلے، سارنگی، چوراسی (گھنگھرو) اور ضعیف طبلچی کو اپنے ہاتھوں سے اتارا۔ میرے کان میں کہنے لگے کہ داڑھی کی وجہ سے طوائف کو میرے ساتھ آنے میں تامل تھا! روپیہ تو خیر ہم سب نے چندہ کرکے فراہم کیا۔ مگر باقی ماندہ سارا انتظام ان ہی کا تھا۔ اس میں شہر سے باہر اس سرکاری بنگلے کا انتخاب و حصول بھی شامل تھا جہاں پر یہ محفل برپا ہوئی تھی ڈپٹی کلکٹر سے ان کی یاری تھی۔ دسترخوان پر کھانا انھوں نے اپنے ہاتھوں سے چنا۔ کانپور کے خاص سرخ و سفید رس گلوں کے کلھڑ خود خرید لائے۔ زردے میں ملا کر کھانے کے لئے بالائی بطور خاص لکھنؤ سے

نگرانی ۔ ان کا کہنا تھا کہ گلوریاں بھی وہیں کی ایک طرحدار تمبولن کے ہاتھ کی ہیں ۔ کرارے پان کی گلوری اس ترکیب سے بناتی ہے کہ کسی کو کھینچ کر مارے تو بلبلا اٹھے ۔ گلوری ٹکڑے ٹکڑے بھلے ہی ہو جائے لیکن مجال ہے کھل جائے ۔ دسترخوان بچھانے سے ذرا پہلے اپنی نگرانی میں تندوری روٹی پر گڑ اور نمک کا چھینٹا دلوایا ۔ کانپور میں اسے چھینٹے کی روٹی کہتے تھے ۔ وہ تازہ قلفی کی ہنڈ سیلنچیوں میں نیم کے پتے ڈال کر کونے میں رکھوا دیں ۔ غرض کہ مجرے اور دعوت کا سارا انتظام کیا ۔ سب دسترخوان پر بیٹھ گئے تو کسی نے پوچھا " ملا کہاں ہے ؟ ڈھنڈیا پڑی ۔ کہیں پتہ نہ چلا ۔ محفل تو ہوئی ۔ مگر بے لطفی رہی ۔ دوسرے دن ان سے پوچھا گیا تو تنک کر بولے ' آپ نے مدعو کب کیا تھا ؟ میرے سپرد تو بس انتظام کیا گیا تھا ۔ سو میں نے کر دیا ۔

مزاج کا بس ہمیشہ سے یہی رنگ رہا ۔ جو ٹیڑھ اور سنک جب تھی ' وہ اب بھی ہے ۔ کچھ بڑھ ہی گئی ہے ۔ ایک قصہ ہو تو سنائیں طالب علمی کا زمانہ تھا ۔ وہ کوئی مافوق الفطرت کوڑھ مغز نہیں تھے ۔ میرا مطلب ہے اوسط درجے کے بالکل نادمل نالائق تھے امتحان میں تین مہینے رہ گئے تھے ۔ دسمبر کا مہینہ ۔ کڑکڑاتے جاڑے ۔ انہوں نے کرسمس کے دن سے پڑھائی کی تیاریاں شروع کیں ۔ وہ اس طرح کہ آنکھوں اور دماغ کو طراوت پہنچانے کے لئے سرمنڈوا کے تیل سے سینچائی کی جو ایک میل دور سے پہچانا جاتا تھا کہ اصلی سرسوں کا ہے ۔ پہلی ہی رات نزلہ ان کے عضوِ ضعیف یعنی سر پر گرا تو دوسرے دن چیکتے ہرے رنگ کا روئی کا ٹوپا سلوایا جسے پہن کر پان کھاتے تو بالکل طوطا لگتے تھے ۔ جمعرات کو علی الصبح سفید بکری کی کلیجی اور بسری خرید کر لائے ۔ بسری پکوا کر شام کو فقیروں کو کھلائی ۔ اس زمانے میں بے پردگی کے اندیشے سے محلے میں کسی مرد کو چھت پر چڑھنے کی اجازت نہیں تھی ۔ اس کے باوجود چھت پر کھڑے ہو کر دیر تک " چیل ' چیل ' چیل ' چیل " ! پکارا کئے ۔ پھر ہوا میں اچھال کر چیلوں کو کلیجی کی بوٹیاں اور خود کو پردہ نشین گھروں کے مردوں کی گالیاں کھلوائیں ۔ دوپہر کو بان کی چارپائی باہر نکالی اور ادونتے پانی سے ان کھٹملوں کو جنھیں برسوں سے اپنا خون پلا پلا کر بڑا کیا تھا ۔ آخری غسل دیا ۔ پھر چارپائی گھر کے باہر دھوپ میں الٹی کر کے مرحومین و نیم مرحومین پر ڈھیروں گرم مٹی ڈالی ۔ پھر دانی کے بانس پر جھاڑو باندھ کے بھڑ کے چھتے اور جالے اتارے ۔ رات کو مختلف اوقات میں چھت پر ٹارچ سے روشنی ڈال ڈال کر چھپکلیوں کی تعداد اور عاداتِ شبینہ و شنیعہ کا جائزہ لیا ۔ ان میں تین چھپکلیاں غالباً چپکلے تھے ۔ غالباً کی قید اس لئے لگانی پڑی ، بقول مرزا " پرندوں ' چھپکلیوں ' مچھلیوں punks اور اردو الفاظ میں نر مادہ کی تمیز کرنا انسان کے بس کا کام نہیں ۔ پرندے بنک ' مچھلیاں اور چھپکلیاں تو پھر بھی بشری تقاضوں ٭ سے مغلوب ہو کر اپنی مخالف جنس کو پہچان کر عمل دخل پیدا ہوتے ہیں ۔ لیکن اردو الفاظ کے کیس میں تو یہ سہولت بھی میسر نہیں ۔ ان کی جنس بندی اور تذکیر و تانیث کی شناخت و ادراک صرف قدما فصحا کا حصہ ہے ۔ استاد جلیل نے کسی زمانے میں ایک محققانہ رسالہ تذکیر و تانیث پر لکھا تھا جس میں سات ہزار الفاظ کے طبی معائنے کے بعد ہر ایک کے متعلق دوٹوک فیصلہ کر دیا تھا کہ مذکر ہے یا مونث ۔ ساتھ میں ان الفاظ کی نشاندہی کر دی ن کی مشکوک جنس کے بارے میں اہل لکھنؤ اور دلی والے ایک دوسرے کا سر پھاڑنے کے لئے تیار ہو جاتے تھے ۔

رہبر گوید کہ من شاہ جہانم

بُری عادتوں سے تائب ہو گئے ۔ مطلب یہ کہ رات دیر گئے تک غیر حاضر دوستوں کی غیبت ' تاش ' شطرنج ، ٹیلی سکوپ اور بُری محبت یعنی اپنے ہم جنس دوستوں کی محبت سے میعادی توبہ کی ۔ یعنی کرسمس کے دن سے یوم امتحان تک ۔ اور

٭ مرزا حیوانوں کی اسی نوع کی حرکتوں کے لئے بھی بشری تقاضوں ہی کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں ۔

دل میں both days inclusive کہہ کر مسکرا دیئے۔ مثنوی "زہرِ عشق" جو کبھی از کتبِ ممنوعہ تھی اور دس بارہ بدنام مثنویوں کے سراپا سے متعلق اقتباسات جن کا شمار اس زمانے میں porn میں ہوتا تھا۔ مقفل الماری سے نکالے۔ یہ سب ان کے ہاتھ کے قلمی نسخے تھے جو املا کی غلطیوں کے باوجود بلکہ بسبب دونا مزہ دیتے تھے کہ ان میں کی بعض غلطیاں فاحش اور فاحش ہی نہیں، فحش بھی تھیں۔ ان مخطوطات کو مع تاش کے دو پیک کے، جن میں ایک بالکل نیا تھا نذرِ آتش کرنے صحن میں لے گئے۔ لالٹین سے تیل نکال کر ابھی پرانا پیک ہی جلایا تھا کہ بزرگوں کی ایک نصیحت یاد آگئی کہ کوئی بھی کام ہو جلدبازی نہیں کرنی چاہیئے۔ جلدی کا کام شیطان کا۔ لہٰذا کارِ شیطان پر لعنت بھیجی اور نیا پیک اور "سراپے" واپس لے آئے۔ پھر دو پنسلیں اور چھ ربر خریدے کہ ان کے ہاں ہر دو اشیاء کے استعمال کا یہی تناسب تھا۔ آپ بھی تو پنسل سے لکھتے ہیں تاکہ مسودہ فیئر کرنے کی کھکھیڑ سے بچ جائیں۔ مگر دشمنوں کا خیال ہے لکھتے کم مٹاتے زیادہ ہیں۔ آپ نے پنسل کی لت بچارے مختار مسعود کو بھی لگا دی۔ اب وہ بھی آپ کی طرح ربر سے لکھتے ہیں۔ مگر آپ سے پہلے نابوکوف بھی پنسل سے لکھتا تھا۔ افسوس کہ لفظ "میٹنا" اب متروک ہو گیا۔ پھر ملا عاصی "رف ورک" کے لئے ردی والے کے یہاں سے ریلوے کی بڑی رسیدوں اور بلٹیوں کا پانچ سیر کا پیپا ایک آنے میں خرید لائے۔ اس زمانے میں کفایت شعار لوگ انہی کی پشت پر "رف ورک" کرتے تھے۔ آدھ سیر سونف بھی لائے۔ اس کے کنکر محلے کی ایک دوشیزہ سے بنوا کر ایک شیشی میں اسی طرح محفوظ کر لئے جیسے بعض شیخی خورے مرد آپریشن کے بعد گردے اور پتے کی پتھریاں سجا کر رکھتے ہیں۔ مگر دوشیزہ کا علیحدہ قصہ ہے۔ کبھی اور سہی۔ پھر سونف میں ایک پاؤ دھنیے کے بیج ملا کر دونوں کو مرتبان میں بھر دیا۔ ہری پرکاش پانڈے نے کہا تھا کہ دھنیے کے عرق کے دو قطرے بھی مست سانڈ کے حلق یا بھڑکتے جوالا مکھی پہ ڈال دو تو وہیں بلبلے کی طرح بیٹھ جائے گا۔ سونف سے آنکھوں کی جوت بڑھے اور دماغ کو تراوٹ پہنچتی ہے۔ چنانچہ ایک چٹکی نیند کے جھونکے سے پہلے اور ایک بعد میں پھانک لیتے تھے۔

جب مطالعہ کے لئے مناسب ماحول بن گیا تو باخبر لوگوں سے معلومات حاصل کر کے کورس کی کتابوں کی فہرست بنائی۔ پھر بیشتر سیکنڈ ہینڈ خریدیں۔ سیکنڈ ہینڈ کتابوں کو کم قیمت کی بنا پر نہیں بلکہ فقط اس لیے ترجیح دی کہ بعض نایاب ایڈیشن ایسے مل گئے جن میں فیل ہونے والوں کی دو تین تجربہ کار نسلوں نے یکے بعد دیگرے اہم حصوں پر نشان لگائے تھے۔ بعض نشان تو مشعلِ لائٹ ہاؤس کے تھے جو ان خطرناک چٹانوں کی نشاندہی کرتے تھے جہاں علم کی تلاش میں نکلے ہوئے غافل طلباء کی اداس نسلوں کا بیڑا غرق ہوا تھا۔ ایک نادر نسخہ ایسا بھی ہاتھ لگا جس میں صرف غیر اہم حصے انڈرلائین کئے گئے تھے تاکہ انہیں چھوڑ چھاڑ کر پڑھا جائے لیکن یقین تھا کہ کورس کی کتابوں کی خرابی سے وہ ممتحن کے خلاف جنگ میں آدھی فتح تو حاصل کر ہی چکے ہیں۔ اس کے بعد وہ ہری پرکاش پانڈے کے گھر گئے جو گورنمنٹ کالج میں ہمیشہ فرسٹ آتا تھا۔ منت سماجت کر کے اس کی تمام کتابیں دو دن کے لئے مستعار لیں اور ریڑھے میں ڈھو کر گھر لائے۔ پھر چھٹی کلاس کے ایک غریب لڑکے کو آنے پیسہ کی دہاڑی پر اس کام پر تعینات کیا کہ ہری پرکاش پانڈے کی کتابوں پر جو حصے انڈرلائین کئے ہوئے ہیں ان ہی کے مطابق میری تمام کتابیں سبز پنسل سے انڈرلائین کر دو۔ پھر ایک آنے میں ربر کی مہریں Most Important اور Important کی کھڑے کھڑے بنوائیں اور اپنی کتابوں کا سیٹ پانڈے کو دے کے جن جن حصوں کو تم امتحان کے لحاظ سے بھاری توجہ کے لائق سمجھتے ان پر حسبِ اہمیت یہ مہریں لگا کے چلے جانا۔ پیشتر۔

کتابوں کی قسمیں اور نکٹے دشمن

سب نشان لگ گئے تو انھوں نے غیر ضروری اور فالتو علم سے چھٹکارا حاصل کرنے کی غرض سے ایک اور ہنگامی تکنک کی ایجاد کی جسے وہ Selective studies کہتے تھے۔ اردو مترادف تو مجھے معلوم نہیں۔ تفصیل اس کی یہ کہ جو سوال پچھلے سال آچکے تھے ان کی متعلقہ ابواب پورے کے پورے قینچی سے کاٹ کے پھینک دیئے کہ ان کی موجودگی سے تو جیسے ma ... ہوتی اور دل پر ضخامت سے خواہ مخواہ دہشت بیٹھتی تھی۔ یہی نہیں، ان کی وہ بین السطور جڑیں بھی جو دوسرے ابواب میں کینسر کی طرح پھیلی ہوئی جہاں تہاں نظر آئیں کاٹ کر پھینک دیں۔ پھر وہ باب نکال پھینکے جن کے بارے میں ان کے مشیروں اور بہی خواہوں نے کہا کہ ان میں سے کوئی بھی سوال آ ہی نہیں سکتا۔ تھوڑا بہت اپنے کشف سے بھی کام لیا۔ آخر میں جی کڑا کے وہ ادق حصے نکال پھینکے جنھیں وہ دس دفعہ پڑھتے تب بھی کچھ پلے نہ پڑتا۔ اس عمل جراحی سے کتابیں چھٹ کر ایک چوتھائی سے بھی کم رہ گئیں۔ ان میں سے تین کا شیرازہ تو ایسا بکھرا کہ ان کی باقیات کو کلپ سے دوسری کتاب کے نیفے میں اڑسنا پڑا۔ ایک کتاب کا صرف سرورق باقی رہ گیا۔ اس میں چند غیر ضروری صفحے محض شگون اور ممتحن کی دلجوئی کے لئے رکھ لئے۔ ان کا پروگرام تھا کہ زندگی اور بینائی نے اگر امتحان تک وفا کی تو ان منتخب اوراق کے چیدہ چیدہ حصوں پر ایک اچٹتی نظر ڈالیں گے۔ آخر ہر کتاب ایک ہی انداز سے تو نہیں پڑھی جا سکتی۔ پھر ذہانت خداداد اور علم لدنی بھی تو کوئی چیز ہے۔ رہا فیل ہونے کا خدشہ، سو وہ تو ہر صورت میں رہے گا۔ اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔ بہر حال محنت کر کے اپنے زور بازو سے باعزت طریقے سے فیل ہونا نقل کر کے پاس ہونے سے بدرجہا بہتر ہے۔ کسی نے ان ہی کتابوں سے میں بیکن کا مشہور مقولہ سنایا جو ان کے دل کو بہت بھایا۔ مزے کی بات یہ کہ بیکن کا یہ انشائیہ ان کے کورس میں شامل تھا اور اسے انہوں نے فضول سمجھتے ہوئے کاٹ کر پھینک دیا تھا۔ وہ "کوٹیشن" آپ کو یاد ہوگا۔ کچھ اس طرح ہے کہ بعض کتابیں صرف چکھی جانی چاہئیں۔ کچھ کو نگل جانا چاہئے۔ کچھ اس لائق ہوتی ہیں کہ آہستہ آہستہ، چبا چبا کے ہضم کی جائیں۔ اور کچھ ایسی بھی ہوتی ہیں جنھیں کسی عوضی سے پڑھوا کے خلاصہ بنوا لینا چاہئے۔ ملا عاصی نے اس قول فیصل میں اتنی اصلاح اپنی طرف سے کی کہ اگر سب نہیں تو بیشتر کتابیں اس لائق ہوتی ہیں کہ سونگھ کر ایسوں کے لئے چھوڑ دی جائیں جو ناک نہیں رکھتے۔ صاحب! ناک پر آپ نے اس دلچسپ لکڑی ہوٹل والے فنکشن میں کمال نظم "کوٹ" کی مگر حاضرین میں جیسے دو چار ہی ہوں گے جو یہ سمجھ پائے کہ آپ کا ہدف و مخاطب کون ہے۔ ایسے حملے سے دشمن کا تو کچھ نہیں بگڑتا اپنا خون خشک ہو جاتا ہے۔ یاد ہیں کچھ لائنز؟

They haven't got no noses
*The fallen sons of Eve**

تاریخ کا کلیجہ

تاریخ کے مسئلہ کو بھی انھوں نے پانی کر دیا – وہ اس طرح کہ ہری پرکاش پانڈے کو ہدایت کی کہ محنت

---

* The Song of Qoodle - G.K. Chesterton

نقطۂ نظر سے جتنے سنہ اہم ہوں، ان سب کی فہرست بنا کر مجھے دے دو تاکہ ایک ہی ہلے میں ان سے نمٹ لوں۔ لیکن بیس سے زیادہ نہ ہوں۔ اب تک صرف پانچ چھ سنہ سے غریب امتحان کا کام چلا رہے تھے۔ ماسٹر فاخر حسین نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ تواریخ، جیسا کہ اس کے نام ہی سے ظاہر ہے۔ مجموعۂ سنین کے سوا کچھ نہیں۔ اپنے جواب میں جتنے زیادہ سنہ لکھو گے اتنے ہی زیادہ نمبر ملیں گے۔ سن کی جمع سنین انھیں پہلی مرتبہ اسی موقعے سے معلوم ہوئی۔ لیکن جب ماسٹر فاخر حسین نے یہ کہا کہ ہمارے ہاں بڑے آدمیوں کا سن وفات ان کے سن پیدائش سے زیادہ اہم ہوتا ہے تو ملا عاصی کا ماتھا ٹھنکا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ پیدا ہونے، وفات پانے اور گدی پر بیٹھنے کے لئے انھوں نے متولد، متوفی، متمکن اور سریر آرائے سلطنت ہونے کی اصطلاحیں ماسٹر فاخر حسین ہی سے سیکھیں۔ ماسٹر صاحب نے یہ ٹپ بھی دیا کہ ممتحن اپنا تاثر صرف تمہارے پہلے جواب کے پہلے پیراگراف سے قائم کر لیتا ہے۔ ان چند ہائے سود مند کے بعد دسویں جماعت کا جو ششماہی امتحان ہوا اس میں ملا عاصی نے پہلے ہی سوال میں کاپی پہ تاریخ کا کلیجہ نکال کے رکھ دیا۔ مطلب یہ کہ پہلے صفحے کے پہلے پیراگراف کے کوزے میں وہ سارے سنہ بند کر دیئے جو اپنی ہتھیلی اور سوال ایک کے ڈبے کے پسینے سے پر لکھ کر لے گئے تھے۔ ان سنوں یا سنین کا اصل سوال سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ بلکہ آپس میں کوئی بھی تعلق نہیں تھا۔ ان سب کو ایک لڑی میں اس طرح پرو دینا کہ ماسٹر فاخر حسین پر اپنی نصیحت کے نتائج ہویدا ہو جائیں۔ صرف ان ہی کا کام تھا۔

سوال لارڈ ڈلہوزی کی پالیسی پر آیا تھا۔ ان کا جواب مجھے حرف بحرف تو یاد نہیں لیکن اس کا پہلا پیراگراف جس میں انہوں نے بلا امتیاز مذہب و ملت سب بادشاہوں کو ایک ہی ہانک لاٹھی سے ہانک کر موت کے گھاٹ اتارا، کچھ اس طرح تھا:-

"اشوک اعظم (متوفی ۲۳۲ ق م) کے بعد سب سے بڑی سلطنت اورنگ زیب عالمگیر (متوفی ۱۶۸۰ء) کی تھی جو ۱۶۵۸ء میں اپنے والد کا تختہ الٹ کر سریر آرائے سلطنت ہوا۔ اس اثناء میں پانی پت میں گھمسان کی جنگ ہوئی۔ مگر طوائف الملوکی کا دور دورہ ختم نہ ہوا۔ حالانکہ اورنگ زیب نے اپنے دشمنوں کے ساتھ بھائیوں سا سلوک کیا یعنی یکے بعد دیگرے موت کے گھاٹ اتارا۔ اگر وہ یہ نہ کرتا تو بھائی اس کے ساتھ یہی کچھ کرتے۔ دراصل اکبر اعظم (متولد ۱۵۴۲، متوفی ۱۶۰۵ء) کی آنکھ بند ہوتے ہی انتزاع سلطنت کے آثار شروع ہو گئے۔ جو متعدد شاہی اموات کے بعد ۱۷۵۷ میں پلاسی کی جنگ اور ۱۷۹۹ء میں سرنگا پٹنم کی جنگ پر منتج ہوئے۔ ادھر یورپ میں نپولین (متوفی ۱۸۲۱ء) کا طوطی ٹک ٹک کر بولنے لگا تھا۔ (یہاں انھیں اچانک دو سنہ اور یاد آ گئے۔ چنانچہ انھیں بھی دینیات کی آگ میں جھونک دیا) یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ فیروز تغلق (متوفی ۱۳۸۸ء) اور بلبن (متوفی ۱۲۸۷ء) بھی سلطنت کو استحکام نہ بخش سکے۔ یہاں ہمیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہیئے کہ ۱۸۵۷ء تک ایک سو سال کی مدت بنتی ہے ..."

سنہ کو بطور آلۂ تسخیر ممتحن استعمال کرنے اور تاریخ کے صحیح تعین سے متعلق ماسٹر فاخر حسین کی نصیحت انھوں نے گرہ میں باندھ لی۔ انھیں اپنی صحیح تاریخ پیدائش معلوم نہیں تھی چنانچہ اس کے خانے میں وہ بڑی فراخدلی سے "نامعلوم" لکھ دیا کرتے تھے لیکن جس دن سے ماسٹر فاخر حسین نے ٹوکا کہ برخوردار ہمارے ہاں نامعلوم و ناتحقیق تو صرف ولدیت ہوا کرتی ہے۔ وہ اپنی قیاسی تاریخ ولادت ۱۹۰۸ کے بعد A.D بھی لکھنے لگے تاکہ تسامح نہ ہو۔ کوئی کوڑھ مغز التباساً B.C نہ سمجھ بیٹھے۔ اپنی فاش غلطی میں بھی عالمانہ شان پیدا کرنے کے لئے غلطی کو تسامح اور التباس کہنا۔ ہم دونوں نے ماسٹر

خوحسین ہی سے سیکھا۔ جس زمانہ کا یہ ذکر ہے ملائی کی یادداشت خراب ہو چلی تھی۔ کوئی بات یا جواب ذہن پر زور دینے کے باوجود یاد نہ آئے تو "اس وقت استحضار نہیں ہے" اس طرح کہتے کہ ہم خود اپنی نالائقی پر شرمندہ ہوتے کہ کیسے غلط وقت سوال کر بیٹھے۔ صاحب! اگلے وقتوں کے استادوں کی شان ہی کچھ اور تھی۔

امتحانی چالاکیوں سے متعلق ماسٹر ناظر حسین کا بتایا ہوا ایک نکتہ یاد آیا۔ فرماتے تھے کہ جہاں مشکل لفظ استعمال کر سکتے وہاں آسان لفظ نہ لکھو۔ تم طالب علم ہو۔ سادگی و سلاست صرف عالموں کو زیب دیتی ہے اور ان ہی کے یہاں مقصود ہے۔ اسی ضمن میں یہ بھی فرماتے کہ جس عربی یا فارسی لفظ کی جمع تمہیں معلوم ہو اس کو صیغہ واحد میں استعمال نہ کرو۔ چنانچہ میں نے اپنے دشمنوں کو ملاعین و طواغیت کہنا ان ہی سے سیکھا۔ صیغہ واحد ——— ملعون اور طاغوت ——— میں وہ بات کہاں۔

ملا عبد المنان اور نپولین

اسی طرح ان کے ایک خیر خواہ نے کسی زمانے میں ٹپ دیا تھا کہ اگر تین ESSAYS اور تین تاریخی جنگیں رٹ لو تو انگریزی اور تاریخ میں فیل ہونا ناممکن ہے۔ بشرطیکہ ممتحن جوہر ناشناس اور نالائق نہ ہو۔ یہ وہ زمانہ تھا جب وہ ہر ایک کے مشورے پر حرف بحرف عمل کر بیٹھتے تھے۔ چنانچہ ہر دفعہ ایک مختلف طریقے سے فیل ہوتے اور ممتحن کی نالائقی پر رہ رہ کر افسوس کرتے واٹرلو کی فیصلہ کن جنگ جس میں ان کے ہیرو نپولین کو شکست فاش ہوئی، ان تین جنگوں میں جو انھوں نے نقشہ میدان سمیت رٹ لی تھیں، ان کی "فیورٹ" تھی۔ دوستوں کو اپنے فیل ہونے کی اطلاع بھی اسی یادگار تاریخی حوالے سے دیتے تھے۔ جس میں طالب علمانہ ندامت کے بجائے جرنیلی تکبر پایا جاتا تھا۔

"I have met my waterloo!"

بعد میں اپنی زندگی کی دیگر ناکامیوں کا اعلان بھی ان ہی تاریخی الفاظ میں کرنے لگے۔ مگر صاحب، نپولین کی اور ان کی شکست میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ نپولین تو ایک ہی شکست میں ڈھیر ہو گیا تھا، جبکہ ان کے اعلان ہزیمت میں دوبارہ شکست کھانے کا عزم پایا جاتا تھا۔

تالا نہیں کھلتا

جب ممتحن کو زیر دام لانے کے تمام ہتھکنڈے اور "شارٹ کٹ" مکمل ہو گئے تو امتحان میں کل چار ہفتے باقی رہ گئے تھے۔ شارٹ کٹ دراصل اس راستے کو کہتے ہیں جو ذہین مگر کاہل لوگ کم سے کم فاصلے کو زیادہ سے زیادہ وقت میں طے کرنے کے لئے دریافت کر لیتے ہیں۔ صاحب! فاصلے کو گزرنے وقت سے ناپنا چاہیئے۔ خیر اب ملا عاصی سچ مچ پڑھائی میں جٹ

☆ ۱۹۸۹ء میں ایک دلچسپ الٹی لغت Reverse Dictionary شائع ہوئی ہے۔ جس میں ہر آسان لفظ کے نہایت مشکل اور نامانوس مترادفات دیئے گئے ہیں۔ یہ ڈکشنری ان طبقوں میں جن کا کام بات کو کھول کر عام فہم انداز میں بیان کرنا ہے بے حد مقبول ہو رہی ہے۔ ہماری مراد پیغمبروں، نقادوں، پادریوں، حکومت کے ترجمانوں اور بزنس ایگزیکٹیوز سے ہے۔ ماسٹر ناظر حسین کی روح مجھ فقیر کو پچاس سال بعد اپنی نصیحت پر عمل کرتا دیکھ کر کس قدر مسرور و مفتخر محسوس کر رہی ہو گی۔

گئے۔ صبح سات بجے آٹھ پوریاں پاؤ بھر کڑاہی سے اتری جلیبیاں اور رات بھر تاروں کی چھاؤں میں بھیگے دس باداموں کی ٹھنڈائی کا ناشتہ کرنے کے بعد وہ خود کو کمرہ میں بند کرکے باہر سے تالا ڈلوا دیتے تاکہ اگر چاہیں بھی تو باہر نہ نکل سکیں۔ عشا کے وقت تالا کھلتا تھا۔ دو ڈھائی ہفتے یہی معمول رہا۔ مگر امتحان میں نہیں بیٹھے۔ کہنے لگے دماغ کا تالا نہیں کھلا۔

اور صاحب! تالا کھلتا بھی کیسے۔ امتحان سے چند روز قبل یہ معمول بنا لیا کہ شام پڑتے ہی سائیکل لے کے نکل جاتے دیر گئے پھٹے لوٹتے۔ پرچے آؤٹ کرنے کی مہم میں لگے ہوئے تھے۔ جن جن پروفیسروں کے بارے میں انھیں ذرا بھی بدگمانی ہوئی کہ انہوں نے پرچہ بنایا ہوگا، ان کے چپراسیوں، خانساماؤں، مہتروں حتی کہ ان کے شیرخوار بچوں کو آیاؤں سمیت cultivate کر رہے تھے۔ جیسے ہی کہیں سے کوئی ہنٹ ملتا یا گیس پیپر ہاتھ لگتا، اسے راتوں رات گھر گھر تقسیم کرتے۔ وہ مستحقین تک یعنی شہر کے تمام نالائق طالب علموں تک پہنچ جاتا تو کسی دوسرے پرچہ کو آؤٹ کرنے کی مہم پر سائیکل اور منہ اٹھائے نکل جاتے۔ ایک رات دیکھا کہ ایک پرنٹنگ پریس کے باہر جو کاغذ کی کترنیں، پروف کی ردی اور کوڑا کرکٹ پڑا تھا، اسے اپنے معتقدینِ خاص سے دو ملیدوں میں بھروا کر خورد بینی معائنے کے لئے گھر لے آئے۔ انھیں کسی نے انتہائی رازداری سے ہنٹ دیا تھا کہ ایک پرچہ اسی پریس میں چھپا ہے۔ ان کے جاسوس شہر کے مختلف حصوں میں کام کر رہے تھے۔ ان کے بقول آگرے، میرٹھ، بریلی اور راجپوتانہ و سنٹرل انڈیا کے شہروں میں جن کا آگرہ یونیورسٹی سے الحاق تھا۔ ان کے خفیہ ایجنٹوں نے جاسوسی کا جال بچھا رکھا تھا جس سے کسی بھی ممتحن کا باعزت طریقے سے بچ نکلنا ناممکن تھا۔ یہ سب وہ تھے جو کئی سال سے مختلف مضامین میں فیل ہو رہے تھے۔ ہر جاسوس اسی مضمون کے پرچے کی مخبری میں اسپیشلائز کئے ہوئے تھا جس میں وہ گزشتہ سال لڑھکا تھا leakage اور خفیہ اطلاعات کے سوتے خشک ہونے لگے تو انہوں نے ہمت نہیں ہاری۔ اپنے ذاتی کشف والہام سے اس کمی کو پورا کیا۔ پہلا پرچہ سیٹ کرنے والے ممتحن کے گھر کے باہر تھڑے پر گردن اور پیپر لٹکائے دو گھنٹے تک پرچے کی بو لیتے رہے۔ تین سوال عالم میں القا ہو گئے۔ گھر آکر ان میں مزید تین سوالوں کا اضافہ اس طرح کیا کہ دس سوالوں کی کاغذ کی گولیاں بنائیں اور اسی دوشیزہ کے، جس کا ذکر پہلے کر چکا ہوں، پانچ سالہ بھائی سے کہا کہ کوئی سی تین اٹھالو۔ پیر کی صبح پہلا پرچہ تھا۔ اتوار کی رات کو صبح چار بجے تک دس سوالوں پر مشتمل اپنا آؤٹ کیا ہوا پرچہ ہر اس طالب علم کے گھر پہنچایا جو گزشتہ برسوں میں متواتر فیل ہوتا رہا تھا یا جس میں انھیں آئندہ فیل ہونے کی ذرا بھی صلاحیت نظر آئی۔ اس کار خیر سے صبح ساڑھے تین بجے فارغ ہوئے۔ گھر آکر ٹھنڈے پانی سے غسل کیا۔ باہر نکل کے صبح کے تارے کی طرف ٹکٹکی باندھے دیر تلک دیکھا کیے۔

ملّا عاصی کے کشف و کرامات

جتنی محنت اور ریاضت انہوں نے رفاہِ عام کی خاطر پرچے آؤٹ کرنے میں کی، اس کی 1/100 بھی اپنی پڑھائی میں کر لیتے تو فرسٹ ڈویژن میں پاس ہو جاتے۔ بہرحال افسوس اس کا نہیں کہ انہوں نے ایسے لغو کام میں وقت کیوں ضائع کیا۔ رونا اس بات کا ہے کہ

انتہائی ہیبت ناک پہلے پرچے میں آٹھ میں سے پانچ سوال ایسے تھے جو ان کے آؤٹ کئے ہوئے الہامی پرچے میں موجود تھے ایسا لگتا تھا جیسے ممتحن نے ان کا پرچہ سامنے رکھ کر پرچہ سیٹ کیا ہے۔ یہ بھی سننے میں آیا کہ ممتحن کے خلاف انکوائری

بعد ہی ہے۔ ملا عاصی نے تو یہاں تک کہہ کہ اس پروفیسر نے وہ تھڑا ہی تڑوا دیا جس پر بیٹھے بیٹھے انھیں کشف ہوا تھا۔ ایک عرصے تک وہ جگہ مرجع گریہاں خاص رہی۔ واللہ اعلم۔

اب کیا تھا، سارے شہر میں ان کی دھوم مچ گئی۔ دوسرے دن ان کے گھر کے سامنے امتحان میں بیٹھنے والے طلبا کے ٹھٹ لگ گئے۔ اس کے بعد امتحان میں چار دن کا ناغہ تھا۔ ان ایام میں نزدیک و دور کے کالجوں کے طلبا وطالبات کوئی ڈولی میں، کوئی ٹرین سے کوئی پا پیادہ ——— جوق در جوق آکر ان کے گھر کے سامنے پڑاؤ ڈال دیا۔ میلا سا لگ گیا۔ یوپی کے نالائق لڑکوں کا ایسا عظیم الشان اجتماع چشمِ فلک نے نہ کبھی اس سے پہلے، نہ اس کے بعد دیکھا۔ یہ بھی سننے میں آیا کہ پولیس نے کیس اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ مجمع میں سی آئی ڈی کے آدمی والدین کا بھیس بنائے پھر رہے ہیں۔ ملا عاصی کا بیان تھا کہ دو برقع پوش لڑکیاں بھی آئی تھیں۔ ان میں سے لمبی لڑکی کے بارے میں شکیل احمد نے جو کلاس میں سب سے چھوٹا اور خوبرو لڑکا تھا یہ شہادت دی کہ اس نے میرے کولھے میں چٹکی لی اور اس کی نقاب کے پیچھے مجھے تاؤ دی ہوئی مونچھ نظر آئی۔ واللہ اعلم حالانکہ ملا عاصی اب خود امتحان میں نہیں بیٹھ رہے تھے لیکن اوروں کی خاطر دن رات ایک کر دیئے۔ کہتے تھے اگر خود امتحان میں بیٹھ جاؤں تو سارا کشف باطل ہو جائے گا۔ طالب علموں میں یہ افواہ آگ کی طرح پھیل گئی کہ جب سے جوابات اٹھے ہیں۔ ملا عاصی دنیا سے کنارہ کش ہو کر صوفی ہو گئے ہیں اور پے در پے کرامات ظہور میں آرہی ہیں۔ ان سے پوچھا گیا تو انہوں نے جواب دیا، میں اس افواہ کی تردید نہیں کر سکتا۔ وہ کمرے میں تالا ڈلوا کر دن بھر چھپی جس کی مدد سے پرچے بناتے۔ رات کو ٹھیک بارہ بجے اور پھر ڈھائی بجے اپنے ماموں سجاد احمد مرحوم، وکیل کا بوسیدہ گاؤن پہنے حجرۂ عالیہ سے برآمد ہوتے اور پرچہ آؤٹ کرتے۔ تین دن تک یہی نقشہ رہا۔ تصوف وصوفی کے بارے میں تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ مجھے تو ان کے چہرے پر تپسیا کرنے والا سادھوؤں کی سی گمبھیر شانتی نظر آئی۔ آنکھیں ایک چوتھائی سے زیادہ نہیں کھولتے تھے۔ گوشت لہسن اور جھوٹ چھوڑ دیا۔ تڑکے ایسے ٹھنڈے یخ پانی سے اشنان کرتے کہ بے اختیار چیخ کو روکنے کے لئے پورا زور لگانا پڑتا۔ عفتِ نگاہ کا یہ عالم کہ عورت تو کجا مرغی یا بکری بھی سامنے آجائے تو برہمچاریوں کی طرح شرما کر نظریں نیچی کر لیتے۔ مخالف جنس سے اس قدر احتیاط اور پرہیز کہ اردو کے بعض ایسے الفاظ کو بھی مذکر بولنے لگے جو اندھے کو بھی نظر آتے ہیں کہ مونث ہیں! غرض کہ پرچے آؤٹ کرنے کے لئے اپنی تمام روحانی طاقتیں اور باطنی تصرفات داؤں پر لگا دیئے۔

پہلے پرچے کو چھوڑ کر، باقی ماندہ پرچوں میں ان کا بتایا ہوا ایک سوال بھی نہیں آیا۔ وہ منہ دکھانے کے قابل نہ رہے۔ ان کے حق میں بس یہی کہا جا سکتا تھا کہ انھوں نے بڑے خلوص نیت سے خلق خدا کو خوار کیا تھا۔ اس سال کانپور اور اس کے ارد گرد پچاس ساٹھ میل کے حلقے میں جتنے بھی لڑکے فیل ہوئے ان سب کا یہی موقف تھا کہ ملا عاصی کے آؤٹ کئے ہوئے پرچوں کی وجہ سے لڑھکے ہیں۔ حد یہ کہ عادی فیل ہونے والے لڑکے جو ہر سال قسمت اور ممتحن کو گالیاں دیا کرتے تھے۔ وہ بھی ملا عاصی کی جان کے لاگو ہو گئے۔ نوبت گالی گلوج پر آنے لگی تو وہ چپکے سے امروہہ سٹک گئے۔ ایک لڑکے کے ماموں نے تو ملا عاصی کے ماموں کو سربازار زد و کوب بھی کیا۔ ایک ڈیڑھ مہینے تک ان کے خاندان کا کوئی بزرگ گھر سے باہر نہیں نکل سکا۔

تو جناب یہ تھے ہمارے ملا عاصی عبدالمنان۔ چند مخصوص eccentricities سنک۔ مضحک عادات و اطوار سے قطع نظر جوانی ان کی بھی ویسی ہی گزری جیسی اس زمانے میں عام طالب علموں کی گزرتی تھی۔ آپ نے اس دن مرزا عبدالودود بیگ کا ایک چراند سا مقولہ سنایا تھا۔ کس کس بلا سے عبارت تھی جوانی اس زمانے میں؟

سال بھر عیش، امتحان سے پہلے چلہ، قبلے سے مشاعروں میں ہوٹنگ، آغا حشر کاشمیری کے ڈرامے، رینالڈ اور مولوی عبدالحلیم شرر کے اسلامی ناول، سونے سے پہلے آدھ سیر اونٹنی دودھ، بلاناغہ ڈنڑ بیٹھک اور استمنا بالید، جمعہ غسل، شب گپ، ریلوے اسٹیشن پر لیڈیز کمپارٹمنٹ کے سامنے 'solo goos-step'، انگریز کے خلاف نعرے اور اسی کی نوکری کی تمنا!"

ملا عاصی نے ساری زندگی تجرد میں گزار دی۔ سہرا باندھا نہ شہنائی بجی۔ نہ چھوہارے بٹے۔ خود ہی چھوہارا ہو گئے۔ میں نے بہت کریدا۔ پتھر پر ہاتھ نہیں رکھنے دیتے۔ کھڑے کھڑے بقراطی جیلے لڑھکانے لگے جو ان کے اپنے نہیں معلوم ہوتے۔ "بس تمام عمر ایسی افراتفری رہی کہ تزوج اور متاہلانہ آسودگی کے بارے میں سوچنے کی فرصت ہی نہ ملی۔ (جی ہاں! شادی کے لئے ملا عاصی اب یہی لذیذ اصطلاحیں استعمال کرتے ہیں۔ آدھی لذت تو فقط ان کے تلفظ میں ہی مل جاتی ہے) مجھے تو عورتوں کے بغیر زندگی میں کوئی کمی محسوس نہیں ہوئی۔ البتہ ان کی کوئی حق تلفی ہوئی ہو تو مجھے علم نہیں۔ اللہ معاف کرے" وغیرہ وغیرہ اب بھی اسی کمرے میں رہتے ہیں جس میں ان کی ولادت ہوئی تھی۔ میرا تو سوچ سوچ کے ہی دم گھٹنے لگا کہ کوئی شخص اپنی ساری زندگی ستر بہتر برس ایک ہی محلے، ایک ہی مکان اور ایک ہی کمرے میں کیسے گزار سکتا ہے۔ کراچی میں تو اتنے سال آدمی قبر میں بھی نہیں رہ سکتا۔ جہاں گورکنوں نے دیکھا کہ اب کے شب برات اور عید بقرعید پر بھی کوئی فاتحہ پڑھنے نہیں آیا وہیں ہڈیاں اور پنجر نکال کے پھینک دیئے اور تازہ مردہ کے لئے جگہ نکال لی۔ جب صور پھونکا جائے گا تو ایک ایک قبر سے ایک سو ایک مردے اٹھ کھڑے ہوں گے۔ ایک سو ایکواں مردہ متعلقہ گورکن ہو گا۔

(آب گم سے)

(سلسلہ جاری)

محمد نسیم الدین فریس
(حیدرآباد)

مینڈکی کو زکام

بی مینڈکی سے ہمارا پہلا تعارف کب ہوا سنہ اور مہینہ ٹھیک سے یاد نہیں البتہ ملاوٹ بھری غذا نقلی دوا ۔ بناسپتی گھی ۔ آلودہ پانی ۔ مسموم ہوا اور ہر اعتبار سے زہریلی فضا میں پرورش پائی ہوئی حافظہ قسم کی کسی چیز کو جب ہم ٹٹولتے ہیں تو جو کچھ ڈوبتی ابھرتی یادیں اور دھندلی دھندلی باتیں ہاتھ آتی ہیں وہ بھی ملاوٹ سے خالی نہیں معلوم ہوتیں ۔

یہ غالباً ان دنوں کی بات ہے جب ہم پہلی جماعت کے طالب علم ہوا کرتے تھے ۔ ہم جس مدرسے میں پڑھتے تھے وہ گورنمنٹ کا تھا ۔ یہاں غربا کے علاوہ سماج کے خوش حال افراد کے بچے بھی تعلیم پاتے تھے ۔ یہ اس دور کی بات ہے جب کہ تاجرانہ ذہنیت نے تعلیم و تدریس کی خوش نما نقاب میں جابجا اپنی دکانیں نہیں کھولی تھیں ۔ تعلیم برائے تعلیم کا جذبہ عام تھا ۔ درس و تدریس میں تجارت کارفرما نہیں تھی تو اس عمل میں تعظیم و تقدیس بھی شامل تھی ۔ یکا دکا خانگی مدارس تھے لیکن سرکاری مدارس میں اپنے بچوں کو تعلیم دلوانا شرفا کے لیے باعث عار نہیں تھا ۔ بڑے آدمیوں کے بچے سرکاری مدرسوں میں پڑھتے تھے جس کے نتیجے میں یہ مدرسے حقیقی معنوں میں درسگاہ تھے ۔ بچوں کے اخلاق و کردار کی قتل گاہ نہیں ۔ اکبر الہ آبادی نے اپنے دور کے کالجوں کا رنگ دیکھ کر کہا تھا :

افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

اگر وہ آج کے دور میں ہوتے تو شاید مرزا غالب کا یہ مصرع دہراتے پھرتے :

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں

وہ بھی کیا دن تھے جب ہم بستے میں مبلغ ایک عدد کتاب اور ایک سلیٹ لیے اچھلتے کودتے مدرسہ جایا کرتے

جستہ ہلکا پھلکا ہوتا اچھلنے کودنے کی پوری آزادی تھی۔ آج کل کتابوں کی بھاری گٹھڑ نے بچوں سے یہ آزادی چھین لی ہے۔ کچھ عجیب سی ہوا چل نکلی ہے کہ جو مدرسہ بچوں پر جتنی زیادہ کتابوں کا بوجھ لادتا ہے اتنا ہی معیاری تصور کیا جاتا ہے۔ یاد ش بخیر ہم پہلی جماعت کے طالب علم تھے اور اردو کے گھنٹے میں اپنی جماعت کے لڑکوں کے ساتھ جھوم جھوم کر کورس کی شکل میں گایا کرتے۔

بی بی مینڈکی ری تو تو پانی میں کی رانی۔ کہاں تیرا بھائی بھتیجہ کہاں تیری دیدہ مانی۔ بی بی مینڈکی ری۔ اتنے برسوں بعد اب ہم غور کرتے ہیں تو سمجھ میں نہیں آتا کہ ان مہمل کلمات میں ایسی کیا تاثیر تھی جو اس قدر مزہ لے لے کے پڑھا کرتے اور بار بار کے پڑھنے پر بھی اکتاہٹ نہ ہوتی۔ دراصل بچپن میں ہم ان جملوں کی حقیقت سے بے خبر تھے اس لیے ان میں لطف و سرور تھا اب حقیقت کھل چکی ہے تو ان کا لطف بھی ختم ہو گیا۔ حقائق کا عرفان آدمی کو سنجیدہ کر دیتا ہے شاید اسی لیے آج کل کے بچوں پر گہری سنجیدگی طاری ہو گئی ہے۔

پہلی جماعت کی اس نظم کے ذریعہ پہلی مرتبہ ہم نے بی مینڈکی سے شرفِ تعارف حاصل کیا۔ اس کے بعد تو اس قوم کے افراد سے سابقہ پڑتا ہی رہا اور اس کے ایسے ایسے کارنامے ہمارے علم میں آتے گئے کہ اب ہم خود کو ماہر غوکیات سمجھنے لگے ہیں۔ ہم نے ہر طرح کے مینڈک دیکھے ہیں۔ سمندری مینڈک۔ دریائی مینڈک تالاب کا مینڈک۔ برساتی مینڈک۔ ٹرّاتے ہوئے مینڈک وغیرہ وغیرہ۔ کسی مینڈک کو ایک نظر دیکھ کر ہم بتا سکتے ہیں کہ یہ کس قبیل سے تعلق رکھتا ہے۔ اپنے آس پاس مینڈکوں کی اس کثرت کو دیکھ کر کبھی کبھی ہمیں گمان ہونے لگتا ہے کہ کہیں ہم انسانوں کی دنیا کے بجائے مینڈکوں کے کنوئیں میں تو نہیں ہیں۔

مینڈک کی مادہ مینڈکی کہلاتی ہے۔ عام طور پر یہ ایک شریف مخلوق تصور کی جاتی ہے لیکن اس کی ساری شرافت اس وقت رخصت ہو جاتی ہے جب اسے زکام ہونے لگتی ہے۔ اس حالت میں وہ ایسی [illegible] لیتی ہے کہ کچھ مت پوچھیے۔ آپ نے سنا ہی ہو گا کہ مینڈکی چلی مداروں۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ حرکت بھی اس سے صرف اسی وقت سرزد ہوتی ہے جبکہ وہ زکام میں مبتلا ہو گئی ہو۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کہ مینڈکی کو زکام کیسے ہو سکتا ہے۔ ہوتا ہے اور ضرور ہوتا ہے۔ اس بات کو ہم عقل سے نقل سے روایت سے ہر طریقے سے ثابت کر سکتے ہیں۔ لیکن فی الحال ایک روایت سنیے مخفی مبادکہ دروغ بر گردن راوی۔ سنتے ہیں کسی زمانے میں بڑے زوروں کی برسات ہوئی اور جنگل کے سارے جانوروں کو سردی اور زکام کی شکایت ہو گئی کیوں کہ انھیں عادت کے خلاف پانی میں رہنا پڑا تھا۔ بقول شاعر:

کیا آب و ہوا ہے ترے کوچے کی ستمگر
دیکھا جسے دیکھی ہے اسے دل کی شکایت

جسے دیکھو چھینک رہا ہے یا کھانس رہا ہے ایسے میں دیکھا گیا کہ بی مینڈکی کانوں پر کنٹوپ چڑھائے سینے پر گرم دوشالہ لپیٹے ایک ہاتھ میں غالباً inhaler لیے پھدک پھدک کر کہیں جا رہی ہیں۔ کہیں سے میاں ہرن بھی قلانچیں بھرتے ادھر آنکلے۔ مینڈکی کو اس حال میں دیکھا تو پوچھا بی مینڈکی کدھر کی روانگی ہے۔ بی مینڈکی نے پہلے تو دو چار زبردست چھینکیں لیں۔ اس کے بعد ناک سے شوں شوں کی آواز نکالی اور بھرّائے ہوئے گلے سے بولیں۔ بھیا گزشتہ دنوں ہمارے تالاب پر بھی زبردست بارش

ہوئی جس کی وجہ سے مجھے بھی زکام ہوگیا ہے۔ حکیم صاحب کے پاس جا رہی ہوں۔ یہ جواب سن کر ہرن کے دل پہ کیا گزری۔ راوی اس بارے میں خاموش ہے لیکن ہمارا قیاس ہے کہ میاں ہرن اپنی چوکڑی بھول گئے ہوں گے۔

تو صاحبو یہ قصہ ہے مینڈکی کے زکام کا۔ لیکن یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جس پر اچنبھا کیا جائے کیونکہ آج بھی مینڈکی کو زکام ہوتا ہے۔ ذرا آس پاس نظر دوڑائیے کتنی ہی مینڈکیاں زکام کی ماری نظر آتی ہیں۔ بعض وقت تو زکام کا حملہ اس قدر شدید ہوتا ہے کہ مینڈکی کی حالت پر افسوس کے علاوہ رحم بھی آنے لگتا ہے۔

ادب۔ سیاست۔ تجارت۔ فنونِ لطیفہ۔ شاعری۔ قانون۔ فلسفہ۔ عدلیہ۔ انتظامیہ غرض کون سا کنواں ہے جو مینڈکیوں سے خالی ہے اور کون سا طبقہ ہے جس میں بعض مینڈکیوں کو زکام نہیں۔ ابھی حال میں ایک مینڈکی کو زکام ہوا تو اس نے اپنی موہوم سی گردن اکڑا کر کہا اقبال کی شاعری تو سرے سے شاعری ہی نہیں۔ ایک اور مینڈکی کو زکام ہوا تو اس نے کہا فراق تو تیسرے بلکہ چوتھے درجے کا شاعر ہے۔ ایک مینڈکی جس پر زکام کا حملہ نسبتاً شدید تھا اپنے کنوئیں میں حلق پھاڑ پھاڑ کر چلّا رہی تھی۔ اردو غزل قابلِ گردن زدنی ہے۔ کوئی مینڈکی ساری دنیا کو فتح کرنے کے خواب دیکھنے لگتی ہے۔ کسی مینڈکی کو زکام ہو جاتا ہے تو وہ اپنے آپ کو عالمی امن کا ٹھیکہ دار سمجھنے لگتی ہے۔ زکام ایک متعدی مرض ہے۔ ایک سے دوسرے کو بڑی آسانی سے لگ جاتا ہے۔ مثلاً فرض کیجیے کہ مینڈکی کو زکام نے ارسطوئے زماں بنا دیا ہے۔ اس کا یہ زکام جب دوسری کو لگتا ہے تو شدت اختیار کر جاتا ہے۔ جس کے نتیجے میں وہ اپنے آپ کو افلاطون سمجھنے لگتی ہے۔ یہی حال زندگی کے دوسرے شعبوں کا ہے۔ ایک مینڈکی کا زکام اس طبقے کی ساری مینڈکیوں کو متاثر کرتا ہے۔ یہاں تک کہ شوقِ زکام میں ناک کٹنے کی نوبت آجاتی ہے۔ مینڈکی کے زکام اور اس کے عبرت ناک انجام کے واقعات بہت ہیں۔ مختصر یہ کہ کسی نے کہا تھا خدا سر دے تو سودا بھی دے۔ لیکن ہم یہ کہتے ہیں خدا ناک دے لیکن مینڈکی کا زکام نہ دے۔

سعدیہ غوری
(ریاض)

کاک ٹیل

ایک صاحب اپنے دوست کو رات کے کھانے پر گھر لے گئے۔ گھر میں داخل ہوتے ہی ان صاحب نے اپنی بیگم کو محبت بھری نظروں سے دیکھا اور پیار بھرے انداز میں کھانا مانگا۔ کھانے کے بعد انہوں نے بیگم کے کھانے کی تعریف کی اور پہلے سے زیادہ محبت بھری نظریں بیگم کے چہرے پر ڈالیں۔

دوست نے کہا۔ "یار کیا تم اپنی بیوی سے ہمیشہ اسی محبت سے پیش آتے ہو؟"

انہوں نے جواب دیا "ہماری شادی کو بیس سال گذر چکے ہیں اور آج تک ایک دن بھی ایسا نہیں آیا جب میں نے بیگم سے محبت کی باتیں نہ کی ہوں"۔

دوست نے کہا "مجھے آج معلوم ہوا کہ خوشگوار ازدواجی زندگی کا راز محبت میں مضمر ہے میری شادی کو پندرہ سال ہوگئے ہیں لیکن میں نے شادی کے چند ماہ چھوڑ کر بیوی سے کبھی پیار بھری گفتگو نہیں کی مگر اب میری آنکھیں کھل گئی ہیں میں تم سے زیادہ اپنی بیوی سے محبت کروں گا"

چنانچہ وہ گھر گیا اور بیوی سے بولا "آج کی رات تم کتنی پیاری معلوم ہو رہی ہو۔ تمہارا یہ سبز لباس تمہارے جسم پر کتنا بھلا معلوم ہو رہا ہے تمہاری ان بڑی بڑی آنکھوں کے سامنے ہرن کی آنکھیں کچھ بھی نہیں"۔

ابھی وہ بیوی سے محبت بھری باتیں کر ہی رہا تھا کہ بیوی نے روتے ہوئے بتایا "ننھے کے خسرہ نکل آئی ہے، منی کی آنکھیں دکھ رہی ہیں۔ ریفریجریٹر کو بھی آج ہی خراب ہونا تھا۔ پریشانی کی وجہ سے سارا سالن بھی جل گیا ہے اور اب تم گھر میں شراب پی کر آگئے ہو؟"

●

ہمارے اور ضمیر جعفری کے درمیان کوئی قدر مشترک نہیں، وہ سید ہم شیخ۔ وہ کھرے فوجی اس پر میجر، ہم ایک سیویلین اس پر پیر مگر نابالغ یعنی مائنر۔ ہم ادب برائے زندگی کے قائل اور زندگی برائے بندگی کی طرف مائل جبکہ وہ ادب برائے ادب سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر اپیی کیورس کے فلسفہ اکتساب مسرت پر عامل اور زندگی اور ادب دونوں سے حسب توفیق مسرت حاصل کرنے میں کوشاں وہ قدیم ہونے کے باوجود جدید یعنی جاگیرداری نظام کے پروردہ ہونے کے باوجود صنعتی سماج کی اقدار کے حامل اور ہم جدید ہونے کے باوصف قدیم بلکہ قدیم تر یعنی صنعتی تہذیب چشیدہ ہو کر بھی فیوڈل بلکہ قبائلی قدروں کو حرز جاں بنائے رکھنے والے۔ ایسا ہی اختلاف ہم دونوں کے مابین خاندانی منصوبہ بندی کے سوال پر بھی پایا جاتا ہے کہ ہم انسان کو خدا کی مخلوق سمجھ کر اس کی تخلیق میں انسانی ہتھکنڈوں کا چلایا جانا پسند نہیں کرتے اور ضمیر کہتے ہیں کہ

آٹھ برس میں بچے دس ا
بس کر مولا بخشا بس!

یہی معاملہ شاعری کے میدان میں ہے کہ ہم دونوں یک چشم نہیں ہیں جو اسے ایک نگاہ سے دیکھیں۔ وہ شاعری کو معشوقۂ دل نواز سمجھتے ہیں چنانچہ ہمہ وقت اُس کی نوک پلک سنوارنے میں لگے رہتے ہیں، جبکہ ہم "حاجت مشاطہ نیست روئے دلآرام را" کا نعرہ بلند کرکے جو کچھ ذہن میں آتا ہے اور جس طرح آتا ہے اسی طرح نذر کرتے چلے جاتے ہیں۔ ضمیر اپنی معشوقۂ دل نواز کو شاید معنوی جانتے ہیں کہ اس پر نظریات کا بوجھ کم سے کم لادتے ہیں، جبکہ ہم اپنی دلآرام کو تاتاری النسل سمجھ کر اس سے باربرداری مقصد کا کام لیتے ہیں، چنانچہ اس بے چاری کی کمر ہمارے آئیڈیلزم کے بوجھ سے دوہری ہوئی جاتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ضمیر جعفری شاعری کی خدمت کرکے اس کے مخدوم ہیں اور ہم شاعری سے خدمت لینے کی کوشش میں ناکام رہ کر اس کے معتوب ہیں۔

کچھ اور آگے چلیں تو یہی اختلاف شاعری کے ساتھ ساتھ شعرا کے معاملہ میں بھی کارفرما دکھائی دیتا ہے کہ ہم داد دینے کے معاملے میں بخیل ہونے کی حد تک محتاط، اس خوف سے کہ مدح کا نشہ ممدوح کے دماغ پر چڑھ کر اسے بے ادب نہ بنادے اور ضمیر حاتم کی طرح فراخ دل۔ اس اُمید پر کہ ہمت افزائی موصوف کو ادب کی خدمت میں ہمیشہ مؤدبانہ حاضر رکھے گی۔
اسی طرح دوست بنانے کے سلسلے میں بقولِ نذیر احمد شیخ، ضمیر جعفری کا حال کہ :-

ہر کسی سے پُر خلوص و با مروت دوستی
ہر ادیبِ نامور سے بے ضرورت دوستی
ہر مدیر و پبلیشر سے خوبصورت دوستی

دوستی میں مردِ استقلال ہیں میجر ضمیر
...... مسٹر دہلوی ——— "مردِ روشن ضمیر"

رشوت کے نوٹ جس نے لئے وہ بھی آدمی
دو روز جس نے فاقے کئے وہ بھی آدمی
جو آدمی کا خون پیئے وہ بھی آدمی
جو پی کے غم کا زہر جئے وہ بھی آدمی
آنسو بہا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
اور مسکرا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

...... "جدید آدمی نامہ" مجید لاہوری

ایک پہاڑی پر تین انگریز رہتے تھے۔ چھوٹے درجہ کا افسر پہاڑی کے دامن میں، درمیانے درجے کا افسر پہاڑی کے اُوپر اور سب سے بڑا افسر چوٹی پر رہتا تھا۔ ان تینوں کے کپڑے ایک ہی دھوبی دھوتا تھا۔ وہ اپنا گدھا پہاڑی کے بیچ تک لے جاسکتا تھا لیکن چوٹی تک گدھا نہیں لے جاسکتا تھا کیونکہ راستہ خراب تھا۔ بڑے افسر نے دیکھا دھوبی سب کے گھر گدھا لے جاتا ہے میرے گھر نہیں لاتا۔ اسے اپنی اس توہین پر غصہ آگیا۔ جب دھوبی آیا تو انگریز افسر نے انگلی کے اشارے سے اپنی ٹوٹی پھوٹی اردو میں کہا "یہ گدھا، وہ گدھا، ہم نہیں گدھا" دھوبی نے گھبرا کر ہاتھ جوڑے اور کہا "ہاں صاحب آپ بھی گدھا"۔

زیرِ لب

منتخب اشعار

اس عنوان کے تحت ہر مہینہ قارئین کی پسند کے اشعار شائع کیے جائیں گے (ادارہ)

سعدیہ غوری (ریاض)
وزنی بیگم کا جو تولا تو وہ نکلا ڈھائی من
اور شوہر سوکھ کر آلو بخارا ہو گیا .... شاہین

پولیس کرا لیتی ہے ہر چیز برآمد
اس سے بھی کہ جس نے وہ چرائی نہیں ہوتی .... انعام الحق جاوید

ہے میزبانی کا یہ تقاضا کہ آئے مہماں تو مسکرا دو
مگر طبیعت یہ چاہتی ہے گلے ملو اور گلا دبا دو.... سرفراز شاہد

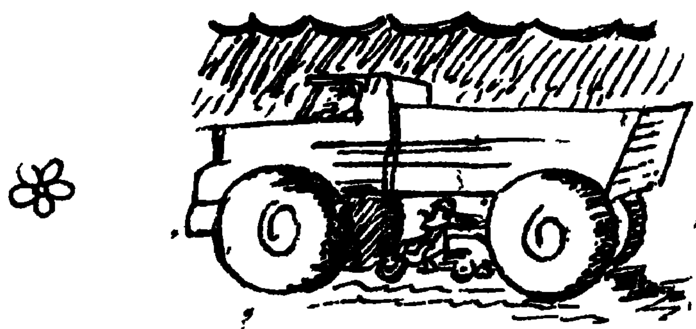
ایک بوڑھا سرو کا ہے ایک برگد کا تڑی
ایک ہے بیوی مری اور اک مری سکریٹری .... قمر زیدی

نزہت النساء جدہ۔ کوئی خاتون پڑھے شعر تو اکثر شاعر
داد دیتے ہوئے تھوڑا سا مٹک جاتے ہیں.... عبدالحکیم ناصف

روز تھی بیگم سے کل کل زہر آخر کھا لیا
میرا کیا بگڑا اسی کی بیوگی چکر میں ہے — گستاخ گیاوی

سارہ مہدی حیدرآباد — اف یہ لاٹھی چارج بھی کیا ساز ہے
بج رہا ہے اور بے آواز ہے

مزاحیہ ہے اگر شاعری تو یوں پڑھیے
کہ لوگ آپ کی صورت کو دیکھ کر رو دیں .... دلاور فگار



بارش سے بچنے کی
آسان ترکیب

ماہنامہ

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

شگوفہ

حیدرآباد

جلد ۲۵ شمارہ ۱۰

اکتوبر ۱۹۹۲ء

سعودی عرب نمبر

★ ترسیلِ زر و خط و کتابت کا پتہ:

۳۱ - بیچلرز کوارٹرز۔ معظم جاہی مارکٹ

حیدرآباد 500001 اے پی (انڈیا)

سرورق: طالب خوندمیری

کتابت: ۔ کمپیوٹر کارپوریشن، بنجارہ ہلز

محمود سلیم

طباعت: صام پرنٹنگ پریس (برائے دائرہ پریس، چھتہ بازار)

فی پرچہ: دس روپے

زرِ سالانہ: ۶۵ روپے

بیرونی ممالک سے۔ ۲۰ ڈالر

★ فون: آفس: 557716

مکان: 521064

اِس تھیلی کے چٹّے بٹّے (فہرست)

مہمان اداریہ

بر سبیل تذکرہ

کسی بھی ادبی رسالے کے خاص نمبر کا اجراء قارئین کو یہ سوچنے کی طرف مائل کرتا ہے کہ آخر اس خصوصی نمبر کی کیا ضرورت تھی۔ ظاہر ہے کہ یہی سوال "شگوفہ" کے قارئین کے ذہن میں بھی ہوگا۔

اس سے پہلے کہ ہم شگوفہ کے سعودی نمبر کی ضرورت کا تعین کریں، شگوفہ جیسے رسالوں کی افادیت اور اہمیت پر گفتگو کرنی ہوگی اور اس پر غور کرنے سے پہلے طنزیہ ومزاحیہ ادب کی قدر و منزلت کا جائزہ لینا ہوگا۔ عجیب بات یہ ہے کہ بعض ناقدین طنز و مزاح کو ثانوی حیثیت دیتے ہیں لیکن وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ بقول دانتے اس کائنات کا تمام تخلیق ایک Divine Comedy ہے ہنسی کی اہمیت کو ہر دور میں تسلیم کیا گیا، اور دنیا کی تمام ترقی یافتہ زبانیں طنزیہ ومزاحیہ ادب سے مالا مال ہیں۔ اگر طنز و مزاح کی قدر نہ ہوتی تو شکسپیئر، برنارڈ شاہ اور غالب یوں مستند و مقبول نہ ہوتے۔

مشکل یہ ہے کہ اردو طنزیہ ومزاحیہ ادب کی ترقی اور اردو داں و اردو خواں عوام کے ذہن پر صحتمند تاثر قائم کرنے والے ادارے عنقا ہیں۔ لیکن یہ بے بضاعتی صرف اردو ادب کی ہی نہیں بلکہ برطانیہ میں بھی انگریزی کا مشہور رسالہ PUNCH ایک عرصہ تک طنز و مزاح کا پرچم بلند رکھنے کے بعد مسدود ہوگیا۔ اسی طرح امریکہ میں ہمیں اس نوعیت کا ایک ہی رسالہ NEW YORKER نظر آتا ہے۔ دراصل یہ رسالے صرف اس لئے مشکلات کا شکار ہوئے کہ ایسے رسالوں کی مالی معاونت کے لئے ماحول سازگار نہیں۔

شگوفہ وہ واحد ہندوستانی رسالہ ہے جو ایک طویل عرصہ سے سنجیدگی کے ساتھ طنزیہ ومزاحیہ ادب کا علم بلند کئے ہوئے ہے۔ یہ اعزاز یوں بھی قابل قدر ہے کہ ہندوستان کی سرکاری زبان اردو نہیں ہے۔ رسالے ادب کی تشہیر و تبلیغ کا اہم ترین ذریعہ ہوتے ہیں گو کہ یہ کام کتابیں اور اخبار بھی کرتے ہیں لیکن ادب کے قارئین نے ہمیشہ رسالوں کو اولیت دی ہے۔ کسی بھی معیاری رسالے کے مدیر کے لئے اہم ترین کام اپنا نہیں بلکہ اپنے رسالے کا پیٹ بھرنا ہوتا ہے، اور اس رسالے کو ایسی غذا فراہم کرنی ہوتی ہے جسے قارئین آسانی سے ہضم کر سکیں۔

قابل مطالعہ اور معیاری تخلیقات بہت مشکل سے حاصل ہوتی ہیں۔ میری دانست میں "شگوفہ" یہ کام بھی بہت خوش اسلوبی سے انجام دے رہا ہے۔

برصغیر میں اردو طنز و مزاح کا سفر بہت طویل اور مسلسل ارتقاء پذیر ہے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ، عظیم بیگ چغتائی، اکبرالہ آبادی، نظیر اکبرآبادی، رشید احمد صدیقی، احمد شاہ بخاری پطرس، شفیق الرحمن، مشتاق احمد یوسفی، شوکت تھانوی ابراہیم جلیس، ابن انشاء، کرنل محمد خاں، ضمیر جعفری، کنھیالال کپور، فکر تونسوی وغیرہ کی جلائی ہوئی شمعیں اٹھائے ہوئے کاروان طنز و مزاح مسلسل رواں دواں ہے۔ کبھی یہ مشعل مجتبیٰ حسین کے ہاتھ میں ہوتی ہے کبھی یوسف ناظم اور دلاور فگار کے۔ قافلے بڑھتے رہتے ہیں، ہاتھ بدلتے رہتے ہیں لیکن طنز و مزاح کی مشعل مسلسل پوتر اگنی کے مانند روشن رہتی ہے۔ اس مشعل برداری کے ذریعہ جو بنیادی کام شگوفہ انجام دے رہا ہے وہ یہ ہے کہ ادارہ ایسے نئے اور اچھے لکھنے والوں کو متعارف کرتا رہتا ہے جو آگے چل کر اردو ادب کا سرمایہ بن جاتے ہیں۔

اب آیئے شگوفہ کے سعودی عرب نمبر کی طرف۔ سوال یہ ہے کہ اردو کے ایک اہم طنزیہ ومزاحیہ رسالے کو سعودی

عرب نمبر نکالنے کی ضرورت کیسے پیش آئی دراصل یہ ضرورت رسالہ کی نہیں بلکہ اردو ادب کے قارئین کی ہے۔

بہت کم لوگوں کو یہ اندازہ ہوگا کہ برصغیر ہند و پاک سے باہر اردو بولنے، پڑھنے اور سمجھنے والوں کی سب سے بڑی تعداد مشرق وسطیٰ میں مقیم ہے اور ان کا سب سے بڑا مرکز سعودی عرب ہے جہاں اردو سمجھنے والوں کی تعداد دس لاکھ سے کسی صورت میں کم نہیں۔ حقیقتاً عربی زبان کے بعد اردو یہاں کی سب سے زیادہ بولی اور سمجھی جانے والی زبان ہے۔ اردو کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ سعودی ریڈیو روزانہ مقامی براڈکاسٹنگ میں دو گھنٹے کا اردو پروگرام نشر کرتا ہے۔ متحدہ عرب امارات اور کویت ریڈیو بھی ایسے ہی پروگرام نشر کرتے ہیں۔ تقریباً تمام پاکستانی اخبار روزانہ یا ہر ہفتہ مشرق وسطیٰ میں مقیم اردوداں طبقے کے لئے خصوصی صفحات کا اہتمام کرتے ہیں۔ شگوفہ کا سعودی نمبر دراصل اس کثیر اردوداں طبقے کی ایک اہم ضرورت پوری کرتا ہے۔ مشرق وسطیٰ میں عارضی طور پر قیام پذیر لوگ دراصل یہاں کے آرام دہ اور بظاہر پرسکون ماحول میں رہ کر یہ بھول جاتے ہیں کہ وہ دراصل صحراؤں کے درمیان مصنوعی نخلستانوں میں زندگی گذارتے ہیں وطن سے دوری، سماجی مشکلات، نفسیاتی الجھنیں، بین الاقوامی تناؤ اور اہل وطن کی کوتاہیاں اور اس طرح کے بے شمار مسائل۔ ان کی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ان مشکلات کو یک گونہ آسان کرنے میں یا یوں کہئے کہ کچھ لمحوں کے لئے بھولنے میں مزاحیہ ادب ایک اہم کردار ادا کرتا ہے جو نہ صرف چند لمحوں کے لئے مسکرانے کی فرصت فراہم کرتا ہے بلکہ ہنستے ہنستے ناہمواریوں سے مجادلہ کرنے کی ہمت عطا کرتا ہے۔

شگوفہ کے اس خاص نمبر کے اجراء میں جو کردار ڈاکٹر عابد معز اور ان کے معاون جناب شجاع الدین غوری نے ادا کیا ہے وہ بلاشبہ نہ صرف یہ کہ قابل تحسین ہے بلکہ قابل تقلید ہے۔ سب سے پہلے تو انہوں نے سعودی عرب کے سب منطقوں میں آباد اردو لکھنے والوں کو اس نمبر میں شامل کرنے کا بیڑہ اٹھایا اور ساتھ ہی قلم کاروں کے انتخاب پر پوری توجہ مرکوز کی تاکہ اس خاص نمبر میں نمائندہ بلکہ عمدہ تخلیقات شامل ہوسکیں۔ ان کی کامیابی کا فیصلہ تو قارئین ہی کریں گے لیکن یہ کوششیں قابل ستائش ضرور ہے۔ انہوں نے نہ صرف یہ کہ نئے لکھنے والوں کو ڈھونڈ نکالا بلکہ بہت پرانے اور مستند لکھنے والوں کو اس خاص نمبر کے لئے قلم برداری پر راضی کیا تاکہ اس خصوصی اشاعت کا اعتبار قائم ہوسکے۔

میں ذاتی طور پر اور ادارہ شگوفہ کی طرف سے ان ادیبوں اور شاعروں کا شکریہ ادا کرنا بہت ضروری سمجھتا ہوں جنہوں نے ہماری درخواست کو درخور اعتناء سمجھا اور اس اہم نمبر کے معیار کو بلند سے بلند تر بنانے میں ہماری مدد کی۔

میں ڈاکٹر عابد معز اور ادارہ شگوفہ کا شکر گذار ہوں کہ انہوں نے مجھ جیسے نوآموز اور غیر معروف شخص کو اس اہم نمبر کے اعزازی مدیر کے طور پر منتخب کیا۔ یہ انتخاب میرے لئے اس لئے اہم ہے کہ شگوفہ جیسے رسالوں کا اثر عرصہ تک قائم رہتا ہے اور ان کے نام کے ساتھ ہمارا نام شریک ہو جاتا ہے۔ ایک دن آئے گا جب شاید ڈاکٹر عابد معز میرے بارے میں کہیں گے کہ

منم کردہ ام رستم داستاں
وگرنہ یلے بود در پاستاں

مجھے امید ہی نہیں یقین ہے کہ شگوفہ کے اس طرح کے خاص نمبروں کا سلسلہ آئندہ بھی جاری رہے گا اور قارئین اور قلمی معاونین کی ہمت افزائی ادارہ شگوفہ کو ہمیشہ حاصل رہے گی۔

منیر پرویز

الریاض۔ سعودی عرب
۱۶۔ستمبر ۱۹۹۲عیسوی

پاک وپاکیزہ مزاح

محمد حنیف اللہ والا

عربی زبان کا ایک مشہور مقولہ ہے کہ کلام میں مزاح کو وہی مقام حاصل ہے جو طعام میں نمک کو ہے۔ انسانی فطرت مسرت سے مرکب اور متانت کے ساتھ مسکراہٹ سے ہی حیات انسانی کا قافلہ رواں دواں ہے۔ سرور کائینات، فخر موجودات کی پوری زندگی ایک کھلی کتاب کی طرح ہمارے سامنے ہے حضورؐ نے کس طرح مقصد ربانی کی تکمیل کے لئے اپنی حیات گرامی کا ایک ایک لمحہ وقف کر رکھا تھا اور انتہائی دلسوزی، دردمندی اور سنجیدگی سے فلاح انسانی کے لئے کوشاں رہے لیکن عجیب بات یہ ہے کہ حضورؐ نے کسی مرحلہ پر بھی ترش روئی کو پسند نہیں فرمایا حضورؐ اقدس کی ذات گرامی فطری تقاضوں کو اخلاقی معیار کے ساتھ ہم آہنگ رکھنے کے لئے وقف رہتی تھی آپؐ نے مزاح میں بھی متانت کا پہلو ہمیشہ ملحوظ رکھا اور کبھی کھلکھلا کر یا قہقہہ لگا کر نہیں ہنستے تھے بلکہ آپؐ کی ہنسی ہمیشہ تبسم تک محدود رہتی تھی ایک مرتبہ حضرت عائشہ صدیقہ سے پوچھا گیا کہ "یا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کبھی مزاح بھی فرماتے تھے تو آپؐ نے فرمایا" ہاں لیکن مخاطب کے محل و مقام اور استعداد کے مطابق ایسا فرماتے تھے۔"

حضرت حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ ایک روز کوئی ضعیفہ نبی علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئی اور کہا یا رسول صلی اللہ علیہ وسلم! دُعا کیجئے میں جنّت میں جاؤں جس پر آنحضرتؐ نے فرمایا "بوڑھی عورتیں جنت میں نہیں جائیں گی۔" وہ بڑی پریشان ہوئی اور رونے لگی جس پر آپؐ نے فرمایا کہ "جنت میں بوڑھی نہیں جائیں گی بلکہ اللہ تعالیٰ جوان کر کے داخل کرے گا۔" اس پر وہ بڑھیا خوش ہو گئی۔

اس طرح حضرت انس بن مالکؓ راوی ہیں کہ ایک شخص نے رسول اکرمؐ کی خدمت عالیہ میں حاضر ہو کر درخواست کی کہ "اسے کوئی سواری کا جانور عطا فرمائیں آپؐ نے فرمایا ہم تجھے اونٹنی کا بچہ دیں گے اس نے کہا رسولؐ میں اونٹنی کے بچہ کا کیا کروں گا؟ (کیونکہ سواری کے لئے بچہ تو کام نہیں دے گا) آپؐ نے فرمایا اونٹ کا ناقہ یعنی اونٹنی ہی تو جنتی ہے۔

مزاح کا یہ لطیف پیرایہ نہ صرف زیر لب تبسم کا عکاس ہے بلکہ اس میں صداقت کا پہلو بھی پوری آب و تاب سے نمایاں ہے چنانچہ حضرت ابو ہریرۃ سے روایت ہے کہ "لوگوں نے پوچھا یا رسول اللہ آپ مزاح فرماتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا یقیناً مگر اس میں صرف سچی بات کہتا ہوں۔" لطیف ترین اور صداقت پر مبنی مزاح کی ایک اور درخشاں مثال یوں ہے کہ ایک عورت حضورؐ کی خدمت میں پہنچی آپؐ نے اس کے شوہر کی بابت پوچھا تو اس نے نام بتایا جس پر آپؐ نے فرمایا! وہی جس کی آنکھوں میں سفیدی ہے جونہی وہ عورت گھر پہنچی اپنے شوہر کی آنکھ کو غور سے دیکھنے لگی اس کے خاوند نے کہا تجھے کیا ہو گیا ہے! عورت نے جواب دیا میں نے آپ کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے آپ کے بارے میں فرمایا وہی جس کی آنکھوں میں سفیدی ہے۔ یہ سن کر اس نے کہا کہ کیا میری آنکھوں میں سفیدی سیاہی سے زیادہ نہیں ہے۔

حضورؐ کی شگفتہ مزاجی کی ایک اور مثال حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ زاہر نامی ایک دیہاتی اکثر آپؐ کے لئے گاؤں کی چیزیں تحفہ کے طور پر لایا کرتا تھا۔ آپؐ کو بھی اس سے بے حد انس تھا اور آپؐ بھی اسے شہر کی کوئی نہ کوئی سوغات ضرور عنایت کیا کرتے تھے چنانچہ ایک دفعہ آپؐ نے فرمایا کہ "زاہر ہمارا جنگل ہے اور ہم اس کے شہر ہیں" زاہر کی شکل و صورت بھی اچھی نہ تھی ایک دن وہ اپنا سودا بیچ رہا تھا کہ حضورؐ پیچھے سے آئے اور بے خبری سے اپنی آغوش میں لے لیا اس نے کہا کون ہے مجھے چھوڑ دے مگر جب مڑکر دیکھا تو رسول خدا تھے جس پر وہ اپنی کمر حضورؐ کے سینہ مبارک سے ملنے لگا آپؐ نے فرمایا یہ غلام کون خرید تا ہے؟ زاہر کہنے لگا یا رسولؐ آپؐ مجھے کھوٹا سکہ پائیں گے آپؐ نے فرمایا مگر اللہ کے نزدیک تو بہت قیمتی ہے۔

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرمؐ کے لئے شائستہ مزاح پیدا کرنا تبلیغی اور دینی ضرورت بھی تھی کہ حضورؐ کی ذات گرامی ایسا نہ کرتی تو ان کے قدرتی رعب و جلال کی بنا پر حاضرین کا ان کے قریب میں رہنا بھی مشکل ہو جاتا مزید براں سنت نبویؐ کی پیروی کرتے ہوئے آنے والے اکابر عملاً مزاح سے اجتناب کرتے یہی سبب ہے کہ حضورؐ بعض اوقات صحابہ کرامؓ کو مزاحاً حسب حال القابات سے بھی نوازتے رہتے تھے چنانچہ حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرمؐ نے ایک روز تفنن کے طور پر فرمایا "اے دو کان والے" بادی النظر میں کان تو ہر شخص کے دو ہی ہوتے ہیں انہیں خصوصیت سے یہ لقب عطا کیا تو ان کے کان بڑے ہونگے بصورت دیگر ان کی قوت سامع کافی تیز ہوگی۔ اس طرح حضرت ابو ہریرہؓ کو یہ لقب (یعنی بلی کا باپ) اس لئے دیا کہ عربی میں ہریرہ بلی کو کہتے ہیں اور آپؐ نے ایک بلی پالی ہوئی تھی اس طرح حضرت علیؓ کو ابو تراب (مٹی کا باپ کا لقب) اس بنا پر مرحمت ہوا کہ ایک دن خاک پر سوتے میں ان کے رخسار مٹی لگی ہوئی تھی۔

" سرور کائنات جہاں خود شستہ مذاق کرتے تھے وہاں اگرچہ صحابہ کرام بھی اس نوع کا مذاق کرتے تو اس سے محظوظ ہوا کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت عوف بن مالکؓ روایت کرتے ہیں کہ سرکار دو عالمؐ غزوہ تبوک کے دوران ایک بالکل چھوٹے سے خیمہ میں بیٹھے تھے کہ ایک شخص نے باہر سے سلام عرض کیا آپ نے سلام کا جواب دیا اور فرمایا کہ اندر آجاؤ۔ میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ کیا پورا آجاؤں فرمایا ہاں پورے آجاؤ۔ آپؐ کا تبسم بھی اس لئے تھا کہ آپؐ کے ساتھ مصالح خلق وابستہ تھے البتہ کبھی کبھی بوقت تبسم آپؐ کے دندان مبارک نظر آجاتے۔ اس وقت دندان مبارک یوں چمکتے تھے جیسے بادلوں کی اوٹ سے بجلی چمکی ہو۔ اس سلسلہ میں عامر بن سعد بن ابی وقاص راوی ہیں کہ انہوں نے دیکھا کہ آپؐ نے غزوہ خندق کے موقع پر تبسم فرمایا اور آپؐ کے دندان مبارک نظر آنے لگے عامر نے اپنے والد صاحب سے پوچھا کہ حضورؐ کا تبسم کس نوع کا تھا اس پر سعد کہنے لگے کہ غزوہ خندق میں ایک آدمی نے تیروں سے بچنے کے لئے لوہے کی ڈھال کا سہارا لیا ہوا تھا۔ میں تیر پھینکتا جا رہا تھا اور وہ شخص اپنا چہرہ ڈھال سے بچا رہا تھا اسی دوران میں نے ایک تیر چلانے کے لئے نکالا۔ اس نے اچانک سر اونچا کیا میں نے فوراً تیر چلا دیا جو اس کی پیشانی میں دھنس گیا اور وہ بل کھا کر گر پڑا اس کی یہ کیفیت دیکھ کر رسول خدا بے ساختہ مسکرا پڑے اس وقت ہم نے آپؐ کے دندان مبارک دیکھے۔

حضورؐ چونکہ "افصح العرب" تھے اس لئے آپ کا ہر ارشاد فصاحت و بلاغت کی بے پایاں کیفیتوں کا امین ہوتا تھا آپ کا مزاح شگفتگی، شائستگی اور پاکیزگی کا حامل تھا۔ حضورؐ کے مزاح میں شگفتگی بدرجہ اتم موجود تھی۔ دلآزاری کا شائبہ بھی نہیں تھا اور اسی انداز کی تقلید ہم سب پر لازم ہے۔

قاری سید صدیق حسین

(ریاض)

میری پیدائش ۳۰ / مارچ ۱۹۵۴ء میں حیدرآباد میں ہوئی، نام سید صدیق حسین رکھا گیا۔ والد صاحبزادہ قاری سید امانت حسین صاحب ہیں جو حیدرآباد کے جید قراء میں شمار کئے جاتے ہیں۔

۱۹۷۰ء میں میٹرک پاس کیا۔ ۱۹۷۰ تا ۱۹۷۵ء انٹر اور گریجویشن انوار العلوم کالج ملے پلی سے مکمل کیا۔ بی اے کی تکمیل کے بعد آرٹس کالج عثمانیہ یونیورسٹی سے عربی میں ۱۹۷۷ء میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ پروفیسر سید ابراہیم ندوی صاحب مرحوم کی نگرانی میں ۱۹۷۹ء میں ایم فل کے لئے "انیسویں صدی میں عربی نثر کا ارتقاء مصر میں" کے موضوع پر مقالہ پیش کیا۔ اس کے بعد سنٹرل انسٹیٹیوٹ آف انگلش اینڈ فارن لینگویجس حیدرآباد سے PGDTA (پوسٹ گریجویٹ ڈپلوما ان ٹیچنگ آف عربک) پروفیسر عبدالحلیم ندوی صاحب کی نگرانی میں، ۱۹۸۰ میں مکمل کیا۔ دوران ڈپلوما انوار العلوم کالج ملے پلی میں جزوقتی لکچرر کی حیثیت سے چند ماہ خدمات انجام دیا۔ گردش لیل و نہار نے سمندر پار ملازمت کے سلسلے میں ۱۹۸۱ء میں بغداد پہنچا دیا۔ جہاں ایک کنسٹرکشن کمپنی میں تین سال تک مترجم و افسر رابطہ کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔

۱۹۸۴ میں عراق سے مستقل طور پر ہندوستان واپس ہوا۔ عراق سے واپسی کے بعد زندگی کا ایک اہم واقعہ رونما ہوا۔ یہ واقعہ میری شادی سے متعلق ہے۔ جو ۲۳ ستمبر ۱۹۸۴ کو "حالت کرفیو" میں انجام پائی۔ اس وقت شہر ۹ ستمبر کو بھیانک تباہی کے بعد مسلسل کئی دنوں تک کرفیو کی لپیٹ میں تھا، چونکہ تاریخ مقرر ہو چکی تھی اس لئے شادی بھی کرفیو کی زد میں آگئی، دوست احباب کو شادی میں شرکت کے بعد شادی خانے سے اپنے اپنے گھروں کو واپس ہونے کے دوران پولیس والوں سے آنکھ مچولی کھیلنے پر مجبور ہونا پڑا تھا، بعض احباب نے تو پولیس والوں کے ڈنڈے بھی کھائے۔ آج بھی اس تاریخی دن کو "کرفیو میاریج" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ کیونکہ ہمیں تو "لو میاریج" "کورٹ میاریج" یا انٹرکاسٹ

میارتیج کے نام سے کوئی دن منانے کا موقع تو نہیں ملا تھا۔

عراق سے واپسی کے بعد ۱۹۸۵ء میں سلطنت آف عمان مسقط جانے کا اتفاق ہوا جہاں سیب میں سلطان قابوس یونیورسٹی پراجکٹ میں بحیثیت مترجم و پی آر او (۱۴) مہینے خدمات انجام دیں۔

مسقط سے واپسی کے بعد ۱۹۸۷ء کے اوائل سے میرے کرم فرما جناب محمود بن محمد صاحب سفیر ہند کی دلچسپی کے باعث ہندوستانی سفارتخانے میں بحیثیت مترجم انجام خدمات دے رہا ہوں۔

قرات کی ابتدائی تعلیم والد بزرگوار کی سخت نگرانی میں بچپن ہی میں تکمیل پائی۔ مکمل قرآن مجید تجوید کے ساتھ والد بزرگوار کے آگے اختتام پایا۔ ادارہ کلیمیہ سے سند حاصل کی۔ پھر استاذ محترم الحاج ڈاکٹر قاری سید کلیم اللہ حسینی صاحب مرحوم نے سند تواتر عطا فرمایا۔ والد محترم نے فن تجوید قاری کرنل تاج احمد خان اور لحن قاری عبدالباری صاحب مرحوم سے سیکھی تھی۔

۱۹۷۲ء میں کل ہند مقابلہ قرات منعقدہ کالی کٹ اور ۱۹۷۳ء میں اذان و قرات کے کل ہند مقابلے میں منعقدہ کالی کٹ کیرالا انعام اول حاصل کیا۔ کیرالا ہی کے ایک اور مقام پمباوور میں ۱۹۷۴ء میں اذان و قرات کے مقابلوں میں انعام اول حاصل کیا۔ کاسرگوڈ کیرالا میں بھی منعقدہ اذان و قرات کے مقابلوں میں انعام اول حاصل کیا۔ ترچناپلی کے جمال محمد کالج کی سلور جوبلی تقاریب کے سلسلے میں منعقدہ مقابلہ قرات میں بھی انعام اول حاصل کیا۔

۱۹۷۴ء میں مولانا عبداللہ قریشی صاحب موجودہ خطیب مکہ مسجد کے ہمراہ قرات کے بین الاقوامی مقابلہ قرات منعقدہ ملیشیا میں ہندوستان کی نمائندگی کی۔ دوسرے سال یعنی ۱۹۷۵ء میں بھی ملیشیا کے مقابلوں میں شرکت کی، پھر پانچ سال کے وقفے کے بعد ۱۹۸۰ء میں تیسری مرتبہ بھی ہندوستان کی نمائندگی کا موقع ملا۔ اس مرتبہ کی نمائندگی پر جملہ اکیس قرا میں ساتواں مقام حاصل ہوا تھا۔ اسی دورے میں ہمیں سنگاپور اور جکارتا میں بھی قرات کے مظاہرے کے لئے روانہ کیا گیا تھا۔

۱۹۷۵ء میں مرحوم صدر جمہوریہ ہند فخرالدین علی احمد کی جانب سے "بہترین قاری" کا ایوارڈ بھی عطا کیا گیا۔

عربی میں مزاح کے چند نمونے

قاری صدیق حسین

عربی ادب میں طنز و مزاح کی روایت زمانہ قدیم سے ہی ملتی ہے۔ یہ موضوع بجائے خود بڑا اہم اور دلچسپ ہے یہاں طلوع اسلام کے بعد عربوں میں طنز و مزاح کا ایک اجمالی خاکہ پیش ہے۔

عہد نبوی میں خود صحابہ کرام بھی نہایت شائستہ ڈھنگ سے آپس ہی میں مذاق کیا کرتے تھے ان کا مزاح شگفتگی، تفریح طبع اور آداب کے حدود سے متجاوز نہیں ہوا کرتا تھا۔ اس ضمن میں ایک مشہور واقعہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

سابقون الاولون صحابہ جن میں حضرت عمر ابن خطابؓ اور علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ شامل تھے ایک دفعہ

اپنے ایک ساتھی کے پاس مدعو تھے اس موقع پر دیگر اکابر صحابہ بھی موجود تھے عربوں کی روایات کے مطابق دستر خوان پر کھجور بھی چنے گئے تھے صحابہ از راہ مذاق کھجوروں کی گٹھلیاں نظریں بچا بچا کر حضرت علیؓ کے آگے جمع کرنے لگے جب بہت ساری گٹھلیاں حضرت علی کے سامنے جمع ہو گئیں تو ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر مسکراتے تھے اس سے یہ جتانا مقصود تھا کہ دستر خوان پر سب سے زیادہ کھجوریں حضرت علیؓ نے کھائی ہیں۔ حضرت علیؓ اس لطیف اور شائستہ مذاق کو بھانپ گئے اور خود بھی لطف اندوز ہوتے ہوئے مسکراتے گئے جب لوگوں نے حضرت علیؓ کی طرف دیکھ کر کہا کہ "علیؓ نے سب سے زیادہ کھجوریں کھائی ہیں" ۔ اسی لئے تو ان کے سامنے کھجوروں کی باقیات کا ڈھیر سا لگا ہے تب حضرت علیؓ نے برجستہ فرمایا "شکر ہے کہ میں نے گٹھلیاں چھوڑ دیں ورنہ باقی سبھوں نے کھجوریں گٹھلیوں سمیت کھالی ہیں" حضرت علی کے اس برجستہ فقرہ پر محفل زعفران زار ہو گئی۔

ابو العلی المعری کی تصنیف "رسالتہ الغفران" عربی ادب میں ممتاز حیثیت رکھتی ہے اس کتاب میں طنز و مزاح کے اعلیٰ نمونے ملتے ہیں۔ مغربی نے اس میں جنت کی سیر کا دلچسپ حال بیان کیا ہے۔ ایک عابد و زاہد کو اس سیر میں وہ سارے احباب جنت میں دکھائی دیتے ہیں جنہیں وہ جہنمی گردانتے تھے۔ مُصنف بڑے حسین انداز میں ان احباب کی ایک ایسی نیکی کو گنواتا ہے جو اللہ تعالیٰ کو بڑی پسند آتی ہے، اور اس نیکی کے بدلے انھیں جنت میں داخل کر دینے کا فرمان جاری ہو گیا۔ مغربی نے ان تفصیلات کو بے حد دلچسپ پیرائے میں بیان کیا ہے جس میں طنز کے نشتر ہی نہیں مزاح کی تمام تر لطافتیں ملتی ہیں۔

مشہور عربی عالم و ادیب ابو عثمان بن بحر الملقب بہ جاحظ کے پاس بھی طنز و مزاح کا خوبصورت امتزاج ملتا ہے۔ اس کی مشہور کتاب "النجلا" مزاحیہ ادب میں گرانقدر حیثیت کی حامل ہے۔

جاحظ ۸۶۶ء میں بمقام بصرہ پیدا ہوا اس کا تعلق فرقہ معتزلہ سے تھا جاحظ کی تحریروں سے اس عہد کے سیاسی، مذہبی معاشرتی اور اخلاقی حالات کا پتہ چلتا ہے۔ اس کی دیگر کتابوں میں "الحیوان" "البیان والتبیین" اور "التاج" بہت مقبول ہوئیں۔ "النجلا" میں اس نے اپنے عہد کے احوال و کوائف ہی نہیں بلکہ دلچسپ اور لطیف پیرائے میں بخیلوں سے متعلق بے شمار واقعات، قصّے اور لطیفے اکٹھا کئے ہیں۔ جاحظ کے جادو اثر اسلوب نے اس کتاب کو بے پناہ مقبولیت عطا کی جاحظ کو پڑھنے اور لکھنے کا جنون کی حد تک شوق تھا چنانچہ مشہور ہے کہ وہ کتب خانے کرائے پر حاصل کرتا اور رات دن انہماک سے مطالعہ کر کے علم و حکمت کے خزانے سمیٹتا تھا۔ اس کی موت بھی کتابوں کے ڈھیر کے اس پر گر پڑنے کے باعث واقع ہوئی۔ جاحظ قلم کا دھنی اور باکمال مصنف تھا اسی لئے تو "بخل" جیسے موضوع پر قلم اٹھا کر اس نے اپنے فنی کمال اور انسانی نفسیات پر گہری نظر کا ثبوت دیا۔

جاحظ کی کتاب النجلا سے چند واقعات قارئین شگوفہ کی نذر ہے۔

ایک مبروزی اپنے دوست کے ہاں مہمان رہا۔ جب بھی کھانے کا وقت ہوتا وہ اپنے میزبان سے کہتا کاش تو خراسان میں ہوتا تو میں تیری اس طرح مہمانداری کرتا کہ دنیا میں کسی نے نہ کی ہو۔ میں تیری خوب پذیرائی کرتا وغیرہ، چند سال بعد اتفاقاً اس کا میزبان خراسان پہنچا اور اپنے دوست کو ڈھونڈنے لگا جس نے مہمانداری کا وعدہ کیا تھا لیکن جب آمنا سامنا ہوا تو دوست اجنبی بن گیا۔ نہ سلام کا جواب نہ خیر و عافیت کا تبادلہ جب دوست نے توجہ دلائی کہ میں تم سے

کلام کرتا ہوں تب بھی وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ مذاق کا خیال کر کے اس نے سر سے عمامہ اتارا اور اسے یاد دلایا کہ تم فلاں وقت میرے مہمان تھے مجھے اب کیوں نہیں پہچانتے اس نے اپنا حلیہ ظاہر کرنے بدن کی چادر ہٹادی تب دوست نے کہنا شروع تم عمامہ یا کپڑے نہیں بلکہ اپنی کھال سے باہر آجاؤ تو میں تمہیں نہیں پہچانتا۔ یوں جاحظ خراسانیوں کے بخل کو ظاہر کرتا ہے

جاحظ کہتا ہیکہ میں تمہیں سرمایہ لگائے بغیر یا محنت و مشقت کے بغیر آمدنی حاصل کرنے کا ذریعہ بتاتا ہوں۔ اس کے پیش کش پر سامنے والا بڑے ہی خوشی سے یہ سننے کے لئے بے چین ہو جاتا ہیکہ آخر وہ کونسا ذریعہ ہے جو بغیر کسی محنت اور کچھ خرچ کے آمدنی کا باعث بنتا ہے۔ تو وہ کہتا ہیکہ تمہیں جو کچھ آمدنی ہوتی ہے اس میں کفایت شعاری سے کام لو وہ بھی ایک آمدنی کا ذریعہ ہے۔

خراسانیوں کے بخل کے واقعات بیان کرتے ہوئے لکھتا ہیکہ میں نے دنیا جہاں کے مرغوں کو دیکھا ہیکہ وہ پہلے مرغی کو کھلاتا ہے بعد خود کھاتا ہے لیکن خراسانی مرغ مرغیوں کی چونچ سے دانا چھین کے کھاجاتا تھا شاید اہل خراسان کا اثر وہاں کے چرند و پرند پر بھی پڑا ہے۔

اہل خراسان ہی کے واقعات کے سلسلے میں ایک واقعہ یوں لکھتا ہیکہ پاتابے کی طبعی عمر چھے مہینے ہوتی ہے لیکن خراسانی ان کو ایک سال تک استعمال کرتے ہیں وہ کس طرح ؟ تو وہ لکھتا ہیکہ خراسانی چھے مہینے پنجوں کے بل اور چھے مہینے ایڑیوں کے بل چلتا ہے اس طرح پاتابوں کو ایک سال تک استعمال کیا کرتے تھے۔

جاحظ نے اس کتاب میں بے شمار ایسے واقعات کو سند کیساتھ بیان کیا ہیکہ اس کی اہمیت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ واقعات کیساتھ کوئی حدیث کوئی قول اور کبھی کوئی آیت قرآنی بطور دلیل پیش کرتا ہے جس سے جاحظ کی قادر الکلامی کا ثبوت ملتا ہے۔ اتنا عرصہ گزرنے کے باوجود جاحظ کی یہ تصنیف اب بھی لطف دے جاتی ہے اس کا جو بھی مطالعہ کریگا مزاح، ظرافت کی چاشنی سے ضرور مستفید ہوگا۔

▲▲

انور نسیم

بقلم خود

(ریاض)



اپنے بارے میں کچھ لکھنا بہت مشکل سا کام ہے اور عین ممکن ہے کہ کوئی قابل تحریر بات آسانی سے نہ مل سکے۔ قارئین کی دلچسپی یا عدم دلچسپی بھی نظرانداز نہیں کی جاسکتی۔ ملازمت کے اعتبار سے ایک Genticist (جنسیات، علم تکوین یا نسلیات) ہوں اور گذشتہ تین سال سے یہاں کے مستشفیٰ الملک فیصل التخصصی کے "تحقیقاتی مرکز" سے وابستہ ہوں اور اس سے پہلے ۲۳ سال تک کینڈا کے وفاقی تحقیقاتی اداروں سے وابستہ رہا۔ تحقیق کے حوالے سے امراض قلب کی مختلف وجوہات یعنی دل دھڑکنے کا سبب کیا ہے "شاعری میں وجہ "ان کی یاد" ہو سکتی ہے مگر طبعی وجوہات یقیناً کچھ اور ہوں گی! اردو شاعری، افسانہ، اور طنز و مزاح پڑھنے میں دلچسپی گذشتہ چالیس برس سے ہے اور وقتاً فوقتاً حسب توفیق و صلاحیت کچھ لکھنے کی بھی کوشش کرتا رہا ہوں۔ بیک وقت ادب اور سائنس میں دلچسپی کو برقرار رکھا اس لئے بھی کہ دونوں ہی ایک تخلیقی ذہنی کاوش کا نتیجہ ہیں۔ سائنس اور سائنسی شعور، مشاہدات کا تجزیہ اور پھر ان کی اشاعت، شعر کی تخلیق اور ادب کا تنقیدی جائزہ سبھی انسانی ذہانت اور اس کا صحیح استعمال سب کچھ ایک ہی عمل کے مختلف پہلو ہیں۔

ادبی تخلیق کو پرکھنے کے لئے حتی الامکان کوئی objective criteria (معروضی پیمانے) کہ جس کی بنیاد چند معقول اصولوں پر ہو اور سائنسی تحریروں میں تھوڑی بہت چاشنی تاکہ پڑھنے والے کی دلچسپی برقرار رہے یہی امتزاج شخصیت کا بنیادی عنصر رہا ہے۔ اپنے مضمون کی پانچ کتابیں یکجا کی ہی اور کسی حد تک مقبول بھی ہوئیں، ایک کا ترجمہ جاپانی زبان میں ہوا اور ایک حال ہی میں لکھے ہوئے Monograph کا ترجمہ عربی اور فرانسیسی زبان میں ہوگا، ایک سو سے زائد تحقیقاتی مقالے بھی دنیا کے مختلف جرائد میں شائع کر چکا ہوں کہ جن کے بارے میں گماں گذرتا ہے کہ کچھ لوگوں نے پڑھے ہوں گے!

اپنی مکمل سوانح حیات کی تفصیلات آپ پر "مسلط" کرنے کا قطعاً ارادہ نہیں، اردو زبان اور ادب کے حوالے سے اس میدان سے جو رشتہ ہے اس کی مختصر روئداد اور کچھ ذاتی باتیں!

ضلع سیالکوٹ کے ایک قصبہ پسرور میں پیدا ہوا! اس قصبے کی "وجہ شہرت" شاید یہ ہو سکتی ہے کہ علامہ اقبال اور فیض صاحب کا تعلق بھی اسی خطے سے تھا! گھر کا ماحول مکمل طور پر غیر علمی اور غیر ادبی تھا! والد مرحوم کو بچوں کی تعلیم اور ترقی میں بے پناہ دلچسپی تھی لیکن نصاب میں شامل کتابوں کے علاوہ دوسری کتابوں کے مطالعہ کو کم و بیش تضیع اوقات سمجھتے تھے۔

بچپن میں نام محمد انور ہوا کرتا تھا اسے تھوڑا بہت ادبی رنگ دینے کے لئے بدل کر انور نسیم کر لیا! یہ اضافہ کئی سال تک غیر سرکاری ہی رہا! بعد ازاں کنیڈا اور برطانیہ میں جہاں Family names کی زبردست روایت ہے اس

سے عاجز آکر ۱۹۶۸ میں اس نام کو ایک "سرکاری شکل" دے دی۔

افسانے یا مقالے میں نے اتنے زیادہ لکھے نہیں کہ کوئی یہ پوچھنے کی جرات کر سکے کہ "صاحب آخر آپ کیوں لکھتے ہیں"! لیکن اگر آپ یہ جاننا چاہیں کہ "اردو ادب پڑھنے میں آپ کی دلچسپی کا پس منظر"

اپنا تفصیلی "نفسیاتی تجزیہ" تو کبھی میں نے کیا نہیں لیکن "کامیاب" ہونے کی خواہش بچپن سے رہی ہے! فارمولا اس کا Role Models کی تلاش! میٹرک کے امتحان میں صوبے بھر میں ہمارے سکول کا ایک طالب علم اول آیا! اخبار کے انٹرویو میں اس نے اپنا سب سے گہرا شوق اردو کی کتابیں پڑھنا قرار دیا! اپنی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی کہ اہلیت و صلاحیت کو اجاگر کرنے کا نسخہ مل گیا! وہ دن اور آج کا دن اردو کی کتابیں پڑھنے کا شوق قائم ہے! محلے کی ایک لائبریری سے دن بھر کے لئے کتاب کرائے پر ایک آنے میں ملتی تھی اور اپنی غربت کا یہ عالم کہ رات کو دیر تک جاگ کر کتاب کو ختم کرنا لازمی ہوتا! ورنہ چاکلیٹ کھانے کے لئے جو "جیب خرچ" بچا کر رکھتا تھا وہ بھی لائبریری کی نذر کرنا پڑتا۔

پاکستان سے علم نباتات میں ایم ایس سی کی ڈگری حاصل کی۔ بفضل تعالیٰ وطن عزیز میں سائنس کی تعلیم کا نظام کچھ اتنا اچھا ہے کہ طلبا کے پاس فالتو وقت کافی ہوتا ہے! ان "فارغ لمحات" میں لیبارٹری کے ماحول سے نجات پانے اور کچھ ذہنی آسودگی و آسائش کے لئے اطمینان سے کسی قریبی کافی ہاؤس میں بیٹھ کر گپ شپ کرنے اور تازہ ترین فلمی گیت سننے کا موقع مل جاتا ہے۔ میں نے اس فرصت کا بھرپور فائدہ اٹھایا اور لاہور کی ادبی محافل، حلقہ ارباب ذوق، ترقی پسند مصنفین کے اجلاس، مشاعرے، مذاکرے غرض یہ کہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر مختلف تقاریب میں شرکت کی!

تحریر کی موجودہ کوشش نے یہ موقع فراہم کیا ہے کہ ادب میں اپنی دلچسپی کو برقرار رکھنے کے عوامل پہ غور کر سکوں! میں سمجھتا ہوں کہ اس سلسلے میں یہ میری خوش نصیبی ہے کہ مجھے ہمیشہ ایسے اچھے رفقائے کار اور دوست ملتے رہتے ہیں جنہوں نے ہمیشہ میری حوصلہ افزائی کی ہے۔

کنیڈا میں ولی عالم شاہین صاحب سے ۱۹۷۰ء میں ملاقات ہوئی، رگ ساز اور بے نشان کے مصنف، بہت ہی اچھے اور بین الاقوامی شہرت کے شاعر تو ہیں ہی مگر اس سے بھی زیادہ اچھے دوست اور انسان! مجھے یہ کہنے میں قطعاً کوئی تامل نہیں کہ میرے ادبی ذوق اور دلچسپیوں کی نشو و نما میں سب سے زیادہ اہم Influence شاہین صاحب کا ہی ہے! بنیادی طور پر میں ہر کاوش میں سائنسی طریقہ کار کا قائل ہوں! کسی بھی تحریک کو آگے بڑھانے کے لئے ایک صورت جو بیحد موثر ثابت ہو سکتی وہ باہمی تعاون، رابطہ اور مشترکہ کاوش کی ہے۔ اس کے پیش نظر سائنس سے اس خیال کو مستعار لے کر فروغ اردو کے لئے ایک بین الاقوامی تحریک International Network for Promotion of Urdu شروع کی گئی ہے! ان دنوں اس حوالے سے اردو سے وابستہ ہوں۔ اسی سلسلے میں گذشتہ سال دسمبر میں ماریشس میں اردو کی ایک بین الاقوامی کانفرنس منعقد ہوئی تھی اس موقع پر بھی کافی ادیبوں اور شاعروں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ ایسا ہر موقع کسی بھی فرد کی Intellectual Growth میں بیحد مفید ہوتا ہے اور وابستگی کو مزید تقویت ملتی ہے۔

ادب اور سائنس کی ان ہی مصروفیات میں زندگی اطمینان سے گذر رہی ہے۔ لگتا یوں ہے کہ ستارہ میرا ابھی تک صحیح برج میں ہی ہے یہاں ریاض میں عابد معزؔ اور شجاع الدین سے ملاقات ہوئی، اور اب شگوفہ کا "سعودی عرب" نمبر ترتیب دیا جا رہا ہے جس کے لئے مجھے نہ صرف مضمون لکھنا تھا بلکہ یہ خاکہ بھی! یہ سب کچھ انہی دو دوستوں کا کیا دھرا ہے!

ذاتی طور پر مجھے ایک سیدھا سادہ قاری ہونا بہت پسند ہے کہ گھر میں اطمینان سے بیٹھ کر دوسروں کی تخلیقات پڑھتے رہیئے، اور پوری پوری آزادی سے جو بھی رائے چاہیں قائم کر لیں! زیادہ طیش آجائے تو ایک آدھ خط ایڈیٹر کے نام لکھ دیا اور اپنے آپ کو ان تمام ترکاوشوں سے بلند و بالا سمجھ لیا (تصور کر لیں) اپنے بارے میں کوئی بھی خاکہ لکھا جائے تو ضروری ہے کہ اس میں خوشگوار ازدواجی زندگی کا تذکرہ شامل ہو دانشمندی اور مصلحت دونوں کا یہی تقاضا ہے۔ خاکہ کی اشاعت کے بعد گھریلو امن و امان کی صورت حال بہت بہتر ہو جانی چاہیئے۔ میں رسمی جملے لکھنے کا ہرگز ہرگز قائل نہیں لیکن سچی بات یہ ہے کہ میری بیوی ان بھلے لوگوں میں سے ہے جن کو ہر لحہ یہ فکر رہتی ہے کہ گھر کے دوسرے افراد خوش رہیں اللہ تعالیٰ نے اسے اتنی ہمت اور صبر کی طاقت عطا کی ہے کہ وہ میری ان گنت انجمنوں کی انتظامیہ میں شرکت، گئی رات تک موسیقی اور ادب کی تقریبات میں شمولیت، سائنسی تحقیقات کی الجھنوں، بین الاقوامی نیٹ ورکس کے قیام، غرضیکہ ہر چیز کو بظاہر ہنسی خوشی نہ صرف برداشت کرتی ہے بلکہ ہر ممکن طریقہ سے مدد کرتی ہے! گذشتہ ایک سال میں تقریباً بیس دفعہ میں نے ان سب سرگرمیوں میں تخفیف کا اعلان کیا ہے مگر عملی طور پر یہ اعلانات محض "نیک ارادوں" تک تو پہنچے مگر تکمیل کی نوبت تادم تحریر نہیں آئی۔

تماشۂ اہل قلم۔۔۔۔۔۔

انور نسیم

بہت سال پہلے اور یوں لگتا ہے کہ یہ باتیں بہت پرانی ہو گئی ہیں کہ ادب برائے ادب یا ادب برائے زندگی کے موضوع پر خوب گفتار ہوا کرتی تھی۔ ایک عام قاری کی حیثیت سے آپ بس یونہی ان تمام تر بدلتے ہوئے رجحانات میں دلچسپی لیتے ہیں۔ حلقہ ارباب ذوق اور انجمن ترقی پسند مصنفین لاہور ایک ہی عمارت میں باقاعدگی سے اپنے اپنے اجلاس منعقد کیا کرتے تھے! یوں لگتا ہے کہ اب ان پرانی تحریکوں کی جگہ نئے رجحانات نئے مقاصد اور نئے طور طریقوں نے لے لی ہے! اپنے ادیب اور شعرا۔ دوستوں سے مل کر احساس ہوتا ہے کہ فیشن کی طرح اب ادبی ماحول بھی بہت بدل گیا ہے۔ چند دن پہلے کی بات ہے ایک شاعر دوست بیحد پریشان اپنی تازہ ترین مشکلات و مسائل کا ذکر کرتے ہوئے بتا رہے تھے کہ "عجیب لوگ ہیں جو برطانیہ میں ایک مشاعرے کا اہتمام کر رہے ہیں۔ ہوائی جہاز کا ٹکٹ بھجوایا تو یکطرفہ، اب برطانوی سفارت خانے والے ویزا نہیں دے رہے، تاخیر ہوتی جا رہی ہے۔ مشاعرے میں شرکت کیسے کروں گا؟" موصوف چند ہی دن پہلے یورپ کے ایک دوسرے ملک میں مشاعرہ پڑھ کر واپس تشریف لائے تھے! مجھے اچانک احساس ہوا کہ ان کی شکایت اور پریشانی دونوں بالکل بجا ہیں اس لئے کہ اپنی آئندہ کتاب کے فلیپ پر جب اپنی سوانح حیات شائع کروائیں گے تو اس میں ایک "سفر" کا کالم بھی شریک رہے گا یعنی اس مصنف نے تعلیمی ڈگریاں حاصل کرنے اور کتابیں لکھنے کے علاوہ دنیا کے کون کونسے ممالک کا سفر کیا ہے یا یوں کہیئے کہ ان کے "تعلقات عامہ" کے پیش نظر کہاں کہاں ان کے مداح یا قریبی دوست موجود ہیں جو ادبی محافل میں شرکت کے لئے انھیں دعوت دیتے رہتے ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ جب تک آپ کی پی۔آر P.R مضبوط نہ ہوگی شہرت خاک ہوگی؟ میں نے بہت ہی توجہ اور دلچسپی سے اس نئے رجحان کا تجزیہ کرنے کا ارادہ

کیا کہ یہ بات شاید کچھ ایسی نئی بھی نہ ہو، ظاہر ہے کہ ہر اہل قلم کو شہرت کی خواہش تو ضرور ہوتی ہے لیکن اس انہماک اور جذبے کے ساتھ اس کا "اہتمام" شاید آج کے دور کا خاصہ ہے۔غالب، میر اور عہد گذشتہ کے دوسرے معروف شعراء ان کی شہرت میں پی آر کا کہاں تک دخل تھا ایک باقاعدہ ریسرچ کا موضوع ہے۔ میر صاحب تو ریل کے سفر میں اپنے ہم سفروں سے اس خدشے کی وجہ سے بات بھی نہیں کرتے تھے کہ کہیں ان کی زبان خراب نہ ہوجائے۔تو وجہ شہرت؟ اس زمانے میں تو سفر کی بھی ایسی سہولتیں نہ تھیں کہ شمالی امریکہ اور یورپ میں مشاعرے منعقد ہوں۔اب کی بات ہی دوسری ہے۔ہمارے ایک بزرگ نے اوماوہ میں ایک مشہور شاعر سے بڑی سادگی سے پوچھ لیا کہ آپ کا اگلا شو Show اب کس شہر میں ہے؟

دور جدید اور نئے ادب کے اس مشینی دور میں سبھی کچھ بدل گیا ہے۔اب تو صاحب وی سی آر vcr کا زمانہ ہے۔ سامعین تک پہنچنے کا اگر کوئی دوسرا موثر طریقہ سمجھ میں نہ آئے تو کوشش کرکے یار لوگ اپنا ایک آدھ ویڈیو ہی بنوا سکتے ہیں۔کسی ایسے شخص کو ڈھونڈ نکالئے جو کمپیئرنگ میں ماہر ہو۔بس ذرا تعارف میں ہلکی پھلکی موسیقی ہو۔آپ کی بھرپور تعریف ہو اور سامعین میں چند باذوق اور سوشل احباب جو صحیح وقت پہ خوب داد دیتے رہیں تو بہت اچھا Impact ہوگا۔ بنیادی اور اہم بات یہ ہے کہ بقول شخصے آپ کو آج کے زمانے میں ایک کامیاب شاعر یا ادیب بننے کے لئے Aggressive ہونا بہت ضروری ہے۔کتاب لکھنے سے بہت پہلے یہ طے کرنا ضروری ہے کہ اس کا پبلیشر کون ہوگا جو Marketing Strategies کا ماہر ہو اور یہ کبھی مت بھولئے کہ بہت ہی کم لوگوں کے پاس اتنا وقت ہے کہ وہ آپ کی کتاب پڑھیں گے اصل مرحلہ تو "رسم اجراء" میں شرکت کا ہے۔اشاعت سے کئی ماہ پہلے اپنے اثر و رسوخ کو استعمال کیجئے اپنی پوری پبلک ریلیشنز کی مشنری کو مکمل طور پر سرگرم عمل ہونے کی ہدایت دیجئے اور پتہ لگائے کہ موجودہ حکومت (مرکزی ہو تو بہت بہتر ورنہ صوبائی وزیر اعظم سے کام چل جائے گا) کے اہم ترین وزراء میں سے کون کس دن فارغ ہے۔ دو یا تین نہیں بلکہ پورے "پانچ ستاروں" والے ہوٹل کا سب سے بڑا ہال قبل از قبل بک۔باقی تفصیلات تو خیر سبھی کو معلوم ہیں۔صدارت کے لئے مرکزی وزیر اور مقالے پڑھنے والے لوگ ایسے ہوں جو ان سب طریقوں سے خوب واقف ہوں اور مصروف اتنے کہ بمشکل کتاب کا ٹائٹل دیکھ لیں اور چند سطریں دیباچے کی پڑھ لیں۔ باقی سب کچھ آپ ان "ماہرین فن" پر چھوڑ دیجئے وہ مقالے لکھنے کا فن خوب جانتے ہیں۔اخبارات، رسائل، ٹی وی، ریڈیو جہاں تک بھی رسائی ممکن ہو سب کو مدعو کیجئے۔عام طور پر تھوڑی بہت محنت کرکے ایک معتبر مہمانوں کی فہرست تیار کرلیں یا کہیں نہ کہیں سے ایسی فہرست حاصل کرلیں۔

رسم اجراء اگر کامیاب ہوئی اور Press Coverage کا بندوبست ہوگیا تو بس آپ کی کتاب ہٹ ہے۔جس حد تک ممکن ہوسکے یہ رسم نہ صرف ملک کے مختلف شہروں میں منعقد ہونی چاہئے بلکہ جہاں جہاں تک آپ کی رسائی ہے دوسرے ممالک میں بھی تقریب کا "بندوبست کروانے" کے لئے ہر ممکن کوشش لازم ہے۔

آج کی دنیا کے تقاضے، اس دور کی اقدار، انسانی رشتے سب کچھ بڑی تیزی سے بدل رہا ہے۔مجھ جیسے قدامت پسند اور پرانی وضع کے لوگ یہ سب کچھ دیکھتے اور محو حیرت ہوں ..... لیکن ساتھ ہی ساتھ ایک بڑا ہی دلچسپ تماشہ دیکھنے کا بھی موقع ملتا ہے۔تماشہ اہل قلم دیکھتے ہیں اور اس دور میں فقیروں کا بھیس بدلنے کی ضرورت نہیں خوب سوٹ پہن کر

محافل میں شرکت کیجئے۔
مجھے یہ علم نہیں کہ کسی نقاد نے نہایت سنجیدگی سے شاعرانہ عظمت اور شہرت کے اس Component یعنی
کا باقاعدہ تجزیہ کیا ہے یا نہیں لیکن میری ذاتی دلچسپی یہ ہے کہ اساتذہ کی زندگی اور شاعری کا بغور مطالعہ کر کے یہ
یں کہ اس زمانے میں کیا صورت تھی؟ یہ موضوع آئیندہ کے لئے اٹھا رکھتے ہیں۔
آج کل تو کچھ ایسے ہی لگتا ہے جیسے باپ بہت سال پہلے اپنے بیٹوں سے کہتے تھے کہ میرا بیٹا جوان ہو کر ڈاکٹر بنے گا۔
ت خلق کرے گا اور بیمار لوگوں کا علاج کرے گا اور اس خدمت کے عوض تھوڑی بہت فیس بھی چلتی رہے گی؟ اور
اج والد بزرگوار کو شہرت کی بھی خواہش ہو تو کرکٹ کے کھلاڑی، ٹی وی کے فنکار کے علاوہ ادیب یا شاعر ہو جانے میں
کوئی مضائقہ نہیں لیکن واضح رہے کہ پی آر کے بغیر کچھ حاصل نہ ہوگا" وہ معجزہ فن کی ہے خون جگر سے نمود" والے دن

کئی سالوں بعد میں یہی اب ادب برائے ادب، اور ادب برائے زندگی کے علاوہ ایک تیسرا مدرسہ۔ فکر یا
School of Thoug تو سامنے آیا" ادب برائے شہرت"
قارئین کرام سے مؤدبانہ التماس ہے کہ اس نئی تحریک اور طرز کار کو ہر ممکن طریقے سے فروغ دیں اور حسب
یق و استطاعت اس رجحان کو دن دگنی اور رات چوگنی ترقی دینے کی ممکنہ کوشش کریں۔
اس وقت شدت سے ضرورت اس بات کی ہے کہ پی آر کی اس مہم کو کامیاب اور موثر بنانے کے لئے ایک مکمل
جامع گائڈ اور خلاصہ تیار کیا جائے ایک چھوٹی سی مثال یوں ہے کہ اکثر بڑے شہروں کے مشاعرے میں بعض شعراء
ہمراہ چند ایسے نوجوان احباب کو بھی لاتے ہیں (جن میں سے اکثر ان کے بھانجے اور بھانجیاں ہوتی ہیں۔) جو مشاعرے
وقفے کے دوران بڑے جوش و خروش سے ان کے پیچھے بھاگ بھاگ کر ان کے آٹو گراف حاصل کرنے کی جد و جہد
تے ہیں۔ آپ ہی بتائے مقبولیت کا اس سے زیادہ بین ثبوت اور کس طریقے سے دیا جاسکتا ہے۔ یہ تو بس ایک ہی
ل ہے گائیڈ کی تیاری کا پراجیکٹ شروع ہوجائے تو کئی اور طریقے سامنے آئیں گے مثلاً موجودہ دور میں مشاعروں کا
ل بھی تو بہت بدل چکا ہے۔ شمع محفل کی جگہ ایک مائیکروفون نے لے لی ہے اور پھر پوری کارروائی کو فلمایا بھی جارہا
۔ ویڈیو کیسٹ کی تیاری پورے انہماک اور اہتمام سے کی جارہی ہے۔ لہذا مناسب لباس کا انتخاب بے حد ضروری ہے
آپ کا شمار شہر کے چوٹی کے شاعروں میں ہے تو یقیناً ناظم مشاعرہ اور صدر گرامی دونوں ہی آپ کے قریبی دوست ہوں
۔ شاعری میں انکساری کیسی۔ آخر آپ نے اتنی محنت سے لکھا ہے۔ نیویارک میں میرے ایک دوست ان مشہور شعراء
نا کی شکایت کر رہے تھے کہ صاحب دیکھئے ان حضرات کو خوش کرنا بھی ناممکن ہے ایک صاحب کو صدر کی دائیں
ب بٹھایا اور دوسرے کو صدر کی بائیں طرف مگر پھر بھی ناخوش تھے۔ میں نے بڑی سادگی سے پوچھا کہ صدر کون تھا۔
لے جی خیر صدارت تو میں نے خود کی خیر...... مشاعرہ میں کلام سنانے کا بھی ایک خاص انداز ہونا چاہیئے اور اگر اللہ
لی نے آپ کو آواز بھی اچھی عطا کی ہے تو پھر تو سونے پہ سہاگہ والا قصہ ہے۔
مصرعوں کے وزن سے خارج یا وزن میں داخل ہونے کی پرواہ کئے بغیر بس ترنم سے پڑھتے رہئے۔ بحور کی چھوٹی
ی اونچ نیچ آپ کی خوش الحانی میں دب کر رہ جائے گی اور غنائیت کے اس سحر سے مسحور سامعین مسلسل داد دیتے رہیں گے۔

یہ مشاعرہ تو محض ایک چھوٹی سی مثال تھی ۔ تھوڑی سی کوشش سے ہر تقریب کے لئے ایک باقاعدہ Protoco پہلے سے طے کیا جا سکتا ہے ۔ کتاب کی رسم اجراء کسی معروف شاعر کا جشن اور پھر جو کسی مرحوم ادیب کی یاد میں تقریب منعقد ہو تو لازم ہے کہ آپ کی اپنی تقریر میں بار بار مرحوم سے آپ کی شہری دوستی اور مراسم کا ذکر ہو ۔ ایک معروف شاعر کی بیگم نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ "وفات کے بعد ہم لوگوں نے مرحوم کے لاتعداد دیرینہ دوستوں کو دریافت کیا جن سے ان کی زندگی میں کبھی ملاقات نہ ہوئی تھی ۔"

مجید امجد مرحوم مجھے بیحد پسند ہیں ۔ بہت ساری خوبصورت نظموں کے خالق ۔

اپنی مشہور نظم "آٹو گراف" کے آخری بند میں لکھتے ہیں "میں اجنبی میں بے نشاں نہ رفعت مقام ہے نہ شہرت دوام ہے" ۔

ایسے بہت سے شاعر اور ادیب ہوں گے جنہیں وہ مقام نہ مل سکا جس کے وہ بجا طور پر مستحق تھے یا آج بھی موجود ہیں ۔ سنجیدگی سے سوچا جائے تو واقعی ان کی حق تلفی ہوئی ہے مگر اس کوتاہی کا کیا مداوا کہ ایسے سادہ دل بندے پی آر کے بھی آداب سے ناواقف ہیں ۔ نوجوان نسل کے شعراء اور ادیبوں کو ایسے لوگوں کے "حشر" سے سبق سیکھنا چاہئے اور ان ماہرین حصول شہرت کی تقلید کرنی چاہئے جو مجسم تشہیر کی علامت ہیں اور دن دوگنی رات آٹھ گنی ترقی کر رہے ہیں ۔ ▲▲

ی نام: محمد نسیم

نام: نسیم سحر

خ: پیدائش ۱۵/ فروری ۱۹۴۴ بمقام راولپنڈی (پاکستان)

م: ڈگری والی ۔ بی اے تک ...... دیگر جاری ہے

نیف: (۱) پہلی اڑان (غزلیں) (۲) ہر بوند سمندر (غزلیں) (۳) دریچہ ءشب (نظمیں) (۴) روشندان میں چڑیا (ہائیکو)

م: ڈیل کارنیگی کی نفسیات کے موضوع پر دو کتابوں کا ترجمہ کیا ۔ سینکڑوں ادبی افسانوں اور کہانیوں کا انگریزی سے
ہ کیا

ف سخن جن میں طبع آزمائی جاری ہے: غزل ۔ نظم ۔ افسانہ ۔ ہائیکو ۔ خاکہ نگاری ۔ تنقید ۔ مزاحیہ شاعری

غزل

ند کر مشکلوں سے میں نالا — ان کے ہاں جب گیا تو تھا تالا
س گئی حسن کی حسین مکھی — جیسے ہی عشق نے تنا جالا
ئے ہڈی کباب میں آئی ! — درمیاں میرے ان کے ہے سالا
ر وہ دیوان لے کے آ دھمکا — کل جسے مشکلوں سے تھا ٹالا
ق بے چارہ اس قدر مظلوم ؟ — حسن اور حسن اس قدر کالا
کے بہکا تو بول اٹھا ہے نسیم — شاعر دل فریب مجھ سا لا

غزل

غصے میں نہ کھینچو کبھی دربان کی مونچھیں
اکھڑیں گی نہ یوں تو کسی انسان کی مونچھیں

ہے شیخ کے چہرے پہ ہر اک چیز ہی نقلی
انگلینڈ کی ڈاڑھی ہے تو جاپان کی مونچھیں

ایسا بھی نہیں سیفٹی ریزر نہ ملا ہو
بڑھ جاتی ہیں فیشن میں بھی انسان کی مونچھیں

استاد کو شاگرد پہ غصہ بہت آیا
بولا کہ کوئی کھینچے تو نادان کی مونچھیں

جنرل ہو کہ کرنل ہو، سبھی خوف زدہ ہیں
کچھ اتنی خطرناک ہیں کپتان کی مونچھیں

اک پل بھی اسے چین سے سونے نہیں دینا
سوجائے تو تم مونڈھ دو مہمان کی مونچھیں

تصویر میں آنکھیں تو فلک دیکھ رہی تھیں
ٹھوڈی سے بھی نیچے تھیں پہلوان کی مونچھیں

اس دور کے لونڈوں سے تو اللہ بچائے!
لے آتے ہیں وہ مونڈھ کے شیطان کی مونچھیں

مونچھوں کا یہ دشمن ہے مگر خود بھی ہے بامونچھ
دیکھے کوئی کیسی ہیں غزلخوان کی مونچھیں

جو رشوت نہ دوگے تو مرضی تمہاری
وہ فائل میں رکھ دیں گے عرضی تمہاری

کبھی ہم سے بے لوث بھی مل کے دیکھو
ہر اک بات لگتی ہے " غرضی " تمہاری

انہیں تم سے اک کہکشاں کی طلب تھی
محبت رہی صرف ارضی تمہاری

تمہارے لئے تھا ، تمہیں دے دیا دل
جو تم دل نہ دو ہم کو ، مرضی تمہاری

نکالے گا اس میں سے بیٹے کی نیکر
سیئے گا جو پتلون درزی تمہاری

نسیم ان پہ اس کا اثر کیسے ہوتا ؟
کہانی ہی لگتی تھی فرضی ۔ تمہاری

فردیات

ابھی تمیز سے بیٹھے ہوئے تو ہیں
سوجائیں گے جب آپ تو باجا بجائیں گے

o

گھر کے نزدیک کرائے کا مکاں اس نے لیا
ہوگئے اس سے ملاقات کے اب چانس بہت

OOOOOOOOOO

چل آ تجھے میخانے کو لے چلتے ہیں زاہد
اس وقت مساجد میں بھلا کون ملے گا؟

OOOOOOOOOO

بلا کہوں گا تمہیں یا قضا کہوں گا تمہیں ؟
پکارنا جو پڑے گا تو کیا کہوں گا تمہیں

تمہیں بیاہ بھی لایا تو رہ سکوں گا نہ شاد
میں اپنے سر پہ مسلط سزا کہوں گا تمہیں

ہٹا کے رخ سے نقاب اپنی شکل دکھلادو
مگر یہ سوچ لو ، کالی گھٹا کہوں گا تمہیں

OOOOOOOOOO

جب قلم لے کے ذرا بیٹھیں سخنور مجھ سے
بھاگ سکتے ہیں کہاں شعروں کے لشکر مجھ سے

OOOOOOOOOO

سادگی ان کی بھی کیا خوب نمایاں ہے نسیم
ریشمی سوٹ پہنتے ہیں وہ کھدر کہہ کر

OOOOOOOOOO

انہیں جب خون دل اپنا دکھانا ہم کو ہو مطلوب
تم ہم " ریڈ اِنک " کی بوتل اُلٹ لیتے ہیں دامن پر

OOOOOOOOOO



محمد عاصم صدیقی،
پوسٹ باکس 3855
الدمام

عاصم صدیقی جانے پہچانے ادیب ہیں افسانے ، انشائے اور دوسری نوعیت کے مضامین ، رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں ۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے لئے ڈرامے اور منظرنامے بھی لکھتے رہے ہیں ۔ موصوف کے ڈرامے اسٹیج پر بھی پیش ہو چکے ہیں ۔

دعوت

" کیا بات ہے نور جہاں " محاسب متین صاحب نے اپنی سکریٹری سے پوچھا " گیارہ بج چکے ہیں اور ابھی تک سرفراز صاحب تشریف نہیں لائے ، کوئی فون وون آیا کیا ؟ "

" وہ سر ۔ دیکھئے نا سر اتنے افراد کی دعوت تھی اور پھر سرفراز صاحب تو کھانا بھی گھر پر ہی تیار کرواتے ہیں ۔ کل پورے دن لگے رہے ہونگے اس کے علاوہ فراغت تناول کے بعد ہم رات گئے تک گپ شپ کرتے رہے دعوت میں اوپر کے کام زیادہ ہی ہوتے ہیں دیر سے بستر پر گئے ہونگے "

تو کیا ہوا ؟ ہم بھی تو دیر سے سوئے تھے ، آفس تو بہر حال آفس ہے ۔ گھر کے کاموں کا کیا تعلق ، خیر جیسے ہی تشریف لائیں میرے پاس بھیج دینا ، دراصل " واصل باقی " (بیلنس شیٹ) آج ٹالی کرا کر ڈی جے کے پاس بھیجنی ہے " ۔۔۔۔ " او کے سر " نور جہاں محاسب متین صاحب کے کمرے سے نکلی ، ناگواری کے تاثرات سجا کر اپنی سیٹ پر جا بیٹھی ۔ تھوڑی گردن میں ٹکائی ، شہادت کی انگلی ناک اور ہونٹ کے درمیانے حصے میں رکھی تو منہ ایسا پھول گیا جیسے سوجن آگئی ہو ۔

"کیا ہوا نور جہاں" ؟ دبیر نے پوچھا۔

"سوچ رہی ہوں کہ متین صاحب نے تو احسان فراموشی کی حد کر دی، صبح ہوتے ہی سب کچھ بھول گئے، موصوف سرفراز صاحب پر برس رہے ہیں۔حالانکہ سب سے زیادہ انہوں نے اپنی شکم بھری تھی، کھانوں کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملائے تھے۔کیا سحر بیانی تھی۔موقع شناسی الفاظ میں ڈھل کر ایسی جھڑ رہی تھی جیسے رات کی رانی کے پھول۔ ایسے ہوتے ہیں کھاؤمیت۔ کھانا اور غرانا۔ کس قدر غریب سرفراز اور بچاری بھابی نے کام کیا ہوگا"۔

****

سرفراز صاحب، کے کے آفس کے "شعبہ۔ حساب" میں تقریباً ڈیڑھ سال سے نائب محاسب تھے بقول سرفراز صاحب کے وہ نوکری شوقیہ کرتے ہیں یا پھر وقت گذاری کے لئے۔اللہ کا دیا اتنا ہے کہ انہیں نوکری کی ضرورت ہی نہیں اولاد در اولاد بیٹھ کر کھاتے رہیں تو کم نہ ہوگا۔جس طرح کسی کو کھیل کود، پڑھائی، گلوکاری اداکاری۔صداکاری وغیرہ کا شوق ہوتا ہے انھیں کھانے پینے کا شوق بچپن سے ہے۔افراد خانہ کے ساتھ تین چار اشخاص دسترخوان پر موجود نہ ہوں تو کھانا ہی ہضم نہیں ہوتا۔بقول انکے، انکی ملنساری۔خوش پوشی، خوش کلامی اور مہمان نوازی کے چرچے ان کے ہر دوست کی زبان پر ہیں۔ بعض دوست شعراء نے تو انکی شان میں اتنے قصیدے لکھ دے گئے ہیں کہ اب وہ ان کو کتابی شکل دینے والے ہیں، ایک روز انکے اعزاز میں دی ہوئی ایک تقریب میں ان کے ایک ادیب دوست نے ان کلمات سے نوازا۔

"سرفراز صاحب کی مہمان نوازی، شیریں کلامی۔انکساری، ادب نوازی جاذبیت، سجاوٹ اور سب سے بڑھ کر خوش رو شمع رو چہرہ اس بات کا غماز ہے کہ انھیں شہد، پھول، جامن۔ کہکشاں اور چاندنی کو ایک جگہ گھوٹ کر ڈھالا گیا ہے۔صرف دل کی مترنم دھڑکنوں اور تنفس کی خاطر، آگ، پانی، مٹی اور ہوا کی ملاوٹ کی گئی ہے" یہ تو وہ تعریفی، کلمات تھے جو سرفراز صاحب کسی نہ کسی بہانے اپنے دوستوں کے حوالے سے بیان کرتے رہتے تھے۔

لیکن ان کے چند دفتری ساتھی بھی تو تعریفوں کے پل باندھنے اور زمین و آسمان کے قلابے ملانے میں کم نہ تھے اکثر ان کے ساتھی ان الفاظ میں نوازا کرتے۔

"اس دور میں حاتم طائی بھی ہوتا تو وہ بھی سرفراز صاحب کے آگے سر جھکا کر بیٹھتا" یہ کالے خان تھے "سرفراز صاحب آپ تو لگتے ہی نہیں کہ جوان بچے کے باپ ہیں۔آپکی بیٹی کو میں آپکی بہن سمجھی" یہ موقع پرست فوزیہ تھی۔

"سرفراز صاحب اتنے مرغن و لذیذ کھانوں کے شوقین ہیں آپ اور اس قدر سلم اس کیا راز ہے" یہ ضمیر نام کے بے ضمیر تھے۔

سنتے تھے کہ اچھے سیدھے، کھرے اور صاف دل کے لوگوں کے چہروں پر فرشتوں جیسی معصومیت ہوتی ہے۔ بقول شاعر ؎

آپ کو دیکھا تو یہ یقین آیا
خواب سچ میں بدل بھی سکتے ہیں

یہ آنکھوں والی بے نور سی نور جہاں تھی۔

****

سرفراز صاحب تقریباً پونے بارہ بجے آج بھی دفتر میں اسلام علیکم کہتے ہوئے داخل ہوئے ۔ ایک شور اٹھا کہ سرفراز صاحب تشریف لے آئے ۔ چہروں پر خوشیاں ایسے شامیانے تان کر کھڑی ہو گئیں جیسے مرادیں بر آگئی ہوں ۔ ہر شخص نے کھڑے ہو کر باادب ، بااخلاص انکا استقبال کیا ۔ بعض بسیار خور جو شاید کھانے کے لئے زندہ ہیں گلے لگانے کے لئے آگے بڑھے ۔ لیکن ابھرے ہوئے بلکہ بھرے ہوئے پیٹ ایسے درمیان آگئے جیسے دو دلوں کے درمیان رقیب روسیاہ ، چنانچہ کسی نے زور لگا کر پیٹ پچکانے کا ظلم برداشت کیا ۔ بعض کے متلاطم امواج بیٹوں میں جھکنے پر مجبور کر دیا ۔ شلوار قمیض میں ملبوس کالے خاں جو دور کونے میں بیٹھے بیٹھے خواب خرگوش کے مزے لے رہے تھے اور ایسی حالت میں کان پھاڑتا لڑاکا طیارہ بھی اوپر سے گذر جائے تو ان پر جوں نہیں رینگتی ، وہ بھی سرفراز صاحب کی مہین آواز پر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے ۔ انہوں نے اپنی چپلیں جلدی جلدی یوں پہن لیں جیسے اونگھتے ہوئے مسافر کو ریل کی سیٹی نے اپنی آمد کی نوید سنائی ہو ۔ حاملہ عورتوں کی طرح مٹکی پیٹ سے سرکتی ہوئی شلوار کو بار بار ناف سے اوپر لے جاتے ہوئے لمبے لمبے قدموں کے ساتھ آگے بڑھے ۔

" واہ ۔۔۔ واہ ۔۔۔ سرفراز صاحب کل کی کیا ضیافت تھی ۔ قسم خدا کی ابھی تک سرور میں بیٹھا ہوں " ۔ بڑے بڑے امراء، زمینداروں ، جاگیرداروں اور نوابوں کے گھر اس حقیر بندہ ناچیز نے تناول فرمایا ہے لیکن جو مزہ ، لذت ، خوش ذائقی آپ کے یہاں پایا اس کی نظیر نہیں ملتی " انہوں نے ایک بار سرکتی ہوئی بلکہ اترتی ہوئی شلوار کو سنبھالا دیا " ۔

" بڑی عنایت کالے خان ، دراصل زندگی میں رکھا ہی کیا ہے ، کھاؤ ، پیئو اور اس دار فانی سے کوچ کر جاؤ ۔ کھانا پینا بھی سب نصیب کی بات ہے ۔ اب دیکھئے نا ، چند دن پہلے کی بات ہے ۔ ہمارے پڑوسی عشرت صاحب کوئی اسی کے پیٹے میں ہونگے ، آخری ہچکیاں تھیں ، روح قفس بدن سے نکلنے کے لئے ملک الموت کا انتظار کر رہی تھی کہ اس وقت انہوں نے لڈو کی فرمائش کی اور جناب انہوں نے (میز پر ہاتھ مارتے ہوئے) لڈو نوش فرمایا اور پھر ملک عدم کے سفر پر روانہ ہوگئے ۔ ہے نا اپنا نصیب ۔

" واہ ۔ واہ ۔ کیا بات ہے " دبیر نے کہا ۔ سب نے ہاتھ اٹھا اٹھا کر ایسی داد دی کہ جیسے سرفراز صاحب نے غالب کا کوئی شعر پڑھ دیا ہو ۔

" کتنے اچھے خیالات ہیں انکے " شبانہ نے جو ان جھمیلوں سے دور ہی رہتی تھی گردن کو جھٹکا دیکر دل ہی دل میں کہا واہ کیا تھے انکے پڑوسی ، انکی خوش نصیبی تو دیکھئے کہ کلمہ پڑھنے کے بجائے لڈو کھا کر سو گئے ۔ اور کیا کہوں میں ان دفتری ساتھیوں سے جو تر نوالے کے لئے تلوؤں سے آنکھیں مل رہے ہیں ۔ اور کیا کہوں میں سرفراز صاحب کو وہ خوشامدی ہجوم میں خود کو کوہ قاف کا شہزادہ سمجھ بیٹھے ہیں ۔ واقعی خوشامد سے ہی آمد ہے ۔ جس کے ہاتھ میں ڈوئی اسکا سب کوئی جسکا کھائینگے اس کا اگر نہیں گایا تو آئندہ حلوہ مانڈہ بند نہ ہو جائیگا ۔ لیکن شاید سرفراز صاحب کو یہ نہیں معلوم کہ یہ سم قاتل دراصل ان ہی لوگوں میں سے ہیں جو دل ہی دل میں کہتے ہیں کہ مفت کی شراب تو قاضی کو بھی حلال ہے ۔

شبانہ مختلف ذہن کی مالک تھی ۔ خوشامد فریب سے پاک ، خوددار اور سچی ۔ زمین کو آسمان کہنا اسے آیا ہی نہ تھا ۔ ایک مرتبہ اس نے سرفراز صاحب سے صرف اتنا ہی کہدیا تھا کہ جناب جب تک گڑ ہے مکھیاں بھنبھنا رہی ہیں ادھر گڑ ختم ہوا سب ایک ایک کر کے اڑ جائینگی ۔ سرفراز صاحب نے دل ہی دل میں جواب دیا تھا کہ اس تھوڑے گڑ کی بدولت ایک

ں سے مفت کی تنخواہ لے رہا ہوں ۔ سارا دفتری کام تو میرا یہ مکھیاں ہی کرتی ہیں ۔

آج پھر بناوٹی اخلاق کا مظاہرہ دیکھنے کے قابل تھا ۔ سارے عملے کے چہروں پر خوشی موتیوں کی طرح بکھری ہوئی تھی ے دھوپ کی طرح چمک رہے تھے ۔ گفتگو میں ملائمیت تھی چہروں پر بشاشت، لباسوں میں سجاوٹ، لہجوں میں تراوٹ ں، لفظوں میں رس گھلے ہوئے تھے، سانسوں میں مہک تھی، منہ پانی سے بھر رہے تھے اور زبانیں چٹخارے لینے کے لئے ، چین تھیں ۔ وقت کاٹے نہ کٹے ۔ کیونکہ آج رات جمعرات والے دن سرفراز صاحب کے ہاں حسب معمول دعوت تھی ۔ دوپہر کا فاقہ تھا ۔ کوئی ٹفن باندھ کر نہیں لایا تھا سوائے شبانہ کے ۔ سب اسکے ٹفن کی طرف مسکرا کر دیکھ رہے تھے ۔ ہوں میں شکوہ تھا اور سرگوشیوں میں شبانہ کے ہمیشہ کی طرح آج کی دعوت بھی قبول نہ کرنے کو بداخلاقی کا بدترین اہرہ قرار دے رہے تھے ۔

****

آہستہ آہستہ مہمانوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا ۔ سرفراز صاحب بہ نفس نفیس خود استقبال کے لئے گھر کے ٹ پر موجود تھے، سب سے پہلے کالے خان اپنے بچے کی انگلی تھامے تشریف لاتے دکھائی دئے ۔ وہ خود پیچھے پیچھے تھے پیٹ ے آگے چل رہا تھا ۔ حسب عادت نیچی آتی ہوئی شلوار کو پہلے پیٹ کی پھسلن پر ٹکایا ۔ پھر جھک کر ہاتھ ملایا ۔ اپنے اکلوتے تے بچے کا تعارف کرایا ۔ حیدرآبادی ڈریس، کھلے بالوں اور میک اپ سے بھرپور چہرے کے ساتھ نور جہاں تشریف یں، فوزیہ دردانہ ساتھ ساتھ آئیں، اسطرح آگے پیچھے دفتر کے تمام ساتھی آچکے تھے ۔ نور جہاں اپنے دوپٹے کو پنوں سے لائی تھیں لیکن صحت مند فوزیہ کا دوپٹہ خرگوش کی طرح چھلانگیں لگا رہا تھا، ایک جگہ ٹکتا ہی نہ تھا ۔ کبھی گردن میں کر باقی حصوں کو اپنے سائے سے محروم کر دیتا، کبھی دائیں طرف لڑھک کر سیدھے ہاتھ کو چومنے لگتا ۔ اور کبھی اس حرزانوں پر اس طرح گر جاتا کہ دونوں پلو قدموں پر گر کر سربہ سجود ہو جاتے جیسے گڑگڑا کر کہہ رہے ہوں کہ اے ری مشرقی مائی کبھی ہمیں اپنے سینے سے لگاتی ہو جیسے یتیم بچہ، اور کبھی کسی نہ کسی بہانے قدموں میں ڈال کر ہماری ت وتقدس کو پامال کر دیتی ہو، دردانہ ساڑی کے پہلو سے کھیلتے ہوئے ہر وقت ایک فرمانبردار چاق وچوبند چوکیدار کی ح اپنی نظریں اپنے بدن پر رکھی ہوئی تھی کہ ایسا نہ ہو کہ آنکھ بچے اور مال یاروں کا ہو جائے ۔

روح افزا کے گلاس آچکے تھے ۔ کمرہ سگریٹ کے دھوئیں سے بھرا جا چکا تھا زمانے کے تمام رنگوں سے آشنا شادی شدہ رات کی نظریں سرفراز صاحب کی طرف چپکی ہوئی تھیں کہ کب اشارہ ملے اور ہم ٹوٹ پڑیں ۔ جبکہ کچھ کنوارے ریوں کی نظریں صنف نازک کے جسموں سے کھیل رہی تھیں یعنی بھوک دونوں طرف مشترک تھی، گفتگو میں گرمی ی نہ تھی، کیونکہ خالی پیٹ نہ مزاح اچھا لگتا ہے اور نہ نظروں کے تیر سہنے کی سکت نہ عشقیہ جملے اور نہ ڈورے ۔

نادیہ، نور جہاں اور فوزیہ کچھ دیر اپنے ساتھیوں کے درمیان رہیں اور پھر محفل کی رونق اجاڑ کر زنان خانے میں گئیں ۔ بیگم سرفراز سے گلے ملیں، جوان بچیوں کی تھڈیوں کو ہاتھ لگا کر ایسا دیکھا پرکھا جیسے اپنے بھیا کا پیغام لیکر آئی ں ۔ پھر وہی تعریفی جملے کہ تم ریکھا کی طرح اور تم جوہی چاولہ کیطرح اور بھابی تو بنی بنائی راکھی ہیں ۔ عورت کی ری تعریفوں میں پنہاں ہوتی ہے ۔ بھابھی کا چہرہ کھل پڑا، شفق کے رنگ اتر آئے ۔ ناگن کی طرح خوب ادھر سے ادھر بل ں کھانے کی کوشش کی ۔ لیکن کمبخت موٹاپا دل کا جلاپا آڑے آیا، ایسا لگا کہ کھونٹے سے بندھی صحت مند گائے نے

سینگ سے ایک جھٹکے کے ساتھ پھیلے ہوئے جسم کو کھجایا ہو یعنی بڑی مشکل سے کمر میں لچک پیدا ہوئی کہ ادھر گھٹنے چرچرا کر رہ گئے۔

"بھابھی جیسے ہی ہم لوگ گھر میں داخل ہوئے ہیں پورا گھر کھانوں کی خوشبوؤں سے مہکتا ہے لیکن کیا بات ہے آج تمھنے لذیذ خوشبو سے محروم ہیں" نور جہاں نے لب کھولے۔ "بھئی بچے کہہ رہے تھے کہ بھوک لگ رہی ہے۔ ہمیں پہلے دیدو اور یہ میرے اصولوں کے خلاف ہے۔ پہلے مہمان پھر میزبان اس لئے کچن کو تالا لگا کر کھانا اور خوشبو کو مقید کر دیا ہے میں نے"۔

خوشبو اور قید۔ فوزیہ نے صرف سوچا کہا نہیں، بلکہ بات کی تو یوں کی کہ "بھابی ایک بات واقعی قابل تعریف ہے۔ مہمانوں کے آنے سے پہلے ہی آپ پکوان تیار کر لیتی ہیں اور ایسی ترو تازہ نظر آتی ہیں کہ جیسے آپ نے محنت ہی نہ کی ہو، یہ بہت بڑا کمال ہے۔"

بھابھی کے جواب دینے سے پہلے ہی نادیہ بول پڑی "ہماری تو حسرت ہی رہی کہ کبھی ایسا ہو کہ ہم آئیں اور پکوان کے سلسلے میں آپ کے ہاتھوں کی مہارت دیکھیں۔ اس طرح ہاتھ بٹانے اور تراکیب سیکھ لینے کا بہانہ ہاتھ آجائے"۔

"بس یہ اوپر والے کی مہربانی ہے جو مجھ میں اتنی ہمت پیدا کرتا ہے" اور پھر بھابھی اپنی بچیوں سے مخاطب ہوئی" بیٹا لان میں میزیں، کرسیاں، گلاس اور پلیٹ وغیرہ سب کچھ لگادیں۔" "جی امی۔ ارشد بھائی آجائیں تو کھانا لگاتے ہیں۔" ارشد سے میں نے گرما گرم شیرمال منگوائے ہیں" بیگم سرفراز دلہن کے گھونگھٹ کی طرح کھڑکی کے پردے کا کونا سرکائے ہوئے کہا۔ رات کے ساڑھے نو بج چکے تھے لیکن ارشد ابھی تک نہیں آیا تھا۔ نور جہاں اور فوزیہ واپس ساتھیوں میں آکر بیٹھ گئیں تھیں۔ کالے خان سے برداشت نہ ہوا اور وہ کہہ اٹھے۔ "سرفراز صاحب اب تو آنتیں قل ہو اللہ پڑھ رہی ہیں" انکا بولنا تھا کہ دوسرے بھی بچوں کی طرح بلبلانے لگے۔ متین صاحب نے کہا" میرے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہیں" ضمیر بولے" میری آنتیں کوس رہی ہیں"۔ دبیر بولے" میری آنتیں حلق میں اتر کر تر نوالہ ڈھونڈ رہی ہیں" نور جہاں نے کہا "میری آنتیں سوکھ رہی ہیں اور پھر ایک زبردست قہقہہ پڑا۔

سرفراز صاحب نے ایک بار پھر تاخیر کی معذرت کی اور پھر عقبی دروازے سے باہر چلے گئے۔ پچیس منٹ بعد سرفراز صاحب نے اترے ہوئے چہروں میں یہ کہہ کہ تازگی پیدا کر دی کہ کھانا چن دیا گیا۔ جواب میں سب نے میزوں کا گھیراؤ کر لیا۔ پھر چمچے بجنے لگے۔ پلیٹیں کھنکنے اور پھر بھری جانے لگیں۔ بوٹیاں جھنجھوڑی جانے لگیں۔ منہ میں نوالے ایک ڈاڑھ سے دوسرے ڈاڑھ گھوم گھوم کر ایسے نیچے اترنے لگے جیسے بھنور کا پانی۔ پھر تر نوالوں نے تریانی کو جنم دیا" واہ۔ واہ کیا خوش انتظامی ہے، کیا لذت ہے، کیا بریانی ہے کیا ••• کھیر ہے، لذت سے بھرپور کھانا خود بول اٹھتا ہے کہ بڑے خلوص اور چاؤ سے بنایا گیا ہے۔ تعریفی جملوں کے دوران کسی نے بری طرح دروازہ پیٹا۔" ارے بھئی دیکھنا کوئی مہمان باہر تو نہیں رہ گیا۔"

سرفراز صاحب نے چپراسی حکیم سے کہا۔ حکیم نے جیسے ہی دروازہ کھولا سامنے منصور اور اس کے ساتھ ایک اور بیرا تھا۔ منصور کا گال تربوز کے گودے کی طرح سرخ تھا ایسا لگتا تھا کہ بری طرح پٹائی کی گئی ہے۔ دوسرے بیرے کی حالت بھی کم بری نہ تھی۔ ایک شخص منصور کا گریبان پکڑا ہوا تھا دوسرا شخص دوسرے بیرے کا ہاتھ تھاما ہوا تھا۔ دو تین

ناص کے ساتھ ایک طیم شحیم شخص اندر داخل ہوا۔" واہ۔ واہ کیا مفت خوری ہے۔ کیا بے شرمی کا مظاہرہ ہے۔ یہ سوٹ
ٹ میں ملبوس۔ دیکھا آپ نے فتیہ دوں کا یہ روپ کبھی نہ دیکھا ہوگا۔" پھر اس شخص نے اپنا تعارف کرایا کہ "فلاں علاقے
، تھانے کا ایس ایچ او ہوں۔ آج میری بچی کی شادی تھی۔ چار سو افراد کے کھانوں کا انتظام کیا تھا، ساڑھے تین سو افراد
ی میں آئے پھر بھی کھانا کم پڑ گیا۔"

سرفراز صاحب نے ہاتھ جوڑتے ہوئے "ایس ایچ او کے کان میں کہا" حضور غلطی ہو گئی میری عزت کا سوال ہے۔"
"اور میری عزت دوستوں رشتہ داروں میں ذلیل ہوا ہوں۔" ایس ایچ او نے چیختے ہوئے کہا۔ سب کی نظریں
ں ایس ایچ او کے چہرے پر چپک کر رہ گئیں، نوالے حلق میں اٹک کر رہ گئے۔ متین صاحب کو ایک دم ہچکیاں شروع
لئیں۔ بعض کے ہاتھ ایسے کانپنے لگے جیسے بریک ڈانس کر رہے ہوں۔ نور جہاں، فوزیہ، دردانہ کے پیٹوں میں ایسے بل
ے کہ وہ چپکے سے کھسک گئیں، دبیر نے دل ہی دل میں سوچا یہ شخص ایک تیر سے دو دو شکار کر رہا تھا گھر کی دعوت فری
آفس کا کام بھی فری۔ جب کہ کالے خاں اپنی بھری ہوئی پلیٹ سب کی نظروں سے بچا کر ڈرائنگ روم میں یہ سوچ کر
آئے کہ آخری دعوت ہے۔ یہاں کوئی نہیں دیکھ رہا۔ جتنا کھا سکو کھالو۔ وہ جلدی جلدی لقمے بھر رہے تھے اور کسی
ے دار خاتون کی طرح کھڑکی کا پردہ سرکا کر بھی دیکھتے رہے کہ لان میں کیا ہو رہا ہے۔

متین صاحب نے کہا کہ ہم اب بھی لاعلم ہیں کہ ماجرا کیا ہے۔"
منصور کو ایک پولیس والے نے لات رسید کی کہ بتا کیا حقیقت ہے تو اس نے کہا سرفراز صاحب کے گھر کے پیچھے
ادی ہال ہے سنگم پیلیس اس کا میں بیرا ہوں۔ قریب کے گھر کچھ میں نے باندھ لئے ہیں جب بھی شادی ہوتی ہے کھانا
ا ہوں۔ آج اتفاق سے موت ہو جانے پر شادی ملتوی ہو گئی تو میں سرفراز صاحب کی عزت کی خاطر ان کے بیٹے ارشد کے
، شاہ پیلیس جہاں میرا دوسرا دوست بیرا ہے ٹیکسی میں پتیلے رکھ کر یہاں لے آیا۔"
متین صاحب نے چاہا کہ دوستوں سے کچھ رقم دیکر معاملہ رفع دفع کرائیں لیکن سوائے حکیم چپراسی کے تمام مکھیاں
شبانہ اڑ چکی تھیں۔ پھر متین صاحب نے ہی کچھ کر کرا کر معاملہ ختم کیا۔

* * * * * * * * * * * *

بروز ہفتہ جیسے ہی شبانہ دفتر آئی تو چپراسی حکیم نے شبانہ کو ضیافت کی تمام روداد سنادی۔
دفتر میں سب کے منہ لٹکے ہوئے تھے۔ جبکہ شبانہ کے لبوں پر معنی خیز مسکراہٹ بار بار چکر لگا رہی تھی۔ لنچ سے
ی دیر پہلے شبانہ نے اپنا ٹفن کھولتے ہوئے پہلی بار بہ آواز بلند کہا۔ "آیئے ہم غریبوں کی دال چٹنی بھی چکھ لیں۔" کسی
نہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا البتہ چہرے انگارا ہو گئے۔

چپراسی حکیم نے نور جہاں سے کہا۔ "صاحب بلا رہے ہیں۔"
"جی سر۔" نور جہاں نے متین صاحب سے بہت ہی دھیمے لہجہ میں کہا۔
از صاحب تشریف نہیں لائے۔ ایک بجنے والا ہے۔" متین صاحب نے پوچھا۔
"نہیں سر۔ وہ تو نہیں آئے۔ ابھی ابھی ان کا استعفیٰ آیا ہے"۔



سید یونس اعجاز

الخبر۔ سعودی عرب

پیدائش ۱۹۳۸ء جالندھر کی۔ بی۔اے تک تعلیم حاصل کرسکا۔ گزشتہ ۱۸ سال سے آرامکو۔ سعودی عرب میں حساب کم و بیش سے رزق منسلک ہوں۔ اپنا ہی ایک شعر نذر ہے ؎

ہزاروں خوبیاں قربان ہیں اس ایک خوبی پر
کہ برخوردار مدت سے سمندر پار بیٹھے ہیں

گزشتہ ۱۶ سال سے سعودی عرب میں مجلس اقبال کا بانی اور سکریٹری جنرل ہوں اور تین سال سے اوورسیز رائٹرز فورم کا صدر

سراپا نیاز ـــــ سید یونس اعجاز

چائے

ہیں نگاہیں سوالی چائے کی
لے بھی آؤ پیالی چائے کی

دوستو، تول کر بولو
گفتگو ہے مثالی چائے کی

بڑھ گئی کتنی گرمیٔ محفل
بات کس نے اچھالی چائے کی

رونا رو کر فضول خرچی کا
دیگچی پھر ابالی چائے کی

جوش کھا کر ہی رنگ لائے گی
کیجئے کچھ گوشمالی چائے کی

بے اصولوں نے ہونٹ جلنے پر
مل کے پگڑی اچھالی چائے کی

وہ بھی آمادۂ کرم نہ ہوا
بات ہم نے بھی ٹالی چائے کی

لوڈ شیڈنگ کی افراتفری میں
کس نے پتی چرالی چائے کی

کیوں تکلف ہوا مٹھائی کا
یہ تو دعوت تھی خالی چائے کی

چسکیاں اس کی ہر حسیں لب پر
عادتیں لاابالی چائے کی

کیسی کیسی زباں سے سنتے ہیں
خوبیاں کالی کالی چائے کی

ابر نے کیا نشہ پلایا ہے
جھوم اٹھی ڈالی ڈالی چائے کی

سرخیٔ لب کا ہم سے ذکر نہ کر
ہم نے دیکھی ہے لالی چائے کی

اس پہ مرنے لگے بڑے بوڑھے
ہائے رے خورد سالی چائے کی

چھوٹتی ہی نہیں ہیں ہونٹوں سے
لذتیں یار والی چائے کی

رنگ کتنے بکھیرے کاغذ پر
بات کیا کیا نکالی چائے کی

کیسا کافر مزاج تھا اعجاز
طرح جس نے بھی ڈالی چائے کی

گھر کا نہ گھاٹ کا...

پیوند اس کو کہتے ہیں ریشم میں ٹاٹ کا
شادی کرے گا میم سے فرزند جاٹ کا

وابستہ ان لبوں سے بھی کیا کیا نہ تھے مزے
لیکن تھا لطف اور ہی گالی کی چاٹ کا

دھمکی بھی بات بات پہ دیتا ہے جیل کی
کرتا ہے ہم سے پیار بھی سالا وہ لاٹ کا

سنتے ہیں اس کو آٹھویں شوہر کی ہے تلاش
پانی تو ہم نے بھی ہے پیا گھاٹ گھاٹ کا

قسطیں طرح طرح کی ادا کر رہا ہوں میں
مالک مگر نہیں ہوں قسمتی اک پلاٹ کا

سچ مچ ہی آ نہ جائے سسر دیکھنے مجھے
یا رب بھرم کھلے نہ کہیں ٹھاٹ باٹ کا

منزل کی آرزو بھی کروں کس گھمنڈ پر
دھوبی کا کتا گھر کا رہا ہے نہ گھاٹ کا

اک وعظ ہی سے ممبر و محراب جل اٹھے
پہنچا ہے کیسا پیٹ میں تیتر کو ہاٹ کا

اعجاز تیغ و تیر کے زخموں کا سو علاج
مرہم کوئی تو دکھلائے تو لفظوں کی کاٹ کا

بنگلہ

نہ دیکھا خواب میں بھی گو کبھی سسرال میں بنگلہ
دلہن رانی کو پر درکار ہے ہر حال میں بنگلہ

سلیں مرمر کی ہیں یا ساز پر گائی ہوئی غزلیں
ہے بنوایا کسی نے کس قدر سُر تال میں بنگلہ

چمک اٹھا ہے اب اپنا بھی کاروبار رشوت کا
خریدا خیر سے ہے دوسرا اک سال میں بنگلہ

ہمیں کرنا ہے کیا وہ بھی کرائے پر اٹھا دیں گے
محکمہ نے جو بیگم کو دیا ہے حال میں بنگلہ

نہ مالی گل کترتا ہے نہ چوکیدار سوتا ہے
ارے چھوڑا ہوا ہے آپ نے کس حال میں بنگلہ

وہ مہماں رات بھر کے کیا ہوئے گلبرگ میں جاکر
ٹپک کر رہ گیا ہے مستقل ہی رال میں بنگلہ

مرے تو جھونپڑے کا بانس تک ٹکنے نہیں دیتے
رقیبوں کو دیئے جاتے ہو رکھ کر تھال میں بنگلہ

وہ خالی بھی نہیں کرتے کرایہ بھی نہیں دیتے
ہے اک مدت سے میرا ان کے استعمال میں بنگلہ

میں تب سے قدر و قیمت شاعرِ مشرق کی سمجھا ہوں
بنا ہے جب سے میرا گلشنِ اقبال میں بنگلہ

کوئی اعجاز چشمِ تنگِ دولت ٹیکس تو دیکھے
نظر آتا ہے کیسا ٹوٹی پھوٹی ٹال میں بنگلہ

لوگ

آئے دن ہی اک نئی شادی رچالیتے ہیں لوگ
ایک چہرے پہ کئی سہرے سجالیتے ہیں لوگ

کھانا پینا، رہنا سہنا، آنا جانا مفت کا
سب کی سب تنخواہ چپکے سے بچالیتے ہیں لوگ

بیوی بچوں کا انہیں ویزا ملے یا نہ ملے
کام اپنا سو طریقوں سے چلالیتے ہیں لوگ

یا تو ابا سے بھی کرتے ہیں گدھوں جیسا سلوک
یا گدھے کو باپ ہی اپنا بنالیتے ہیں لوگ

میرے بیمہ کی رقم پہ ہر کسی کی آنکھ ہے
میرے مرنے پہ ہی جینے کا مزا لیتے ہیں لوگ

اُن کے بے ہنگم خراٹوں کی شکایت کیا کروں
جب بھی سوتا ہوں مجھے فوراً جگالیتے ہیں لوگ

عمر کاٹی ہے تیرے اعجاز نے فٹ پاتھ پر
رات بھر میں کوٹھیاں بنگلے بنالیتے ہیں لوگ

غریب الدیار

چسکے ہمیں کچھ ایسے پڑے ہیں اُدھار کے
جب دیکھئے کھڑے ہیں ہتھیلی پسار کے

اب دن کہاں تھے اُن کے بناؤ سنگھار کے
نکلے ہیں پھر سے پانچویں عدت گذار کے

کس طور سے حجاب میں جھنجھلا رہے تھے وہ
کس درجہ شادمان ہوئے برقعہ اتار کے

کیوں کر نہ مجھ غریب کے نمدے کسے رہیں
حاکم بھی کاسہ لیس ہیں سرمایہ دار کے

بس دیکھئے کہ وقت پہ ملتا رہے ڈرافٹ
احوال پوچھئے نہ غریب الدیار کے

سالانہ چھٹیوں میں کوئی دیکھے کرّوفر
قیصر کے بھانجے ہیں تو بھتیجے ہیں زار کے

بخشا ہمیں نے لمحوں کو صدیوں کا سا غرور
قیدی ہمیں ہیں گردشِ لیل و نہار کے

پیری میں بھی تو پیار کے قابل رہیں گے ہم
کیا کیا ہیں واہمے دلِ ناکردہ کار کے

اولاد اپنے باپ کو پہچانتی نہیں
اعجاز کیسے ہیں دولت کے پیار کے



ظفر اقبال کھوکھر
RIYADH OXYGEN PLANT
PLANT ENGINEER
P.O.BOX. 374.
RIYADH - 11411. K.S.A.

سیالکوٹ سے تعلق اور علامہ کے نام سے مماثلت، جہاں اعزاز کی بات ہے وہاں اس میں کچھ نقصانات بھی پنہاں ہیں۔ دوست احباب زبردستی شعر و ادب سے ناطہ جوڑ دیتے ہیں۔ سیالکوٹ میں بھی اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو دوسرے شہر کی طرح ادب سے دور دور رہتے ہیں۔ بلکہ زیادہ لوگوں کو "آلات" سے دلچسپی ہے لیکن ان کے احساس مروت بہرحال کچلے نہیں گئے۔

راقم سنہ ۱۹۵۴ء میں شہر اقبال میں پیدا ہوا۔ ابتدائی اور ثانوی تعلیم شہر کے مدارس سے حاصل کی۔ پھر جیسا کہ سیالکوٹ میں رواج ہے ہم بھی "پردیسی" ہوگئے۔ ابتدائی پردیس کراچی تھا جہاں کالج میں تعلیم حاصل کی۔ والد صاحب خلیجی ریاست قطر میں انجینئر تھے موسم گرما کی چھٹیوں میں قطر جانے کا موقعہ ملتا۔ اس زمانے میں سفر بحری جہاز کے ذریعہ ہوتا تھا۔ ان بحری اسفار میں سیر و سیاحت کے جذبات پروان چڑھے اور ہم نے دنیا کو ذرا قریب سے دیکھنے کا پروگرام بنایا۔

ہمارے منصوبوں اور معاشی حالات میں ہمیشہ سے کچھ فاصلہ رہا ہے۔ چنانچہ کالج سے فارغ ہوتے ہی ہم نے دو سال کے لئے قطر کی ایک کمپنی سے معاہدہ کر لیا اور قطر کو عارضی مسکن بنایا۔ سنہ ۱۹۶۶ء تک کافی تعداد میں پاکستانی اور ہندوستانی باشندے قطر میں موجود تھے اور جہاں کہیں یہ لوگ موجود ہوں مشاعرے ہونا لازمی امر ہے چنانچہ شعر و ادب کی بڑی "دھواں دار" محفلیں منعقد ہوتیں۔ اسی دور میں ادب سے ہمارا باقاعدہ تعارف ہوا۔ جمعہ کو صبح کے وقت کرکٹ کھیلی جاتی اور شام کو ادبی محفل میں حاضری ضروری ہوتی۔ اس سے قبل کہ ہم رسمی طور پر ادب سے منسلک ہوتے اور ظفر اقبال عاجز یا مجذوب بنتے۔ سنہ ۱۹۶۸ء میں انجینئرنگ کی تعلیم کے لئے عازم امریکہ ہوئے۔ ہمارے حصے میں اوکلاہما OKLAHOMA سٹیٹ آئی۔ امریکی رنگینیوں کے معیار سے یہ اچھی سٹیٹس میں شمار نہیں ہوتی تھی لیکن تعلیمی، معاشی

اور معاشرتی لحاظ سے بہت اچھی درس گاہ تھی گرمیوں کی چھٹیوں میں کام کرنے کی اجازت تھی چنانچہ جی بھر کر امریکہ کی سیر کی اور اپنی معاشی حالت بھی بہتر کی۔

۱۹۷۳ء میں پاکستان واپسی ہوئی اور دوبارہ خلیج میں سروس شروع کی۔پہلا پڑاؤ سلطنت عمان کا شہر مسقط تھا اس ملک میں ہماری آزادی کا سودا ہوا اور آخر کار شاہیں زیر دام آگیا اور ہنوز ہے۔

جس گیس کمپنی کے ساتھ معاہدہ تھا انہوں نے ابوظہبی، دوہا اور ریاض میں پلانٹ لگائے اور ہمیں بھی ان ریگزاروں میں لئے پھرے۔آج کل ریاض میں ریت چھان رہے ہیں کچھ سونا بھی مل جاتا ہے لیکن ہمارا اور ہمارے بیوی بچوں کا اصل بونس مکہ المکرمہ اور مدینتہ النبی کی حاضری ہے۔اس کے لئے ہم اللہ تعالیٰ کے شکر گذار ہیں۔۔۔

" خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوہ دانش فرنگ "
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاک مدینہ و نجف

ہدایت نامہ افسانہ نویسی

ظفر اقبال کھوکھر (ریاض)

مطلع ابرآلود ہے۔صبح سے تیز ہوائیں چل رہی ہیں۔بارش کی آمد کے امکانات ہیں۔گرج، چمک مسلسل جاری ہے۔درجہ حرارت تیزی سے گر رہا ہے ایسے میں۔۔۔۔

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موسمیات کا کوئی ماہر موسم کا حال بتا رہا ہے لیکن دراصل یہ ہمارے پچاس فیصد افسانوں کی تمہید ہے۔ایسے افسانوں کو آپ موسمی افسانے کہہ سکتے ہیں۔یہ موسم افسانہ پر بہت اثر انداز ہوگا اگر مطلع ابرآلود ہے تو سمجھ لیں کہ حالات ٹھیک نہیں۔سرد ہواؤں کا ذکر افسانہ میں کسی طوفان کا پیش خیمہ ہے۔زور کی بارش کشمکش کا اظہار ہے یعنی موسمی حالات سے آپ افسانہ کا مزاج معلوم کر سکتے ہیں۔

ایک اچھے افسانہ نگار کے لئے یہ اشد ضروری ہے کہ وہ پہاڑی مقامات سے واقف ہو۔مری، ایبٹ آباد، کاغان اور سوات سے شناسائی واجب ہے کیونکہ ہیرو اور ہیروئین کا تعارف ان ہی مقامات پر ہوگا اور پھر جب ظالم سماج اپنا کام دکھائے گا تو تنہائی کے لمحات میں ان ہی مقامات کے ڈاک بنگلہ میں لوٹ کر آنا ہے اور بھولی یادوں کو ہمیں تازہ کرنا ہے بعض سمجھ دار ہیرو جنگل کے کسی درخت پر نام بھی لکھ جاتے ہیں تاکہ سند رہے۔اگر ہیروئین غریب اور حساس ہے تو اس کو ٹی۔بی ہوگی اور وہ مری کے ساملی سینیٹوریم میں داخل ہوگی اس لئے ابتدائی تعارف کے لئے مری ہی مناسب مقام ہے۔ویسے آج کل کینسر زیادہ "اچھی بیماری" تصور کی گئی ہے۔

ہیرو صاحب کے لئے ہجر کے صدمہ سے عہدہ برآ ہونے کے لئے بہت سے ذرائع ہیں۔اگر جلدی میں ہیں تو شراب کی عادت ڈال دیں۔لیکن یہ رواج فلموں میں زیادہ ہے یوں بھی پابندی لگ جانے سے اس کا ذکر مناسب نہیں۔اس سلسلہ میں کچھ افسانہ نگاروں کو پریشانی بھی رہی لیکن منشیات نے کافی آسانیاں مہیا کر دی ہیں۔آپ ہیرو کے معاشی رتبے کے لحاظ

سے کسی مناسب نشے کا انتخاب کر سکتے ہیں ۔ کلب میں جانا بھی ایک ترکیب ہے ۔ لیکن اس پر اب فلم والوں کی اجارہ داری ہے ۔ عام لوگ جب کلب تلاش کرتے ہیں تو انہیں مایوسی ہوتی ہے اس طرح افسانہ پر برا اثر پڑتا ہے ۔

ہیرو کے پیشے کا انتخاب افسانے کا اہم ترین حصہ ہے ۔ کیونکہ واقعات براہ راست اس کے پیشے سے متعلق ہوتے ہیں ۔ پاکستان بننے کے فوراً بعد سیدھے سادھے سکول ماسٹر یا کلرک سے بھی کام چل جاتا تھا ۔ لیکن جوں جوں تعلیمی اور معاشی ترقی ہوتی گئی معیار بدلتا گیا ۔ ڈاکٹر اور انجینئر بہت کامیاب ثابت ہوئے ۔ کافی دیر یہ لوگ میدان میں چھائے رہے سنہ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد فوجی افسروں نے یہ بازی جیت لی ۔ ہر دوسرے افسانے کا ہیرو کیپٹن یا میجر ہوتا ۔ سنہ ۱۹۷۱ء کی جنگ نے فوجی افسران کو منظر سے ہٹا دیا ، اور یہ مالا سی ۔ ایس ۔ پی حضرات کے گلے میں ڈالی گئی چنانچہ ڈپٹی کمشنر ایس پی اور کسٹم کے افسران ہمارے افسانوی ادب پر راج کرتے رہے ۔ سیاستدانوں نے بھی قلیل مدت کے لئے کوشش کی لیکن انکی دیگر دلچسپیاں اس محاذ پر آڑے آئیں ۔

اس کے بعد لندن اور امریکہ پلٹ کزنوں (چچازاد) نے کارہائے نمایاں انجام دیئے یہاں تک کہ ٹیلیفون پر ہی انہیں اپنی من پسند ہیروئین مل جاتی ۔ لیکن انہوں نے غلط بیانی اور متعدد شادیاں کر کے اپنی مارکیٹ خود خراب کر لی ۔ دبئ کویت اور سعودی عرب میں " بیس ہزار روپے ماہوار " کمانے والوں نے بھی بڑی مقبولیت حاصل کی ۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ ہر طرف چھا گئے ۔ عملی طور پر ان لوگوں نے بہت متاثر کیا ۔ اکثر معاملے تو Accompanied Baggage دیکھ کر ہی طے ہو جاتے ۔ لیکن انہوں نے بھی سمجھداری کا مظاہرہ نہیں کیا اور بہت سے رقیب پیدا کر لئے ۔ کچھ قصور خلیجی ممالک کے Immigration Department کا بھی ہے ۔ فیملی ویزوں اور اقامہ کے قانون نے بہت سے لوگوں کی پول کھول دی ۔ اس وقت خلیجی ممالک کے لوگ مقبولیت کے گراف میں سب سے نیچے ہیں ۔ بلکہ کویت کے حالیہ واقعات نے مستقبل خاصاً مخدوش کر دیا ہے ۔ ہیرو کی کرسی اس وقت کاروباری حضرات یا پھر قومی اور صوبائی اسمبلی کے ممبران کے پاس ہے ۔ جن کے پاس اپنا کارخانہ ، ڈیفنس ، ماڈل ٹاؤن یا گارڈن ٹاؤن میں (۲) کنال کا گھر اور صرف کروڑوں کا بنک بیلنس ہو ۔

افسانے میں ہیرو اور ہیروئین کے لئے ایک اہم مسئلہ Transportation (آمد و رفت) کا بھی رہا ہے اس کا آسان حل یہ ہے کہ دونوں میں سے کسی ایک کو امیر رکھا جائے ۔ پہلے تو ان کے استعمال میں کیڈلک ، بیوک ، مرسیڈیس اور شیورلیٹ گاڑی ہوتی تھی ۔ لیکن جب سے پٹرول مہنگا ہوا ہے اور کسٹم نے بھی سختی کی ہے جاپانی گاڑیوں کو پسند کیا گیا ہے ۔ آج کل تو سوزکی بھی برداشت کی جا رہی ہے لیکن خیال رہے کوئی بھی گاڑی 1000 CC . سے کم نہ ہو ۔

خط و کتابت کا مرحلہ بھی بنیادی اہمیت کا حامل ہے ۔ کبوتروں نے اس سلسلے میں تاریخی کردار ادا کیا ہے ۔ وہ آج بھی یہ کردار کرنے کو تیار ہیں لیکن نہ جانے کیوں ان کی خدمات سے استفادہ نہیں کیا جاتا ۔ چونکہ آج کل مراسلت کے بے شمار وسائل موجود ہیں اس لئے اپنے ذہن رسا سے کام لے سکتے ہیں اور سچویشن کے مطابق حل تلاش کر سکتے ہیں ۔ ٹیلیفون اور فیاکس نے اگرچہ صورت حال تبدیل کر دی ہے ورنہ محکمہ ڈاک نے اس سلسلے میں بہت خدمات انجام دی ہیں ۔ کسی دور میں ڈاکیا بڑا اہم ہوتا تھا ۔ بڑا موثر پیغام بر تھا لیکن بعض نے رقیب کا کام بھی کیا اس لئے منظر سے غائب ہو گئے ۔

حالات نے ثابت کیا کہ مراسلت بڑا خطرناک ذریعہ ہے اکثر خط کسی غیر متعلق فرد کے ہاتھ لگ جاتا اور افسانے

میں ایک زبردست موڑ آجاتا۔ یوں بھی خط ایک ناقابل تردید ثبوت ہونے کی وجہ سے مشکلات کا باعث بنا۔

گذشتہ دور میں تبادلہ خطوط کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگائیں کہ پورا افسانہ ہی خطوط پر مشتمل ہوتا تھا چند خطوط لکھ دیئے جاتے تھے قارئین خطوط کی ترتیب سے ہی افسانہ پڑھ لیتے تھے۔ لیکن یہ بڑا "منشیانہ" انداز ثابت ہوا۔ یوں بھی لوگوں کو سیاق و سباق سمجھنے میں کافی الجھن ہوئی اس لئے یہ انداز مقبول نہ ہوسکا۔

ہیرو اور ہیروئین کا نام بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ کچھ لوگ تو بچوں کے نام رکھنے کے لئے بھی افسانے کو "استعمال" کرتے ہیں۔ ایسی صورت میں آپ افسانے میں ہیرو کے لئے مولا بخش، کرم داد یا اللہ بچایو جیسے نام نہیں رکھ سکتے۔ ہیروئین بھی اللہ رکھی، سکینہ بی بی اور بشراں نہیں ہوسکتی۔ ہمارے افسانے میں اس بات کا امکان نہیں کہ اللہ رکھی کے دل پر کیوپڈ کا وار ہو۔ اسی طرح کرم داد کے دل میں محبت کا جذبہ ہرگز پیدا نہیں ہوسکتا۔

بڑی کوشش کے باوجود یہ بات سمجھ میں نہیں آسکی کہ یوکلپٹس ہمارے افسانہ نگاروں کا پسندیدہ درخت کیوں ہے۔ اپنی کم علمی کا اعتراف کرنے میں حرج نہیں۔ بہت عرصہ تک یہ پتہ ہی نہ چل سکا کہ یہ درخت کیسا ہوتا ہے۔ ایک دفعہ خصوصی انتظام کے ذریعہ اس درخت کی زیارت کی۔ بہرحال جو لوگ افسانہ لکھنا چاہیں انہیں اس درخت سے ضرور واقفیت حاصل کرنی چاہیئے۔ وطن پرست افسانہ نگار چنار کا استعمال بھی کرتے ہیں۔ اگر چہ مقامی درخت پیپل۔ بڑھ اور شیشم یہ کمی پورے کر سکتے ہیں لیکن افسانے میں فیشن کا خصوصی خیال رکھنا پڑتا ہے۔

ایثار اور قربانی کو ہمارے افسانوں کی حد تک بہت عمل دخل رہا ہے۔ اس سلسلے میں ہمارے افسانوں کی شاندار خدمات ہیں۔ قربانی جتنی ہنگامہ خیز اور جذباتی ہوگی افسانہ اتنا ہی موثر کہلائے گا۔ لیکن اب لوگوں نے افسانوی قربانیوں پر نکتہ چینی شروع کردی ہے۔ ایسی ہی ایک قربانی پر نکتہ چینی یاد آرہی ہے جس نے افسانہ کا سارا مزا کر کرا کردیا

ایک افسانہ نگار نے دو دوستوں کی لازوال دوستی کی داستاں تحریر کی۔ ایک دوست پیدائشی اندھا ہوتا ہے۔ دونوں ساتھ ساتھ جوان ہوتے ہیں اور ایک جذباتی موقعہ پر آنکھوں والا دوست قربانی کا شاندار مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی دونوں آنکھیں اپنے نابینا دوست کی نذر کردیتا ہے۔ کامیاب آپریشن کے بعد جب بینائی حاصل کرنے والا دوست "نئے نابینا" کا شکریہ ادا کرتا ہے تو قارئین عش عش کر اٹھتے ہیں۔

ایک نقاد نے اس پر اعتراض کیا کہ یہ قربانی نہیں بیوقوفی ہے۔ اگر یہ دوست ایک آنکھ کی قربانی دیتا تو دونوں دیکھ سکتے۔ ایک انجینئر نے اٹھ کر کہا۔ یہ حماقت ہے یہ تو NO WORK DONE ہوا ایک [illegible] بہرحال اندھا رہا۔ محفل میں ایک ڈاکٹر صاحب کہنے لگے ایسے بے معنی آپریشن پر تو ڈاکٹر کی رجسٹریشن CANCEL کر دینی چاہیئے وغیرہ وغیرہ اس لئے افسانہ نگاروں کو اس قسم کی قربانیاں پیش کرتے وقت محتاط رہنا چاہیئے اور عوامی جذبات کا خیال رکھنا چاہیئے۔

امید ہے یہ ہدایت نامہ افسانہ لکھنے والوں کے لئے مددگار ثابت ہوگا۔

★



قبال شانہ
نقل۔ تبوک

کمپیوٹر

لطیاں کررہا ہے کمپیوٹر — آدمی بن گیا ہے کمپیوٹر
ک پری چہرہ آپریٹر سے — عاشقی کررہا ہے کمپیوٹر
نکی جرمن ہماری اردو کا — ٹرانسلیٹر بنا ہے کمپیوٹر
ہے یہ واقف امور خانہ سے — بیویوں سے بھلا ہے کمپیوٹر
ت دل کی سمجھ نہیں سکتا — ہر زباں جانتا ہے کمپیوٹر
لڑ " کمپیوٹرن " ہوا شاید — خوش بہت ہورہا ہے کمپیوٹر
مائیکرو چپ " خراب ہے یارو — اس لئے سورہا ہے کمپیوٹر
و مسلسل سنائے ہے غزلیں — آدمی ہے وہ یا ہے کمپیوٹر

ہے یہ۔ انجینیئر کا گھر شانہ
ٹکڑے ٹکڑے ہوا ہے کمپیوٹر

میوں کی شدتوں میں " آفریقہ جائینگے — برف کے طوفان میں " انتارتیکا " جائنگے
رشوں میں بھیگتے جائینگے " انڈونیشیا " — ہمسفر ہوں آپ تو " جھمری تلیا " جائینگے
ن جاں ہم ماڈرن جن ہیں چراغِ چین کے — دل پہ جب تم ہاتھ رکھوگی تو ہم آجائینگے
یا ہے جذبہ ۔ تعمیر مسجد جوش میں — مل کے سب چندہ کرئینگے بانٹ کر کھا جائینگے
انے مانا جیت کر آئے ہیں بازی جنگ میں — یہ حقیقت ہے پٹاخوں سے وہ تھرا جائینگے
کیا کرتے ہیں اکثر شیر کا تنہا شکار — سامنا بیگم کا جب ہوگا تو گھبرا جائینگے
پولیس اندھا سمجھ کر معاف کردیگی انہیں — بھیڑ میں جب وہ کسی لڑکی سے ٹکرا جائینگے

ہر جگہ جاتے ہیں شانہ اپنی مرضی سے مگر
آپکی خاطر " جنوبی آفریقہ " جائینگے

غزلیں

زندگی معشوق کی چوکھٹ پہ مرجانے کا نام
موت ہے ڈیڈی کا انکے بام پر آنے کا نام

" جارج واشنگٹن " تھا بے شک فلسفی یونان کا
ہے سکندر دوستو ! لیلیٰ کے دیوانے کا نام

کس طرح سمجھاؤں یارو کیا ہے بیگم کا جلال
فارسی سے یک بہ یک اردو میں آجانے کا نام

ہم سمجھتے ہیں کہ قوموں کی ترقی کا ہے راز
صبح کے بارہ بجے تک مست سوجانے کا نام

پھینک دو کشتی کنارے پر پڑے سوتے رہو
بے وقوفی ہے میاں طوفاں سے ٹکرانے کا نام

شیخ صاحب اللہ اللہ آج کیسے میرے گھر
کس نے لکھا میرے دروازے پر مئے خانے کا نام

ہم نہیں ڈرتے کسی سے اپنی بیگم کے سوا
ہے سماعت سے ہماری دوڑ گھبرانے کا نام

اور کیا دوں اب سیانے پن کا میں اپنے ثبوت
کہہ رہا ہے ہر کوئی شاؔنہ ہے دیوانے کا نام

پھاڑ کر دامن سرِ بازار پاگل ہوگئے
ہوگیا اُنکا ہمیں دیدار پاگل ہوگئے

پائلوں کی جب سنی جھنکار پاگل ہوگئے
آئی لیڈی ڈاکٹر بیمار پاگل ہوگئے

عاشقوں نے توڑ ڈالے ہیں سبھی پچھلے ریکاڑ
دل کے ہاتھوں ایک دن میں چار پاگل ہوگئے

ہائے رے زورِ سخن نظمیں دوانی ہوگئیں
تپ کے میرے ذہن میں اشعار پاگل ہوگئے

وہ جو آئے میرے گھر اک زلزلہ سا آگیا
دیکھ کر انکو در و دیوار پاگل ہوگئے

عشق میں حسن کے ہماری ہوگئیں زلفیں سفید
انکی شادی کا ملا جب تار پاگل ہوگئے

کررہے ہیں وہ صفایا خود ہی اپنی فوج کا
جنگ میں شائد سپہ سالار پاگل ہوگئے

عقدِ شاؔنہ کردیا ہے ایک دیوانی کے ساتھ
کیا ہمارے سارے رشتہ دار پاگل ہوگئے

بشیر مرزا
ریاض



بقلم خود

ابھی تک میں دوست احباب کے خاکے لکھتا رہا ہوں ۔خود کے بارے میں لکھنا جبکہ پدرم سلطان بود والا معاملہ بھی نہ ہو ۔خاصہ دقت طلب کام ہے قارئین کے لئے ۔اب یہ بات کیا اہمیت رکھتی ہے کہ والد محترم ساری عمر پگھلتے لوہے کے ساتھ نبرد آزما رہے ۔پیٹ کو ایندھن فراہم کرنے کے لئے لاہور کی شاید ہی ایسی کوئی ایک فیکٹری بچی ہو ،جس کی فرنس بھٹی کا وہ خود ایندھن بنے رہے ہوں ۔

اپنے آباء واجداد کے بارے میں یہ تو پتہ چلتا ہے ،کہ جب ہندوستان کی آب و ہوا نے مغلوں کے دربار کے لئے سپہ گری کرنے کے قابل نہ چھوڑا تو نسلی جفاکشی نے نکاس کا رستہ یوں تلاش کیا ،کہ ہاتھوں کے ہنر نے ہتھیار تراشنا شروع کر دیئے ۔

سات آٹھ پشتوں تک جن کے نام و اوصاف مجھ کو معلوم ہیں ،ان میں کوئی لکھاری نظر نہیں آتا ۔جن ہاتھوں کو لوہا موم کرنے کی علت ہو ،ان کے لئے قلم پکڑنا کبھی ذریعہ عزت نہیں رہا ۔

لے دے کہ ایک محترم ناناجی مرحوم اور دوسرے ان کے تیسرے صاحبزادے ماموں حمید اختر ایسے دو فرد میں نے دیکھے ہیں جن کو ادب سے رغبت تھی یہ دونوں بزرگ اُردو اور پنجابی میں شاعری کیا کرتے تھے ۔جو مختلف اَدوار میں شائع بھی ہوتی رہی ۔

شاید یہ انہی کا فیضان ہے کہ یہ عاجز بھی کبھی کبھار نثر لکھ لیا کرتا ہے ۔جو یہاں کی مختلف ادبی تقریبات میں سامعین کی نذر کر دیا کرتا ہوں ۔

پاکستان اور ہم، تھوڑے سے وقفے کے ساتھ ہم عمر ہیں ۔شاید یہی وجہ ہے کہ ہم دونوں کے ستارے ابھی تک گردش میں ہیں ۔جس میدان میں قرار داد لاہور منظور ہوئی ۔اس کے مغربی مجلے میں اس قرار داد کے منظور ہونے کے

تین سال بعد ایک محنت کش کے گھر میں آنکھ کھولی اور پہلی سانس لی۔ کالج میں پڑھتے ضرور رہے۔ لیکن کوئی ماسٹر ڈگری حاصل نہ کرسکے، اس لئے کہ ڈگری کو حاصل کرنے کے وسائل نہ تھے۔ چونکہ میں نے اپنی اس زبان جسکا نام اردو ہے، کو کتابوں، رسالوں اور خط و کتابت کے ذریعہ حاصل کیا ہے۔ اس لئے تلفظ اور لہجہ دونوں قابو میں نہیں ہیں۔

میں پھر بھی حیران ہوں کہ ریاض کے حلقے خصوصاً حبا دری ادبی حلقے کس طرح اس احقر کے خاکوں، انشائیوں اور افسانوں کو شرف پذیرائی بخشتے ہیں۔ شاید یہ صرف محبت کی کارفرمائی ہے۔

تیرہ سال سے الریاض میں مقیم ہوں، انگریزی میں اکاونٹنٹ، عربی میں محاسب اور اردو میں جسے منشی کہتے ہیں، اس پیشے سے منسلک ہوں۔ چونکہ سارا وقت دو جمع دو میں گذر جاتا ہے۔ اس لئے حساب دوستاں نہیں رکھتا۔

سو دوستو، من آنم کہ من دانم۔

اخبار

بشیر مرزا

اخبار کس نے پڑھا، دیکھا یا سنا نہیں! اخبار! اس تہذیبی دور کا ایک ایسا عطیہ ہے۔ جس نے نہیں پڑھا وہ بھی پچھتایا۔ جس نے پڑھا وہ اور بھی پچھتایا۔

اخبار دنیا کے ہر ملک اور قریب قریب ہر شہر سے شائع ہوتا ہے۔ اخبار تیسری دنیا میں دو صفحہ سے لیکر ۲۰ تا ۲۲ صفحہ تک اور پہلی اور پھر دوسری پہلی دنیا میں ڈیڑھ دو سو صفحات تک کی کمیت پر شائع ہوتا ہے۔ اس دم تحریر تک اس کرۂ ارضی پر کسی ایسی دنیا کا وجود نہیں، جسکو دوسری دنیا کہا جاسکے، اس لئے میں کوئی تفصیل دوسری دنیا کے کسی اخبار کے بارے میں دینے سے قاصر ہوں۔ معذرت چاہتا ہوں۔ اخبار جسے بازو پھیلا کر پکڑنا پڑتا ہے اور پڑھنے کے لئے کبھی کبھی کمر کے بل بھی جھکنا پڑتا ہے، کسی اخبار فروش کے بنچ پر، کسی قہوہ خانے کے کاونٹر پر، کسی دکان کے چبوترے پر۔ اپنے مکان کے صحن میں، صبح صبح ناشتہ کی میز پر یا کسی واقف یا کسی اجنبی کے ہاتھ میں ضرور نظر آجاتا ہے۔

گئے وقتوں میں اخبار صرف صبح کے وقت ہی شائع ہوتا تھا۔ اب تو شام کو بھی کئی کئی اخبارات شائع ہوتے ہیں۔ جو زیادہ تر ایوننگ نیوز کے نام سے مارکیٹ میں بکتے ہیں۔ جبکہ کوئی خبر بھی شام سے متعلق نہیں ہوتی۔ بلکہ ان میں ایسی شاموں کا زیادہ ذکر ہوتا ہے جنکا کسی گھر میں وقوع پذیر ہونا ممکن نہیں۔

اخبار اس ترقی یافتہ جدید دور کی ایک انتہائی اہم ضرورت بن چکا ہے۔ وہ زمانہ اب ہوا ہوا جب اخبار صرف اپر کلاس کے لئے مخصوص ہوتا تھا۔ اور عوام الناس کے فرشتوں لو بھی معلوم نہ تھا۔ اخبار نام کی بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ اب تو اخبار اشیائے ضرورت میں تصور کیا جاتا ہے (بلکہ اخبار اشیائے خورد ونوش کا ایک حصہ بھی تصور کیا جاتا ہے) جب تک صبح کے ناشتہ کے ساتھ اخبار نہ ملے، ناشتہ بے مزہ سا معلوم ہوتا ہے۔ چائے کی خوش رنگ تلخی کڑوا گھونٹ بن جاتی ہے۔ کبھی ایسا چانس ہوجائے، کہ اخبار کسی وجہ سے دستیاب نہ ہو تو سارا دن ایسے گذرتا ہے، جیسے محبوب سے تلخ کلامی ہوگئی

، اب تو طلوع صبح کا علم بھی اخبار کے ہاکر کی آواز سے مشروط ہو گیا ہے۔ بیڈ ٹی کے ساتھ اگر اخبار نہ ملے تو دن کے آغاز ین نہیں ہوتا۔

اخبار بینی کے اب کئی اسلوب اور اوقات وضع ہو چکے ہیں۔ W.C میں کموڈ پر بیٹھے ہوئے۔ دانتوں کو برش تے ہوئے، لباس کی تبدیلی کے وقت (جب بیوی لباس تبدیل کرنے میں مدد دے رہی ہو) چائے کے کپ میں چینی تے ہوئے، بس میں سفر کرتے ہوئے، ٹریفک سگنل کے کھلنے کے وقت اور دفتر میں جب کام کی بہت زیادتی ہو تو کرسی ، ٹیک لگا کر بھی اخبار پڑھا جا سکتا ہے اور ہاں کبھی کبھار ریل گاڑی، ہوائی جہاز یا بس کے سفر کے دوران جان پہچان ، لنے بھی اخبار بڑا معاون اور مددگار ثابت ہوتا ہے۔

خبر مونث ہوتی ہے۔ بہت سی خبروں کا مجموعہ جب اخبار کی شکل اختیار کرتا ہے تو یہ مذکر ہو جاتا ہے۔ خبر دی جاتی ، اخبار پڑھا جاتا ہے۔

کتابوں میں اخبار کو ریاست کا چوتھا ستون لکھا جاتا ہے۔ حالانکہ اس دور میں اس چوتھے ستون کا جو حشر کیا جاتا ہے ، پر حیرانی ہوتی ہے کہ اب بھی یہ چوتھا ستون کیسے کہلاتا ہے۔ مختلف ریاستوں اور مختلف حکومتوں کے ساتھ مختلف یے اختیار کئے جاتے ہیں۔ وہ ریاستیں جو صرف عوام کی خدمت کی دعویدار ہوتی ہیں، وہاں اخبار صرف عوامی حکومتوں کا ان ہوتا ہے اور عوامی حکومتی خبروں کے علاوہ کسی نوع کا عوامی ردعمل شائع کرنا سخت ممنوع ہوتا ہے۔

ایک اخباری رویہ رجعت پسند ریاستوں کا ہوتا ہے جہاں اخبار بالکل مادر پدر آزاد ہوتے ہیں۔ کوئی بات، کوئی اخفا میں نہیں رہتی، حکومت اور عوام کی ہر حرکت اخبار کی زینت بنتی ہے۔ رسوم و قیود سے اتنے باغی، کہ قلم نے جو ، اخبار کے کاغذ پر نقش کر دیا۔ اور اخبار کا تیسرا رویہ یہ ہے کہ چڑھتے سورج کی پوجا اس کا دھرم ہوتا ہے۔ اور ہر چڑھتے رج کے مخالفوں کو جوتے دکھانا اسکا شیوۂ ایمانی ہوتا ہے۔

کچھ اخبار ایسے بھی ہوتے ہیں جو صرف اپنی ذات کے اسیر ہوتے ہیں انہیں اپنے علاوہ کسی چیز سے بھی غرض نہیں نی۔ اور وہ صرف خود کوزہ۔ خود کوزہ گر اور وغیرہ وغیرہ ہوتے ہیں۔ اخبار میں کام کرنے والے کو صحافی کہتے ہیں۔ اور فی جو کچھ کرتا ہے اس کو صحافت کا نام دیا جاتا ہے۔ کچھ صحافی اپنی ہر تحریر میں اس اعلان کو بطور تکیہ کلام استعمال تے ہیں۔ کہ صحافت ایک مقدس پیشہ ہے۔ قلم اور اخبار کی عصمت، ماں بہن کی عصمت کی طرح عزیز اور مقدس ہوتی ۔ اور پھر جیسے ہی کسی حکمرانی کا چراغ گل ہوا، یا وہ گوشہ گمنامی میں دھکیل دی گئی یا کبھی اپنے معاشی مفادات پر زد ، نظر آرہی ہو۔ تو وہی صحافی مع اپنے اخبار کے، ایک لمحہ توقف کئے بغیر اپنی اور اپنے قلم کی عصمت کا سودا آنے والے ، کر لیتے ہیں۔ اور ایک لمحہ کو بھی چہرے کا رنگ تبدیل نہیں ہوتا ہے۔ پھر بھی وہ اخبار اپنے آپ کو بہت ہی موقر ، انتا ہے۔ ایسے اخبار بھی ہوتے ہیں۔ جن میں خبریت کم اور داستانی چٹخارہ زیادہ ہوتا ہے۔ اکثر اخبار پورا پورا ہفتہ ف قسم کے فلمی، تجارتی، ادبی، تہواری اور علاقائی ایڈیشن شائع کرتے ہیں۔ جب کسی وجہ سے کوئی ایڈیشن نہ بن سکے، ، دن صرف اخبار شائع ہوتا ہے۔

اخبار کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ قومی اخبار، علاقائی اخبار اور مقامی اخبار تقریباً ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔ ہر اخبار اپنے ان اور میلان طبع کے لحاظ سے پہچانا جاتا ہے۔ پھر آگے کچھ اس کی شاخیں ہوتی ہیں۔ مثلاً پارٹی کا ترجمان اخبار، حکومت کا

نقیب اخبار آزاد اخبار اور پھر شخصی اخبار ہر ریاست میں شائع ہوتے ہیں۔

کچھ ایسے اخبار بھی دیکھے گئے ہیں۔ جو کسی بھی حکومت کا گزٹ کہلاسکتے ہیں۔ کسی زمانے میں ایک ہی اخبار، زندگی کے تمام شعبوں کے متعلق خبروں کا احاطہ کرتے تھے لیکن اب خصوصیت پسندی کا کچھ ایسا زور بندھا ہے۔ کہ ہر حکومت، ہر صنعت اور ہر گھر کا اپنا ایک الگ اخبار شائع ہونے لگا ہے۔ شاخ در شاخ ہم یوں تقسیم ہوتے جارہے ہیں، کہ پورے شجر کا تصور ہی ختم ہوجاتا جارہا ہے۔

"اللہ ہی کے لئے مشرق و مغرب" یہ طغریٰ ملک کے ایک اخبار کی پیشانی کا جھومر ہے۔ ایک بڑی بڑی دھماکہ اور مضحکہ خیز سرخیوں والے اخبار نے اتنی لمبی چوڑی عبارت اپنے ماتھے پر کھدوا رکھی کہ اخبار میں سوائے اس تحریر کے اور کچھ نہیں ہوتا۔

چونکہ اخبار پورے ملک یا کسی مخصوص ریاست یا کسی علاقائی حصہ کے عوام کے لئے ہوتا ہے اور اسے صرف ایک ہی شخص نہیں پڑھتا۔ بلکہ آبادی کا کثیر حصہ اپنے زیر مطالعہ لاتا ہے۔ اس لئے زیادہ اشاعت، زیادہ فروخت اور مختلف طبائع کو مدنظر رکھ کر اور اخبار کو سب کے لئے قابل قبول اور پسندیدہ بنانے کے لئے مختلف حصوں میں تقسیم کردیا جاتا ہے۔ یوں کہیئے کہ ایک دن کا اخبار بھی کئی ضمنی ایڈیشنوں کا مرقع ہوتا ہے۔

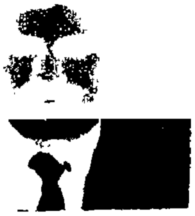
ادارتی کالم، سیاسی کالم، قصیدہ گوئی کالم، ہجو گوئی کالم، مزاحیہ کالم، فلمی کالم اور ادبی کالم کے علاوہ تجارتی، معاشرتی اشتہار جیسے ضرورت رشتہ کے اشتہار اور فلمی اشتہار تو ہر اخبار کا لازمہ ہوتے ہیں۔ باقی جگہ اگر اخبار میں شومیٔ قسمت سے کوئی بچ جائے تو اس میں خبریں لکھی جاتی ہیں۔

کچھ اخبار خبروں کی ایسی چیختی چنگھاڑتی سرخیاں جمائیں گے۔ کہ کچھ محتاط قسم کے لوگ صبح کا اخبار دن کے دس بجے سے پہلے نہیں دیکھتے اور اخبار پڑھنے سے پہلے احتیاطاً کچھ حزنیہ گیت ضرور سن لیتے ہیں۔ اور اس میں لطیفہ یہ ہوتا ہے کہ دی ہوئی تفصیل میں کوئی خبر نہیں ہوتی۔

اخبار، ذرائع و ابلاغ کا ایک ایسا میڈیا ہے جو انسانی ذہنوں کی تربیت کے لئے ایک موثر ذریعہ ہے اور جو بنانے سنوارنے بگاڑنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اس میڈیا سے مثبت کام بھی لئے جاسکتے ہیں۔ رائے عامہ کو مسخر کرنے میں اخبار ہی ایک سستا ترین ذریعہ ہے۔ لیکن اس نے آج پوری انسانیت کو چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بانٹ دیا ہے آج کے اخبار نے نہ صرف معصوم ذہنوں کو مسموم کیا ہے بلکہ انسان کی اخلاقی اور جسمانی صحت کو دیمک کی طرح چاٹ لیا ہے۔ اخبار کی دی ہوئی وہی خبر درست اور سچی کہی جاتی ہے۔ جس کی وہ اخبار دوسرے دن تردید شائع کرے۔ تیسری دنیا کے رہنے والے اپنی ریاست کے کسی اخبار کی کسی اہم خبر پر باوثوق یقین نہیں رکھتے۔ وہ جانتے ہیں کہ اخبار میں صحیح اور درست خبر شائع نہیں ہوسکتی۔ دونوں جانب یہ بات واضح ہوتی ہے۔ کہ اگر سچی خبر شائع کی گئی تو یہ سچ حاکم اور عوام دونوں ہی ہضم نہ کرسکیں گے۔ لہٰذا اخبار میں بھی وہی شائع ہوتا ہے جس کو پڑھ کر کسی کی پیشانی شکن آلود نہ ہو۔ کیا یہ غلط ہے۔ اخبار میں عام طور پر اخباری کاغذ استعمال ہوتا ہے اور کبھی کسی زمانہ میں اخبار صرف ایک ہی سیاہی یعنی کالی سیاہی استعمال کرتے تھے۔ متانت، سادگی اور وضع داری کے پیکر ہوتے تھے۔ لیکن اب اخبار کے صفحات اتنے مختلف اور چنچل رنگوں کے ہوتے ہیں اور لکھائی اتنی متنوع اور شوخ سیاہیوں سے مزین ہوتی ہے کہ اخبار پر کسی بنی سنوری ماڈل گرل کا گمان ہوتا ہے۔

▲▲

"کوائف نامہ"



ادبی نام***** سید قمر حیدر قمر

خاندانی نام***** سید قمر حیدر

اب وجد***** حضرت نثار بیانوی مرحوم و سید محمد مرحوم

تاریخ پیدائش و مقام***** ۲۷/جون سنہ ۱۹۵۰ء بمقام خیرپور میرس سندھ، (پاکستان)

تعلیم***** ایم اے (لٹریچر) ڈی اے آئی بی پی (بنکنگ)

پیشہ***** بنکنگ

تصنیفات***** سبیل حرف (غزلوں و نظموں کا مجموعہ) زیر طبع، "اردو تلفظ الفاظ" (نثر) زیر طبع اور حسرت موہانی کی کتاب "نکات سخن" پر ایک نظر، (تجزیہ و تنقید) زیر طبع

کس صنف میں زیادہ لکھتے ہیں***** غزل، نظم، قطعہ، نعت وغیرہ

اپنے فن کے بارے میں کوئی اور بات***** شعروادب کو زندگی کی تہذیب و ترتیب کا ذریعہ اور انسانیت کے لئے امن و سرخوشی کا سرچشمہ سمجھتا ہوں، اور میرا قلم انہیں مقاصد کے حصول کے لئے کوشاں ہے۔

مشرق وسطیٰ کے مختلف ممالک میں مدت قیام***** ۱۰ سال

حالیہ پتہ مع فون نمبر***** پوسٹ بکس نمبر ۱۹۴۲ الریاض ۱۱۴۴۱۔ سعودی عربیہ۔ فون 4067888x349

شاطر ہے ایسا، اندھے کو آئینہ بیچ دے — چالاک اتنا، بہرے کو سازینہ بیچ دے
ارکان کو پتہ نہ چلے، بک چکے ہیں وہ — چاہے تو اس ادا سے وہ کابینہ بیچ دے
خوش فہمیوں کے بام پہ جس سے چڑھائے وہ — دشمن کے ساتھ مل کے وہی زینہ بیچ دے
لیڈر کے کاروبار پہ گہری نظر رکھو — دوروں کے بیچ وہ کہیں بستی نہ بیچ دے
آرائشوں کے دھوکے میں آجاتے ہیں عوام — آئین کو بناکے نہ آئینہ بیچ دے
ملفوف کرکے تازہ حواشی میں سر بسر — بازار میں وہ قصۂ پارینہ بیچ دے

فنِ فروخت ختم ہے اس شخص پر قمر
گاہک ہو شہد کا تو وہ پودینہ بیچ دے

رنگ کیسا ہے میں اظہار نہیں کرسکتا — کیمرہ ان کو گرفتار نہیں کرسکتا
انگلیوں پر اسے جتنا بھی نچالو گھر میں — رقص وہ برسرِ بازار نہیں کرسکتا
"پاسباں" ساتھ اگر ہو تو کوئی اہلِ جنوں — حسن پر مرنے کا اقرار نہیں کرسکتا

حد سے بڑھ کر ہیں قمر جب کہ پڑوسی کے حقوق
کیوں پڑوسن سے کوئی پیار نہیں کرسکتا

رؤف خلش



رؤف خلش ۴ جنوری ۱۹۴۱ء بہ مقام کرنول پیدا ہوئے لیکن ان کی تعلیم اور رہائش مستقلاً حیدرآباد کی ہے۔ ۱۹۶۵ء میں ڈپلوما اِن آرکیٹکچر کے تین سالہ کورس کی تکمیل کی۔ ۱۹۶۰ء کے آس پاس شعر گوئی کا آغاز کیا۔ اِن کی پہلی نظم بہ عنوان "شاعر" ماہ نامہ 'صبا' حیدرآباد کے نومبر ۱۹۶۱ء کے شمارے میں شائع ہوئی۔ جدید اردو شاعری کی پہلی انتھالوجی "نئے نام" (مطبوعہ ۱۹۶۷ء) میں جسے شمس الرحمٰن فاروقی نے ترتیب دیا تھا، ان کی دو نظمیں شریک ہیں۔ اس کتاب کو کشمیر یونیورسٹی کے ایم۔اے (اُردو) کے نصاب میں شامل کیا گیا ہے ——— رؤف خلش کا کلام ہند و پاک کے تقریباً تمام معروف ادبی رسالوں میں شائع ہوتا رہتا ہے۔ ۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۴ء تک اعظم راہی کی ادارت میں شائع ہونے والے ماہ نامہ 'پیکر' میں شریک مدیر کی حیثیت سے کام کیا۔ انہی دنوں اپنے احباب کے تعاون سے "ادارۂ مصنفین نو" کی بنا ڈالی جس کے زیرِ اہتمام کوآپریٹیو اساس پر دو کتابیں "نیا کارواں" (افسانوی مجموعہ) اور "آبگینے" (شعری انتخاب) شائع کی گئیں۔

۱۹۸۱ء کے اواخر میں جدہ (سعودی عرب) کا رُخ کیا جہاں وہ تادمِ تحریر اپنی ملازمت کے سلسلے میں مقیم ہیں۔ اب تک ان کے دو شعری مجموعے "نئی رتوں کا سفر" (۱۹۷۹ء) اور "صحرا صحرا اجنبی" (۱۹۸۸ء) شائع ہوئے ہیں جنھیں آندھرا پردیش اُردو اکیڈمی کے ایوارڈ ملے۔ رؤف خلش حیدرآباد کی مشہور ادبی انجمن "حیدرآباد لٹریری فورم" (حلف) کے بانی اراکین میں سے ہیں۔

— رؤف خلش بنیادی طور پر سنجیدہ شاعر ہیں لیکن انھوں نے عابد معز کی فرمائش پر یہ مزاحیہ غزل کہی ہے۔

غزل

(اپنی ہی ایک غزل کی پیروڈی جس کا مطلع ہے : ؎ خوں چھڑکنے کی رُت نوحہ خوانی میں تھی ؛ کیا کہوں جوے خوں کس روانی میں تھی)

جاڑا نانا میں تھا، سردی نانی میں تھی
ڈگمگاتی ہوئی ناؤ پانی میں تھی

محفلِ عقد میں وہ بظاہر تھے خوش
اک پریشانی سی شیروانی میں تھی

بن گئی تھی لچکتی ہوئی شاخِ گُل
اتنی مصروف وہ باغبانی میں تھی

چھیڑنا جوتیوں کا سبب بن گیا
بات جتنی بھی تھی بدگمانی میں تھی

پارسا تھے بہت پھر بھی لٹو ہوئے
پوچھئے کیا کشش نوکرانی میں تھی؟

پُرزہ پُرزہ بیانِ صفائی ہوا
کیوں کہ بیگم کی قینچی روانی میں تھی

ساری بازی تو ٹٹ پونجیے لے گئے
چاپلوسی تری حکمرانی میں تھی

رکھ دیا نام اس کا 'نمک شاعری'[1]
چاشنی کیسی "نقل مکانی" میں تھی

ہاں مزے میں گذرتی ہے اب بھی خلش
زندگی وہ کہاں جو جوانی میں تھی

---

[1] حال ہی میں ڈاکٹر یوسف کمال نے "نقل مکانی" کے کرب (ن۔م۔ک) کی شاعری کو "نمک شاعری" سے تعبیر کیا ہے۔



ابد معز
ریاض)

اپنے منھ میاں مٹھو

اپنے بارے میں لکھنا ایک مشکل اور متنازعہ کام ہے اور پھر اپنے تعلق سے دل و دماغ میں موجود خیالات اور ں کا برملا اظہار اکثر رائیگاں جاتا ہے۔عام قاری کو ادیبوں اور شاعروں کی ذاتیات سے دلچسپی نہیں ہوتی کہ آبادی میں ب اور کہاں اضافہ ہوا، کہاں تعلیم پائی، ادب میں داخلہ کب اور کیوں کر ہوا وغیرہ وغیرہ۔وہ ہماری نگارشات پڑھ لیتے ، یہی ان کا کرم ہے۔فلمی ستاروں اور سیاستدانوں کی بات علیحدہ ہے۔ان لوگوں کی حقیقی زندگی بھی اسکینڈلس کی رح دلچسپ ہوتی ہے۔رہی بات ناقدین کی تو جناب ان کا ہماری خوش فہمی سے متفق ہونا تو دور ہماری باتوں پر یقین مشکل سے کرتے ہیں۔نقاد کی اپنی رائے ہوتی ہے جس کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں ہے۔ان حقائق کے باوجود بھی ب و شعراء اپنے بارے میں لکھتے اور ڈھیر ساری باتیں کرتے ہیں۔اپنے بارے میں کہنا اور سننا انسانی کمزوری جو ٹھہری

دو چار سال کے فائدے کے لئے غلط تاریخ پیدائش بتلانے اور لکھوانے کا رواج چل پڑا ہے۔تاریخ پیدائش کے ہونے کے لئے صداقت نامہ منسلک کرنا ضروری ہے چوں کہ اب ایسا کوئی لزوم عائد نہیں کیا گیا ہے قارئین کو آزادی ۔چاہیں تو سن پیدائش کو آٹھ، دس سال آگے سمجھیں۔میں ۲۵ جنوری ۱۹۵۵ کو پیدا ہوا۔وطن مالوف حیدرآباد دکن ہے علم دوستی اور سرپرستی، چارمینار، جامعہ عثمانیہ املی اور جگر کا کھٹا، بریانی اور بگھارے بیگن، شیروانی نوابوں اور نظام باقیات کے علاوہ مزاح نگاروں اور مزاح کے فروغ کے مرکز کے طور پر مشہور ہے۔

جس ماحول اور فضا میں آنکھ کھلی اور پلا بڑھا وہ ادبی نہ تھا گو علمی ضرور تھا۔والد محترم پیشہ تدریس سے وابستہ اور س جیسے خشک سائنسی مضمون کے ریڈر رہے ہیں۔گھر ادبی کتابوں اور رسالوں سے بھرا پڑا تھا اور نہ خاندان میں ر دور تک کسی ادیب و شاعر کا پتہ ملتا تھا۔اسباب ڈھونڈتا ہوں کہ ادب کی ڈگر پر میں کیوں کر چل پڑا (نہ چلتا تو ہر دو کا

بھلا ہوتا) اب تک کوئی قابل قبول عذر دریافت نہ کر سکا۔

میں نے جب تعلیم شروع کی تو دائیں بازو کی زبانوں (اردو، فارسی اور عربی) میں بنیادی تعلیم پانے اور مولوی صاحبان کے آگے زانوے ادب تہہ کرنے کا دور ختم ہو کر بائیں بازو کی زبانوں (انگریزی، ہندی، وغیرہ) کے پیچھے بھاگنے اور اسکول میں ٹائی باندھ کر کرسیوں پر بیٹھنے کا فیشن رواج پا چکا تھا۔ انگلش میڈیم اسکول میں تعلیم پائی۔ مادری زبان اردو کو ثانوی حیثیت میں پڑھا اور سیکھا۔ والدین کی خواہش اور دعاؤں کی بدولت ۱۹۷۹ء میں جامعہ عثمانیہ سے ایم بی بی ایس اور پھر ۱۹۸۵ء میں تغذیہ اور استحالی امراض میں پوسٹ گریجویشن کیا۔

نام سید خواجہ مُعزالدین ہے۔ میڈیسن میں داخلہ کے ساتھ ڈاکٹر میرے نام کا جز بن گیا۔ معلوم نہیں اطباء کے ساتھ ایسا کیوں ہوتا ہے ان کے نام کے ساتھ ڈاکٹر نتھی کر دیا جاتا ہے۔ بعض مرتبہ بے چاروں کا نام غائب ہو جاتا ہے صرف ڈاکٹر کہلائے جاتے ہیں۔ دوسرے پیشہ وروں کے ساتھ ایسی زیادتی نہیں ہوتی۔ سیاستداں کے ساتھ لیڈر، معمار کے ساتھ انجینئر، استاد کے ساتھ ٹیچر، نام کا جز نہیں بنتے۔ شاید معالجوں کو احساس دلانا مقصود ہوتا ہے کہ ڈاکٹر ہر لحہ ڈیوٹی پر ہوتے ہیں۔ ان سے کبھی بھی، کسی وقت بھی اور کسی حالت میں بھی طبی مشورہ لیا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر معز کو ادب سے الگ رکھنے کے لئے عابد معز کے نام سے لکھتا ہوں۔ عابد معز کے ساتھ ڈاکٹر کی اضافت گوارا نہیں کرتا لیکن بعض احباب اپنی عادت سے مجبور ہیں۔ ڈاکٹر عابد معز لکھتے یا پکار لیتے ہیں جب ڈاکٹر معز اور عابد معز باہم دگر ہوتے ہیں تو دلچسپ صورتحال پیدا ہوتی ہے۔ بحث چھڑ جاتی ہے کہ میں طِب کا ڈاکٹر ہوں کہ علم کا۔ ادب کے چاہنے والے سمجھتے ہیں کہ میں نے اردو سے پی ایچ ڈی کی ہے۔ ساتھی معالجوں کا خیال ہے کہ بہتر ہوتا اگر میں ادب کا ڈاکٹر بن جاتا۔ میں اپنے مریضوں کی رائے سے لاعلم ہوں کہ وہ کیا سوچتے ہیں۔ اس ضمن میں ایک بات بتلاتا چلوں کہ میں طب سے کماتا اور گنواتا ہوں۔ ادب میں گنوانے والوں میں، ایک میں ہی نہیں اور بھی کئی ہیں بلکہ اگر میں یہ کہوں تو غلط نہ ہوگا کہ ادب خود ایک گھاٹے کا سودا ہے۔

شناخت کے لئے تصویر چھاپی گئی ہے۔ کتابوں اور رسالوں میں چھپے چہرے پر کم عمری میں لی گئی تصویر کا قیاس کرنا زیادتی ہے۔ ہر چہرہ کاغذ پر اچھا نہیں اترتا اور پھر فوٹو جینک چہرے کم ہوتے ہیں۔ ایک آدھ تصویر اصل چہرے سے اچھی آجاتی ہے۔ اسی کو بار بار چھپایا جائے تو کیا مضائقہ ہے اور پھر کیمرہ کیل، مہاسے اور جھریاں چھپا لیتا ہے تو اس میں صاحب تصویر کا کیا قصور ہے۔ قصہ مختصر قارئین کی قیاس آرائیوں کے خوف سے میں نے اپنی تازہ تصویر چھپنے کے لئے دی ہے۔ اب اس کو کیا کہئے کہ فارغ البالی کے سبب میں اپنی عمر سے دس سال بڑا نظر آتا ہوں (کم از کم مجھے تو ایسے ہی لگتا ہے)

جو باتیں تصویر بتانے سے قاصر ہے وہ سن لیجئے۔ جلد کا رنگ کالا، سانولا، اور نہ ہی گورا بلکہ وہ مخصوص تانبے جیسا ہے جو برصغیر کی پہچان ہے۔ چہرہ بھرا بھرا اور ابھی تک جھریوں سے پاک ہے۔ ماضی میں ناک اور کان مناسب لگتے اچھے لیکن اب فارغ البالی کی وجہ ناک موٹی اور کان بڑے نظر آتے ہیں۔ ہونٹ پتلے اور اوپر کے ہونٹ پر کسی قدر گھنی مونچھ سائبان کئے ہوئے ہے۔ آنکھیں، پلکوں کی اوٹ میں روشن اور چمکدار، موضوع کی تلاش میں سرگرداں رہتی ہیں۔ قد عام مردوں جیسا، (خواتین کے درمیان اونچا نظر آتا ہوں) پانچ فٹ آٹھ انچ، بڑھتے ہوئے وزن کو قابو میں کرنے کا جتن کر رہا ہوں۔ چال چلن بیان کرنے سے زیادہ دیکھنے بلکہ پرکھنے کی چیز ہوتی ہے۔

دل، دماغ اور ذہن کی تمام کھڑکیاں کھلی رکھتا ہوں۔ دل و زبان میں ایک ہی بات ہے اور اندر اور باہر ایک ہی

شخصیت کا مالک ہوں ۔ان کمزوریوں کے سبب نقصان اٹھاتا ہوں اور دوسرے فائدے میں رہتے ہیں ۔

حیدرآباد میں سیول اسسٹنٹ سرجن کے طور پر پہلے جیل اور پھر عدالت العالیہ میں کام کیا ۔ دستور ہیکہ مجرمین عدالت سے سزا پاکر جیل کا رخ کرتے ہیں لیکن جو بے گناہ ہوتے یا ناکردہ گناہوں کی سزا بھگتے ہیں وہ جیل سے عدالت جاتے ہیں ۔ایسے لوگوں کو جیل میں بہت کچھ لکھنے کا موقع ملتا ہے جیل میں، میں نے بھی لکھا ۔لکھنے کے لئے جیل اچھی جگہ ہے ۔قیدیوں کے ہاں گناہ اور بے گناہی کی بے شمار کہانیاں ہوتی ہیں ۔

ہجرت افرو ایشائی باشندوں کا مقدر بن چکی ہے ۔لوگ گاؤں سے قصبہ، قصبہ سے شہر اور پھر بحیثیت امیگرنٹ، رفیوجی یا ریزیڈنٹ شہر سے دوسرے ملک کا رخ کرتے ہیں ۔ مقدر کا لکھا پورا کرنے کے لئے ۱۹۸۷ء کے اوائل میں، میں سعودی عرب آیا ۔بہت کچھ دیکھا اور سیکھا ۔بیک وقت کئی ممالک کے لوگوں سے ملنے اور ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے اور بسنے کا موقع ملا ۔ایسا تجربہ اور مشاہدہ جو شاید وافر مقدار میں تیل کی طرح مشرق وسطیٰ ہی میں حاصل ہوتا ہے ۔ تادم تحریر شہر ریاض میں مقیم ہوں ۔اپنی تہذیب و ثقافت سے رشتہ مضبوط سے مضبوط تر بنانے کے لئے ہر دس مہینے بعد چھٹی پر وطن جاتا ہوں ۔

گھریلو زندگی سے ہم دونوں مطمئن اور شادماں ہیں ۔وہ مجھے دیکھ کر صبر کرتی ہیں اور میں انھیں دیکھ کر شکر کرتا ہوں ۔صبر و شکر کا انعام ہمیں تین پیاری لڑکیوں کی صورت میں ملا ہے ۔ہم انھیں دیکھ کر خوش ہوتے اور فخر کرتے ہیں ۔ مزید تفصیلات میں اگر گیا اور بیوی نے پڑھ لیا تو ہو سکتا ہیکہ حالات دوسرا رخ اختیار کرلیں ۔اسی لئے فی الحال اتنا ہی کافی ہے ۔

لکھنا ۱۹۷۰ء سے شروع کیا لیکن چھپانے کا مہورت سات سال بعد نکالا ۔۱۹۷۷ء میں حیدرآباد کے مقامی روزنامے میں دو مضامین چھپے ۔اتنی مسرت ہوئی کہ چار سال تک خوش ہوتا رہا ۔ باقاعدگی سے لکھنے اور چھپنے کا سلسلہ مارچ ۱۹۸۱ء میں ماہنامہ شگوفہ سے شروع ہوا ۔تب سے ہند و پاک کے مختلف اخبارات، رسائل اور جریدوں میں شائع اور ڈائجسٹ ہوتا رہا ہوں ۔

جون ۱۹۸۳ء سے مارچ ۱۹۸۷ء تک شگوفہ میں " مرا شہر لوگاں سوں معمور کر " عنوان کے تحت شہر حیدرآباد پر موضوعاتی مضامین کا ماہانہ سلسلہ جاری رہا ۔

طبع زاد مضامین کا اتنا انبار لگ چکا ہے کہ بہ آسانی چار پانچ کتابیں شائع ہو سکتی ہیں ۔ کتابیں شائع کرنے کے لئے احباب کا اصرار اور پیشکش دونوں موجود ہے لیکن میں خود اس طرف مائل نہیں ہوا ۔اردو کتاب چھپانے کے بعد ادیبوں اور شاعروں کے حشر کو دیکھ کر سہم جاتا ہوں ۔رسم اجراء کے لئے اصحاب کی خوشامد، خریداروں کی تلاش بسیار اور آخر میں تنگ آکر بوجھ کم کرنے کے لئے کتابوں کی مفت تقسیم ۔لوگ مفت میں کتابیں لے تو لیں لیکن پڑھنے کسی صورت میں تیار نہیں ۔اردو والوں میں پڑھنے کا شوق جاگا تو میں اپنی کتاب شائع کروں گا تاکہ کتاب پڑھ کر لوگوں کا شوق پھر سے ختم ہوجائے ۔

ہند اور بیرون ہند ادبی اجلاس اور نثری محفلوں میں جسے نثری مشاعروں کا نام دیا جانے لگا ہے، شریک رہا ہوں ۔ مضامین پڑھ کر سنائے اور واہ واہ، مکرر ارشاد کی صورت داد سمیٹی ہے ۔ بعض مرتبہ پسینے چھوٹنے، زبان لڑکھڑانے اور

غلط تلفظ سے خاصا مزاح پیدا ہوا ہے۔

مضامین حوالے کرنے کے لئے دفتر شگوفہ پر آنا جانا شروع ہوا۔ مدیر شگوفہ سے ملاقاتیں دوستی میں تبدیل ہوتی گئیں۔ ہم نے اپنے درمیان کئی مشترکہ خوبیاں اور خامیاں دریافت کیں اور جو باتیں مشترک نہ تھیں ان میں ہم نے آہنگی پیدا کی۔ کمال بھائی کی کمزوری شگوفہ میری اپنی کمزوری بھی بنتی گئی۔ شگوفہ کھلانے کے درد کا احساس ہونے لگا تو احباب شگوفہ نے مجھے بھی جنوری ۱۹۹۲ء سے ایڈیٹر بنا دیا۔ فرق قائم رکھنے کے لئے ساتھ میں اوور سیز کا اضافہ ہے۔

ریاض آیا تو اردو کے حوالے سے مجسم اخلاق جناب شجاع الدین غوری صاحب سے دوستی ہوئی۔ صحرا میں باذوق اور اچھی صحبت میسر آئی۔ شگوفہ کے معاملات میں انھیں بھی دھر گھسیٹا۔

فکاہیہ تحریروں کے علاوہ طب کے مختلف موضوعات پر مضامین بھی لکھتا ہوں جو مختلف اخباروں اور رسالوں میں چھپتے رہتے ہیں "صحت و طب" کے عنوان سے روزنامہ "منصف" حیدرآباد میں ہر دوسرے ہفتہ مضامین کا سلسلہ ۱۹۸۹ء میں ایک سال کے لئے جاری رہا۔ ان مضامین کو کتابی شکل میں شائع کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔

میں اپنے آپ سے چند سوال اکثر کرتا رہتا ہوں اور شاید قارئین بھی یہی سوالات مجھ سے پوچھنا چاہتے ہوں گے۔ میں کیا لکھتا ہوں، کیوں لکھتا ہوں، کیا میرا لکھنا ضروری ہے اور کب تک لکھتا رہوں گا؟

میں کیا لکھتا ہوں؟ پڑھنے والے بہتر جانتے ہیں۔ نقاد فیصلہ صادر کریں گے میرا اپنا جواب ہیکہ میرے ذہن میں جو خیالات آتے ہیں، انھیں قارئین تک پہنچاتا ہوں۔ اس پر ان کے نظریات جاننا چاہتا ہوں لیکن میری یہ مشق یکطرفہ ثابت ہورہی ہے۔ تکنیکی نقطہ نظر سے اپنی تحریروں کو مزاحیہ، طنزیہ، انشائیہ اور فکاہیہ اصناف ادب کا امتزاج سمجھتا ہوں۔ ہر مضمون میں کسی نہ کسی ایک کا پلڑا بھاری ہوتا ہے۔

میں کیوں لکھتا ہوں اور کیا میرا لکھنا ضروری ہے؟ اونچی اونچی اور فلسفیانہ باتیں نہیں بگھاروں گا۔ انھیں کوئی سمجھے گا نہیں (میں بھی نہیں سمجھتا) اور اگر سمجھ لے تو یقین نہیں کرے گا۔ میں اپنے ذوق کی تسکین کے لئے لکھتا ہوں اور میرے اپنے لئے لکھنا ضروری ہے (خدا آپ کو اپنی امان میں رکھے)۔

میں اس وقت تک لکھتا رہوں گا، جب احباب اور میری تعریف کرنے والے دو ٹوک الفاظ میں مجھ سے نہ کہدیں "بس بہت ہو چکا" میں دعا گو ہوں کہ ہم میں ایسی جرأت پیدا ہو۔

کسی مضمون کا خیال آنے کے بعد میں اس خیال پر سوچتا اور اہم نکات نوٹ کرتا جاتا ہوں۔ مضمون کو مختلف نشستوں میں پنسل سے لکھتا ہوں۔ مرمت کے لئے ربر سے کام لیتا ہوں۔ وقتی طور پر مطمئن ہو کر چھپنے بھیجتا ہوں۔ چھپنے کے بعد پڑھتا ہوں تو احساس ہوتا ہیکہ مضمون کو بہتر بنایا جاسکتا تھا (اگر سرے سے نہ لکھتا تو اچھا تھا) معلوم نہیں قارئین کی رائے اور حالت کیا ہوتی ہوگی۔ مجھ تک احباب اور نقادوں کی رائے پہنچتی ہے۔ احباب تعریف کرتے ہیں نقاد کی رائے فنی پیچیدگیوں میں الجھی گول مول باتیں ہوتی ہیں جو میری سمجھ میں نہیں آتیں۔ میرے نزدیک عام قاری اور سامع کی رائے مقدم ہے عام قاری کی رائے خلوص دل سے نکلی ہوئی صدا ہوتی ہے جو کبھی کبھار ہی سننے کو ملتی ہے۔ چاہتا بھی ہوں کہ عام لوگوں کے لئے لکھوں۔ ادب کے شہ پارے تخلیق کرنا میرا مقصد ہے اور نہ شاید میں اس کا اہل ہوں۔ میں خیالات کا منظم اظہار کرنے والی تحریروں کو ادب سمجھتا ہوں۔

اعتراف کرتا ہوں کہ میرا ادب کا مطالعہ محدود ہے۔ رموز شاعری سے واقف ہوں اور نہ ہی دیگر فنی باریکیوں سے آگاہ۔ نقاد اگر میرے مضامین میں زبان و بیان کی کمزوریوں کی جانب اشارہ کریں تو انھوں نے کوئی تیر نہیں مارا ہے۔

کوئی کردار وضع کرنے کے بجائے خود اپنا مضحکہ اڑا تا پسند کرتا ہوں۔ اس سے عافیت رہتی ہے اور یہ دوسروں پر ہاتھ ڈالنے کے لئے توازن کے کام بھی آتا ہے۔ بیوی کی آڑ لے کر اپنے اندر ایک دوسرا کردار ایجاد کرلیتا ہوں۔ اپنے اور بیوی کے درمیان مکالمہ کے ذریعہ میں بہت کچھ کہہ گذرتا ہوں۔ میری بیوی ناراض نہیں ہوتیں۔ میں انھیں یقین دلا چکا ہوں کہ وہ مجھ سے علیحدہ نہیں ہیں، میری اپنی شخصیت کا عکس ہیں اور ہم ایک ہی سکے (رائج الوقت) کے دو رخ ہیں۔

شاعری آسان صنف ادب ہے۔ شاعروں کی بہتات یہی ثابت کرتی ہے۔ پتہ نہیں شعر کہنے سے کیوں گھبراتا ہوں کئی شعراء گھسی پٹی شاعری کرنے کے باوجود محفوظ ہیں۔ میں نے کبھی شعر کہا اور نہ کہنے کا ارادہ ہے (خوشی کی بات ہے)

اردو سے عشق کی حد تک محبت ہے۔ ہم زبان لوگوں کے جذبہ رقابت اور بے حسی سے ہول آتا ہے۔ ان افراد پر بہت غصہ آتا ہے جن کی مادری زبان اردو ہونے کے باوجود سینہ تان کر "ہمیں اردو نہیں آتی" کہنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ میں ان سے الجھ پڑتا ہوں۔

سیاست اور سیاستدانوں سے بے زار ہوں، انھیں موجودہ افراتفری اور تمام مسائل کا ذمہ دار گردانتا ہوں۔ دنیا کے مسائل کا حل اور دنیا کا کاروبار ان کے بغیر چل سکتا ہے لیکن زندگی کے ہر شعبہ اور ہر سطح پر سیاست اور سیاستدان گھس کر تباہی مچائے ہوئے ہیں۔ فی الحال نجات کی صورت نظر نہیں آتی۔

دانشوروں سے شکایت ہیکہ وہ اپنے خول میں بند ہوتے جاتے ہیں انھیں عوام میں کھلنا چاہئے۔ میرے نزدیک ان کا وجود کنول کے پھول کی طرح ہے جو کھل کر ماحول کو خوبصورت بناتا ہے۔

عقیدتاً پکا مسلمان ہوں لیکن عمل کے میدان میں اپنے آپ کو کمزور پاتا ہوں۔ مسلمانوں کی اکثریت کا شاید یہی المیہ ہے۔

موقع ملا ہے تو اور بھی بہت کچھ کہنے اور سنانے کو جی چاہتا ہے جیسے کہ بازار میں قیمتیں کم ہوں تو خوشی ہوتی ہے (کسے نہیں ہوتی) لیکن اب تک ایسا نہیں ہوا۔ الیکشن کے موسم میں پریشان رہتا ہوں کتوں سے ڈر لگتا ہے۔ لڑائی سے طبیعت گھبراتی ہے۔ کرکٹ شوق سے دیکھتا ہوں۔ خوب ڈٹ کر کھانا اور کھلانا اچھا لگتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ آپ کا خیال آتا ہے۔ آپ میرے مضامین پڑھتے ہیں اور یہ تحریر بھی بھگت رہے ہیں۔ شکریہ۔ مجھے آپ سے دلی ہمدردی ہے ؎

قدر کرتے ہیں لوگ میری بھی
ہائے لوگوں کو کیا زمانہ ملا

▲▲

(سلسلہ مضامین آگے ملاحظہ فرمائیے)

عابد معز
ص۔ب ۵۲۵۳ الریاض
فون رہائش : ۴۶۴۸۰۳۳

بیمہ ایجنٹ

عابد معز

چند سال قبل کی بات ہے پہلی مرتبہ بیمہ ایجنٹ ہمارے گھر آئے ہم بہت خوش ہوئے کہ ہمارا شمار بھی دولت مند لوگوں میں ہونے لگا ہے ۔ انسان کے پاس روپیوں پیسوں کی ریل پیل ہوتے ہی رشتہ دار قریب آنے لگتے ہیں ۔ دوست احباب کی تعداد میں اضافہ ہونے لگتا ہے چور لوٹنے کا پلان بنانے لگتے ہیں اور بیمہ ایجنٹ ورغلانے چلے آتے ہیں ۔ پیسہ نہ ہو تو کوئی قریب نہیں پھٹکتا ، دنیا کا دستور یہی ہے ۔ خیر ، بیمہ ایجنٹ کی آمد ہمارے لئے پیام مسرت بنی ۔ عرصہ سے ہمیں موصوف کا انتظار بھی تھا ۔ ہمیں اپنی وہ مایوسی خوشی میں تبدیل ہوتی نظر آئی جو ہمیں ڈائری لکھتے وقت بیمہ پالیسی کے کورے کالم کو دیکھ کر ہوتی تھی ۔ اب ہم بھی شان سے آٹھ دس ہندسوں والے بیمہ پالیسی نمبر لکھا کریں گے ۔ ہم نے بیمہ ایجنٹ کا پرتپاک استقبال کیا ۔ انھیں تقریر کرنے اور ہمیں اپنے جال میں پھانسنے کا موقع دیئے بغیر ہم نے ایک بیمہ پالیسی لے لی ۔ موصوف کا کام آسان ہوا اور وہ خوش و خرم ہمارا شکریہ ادا کر کے چلتے بنے ۔

بیمہ ایجنٹ سے ہماری یہ پہلی ملاقات تھی ۔ اپنی دانست میں دولت مند بننے کی خوشی میں ہم اس کے روبرو ایسے ریجھ گئے کہ ہم پر بیمہ ایجنٹ کی خوبیاں عیاں نہ ہوئیں لیکن جب وہ مستقلاً ہماری کمائی پر دیدے لال کئے ہمیں مختلف پالیسیوں میں مبتلا کر کے کنگال بنانے کے لئے ہمارے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئے تو وہ ہمیں دشمن جان ، دشمن دولت اور دشمن صبر و سکون نظر آنے لگے اور ہمیں بیمہ ایجنٹ کے قریب سے دیکھنے ، سمجھنے ، جانچنے اور پرکھنے کا موقع ملا ۔

موت سے ہر کوئی ڈرتا ہے ۔ یہ ایک فطری خوف ہے بعض لوگ اس خوف سے فائدہ اٹھا کر اپنا روزگار پیدا کرتے ہیں ۔ ان میں ڈاکٹر اور بیمہ ایجنٹ پیش پیش ہوتے ہیں ۔ ڈاکٹر موت سے یونہی نہیں ڈراتے ، ان کے ڈرانے کی وجہ ہوتی ہے معمولی نزلہ زکام ہو گا تو نمونیا سے ہونے والی موت کا خوف دلا کر علاج کریں گے ۔ خدا شفا دیتا ہے اور وہ مفت میں فیس بٹورتے ہیں ویسے مریض خود ڈاکٹر کے یہاں موت کا خوف لئے رجوع ہوتا ہے ۔ ڈاکٹر کا کام آسان ہو جاتا ہے وہ ان کے ڈر اور خوف کو تقویت پہنچاتے اور اپنا الو سیدھا کرتے ہیں ۔ بیمہ ایجنٹ یونہی ، بلاوجہ اور بے وقت موت سے ڈرا کر اپنا روزگار پیدا کرتے ہیں ۔ عجیب طریقوں سے موت کے بعد متعلقین پر ٹوٹنے والی مصیبتوں کا رونا روتے ہیں کہیں گے "آپ کا کیا ہے آپ ہنستے کھیلتے اس دار فانی سے گذر جائیں گے ۔ پسماندگان مغفرت کی دعا کرتے رہیں گے لیکن کیا آپ نے کبھی سوچا ہے کہ آپ کے بعد آپ کے اہل و عیال پر کیا بیتے گی ۔ بچوں کی پڑھائی کیسے ہو گی ۔ لڑکی کی شادی کا انتظام کیوں کر ہو گا ۔ بیوہ کہاں سر چھپائے گی ۔ دنیا سے جاتے ہوئے آدمی کو اپنے پیچھے کم از کم چند بیمہ پالیسیاں چھوڑ جانا چاہیئے تاکہ اہل و عیال ایک عرصہ تک اسے یاد رکھ سکیں " ۔

بیمہ ایجنٹ سے ملاقات ایک عجیب و غریب واقعہ ہوتا ہے دوسرے کئی قسم کے ایجنٹ حضرات سے ہماری ملاقات ہوتی ہے اور ہم انھیں بھول بھی جاتے ہیں لیکن بیمہ ایجنٹ ہمیں بے بس کر دیتے ہیں ۔ ہنس سکتے ہیں اور نہ رو سکتے ہیں

خاموش بیٹھے موصوف کی باتیں سنتے رہتے ہیں، خیر خیریت، صحت اور کاروبار کے متعلق سرسری سوالات کرنے کے بعد پیسے کی قدر و اہمیت پر تقریر کرتے ہیں "آج کا نظام حیات صرف روپیہ پیسہ ہے۔پیسہ ہے تو سب کچھ ہے۔پیسہ نہ ہو تو کچھ بھی نہیں۔آج آپ خوش ہیں اس لئے کہ پیسہ آپ کے پاس ہے۔معلوم نہیں کل شاید آپ کے پاس پیسہ نہ ہو۔اسی لئے اچھے وقتوں کا پیسہ برے وقت کے لئے اٹھا رکھنا چاہئے۔آپ ہمیں اپنے اچھے وقت کا پیسہ دیجئے ہم اسے برے وقت پر آپ کے لئے جمع رکھیں گے۔آپ کے پیسوں پر ہم منہ مانگا فائدہ بھی دیتے ہیں" اشاروں اور کنایوں میں ہم اگر بیمہ ایجنٹ کی بات سمجھ گئے تو ٹھیک ہے ورنہ وہ ہمیں کھلے الفاظ میں ڈرانے اور دھمکانے لگتے ہیں "دنیا فانی ہے۔زندگانی تو آنی جانی ہے اگر آپ چل بسے تو بیمہ کی رقم پسماندگان کو ملے گی۔پیسہ آپ کی کمی محسوس نہیں ہونے دے گا" اب بھی اگر ہم بیمہ پالیسی لینے تیار نہ ہوئے تو لگتا ہے بیمہ ایجنٹ ہتھ مار کر کوسنے لگیں گے "بیمہ کروانے سے پہلے بلکہ ابھی آپ سورگباش ہو جائیں"

موت کے ڈر یا مستقبل کے خوف سے جب ہم پالیسی لینے تیار ہو جاتے ہیں تو بیمہ ایجنٹ مقام اور تاریخ پیدائش پوچھ کر ڈاکٹر کی طرح بلکہ ڈاکٹر سے دو ہاتھ آگے جاکر صحت اور مختلف بیماریوں کے تعلق سے معلومات حاصل کرتے ہیں "کہاں اور کب پیدا ہوئے۔شکر، بلڈ پریشر، دل کی بیماری، فالج، کینسر وغیرہ جیسی جان لیوا بیماریوں میں مبتلا تو نہیں ہیں آپ کا خاندان کونسی بیماریوں کا مسکن ہے۔خاندان میں ہونے والی اموات کے بارے میں تفصیلات بتلائیے۔ادھر ادھر منہ مار کر ایسی ویسی بیماری حاصل کرنے کا شوق تو نہیں ہے" اپنے طور پر اندازہ کرتے ہیں کہ یہ شخص عنقریب مرنے والا نہیں ہے اور قیامت کے بورئے سمیٹے گا۔اگر انہیں ذرا بھی شک ہوا تو اچھے بھلے اور صحتمند شخص کو مختلف شکوک و شبہات میں مبتلا کر کے اپنے بڑے بھائی یعنی ڈاکٹر کے پاس طبی معائنہ کے لئے بھیجتے ہیں۔یہ طبی معائنہ عام معائنوں سے مختلف ہوتا ہے بیماری کا پتہ لگانے سے زیادہ اس نکتہ پر توجہ دی جاتی ہے کہ یہ شخص کب تک زندہ رہ سکتا ہے۔

ہر ممکن طریقے سے مطمئن ہونے کے بعد کہ پالیسی لینے والا پالیسی "پکنے" سے پہلے ختم ہونے والا نہیں ہے تو اس کی زندگی کا بیمہ کیا جاتا ہے۔نجومی کی طرح بیمہ ایجنٹ اپنے پاس موجود زائچے سے ہمارا مستقبل دیکھتے اور بیمہ کرتے ہیں بیمہ ایجنٹ صرف اوسط عمر کی حد تک پالیسی کرتے ہیں۔ایک مرتبہ ہم نے اپنی بیمہ ساٹھ سال تک کروانا چاہا تو بیمہ ایجنٹ نے بتلایا "آپ کا بیمہ صرف پچپن برس تک ہی ہو سکتا ہے ہمارے حساب سے آپ پچپن سال تک زندہ رہیں گے اس لئے کہ ہماری اوسط عمر یہی ہے۔پچپن کے بعد ہم رسک نہیں لے سکتے"۔

ہماری عمر، بیمہ کی رقم، پالیسی کی عمر اور مختلف فارمولوں کی مدد سے ماہانہ، سہ ماہی اور سالانہ اقساط مقرر کرتے ہیں۔اقساط کو پابندی سے یوں ادا کرنا پڑتا ہے گویا قسطیں ہمارے سانس لینے کا ٹیکس ہیں۔قسط ناغہ ہوئی تو پالیسی ڈوب جانے کے ساتھ اب تک جمع کی ہوئی رقم کے لالے بھی پڑ جاتے ہیں۔بیمہ ایجنٹ پالیسی دلا کر ہمیں بھول جاتے ہیں ہم پالیسی کو گلے لگائے مخمصہ میں گرفتار رہتے ہیں پالیسی پکنے تک کوئی فائدہ ہوتا نظر نہیں آتا اور نہ ہم فائدے کی خواہش کر سکتے ہیں بالائے ستم یہ کہ پیسے کی قیمت دن بہ دن گھٹتی جاتی ہے محسوس ہوتا ہے ہم قیمتی روپے پیسوں کا سودا کوڑیوں کے مول کر رہے ہیں۔پالیسی گلے کا کانٹا بن جاتی ہے نگل سکتے ہیں اور نہ نکال سکتے ہیں ہمیں پریشان کر کے بیمہ ایجنٹ کمیشن کھاتے چین کی بانسری بجاتے رہتے ہیں۔انھیں ہماری یاد پھر اس وقت آتی ہے جب وہ ہمیں ایک نئی پالیسی کے لئے

پھانسنا چاہتے ہیں ۔ بیمہ ایجنٹ نئی پالیسی لئے آدھمکتے ہیں ، نئی پالیسی کے فائدے بتلاکر ، موت سے ڈراکر ، تاریک مستقبل کی دہائی دے کر اور دوسرے ہتھکنڈے استعمال کر کے ایک اور مرتبہ اپنے شکنجے میں جکڑ لیتے ہیں اور ہم پھر قیمتی پیسوں کا مول سستے دام کر بیٹھتے ہیں ۔

بیمہ ایجنٹ سے ملنے کے بعد ہماری طبیعت مضمحل اور پریشان ہوجاتی ہے احساس ہوتا ہیکہ ہمیں کیا کرنا چاہئے تھا اور ہم نے کیا کچھ کیا ۔ اپنی غلطیاں اور گناہ یاد آتے ہیں ۔ توبہ کرتے ہیں ہم جب بھی وقت سے پہلے گھر پہنچ کر مصلا بچھائے ہاتھ اٹھائے گڑگڑانے لگتے ہیں تو بیوی سمجھ جاتی ہیں کہ ہماری ملاقات بیمہ ایجنٹ سے ہوئی ہے ۔ بیوی ہمیں سمجھانے لگتی ہے "آپ کیوں ان کی باتوں سے پریشان ہوتے ہیں ۔ بزنس کے لئے وہ کچھ بھی کہہ لیتے ہیں" جب ہمارا یہ حال ہوتا ہے تو کمزور دل والوں پر کیا گذرتی ہوگی ۔ ہم اپنے ایک دوست سے واقف ہیں جنھوں نے بیمہ ایجنٹ سے ملنے کے بعد پہلے وصیت لکھوائی اور پھر بیمہ کروایا تھا ۔

زندگی کے ہر موڑ پر بیمہ ایجنٹ ہمارا پیچھا کرتے رہتے ہیں کسی موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے ۔ ہمیشہ ہی کڑوی کسیلی ، تباہی و بربادی اور مایوسی و پریشانی کی باتیں کرتے ہیں ، ہمیں تو لگتا ہے ان کی زبان کالی ہوتی ہے ۔ انھیں ناراض کرنے سے بھی ڈر لگا رہتا ہے کہ کہیں ان کی باتیں سچ ثابت نہ ہوجائیں ۔ نوکری ملتے ہی تنخواہ میں حصہ دار بننے کے لئے آدھمکیں گے "مبارک ۔ آپ کو نوکری مل گئی لیکن کیا آپ نے سوچا ہے نوکری تو آخر نوکری ہے ۔ آج ہے کل نہیں ۔ اپنی مرضی سے نہ چھوڑا تو شاید مالک چھٹی کردے تب کیا کریں گے ۔ ایک پالیسی رکھئے ایسے وقت کام آئے گی" شادی کے مبارک موقع پر دلھن کے بیوہ ہونے کی دہائی دے کر پالیسی کے لئے ورغلائیں گے ، لڑکے کی پیدائش پر پڑھائی کے اخراجات اور لڑکی پیدا ہونے پر شادی کے وقت لٹ جانے کا اندیشہ ظاہر کر کے پالیسی لینے پر مجبور کردیں گے ۔ بوڑھے ہونے سے پہلے بوڑھاپے میں صفر آمدنی کی مد میں مختلف بیماریوں میں ہونے والے کمر توڑ اخراجات کا نقشہ کھینچ کر اولاد کی بے حسی کا رونا روئیں گے "بوڑھاپے کے لئے جوانی کی کمائی کو رکھ چھوڑنا چاہئے ۔ اگر بوڑھاپے میں پالیسیاں پاس ہوں تو اصل بیٹا تو اصلی ہے کئی نقلی بیٹے خدمت کرنے دوڑے چلے آئیں گے" ۔

ایک مرتبہ بیمہ ایجنٹ کی باتوں میں آکر بیمہ کروانے کے چکر میں پڑ گئے تو پھر بیمہ ایجنٹ ہمیں ننانوے کے پھیرے میں جکڑ لیتے ہیں ۔ پالیسیاں لینے کی لت پڑجاتی ہے ایک کے بعد دوسری ، دوسری کے بعد تیسری ، چوتھی ، پانچویں ، چھٹی ، کوئی قید نہیں پالیسی کے بعد پالیسی لیتے چلے جاتے ہیں ۔ بیمہ ایجنٹ اطراف بھنبھنانے لگتے ہیں ۔ ان کا کام بھی آسان ہوتا ہے ۔ نئی پالیسی اور نت نئے فائدے بتلاکر شیشے میں اتارتے جاتے ہیں ۔ ہمارے ایک دوست ہیں جنھوں نے اپنی زندگی کا بیمہ ، بیوی کا بیمہ ، اپنی اور بیوی بچوں کی صحت کا بیمہ ، بچوں کی تعلیم ، شادی اور ان کے مستقبل کا بیمہ ، گھر کا بیمہ ، کار کا بیمہ ، سفر کا بیمہ اور یہ بیمہ وہ بیمہ کروار کھا ہے ۔ انہیں دیکھ کر ہمیں رشک آتا ہے کہ کتنی بے فکر زندگی گذارتے ہوں گے ۔ خود انشورڈ ، بیوی انشورڈ ، گھر انشورڈ ، حتیٰ کہ مستقبل بھی انشورڈ ۔ آرام کی نیند سوتے ہوں گے ۔ ایک دن ہم نے ان سے اپنی جلن کا اظہار کیا "آپ دنیا کے خوش قسمت ترین انسان ہیں کوئی فکر نہیں ، کوئی پریشانی نہیں" موصوف نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "آپ کو میری پریشانی کا اندازہ نہیں ہے ۔ ہر دم مختلف بیمہ پالیسیوں کی اقساط ادا کرنے کی فکر دامن گیر رہتی ہے ۔ بیمہ ایجنٹس کو اتنا بھگتا ہوں کہ اب انھیں بھگانے کا منتر سیکھ گیا ہوں جب بھی کوئی بیمہ ایجنٹ ملنے

آتا ہے تو میں اس سے خندہ پیشانی سے پیش آتا ہوں ۔اس کی بکواس سنتا ہوں اور پالیسی لینے کے لئے تیار ہو جاتا ہوں ۔ خوش ہو کر وہ فارم نکالتے اور سوالات کرنے لگتے ہیں "کیا آپ کو کوئی بیماری ہے "جواب میں ایک خطرناک بیماری کا نام لیتا ہوں ۔بیمہ ایجنٹ ہمدردی کا اظہار کر کے فارم بیگ میں رکھ لیتے ہیں ۔تب میں انھیں انسانیت کا درس دیتا ہوں اور وہ بغلیں جھانکنے لگتے ہیں "۔

دن بہ دن حالات اتنے خراب اور ناگفتہ بہہ ہوتے جارہے ہیں کہ بیمہ ایجنٹ کی بن آئی ہے ۔بیمہ کے بغیر زندگی گذارنا مشکل ہوتا جارہا ہے صحت کا بیمہ نہ ہو تو بیماری کے دوران ڈاکٹر اور ہسپتال کا بل ادا نہیں کر سکتے ۔کار کا بیمہ نہ ہو تو کار مرمت نہیں کرواسکتے ۔گھر کا بیمہ کروائے بنا گھر کا مالک بننا نہیں چاہئے ، پتہ نہیں کب فسادات اور تشدد لپیٹ میں آجائیں اور پھر سے بسنے کے لئے پیسے نہ ہوں ۔خود اپنا بیمہ نہ ہو تو بیوی بچے خوش رہتے ہیں اور نہ ہمیں تسکین ہوتی ہے بیمہ کروائے بغیر بیویاں شہر میں آزاد گھومنے پھرنے نہیں دیتیں نہ معلوم کب کسی احتجاج کی نذر ہو جائیں ، دہشت گردی کا شکار یا حادثہ میں جاں بحق ہو جائیں ۔روزمرہ کے حالات ہی ایسے ہیں کہ بیمہ ایجنٹ کا کاروبار دن دونی رات چوگنی ترقی کرتا جارہا ہے ، اخبار میں خبریں پڑھ کر لوگ خود بیمہ ایجنٹ کے پاس پالیسی لینے پہنچ رہے ہیں ۔بیمہ ایجنٹ کو زیادہ محنت بھی نہیں کرنا پڑتی ۔ڈرے اور سہمے لوگوں کو بس اتنا کہنے کی ضرورت ہیکہ "آج زندہ رہنے کے لئے ہوا اور پانی کے ساتھ بیمہ بھی ضروری ہے "۔

بیمہ کے بغیر زندہ نہ رہ سکنے کے اس دور میں ہمیں اس بیمہ ایجنٹ کی تلاش ہے جو ہماری تہذیب ، سماجی اقدار اور ثقافت کا بیمہ کر سکے جنھیں آج جس قدر خطرہ لاحق ہے وہ شاید پہلے کبھی نہ تھا!

گربہ کشتن

عابد معز

کسی سے پہلی ملاقات عجیب و غریب تجربہ ثابت ہوتی ہے اور پھر جب معاملہ شریک حیات سے پہلی ملاقات کا ہو تو ہر دو کا اللہ حافظ ہے ۔دوسروں کے لئے دلچسپی کا سامان بنتے ہیں ۔شادی کی رسوم کی مثال لیجئے ۔دولہا دولہن تماشا بنتے اور بنائے جاتے ہیں اور احباب موج کرتے ہیں ۔ویسے بھی عورت اور مرد کی متفقہ باہمی کوششوں کا نتیجہ دو صورتوں میں برآمد ہوتا ہے ایک اولاد اور دوسرے بے وقوفیاں !

کہتے ہیں محبت پہلی نظر میں ہو جاتی ہے ۔ہم نے پہلی نظر کی محبت کے قصے سنے اور افسانے پڑھ رکھے تھے ۔کئی مرتبہ کوشش کی کہ اپنی پہلی نظر کو محبت کی نظر بنائیں لیکن دل نے دوسری اور تیسری نظر ڈالنے کے لئے اکسایا تو عقل نے محبت کرنے کے فیصلہ پر نظر ثانی کا مشورہ دیا اور ہماری پہلی نظر اندھی محبت کو اجاگر نہ کر سکی ہم اس وجدانی کیفیت اور طوفانی دور سے محروم رہے جو پہلی نظر کی محبت کے بعد آتا ہے ۔تنگ آکر اپنی قسمت کا فیصلہ بڑوں پر چھوڑ دیا ۔خاندان کے

جہاندیدہ بزرگوں نے خوب چھان بین کے بعد ایک لڑکی کا انتخاب کیا۔ ہمارے سامنے اس کی خوبصورتی۔ تعلیم۔ سلیقہ مندی اور نفاست پسندی کے گن گائے جانے لگے۔ ہم اس فکر میں گھلنے لگے کہ موصوفہ سے پہلی ملاقات کیسی ہونی چاہئے۔ ان سے کس طرح اور کیا بات کرنی چاہئے۔ مختلف منصوبے سوچے گئے کہ پہلے دروازہ کھٹکھٹائیں گے خیال ہوا کہ دروازہ بند کیوں ہوگا؟ ہمارے انتظار میں تو دروازہ کھلا ہوگا! دوسرے منصوبے میں موصوفہ کا نام اور تعلیم کے بارے میں پوچھ کچھ کا خیال آیا لیکن یاد آیا کہ نام پہلے سے معلوم ہے۔ تعلیم کے بارے میں پوچھ کر کیا کرنا ہے عقل نے مشورہ دیا۔ بے وقوفی چھوڑو کام کی باتیں کرو، تیسرے منصوبے کے لئے سوچا کہ ان کے حسن کی تعریف کی جائے۔ کئی فلموں کے مکالمے یاد آئے آپ چودھویں کا چاند ہیں۔ آپ کی آنکھیں نرگسی اور ہونٹ گلاب کی پنکھڑیوں جیسے ہیں۔ کالی گھٹاؤں جیسے سیاہ اور گھنے بال اور قد و قامت جیسے سرو کا درخت۔ عقل نے طنز کیا تو آپ کی ہونے والی شریک حیات باغ باغیچہ ہیں۔ ڈھنگ سے تعریف بھی کرنا نہیں آتا۔ چوتھے منصوبے کے لئے ہم نے سوچا کہ مستقبل کے لئے پلاننگ کرنی چاہئے۔ ہم زندگی کیسے گزاریں گے، بچے کب اور کتنے ہوں گے وغیرہ۔ عقل نے اس منصوبے پر ہماری مذمت کی اور طنز کیا کہ حال کی فکر کرو۔ بات کرنے سے پہلے لڑکھڑا رہے ہو اور چلے ہیں مستقبل کی منصوبہ بندی کرنے۔ تنگ آکر ہم نے منصوبہ سازی کا کارخانہ بند کر دیا۔ بھائجو سے مشورہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ بھائجو ہمارے خالہ زاد بھائی ہیں۔ عمر میں دس بارہ سال بڑے ہیں لیکن خوب بے تکلفی ہے۔

بھائجو ہمیں دیکھ کر خوش ہوئے "مبارک نوشہ! دلہن کو پاکر ہمیں بھول نہ جانا"۔

مبارک باد کو نظرانداز کرتے ہوئے ہم نے کہا "بھائجو شادی میں دو دن باقی ہیں اور ہم پریشان ہیں۔"

ہماری بات کاٹی بھویں چڑھائیں اور اپنا کان ہمارے منہ کے قریب لاکر بھائجو نے سوال کیا۔ "خیریت تو ہے۔" ہم نے بھائجو کو اطمینان دلاتے ہوئے اپنی پریشانی بتلائی بھائجو ہنسنے لگے "تم نے مجھے ڈرا دیا تھا۔ اچھا بتاؤ تم نے کیا سوچا ہے؟"

ہم نے جواب دیا "سمجھائی نہیں دیتا کہ سلام کے بعد کلام کیا ہو اور کیونکر ہو؟"

بھائجو نے تعجب سے ڈانٹا "سلام کرو گے۔ تم سرتاج بننے جا رہے ہو میری جان! وہ تمہیں سلام کریں گی۔"

"وعلیکم السلام" ہم نے شوشہ چھوڑا۔

"دعائیں بھی دو جگ جگ جیو دودھوں نہاؤ پوتوں پھلو۔"

"تو پھر ہم کیا کریں؟"

"خاموش رہو" گربہ کشتن روز اول پہلی ملاقات میں ایسا تاثر چھوڑو کہ بیوی چرن داسی بن جائے۔ بیوی کو اپنی پسند کے سانچے میں ڈھالو۔ وہ کہے کہ مجھے چائے پسند ہے تو تم کہنا چائے گنوار پیتے ہیں۔ مجھے کافی پسند ہے۔ دیر گئے گھر پہنچو اپنی سلیقہ مندی چھوڑو۔ بیوی کے سلیقہ کا امتحان لو۔" بھائجو نے اور بھی چند مفید مشورے دیئے۔

ہم نے بھائجو سے درخواست کی "بھائجو آپ کے مشوروں پر عمل کرنے سے بیوی سمجھے گی کہ ہم بڑے سخت اور جلاد قسم کے شوہر ہیں کیوں نہ کچھ نرم گفتاری کی جائے کیا ہم بیوی کی مدح نہیں کر سکتے!"

کیا کہنا چاہتے ہو؟" بھائجو نے سوال کیا۔

ہم نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا "یہی کہ آپ لاکھوں میں ایک ہیں۔ آپ بہت ہی خوبصورت ہیں!"

بھابجو طنز کرنے لگے "زمین پر قدم نہ رکھئے۔ خدا آپ کو نظر بد سے بچائے۔ آپ کے حسن کے میں صدقے۔" بھابجو ورانتگ دی۔ بچو! بیوی ملنے کی خوشی میں ہوش و حواس کھو بیٹھو گے اور بیوی کی پسند اور خواہش سے سمجھوتہ کرنے لگے مرزندگی بھر زن مریدی کروگے۔ سمجھے!"

پہلی ملاقات کا دن آپہنچا۔ ہمیں نئے چمکیلے کپڑے پہنا کر خوب رنگ و روغن لگا کر سر سے پیر تک معطر کرکے، ذں سے لاد کر اور مختلف رسوم سے گزار کر سجے سجائے کمرے میں ڈھکیلا گیا جہاں ہماری قبول کردہ شریک حیات سے ، ملاقات بلکہ "پہلی ملاقات" ہونے والی تھی۔ دولہا بننے کے بعد ایک مرتبہ باتھ روم جانے کے بہانے خود کو آئینہ میں ینے کا موقع مل گیا تھا اور خود کو آئینے میں دیکھ کر ایسا لگا تھا کہ ہم، ہم نہیں بلکہ کسی شریف آدمی کو جوکر کا میک اپ کے سرکس کے رنگ میں چھوڑ دیا گیا ہے۔ ہم کمرے میں داخل ہوکر بھابجو کی ہدایت کے مطابق انتظار کرنے لگے کہ ں اپنے سرتاج کو سلام کریں ـــــ اسی دوران اپنے کمرے کا جائزہ لیا تو محسوس ہوا کہ سجا سجایا معطر کمرہ خوب ہے۔ شے قرینے سے سجی۔ شاندار فرنیچر اور ڈریسنگ ٹیبل کی موجودگی سے محسوس ہوا کہ ہم کسی اور کے کمرے میں آگئے ہیں خیال آیا کہ اس کمرے میں آئی بہار اور رونق کی وجہ ہماری شریک حیات ہیں۔ دل چاہا کہ تبدیلی کے ساتھ یہ شعر وجہ کی نذر کریں۔

آپ آئیں میرے کمرے میں خدا کی رحمت ہے
کبھی ہم آپ کو کبھی اپنے کمرے کو دیکھتے ہیں

لیکن بھابجو کی ہدایت "گربہ کشتن روزِ اول" یاد آئی ـــــ شعر عرض کرنے کے بجائے ہم کھنکھار کر رہ گئے "السلام م" کی نقرئی آواز اب بھی نہ گونجی، اب ہم نے اپنا گلا صاف کیا۔ ادھر خاموشی رہی۔ ہماری نظریں شریک حیات پر پڑیں، موقہ کی حالت بھی ہم سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھی۔ وہ بھی سہیلیوں کی زیادتیوں کا نشانہ بن چکی تھیں۔ لال پیلی بنی، ں اور زیور میں لپٹی اور سمٹی، آنکھیں موندے لیکن کان کھڑے کئے، جلوہ افروز تھیں۔ سہیلیوں نے دیر سے ان کی ن بھی نیچی کر رکھی تھی۔ ہمیں ایک لمحے کے لئے تو ان پر ترس آیا لیکن بھابجو! ہم نے بے بسی سے اپنی شریک حیات کو ا اور آخر تنگ آکر خود ہی سلام کیا۔ سلام میں کیا رکھا ہے ویسے بھی آنے والے کو پہل کرنی چاہئے۔ جواب میں گھٹ ہٹا۔ ہاتھ اٹھا، گردن جھکی، سلام کا جواب ملا اور ہماری اور ان کی نظریں باہم ٹکرائیں۔ نظروں کا ٹکرانا تھا کہ خاموش ہوئے اور زبان گونگی۔ آنکھوں نے بہت کچھ کہا، تعارف ہوا، تکلف، شرم اور جھجک کے پردے اٹھتے گئے۔

جب قوت گویائی واپس آئی تو بیگم نے کہا۔ "سنئے!"

ہم نے کہا۔ فرمائیے!"

ل ہوا" کیا آپ نے کسی سے دل لگایا تھا؟"

ہم نے جواب دیا" نہیں! آپ سے پہلا اتفاق ہے!"

جواب میں ارشاد ہوا" اب آپ ایسے بھولے بھی نہ بنئے۔ میں نے سن رکھا ہے کہ کالج میں آپ لڑکیوں کے میان خاصے مقبول تھے!"

ہمارے کان کھڑے ہوئے اور بھابجو کی ہدایات یاد آئیں۔ ہم نے اس موقع پر جھوٹ بولنا مناسب خیال کیا" ایک

آدھ لڑکی سے کبھی کبھار آنکھ لڑ گئی ہو گی!"

"اب ایسا نہیں ہو گا آپ کی نظریں کسی اور کی طرف نہیں اٹھیں گی۔ وعدہ کیجئے۔"

بھانجو نے ایسا کوئی وعدہ کرنے سے منع کیا تھا اس لئے جواب دیا" غلطی کا امکان رہتا ہے۔ وعدہ کرنا مناسب نہیں ہو گا کہ بعد میں وعدہ خلاف ہو گی۔"

فیصلہ صادر ہوا۔ ایسی غلطی نہیں ہو گی آپ وعدہ کیجئے۔"

حسب ہدایات ہم خاموش رہے اور ہماری بیگم مایوس۔ دل نے چاہا کہ وعدہ کر لیں اور انہیں منالیں، لیکن گر گشتن روز اول!

دوسرے دن بیگم نے ہمارے کپڑے نکال کر دیئے۔ ہم نے اعتراض کیا۔" اس سوٹ کے ساتھ یہ شرٹ اور ٹا اچھی نہیں لگتی"۔

جواب ملا" حیرت ہے بلو سوٹ پر نیلی شرٹ اور لال ٹائی خوب کھلتی ہے۔ آپ پہنئے تو سہی۔"

"لیکن ہمیں اچھا نہیں لگتا اس سوٹ کے ساتھ والی ٹائی دیجئے"۔

بیوی نے اپنی پسند پر اصرار کیا اور مشورہ دیا" کسی اور کی رائے لیجئے"۔ ہمیں اتنا جلد اپنے درمیان کسی اور دخل اندازی اچھی نہ لگی۔ مجبوراً نیلی شرٹ پر لال ٹائی باندھی اور منہ پھلائے رہے۔

بات چیت کے دوران ہمارے درمیان اختلاف رائے کے ساتھ بحث ہونے لگی۔ ٹی وی کے بارے میں ہم نے "ٹی وی دیکھنا وقت گنوانا اور آنکھیں خراب کرنا ہے۔ کوئی پروگرام ڈھنگ کا نہیں ہوتا۔"

جواب ملا" ٹی وی اتنا بُرا تو نہیں ہے۔ کئی پروگرام اچھے ہوتے ہیں۔ جب ہم گھر اکیلے ہوتے ہیں تو ٹی وی ایک ا ساتھی ثابت ہوتا ہے۔"

بیگم نے روٹی پر پسندیدگی کا اظہار کیا۔" روٹی کھانے سے وزن قابو میں رہتا ہے ہمیں چاول سے زیادہ روٹی کو چاہیئے"۔

بھانجو کی ہدایت کے موجب ہم نے خواہ مخواہ ہی مخالفت کی۔" روٹی کھانے سے وزن قابو میں رہتا ہے لیکن دا جلد گرنے لگتے ہیں۔ روٹی کو پانی میں بھگو کر کھانے سے بہتر ہے کہ چاول کھائے جائیں۔"

ہم نے تفریح کے خیال سے اپنی رائے دی۔" پکنک پر جانے اور لوگوں کے درمیان تماشا بننے کے بجائے گھ موسیقی سنتے ہوئے اور چائے چسکیاں لیتے، گپ ہانکنا اور تاش کھیلنا اچھا لگتا ہے۔"

بیگم کی جانب سے فوراً مخاشت میں اپنی قابلیت کا اظہار ہوا۔" باہر جانے سے حرکت ہوتی ہے۔ جسم چست ر ہے۔ دھوپ سے وٹامن ڈی ملتا ہے"

ہم نے بحث کی" کبھی کبھار پکنک پر جانے سے صحت بہتر نہیں رہتی۔ ہمیں ہر روز ریاضت کی ضرورت ہے۔ بر اور کپڑے دھونا چاہیئے۔ جھاڑو لگانی چاہیئے۔ استری پھیرنی چاہیئے۔ ناشتہ تیار کرنا اور کھانا بنانا چاہیئے"۔

بیگم نے طنز کیا" لگتا ہے آپ کو ماما کی تلاش تھی۔" ہمارا وقت کچھ عجیب سا گزر رہا تھا ایک دن ہم بھانجو کے پا پہنچے اور اپنی مشکلات بتائیں انہوں نے سمجھایا یہی ابتدائی چند دن اہم ہیں۔ ہمت نہ ہارنا۔ مقابلے پر ڈٹے رہو۔ مخالف

مان کر اپنے آپ کو تمہارے حوالے کر دے گا پھر بچو! عیش کرنا۔ بھابجو نے کھانا کھلایا اور رات دیر گئے تک اپنے پاس روکے رکھا۔ ہم گھر پہنچے تو بیوی کو انتظار میں روٹھا ہوا پایا۔ ہمیں دیکھ کر منہ دوسری جانب کر لیا۔ ہم شرمندہ ہوئے اور چاہا کہ بیگم صاحبہ کو منائیں۔ لیکن بھابجو کی ہدایت کے مطابق انجان بنے رہے۔ کچھ دیر ہم دونوں خاموش گھڑی کی ٹک ٹک سنتے رہے آخر کار بیگم نے خود ہی خاموشی توڑی اور غصہ سے کہا" کھانا میز پر ہے زہر مار کر لیجئے"۔

ہم نے بے رخی سے جواب دیا" میں کھانا کھا چکا ہوں اور امید ہے کہ آپ نے بھی زہر مار کر لیا ہوگا"

"جی نہیں میں نے کھانا نہیں کھایا۔آپ کے انتظار میں سوکھ رہی ہوں۔"

ہم نے مشورہ دیا" وقت پر کھا لیا ہوتا" اور خاموش ہو گئے۔

گھڑی کچھ دیر اور ٹک ٹک کرتی رہی۔ بیگم نے بھرائی آواز میں کہا" مجھے بھوک لگی ہے۔"

ہم نے کہا" پھر آپ کھاتی کیوں نہیں ہیں؟ اب کھا بھی لیں۔"

بیگم کے آنسو چھلک پڑے۔"آپ مناتے کیوں نہیں، خالہ بی۔۔۔۔۔" بیگم آنسو پونچھنے کے لئے رکیں تو ہم چونک پڑے۔

"خالہ بی۔ خالہ بی نے کیا کہا تھا!"

بیگم نے اپنی بپتا سنائی "خالہ بی نے مجھے مشورے دیئے کہ پہلے دن ہی سے آپ کو گانٹھ کر رکھوں۔ ڈھیلی ڈوری نہ چھوڑوں۔ آپ لوگ بڑے بے بھروسا ہوتے ہیں۔ خالہ بی کے مشورے آپ پر اثر ہی نہیں کر رہے ہیں۔"

ہم نے جواب دیا" ہمارے پاس خالہ بی کے مشوروں کا توڑ بھابجو ہیں۔"

بیگم نے خوشی سے آنسو پیتے ہوئے پوچھا" تو کیا آپ ایسے نہیں ہیں؟" "بالکل نہیں وہ تو بھابجو کے مشورے تھے" اور پھر یکلخت ہمارے درمیان جو کھنچاؤ اور تناؤ تھا۔ وہ دور ہوا، اب ہم لوگ ایک مثالی شوہر اور بیوی ہیں یقین نہ ہو تو بھابجو اور خالہ بی سے پوچھ لیجئے۔ ▲▲



مرزا سلطان بیگ

پیدائش دہلی ۱۹۲۵ تعلیم بی اے (آنرس) دہلی یونیورسٹی ۱۹۴۶، ہجرت پاکستان ۱۹۴۷، حال مقیم ریاض، سعودی عرب۔
پتہ: پوسٹ بکس ۱۵۸۴۹، ریاض ۱۱۴۵۴ مملکتہ سعودی عرب

غزل

حسن کرشمہ ساز نے کیا کیا بنادیا
ہم اچھے خاصے لوگوں کا بھیجا ہلادیا

میری تو کوئی بات بھی وہ مانتے نہیں
اللہ نے مجھ کو کیوں نہیں شرطہ بنادیا

میں نے کہا کہ دال پلائی ہے آج پھر
اتنی سی بات پر مجھے مرغا بنادیا

کیوں ہنس رہے تھے خواب میں اور جان کون تھی
اچھا یہ میں تھا، آپ کو ناحق جگادیا

"سوری رہوگی ناشتہ پانی کبھی تو دو"
سب کچھ کچن میں ہے" مجھے رستہ بتادیا

میں ہنس رہا تھا وقت کے گھڑیال نے مجھے
کچھ ایسی بات یاد دلادی رولادیا

تضمین

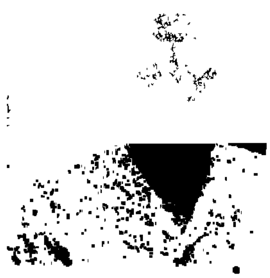
یا خدا کر دے مصیبت کو تو آساں میری
مجھ کو مل جائے حکومت کہ ہے جاناں میری
ہو عنایت کہ ہے یہ خواہش پنہاں میری
لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری
زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری

اے خدا سن لے دعا دوست و ڈیرا ہوجائے
دست شفقت ملے اور رام وہ پھیرا ہوجائے
میں گورنر بنوں اور بیٹا وزیرا ہوجائے
دور دنیا کا میرے دم سے اندھیرا ہوجائے
ہر جگہ میرے چمکنے سے اجالا ہوجائے

تھی جوانی میں خرابات کی چاہت یارب
دائیں بائیں کے مشاغل سے تھی رغبت یارب
اب بڑھاپا ہے کروں پندو نصیحت یارب
زندگی ہو میری پروانے کی صورت یارب
علم کی شمع سے ہو مجھ کو محبت یارب

کیا ضروری ہے وطن سے ہی محبت کرنا
اس سے افضل ہے وزیروں کی ضیافت کرنا
اور جلسوں میں بصد شور خطابت کرنا
تھا مرا کام غریبوں کی حمایت کرنا
دردمندوں سے ضعیفوں سے محبت کرنا

خواب لگتا ہے جوانی کا زمانہ مجھ کو
پر کشش میٹھے گناہوں کا فسانہ مجھ کو
وقت پیری ہے نہ اب یاد دلانا مجھ کو
میرے اللہ برائی سے بچانا مجھ کو
نیک جو راہ ہو اس رہ پہ چلانا مجھ کو



سید احمد راجا

Omega Factory

P.O.Box 22258

Riyadh - 11495

۵۶ برس سے اس زمین کی چھاتی پر بوجھ بنا ہوا ہوں۔ وطن روڑکی ضلع ہردوار (یوپی) ہے پیدائش میرٹھ کی غریب خانہ ۱۹۴۷ء سے مستقل روڑکی ہی چلا آرہا ہے تلاش روزگار نے بھٹکایا تو ۷ برس بمبئی کی نذر ہوگئے آٹھ برس سعودیہ کی نذر یعنی میرے بن باس کا عرصہ اب رامچندر جی کے بان باس کے ریکارڈ کو توڑ چکا ہے تعلیم ابھی تک نامکمل ہے جیسے ہی مکمل ہوئی انشاء اللہ آپکو ضرور مطلع کردونگا ویسے تو میری تحریر اور انداز تحریر دونوں ہی اس معاملے میں بطور سند پیش کئے جاسکتے ہیں آجکل ریاض جی پول اور اسٹریٹ لائٹ بنانے والی ایک کمپنی میں سپروائزر کے عہدہ پر مزدوری کر رہا ہوں۔ ریاض کے مشاعروں میں بڑی محبت سے ناچیز کو یاد کیا جاتا ہے اور سنا بھی جاتا ہے۔ پچھلے ایک سال سے اپنی ہی کچھ مصروفیات کی وجہ سے خود کو گوشہ تنہائی میں قید کئے ہوں۔

قطعات

(۱)

لگا جب سے عشق و محبت کا چسکا
رہ شاعری میں قدم بڑھ رہے ہیں
ادھر گھر میں فاقے سے بیٹھی ہیں بیگم
اودھر راجہ صاحب غزل پڑھ رہے ہیں

(۲)

پردہ نشیں کے عشق میں ایمان بھی گیا
تحفہ میں جو دیا تھا وہ سامان بھی گیا
جس دن سے انکی اماں کو دیکھا ہے بے نقاب
اس دن سے انکی دید کا ارمان بھی گیا

(۳)

سائنس کے ٹیچر نے پوچھا اسکول میں ایک لڑکے سے یوں
ہوتا ہے اس شب چاند کہاں جس رات اندھیرا رہتا ہے
لڑکے نے کہا میں کیا جانوں مجھکو ہے فقط اتنی ہی خبر
میرے سامنے والی کھڑکی میں ایک چاند کا ٹکڑا رہتا ہے

(۴)

یہ مجھ سے ایک دن پوچھا میرے والد کے پوتے نے جوانی اور بڑھاپے میں بھلا کیا فرق ہوتا ہے
جواباً میں نے فرمایا بس اتنا فرق ہے ان میں وہ کشتی پار لگتی ہے یہ بیڑا غرق ہوتا ہے

(۵)

برا کیا ہے اگر میں گھر کے سارے کام کرتا ہوں نہانے بھی وہ گر بیٹھیں تو پانی میں ہی بھرتا ہوں
طریقہ اپنا اپنا ہے گرہستی کو چلانے کا یہ دشمن نے اڑائی ہے کہ میں بیگم سے ڈرتا ہوں

(۶)

یہ ہر خط میں سالے کو لکھتے ہیں ہم مکرم . معظم میرے محترم
کہ سالے کو "سالا" ہی کہتے ہیں ہم مگر پھر بھی بیگم کو ہے یہ گلہ

(۷)

میں کل سے نئے رنگ میں اشعار کہوں گا دشمن ہیں مگر اب انہیں دلدار کہوں گا
ادنیٰ سی ہر اک شے کی بھی تعریف کروں گا مرغی کو شتر سوئی کو تلوار کہوں گا
بیگم کی رضامندی خوشنودی کی خاطر سسرال کے کتے کو بھی سرکار کہوں گا

(۸)

یہ بولیں ایک دن بیگم لجی اتنا تو بتلا دو کہ اب کے یوم آزادی بھلا کس روز آئے گا
کہا میں نے کہ جس دن بھی چلی جاؤگی میکے تم اسی دن راجہ بیچارہ قفس سے چھوٹ جائے گا

(۹)

اک بنگلہ ہو اک کار بھی ہو ایک ٹی وی ، وی سی آر بھی ہو
یہ ساری چیزیں حاصل ہوں تب لائف سندر ہوتی ہے
وہ گوری ہو یا کالی ہو پنجابی یا بنگالی ہو
جو جہیز میں یہ سب لے آئے وہ وائف سندر ہوتی ہے

(۱۰)

جناب حضرتِ آدم پیغمبر تھے پر آدم تھے انہیں بھی باغ جنت سے تھا حوّا نے نکلوایا
مرے گھر میں بھی رہتی ہے ان ہی حوا کی اک بیٹی اسی نے میری جنت سے مجھے صحرا میں بھجوایا

(۱۱)

اظہار عشق پہ وہ بولے کہ ہو قربان انتا*
تو میں نے انکو سمجھایا نہ ذالان انتا
یہاں کی خاک میں ہیں قیس کی الفت کے کیٹانو
کسی دن ہو ہی جاؤ گے صنم تابان انتا

* عربی قافیہ ردیف

(۱۲)

سنتے تھے ہم عرب میں ہیں دولت کے گلستان ہر شاخ ہر شجر پہ جہاں نوٹ کھلتے ہیں
لیکن یہاں بھی ہم نے وہی دیکھا ماجرا دامن ہوں جنکے چاک وہ مشکل سے سلتے ہیں
ڈالر ہوں یا ریال ہوں دینار یا درہم محنت کشوں کو یہ بڑی محنت سے ملتے ہیں

(۱۳)

جب اک کالج کے لونڈے پر جوانی کا خمار آیا تو اک گلفام سے بولا حسینہ تجھ پہ پیار آیا
پڑے جب سر پہ دو سینڈل جھٹک کر سر کو یوں بولا بڑی مشکل سے دل کی بیقراری کو قرار آیا

(۱۴)

کہا یہ میں نے ہیما سے مجھے ہیرو بنالے تو میری ایکٹینگ کا اسٹائل بھی دھرمیندر ہی جیسا ہے
وہ بولی تجھ میں کچھ بھی تو دھرم جیسا نہیں ہے پر مرے بالوں کا اسٹائل مرے ڈیڈی سے ملتا ہے

(۱۵)

اک لیڈی ڈاکٹر سے پیار اس لئے کیا تھا وہ زخم دے تو لینگے پھر ہم اسی سے مرہم
پر ہائے بدنصیبی اب یہ پتہ چلا ہے کرتی ہیں ہاسپٹل میں لاشوں کا پوسٹ مارٹم

(۱۶)

مانگا جو دل انہوں نے پوچھا یہ میں نے ان سے لے کر کروگے کیا تم آخر ہمارے دل کو
بولے وہ میری اماں کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے بدلے گا انکے دل سے ڈاکٹر تمہارے دل کو



نام۔۔ جمیل عثمان

تاریخ پیدائش۔۔ ۲۷/ مئی سنہ ۱۹۵۳ء

تعلیم۔۔ ایم۔اے (انگریزی) ایل۔ایل۔بی۔

مستقل رہائش کراچی۔پاکستان۔

ملازمت۔۔ شرکہ غادہ للملاحۃ۔

پوسٹ بکس نمبر 7272

جدہ۔21462 سعودی عرب۔

میرے افسانے اور کہانیاں پاکستان کے مختلف رسالوں میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ مثلاً اردو ڈائجسٹ، سیارہ ڈائجسٹ، قومی ڈائجسٹ، اخبار جہاں، چلمن، ماہ نو اور اب رابطہ۔ کوشش یہی رہی ہے کہ پڑھنے والوں کو اور خاص کر وطن سے دور خلیج اور سعودی عرب میں رہنے والوں کو ہلکی پھلکی، پرمزاح اور دلچسپ تحریریں پیش کی جائیں جنہیں پڑھ کر وہ تھوڑی دیر کے لئے اپنے تفکرات سے آزاد ہو سکیں۔ ویسے سنجیدہ تخلیقات بھی اکثر شائع ہوتی رہی ہیں۔

ادب وہ ہے جو پڑھنے والے تک اپنی بات پہنچانے کے لئے لکھا جائے نہ کہ اپنی علمیت کا رعب جمانے کے لئے۔

چچا وطنی

چچا وطنی چھٹی پر حیدرآباد جانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ روزانہ دفتر سے نکل کر بلد چلے جاتے۔ کسی دن شرفیہ کا چکر لگتا تو کسی دن بنی مالک کا۔ خوب زوروں پر خریداری ہو رہی تھی۔ کپڑے، گھڑیاں، کاسمیٹکس، کھلونے، چاکلیٹ، ٹافیاں، پنیر اور خشک میوے وغیرہ وغیرہ!

ایک روز دفتر کے مینیجر سے ایک گھنٹے کی چھٹی لیکر باہر گئے۔ واپس آئے تو ہاتھ میں ایک تھیلی تھی۔ الیاس بدمعاش نے معنی خیز نظروں سے کلیم کی طرف دیکھا اور دونوں مسکرا کر رہ گئے۔ چچا وطنی میزوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے اپنی سیٹ کی طرف بڑھ رہے تھے اور ہر آدمی ان کی پوٹلی کو دیکھ کر مسکرا رہا تھا چچا اپنی میز پر بیٹھ گئے تو الیاس بدمعاش نے آواز لگائی۔۔۔

"چچا کیا لئے آئے"؟

"کائی کو؟"

"بس یوں ہی پوچھ رہا ہوں۔"

"تم سے مطلب جی؟ میں جو بھی لاؤں!"

"خیر، نہ بتائیے، ہمیں معلوم تو ہو ہی جائے گا۔"

تھوڑی دیر کے بعد چچا باتھ روم تشریف لے گئے، تو الیاس بھاگ کر ان کی میز پر پہنچا اور درازوں کی تلاشی لینے لگا۔ پوٹلی برآمد ہوئی اور اس میں سے بادام نکلے۔ چچا جب اپنے مخصوص کمرے سے باہر آئے تو اندوہناک منظر دیکھا، بادام کی پوٹلی کھلی پڑی تھی اور پورا دفتر اس سے فیض یاب ہو رہا تھا۔

"آیئے آیئے" کلیم نے انہیں دیکھتے ہی ہانک لگائی "آپ بھی شامل ہو جائیں۔ صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لئے"

"دوسرے کا مال کھاتے ہو؟ کیڑے پڑیں گے پیٹ میں!" چچا چیخے۔
"دوسرے کیسے ہوئے چچا؟" الیاس نے کہا"۔ہم بھی تو آپ کے بچے ہیں!
"ہٹو ہٹو! بڑے آئے بچے! ایسے ہوتے ہیں بچے؟ اور میرے بچے تمہارے ایسے جوان مسٹنڈے نہیں ہیں!"
مطلب چچا کا یہ تھا کہ ابھی ان کی عمر ہی کیا ہے جو ان کے بچے اتنے بڑے ہوں ۔چچا عورتوں کی طرح اپنی عمر چھپاتے تھے۔
مجھ سے اکثر کہا کرتے "اب کیا بولوں صاحب! نزلے میں یہ بال سفید ہو گئے!"
"چچا آپ نے میٹرک کس سن میں پاس کیا تھا؟" اب یہ سوال ایسا ہے جس کا جواب ہر شخص کی زبان پر دھرا ہوتا ہے (بشرطیکہ اس نے میٹرک کیا ہو)۔ مگر چچا نے فوراً جواب نہیں دیا۔ کچھ دیر خلا میں گھورتے رہے۔ تھوڑی دیر آنکھیں بند کر کے بدبداتے رہے، لمحہ بھر انگلیوں پر حساب کیا پھر فرمایا "1965 میں"
"اس وقت آپ کی عمر کیا ہوگی؟" "یہی کوئی پندرہ سال!"
"ماشاء اللہ بہت کم عمری میں آپ نے میٹرک پاس کر لیا تھا"۔
"جی!" انہوں نے انکساری سے سر ہلایا۔
"پولیس ایکشن یاد ہے آپ کو؟"
"جی ہو صاب!"
"آپ اس وقت ـــــ" میں جملہ پورا نہیں کر پایا تھا کہ وہ اٹھ گئے۔
"میں سیٹ پر جاتا ہوں صاب ـــ انڈیا سے ٹیلی فون آنے والا ہے"۔ یہ کہا اور یہ جا وہ جا۔
چچا وطنی کی چھٹی کا معاملہ بھی عجیب تھا۔ ایک عرصہ سے مینیجمنٹ سے ان کا تنازعہ چل رہا تھا۔ وہ کہہ رہے تھے کہ دو مہینے بعد جاؤ مگر چچا کا اصرار تھا کہ وہ ابھی جائیں گے۔ چونکہ افسران اور اسٹاف زیادہ تر برصغیر سے تعلق رکھتے تھے اس لئے چچا کو مافی الضمیر بیان کرنے میں بڑی آسانی رہتی تھی۔ لڑنے بھڑنے کا بھی کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔ منیجر سے اس بات پر ان کی بڑی بحث چلی تھی۔
"آخر آپ بضد کیوں ہیں؟ اگر دو مہینے بعد چلے جائیں تو کیا حرج ہے؟"
"صاب" دو سال سے میں چھٹی نہیں گیا۔ آخر بیوی بچوں کے بھی حقوق پورے کرنے ہوتے ہیں"۔
"اچھا تو آپ حقوق پورے کرنے جائیں گے۔"
"جی ہو!"
"کس کے حقوق؟ بیوی کے یا بچوں کے؟"
"کیسی بات کرتے صاب؟ سب کے حقوق ہوتے ہیں۔ بچوں کے بھی اور بیوی کے بھی"
غرضیکہ چچا کی چھٹی منظور ہو گئی اور اب جانے کا دن قریب آ رہا تھا۔ روانگی سے ایک دن پہلے گھر سے ان کا ٹیلیفون آیا۔
گھر سے جس وقت ٹیلی فون آتا تھا تو چچا کی حالت قابل دید ہوتی تھی۔ اگر اپنی سیٹ پر نہ ہوں تو جہاں بھی ہوں،

بھاگتے ہوئے سیٹ پر پہنچتے ۔اگر سیٹ پر بیٹھے ہوتے تو اس طرح جھپٹ کر رسیور اٹھاتے جیسے ابھی وہ اڑ جائے گا ۔سانس تیز چلنے لگتی، ہاتھ کپکپانے لگتے، نتھنے پھڑکنے لگتے اور آواز میں لرزش پیدا ہو جاتی، اس قدر چیخ کر بات کرتے کہ سارا دفتر ان کی نجی معاملات سے مشرف ہو جاتا۔

ابھی جو فون آیا تھا انہوں نے اتنی جلدی میں رسیور اٹھایا کہ کریڈل گرتے گرتے بچا۔البتہ ایک فائل میز سے نیچے گر گئی۔

"ہیلو ــــــہیلو!" وہ فون پر چیخے "سلام علیکم" بیوی کو وہ بڑے ادب سے سلام کرتے تھے۔"ہاں" ــــــ کیسے ہیں؟ ــــــ اچھا بچہ کیسا ہے" ــــــ پیسے مت دو اس کو ــــــ اڑا دیں گا حرام کا ــــــ تم اپنے اکاونٹ میں رکھو ــــــ ہاں ــــــ ہاں ــــــ درد ہے اب بھی؟ ٹھیک ہے ــــــ میں آکے دیکھ لوں گا ــــــ وکیل آیا تھا؟ ــــــ کائی کو ــــــ اور کیسا پیسہ" ــــــ ایک پائی مت دینا سالے کو ــــــ مقدمہ ہمارے حق میں نہیں ہوا تو پیسہ نہیں ملے گا ــــــ بول دو اس کو ــــــ اچھا ــــــ سنو ــــــــــــ نل میں پانی برابر آرہا ہے؟"

اس سے زیادہ سننے کی تاب نہیں تھی، پورا دفتر قہقہوں سے گونج اٹھا ۔جب بات ختم ہوئی تو الیاس بدمعاش ان کی میز پر پہنچا اور جھک کر ان سے پوچھنے لگا۔

"چچا ــــــ ابھی سے آپ کو یہ فکر کیوں ہے کہ پانی برابر آرہا ہے یا نہیں"؟

"کیوں جی؟ پانی نہاتے نہیں کیا؟"

"میں کب کہتا ہوں کہ تیل نہاتے ہیں! مگر ــــــ یہ کہ ــــــ ابھی سے پانی کی اتنی فکر؟

"چچا ــــــ یہاں دبا کر بادام کھا رہے ہیں، حقوق ادا کرنے کی باتیں کر رہے ہیں اور یہیں سے فکر ہے کہ حیدرآباد میں پانی آرہا کہ نہیں ــــــ خدا خیر کرے!! کلیم نے جملہ کسا۔"بہوت باتاں کرتے جی!!اب خدا کے واسطے چپ بھی ہو جاؤ! "چچا نے گھور کر کلیم کو دیکھا تو وہ بھاگ کھڑا ہوا۔

صبح پونے آٹھ بجے ہوں گے ۔چچا وطنی ڈرائیور کے ساتھ گاڑی میں بیٹھے دفتر جا رہے تھے ۔سردیوں کے دن تھے ۔جدے میں سردی کہاں، مگر اس روز خلاف معمول ذرا خنکی تھی ۔اتنی کہ آپ ایک ہاف سوئٹر پہننے کا شوق پورا کر سکتے تھے دوسری خلاف معمول بات یہ تھی کہ فضا ذرا دھند آلود تھی ۔ڈرائیور نے ان کی توجہ اس طرف مبذول کروائی ۔بولا "چچا، دیکھو، آج ذرا دھند چھائی ہوئی ہے" ۔چچا نے ایک نظر باہر ڈالی اور ماہرانہ انداز میں بولے ــــــ

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے ہوائی جہاز سے کیڑے مارنے کی دوا چھڑکی گئی ہو!" اس وقت گاڑی پرانے ایرپورٹ کی طرف سے گذر رہی تھی ۔سڑک کے دونوں طرف دور تک خالی میدان تھے اور دور کی چیزیں دھندلی دکھائی دے رہی تھیں ۔ڈرائیور ان کی اس نکتہ آفرینی پر زچ ہو گیا ۔بولا۔صاب ــــــ کیڑا مارنے والا دوا ایسا چھا جاتا ہے بھلا" وہ دیکھو ــــــ وہ جو پرانا ہوائی جہاز کھڑا ہے وہ ٹھیک سے نظر بھی نہیں آرہا ہے" ۔

"ہوگا بھئی ہوگا!" چچا نے جان چھڑانے کے انداز میں کہا ۔اور غور سے ہوائی جہاز کو دیکھنے لگے ۔

دفتر پہنچ کر ڈرائیور میرے پاس آیا اور پوچھنے لگا" صاحب جی، ہوائی جہاز میں بیک گیئر Back Gear ہوتا کیا؟ میں نے کہا" شاید ہوتا ہو ....مگر اس کا استعمال نہیں کرتے ۔بیک کرنا ہو تو جہاز کو Tow کر کے پیچھے کی طرف لے

جاتے ہیں ۔ تم اکثر ایر پورٹ جاتے رہتے ہو ۔وہاں دیکھا ہوگا ۔

" وہ تو دیکھا ہے صاحب ۔جہاز کا بیک گیر زمین میں نہیں لگتا تو ہوا میں کیسے لگے گا ۔مگر چچا کہتے ہیں کہ اڑتے اڑتے بھی بیک گیئر ڈال کر ہوائی جہاز پیچھے کی طرف اڑ سکتا ہے ۔ہماری تو سمجھ میں نہیں آتا ۔"

" پتہ نہیں صاب! آج صبح پرانے ایر پورٹ سے گزرتے ہوئے ادھر ایک ٹوٹا ہوائی جہاز کھڑا ہے نا! اس کو دیکھ کر بات نکلی اور ہوتے ہوتے یہاں تک پہنچی ۔"

"خیر ... ہو سکتا ہے چچا نے کسی جدید سائینسی تحقیق کا مطالعہ کیا ہو ۔میں معلوم کروں گا ۔" ڈرائیور سر دھنتا ہوا چلا گیا ۔

مطالعہ کے ذکر پر یاد آیا کہ چچا کو پڑھنے کا بڑا شوق ہے ۔گھر سے دفتر آنے کے لئے گاڑی میں سوار ہوتے ہیں تو دفتر آنے تک ان کی نظریں اخبار پر مرکوز رہتی ہیں ۔ یہ اور بات ہے کہ کان کہیں اور رہتے ہوں ۔ مثلاً ایک مرتبہ ایک خوبصورت سی بس قریب سے گزری تو کسی نے کہا "آہ! کتنی پیاری بس ہے ! کاش ہمارے ملک میں بھی ایسی بسیں ہوتیں

" ارے یہ بسیں ترکی میں بنتی ہیں ۔بہت ہی اچھی ہوتی ہیں ۔حج کے وقت نقل جماعی والے انہیں لے لیتے ہیں ۔" الیاس بولا ۔چچا فوراً چونکے ۔اخبار سے نظر ہٹا کر بولے "جمائی؟ ... داماد کے واسطے لے لیتے ہیں؟"

" ارے چچا ... آپ بھی بس .... کس کے داماد اور کتنے داماد جو ان کو ڈھونے کے لئے بس چاہئے ؟" الیاس چڑ کر بولا ۔" وہ جماعی کی عین کو عربوں کی طرح حلق سے نکالتا ہوا بولا ۔دوسرے لوگ منہ دبا کر ہنسی روکنے کی کوشش کر رہے تھے ۔

ہاں ... تو ذکر ہو رہا تھا مطالعے کا ۔چچا اخبار کا مطالعہ بڑی پابندی سے کیا کرتے ہیں ۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب یاسر عرفات اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی سے خطاب کرنے کے لئے نیویارک آنا چاہتے تھے مگر امریکہ نے انہیں ویزا دینے سے انکار کر دیا تھا ۔چچا مجھ سے پوچھنے لگے ۔" بے نظیر بھٹو جنیوا کانفرنس میں شرکت کے لئے جا رہی ہیں کیا؟"

میں ہونقوں کی طرح ان کا منہ دیکھنے لگا تو انہوں نے اپنا سوال دہرایا ۔

" جہاں تک میری ناقص معلومات کا تعلق ہے آج کل جنیوا میں کوئی سربراہ کانفرنس ہو رہی ہے جناب ؟"

ہو رہی ہے جناب!

" اچھا! کب ؟" ہم نے حیرت کا اظہار کیا ۔

" یاسر عرفات جنیوا کانفرنس میں شرکت کے لئے جا رہے ہیں ۔"

" اوہ! بات اب میرے پلے پڑی ۔ چچا .... جنیوا میں کوئی کانفرنس نہیں ہو رہی ہے ۔ بلکہ جنرل اسمبلی کا اجلاس ہو رہا ہے تا کہ یاسر عرفات اس اجلاس سے خطاب کر سکیں اس لئے کہ امریکہ انہیں نیویارک جانے کا ویزا نہیں دے رہا ۔"

" اوہ! اچھا اچھا ۔" وہ سر ہلاتے ہوئے بولے ۔

" چند روز پہلے کی بات ہے" ایک اور سوال داغ دیا ۔۔۔۔

" یہ اس کو ہار کہاں ہے صاحب ؟"

"اس کو بار؟" "اس نام کی کوئی جگہ میرے علم میں نہیں۔ کہیں جزائر انڈمان اور نکوبار کی بات تو نہیں کر رہے آپ؟"

"نہیں اس کو بار! اخبار میں لکھا ہوا ہے۔ یہ دیکھئے" انہوں نے اخبار میری طرف بڑھا دیا۔ لکھا تھا
ESCOBAR ESCAPES PRISON

"اوہ! ..... چچا ..... یہ تو کولمبیا کا بدنام زمانہ ڈرگ لارڈ ہے۔"

"کہاں کا لارڈ؟"

"حضت ..... منشیات کا بہت بڑا اسمگلر ہے جو جیل سے فرار ہوگیا ہے۔"

"اچھا! افسوس ہے یہ .....! وہ تو مجھے معلوم تھا۔" کہتے ہوئے چچا چلے گئے اور میں سوچ رہا تھا کہ دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں۔

چچا خود کو جغرافیئے کا استاد کہتے تھے۔ فرماتے کہ بی اے میں جغرافیہ ان کا خاص مضمون تھا۔ اپنے اسی علم کی بدولت ایک بحث کے دوران وہ مصر تھے کہ سنگاپور تامل ناڈو میں ہے۔ جب انہیں بتایا گیا کہ سنگاپور مشرق بعید کا ایک ملک ہے جہاں چینیوں کی اکثریت ہے تو ماننے کو تیار ہی نہیں ہوئے۔ دلیل یہ دینے لگے کہ سنگا سنگھ سے نکلا ہے جس کے معنی شیر کے ہیں اور یہ ہندی کا لفظ ہے۔ اور پور صرف ہندوستان کے شہروں کے نام کے ساتھ لگتا ہے جیسے جے پور، جمشید پور، ادے پور وغیرہ۔ اُن کو بتایا گیا کہ بیشک اس کا نام سنگھ سے ماخوذ ہے بلکہ انگریزی میں سنگاپور کی عرفیت Lion City بھی ہے۔ مگر وہ کسی صورت نہ مانے۔ "بھلا چینیوں کو ہندی زبان اور "پور" سے کیا سروکار؟"

"وہاں ہندوستانی بھی بڑی تعداد میں آباد ہیں چچا"

"ہاں تو وہ ہے ہی ہندوستان میں ... تامل ناڈو کے قریب!"

ایک روز چچا آئے اور چھوٹتے ہی سوال داغ دیا ....

"یہ جدہ میں سورج کدھر سے نکلتا صاب؟" ہم تو سوال سن کر چکرا گئے۔ مگر پھر دل کو مضبوط اور حواس کو مجتمع کر کے ان سے پوچھا" کیوں؟"

"اپنے حیدرآباد میں تو ہم جدھر منہ کر کے نماز پڑھتے ہیں ادھراچ سورج ڈوبتا ہے اور نکلتا ہے اس کے مخالف سمت سے۔"

"جی آپ نے صحیح فرمایا۔ جدھر منہ کر کے آپ نماز پڑھتے وہ مغرب ہے اور اس کی مخالف سمت مشرق ہے۔ یعنی سورج مشرق سے نکلتا ہے اور مغرب میں غروب ہوتا ہے۔

وہ تو آپ حیدرآباد کی بات کر رہے ہیں۔

"جدہ میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔

"مگر پرسوں ہم روزہ افطار کرنے سمندر کنارے ....

"قطع کلامی کی معافی چاہتا ہوں چچا پرسوں تو محرم کی پانچ تاریخ تھی .... آپ نے روزہ کونسا رکھا تھا؟"

"رمضان کا!"

"یعنی محرم میں رمضان کا روزہ؟"

"نہیں رمضان میں رمضان کا روزہ! میں رمضان کی بات کر رہا ہوں رمضان میں روزہ کھولنے سمندر کنارے گئے تھے"۔

"اچھا اچھا۔ آگے کہئے!"

"تو سمندر کنارے جدھر منہ کر کے نماز پڑھی ادھر سورج نہیں ڈوبا بلکہ ہمارے پیچھے پیچھے ڈوبا!"

"جی صحیح ہے۔"

"ارے یہ کیسا صاب، انڈیا میں بھی مشرق سے نکلتا مگر جدھر منہ کر کے نماز پڑھتے ادھر ڈوبتا۔ یہاں بھی مشرق سے نکلتا مگر جدھر منہ کر کے نماز پڑھتے ادھر نہیں ڈوبتا۔ پیٹھ پیچھے ڈوبتا۔ پھر نکلتا کاں سے؟"۔

"وہ اس لئے چچا۔۔۔ کہ مکہ مکرمہ ہندوستان کے مغرب میں ہے اور جدہ کے مشرق میں۔ اس لئے آپ حیدرآباد میں مغرب کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے ہیں اور جدہ میں مشرق کی طرف۔ اب سورج تو مشرق سے نکلتا ہے اور مغرب میں غروب ہوتا ہے چاہے وہ حیدرآباد ہو یا جدہ!"

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میری بات ان کے پلے نہیں پڑی۔ وہ کچھ کنفیوز سے سر ہلاتے کمرے سے رخصت ہوئے۔

سنا ہے کہ چچا وطنی نے تین کمروں کا ایک مکان ہزار ریال مہینے کرایہ پر لیا ہے اور دو کمرے پانچ پانچ سو ریال میں دوستوں کو SUB-LET کر دیئے۔ خود فری میں رہ رہے ہیں۔ اس پر یہ حال ہے کہ ان کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ بجلی کا بل وغیرہ ایک ہلالہ بھی ان کی جیب سے زائد نہ جائے۔ مالک مکان سے اس بات پر جھگڑ بیٹھے کہ پانی اوپر چڑھانے والا موٹر ہمارے میٹر سے منسلک ہے مگر اوور ہیڈ ٹینک کا پانی دوسرے فلیٹ والے بھی استعمال کرتے ہیں۔ اس لئے ان سے بھی ان کا حصہ وصول کیا جائے۔

جب چھٹی کے لئے ہندوستان کا قصد کیا تو جانے سے پہلے کسی الیکٹریشن کو بلا کر لائے اور میٹر ریڈنگ کروائی۔ آنے کے بعد پھر میٹر ریڈنگ کروائی اور ساتھ رہنے والوں سے کہا کہ چونکہ اتنے دن وہ نہیں رہے ہیں اس لئے اس عرصہ کے بجلی کا بل نہیں دیں گے۔ اب سارے لوگ سر جوڑ کر بیٹھے کہ اس کا حساب کس طرح کیا جائے مالک مکان بھی موجود تھا۔ سب سے پہلے پانی کے موٹر کا مسئلہ تھا۔ سوال یہ پیدا ہوا کہ پورے بل میں موٹر سے پیدا ہونے والی بجلی کے چار جز کتنے ہیں۔ اس رقم کو دونوں فلیٹوں میں تقسیم کیا جائے چچا کے فلیٹ کا جو حصہ ہو اس کے تین حصے کئے جائیں اور چچا ایک تہائی دیں۔ رہ گئی وہ رقم جو دوسرے الیکٹرانک آلات مثلاً بلب، فرج، استری وغیرہ کی قیمت ہو۔ وہ بھی تین حصوں میں تقسیم ہو اور چچا اس کا ایک حصہ ادا کریں۔ دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ چچا جتنے دن چھٹی پر تھے ان یونٹس کا حساب کیسے لگایا جائے کیونکہ وہ عرصہ دو الیکٹرک بلوں پر محیط تھا۔ چچا کا مطالبہ تھا کہ ہر بل میں سے وہ یونٹس منہا کئے جائیں جب وہ چھٹی پر تھے۔ ان کے پیسے باقی دو لوگ دیں۔ اور چچا کی موجودگی کے حسابات تین حصوں میں تقسیم کئے جائیں۔ تمام لوگ کافی دیر تک گول پھرتے رہے۔ آخر کار مالک مکان تنگ آکر کاغذات کو پھینک پھانک کھڑا ہو گیا۔ اور بولا کہ حساب لگانے کی اس اذیت سے بچنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ تمام بل وہ خود ادا کر دے۔ چنانچہ اس کے بعد چچا کو بجلی بھی مفت ملنے لگی۔ فلیٹ پہلے ہی مفت تھا۔

دفتر میں چچا کا پسندیدہ کمرہ "کمرہ۔ استراحت" یعنی REST ROOM تھا۔ زبان زد عام میں اسے BATH ROOM یا بیت الخلا۔ بھی کہتے ہیں۔ ہر تھوڑی دیر بعد اٹھتے اور داخل ہو جاتے۔ الیاس بد معاش کا خیال تھا کہ چچا کی میز اسی کمرے میں لگادی جائے کرسی کی ضرورت نہیں تھی۔ چچا کا اس تواتر سے اس کمرے کا استعمال ان کے لئے ایک دن مصیبت بن گیا۔ ہوا یہ کہ مینجر صاحب باتھ روم جانے کے لئے آئے تو دروازہ بند ملا۔ زید، بکر کوئی بھی گیا ہوا تھا (چچا خلاف توقع اندر نہیں تھے) ۔ مینجر واپس چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ پھر آیا تب بھی دروازہ بند ملا۔ اس اثنا۔ میں شاید زید نکلا اور بکر داخل ہو گیا تھا۔ مینجر پھر مایوس چلا گیا۔ تیسری بار جب وہ آیا تب بھی دروازہ بند ملا اس دوران بکر نکلا اور ہمارے چچا وطنی داخل ہو گئے تھے۔ اور شامت اعمال، ٹھیک اسی وقت وہ دروازہ کھول کر باہر نکلے جب مینجر اسے کھولنے کے لئے ہاتھ بڑھا رہا تھا۔ مینجر یہی سمجھا کہ اس پورے عرصے میں چچا ہی اندر تھے! وہ بری طرح ان پر برس پڑا۔ چیخا۔ " ساعتین فی الحمام؟" "ایش حذا۔" "انت مافی شغل؟ شغل حذا بس؟" وغیرہ وغیرہ چچا اپنی لڑکھڑاتی عربی میں اسے سمجھانے کی کوشش کرتے رہے مگر وہ کہاں سنتا، بڑی مشکل سے انہیں رہائی ملی۔

دوسرے دن میرے پاس بیٹھے اسی واقعے کا ذکر کر رہے تھے۔

"صاحب پیٹ میں بڑی تکلیف رہتی ہے"

"ہاں آجکل شہر میں فساد معدہ کی وبا عام ہے۔" میں نے کہا

"آم کھانے سے پھیلی ہوئی ہے؟" انہوں نے سوال کیا" میں آم تو نہیں کھایا؟"

"نہیں چچا آموں کا موسم آجکل کہاں! عام یعنی GENERAL

"اوہ! اچھا اچھا"

آفس میں جب اکاؤنٹنگ کو کمپیوٹرائز کیا گیا تو تقریباً ہر آدمی کو کمپیوٹر کی ٹریننگ دی گئی۔ سبھوں نے تھوڑا بہت سیکھ لیا سوائے چچا وطنی کے۔ ایک دن مُنہہ پھاڑے کمپیوٹر کی اسکرین کو دیکھے جارہے ہیں۔ کئی منٹ اسی طرح گزر گئے تو اکاؤنٹنٹ صاحب نے دریافت کیا" کیا بات ہے چچا؟"

"صاحب ۔۔۔۔ وہ کرسر کہاں گیا؟ کب سے ڈھونڈ رہا ہوں!"

اکاؤنٹنٹ صاحب بھنا گئے۔ چڑ کر بولے "اٹھ کر جھٹک دو۔ نکل آتا کرسر!!"

چچا کو جب بھی آپ کمپیوٹر پر بیٹھا دیکھیں اور ان کی حالت یہ ہو کہ منہ کھلا ہوا ہے آنکھیں پھٹی ہوئی ہوں، ہاتھ کی بورڈ پر بے ہنگم طریقے سے ادھر ادھر ڈول رہے ہوں تو سمجھ جائیے کہ کوئی گڑبڑ ہے۔ عام طور سے کوئی غلطی کر بیٹھتے ہیں ورنہ اکثر یہ ہوتا ہے کہ کرسر ہی کمبخت سرے سے غائب ہو جاتا ہے۔ چچا کے کام کرنے کے طریقے دیکھ کر اکثر ہمیں یہ ڈر لگا رہتا ہے کہ کہیں کمپیوٹر ہی اچھل کر پاگلوں کی طرح ناچنا نہ شروع کر دے اور آخر میں ان کی دست درازیوں کی تاب نہ لاتے ہوئے ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جائے۔

آخر میں ایک بات بتاتا چلوں ۔۔۔۔ راز کی بات!!! ۔۔۔۔ اکثر لوگ ہم سے یہ سوال کرتے ہیں کہ "آپ ان بزرگوار کو چچا وطنی کیوں کہتے ہیں۔ چچا وطنی تو پاکستان کے ایک چھوٹے سے شہر کا نام ہے"۔

تو بات یہ ہے کہ ہمارے دفتر میں کئی بزرگوار ہیں۔ ایک سعودی عم عبداللہ ہیں، ایک انگریز انکل ہیں اس لئے تشخص قائم رکھنے کے لئے ہم انہیں چچا وطنی کہتے ہیں۔

نام: سید نعیم حامد علی
تاریخ و مقام پیدائش: یکم جنوری ۱۹۳۵ء، مراد آباد (انڈیا)
ہجرت اولی: ہندوستان سے پاکستان سنہ ۱۹۵۰ء
ہجرت ثانی: پاکستان سے سعودی عرب سن ۱۹۵۴ء
پیشہ: تجارت
تصانیف: پیکر نغمہ (مملکت سعودی عرب سے شائع ہونے والا اردو زبان کا پہلا شعری مجموعہ)

نعیم حامد علی کی والدہ محترمہ حضرت جگر مراد آبادی کی نواسی اور مرزا طاہر بیگ طاہر مراد آبادی کی بھتیجی ہیں۔

"نعیم حامد علی اردو زبان کے ان چند شیدائیوں اور سودائیوں میں اہم مقام رکھتے ہیں جن کی لگن اور رت جگے اس صحرا میں اردو شعر و ادب کی "پنیری" کاشت کرتے رہتے ہیں"۔

"فنی حوالے سے نعیم حامد علی --- غزل، نظم، قطعہ۔ کسی صنف سخن میں بند نہیں ہیں۔ وہ سخن کے ہر پیرائے کو محض فنی مہارت ہی نہیں سماجی جسارت اور تخلیقی حرارت کے ساتھ برتنے پر قادر ہیں"۔

(سید ضمیر جعفری کے تحریر کردہ پیش لفظ "اردو ادب کا لالہ صحرائی" سے اقتباس)

نوٹ --- نعیم حامد علی صاحب کی کوئی تخلیق خصوصاً طنز و مزاح میں تلاش بسیار کے باوجود نہ مل سکی۔ ملتی بھی کیسے انہوں نے اس طرف توجہ ہی نہ دی۔ ان کی کتاب "پیکر نغمہ" سے "ہم نے آپ کے لئے وہی قطعات اور غزلیں منتخب کی ہیں جن میں مزاح تو نہیں ہاں طنز کی کچھ کاٹ موجود ہے۔

(غوری)

قطعات

دوست سے شکوہ نہ دشمن سے گلہ رکھتے ہیں
کچھ جو رکھتے ہیں تو اک دستِ دُعا رکھتے ہیں
آج کی بات کبھی کل پہ نہ رکھی ہم نے
آپ کہتے ہیں تو محشر پہ اٹھا رکھتے ہیں

تمہارے کبر و نخوت کی سزا ہے دیکھتے جاؤ
ابھی کیا ہے ابھی تو ابتداء ہے دیکھتے جاؤ
کوئی کفرانِ نعمت کرکے فرخندہ نہیں رہتا
ازل سے یہ ہی قانونِ خدا ہے دیکھتے جاؤ

میں جو چاہوں تو یہ اعجاز بھی کرسکتا ہوں
اک نئے دور کا آغاز بھی کرسکتا ہوں
آپ میرے لئے سرمایہ ، راحت ہیں مگر
آپ کو میں نظر انداز بھی کرسکتا ہوں

ذکر ماضی کا نہ کرتے ہیں کبھی حال کی بات
راس آتی ہے ہمیں صرف زر و مال کی بات
نام اسلام کا لیتے ہیں نمائش کے لئے
بہرِ تفریح کیا کرتے ہیں اقبال کی بات

قصہ ، ماضی سناؤں یا کروں حال کی بات
یاد ہے مجھ کو ہر اک دن کی ہر اک سال کی بات
ان کے پیغام سے رغبت نہ رہی قوم کو حیف
کس کو فرصت ہے سنے حالؔی و اقبالؔ کی بات

چھیڑ رہتی ہے سدا گردش ایام کے ساتھ
ایک پل ہم تو نہ بیٹھے کبھی آرام کے ساتھ
ناز ہے ہم کو نعیم اپنی سیہ بختی پر
کچھ تو نسبت ہے تری زلف سیہ فام کے ساتھ

غزلیں

آگاہ نہ ماضی سے ، نہ حاضر پہ نظر ہے
" کیا قافلہ ، شوق کا اندازِ سفر ہے "
آزادی ، اظہار بھی اس بت کی کمر ہے
ہر چند کہ موہوم ہے سنتے ہیں مگر ہے
یہ موسمِ گل ہے تو خزاں کہتے ہیں کس کو
اڑتی ہے کہیں خاک کہیں رقص شرر ہے
" گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے "
اندیشہ ، فردا ہے نہ صیاد کا ڈر ہے

ہے جس کی جستجو وہ رہبر کامل نہیں ملتا
کوئی بھی آشنائے جادہ و منزل نہیں ملتا
لے دل میں بٹھائیں کوئی اس قابل نہیں ملتا
نگاہوں سے تو ملتی ہیں نگاہیں دل نہیں ملتا
ہماری کم نصیبی اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگی
وبال دوش ہے سر اور کوئی قاتل نہیں ملتا
غمِ دوراں ، غمِ جاناں کسی کو ، ہم کو غم یہ ہے
کہ سوزِ دل بقدر آرزوئے دل نہیں ملتا



نام: مشتاق شاد

پیدائش: یکم جنوری ۱۹۴۲ء، مقام ۔ میرپور
تعلیم: ایم ۔ اے ۔ ایم او ایل
تصانیف: ریگ رنگ (زیر طبع) لوک پرلوک (زیر طبع)
پیشہ: بینکنگ (نیشنل کمرشیل بنک ۔ الریاض)
مدت قیام: تقریباً ۱۶ سال

مشتاق شاد کی شاعری کی ابتدا "کب ۔" "کہاں ۔" "اور کیسے" ہوئی، یعنی وہ دن وہ مقام اور وہ وجہ انہیں یاد نہیں ۔ ہاں اتنا یاد ہے جب اردو زبان کے "داخلی و خارجی" معنی و مطالب سے آگاہی ہوئی اور "ہوش و حواس" کا ادراک ہونے لگا تب سے وہ لکھ رہے ہیں ۔

ناموافق حالات زمانہ کے ہاتھوں خاصہ مواد ضائع ہوگیا ۔ مکمل کلام موجود ہوتا تو اب تک کئی دیوان شائع ہوچکے ہوتے ۔ جو کچھ موجود ہے وہ ترتیب پارہا ہے ۔ عنقریب آپ "ریگ رنگ" ملاحظہ فرمائینگے ۔

شاد کو بنیادی طور پر غزل کا شاعر مانا جاتا ہے ۔ مگر میں انہیں پیدائشی طور پر "گیت" کا شاعر سمجھتا ہوں ۔ ان کے گیت شاہ طوس، پشمینہ اور رفل کی مانند ہیں،

شہر ریاض میں آج جتنی بھی ادبی و ثقافتی انجمنیں سرگرم عمل نظر آتی ہیں اور جو شعر و ادب کی گھما گھمی دکھائی دیتی ہے وہ سب کی سب "بزم فانوس" ریاض کی مرہون منت ہیں ۔ اس بزم کو شہر ریاض کی سب سے قدیم بزم ہونے کا اعزاز حاصل ہے ۔ یہ بزم آج بھی جناب مشتاق شاد صاحب کی زیر صدارت مصروف عمل ہے ۔

(شجاع الدین غوری)

"شارٹ کٹ"

اب حسینوں کی گلی میں اس لئے جاتا نہیں
ان دنوں مجھ کو ذرا نزدیک کا کٹ مل گیا
جب سے شادی ہوگئی میری ۔ مری بیوی کے ساتھ
دوسروں کی بیویاں تکنے کا پرمٹ مل گیا

"انڈے ٹماٹر"

ہم نے کہا کہ شاعری آتی نہیں ہمیں
اس نے کہا کہ آپ یقیناً سنائیں گے
کچھ روز گھر کے خرچ سے مل جائے گی نجات
انڈوں کے ساتھ ساتھ ٹماٹر بھی آئیں گے

"معدنیاتی غزل"

جاگتے ہی جست کو فولاد کر کے چل دیئے
گھر سے جب نکلے تو پیتل یاد کر کے چل دیئے

سلوریں آنکھوں میں سارے رتجگے تانبے کے تھے
جو مرے سپنوں کو لوہا زاد کر کے چل دیئے

اس نے چاندی کے کٹوروں میں دیا پارے کا رس
اور ہم سونے کا رم برباد کر کے چل دیئے

بانٹ کر شیشے کے تیشے آپ سب عشاق میں
عاشقوں کو صورتِ فرہاد کر کے چل دیئے

ٹن کی چھت، ہم اوڑھ کر بیٹھے تھے بنجر تن لئے
تن پہ لوہے چون کا ضماد کر کے چل دیئے

تم سے کیا سیسے کی اک دیوار بھی گرتی نہ تھی
لوگ جب اتنے ستم ایجاد کر کے چل دیئے

لگ گئی جب ان کے چہرے پر بھی نکل کی پلیٹ
وہ بھی خود کو چاند کا ہمزاد کر کے چل دیئے

دیگ کے لوہے کی صورت بھربھرا تھا تیرا پیار
خاک تھے ہم ریت سے فریاد کر کے چل دیئے

دل پرانا تھا اسے قلعی سے اُجلا کر لیا
وہ اسے بھی زنگ سے برباد کر کے چل دیئے

خون پیتے ہیں وہ کانس کی پتیلی بھر کے شاد
اس لئے ہم اپنا دل ناشاد کر کے چل دیئے

غزل

دم اٹکا ہے یوں بیوی کی تکرار کے نیچے
جی کرتا ہے آجائیں کسی کار کے نیچے

عادات سے مجبور ہے اس دور کی لڑکی
پتلون پہن لیتی ہے شلوار کے نیچے

صد شکر کہ بیگم مری خبریں نہیں پڑھتی
معشوق کی تصویر تھی اخبار کے نیچے

اس آس میں ہم لوگ پہنچ جاتے ہیں اوپر
بھاؤ نہیں گرتے کبھی بازار کے نیچے

گھبراتے ہیں ہم بارِ محبت سے تو یوں ہے
ڈرتے ہیں کہ دب جائیں نہ انبار کے نیچے

ہر حُسن کی آنکھوں میں بسا ایک ہلاکو
ہر عشق دبا فتنۂ تاتار کے نیچے

لگتا ہے خلاؤں میں کھڑی رہتی ہے پگڑی
ہوتا ہی نہیں سر کسی دستار کے نیچے

اس جرم میں کھولا گیا ہم پر درِ زنداں
ہم بیٹھے تھے محبوب کی دیوار کے نیچے

زانو نہ سہی، اینٹ اُٹھا لایئے کوئی
تکیہ تو لگا دیجئے بیمار کے نیچے

اس شوخ نے آنکھوں میں اس انداز سے دیکھا
جیتے ہوئے ہم بیٹھ گئے ہار کے نیچے

آج اس نے اٹھایا ہے ہمیں تخت سے اے شاد
کل ہم بھی گرادیں گے اسے مار کے نیچے



سگار لکھنوی

جدہ

آداب کہو ہو نہ مدارات کرو ہو
بس جیب کترنے کی سدا بات کرو ہو

خود گھر مرے آ آ کے ملاقات کرو ہو
اور پھر یہ تری ذکرِ حوالات کرو ہو

یہ محکمہ کُتّوں کا پریشان ہے اب تک
" تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو "

جو بات مجھے کان میں کہنا تھی تمہارے
کیا بات ہے تم آج وہی بات کرو ہو

یہ میکدہ ہے آؤ پیو پیے دو پھونو
کیوں بیٹھ کے دنیا کی خرافات کرو ہو

بھوکا ہوں کئی روز سے کھا جاؤں گا تم کو
ایسا تو نہیں ایسی جو تم بات کرو ہو

عاشق نے یہی نا کہ کیا وصل کا شکوہ
اور سنتے ہی تم جوتوں کی برسات کرو ہو

تم چور ہو یہ بات تو کہتا ہے زمانہ
ہم کیوں کہیں تم چوروں سی ہر بات کرو ہو

یہ وصل کی شب اور یہ موسم بھی سہانا
کیوں آئیں بائیں شائیں سوالات کرو ہو

کس احمق و بوژم سے لگا بیٹھی ہو دل کو
اک خر کے لئے کیوں یہ خرافات کرو ہو

شعلوں سے نوازا ہے زمانے نے سگار اور
تم دوستوں کی پھر بھی مدارات کرو ہو

جاناں

ر میں میڈم نہ آج تو جاناں
کرانی ہے روبرو جاناں
گر نہیں میری آرزو جاناں
پھر تو تجھ پر بھی آخ تھو جاناں
ری انگڑائیوں سے ڈرتا ہوں
ٹ جائے نہ پھر وضو جاناں
کیوں نظر آرہی ہے تو ان ون
کیا ہوا جان آرزو جاناں
بھی آیا تو کس نکتے پر
جو بالکل ہے بانگڑو جاناں
آہ سوزاں کی کیا کہیں شدت
دل میں چلتی ہے جیسے لُو جاناں
سیاست نہیں قیامت ہے
طرف ہے لہُو لہُو جاناں
کیسے کیسے ہیں شاعرِ اعظم
تو کو پڑھتے ہیں آج توُ جاناں
کو دُنیا سِگار کہتی ہے
کھڑا تیرے روبرو جاناں

قطعات

****

دل میں خوف سگار ہوتا ہے
خوف سے دل فگار ہوتا ہے
وصل کی شب وہ جب بھی آتے ہیں
ایک سو دو بخار ہوتا ہے

****

لاس انجلیس میں جو لگی ہے جناب بش
لے لے کہیں نہ آپ اپنی لپیٹ میں
یہ عالمی نظام کا منصوبہ رہ نہ جائے
مرغی کے انڈے کی طرح مرغی کے پیٹ میں

****

شکوہ اللہ سے خاکم بدہن ہو نہ سکا
کم کسی حال مرا رنج و محن ہو نہ سکا
کوششیں لاکھ کیں دن رات مگر صد افسوس
بیٹیاں آٹھ ہوئیں ایک بھی سن ہو نہ سکا

****

کلیاں چٹک رہی تھیں فضا باغ باغ تھی
آیا تھا گلستاں میں وہ گیسو سنوار کے
ہم نے تو دل کو چیر کے قدموں پہ رکھ دیا
کوے کو اس نے دیدیا صدقہ اتار کے

****

سگار لکھنوی

مقصود (جدہ)

تیسری بہن تیسری آنکھ

ہم نے زندگی میں کبھی کسی کو اپنی منہ بولی بہن نہیں بنایا کیونکہ ہم سے نام نہاد بہنوئیوں کے ناز و نخرے نہیں ہوتے۔اور پھر سگی بہنوں میں رسہ کشی بلکہ براور کشی شروع ہو جاتی ہے۔مطلب یہ ہے کہ سگی بہنیں اپنے پیدائیشی حق جتاتی ہیں اور منہ بولی بہنیں غیر پیدائیشی، غرض ہم دو بہنوں کی اولاد کے جرار لشکر سے معرکہ آرائی آرائی میں مصروف تھے کہ قدرت نے بلا جبر و کراہ ایک اور بہن عطا کر دی۔ہم نے اس تیسری بہن کو ابھی شرف سے نوازا نہیں تھا کہ نام نہاد بہنوئی کے ناز و نخرے شروع ہو گئے۔ہمیں یہ "بھائی چارگی" مہنگی معلوم ہونے لگی۔ ئی بار اس رشتے پر نظر ثانی کی اور دس بارہ مرتبہ منہ بولے بہنوئی پر نظر ڈالی تو اس نتیجے پر پہنچے کہ متذکرہ صدر لو تو بہن تسلیم کر لیا جائے مگر منہ بولے بہنوئی کو بہنوئی نہ تسلیم کیا جائے جیسے امریکا نے فسلطینیوں کی تباہی اور ، کو تو مان لیا اور مگر اسرائیل کو کبھی اس کا ذمہ دار نہیں ٹھہرایا۔

ہماری نئی نویلی بہن کے ایک سگے بھائی بھی ہمارے اور ان کے ساتھ مشترکہ طور پر رہتے تھے ابھی یہ رشتہ طے ہو پایا تھا کہ انہوں نے اسے اپنے لئے ایک خطرہ سمجھ لیا۔اور ہمارے ساتھ وہی سلوک کرنے لگے جو اکثر سوتیلے تے ہیں۔ہماری پوزیشن اس کاؤبوائے جیسی ہو گئی جسے تین منہ زور بیلوں میں چھوڑ دیا گیا ہو۔ابھی اس رشتے کو سے بھی تسلیم کروانا تھا۔جو انتہائی جوکھم اور خطرے کا کام تھا۔ہم نہ ہمایوں تھے اور نہ ہماری "نو بہنا تا بہن" رانی لر دل جسے بہن تسلیم کر لے اسے بہن بنانا ہی پڑتا ہے اور یہ رشتہ دوسرے رشتوں کے مقابلے میں کم خطرناک رر ہے، اس میں دست و بازو کی آزمائش بھی نہیں۔اگر دل کسی نامعقول لڑکی کو ہماری محبوبہ تسلیم کر لے ئ کل ایسا نہیں ہوتا کیونکہ اب دل نے کافی ترقی کر لی ہے اور دماغ سے زیادہ سمجھدار ہو گیا ہے) تو ہمارے سٹیٹس کا کیا ہوگا۔ہم نے ان محترمہ سے بارہا کہا کہ اس رشتے کا راست تعلق ہماری ذات سے نہیں۔ہماری ذات رشتے کا تعلق ہے وہ رشتہ تو زمانہ دراز سے پینڈنگ میں پڑا ہے۔ہمشیر کے اس رشتے میں ہمیں اپنا شیرازہ بکھرتا ہوا

نظر آنے لگا۔اسے تسلیم کروانا گویا فلسطین کو تسلیم کروانا تھا۔ہم نے سارے نتائج و عواقب سے محترمہ کو واقف کرایا مگر جاری ہٹ، ہٹ (hit) ہو کر رہی۔اس طرح محترمہ "ماں نہ ماں میں تیری بہن مہمان" یعنی بالجبر بڑی بہن بن کر اردو زبان میں ایک نئے محاورے کی وجہ تسمیہ بن گئیں۔ہمارے بار ہا ٹالنے پر ہمارے منھ بولی بہن نے ایک دن غصے سے ہمارے منھ پر کہدیا"۔آپ تو اس طرح مجھے بہن بنانے سے انکار کر رہے ہیں جیسے کوئی ناجائز اولاد کو اپنی اولاد ماننے سے کتراتا ہے۔معاف کیجئے! میں آپ کی جائیداد کی وارث نہیں بن جاؤنگی"اس بے باکانہ بیان میں زور بیان اتنا تھا کہ ہماری گھگھی بن گئی۔ہمیں ان کی نیت پر تو خیر شروع ہی سے شک نہ تھا۔اب ان کے خلوص کا بھی قائل ہوجانا پڑا اور یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ مستقبل میں ہمارے تعلق سے محترمہ کے کوئی ڈھکے چھپے جارحانہ منصوبے نہیں ہیں۔ہم نے محترمہ کی ہٹ دھرمی دیکھکر سونچا کہ انھیں صرف ہمیں اپنا چھوٹا بھائی بنانے کا خیال آیا۔اگر خدانخواستہ یہ ہمیں اپنا متبنیٰ بنانے پر مصر ہوجاتیں تو انھیں کون روک سکتا تھا ہم سمجھتے ہیں بلکہ ہمارا یقین کہ اکثر رشتے خواتین کے ایسے ہی عزائم کے سبب قائم ہیں۔اگر ہم ان کے "پالتو بیٹے" (متبنیٰ) بن جاتے تو میاں بیوی میں آدھے تیتر اور آدھے بٹیر بن کر دونوں کی ممتا کے بحرِ ذخار میں غرقاب ہوجاتے (یاد رہے محترمہ صاحب اولاد نہیں) محترمہ کی محبت میں بہن سے زیادہ ماں کی ممتا کا عنصر غالب تھا۔

ہم نے منگولوں کے لشکر کے بارے میں تاریخ میں پڑھا تھا۔(چشم دید گواہ تو ویسے بھی منگولوں نے کبھی اپنے کارناموں کے بیان کے لئے زندہ نہیں چھوڑا تھا) اس لئے مورخین نے منگولوں کے حملے سے پہلے لکھ رکھا تھا کہ یہ لشکر جدھر سے گذرتا وہ راستے ویران اور سنسان ہوجاتے۔محترمہ کے شوہر کا بھی یہی حال تھا۔جب یہ گھر تشریف لاتے گھر کی چہل پہل اور گڑبڑ کے بریک لگ جاتا۔یا تو گھر میں الو بولتے یا پھر ان کی سرگوشیاں پھنکاریں مارتیں۔یہ بے چارے اس قدر سنجیدہ آدمی تھے کہ سنجیدگی ان کے چہرے پر مسخ ہو کر خوفناک شکل اختیار کر چکی تھی۔ہم نے ایک مزاحیہ فلم دیکھی تھی جس میں ایک بہنوئی اپنی بیوی اور اپنے سالے کی جائیداد کو ہڑپ کرنے کے لئے مختلف ہتھکنڈے استعمال کرتا ہے۔بیوی اور اکلوتے سالے پر اسکی دھاک اس قدر طاری رہتی ہے کہ اسکی آواز پر دونوں کانپنے لگتے ہیں۔اس فلم کی کہانی پر ہمیں یقین نہیں آیا تھا۔لیکن جب ہم خود ایسے ہی حالات سے گذرنے لگے تو یقین کرنا ہی پڑا۔کہانی میں فرق صرف جائیداد کا تھا۔واقعات تو تقریباً ویسے ہی تھے۔انکا حقیقی سالا محض اس لئے ان کے ستم کا شکار تھا کہ ان کی نظر میں سالا نصف بیوی کی حیثیت رکھتا تھا۔بیوی کی غیر موجودگی میں یہ اس سے جھاڑو دلواتے، رسوئی کا کام لیتے، گالیاں دیتے، گھڑکیاں دیتے اور یہ بےچارہ "مشرقی سالے" کی طرح برابر نظریں بچھائے رہتا۔سالے صاحب کی نگاہ ہمیشہ بہنوئی کے قدموں پر رہتی۔جیسے لکشمن جی کی نگاہ سیتا جی کے قدموں تلے رہا کرتی تھی۔ایسا معلوم ہوتا تھا گویا یہ بے چارے بہنوئی کے چرنوں میں جگہ تلاش کر رہے ہوں۔اسی وصف کی بنا۔پر ہم نے ان کا نام چرن داس رکھ دیا تھا۔یہ عبرت ناک مناظر دیکھ کر کوئی بھی سمجھدار آدمی سالا بننے کی جرات نہیں کر سکتا تھا لیکن ہم نے جرات کی۔انہوں نے ہم پر بھی رعب جھاڑنا شروع کر دیا بلکہ ایک دو بار تو جھاڑو لگانے کو بھی کہا۔کھلے بندوں ایک بار اپنے "بہنوئی شپ" کا بھی اظہار کر دیا۔اب ہماری بھائی چارگی آزمائش سے گذرنے لگی۔ایک طرف ہماری انا دوسری طرف ایک خاتون کا خلوص ستم سہتے سہتے جب اس رشتہ کی ساری گرم جوشی جاتی رہی اور قریب تھا کہ یہ رشتہ ٹوٹ جاتا۔ایک دن ہم پر فلم کے دوسرے پہلو کا گیان ہوا جس میں مظلوم

سالے کا دوسرا جڑواں بھائی اچانک پردہ۔ سیمیں پر نمودار ہو کر ظالم بہنوئی کو دعوت مبارزت یعنی دو بہ دو لڑائی کا چیلنج دیتا ہے۔ دل کو تسلی ہوئی اب ہم نے دوسرے جڑواں سالے کا کردار نبھانا شروع کر دیا۔ سب سے پہلے بہنوئی کے اختیارات کو ہم نے چیلنج کیا۔ ان کے سخت چہرے پر حیرت کی لکیریں ظاہر ہونے لگیں۔ اب وہ بدنام زمانہ حربے استعمال کرنے لگے جن کا استعمال اکثر بہنوئی حضرات کیا کرتے ہیں، ایک موقع پر تو انہوں نے اخبار میں ہمارے خلاف "عاق نامہ" تک چھپوا دیا۔ ہماری منھ بولی بہن اپنے رشتے کا واسطہ دے دے کر ہمیں ہماری حرکات سے باز رکھنے کی کوششیں کرنے لگیں۔ ایسا محسوس ہوتے لگا کہ اب ظلم کے اس ڈرامے کا ڈراپ سین قریب آپہنچا ہے۔ جس میں سمجھدار سالا اپنی بہن کے سہاگ کی خاطر جیل یاترا چلا جاتا ہے، اس منظر کے تصور سے ہی ہماری رونگٹے کھڑے ہونے لگے اور بعض تو ہئیت سے دوڑنے لگے۔ ادھر ہمارے حوصلے پست ہونے لگے ادھر ہمارے منھ بولے بہنوئی کے عزائم بلند ہونے لگے۔

ہمارے منھ بولے بہنوئی، ہماری اس نئی بہن پر بڑی سخت نظر رکھتے تھے اپنی آواز تک اونچی نہیں ہونے دیتے تھے ادھر یہ دفتر روزانہ ہوئے ادھر ہماری بہن نہا دھو کر، خوبصورت کپڑے زیب تن کئے فون کے پاس بیٹھ جاتیں اور سگے سالے صاحب منھ ہاتھ دھو کر سیدھا پکوان کے لئے باورچی خانے میں گھس جاتے۔ بہنوئی صاحب فون کے ذریعے اپنی بیوی پر نظر رکھا کرتے تھے۔ یہ فون کا سلسلہ شام تک جاری رہتا۔ اس طرح سگے سالے صاحب ادھر بہ حسن و خوبی پکوان سے فارغ ہو کر کچن سے نکلتے اور ادھر ان کی بہن، فون پر فرائض زوجگی سے فارغ ہوتیں۔

ہماری تیسری بہن، ہماری دو سگی بہنوں سے زیادہ سخت ثابت ہوئی تھیں، وہ ہم پر بہت کڑی نظر رکھا کرتی تھی۔ اگر ہم کہیں انٹرویو دینے جاتے محترمہ ہماری جیبوں سے لے کر بائیو ڈاٹا تک تمام چیزوں کی تلاشی لے لیتیں، بائیو ڈاٹا میں اگر کوئی دہرے مفہوم کا لفظ نظر آتا محترمہ اسے بھی چال چلن کی خرابی کا پیش خیمہ قرار دیتیں۔ ہماری اسناد میں بھی انھیں ایسے الفاظ مل جاتے جن میں ذم کا پہلو نکلتا۔ چنانچہ ہمارا بائیو ڈاٹا، صرف اخلاقیات کا درس دینے والی نادر دستاویز بن کر رہ گیا تھا۔ ہم پر سخت نظر رکھنے سے محترمہ کی نظر اتنی کمزور ہو گئی تھی کہ ہمارے منھ بولے بہنوئی اس سے تعزیرات ہند کے دائرے میں آنے والے جرائم تک صاف چھپا لیتے۔ غرض محترمہ کو سعودی عرب سے ہندوستان لوٹنے تک تقریباً (۶) سال ہو گئے۔ اب تک ان کی محبت اور ان کے خلوص کی یاد زندہ ہے۔



منیر پرویز
(ریاض)

میرا پورا نام محمد منیر پرویز، والد کا نام خواجہ آشکار حسین مرحوم اور والدہ کا قریشہ بیگم۔ پیدائش کراچی میں مئی ۱۹۵۱ء میں ہوئی۔ والدین ہندوستان سے پاکستان ہجرت کر کے آئے۔ ویسے ہمارا خاندان شمالی ہندوستان میں ضلع مراد آباد کے ایک قصبہ سنبھل میں آباد ہے ہم لوگ نسلاً ترک ہیں اور کئی سو سال پہلے آکر ہندوستان میں آباد ہو گئے تھے۔ کوئی دو سال پہلے میں تقریباً ۴۰ سال کے بعد ہندوستان گیا تو ایک دو دن کے لئے سنبھل بھی گیا اور ایک شام کے لئے چپیل سانہ بھی۔ ن نے ایک بار بتایا تھا کہ ہم لوگ شاید تاجکستان سے ہجرت کر کے ہندوستان گئے تھے۔ اس بار ہندوستان جاکر اپنے چچا اعزاز حسین صا سے پوچھا کہ چچا میاں ذرا ہمارا شجرہ نسب تو دکھائیے یا بتائیے تو کہنے لگے کہ صاحبان نسب کو اپنے تعارف کے لئے شجرہ نسب کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ میں نے کہا کہ میں تو Alex Huxley کی کتاب Roots کی طرح اپنی جڑیں کھوجنا چاہتا ہوں تو کہنے لگے کہ عمدہ جڑیں ہمیشہ گہری اور مضبوط ہوتی ہیں اور ان کا کھوج لگانا اتنا آسان نہیں ہوتا۔

پاپا پاکستان کے نامور ماہر تعلیم میں سے تھے، فلسفی، شاعر، ماہر لسانیات اور بہت شفیق اور محترم استاد۔ ہماری نشو و نما اور تمام ترقی کا ہر سلسلہ ان ہی پر جاکر رکتا ہے۔ رشتہ داروں میں مولانا منظور احمد صاحب نعمانی ہمارے بابا کے فرسٹ کزن اور مفتی نعیمی بھی ان کے فرسٹ کزن ہیں۔

زبان اور ادب سے ہمارا سارا تعلق کئی عورتوں کے حوالے سے ہے۔ سب سے پہلے تو امی کہ جب بچپن میں انہوں نے پڑھایا تو ہم پانچ سال کی عمر میں دس سال والوں سے آگے نکل گئے پھر ایک عارفہ باجی تھیں پاپا کی شاگردہ اور حیدرآباد سے تعلق رکھتی تھیں وہ کوئی چار سال کی عمر میں ہمیں دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے پڑھا گئی تھیں۔ خدا انہیں جنت نصیب کرے۔ پھر محترمہ پروین شاکر جو ہمارے ساتھ یونیورسٹی میں سینئر تھیں ہمیں طفلانہ شوخیوں سے نکال کر ریڈیو پاکستان لے گئی تھیں۔ یہ اس زمانہ کی بات ہے جب ہم "حریت" کراچی میں طالب علموں کے صفحہ پر کالم لکھتے تھے۔ پھر ہماری دوست اور ہماری بیوی نسرین جس کے عشق میں ہم یونیورسٹی میں مبتلا ہوئے اور آج تک اپنی تمام شاعری کا روئے تختہ مشق انہی کو بناتے رہے ہیں نسرین کو کبھی اس بات کا یقین نہیں کہ ہماری شاعری ان کے حوالے سے ہوئی ہے۔ بقول ان کے ہماری شاعری کے پیچھے کچھ اور پردہ نشین بھی ہیں۔ واللہ اعلم۔

ہم اور نسرین ساتھ پڑھتے تھے۔ وہ ہمیشہ فرسٹ کلاس فرسٹ اور گولڈ میڈل لیتی تھیں اور ہم اپنی فرمستیوں کی وجہ سے سکنڈ ڈویژن اور بی گریڈ۔ بہرحال شادی کے بعد نسرین نے ہمارے سینے پر ہمارے بیٹوں یاسر اور نبیل کی صورت میں دو گولڈ میڈل لگا دئے ہیں۔

ہم ایم بی اے کرنے کے بعد تین سال تک پاکستان میں ایک بینک میں کام کرنے کے بعد سعودی عرب آگئے اور گزشتہ پندرہ سال سے یہاں مقیم تھے۔ یہاں اپنی حرکتوں کی وجہ سے ایک مشہور بینک میں وائس پریسیڈنٹ ہوگئے تھے۔ اب کینڈا جارہے ہیں۔

شاعری ہم نے کوئی بائیس سال پہلے شروع کی اور اپنی پہلی دو تخلیقات جناب جون ایلیا کو دکھائیں تو انہوں نے پاپا سے کہا کہ "بھئی خواجہ صاحب آپ کے صاحبزادے تو "تقیہ" کرتے ہیں۔" ہم تقیہ کا مطلب تو اس وقت جانتے نہیں تھے۔ ڈر کر شاعری چھوڑ دی اور کوئی بیس سال کے وقفہ کے بعد پھر یہ سلسلہ شروع کیا وہ بھی یوں کہ ہمارے صحافی دوست جناب شمشاد صدیقی اور جناب فرقان احمد نے ریاض کی معروف ادبی تنظیم پاکستان رائٹرس فورم کا سرپرست بنادیا اور اس سرپرستی کی لاج رکھنے کے لئے ہم پھر سے شاعر بن گئے۔ اب سوچ رہے ہیں کہ پاپا کے دوستوں کی مدد سے اپنی کتاب چھپوادیں۔

ڈاکٹر عابد معز کو نہ جانے ہماری کونسی ادا پسند آئی کہ ہمیں شگوفہ کا اعزازی مدیر بنادیا۔ ان کی مہربانی، بہرحال ہمیں ان کی یہ ادا پسند آئی۔ خدا انہیں سلامت رکھے۔ آمین۔

نظم

اعتراف

شہر میں روز ہی ہنگامہ بپا ہوتا ہے
مجلس نثر کہیں، محفل اشعار کہیں
تنگ سینوں پہ بڑے پھول لگائے کچھ لوگ
سج سے جاتے ہیں سرتخت ادب
سنگ ذہنوں کو مقفل کر کے
اور پھر ذکر و بیاں ہوتا ہے
ذوق و غالب کا کبھی
اور کبھی عصمت کا
اور میں دیکھتا ہوں
بزم میں لوگ کئی
اندھی آنکھوں سے تکے جاتے ہیں
تنگ سینوں پہ بڑے پھولوں کو
اور کئی بار تو یوں ہوتا ہے
میرے سینے پہ بڑا پھول لگا ہوتا ہے

غزل

سلیم مقصود

ان کے آگے مجال کیا ہوگی
ایک پیادے کی چال کیا ہوگی

سرخ رنگت نہ دیکھ پائے جو
اس سے گردن حلال کیا ہوگی

انکی زلفیں فراق کی غزلیں
اس سے بہتر مثال کیا ہوگی

حسن پر کتنے سخت پہرے ہیں
چھیڑنے کی مجال کیا ہوگی

ٹھرہ خواروں کی لڑکھڑاہٹ سے
لائق دید چال کیا ہوگی

مصرعے کسی کے ہیں تو غزل ہی کسی کی ہے
اپنی یہ شاعری بھی عجب شاعری سی ہے
بادل کے اک سیاہ سے ٹکڑے کے ساتھ ساتھ
برقعے میں محو گام کوئی چاندنی بھی ہے



م: محمد حسین ملک
نام: شبنم مناروی
ں: شبنم
ائش: منارہ، ضلع چکوال (۱۹۴۰ء)
م: M.A ENGLISH + M.A. URDU
تی علوم: کمپیوٹر، دفتری امور،
دہ پتہ: P.O. BOX 27040 RIYADH - 111417
TELEPHONE : 4931106

یف: (۱) خواب حیات (شعری مجموعہ) مطبوعہ ۱۹۶۸ء، راولپنڈی
(۲) پانی پانی پر بہتا پھول (شعری مجموعہ) مطبوعہ ۱۹۸۱ء، نئی دہلی
(۳) پنکھڑی اور کائنات (شعری مجموعہ) زیر طباعت

غزل

ہوا کے ساتھ چلنے کا یہی انجام ہوتا ہے
ہمارے جسم و جاں پر دوسروں کا نام ہوتا ہے

کبھی سورج کی دنیا میں وہ ظاہر ہو نہیں سکتا
ستارہ صبحدم کا ہی افق پر شام ہوتا ہے

محبت میں ہمیشہ راز کھل جاتے ہیں پہلے سے
ارادہ جو بھی کرتے ہیں وہ طشت از بام ہوتا ہے

حسینوں سے ہمارا رابطہ ہے اب فقط اتنا
چلے آئے ہیں ملنے جب انہیں کچھ کام ہوتا ہے

ہنسی اپنی اڑاتے ہیں تو ہر سو گرد اڑتی ہے
اگر رونے پہ آئیں تو ہر آنسو جام ہوتا ہے

اجالا کر نہیں سکتے تو تاریکی ہی رہنے دو
تصور کا اندھیرا آرزو کا بام ہوتا ہے

ہمیں معلوم ہے تخلیق غم میں مسکرا دینا
جواباً مسکرانا دوستوں کا کام ہوتا ہے



میر فراست علی خسرو
(ریاض)

پیٹروڈالر شریف

ہائے اس پٹرو ڈالر نے کتنوں کی آنکھوں میں خواب بنے؟ اور کتنوں کے ارمانوں کا خون کیا؟ جب میں نے یہ بات کہی تو قریب میں بیٹھے ہوئے مرزا جی کے کان کھڑے ہوئے کہنے لگے "میر صاحب خواب بننے والی بات تو سمجھ میں آتی ہے، یہ ارمانوں کا خون کیوں کر ہوا؟" میں نے کہا "مرزا صاحب کسی ایک کے ارمان لہو لہو ہوئے ہوں تو بتاؤں۔ کہنے لگے "کوئی ایک ہی واقعہ بتاؤ" ایسے موقعوں پر مرزا ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ جاتے ہیں اور پھر بندہ کو قابو میں کر کے ہی دم لیتے ہیں۔ میں نے کہا "مرزا تمہیں ساحرہ نقوی یاد ہے جو یونیورسٹی میں تمہارے ساتھ پڑھا کرتی تھی اور اپنے آئیڈیل کے لئے خوبصورت سپنے بنا کرتی تھی، کبھی کبھی تم بھی اسکو دیکھ کر دانتوں میں انگلی دبایا کرتے تھے"۔ یہ سنتے ہی مرزا نے کہا "یار ذرا آہستہ بولو تمہاری بھابی چائے لے کر آنے ہی والی ہے۔ سن لیں گی تو قیامت آجائے گی اور تمہیں پتا ہے سعودی عرب میں بیگم کو ناراض کرنا کتنا مہنگا پڑتا ہے، صبح ناشتہ غائب، کپڑوں پر استری ندارد، گھر بھر میں گرد جمی ہے اور بیگم ہیں کہ شان سے طبعیت کی خرابی کا بہانہ کئے لحاف میں دبکی ہوئی ہیں"۔

ہاں تو کہہ رہا تھا "ساحرہ نقوی" آج کل ریاض میں ہی مقیم ہیں اور خبر ہے ایک میلہ ماسٹر کی بیوی ہیں "مرزا کے منہ سے ایک لمبی ہائیں نکلی کہنے لگے "یار کیا مجبوری آن پڑی تھی بے چاری کو" تو میں نے کہا "تم کبھی ضرورت رشتہ کے اشتہار بھی پڑھتے ہو" کہنے لگے "اب اسکی ضرورت نہیں رہی"۔ میں نے کہا "کبھی کبھی پڑھ لیا کرو"۔ مرزا نے جھلاتے ہوئے کہا "اصل بات بتاؤ" میں نے کہا "یہی کوئی تین سال پہلے ایک بڑا سا اشتہار مقامی اخبار میں شائع ہوا جس کا حاصل یہ تھا، لڑکا سعودی عرب میں اپنے کاروبار کا مالک ہے، ماہانہ تین لاکھ روپے اسکی آمدنی ہے۔ لڑکے کے لئے یونیورسٹی کی تعلیم یافتہ حسین و خوبصورت اچھے گھرانے کی لڑکی کا رشتہ مطلوب ہے۔ اب کسی کو اس سے کیا غرض تھی کہ وہ موصوف کی تعلیم و قابلیت ہی دریافت کرتے پھرتے۔ پھر شادی جس شان سے انہوں رچائی تو کسی کو بھی انکا ماضی یاد نہ رہا۔ مگر پہلی ہی رات ساحرہ کو پتہ چلا کہ موصوف دیکھنے میں تو بھلے مانس ہیں مگر پیٹ میں الف بھی نہیں۔ کہنے لگے ڈارلنگ ہم تھک

گئے ہیں لوگوں سے گلے ملتے ہوئے اور بھوک بھی سخت لگی ہے۔ پہلے ہم کھانا کھائیں گے۔ تمہیں بھی بھوک ہو تو کھاؤ ورنہ سو جاؤ۔ ساحرہ نے سر تھام لیا کہ گھر والوں نے اسکو کس کے گلے باندھ دیا ہے۔

ہماری باتیں چل ہی رہی تھیں کہ اتنے میں بھابی چائے کی ٹرے لیئے ہوئے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئیں۔ پوچھنے لگیں کہ کس جادوگر کی باتیں ہو رہی تھیں۔ میں نے یوں ہی چھیڑتے ہوئے کہا کہ مرزا شادی سے قبل کسی اور کے عشق میں بھی مبتلا تھے۔ اتنا سننا تھا کہ بھابھی نے قہر آلود نگاہوں سے مرزا کو دیکھا اور مرزا قسمیں کھا کر یقین دلاتے رہے کہ میر صاحب تمہیں ستانے کے لئے یہ سب کہہ رہے ہیں مگر عورتیں آسانی سے بھلا کب مردوں کی باتوں پر ایمان لاتی ہیں

مرزا صاحب جب فارغ ہوتے ہیں تو تمام دوستوں کو ایک ایک کر کے یاد کرتے ہیں کہنے لگے یار وہ شاہد صاحب کی کوئی خبر ہے جو ریاض میں ۲۰ سال سے مقیم تھے اور اپنے بچوں کی شادی کے سلسلے میں بہت کچھ جمع کر کے واپس لے گئے تھے۔ میں نے کہا کہ ان کے فرزند والد کے پیسوں پر عیش کرتے رہے۔ کبھی تعلیم کے بہانے والد سے پیسے بٹور لیئے۔ کبھی کار کے بہانے تو کبھی کاروبار کے لئے لاکھ دو لاکھ مانگ لیا۔ مگر جسکو آسانی سے دولت مل جائے وہ اس کی قدر کب کر سکتا ہے، گریجویشن کی تکمیل نہ ہو سکی۔ لاپرواہی کی بنا۔ کاروبار میں نقصان ہوا۔ کار دوستوں کی ضیافتوں کی نذر ہو گئی۔ آجکل چرس و گانجے کے سگریٹ پیا کرتے ہیں اور اپنے والد کو مسلسل کوستے رہتے ہیں کہ وہ انہیں مزید پیسے کیوں نہیں دیتے، شاہد صاحب کو ایک ہی تو لڑکی تھی۔ اس کی شادی انہوں نے اپنے جاننے والے گھرانے میں بہت اعلیٰ پیمانے پر کی اور اس امید پر مطمئن ہو گئے کہ چلو ذمہ داریوں سے سبکدوش ہوئے۔ پتہ چلا کہ بی بی نے ایک بوائے فرینڈ بھی پال لیا تھا جو ان سے ملنے ان کے سسرال بھی بلا جھجک پہنچ جایا کرتا تھا۔ شروع میں تو تعارف کزن کے طور پر کرواتی رہیں۔ مگر جب میاں کو پتہ چلا تو اس نے چٹیا پکڑ کر واپس مائیکے بھیج دیا۔ نوبت ابھی طلاق تک نہیں پہنچی مگر میاں بیوی ایک دوسرے کی صورت دیکھنے کے بھی روادار نہیں۔ مرزا نے ایک سرد آہ کھینچی اور خاموش رہے۔

میں نے مرزا سے پوچھا مرزا وہ تمہارے چھوٹے بھائی کی تعلیم مکمل ہو گئی۔ کہنے لگے حبیب کی بات کر رہے ہو۔ میں نے کہا ہاں، وہ تو بڑا ہونہار اور پڑھائی میں بہت تیز تھا۔ کہنے لگے ارادہ تو اس کا انجینئرنگ کا تھا مگر انٹر کے بعد بولا کہ انجینئیر بن کر سڑکوں پر جوتیاں گھسنے سے بہتر ہے کہ سعودی عرب چلا جاؤں کم از کم پیسے تو جمع ہو جائیں گے۔ پھر پیسے کے تو سب غلام ہیں ورنہ ہمیں کون پوچھتا ہے پھر کہا بھائی جان آپ کے زمانے میں لوگ شرافت کی بنا۔ پر یاد رکھے اور پوچھے جاتے تھے۔ آج دنیا status دیکھتی ہے۔ آپ کی کلاس دیکھتی ہے کہ آپ کس کلاس کی نمائندگی کرتے ہیں۔ مرزا کہنے لگے۔ یار لوگ بے چارے تو وقت و حالات کے مارے ہیں۔ جنہیں تعلیم کی سہولت نہیں ملی۔ مگر یہاں تو میں تعلیم پر خرچ کرنے تیار ہوں۔ میرا بھائی پڑھنا ہی نہیں چاہتا۔ ماں کہتی ہیں بیٹا اسکو بھی اپنے پاس بلا لے۔ تو تو مینجر لگا ہے اس کو بھی کہیں helper لگا دے۔ مرزا نے سر اٹھایا اور چھت کو گھورتے ہوئے کہنے لگے۔ میر صاحب وہ جو میکانک سعید بھا۔۔ ورک شاپ میں کام کیا کرتا تھا۔ میں نے چونک کر پوچھا کیوں کیا کوئی خاص بات ہو گئی وہ تو ابھی شادی کر کے وٹا تھا۔ کہنے لگے شادی تو تم بھی کر کے لوٹے ہو، مگر وہ بیوی کے بغیر گذارا کر رہا تھا۔ اس لئے کہ اسکو فیملی ویزا کی ہولت نہیں تھی۔ میں نے کہا مرزا تم بھی تو ایک عرصہ تک بیگم کے بغیر کنوارے ہونے کے مزے لوٹتے رہے اور ہر

دوست کی بیوی کو بھابی اور بہن بنائے ایک مدت تک پکوان سے ۔۔ نیاز رہے ۔ مرزا کہنے لگے یار بات تو تم پوری سنتے نہیں ، اپنی ہانکنے لگتے ہو ۔ میں نے کہا ہاں وہ سعید کا کیا ہوا ؟ کہنے لگے پچھلی جمعرات ہارٹ اٹیک سے اس کا انتقال ہو گیا ۔ میری آواز حلق میں اٹک کر رہ گئی ۔ مرزا نے واقعات کی کڑیوں کو ملانا شروع کیا ۔ کہنے لگے کہ سعید کو شادی سے لوٹے کوئی چھ ماہ ہوئے تھے ، پچھلے ماہ اس کو اپنی بیوی کا خط ملا کہ آپ نے ریاض پہنچ کر مجھے فراموش ہی کر دیا ۔ میرے خرچ کے لئے بھی کوئی پیسہ آپ نے نہیں بھیجا اور نہ ہی آپ کے گھر والے میرا جیب خرچ مجھے دیتے ہیں ۔ یہ بات سعید کو کچھ عجیب سی لگی ۔ اس لئے کہ وہ ہر ماہ اپنی ساری تنخواہ اپنے بڑے بھائی کے نام بھجوادیا کرتا تھا ، اس ہدایت کے ساتھ کہ اس میں سے ایک ہزار روپے اس کی بیوی کے حوالے کر دیا کریں اور بقیہ رقم اس کے بینک اکاونٹ میں جمع کر دی جائے تاکہ اگلے چند سال بعد واپسی پر اس جمع شدہ رقم سے کاروبار شروع کیا جاسکے ۔ سعید کے بڑے بھائی نے سعید کو یہ اطمینان دلا رکھا تھا کہ رقم بینک میں جمع ہو رہی ہے اور اب تک کوئی تین لاکھ جمع ہو چکے ہیں ۔۔۔۔ بیوی کے خط نے سعید کو ہلا کر رکھ دیا تھا کہ کیا واقعی اس کی بیوی کو کوئی رقم نہیں پہنچی ۔ سعید نے بینک والوں سے پتہ کیا کہ آیا اس کے اکاونٹ میں تین لاکھ جمع ہیں ۔ بینک والوں نے بتایا کہ اس کے اکاونٹ میں چند ہزار بھی نہیں ۔ اس خبر نے اس کو توڑ کر رکھ دیا ۔ اس رات وہ سو نہ سکا ۔ صبح اس نے سینے میں تکلیف کی شکایت کی ۔ اس کو ہسپتال میں داخل کروایا گیا مگر دو دن میں اس کے قلب پر متواتر تین شدید حملے ہوئے جو بالآخر اس کی موت کا باعث بنے ۔

مرزا کی آنکھیں نم ہو چکی تھیں مرزا نے دھیمے لہجہ میں کہا میر صاحب کچھ واپسی کا زاد سفر بھی جمع کیا ہے ۔ میں نے کہا شائد بینک میں ایک آدھ لاکھ پڑے ہوں گے ۔ کہنے لگے میں اس کی بات نہیں کر رہا ہوں ۔ میں تو اس دنیا سے Exit کی بات کر رہا ہوں ۔ کچھ توقف کے بعد مرزا نے کہا ۔ یار ہم نے یہاں سے فائدہ بھی بہت اٹھایا ہے اور شائد نقصان بھی ۔ مگر ضروریات کا جال اتنا مضبوط ہو گیا ہے کہ ہم اس کو کاٹ نہیں سکتے ۔ میں نے کہا مرزا طبیعت بوجھل ہو گئی ہے یار ، کوئی اچھا شعر سناؤ تاکہ میں چلوں ، کل صبح آفس بھی تو جانا ہے ۔ مرزا کہنے لگے میر صاحب حفیظ کیفی کا یہ شعر سنو ؂

جب بے نیاز تھا تو بہت سرخرو تھا میں
دامن تہی ہوا ہے ضرورت خرید کر

میں نے کہا واہ کیا سچی بات کہی ہے کیفی نے بھلے ہم کتنے ہی آسودہ حال سہی مگر بے نیازی کی لذت سے محروم ہیں یہ صرف پٹرو ڈالر شریف کی برکت ہے ۔

▲▲



شمس الحق نوشاد
ریاض، سعودی عرب

والدین ہمارا نام شمس الحق، خاندان انصاری اور سن پیدائش ۱۹۵۱ء بتاتے ہیں۔ جائے پیدائش کراچی سے لگ بھگ پچپن (۵۵) میل دور سندھ کا ایک چھوٹا سا شہر "جنگ شاہی" ہے ہو سکتا ہے اس خطہ، زمین پر کبھی کوئی شاہی جنگ ہوئی مگر تاریخ سے کچھ ایسی دلچسپی ہمیں رہی نہیں کہ اس کا کھوج لگاتے حتیٰ کہ اپنی پیدائش بھی والدین نے جو بتادی بلاچون چرا مان لی۔

یادداشت میں اپنا بچپن اس وقت سے آتا ہے جب ہم "جنگ شاہی" سے نقل مکان کر کے سندھ کے ایک اور نسبتاً اندرونی شہر "ماتلی" میں آباد ہو چکے تھے اور اپنے گھر کے عین سامنے کھڑی شہر کی بہت خوبصورت اور مرکزی جامع مسجد میں حافظ محمد حیات صاحب سے قرآن پاک پڑھنے جاتے تھے۔ یہی شاید ہماری زندگی کا سب سے پہلا سبق تھا۔ مگر اس کے بعد جو اسکولوں کی بھاگ دوڑ اور استاد کی کھینچا تانی شروع ہوئی تو تعلیم کا تو جو حشر ہوا وہ ہوا مگر ہم بہرحال ۱۹۷۶ء میں درجہ اول سے الیکٹرانک انجینیئر بن گئے۔ پاکستان ٹیلی ویژن اس وقت نیا نیا بنا تھا اور خوش قسمتی سے انہیں اس وقت بہت سارے انجینیئر کی ضرورت تھی لہٰذا ہماری تھوڑی سی کوشش سے ہمیں وہاں کھپالیا گیا اور اس طرح ہم بے روزگاروں کی طویل قطار میں کھڑے ہونے سے بچ گئے، چار سال وہاں مہ رخوں اور مہ وشوں کے درمیان بے منزل سفر سے گھبرا گیا اور پھر وہی فرصت کے رات دن ڈھونڈنے لگا سو ہم نے ٹیلی ویژن کو چھوڑ چھاڑ ایک بار پھر جنگل کی راہ لی۔ سوچا تھا کہ کچھ دن فرصت کے گزاریں گے اور تصور جاناں کئے ہوئے پڑے رہیں گے۔ [illegible] بھی ہم پر الٹی آپڑی۔ گھر والوں نے ہماری فرصت کو بے کاری سمجھ کر ہمارے لئے مشغولیت کا سامان مہیا کر [illegible] جاناں سے قبلے جان جاناں نے خود بہ نفس نفیس ہمیں اس طرح آدبوچا کہ اس کے بعد پھر کسی کے سامنے سر نہ اٹھا سکے۔

کچھ دن تو ہر طرح آنند ہی آنند نظر آتا رہا مگر جب ہاؤ ہو کا یہ طوفان ذرا دھیما ہوا تو اندازہ ہوا کہ غم دوراں بھی غم جاناں سے بس ایک سانس کے فاصلے پر ہے۔ لکشمی نے لکشی کو کھینچنا شروع کیا اور وہ مثال ہے کہ "گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے" سو اس کے نتیجہ میں ہم اپنا گھر آنگن چھوڑ صحرائے عرب میں سیال دھن سمیٹنے چل پڑے۔ یہ بات مارچ ۱۹۸۱ء کی ہے۔ یہاں کیا آئے جیسے ہر چیز میں برکت آگئی ایک طرف سے ریال برسنے لگے اور دوسری طرف سے بچے اور ہم گویا آمد اور خرچ کا میزان بن گئے۔ کبھی گردن دائیں طرف تو کبھی بائیں طرف، نہ جاناں رہی نہ دوراں صرف غم رہ گیا اور اب وہی ہمارا اوڑھنا بچھونا ہے۔ ریال تو شاید کچھ بچ جاتے ہوں مگر ہم تیزی سے خرچ ہو رہے ہیں۔

شاعری کا سلسلہ ۱۹۷۶ء میں اچانک شروع ہو گیا تھا اور تادم تحریر جاری ہے۔ لکھنا شروع کیا تو تخلص نوشاد رکھ لیا۔ جو اب ہمارے نام کا ایک حصہ بن چکا ہے۔ صنف شاعری میں طبیعت غزل ہی کی طرف مائل ہے گو حسب ضرورت کچھ نظمیں بھی لکھی ہیں مگر

مشاعروں میں پڑھنے پر طبیعت آمادہ نہیں ہوتی۔ اب ستمبر ۱۹۹۲ء ہے اور ہم "شگوفہ" کے "سعودی نمبر" کے لئے یہ سطور لکھ رہے ہیں۔ اس شہر ریاض میں آئے ہوئے اس مہینے پورے ساڑھے گیارہ سال ہوچکے ہیں۔ کچھ پتہ نہیں کب تک یہاں رہنا ہے اب کس سمت کوئی اور ہجرت ہماری منتظر ہے۔ کچھ بھی ہو ہمیں "شگوفہ" کا انتظار رہے گا۔ یار زندہ صحبت باقی۔

شگوفے

مشاعروں پہ ستم یوں بھی ڈھائے جاتے ہیں
غزل کے بدلے لطیفے سنائے جاتے ہیں
جو بھانت بھانت کے شاعر بلائے جاتے ہیں
تو شاعری میں شگوفے کھلائے جاتے ہیں
ظرافتوں کے خزانے لٹائے جاتے ہیں
لطافتوں کے بھی دریا بہائے جاتے ہیں

oooooooooooo

مشاعروں میں کچھ ایسے بھی لوگ آتے ہیں
جو اپنے آپ کو استاد خود بتاتے ہیں
پھر الٹے سیدھے جو اشعار وہ سناتے ہیں
تو داد دینے کو شاگرد ساتھ لاتے ہیں
کہ جیسے بھانڈ بلائے ہوں شادیوں میں کہیں
کہ جیسے عرس میں قوال لائے جاتے ہیں

oooooooooooo

نفیس ڈاکٹروں کا نفیس طرزِ علاج
دوا سے پہلے لطیفے سنائے جاتے ہیں
علاج خاص کے نخرے بنائے جاتے ہیں
مریض خاص کے نخرے اٹھائے جاتے ہیں
وہ لوگ بار مکرّر بلائے جاتے ہیں
پھر ان سے لطفِ مکرّر اٹھائے جاتے ہیں

oooooooooooo

دوا وصال کی دینی تھی ہجر کی دیدی
مریض چشم کو پسوا کے پھٹکری دیدی
نظر ملی تو نظاروں کو روشنی دیدی
جو ہاتھ ہاتھ میں آیا تو زندگی دیدی
کسی کو گولی بس از راہِ دل لگی دیدی
خدا نے شاہوں کو طرزِ قلندری دیدی

OOOOOOOOOOO

کوئی طبیب یہ کہتا تھا اک مریضہ سے
تجھے ہو شرم تو پانی میں جاکے ڈوب مرے
ذرا سی چیز ہے اس پر غرور کیا کہنے
جوانی اور پھر اس کا فتور کیا کہنے
میں ٹنک کہتا ہوں تو اس کو ٹانگ سمجھے ہے
مری کراہ کو مرغے کی بانگ سمجھے ہے

OOOOOOOOOOO

بس اب تو آپ بھی کہدیجے فی امان اللہ
کہ اپنے آخری اشعار ہم سناتے ہیں
میں سالیوں کو تو گھر میں گوارا کرلوں مگر
یہ سالے ، ساس ، سسر سب ہی ساتھ آتے ہیں
سنا کے بزم میں ہر بار اک طلب نوشاد
ہمارے جوہرِ فن آزمائے جاتے ہیں

OOOOOOOOOOO



محمد رشید الدین

قلمی نام: رشید
پیدائش: ۱۹۵۷ء
پیشہ: تجارت
پہلی تخلیق: ۱۹۷۷ء
پہلی اشاعت: ۱۹۷۹ء (غزل)
پسندیدہ صنف سخن: غزل

غزلیں

ہر قدم پر بہت رہی محتاط — خشک صحرا میں زندگی محتاط
عصر حاضر میں کس لئے اتنا — آدمی سے ہے آدمی محتاط
بے تکلف وہ ہوگئے آخر — رہ سکے صرف دو گھڑی محتاط
ایک ہی شہر میں رہے لیکن — دوستی کس قدر رہی محتاط
بعد کرہوں میں رہتے رہتے رشید — زندگی اپنی ہوگئی محتاط

کون ہے کس کی یہ نوازش ہے — ہم پہ کیوں پتھروں کی بارش ہے
یاد کا زخم بیتے موسم کی — اک کہانی ہے اک نمائش ہے
آؤ بچپن کے کھیل پھر کھیلیں — ہلکی ہلکی سی آج بارش ہے
جب سے دیکھا ہے اس کے چہرے کو — اس کو پانے کی دل میں خواہش ہے
گفتگو اور اِس قدر محتاط ! — اس میں کوئی نہ کوئی سازش ہے
تم گلابوں کی طرح کِھل کے ہنسو — تم سے میری یہی گذارش ہے

عشق میں ایک اک قدم پہ رشید
آزمائش ہی آزمائش ہے

اقبال اعجاز بیگ
(ریاض)



ایک دن کے اختتام پر پھر ایک نئی بات

اخبار میں عموماً سہ پہر کو پڑھتا ہوں۔ صبح کے وقت، دراصل دفتر کو جانا اتنا سویرے اور اتنی جلدی میں ہوتا ہے کہ اس افراتفری میں، اخبار پڑھنے کے بارے میں، میں نے کبھی سوچا ہی نہیں۔ مگر آج تو تعطیل تھی، پھر بھی سہ پہر کو اخبار پڑھنے کا جیسے معمول سا بندھ گیا ہے۔

میں چائے کی میز پر پہنچا تو چائے کی پیالی کے ساتھ، تازہ اخبار کے علاوہ، میری بیوی نے پچھلے ہفتے کے بھی چند اخبار میز پر لا رکھے تھے دراصل چھٹی کے دن میں پرانے پرچوں کی بھی ذرا تفصیل سے ورق گردانی کر لیتا ہوں یہ میری کچھ عادت سی ہو گئی ہے۔

میں نے اخباروں کا ہلکا سا پلندہ اپنی گود میں گرا لیا اور پیالی کی کنڈی میں انگلی پھنسا کر، بے خیالی میں ادھر ادھر نگاہ دوڑائی، میں اپنے بیٹے دانش کو تلاش کر رہا تھا وہ میرے ساتھ چائے تو نہیں پیتا، لیکن اس تھوڑے سے وقت کے دوران میں، میرے قریب کھڑا زمانے بھر کی باتیں سناتا رہتا ہے کبھی کبھی تو اس کا اس طرح بولتے چلے جانا مجھے کھلتا بھی بہت ہے۔

میں نے ایک بار اور گردن اچکا کر دائیں بائیں دیکھا اور کچھ اخبار اپنے قریب بچھی ہوئی دانش کی کرسی پر رکھ دیئے یہ دانش کی کرسی کا تکلف دراصل اس کی ماں کا کیا ہوا ہے ورنہ وہ تو شاذ و نادر ہی اس پر بیٹھتا ہوگا۔

چائے ختم ہوئی تو ذرا اور یکسوئی سے میں نے پرانے اخبار بھی کھنگالنے شروع کئے اور ایک خبر نے تو مجھے بے طرح چونکا دیا، حالانکہ یہ خبر میں پہلے بھی پڑھ چکا تھا لیکن آج کے تازہ پرچہ میں وہ خاص خبر دیکھنے کے بعد جب نگاہ اس پرانی خبر پر پڑی تو سارے بدن میں جیسے سنسنی سی دوڑ گئی ـــــ کبھی کوئی سیاق و سباق، ایک معمولی اور عام سی بات کا، اچانک ایک نیا روپ سامنے لے آتا ہے، تو گویا پس منظر ہی اصل منظر ہے اور ـــــ مگر میں نے آگے بڑھتے ہوئے ان بے ڈھنگے اور فلسفیانہ خیالات کے سلسلہ کو کاٹا اور اس خبر کو دوبارہ پڑھنے لگا۔

وہ خبر دراصل دو گروہوں کی آپس میں نفرت اور کشمکش کے نتیجہ میں رونما ہونے والے ایک دلخراش واقعہ کا

بیان تھا کہ کس طرح بھرے بازار میں سرعام، بندوقوں کی نالیوں سے نکلتے ہوئے شعلے چکراتے پھرے، اور مقتولوں کے جسموں اور چہروں کو بھاری ٹائروں تلے گھنٹوں کچلا جاتا رہا ــــــ خبر پڑھ کر میں بہت دیر تک چائے کی خالی پیالی کو گھورتا رہا۔ طشتری میں آج بھی کچھ چائے گری ہوئی تھی طشتری میں یوں گری ہوئی چائے مجھے ہمیشہ ہی بہت بری لگی ہے، میں نے حسب معمول پیالی کو ادھر اٹھایا اور طشتری اٹھا کر احتیاط سے برابر کی کیاری میں خالی کر دی ــــ اب پرانے اخباروں کو ایک طرف رکھ کر، میں آج کے اخبار میں، اس مختصر سی خبر کو دوبارہ ڈھونڈنے لگا، لکھا تھا کہ حکومت نے نہایت ہی نادر اور نایاب پھولوں کے بیج درآمد کئے ہیں، سرکاری سطح پر ان پھولوں کی پرورش اور افزائش کا انتظام بھی کیا جارہا ہے اور مستقبل قریب میں ان پھولوں سے، نہایت ہی اعلیٰ اور نفیس قسم کی خوشبو تیار کرنے کا تجربہ بھی کیا جائے گا

میں یہیں تک پڑھ پایا تھا کہ دانش کی کھلکھلاتی ہوئی آواز سنائی دی "ہیلو بابا" ــــــ وہ یوں اچانک نہ چلا آتا، تب بھی میں اس سے آگے پڑھتا بھی کیا، خبر تو ختم ہو ہی چکی تھی

"بابا آپ نے وہ خبر پڑھی؟ پھولوں اور خوشبوؤں کی ــــــ"

"اچھا تو تم تیرہ نمبر سے آرہے ہو" میں اس کی بات کا جواب دیئے بغیر بولا "مجھے معلوم تھا کہ سارے کمپاؤنڈ میں، بس تیرہ نمبر والے انجینیئر صاحب ہی، اخبار کا مطالعہ میری طرح شام کے وقت کرتے ہیں، ان کا چھوٹا بیٹا دانش کا ہم عمر بھی ہے اور دونوں میں دوستی بھی خوب ہے اور بھلا ان دونوں کی عمریں ہی کیا ہیں، اگلے مہینے میں دونوں چوتھے درجہ کا امتحان دیں گے ــــ ایک ہمارا زمانہ تھا، اور ذرا اس زمانہ کے ان بقراطوں کو دیکھو، دنیا بھر کی الا بلا کتابیں تو ان کے اپنے نصاب میں داخل ہیں، بڑے بڑوں کے کان کاٹتے ہیں اور کیوں نہ کاٹیں، جدید عہد کی ٹیکنالوجی کے سارے تجربے تو یوں سمجھو کہ ان کی آنکھوں کے سامنے ہو رہے ہیں ــــ دانش نے تھوڑی دیر کو ــ مجھے یوں لاتعلق دیکھا تو وہ سمجھا کہ شاید میں اس کی بات پورے طور پر سن نہیں پایا ہوں اور جب قریب پہنچ کر اس نے اپنی بات کو دہرایا تو اب اس کی گفتگو میں اس کی اپنی ذات بھی شامل تھی ــــــ اس نے میرے کاندھے پہ ہاتھ رکھا اور بتانے لگا کہ آج اسکول میں اسے چند کاپیاں ملی ہیں جن میں پھولوں اور تتلیوں کے خاکے ہیں، ادھوری تصویریں اور یہ کہ سب بچے ان میں اپنی اپنی پسند کے رنگ بھریں گے، اور میں تو بابا بالکل یہ رنگ بھروں گا ــــ اس کا اشارہ یقیناً کسی کیاری میں کھلے ہوئے پھول کی طرف تھا مگر وہ پھول شاید کہیں بہت دور کھلے ہوئے تھے، اور میں انہیں دیکھنے کی صرف خواہش رکھتا تھا، ارادہ نہیں ــــــ

اور بابا ہمیں، پھول اگانے کے بارے میں بھی کچھ بتایا جائے گا"

"بابا" میرے ذہن نے یہ لفظ دہرایا، مجھے یقین ہے کہ یہ لفظ دانش نے، ابھی ابھی، کئی بار اور بھی ادا کیا ہوگا ـ ابا زندہ تھے تو دانش انھیں بابا کہا کرتا اور مجھے پاپا کہہ کر پکارتا تھا، میں کچھ اور سوچتا کہ معاً مجھے دانش کی فیصلہ کن آواز سنائی دی"

"بابا" میں ذرا کمپاؤنڈ سے باہر جارہا ہوں" ــــ اس نے اس طرح الجھے ہوئے موڈ میں مجھے، شاید پہلی بار دیکھا تھا اور میں نے محسوس کیا کہ شاید وہ اس صورت حال سے جلد از جلد پیچھا چھڑانا چاہتا ہے۔

"کمپاؤنڈ سے باہر قدم مت نکالنا دانش" ــــــ میں نے، فوری طور پر، پرسکون اور قدرے درشت آواز میں کہا، اور اپنے اس نپے تلے لہجہ پر خود بھی حیرت ہوئی ــــ

"لیکن آخر کیوں بابا" اس استفسار کی مجھے پہلی ہی سے بھرپور توقع تھی۔
"اس لئے کہ باہر راستوں میں شعلے چکراتے پھر رہے ہیں، اور ایک وحشی پہیہ گردش کر رہا ہے اور چہرے مسخ کئے جا رہے ہیں" میرے لہجہ میں بھی وہی ٹھہراؤ تھا اور درشتی بھری ہوئی تھی۔
"مگر بابا میرے پاس کچھ خاکے ہیں، مجھے ان میں رنگ بھرنا ہیں"
دانش نے یہ کہتے ہوئے، ڈھیروں کاپیاں اور کتابیں میری گود میں اچھال دیں جو ایک ایک کر کے پرانے اخباروں پہ آن گری تھیں ــــــ
"مگر میرے بیٹے" میرا لہجہ اب بتدریج نرم ہو چلا تھا۔
"تم آخر کب تک ان خاکوں، ان کتابوں اور ان ادھوری تصویروں کیساتھ سفر کرتے رہو گے"
"جب تک میں بڑا نہیں ہو جاتا" دانش کی تھکی ہوئی آواز سنائی دی۔
"لیکن تم بڑے نہیں ہو گے، تم بوڑھے ہو جاؤ گے، صرف بوڑھے ــــ سنا تم نے" میں بڑبڑایا
"لیکن بابا، مجھے باہر نکلنا ہے مجھے نکلنے دیجئے، میں آپ کیطرح، اس کپاؤنڈ کے کٹہڑے میں بوڑھا نہیں ہونا چاہتا ــــ اور کیا آپ بڑے ہو گئے ہیں بابا ــــ" مجھے اس لہجہ میں استہزا کی کوئی جھلک دکھائی دی اور نہ مجھے اس کے ان مکالموں پر کوئی اچنبھا ہی ہوا، یہ تو وہ عفریت تھا جس کے بارے میں بہت پہلے سے آگاہ تھا کہ اس کی آواز کو مجھے ایک نہ ایک دن آخر کار ضرور سننا ہے۔
اس وقت کوئی بھولا بھٹکا ہوا کا جھونکا لان سے ہو کر گزر رہا تھا ــــ میں نے کن انکھیوں سے دیکھا، دانش میرے سامنے، کہیں دور، کھلے ہوئے پھولوں پر بڑے اعتماد سے نگاہ جمائے ہوئے تھا، اور اس لمحہ میں وہ مجھے اپنی عمر سے بہت بڑا لگا ــــ میں جو ابھی اسے باہر نکلنے کو سختی سے منع کر رہا تھا یہ سوچ کر وحشت زدہ سا ہو گیا کہ دانش بھی آخر کار اسی کپاؤنڈ میں بوڑھا ہوتا جا رہا ہے۔
"تم باہر نکلنا چاہتے ہو، ضرور نکلو" میں نے مفاہمت کی راہ اختیار کی اور دانش نے یکلخت چونک کر میری طرف دیکھا ــــــ
"باہر ضرور نکلو" لیکن یہ، یہ اپنے ساتھ ضرور رکھنا، میں نے اس کی کتابوں اور خاکوں میں دبا ہوا وہ پرانا اخبار برآمد کیا اور مسخ چہروں کی تصویروں کو اپنے ہاتھ کی آڑ میں رکھ کر، اس کی طرف بڑھا دیا،
"یہ کیا ہے؟" ــــ میں نے اس کے سوال کو نظرانداز نہیں کیا، مگر میرا لہجہ اب بہت محتاط ہو چلا تھا میں نے کہا" یہ وہی پرانا اخبار ہے، اور مجھے شبہ ہے کہ تم یہ خبر بھی پڑھ چکے ہو، یہ ہر روز اسی عبارت میں چھپتا ہے ــــ اس سے آنکھیں مت چرانا، تمہارے نہ چاہنے کے باوجود ــ یہ تمہیں تمہارے چہرے کے بارے میں بتاتا رہے گا ــــ باہر نکلو تو اسے اپنے ساتھ ضرور رکھنا ــــ"
"کیوں ــــــــــ دانش کے سوال مختصر ہوتے ہوتے اب چند لفظوں تک رہ گئے تھے ــــ تو کیا وہ فرار کی کوئی راہ سوچ رہا ہے ــ یا وہ مجھے گزرے ہوئے زمانے کا کوئی فرد تو تسلیم نہیں کر چکا ہے ــ یہ سوچتے سوچتے میں غیر ارادی طور پر اس اخبار کی طرف اشارہ کر کے اپنی بات کو دہرانے لگا۔

باہر نکلو تو یہ اپنے ساتھ ضرور رکھنا تاکہ تم یہ جان سکو کہ تمہیں کتنی کیاریاں بنانا ہیں کتنے خاکوں میں رنگ بھرنے ہیں کتنے پھول اگانے ہیں اور تاکہ تم، تم آسانی سے بوڑھے ہو سکو"

"مگر بابا میں نے ایک مضمون میں پڑھا تھا کہ"

میں نے محسوس کیا کہ اس کی آواز اور اس کے لہجہ میں پھر وہی معصومیت در آئی تھی میں جو تھوڑی دیر پہلے، یہ سوچنے سے گریز کر رہا تھا کہ اس نے مجھے اب تک بابا کہہ کر کیوں نہیں پکارا۔ اب جو اس کے منہ سے یہ لفظ سنا تو یہ سوچ کر اچانک اک اطمینان سا محسوس کیا، کہ اس نے مجھے میرے منصب پر بحال کر دیا ہے ـــ اور مجھے یہ سوچنے کا حق بھی حاصل ہے آخر میں اس کا باپ ہوں

"میں نے ایک مضمون میں پڑھا تھا دانش بتانے لگا کہ اس صدی میں انسان صرف مشینیں بنائے گا بڑے بڑے کل پرزے اور دیو پیکر جہاز بنائے گا ـــ اب پھول نہیں اگائے جائیں گے اور کیاریاں نہیں بنائی جائیں گی اور خاکوں میں رنگ نہیں بھرے جائیں گے تو اس کا مطلب ہے بابا" اب دانش براہ راست مجھ سے مخاطب تھا

"کہ اب تتلیوں، چڑیوں اور رنگین تصویروں والی کتابیں بھی نہیں ملیں گی"

"پھر"

"میں نے سوالیہ انداز میں کہا اور میں خود ہی چونک اٹھا، میرا یہ سوال یا استفسار بہت ہی مختصر تھا تو کیا میں دانش سے مایوس ہو چلا ہوں۔

"پھر کیا؟" مجھے اس کی آواز سنائی دی اور اس کا لہجہ وضاحت چاہنے والا تھا۔

پھر یہ کہ جب سب کچھ نہیں ہوگا تو کیا تم انہیں بھول جاؤ گے" میں نے دو ٹوک پوچھا اور جواب کے انتظار میں اس کے ہونٹوں کو، ہوا میں اچھالے ہوئے اس سکہ کی طرح دیکھا جو آن کی آن میں زمین پر گر کر، ہیڈ یا ٹیل کو ظاہر کرنے والا ہو ـــ

"نہیں میں انہیں بھولوں گا نہیں" میں نے اس کی آواز سنی اور میری رگوں میں ٹھہرا ہوا خون گویا دوبارہ چلنے لگا وہ کہہ رہا تھا" میں پھولوں خوشبوؤں اور تتلیوں کو کیسے بھول سکتا ہوں اور میں ان خاکوں کو بھی ہمیشہ اپنی آنکھوں میں رکھوں گا جن میں مجھے رنگ بھرنا ہیں" دانش بولتا گیا میں اسے بولتے ہوئے دیکھ رہا تھا اور خوش تھا کہ میں نے بھی آخر اسے کچھ نہ کچھ سونپ ہی دیا ہے اور میں اسے ابھی یہ بھی بتاؤں گا کہ اس کے بستے سے رنگین تصویروں والی قیمتی کتاب کبھی گرنا نہیں چاہیئے، مگر پھر میں کچھ افسردہ بھی ہو گیا یہ سوچ کر وہ رسان سے نہیں بلکہ بہت کرب اور اذیت کے احساس سے بوڑھا ہوگا ـــ ذرا ادھر آنا، میں نے اسے قریب بلایا اور ہمیشہ کی طرح اس کے کاندھے پہ ہاتھ رکھ کر کرسی سے اٹھا اور پورے قد سے کھڑے ہو کر چاروں طرف اک تھکی ہوئی نگاہ ڈالی ـــ سامنے گملے میں کیکٹس کا پودا ڈوبتے ہوئے سورج کی شعاعوں میں نمایاں نظر آرہا تھا میں غیر ارادی طور پر، قریب پہنچا اور جھک کر دیکھنے لگا، پودے میں ایک اور شاخ کا اضافہ ہو رہا تھا۔ کانٹوں سے لدی ہوئی ایک تازہ اور سبز شاخ تاریک ہوتی ہوئی فضا میں سر اٹھائے کھڑی تھی۔

...ش عباسی

میں ۱۳ جنوری ۱۹۵۳ء کو ڈیرہ غازی خان شہر (صوبہ پنجاب) میں پیدا ہوا۔ انٹرمیڈیٹ (سائنس) تک تعلیم وہیں حاصل کی۔ ...ینیئرنگ یونیورسٹی لاہور میں سیول انجینیئرنگ میں داخلہ ملنے پر ۱۹۷۰ء میں لاہور آیا اور انجینیئرنگ مکمل ہونے (۱۹۷۷ء) تک لاہور میں ...

لاہور میں میرا وقت انجینیئرنگ کی تعلیم کے علاوہ، شاعری اور دیگر فکری و ادبی سرگرمیوں میں صرف ہوتا تھا۔ لاہور میں حلقہ ...باب ذوق، انجمن ترقی پسند مصنفین، نئے افق وغیرہ زبردست نظریاتی و ادبی پلیٹ فارم تھے۔ جن میں مجھ جیسے نوجوان ہمہ تن و ہمہ حال ...کھپائے رکھتے تھے۔ اس دور کی ایک خاص صفت یہ بھی تھی کہ اس میں اکثر و بیشتر فکری و ادبی سرگرمی تحریر کی بجائے زبانی بحث کی صورت ...ے "برپا" ہوتی تھی۔

اس کے بعد ۱۹۷۷ء کے مارشل لاء کے دور سے ہوتے ہوئے تاحال کی اکثر تخلیقی فکری صورت حال ایک طرح کی افراتفری اور ...رادی زبوں حالی، بے نظری اور موقع پرستی کا شکار رہی ہے۔ اگرچہ چند ہیرو صفت لوگ اس دور میں بھی صحت و قوت و راستی فکر کی ...مت بنے رہے ہیں۔

۱۹۸۱ء میں میں بسلسلہ ملازمت سعودی عرب چلا گیا اور میں نے زیادہ شاعری اپنے سعودی عرب کے دوران قیام ہی میں کی۔

بڑے افسر لوگ

ہے میرا ملنا کچھ ان اعلیٰ عہدگان سے بھی
بزعم خود جو غرور ہزار ہوتے ہیں
زمین پر کبھی رہتے نہیں قدم جن کے
ہمیشہ اسپ ہوا پر سوار ہوتے ہیں
کسی پہ پڑتی نہیں انکی خود میں ڈوبی نظر
شراب ذات میں ڈوبا خمار ہوتے ہیں
اگرچہ ان کے خیالات ان کے ارشادات
جہالتوں ہی کے آئینہ دار ہوتے ہیں

کہیں ٹھہرتے نہیں ایک بات کرتے نہیں
تمام جعل ، ہمہ خلفشار ہوتے ہیں

پہ ان کی اتنی صفت مانتا ہوں میں کہ یہ لوگ
بہت حریص ، بہت کاٹ دار ہوتے ہیں

قطعات

کمپنی نے میری ، مجھے دی کار
دھوم ہے اس کی ہر گلی ، بازار
خوب گاتی بجاتی چلتی ہے
کھڑکھڑا کھڑ ، کھرڑ ، کھرڑ ، کھڑ کار

ooooooooooooooooooooooo

بھٹّی میں معاش کی جلایا
رنگ ان پہ نفاق کا چڑھایا
اک ایک کو کاٹنا دباتا
ان کے لئے مشغلہ بنایا

ooooooooooooooooooooooo

خوب خدمت بھی احترام بھی خوب
کر رہے ہیں وہ میرا کام بھی خوب
آدمی چاہئیں مجھے ایسے
بے طلب جو کریں سلام بھی خوب



سعید شوکت

پیدائش 1956 رہائش (انڈیا) فلورا ، روڈ نمبر ۳ - بنجارہ ہلز ، حیدرآباد حال مقیم (سعودی عربیہ) پوسٹ بکس 4259 ریاض 1149 کامرس سے گریجویشن کیا پھر عثمانیہ یونیورسٹی لا کالج (کیمپس) میں تعلیم حاصل کرتے ہوئے ICWA بھی کرتا رہا - 1978 میں سقط بسلسلہ ملازمت چلا گیا - 1981 میں مسقط سے سعودی عرب منتقل ہوا یہاں بحیثیت چیف اکونٹنٹ پھر جنرل منیجر کی حیثیت سے جون 199 تک سعودی ٹراویلرز چیک (امریکن ایکسپریس) میں کام کیا - اب ڈنمارک کے ایک گروپ آف کمپنیز میں بحیثیت اکونٹس مینیجر برسرکار .ں کیمپس کے زمانے میں لیٹرو کلچرل سوسائٹی کی بنیاد ڈالی - جس کے ہفتہ واری اجلاس محبوب کالج سکندرآباد میں ہوتے رہے - اسکول و کالج میں بیٹ میں انٹر کالج مقابلہ میں انعام اول حاصل کیا - مصوری میں بھی انعامات حاصل کئے ڈرامہ میں حصہ لیتا رہا - اور کالج کے زمانے میں لکھتا بھی ہوں - انگلینڈ ، فرانس ، جاپان ، تائیوان ، سنگاپور ، بحرین ، امارات ، پاکستان و بنگلہ دیش کی سیاحت کی -

زندگی کے بارے میں ایک زندہ دل شاعر کا یہ شعر بہت پسند ہے -

زندگی ، میں نے تیرے لئے زندگی بھر رقص کیا ہے
اب یہ حسرت ہے کہ کبھی تجھ کو نچا کے دیکھوں

مضمون

گلف اردو

زبان و کلچر کے خلط ملط ہونے سے بعض اوقات دلچسپ لطیفے تولد ہوتے ہیں لیکن آمیزش صحیح ہو تو دوسری زبان کا لفظ اپنی .بان میں اس طرح پیوست ہو جاتا ہے لگتا ہے کہ یہ کوئی غیر زبان کا لفظ ہی نہیں ہے - آہستہ آہستہ ان الفاظ کا رواج اس علاقہ میں اتنا عام و وسیع ہو جاتا ہے کہ وہ لہجہ زبان کی بذات خود ایک قسم بن جاتا ہے - جس طرح اردو میں مختلف لہجے رائج ہیں جیسے حیدرآبادی ، مدراسی ، بنگلوری ، پنجابی ، بہاری - لکھنو کی سلیس زبان ، بمبئی کی "لگے لا ہے" "کھڑے لا ہے" والی اردو اور مشہور مزاحیہ شاعر مصطفیٰ علی بیگ کی نظموں والی اینگلو اردو وغیرہ اسی طرح خلیجی ممالک میں رہنے والے برصغیر کے لوگ کچھ اس طرح

دو بول رہے ہیں جس کو ہم "گلف اردو" کا نام دے سکتے ہیں۔اس کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں ○○○
زٹ۔۔۔۔گلف اردو کے چند نمونے اس مضمون میں دئے گئے ہیں، ان کی تشریح مضمون کے آخر میں موجود ہے)

ہم نے پہلی بار جب عمرہ کی سعادت حاصل کرنے کے بعد اپنے دوست کو جدہ فون کیا تو فون اٹھاتے ہی انھوں نے پوچھا بن!" پھر بعد دریافت احوال کہنے لگے کہ یار سعید عشاء کی صلاۃ کے بعد مکہ سے نکل جانا میں تمھیں لینے باب مکہ کے موقف پر آؤنگا اس سے ہم الاطول گھر چلیں گے اور پھر تفصیل سے باتیں کریں گے زمانہ ہوگیا ہے یار تم سے ملے ہوئے۔پچھلے مہینے میں عداب پر ریاض آیا تھا لیکن سعید تمہارا فون نمبر گھر چھوڑ آیا تھا اس لئے ملاقات نہیں ہوئی اور ہاں ٹیکسی والے کو زیادہ فلوس میں دینا صرف عشرہ ریال۔بہت ٹیکسی مل جائینگے خدا حافظ"

بہر حال صاحب ہم جدہ پہنچے ہم کو لینے ہمارے دوست موقف پر موجود تھے۔کار میں سامان لادا اور چل پڑے۔میں نے چھا کیا مکان بہت دور ہے؟ کہنے لگے "بس سامنے والی کبری سے الاطول چلیں تو دائیں جانب اسکان ہیں اس کے بعد اشارہ ہے۔ سارہ سے بحر والی روڈ لے کر چلے جائیں۔کچھ دور بعد بائیں جانب حیدرآبادی بقالہ نظر آئیگا اس کے باز و خبز کی دوکان ہے بس س کے برابر والی عمارت میں شقتہ رقم ثلاثہ ہے" ایک دن کے قیام کے بعد ہم نے واپس ریاض جانے کی اجازت مانگی کہنے لگے کہ "عد بکرا تو ویک اینڈ weekend ہے۔بس جمعہ کی رات کو چلے جانا" میں نے کہا کہ بھائی ضروری کام ہے کہنے لگے کہ "کام کی ی ولّی"

ویسے یہاں IBM بہت مشہور ہے IBM کمپیوٹر نہیں یہ ایک محاورہ کا مخفف ہے (I) یعنی انشاء اللہ (B) بکرہ ا) مافی۔کوئی کام آپ نہ کرنا چاہتے ہیں تو پہلے کہیں گے "انشاء اللہ" پھر اصرار زیادہ بڑھ جائے تو کہیں گے "بکرا ضرور کرونگا" اور قع مناسب دیکھ کر ہاتھ اٹھادینگے کہ مافی۔یعنی بالکل نہیں۔

ماحول کے اثر کے بارے میں ایک بات اور بات یاد آگئی۔ہر شخص ماحول کا اثر قبول کرتا ہے اور اپنے اپنے حساب سے کا اظہار کرتا ہے۔معصوم بچے بھی اس سے مبرا نہیں ہیں۔ہم ایک دوست کے گھر "حارّہ شریف" گئے معلوم ہوا موصوف ھنڈی کال" کرنے گئے ہوئے ہیں۔ہم وقت گذاری کے لئے انکی منی سی بیٹی سارہ سے بات کرنے لگے۔سارہ بڑی معصوم سی یاری پیاری باتیں کرتی ہے۔اکثر اسکو میں بچوں کی نصیحت آمیز قصے کہانیاں سناتا ہوں اس نے اصرار کیا کہ میں آج بھی اسکو کچھ ناؤں۔لیکن میں نے کہا کہ سارہ آج میرا کچھ سنانے کا موڈ نہیں ہے تم ہی کچھ سناؤ۔

کہنے لگی کہ وہ کہانی سنائے گی۔میں ہمہ تن گوش ہوگیا۔

کہنے لگی کہ "ایک چوہا تھا۔آڑی ماڑی پھر رہا تھا۔

اس کے پاس "اقامہ" نہیں تھا۔اس کو پولیس پکڑ لی

مافی ختم ہوئی" سارہ کی یہ بے ساختگی مجھے ہمیشہ یاد آتی ہے!

گلف اردو کے چند لفظ

رمن = کون، صلاۃ = نماز، موقف = بس اسٹاپ، باب مکہ = جدہ کا مشہور محلہ، انتداب = عارضی تبادلہ (سرکاری کام) فلوس = پیسے، الاطول = راست، اسکان = سرکاری مکانات، بحر = ساحل سمندر، بقالہ = کرانہ دوکان، خبز = روٹی، خلّی ولّی = ایسی کی تیسی، حارّہ = ریاض میں ایک محلہ کا نام جہاں زیادہ ہندوستانی و پاکستانی رہتے ہیں، شقتہ = فلیٹ، بکرا = کل، اقامہ = شناختی کارڈ جو ہر شخص کے لئے ہمیشہ ساتھ رکھنا ضروری ہے۔

نعمان منظور (الخبر)



پنسل

واہ صاحب واہ! کیا چال ہے "ایک پیر کیے یہ سپاٹ قیامت چال ڈھال کے معاملے میں کیکڑے کی خاصیت رکھتی ہے گھوم گھوم اور ٹھمک ٹھمک کر چلنے والی اپنے قدموں کے نشانات ایسے چھوڑ جاتی ہے جیسے ستارے صفحہ۔ قرطاس پر اتر آئے ہوں لیکن اس میں اس کی قسمت کا کھیل ہے بد قسمتی سے ایسے ہاتھوں چڑھ جاتی ہے جو اس کا استعمال یوں کرتے ہیں کہ اس کے بطن سے ہزاروں کیڑے مکوڑے تولد ہو جاتے ہیں اور کبھی نو خیز کلی کسی گلچیں کے ہتھے چڑھ جائے تو بہت جلد اس کی شادابی ختم ہو جاتی ہے۔ پتیاں ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرتی ہی چلی جاتی ہیں۔ آج کل لڑکیوں کی تمنا ہوتی ہے کہ شادی ہو تو ایسے شخص سے جو کسٹم میں ملازم ہو خواہ چپراسی ہی کیوں نہ ہو۔ اس طرح میری یہ خواہش ہے کہ دکانوں میں سجا یہ بکاؤ مال ایسے ہاتھوں میں جائے جہاں اس کی قدر کا یہ عالم ہو کہ بڑے قرینے سے اسے سجا دیا جائے۔ انجینئر ہو تو عمارت کا حصہ بنا دے اور مصوّر ہو تو کینوس کے برابر جگہ دے۔ قدر تو اس کی منشی اور رائٹر بھی کرتے ہیں خیالات کی حسین دنیا سجا دیتے ہیں لیکن عملی زندگی قابل رحم ہو جاتی ہے۔ ہم نے کہا تھا کہ مور کے پاؤں ایسے ہی کالے اور بھدّے ہوتے ہیں۔ اپنی کم نظری اور محدود علم کا اس وقت علم ہوا جب کسی نے یہ بتایا کہ وہ دراصل اسکی کالی زبان ہے۔ ہاں کالی زبان، لیکن جب یہ کالی زبان چلنا شروع کر دے تو بہتی ندیوں کے دھارے رک جائیں۔ فضاؤں میں رقص کرتے پرندے اپنی پرواز کی ترتیب میں گڑبڑ کر جائیں اور کبھی کبھی کنواریاں سنیں تو شرما جائیں اور کہیں اتنی پاکیزہ بھی کہ زاہد دانتوں تلے انگلیاں داب لے اور بری اتنی کہ شیطان بھی سنے تو کان دھو لے۔

اب میں اس تذبذب میں ہوں کہ اس میں اور میری بیوی میں آخر فرق کیا ہے؟ وہ بھی موڈ کے تابع رہتی ہے اور یہ بھی ترنگ میں آکر نہ جانے کیا کہہ جاتی ہے، غور کرنے پر یہ عقدہ کھلا کہ اس کی زبان دوسروں کے ذہن کے مطابق چلتی ہے جبکہ بیوی کی زبان اس کی ماں اور بہنوں کے پڑھانے پر لفظوں کے تیر پھینکتی ہے۔

ویسے صاحب خیالات اور جذبات، آپ تک پہنچانے میں اسے کلیدی حیثیت حاصل ہے اگر یہ نہ ہوتی تو میں اپنے اندر کے فنکار کو کاغذ کے دل پر کیسے اتارتا لیکن میں بھی انسان ہوں جونہی اس کی جوانی ڈھلنے کو آتی ہے میری بے اعتنائی بڑھتی جاتی ہے اور خوب سے خوب تر کی تلاش میں دوسری لے آتا ہوں اور یہ بیچاری ساگوان کی لکڑی کے بکسے میں پڑی کڑھتی رہتی ہے اور اپنی سوکن کو میری انگلیوں کے حصار میں رقصاں دیکھ کر مارے شرم کے آنکھیں بند کر لیتی ہے اور ایک دن میری بیوی اسے کوڑے کے ڈبے میں پھینک کر کہتی ہے آپ غیر ضروری چیزیں اٹھا کر رکھتے ہیں!

ریاست علی خان



جدہ
قلمی نام: عابد
تاریخ پیدائش: ۱۰-۱۰-۱۹۵۸ء
مقام پیدائش: حیدرآباد
پیشہ: سکریٹری
پہلی تخلیق سنجیدہ: ۱۹۷۹ء (غزل)
پہلی تخلیق مزاحیہ: ۱۹۸۶ء (غزل)
پسندیدہ صنف سخن: غزل

غزلیں

جبتک یہ نوکری ہے ادھر نو پرابلم
مل جل کے ہوگی زیست بسر نو پرابلم

صورت میں کیا رکھا ہے تصور کی بات ہے
آئینگے وہ بھی چاند نظر نو پرابلم

خط میں جو اس کی یاد کا کرتا ہوں تذکرہ
آتا ہے یہ جواب ڈیر نو پرابلم

پردیس میں تو خیر سے ہم اجنبی رہے
بنتا نہیں ہے دیس میں گھر نو پرابلم

شوہر یہاں ریال کمانے میں گم رہا
ٹی وی میں گم شریک سفر نو پرابلم

اگزٹ پہ میری لوگ پریشاں ہیں کسقدر
مجھ پر ہوا نہ کوئی اثر نو پرابلم

فرقت میں جسکی کتنی ہی راتیں گزار دیں
عابد نہیں ہے اس کو خبر نو پرابلم

چہرہ پہ ان کے رنگ شفق آئی لوٗ دٹ [ؒ]
پکڑا گیا ہے جھوٹ تو فق آئی لوٗ دٹ

اس نے چپت لگائی جو روئے رقیب پر
روشن ہوئے ہیں سات طبق آئی لوٗ دٹ

دیکھا جو میں نے آج کے بچوں کے عشق کو
ریکال ہوگئے ہیں سبق آئی لوٗ دٹ

عابد غزل میں آرٹ دکھانے کے واسطے
میں نے زمیں چنی ہے ادق آئی لوٗ دٹ

[ؒ] I LOVE THAT

ند عبدالرحمٰن سلیم آرکٹیکٹ

بر آباد (آندھرا پردیش) میں ۱۹۵۳ء میں پیدا ہوے ۔ ۱۹۶۸ء میں مٹیرک کا اور ۱۹۷۴ء میں آرکیٹکچر کا امتحان عثمانیہ یونیورسٹی سے بدرجہ ل پاس کیا ۔ اسی زمانے میں حیدرآباد کے رائے جانکی پرشاد مقابلہ مضمون نویسی میں دو مرتبہ درجہ اول کا تمغہ حاصل کیا ۔ ۱۹۷۵ء میں بر آباد اربن ڈیولپمنٹ اتھارٹی میں ایک سال تک ، اربن آرٹ کمیشن کی تشکیل کے لئے بنیادی کام کیا اس کے بعد ۱۹۷۶ء میں سعودی ب پہنچ گئے جہاں پر حرم شریف میں مطاف کی توسیع کا ڈیزائن اور صفامروہ کے درمیان راستے کے اوپر راہروں کے لئے اسٹیل برج کے بزائن کا کام کیا اور ۱۹۷۷ء میں (ام القریٰ یونیورسٹی) میں ۱۹۸۸ء تک کام کیا اور ۱۹۸۸ سے ریاض سعودی عرب کی ایک ممتاز کنسلٹنٹ ینیرز کی فرم میں بحیثیت آرکیٹکٹ اور ڈیزائن مینیجر کام کر رہے ہیں ۔ اس کے علاوہ ریاض کی ادبی محفلوں میں سرگرمی سے حصہ لیتے رہے ، پھر بزم حیدرآباد کے کنوینر اور بزم اتحاد کے نائب صدر کی حیثیت سے ۱۹۹۱ء اور ۱۹۹۲ء میں دو مرتبہ چار سو سالہ جشن حیدرآباد کی اریب کار ریاض سعودی عرب میں اہتمام کر چکے ہیں ۔ بحیثیت شاعر مشاعروں میں حصہ لے چکے ہیں ۔

جنگ (پیروڈی)

(چند منتخب بند)

یک اَوٹ کی رات ہے میں دربدر مارا پھروں
ھول سے اُمڈی ہوئی سڑکوں پر آوارہ پھروں
وکریں کھاتا اندھیرے میں ، مَیں بے چارا پھروں
اے غم جنگ کیا کروں اے وحشت جنگ کیا کروں

اگست کی دھوپ اور یہ لُو سے تپ جانے کا حال
یے دوزخ کے ہوں شعلے اور جہنم کا جلال
ر گھڑی میزائیلوں کے سر پہ پھٹنے کا خیال
اے غم جنگ کیا کروں اے وحشت جنگ کیا کروں

ر طرف بکھری ہوئی سرگوشیاں رسوائیاں
ر طرف ہیں جنگ کی بڑھتی ہوئی سفاکیاں
ھ رہی ہیں گود پھیلائے ہوئے بربادیاں
اے غم جنگ کیا کروں اے وحشت جنگ کیا کروں

رفیع الدین احمد ناصرؔ
جدہ ۔ سعودی عربیہ

تلخیاں*****

ایسی اُڑائیں نیند کی سوچوں نے دھجیاں
چبھنے لگی ہیں خواب کی آنکھوں میں کرچیاں
آتے ہیں یاد دیکھ کے برفیلی گھاٹیاں
تاریک دل کے لوگ وہ اجلی سی وردیاں
کیسا سروں کا کال ہے وشتِ بشر میں آج
حق کے لہو کی بوند کو ترسے ہیں بَرچھیاں
آتے نہیں نظر کہیں آثارِ زندگی
یوں تو ہزاروں ہوگئیں آباد بستیاں
منصوبے لوگ آس میں کیا کیا بنا گئے
پل بھر کبھی جو چل پڑیں کاغذ کی کشتیاں
کتنے عجیب لوگ ہیں کس سے کریں سوال
سب کے گلوں میں لٹکی ہیں زرین جھولیاں
دولت کی اس ہوس کی کہو کیا سبیل ہے
جس آگ میں جھلس گئیں معصوم لڑکیاں
وہ دوَر اور تھا کہیں مقتل بھی اور تھا
یہ دور اور ہے یہاں مقتل ہیں بستیاں
کس دل سے مسکراتے ہیں اس دور میں بھی لوگ
گویا اندھیری رات میں چمکی ہیں بجلیاں
ایسی فضاء میں سانس بھی لینا محال ہے
لیکن ہماری کم نہ ہوئیں فاقہ مستیاں
ہم ہی نہیں ہیں ایک جو ترک وطن کئے
کیا لوگ تھے جنہوں نے جلائیں تھیں کشتیاں
ہے داستانِ عشق نہ رنگیں حکایتیں
ناصرؔ مری غزل میں ہیں دنیا کی تلخیاں

ڈاکٹر محمد خالد عبدالسمیع
(ریاض)



ڈاکٹر یا فوق البشر؟

ڈاکٹروں کی جو عزت معاشرہ میں ہوا کرتی ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔اس میں کچھ واجبیت بھی ہے اور کچھ مبالغہ بھی واجبیت اس اعتبار سے کہ ڈاکٹر کی ضرورت امیر و غریب ہر کس و ناکس کو ہوا کرتی ہے۔ہر شخص اس فکر میں رہتا ہے کہ کسی ڈاکٹر سے دوستی اور اچھے تعلقات ہوں تو بہتر ہے کہ وقت ضرورت کام آئے گا۔مبالغہ اس لحاظ سے کہ ڈاکٹروں نے اپنے آپ کو اتنا بلند کر لیا ہے کہ عام لوگوں کا ڈاکٹروں کے بارے میں یہ خیال رہتا ہے کہ ڈاکٹر ہر مرض سے واقف رہتا ہے اور اس کے پاس ہر مرض کی دوا ہے۔ان کو مریض کی ہر شکایت اور تکلیف کے اسباب و وجوہات کا پوری طرح علم ہوتا ہے۔انکی آنکھوں میں ایکس رے ،انکے ہاتھوں میں مقناطیس اور ان کے نسخوں میں تریاق ہوا کرتا ہے۔یہ جب بات کرتے ہیں تو ان کے اندر خود اعتمادی اس قدر ہوتی ہے کہ مریض کے پاس شک و شبہ کی گنجائش بالکل نہیں ہوتی۔ان کی رائے پتھر پر لکھی ہوتی ہے مریض کی طبعیت خراب ہو جاتی ہے تو ہمیشہ مریض یا اس کے عزیز اقارب کی غلطیوں یا بد پرہیزیوں کا نتیجہ ہوتی ہے۔مریضوں کو ایک یا دو سے زیادہ سوالات کرنے کی اجازت نہیں ہوتی کہ ڈاکٹر بہت مصروف ہوتے ہیں۔جوابات بہت مختصراً اکثر اشاروں میں دیئے جاتے ہیں اگر مریض ہمت کر کے ایک اور سوال کرے تو بجائے جواب دینے کے سوال کیا جاتا ہے۔"ڈاکٹر کون ہیں میں ہوں یا آپ"؟۔۔۔یا"یہ ڈاکٹری باتیں آپ کی سمجھ میں نہیں آئینگی آپ مجھ پر چھوڑ دیجئے"وغیرہ وغیرہ،میں نے ڈاکٹروں کو بہت نزدیک سے دیکھا ہے۔آگے سے دیکھا ہے اور خود ڈاکٹر بن کر ان کے اندر گھس کر دیکھا ہے مجھے ہر مرتبہ ان میں ایک نئی چیز دکھائی دیتی ہے۔کچھ عرصہ قبل میں امریکہ سے حیدرآباد لوٹا تو معلوم ہوا کہ ہمارے پڑوسی کی جوان بیوی تھوڑی سی مدت کی علالت میں فوت ہو گئی۔میں پرسہ دینے کے لئے ان کے گھر گیا۔اور پرسہ جن الفاظ میں اور جس انداز میں دیا جاتا ہے اس کی تکمیل کے بعد دریافت کیا کہ مرحومہ کو کس قسم کی بیماری تھی۔انہوں نے تفصیلات بیان کیں اور کہا کہ دواخانہ میں تقریباً (۱۰) دن شریک تھیں اور کچھ افاقہ بھی ہو گیا تھا اور ڈاکٹر صاحب کی رائے کے مطابق کوئی خطرہ کی بات نہیں تھی گھر لیجانے کی اجازت مل گئی۔میں نے مضطرب

ھو کر پوچھا" پھر کیا ہوا" کچھ دیر خاموش رہ کر وہ بولے "گھر لانے کے تقریباً ڈیڑھ دو گھنٹے کے بعد انہیں اچانک دورہ پڑا اور بے ہوش ہو گئیں میں نے ڈاکٹر صاحب کو فون کیا اور ان کے آنے کے لئے موٹر بھی بھجوائی اور ان کے آنے آنے تک بیچاری نے دم توڑ دیا" تھوڑی دیر سکوت رہا۔ میں نے اس سکوت کو توڑتے ہوئے پڑوسی سے دریافت کیا "آپ نے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا نہیں کہ انھوں نے چند گھنٹے قبل اطمینان کیساتھ گھر جانے کی اجازت دے دی تھی کہ مرض میں افاقہ ہو گیا ہے پھر گھر آتے ہی کیوں اسطرح طبعیت خراب ہو گئی کہ آناً فاناً وہ چل بسی" انھوں نے کہا کہ " میرے دریافت کرنے پر ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ دواخانہ سے گھر لاتے ہوئے حرج ہو گیا اسلئے یہہ فوت ہو گئی "اس گفتگو کے درمیان کچھ اور محلے والے بھی آگئے تھے جو سر جھکائے ہوئے ہماری گفتگو سن رہے تھے۔ سب کی آنکھوں میں افسوس اور چہرے پر حیرت کے آثار نمایاں تھے کہ حرج کی وجہ سے بھی موت واقع ہو سکتی ہے۔ سب کو رنج تھا کہ پڑوسی کے بچے ماں کی محبت سے محروم ہو گئے۔ اتنے میں ان کا چھوٹا لڑکا اندر سے روتا ہوا آیا باپ نے گلے سے لگا کر تسلی دی اور خاموش کیا۔ اس منظر کو دیکھ کر ہم سب بہت متاثر ہوئے۔ محلے والے آپس میں باتیں کرتے رہے اظہار افسوس کیساتھ ہمت اور صبر کی تلقین کرتے رہے۔ میں خاموش بیٹھا سوچ رہا تھا کہ یہہ "حرج" کیا ہوتا ہے۔ نہ میں نے کبھی میڈیکل کالج میں پڑھا کہ حرج کیا ہوتا ہے اور نہ امریکہ میں اتنی مدت کے قیام میں کسی کو "حرج" کے باعث مرتے ہوئے دیکھا ہے اب مجھے یہہ فکر تھی کہ کوئی مجھ سے یہہ نہ پوچھ لے کہ "ڈاکٹر صاحب یہہ حرج کیا ہوتا ہے" میں اس سوال کے ڈر سے اٹھنے والا ہی تھا کہ کسی نے مجھ سے پوچھ ہی لیا کہ ڈاکٹر صاحب "یہہ حرج کس وجہ سے ہوتا ہے اور اس سے احتیاط کس طرح کی جائے" میں تو پہلے ہی سوال سے ڈر رہا تھا اس پر ستم یہہ کہ احتیاطی تدابیر بھی جاننے کی خواہش ظاہر کی گئی۔ میرے پاس تو کوئی جواب نہیں تھا۔ ایسے غمگین موقعہ پر یہہ تو نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہہ حرج کوئی چیز نہیں۔ ڈاکٹر صاحب گپ ہانک رہے تھے۔ معاملہ کی نزاکت کا خیال کرتے ہوئے میں نے اس بات کو پڑوسی سے رجوع کرتے ہوئے کہا "آپ نے مرحومہ کے ڈاکٹر سے دریافت کیا تھا کہ کس قسم کا حرج ہو گیا وہ ہی بہتر جان سکتے ہیں کہ وہ ان کے معالج تھے "وہ بولے" دریافت تو کیا تھا لیکن خواطر خواہ جواب نہیں ملا۔ انہوں نے کچھ طبی اصطلاحات کے درمیان کہا کہ حیدرآباد کی سڑکیں بہت خراب ہو گئی ہیں آٹو رکشا میں لانے سے حرج ہو گیا۔ ان کا خیال تھا کہ آٹو رکشا میں لانے کے بجائے موٹر میں گھر لاتے تو شائد اتنا حرج نہ ہوتا" "ڈاکٹر صاحب نے پہلے ہی بتلایا ہوتا تو ضرور موٹر کا انتظام کرلیتے اور آج یہہ نوبت نہ آتی" ہمارے پڑوسی کی ندامت سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اپنے آپ کو کچھ حد تک اپنی بیوی کی موت کا ذمہ دار قرار دے رہے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہہ ڈاکٹر لوگ بھی کیا شئے ہیں کہ جھوٹ بھی بولتے ہیں تو اتنی صفائی کے ساتھ مریض کو ان کے تعلیمی فقدان کا گمان یا عملی تجربہ کی کمی کا احساس ہونا تو بہت دور کی بات ہے۔ الٹا وہ ڈاکٹروں کی باتوں اور تشریحات سے اتنا متاثر ہو جاتے ہیں کہ اپنی نادانی میں ڈاکٹر کی خود ساختہ قابلیت کا ڈنکہ بجانے لگتے ہیں۔ آپ نے بارہا سنا ہو گا کہ "ڈاکٹر نے تو بہت کوشش کی۔ اچھے سے اچھا علاج کیا لیکن وقت آچکا تھا چنانچہ وہ چل بسے" کمال ہے کہ ڈاکٹر کے علاج سے مریض ٹھیک ہو جاتا ہے تو ڈاکٹر ہیرو ہے اور ٹھیک نہیں ہوا تو وہ بری المقدمہ ہے سچ ہے بھی اپنا پٹ بھی اپنا اسی کو کہتے ہیں۔

لیکن حق کی بات تو یہ ہیکہ ڈاکٹروں کو "فوق البشر" کا رتبہ عطا کرنے میں عوام الناس کا بڑا دخل ہے۔ ہر ڈاکٹر سے یہہ امید کی جاتی ہے کہ اس کو تمام امراض کا نہ صرف علاج آتا ہے بلکہ اس کو تکلیف و شکایت کے تعلق سے تمام تفصیلات

علم ہے اور ہر تکلیف کا اس کے پاس علاج موجود ہے۔ کسی کے سر میں درد ہے کسی کی کمر میں درد ہے کسی کو مڑوڑ ہے۔
ب یہہ جاننا چاہتے ہیں کہ یہہ کس وجہ سے ہو رہا ہے۔ حقیقت یہ ھیکہ ڈاکٹروں کو ہر بات کا علم نہیں ہوتا۔ تکلیف کے
ظ سے علاج شروع کیا جاتا ہے اکثر مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ ابتدائی علاج میں چھوٹی موٹی شکایتیں دور ہو جاتیں ہیں۔ اگر
یض اس بات پر اصرار کرے کہ کس وجہ سے مڑوڑ ہوئی۔ کن چیزوں سے آئندہ پرہیز کیا جائے کہ پھر مروڑ نہ ہو وغیرہ
یرہ تو اس کے جوابات ڈاکٹروں کے پاس نہیں ہیں اس لئے کہ اس سے واقف ہونا بعض اوقات ممکن نہیں ہے۔ مریض
، اصرار پر ڈاکٹر اپنی لاعلمی کا اظہار تو نہیں کر سکتا اسکو تو اپنا بھرم رکھنا ہے اپنے پیشے کی برتری بہر حال باقی رکھنی ہے وہ
یہ ایسے تشریحات دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ جن کو سنکر مریض نہ صرف مطمئن ہو جاتے ہیں بلکہ ڈاکٹر کی قابلیت کی
یف کے پل باندھ دیتے ہیں۔ مثلاً کچھ ماہ قبل امریکہ میں ایک خاتون آئیں اور کہنے لگیں کہ "ڈاکٹر صاحب میری سیدھی
ھ دو روز سے پھڑک رہی ہے" میں نے کہا کہ "یہہ بہت اچھا شگون ہے عنقریب آپ کو بڑا فائدہ ہونے والا ہے۔ یا آپ
، ہاں کوئی غیر متوقع مہمان آنے والے ہیں" وہ ناراض ہو گئیں "میں آپ کو اپنی تکلیف اور شکایت بیان کر رہی ہوں
ر آپ ڈاکٹر ہوتے ہوئے بجائے معائنہ کر کے علاج تجویز کرنے کے میرا مذاق اڑا رہے ہیں" میں نے ضابطہ کی تکمیل کے
ہ محترمہ کی آنکھوں کا معائنہ کیا مجھے انکی آنکھوں میں کوئی خرابی نظر نہیں آئی اور میں نے کہہ دیا کہ آنکھوں میں کوئی خرابی
یں ہے پھر بھی آنکھ میں ڈالنے کے لئے کچھ دوا تجویز کئے دیتا ہوں دن میں تین بار ڈالا کیجئے۔ ایک یا دو روز میں آپ کی آنکھ
پھڑکنا بند ہو جائیگا۔ محترمہ نے میرے تجویز کئے ہوئے نسخے کو ہاتھ میں لیتے ہوئے معترض ہوئیں "آپ کہتے ہیں ڈاکٹر
حب کہ میری آنکھوں میں کوئی خرابی نہیں پھر یہہ نسخہ کیوں تجویز کیا جا رہا ہے" میرا جی چاہا کہ چیخوں و چلاؤں کہ پہلے جب
ج کی ضرورت نہیں کہا تو وہ معائنہ اور علاج پر اصرار کرتی ہیں اور جب علاج لکھا جاتا ہے تو کہتی ہیں کہ میری آنکھوں
ں خرابی نہیں تو دوا کیوں دی جا رہی ہے۔ میں نے اپنے غصہ پر قابو رکھتے ہوئے امتحان کی روشنی نکالی اور میز کی دوسری
ب بیٹھتے ہوئے کہا کہ "بظاہر دیکھنے میں کوئی خرابی تو نظر نہیں آتی لیکن بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ہوا میں بعض
allorgei ایسے ہوتے ہیں کہ جب وہ آنکھ سے ٹکراتے ہیں تو آنکھ کے اندر antibodies پیدا کر دیتے ہیں اور
، ان کی تعداد یا مقدار زیادہ ہو جاتی ہے تو Antigen اور Anti bodies کے اختلاط سے آنکھ میں مقامی طور پر
Flare Reactic ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے آنکھ پھڑکنا شروع کر دیتی ہے" وہ بڑی غور سے میری اس سائنٹیفک
ریح اور توجیح کو سنتی رہیں اور میری اجازت لیکر اپنے شوہر کو فون کیا اور میری سائنٹیفک گفتگو کا خلاصہ یوں پیش کیا کہ
اکٹر صاحب کہتے ہیں کہ میری آنکھ میں ANTIBIOTIC بہت ہو گئے ہیں۔ ہاں۔ ہاں دوا دی ہے اور کہا ہے کہ دن
ں تین مرتبہ ڈالتے رہنا اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہا، اختر صاحب آپکا شکریہ ادا کرتے ہیں اور سلام کہتے ہیں میں نے کہا کہ
ر صاحب کو بھی میرا اسلام کہئے۔ میں نے محترمہ سے ۲۵ ڈالر فیس لی تاکہ ان کو یقین ہو جائے کہ میں نے ان کے پھڑکنے کو
یدہ سمجھا ہے اور علاج بھی سنجیدگی سے کیا ہے۔

کچھ عرصہ کے بعد کسی پارٹی میں اختر صاحب سے ملاقات ہوئی اور پھر سے میرا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ ہماری بیگم آپکی
ابلیت اور طریقہ علاج سے بہت خوش ہوئیں چنانچہ دو روز کے اندر اندر ہی انہیں افاقہ ہو گیا ہے By the way
ہم نے آپکے Sense of Humour کی بڑی تعریف کی ہے۔

علیم خان فلکی
پیشہ ۔ تجارت،
وطن ۔ حیدر آباد

روزہ رکھوائی

درمیان شب کہا بیوی نے اک دن جان من
مجھکو ارماں ہے منائیں گھر بھی اپنے کوئی جشن

سب بلاتے ہیں ہمیں ترکیب سے ترتیب میں
کیوں نہ ہم سب کو بلائیں اب کسی تقریب میں

برتھ ڈے ببلو کی یا بے بی کی بسم اللہ کریں
کچھ بیاں اور اپنی مرضی آپ بھی اللہ کریں

ویڈیو کا میرے بھائی ہی کریں گے اہتمام
آپ کو کرنا ہے باقی جشن کا سب انتظام

شوہر

جان جان میں " نا " کہوں اب یہ کہاں میری مجال
دین اور دنیا کا پھر بھی رکھنا پڑتا ہے خیال

جان من اسلام میں جائز نہیں یہ سارے کام
دل دکھانا بھی تو مذہب میں ہے عورت کی حرام

روزہ افطاری کرانا ہے بڑا کار ثواب
ہم بھی جشن روزہ رکھوائی کراتے ہیں جناب

ہو صفائی اور سجاوٹ بام و در کی اسقدر
بے حقیقت سا لگے پھر سب کو شاہوں کا بھی گھر

(شوہر گھر کی صفائی کے دوران سوچتے ہوئے)

کاغذوں کا ڈھیر تھا واں چار سو بکھرا ہوا
میز پر الماریوں میں تھا یہی سب کچھ بھرا

کچھ مدرسوں کی اپیلیں رشتے داروں کے خطوط
طالب ویزا کئی بے روزگاروں کے خطوط

بھیجئے تعمیر مسجد کو لکھیں اک پیش امام
چندے اور سجدے سے ہٹ کر کچھ نہیں ہے انکو کام

کثرت اولاد کا ہر خط میں رونا زار زار
پالنا ممکن نہیں تو کیوں لگاتے ہیں قطار

ہر بشر خیرات اور امداد کا ہے منتظر
غربت و افلاس کی تصویر ہے ہر اک بشر

سب کو پاکٹ میں مری آتے ہیں سکے ہی نظر
جیسے ہم گلچیں ہیں گویا اور عرب زر کا شجر

روبرو بوسیدہ سا اک خط پڑا تھا ادھ کھلا
جانے کتنے سال پہلے ماں کے ہاتھوں کا لکھا

جس میں امی نے لکھا تھا ائے مرے نور نظر
خیریت کوئی نہیں ، عرصے سے ہوں میں منتظر

تو نے لکھا تھا نہ مل پایا ابھی تک کوئی کام
ہر جگہ بے روزگاروں کا لگا ہے اژدہام

دوستوں کی محفلوں میں کاٹی تونے زندگی
ڈگریاں بیکار گر تھیں سیکھ لیتا فن کوئی

تونے لکھنے کو کہا ہے گھر کی ترجیحات کو
شرم آتی ہے مجھے لکھتے ہوئے اس بات کو

تھی تری تعلیم اور ویزا ضروری اسقدر
رہن کرنا پڑگیا تھا زیوروں کو سود پر

زیوروں کا کوئی غم مجھکو ہنیں ہے میرے لعل
تیری بہنوں کی سگائی کا ہے بس مجھکو خیال

صالحہ کے سسرے کہتے ہیں کہ فہرست لائیے
جتنا بیٹے کو ملا اس سے سوا دلوائیے

بشریٰ اور سلمان دونوں ہی ابھی کالج میں ہیں
فیسیں انکی بڑھ چکی ہیں یہ ترے کالج میں ہیں

یاد ہوں گے تجھکو کیسے گزرے تھے وہ ماہ و سال
تیرے ابّا کا جہاں سے ہوگیا جب انتقال

من و سلویٰ سے سوا تھی ایک روٹی اور دال
ہر ٹپکتی چھت سے تھا خود کو بچانا ہی محال

جو اعزا اقربا رکھتے تھے ایسے میں خیال
ان کے احساں کو بھلا دینا ہنیں کوئی کمال

میں نے سوچا تھا کہ سب کے کام کچھ نہ آؤں گی
تیری محنت کا ثمر ان کے بھی گھر بھجواؤں گی

بدلہ احساں کا ہے احساں کچھ ہنیں اس کے سوا
جو کٹے اس سے جرہو بس ہے یہی حکم خدا

تو یہ کہتا تھا کہ امی پہلے حج کرواؤں گا
تیرے سسرے نے کہا ہے پہلے گھر بنواؤں گا

میری صحت کیا کہوں بس موت کا ہے انتظار
تو ہی اس گلشن کا ہوگا بعد میرے ذمہ دار

داستان زندگی ہونے کو ہے اب مختصر

یہ وصیت ماں کی بیٹا یاد رکھنا عمر بھر
فصل گل میں برگ بھی کانٹوں کے سر کا تاج ہے
قمریوں .اور تتلیوں سے شاخ گل کی لاج ہے
جب خزاں آئے تو کھل جاتا ہے شاخوں کا بھرم
مہر و الفت کے سبھی رشتے سبھی ناطے ہیں ختم
پھول بھی ٹہنی پہ پھر اپنی جگہ پاتا نہیں
بوجھ پتے کا بھی شاخوں سے سہا جاتا نہیں
خار پڑجاتے ہیں باقی پھر خزاں آنے کے بعد
پھر کوئی اپنا نہیں اپنے گزر جانے کے بعد
توڑ دیتا ہے شجر بھی برگ سے خود رابطہ
یوں ہی ملتی ہے جہاں میں بے ضمیروں کا صلہ ▲▲

پوشش

اقبال اعجاز بیگ (ریاض)

یہ شہر ہنر ہے
ہر دیوار مرقع ہے

کھینچنے والا، جو بھی خط ہے
بے ہنری سے بیگانہ ہے
ہر گوشہ
آئینہ خانہ ہے

چار جہت کو
رنگ ہنر سے
ڈھانپ دینے والے ہات کی
ہر اک جنبش
مستانہ ہے



اقبال شانہ
حقل، تبوک

خدمت زوجہ

آج صبح سویرے ہمارے ذہن مبارک میں ایک ایسا نادر خیال آگیا کہ کھوپڑی روشن ہو گئ ۔ کبھی کبھی ایسے انمول خیالات ناچیز کے اعلیٰ قسم کے دماغ میں آجاتے ہیں کاش ہم یونان میں پیدا ہوتے تو آج فلسفے کی تاریخ ہی کچھ اور ہوتی ۔ بہرحال آئیڈیا ہے خدمت زوجہ ۔ ہم نے سوچا کیوں نہ بیگم حیراں کی کچھ خدمت کر کے آخرت کے لئے اپنی پوزیشن بنالیں ۔ ہم نے بیگم سے کہا آج سے رات دن آپکی خدمت کریں گے اور زندگی کا باقی بچا کچا حصہ آپ کی سیوا میں گزار دینگے ایسا ہم نے ٹھان لیا ہے" ۔

بیگم نے حیران کن نظروں سے دیکھتے ہوئے فرمایا "لگتا ہے آپ کا دماغ چل گیا ہے ۔ جائیں جا کر کسی ماہر نفسیات سے کنسلٹ کریں" ہمیں اور غصہ آگیا ہم محترمہ کی خدمت کرنا چاہتے ہیں اور یہ اسے پاگل پن سمجھتی ہیں ۔ ہم سے رہا نہ گیا

"ہم آپ کو ثابت کر کے دکھادینگے اور زن مریدی کے سارے پرانے ریکارڈ، ریکارڈ بنانے والی کمپنیوں سے خرید کر چکنا چور کر دینگے" ہم نے ڈرامائی انداز میں ڈائیلاگ ادا کئے ۔ بیگم کو صوفے پر بٹھایا اور کہا "آپ یہاں آرام سے تشریف رکھیں اب ہم آپ کو گرما گرم چائے پیش کرینگے" ۔ اور ہم باورچی خانے میں داخل ہوئے ۔ چائے بنانا ویسے بھی کوئی مشکل فن نہیں ہے ۔ پانی میں دودھ، چینی، چائے کی پتی مکس کی اور کیتلی اسٹو پر رکھ دی اور اسٹو آن کر دیا ۔ لیکن جب اسٹو کے شعلے نہ جانے کیسے بنکاک کے شعلے بن گئے ۔ چائے ابل کر تقریباً تین چوتھائی اسٹو پر گر گئ ۔ ہم نے بڑی مشکلوں سے بنکاک کے شعلے اپنے دامن کی ہوا سے بجھائے اور بچی کچی چائے پیالے میں انڈیل کر بیگم صاحبہ کو ادباً پیش کر دی ۔ بیگم نے چائے کچھ اسطرح برا سا منہ بنا کر حلق میں انڈیلی جیسے دے کا مریض کڑوی دوا پیتا ہے ۔

ہم نے اعلان کر دیا کہ آج لنچ ہم تیار کرینگے ۔ اور بیگم کی شکل دیکھے بنا اس آتش کدے میں داخل ہو گئے جسے کچن کہتے ہیں مسور کی دال بنانے کا خیال آیا ۔ شاید مسور کی دال اور بیگم کی شکل دونوں میں کچھ باہمی تعلق ہے ۔ نہ جانے یہ کونسا رشتہ ہے جو دونوں میں ازل سے قائم و دائم ہے ۔

ہمیں پکوان کا کوئی ذاتی تجربہ نہیں لیکن کوئی تجربہ کرینگے تب ہی تجربہ ہوگا نا! ہم نے پیاز اور تیز دھاری دار

خطرناک قسم کی چھری مہیا کی ۔ بائیں ہاتھ میں پیاز کی ڈلی تھامی اور دائیں ہاتھ سے آہستہ آہستہ پیاز کاٹنے لگے ۔ پیاز کے اثر سے آنکھیں پر نم ہو گئیں ۔ آنسو ہیں کہ روکے نہ رکتے ہائے اللہ یہ کونسا غم ہے جو امڈ امڈ کر ندی کی شکل میں چشم غریباں سے بہہ نکلا ۔ جب آنکھیں بری طرح جلنے لگیں ہم نے سوچا کیوں نہ آنکھیں بند کر لیں ۔ اور پیاز کاٹیں ۔ جونہی آنکھیں بند کیں اور چھری چلائی ۔

"آنکھوں کا تھا قصور چھری دل پہ چل گئی" چھری کی تیز دھار ہمارے ہاتھ پر پڑی اور ہماری "لٹل فنگر" شہید ہو گئی ۔ کٹے ہوئے زخم سے خون کا فوارہ ابل پڑا بیگم گھبرا کر دوڑی دوڑی آئیں ہمیں فرسٹ ایڈ دیا اور بستر پر لٹا کر کہا" یہ کھانا پکانا آپ کے بس کی بات نہیں ہے ۔ دوسری طرح بھی تو خدمت ہو سکتی ہے" بیگم کا اشارہ کس طرف تھا یہ بات ہم آج تک نہیں سمجھ سکے ۔

بیگم کی بات قابل قبول تھی اس لئے ہم نے قبول کر لی لیکن انگلی کی شہادت نے بھی ہمیں جذبہ ۔ خدمت زوجہ سے باز نہ رکھا ۔ ہم نے سوچا کچھ فزیکل طور پر خدمت کی جائے ۔ کیوں نہ ان کی زلف پریشان کی الجھن کو سلجھا دیں ۔ زلفیں سنوارنے کا خیال ہی بڑی حد تک رومانٹک ہے اس لئے ہم بھی رومانٹک ہو گئے ۔ ٹیکنیکل طور پر ہمارا یہ آئیڈیا برا نہیں تھا کیونکہ بیگم بیچاری کو امور خانہ کو نپٹاتے ہوئے اپنے بری طرح الجھے گیسو سلجھانے کا ذرا سا بھی ہوش نہیں رہتا ۔ کبھی کبھی ہمیں انکی کھوپڑی کے چاروں طرف بے تحاشہ بکھرے بال دیکھ کر ان کی ذہنی حالت پر شک ہونے لگتا ہے ۔

ہم بیگم کے قریب اس نیت سے بیٹھ گئے کہ انکے گیسو سنوار دیں گے جیسے ہی ہم نے بیگم کی بے ترتیب بلیک اینڈ وہائٹ زلفیں اپنے دونوں ہاتھوں میں منہ زور گھوڑی کی لگام کی طرف تھامیں بیگم ہم پر برس پڑیں ۔ آپ کو شرم آنی چاہئے ایسی چھچھوری حرکت کرتے ہوئے ۔۔۔۔ اور ہمیں شرم آ گئی ۔۔۔۔ سارا دن کسی نہ کسی بہانے ہم نے بیگم کی سیوا کرنی چاہی مگر معاملہ جم نہ سکا ۔ اور جذبہ ۔ خدمت زوجہ ہمارے سینے میں ٹھاٹیں مارتا رہا ۔ رات دیر گئے تک جب بیگم کے خراٹوں نے اور اس جذبے نے سونے نہ دیا ہم اپنے بستر سے اٹھے اور چاروں خانے چت گھوڑے بیچ کر سوئی ہوئی بیگم کے قریب بیٹھ گئے ۔ ہم نے سوچا سارا دن کام کی وجہ سے بیچاری تھکن سے چور چور ہو جاتی ہیں کیوں نہ ان کی تھکن دور کرنے کا بندوبست کیا جائے ۔ ہم انکے وفادار غلام کی طرح انکے قدموں میں بیٹھ گئے اور آہستہ آہستہ ۔ انکے موٹے موٹے پیر دبانے لگے ۔ بیگم کے پیر دباتے ہوئے جو خوشی محسوس ہو رہی تھی اس کا اظہار کیسے کریں ۔ یہ کیفیت کوئی فرمانبردار شوہر ہی محسوس کر سکتا ہے ۔

شاید قدرت کو خاکسار کی یہ بے لوث خدمت پسند نہ آئی ۔ بیگم نے نیند میں کروٹ بدلی اور اچانک انکی آنکھ کھل گئی ۔ میرے دونوں ہاتھ انکا بایاں پیر دبا رہے تھے اور محترمہ کا دایاں پیر فری تھا میں پلنگ کے آخری سرے پر بیٹھا تھا ۔ نیند سے اچانک جاگنے پر بیگم کو شاید کچھ سجھائی نہ دیا کہ کیا ہو رہا ہے ۔ نیند کی غنودگی میں جانتے ہوئے یا انجانے میں چھ من کی بیگم نے اپنی بھرپور طاقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے بھاری بھرکم پیر سے ایک زوردار لات ہمارے منہ پر رسید کی اور ہم پلنگ سے کئی فٹ اچھل کر فرش پر کٹے ہوئے درخت کی طرح گر گئے ۔ چاروں خانے چت ناک آؤٹ ۔

یہ رب العزت کی قدرت کا کرشمہ تھا کہ ہماری روح عزیز جسم مبارک سے پرواز ہوتے ہوتے رہ گئی ۔ ورنہ آج ہمارا امام فاتحہ میں شامل ہوتا ۔ دوسرا معجزہ یہ ہوا کہ ہم بچ گئے اور جذبہ ۔ خدمت محبت زوجہ مر گیا ۔ ▲▲

نیم سحر
(عدہ)

امجد اسلام امجد - پلیز ڈونٹ مائنڈ

خواتین و حضرات ۔۔۔۔ امجد اسلام امجد کا تعارف کرانا کچھ ایسا ہے جیسے کوئی پھول کا تعارف خوشبو سے کرانے کی شش کرنے لگے ۔ اب تک نظم و نثر میں اس کی تقریباً سولہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں، وہ کالم نگار بھی ہے، ڈرامہ نگار بھی، نرنامہ نگار بھی ۔ اس کی مقبولیت کا حلقہ لامحدود ہے یہ تعارف اس کی شہرت میں اضافہ نہیں بلکہ اس لامحدود جن کو تل میں بند کرنے کی ایک کوشش ہے ۔

چند دن قبل کی بات ہے، مجھے پیغام ملا کہ امجد اسلام امجد ریاض میں اپنے ہم زلف کے ہاں پہنچ چکا ہے اور یہ کہ میں سے فون کر لوں ۔ اس پر مجھے بڑی ہنسی آئی ۔ اس لئے نہیں کہ مجھے امجد کی لطیفہ سازی اور لطیفہ بازی یاد آگئی تھی ۔ اس قسم ، سازیاں اور بازیاں تو امجد کے حوالے سے ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے اور ہم لوگ حقیقتوں پر صرف آنسو بہانے کے دی ہیں، ہنسنے کے نہیں ۔ مجھے ہنسی اس لئے آئی کہ امجد بھی کسی کا ہم زلف ہو سکتا ہے! ہم زلف ہونے کے لئے تو "ہم" ے ساتھ ساتھ "زلف" کا ہونا بھی ضروری ہے اور امجد کا زلف سے (یعنی اپنی زلف سے) وہی تعلق ہے جو چیل کے گھونسلے ماس سے ہوتا ہے ۔ بہر حال اپنی زلف سے تعلق کی محرومی کو اس نے سایہ زلف تلے پناہ لے کر دور کر لیا ہے ۔ قبل از نت "فارغ البالی" سے اس کی شاعری میں "زلف جاناں، کا تذکرہ "چیزے دیگر" کے طور پر آیا ہے ۔

مجھے یہ خاکہ لکھتے ہوئے ایک یہ مشورہ بھی ملا کہ میں اور کچھ بھی لکھ دوں، امجد کے بالوں کو موضوع نہ بناؤں ۔ ب آپ خود ہی بتایئے کہ جو چیز موجود ہی نہیں اسے موضوع کیسے بنایا جا سکتا ہے؟ ویسے مجھے یقین ہے کہ چاہے اس خاکے ں اس کے بالوں کے حوالے سے کچھ بھی لکھ ڈالوں، امجد برا نہیں مان سکتا کیونکہ خود اسی کا قول ہے کہ چاہے بندہ ضائع ، جائے، جملہ ضائع نہیں ہونا چاہئے ۔ یہاں بندہ ہمیں زیادہ عزیز ہے اور جملے چست کرنے کو بھی جی چاہتا ہے اس لئے ، شش یہی ہوگی کہ نہ یہ ضائع ہو نہ وہ ۔ ویسے بھی امجد کا ذکر آئے اور خاکے میں مزاح کا رنگ نہ ہو تو یوں لگتا ہے جیسے ی بلانوش کو لسی کا پیالہ یا کسی بِلا کو وسکی کا جام پیش کیا جا رہا ہو ۔ چنانچہ امجد کا خاکہ لکھتے ہوئے مزاحیہ انداز اختیار ، نا میرا شوق نہیں بلکہ امجد کی شخصیت میں جھانکتے ہوئے شرارتی بچے کا تقاضا ہے ۔

امجد کی شخصیت کا تذکرہ مزاح کے ذکر کے بغیر ادھورا سا لگتا ہے۔ کہنے کو اس نے نہایت سنجیدہ ادبی کام کئے ہیں۔ اس کی شاعری کے چار مجموعے۔ برزخ، ساتواں در، فشار۔ اور ذرا پھر سے کہنا کے عنوانات سے شائع ہو چکے ہیں۔ یہی چاروں مجموعے "خزاں کے آخری دن" کے عنوان سے کلیات کی صورت میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔ گیتوں کا مجموعہ "آنکھوں میں تیرے سپنے" بھی شائع ہو چکا ہے۔ نیگرو شاعروں کی نظموں کا ترجمہ "کالے لوگوں کی روشن نظمیں" اور فلسطینی شاعروں کی نظموں کا ترجمہ "عکس" کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔ انگلش میں امجد کی نظموں کا ترجمہ IN THE LAST DAYS OF AUTUMN کے نام سے آچکا ہے۔ نثر میں اس کا سفرنامہ "شہر در شہر" کے عنوان سے اور کالموں کا مجموعہ "چشم تماشا" کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔ امجد نے اپنا تخلیقی اظہار ایک اور اہم میڈیا یعنی ٹی وی کے ذریعہ بھی کیا ہے اور "وارث" اور "دہلیز" جیسے کامیاب ترین سیریل لکھ کر بے انتہا مقبولیت حاصل کی ہے۔ یہ دونوں ڈرامے بھی کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں اور دوسرے ٹی وی ڈراموں کے دو مجموعے بھی "اپنے لوگ" اور "ہو میں پھول" کے عنوان سے شائع ہو چکے ہیں۔ امجد نے اپنی شاعری ہی میں نہیں، ڈراموں اور کالموں میں بھی اپنے ملکی حالات و مسائل پر روشنی ڈالی ہے اور معاشرے میں ہونے والی ناانصافیوں، غلط بخشیوں اور جبر و استحصال پر تنقید کی ہے، اس کا دل بھی ہر سچے فنکار کی طرح شدت احساس کا شکار رہتا ہے۔ مجھے ایک لطیفہ یاد آیا۔ ایک صاحب شدید سر درد کی شکایت لے کر ڈاکٹر کے پاس پہنچے۔ ڈاکٹر نے معائنہ کرنے کے بعد کہا کہ آپ فوری طور پر دماغی کام کرنا چھوڑ دیجئے۔ ان صاحب نے کہا۔ "مگر جناب میں تو ٹی وی کے ڈرامے لکھ کر روزی کماتا ہوں"۔ ڈاکٹر نے جواب دیا "وہ بے شک لکھتے رہیئے" لیکن یہ لطیفہ یقیناً امجد اسلام امجد کے بارے میں نہیں ہے کیونکہ وہ ملکی مسائل پر کڑھنے کے باوجود سر درد میں مبتلا نہیں ہوتا اور نہ ڈراموں کے ذریعے عوام کو سر درد میں مبتلا کرتا ہے۔ اصل میں یہ سنجیدہ ادبی اور نیم ادبی کام تو وہ شرما شرمی میں کر جاتا ہے، اس کا اصل میدان لطیفہ سازی اور جملہ بازی ہے جس میں تا حال اگر کوئی اس کا ثانی ہے تو وہ عطاالحق قاسمی ہے۔ یہ دونوں ہی اس اصول پر کاربند ہیں کہ چاہے بندہ ضائع ہو جائے مگر جملہ ضائع نہ ہو، چنانچہ یہ دونوں اپنے جملوں کے ذریعہ بندے ضائع کرنے کا کام بڑی محنت سے کر رہے ہیں۔ عموماً ان کے جملے اتنے تہہ دار ہوتے ہیں کہ مخاطب اس وقت تو بے اختیار ہنس دیتا ہے مگر گھر پہنچ کر جب رات گئے سوچتے رہنے کے بعد اس پر اس جملے کے اصل مفہوم واضح ہوتے ہیں تو وہ کئی طریقوں سے سلگنے لگتا ہے۔ شاید اسی لئے امجد کو عموماً نصف شب کے بعد کئی ٹیلی فون کالز آتی ہیں۔ اصل میں یوں ہے کہ امجد نے اپنی ذات کے اندر مزاح اور خوش باشی کی ایک کھڑکی ہی نہیں بلکہ پوری بارہ دری کھول رکھی ہے جہاں سے تازہ ہوائیں ہر لحظہ چل کر اس کی ذات کو تھکن سے اور اس کے لہجے کو تھکان سے بچائے رکھتی ہیں۔ اسی لئے شاعری ہو یا نثر، وہ آج بھی تر و تازہ لہجے میں لکھ رہا ہے اور یہ تازگی باسی سبزیوں پر پانی کا چھڑکاؤ کر کے حاصل کرنے والی مصنوعی اور عارضی تازگی نہیں بلکہ وہ تازگی ہے جو سچی تخلیق کے اندر سے خوشبو بن کر پھوٹتی ہے۔ اسی خوش باشی اور تازگی کا نتیجہ ہے کہ وہ ذہنی تناؤ کے ماحول میں رہتے ہوئے بھی ذہنی دباؤ کا شکار نہیں ہوتا۔ فارغ البال ہو جانا تو خیر اکثر دماغی محنت کرنے والوں کا مقدر ہوتا ہے۔ عجیب بات ہے کہ میں نے کبھی کسی خاتون کو فارغ البال نہیں دیکھا۔ یا تو یہ بیماری صرف مردوں پر ہی حملہ آور ہوتی ہے یا پھر خواتین دماغی محنت اس وجہ سے کرتی ہی نہیں کہ جب اس کا ردعمل ہی ظاہر نہیں ہونا تو کیا فائدہ؟

امجد نے سیر و سیاحت بھی خوب کی ہے اب تو وہ بیرون ملک ہونے والے اردو مشاعروں کے لئے پاکستان کی
یکسپورٹ کماڈٹی" بن چکا ہے ۔ ظاہر ہے ان سرگرمیوں میں اسے رومانی تجربات بھی ہوئے ہوں گے جن کا اظہار اس نے
ن شاعری اور سفرناموں میں کیا ہے مگر بڑی احتیاط سے کہ کہیں کوئی اعتراف گناہ اسے سنگساری کے انجام تک نہ پہنچا
ے ۔ تاہم "ہوم فرنٹ" پر اپنی وفاداری کا اظہار کرتے ہوئے امجد کہتا ہے:

وہ اور ہوں گے جن کو امجد نئے مناظر کی چاہ ہوگی
میں اس کے چہرے کو دیکھتا ہوں، میں اس کے چہرے کو دیکھتا تھا

مگر یہاں بھی امجد ڈنڈی مار گیا ہے ۔ اس نے ماضی اور حال میں تو ایک خاص چہرہ دیکھنے کا اعلان کیا ہے، مستقبل
ے بارے میں ایسا کوئی وعدہ نہیں کیا اور ابھی تو اسے جانے کتنے سفر کرنے اور کتنے نئے چہرے دیکھنے ہیں ۔ شاید اس کے
رے میں اسی لئے ضمیر جعفری نے ایک مرتبہ ٹی وی پر اسلامائزیشن کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا ۔

"ٹی وی پر اسلام تو کم، امجد اسلام زیادہ ہے"

اب جب عمرہ کرنے کے بعد حاجی امجد اسلام امجد صاحب جبہ و دستار میں ملبوس، تسبیح بدست واپس جائیں گے تو
ید ہے کہ وہ ٹی وی کو مشرف بہ اسلام کرنے میں ویسا ہی اہم کردار ادا کریں گے جیسا کہ حاجی سلطان راہی صاحب
جابی فلموں کو مسلمان کرنے کے لئے ادا کر رہے ہیں ۔ تاہم شاید امجد کو ایسا کرنے کا وقت نہ مل سکے کیونکہ سنا ہے کہ
کستان کی کئی بال اگانے کی دوائیں بنانے والی کمپنیاں، انہیں ملین ڈالر کی ملازمت آفر کرنے والی ہیں ۔ اس میں حیرت
، کوئی بات نہیں ۔ جب مرحوم سوویت یونین کے فالتو ہو جانے والے وزیر اعظم گورباشیف کو امریکہ اور یورپ سے
ین ڈالر کی ملازمت آفر ہو سکتی ہے تو امجد میں آخر کیا کمی ہے ۔ بلکہ دونوں میں ایک بڑی واضح قدر مشترک بھی تو ہے ۔
ہی فارغ البالی کی ۔

خواتین و حضرات ـــــ یہ مضمون ختم کرتے ہوئے میں ایک اہم وضاحت کر دینا چاہتا ہوں اگر کوئی بہن بھائی یہ
جھتا ہے کہ مجھے امجد کی فارغ البالی کا ذکر کرتے ہوئے شاید بڑی کمینی سی مسرت حاصل ہو رہی ہے تو وہ مجھے دیکھ کر غلط
ی دور کر لے ۔ اگرچہ ابھی تک فرق کچھ کچھ صاف ظاہر ہے لیکن یقین کیجئے کہ میرا بھی فیوچر برائٹ ہے ۔ بس چند ماہ یا ایک
ڈھ برس کی بات ہے کہ میں بھی امجد جیسا ہونے والا ہوں اور، امجد کا ذکر کے دراصل میں اپنا ہی مذاق اڑا رہا ہوں اور
س لئے پلیز ڈونٹ مائنڈ!

عثمان ناقد
(جدہ)

غزل

بات اچھی اگر کہی ہوگی
جو سنے گا اسے خوشی ہوگی

آپ فن کی طرف توجہ دیں
علم والوں سے دوستی ہوگی

شعر ہوتے نہیں اگر سچے
کس طرح قدر شاعری ہوتی

دل میں اخلاص ہی نہ ہو جب تک
دوستی خاک دوستی ہوگی

ان کا کچھ التفات ہے کم کم
بات کیا ایسی ہوگئی ہوگی

ہے نگاہوں میں جلوہ جاناں
چاندنی میں بھی چاندنی ہوگی

خوب ہے آپ کی غزل ناقد
واردات اس میں قلب کی ہوگی

نعمان منظور
(الخبر)

تو کرتی ہے یونہی چھت پر کھڑی
کسی نے بھیجی پھولوں کی لڑی

نشاں سر پر بنے ہیں پھول جب
کہیں اس شوخ کی جوتی پڑی

گھمایا اور جھٹک ڈالا ادا
میری چاہت تھی حقے کی نڑی

میں شوہر ہوں کوئی نوکر نہیں ہو
مجھے دیتی ہو سالوں کی تڑی

ہوا پھر گرم بازار محب
پڑوسن پھر پڑوسی سے لڑی

ہمیں اک چاہئے جیون کی سا
کوئی مل جائے چھوٹی کیا بڑی

پڑوسن لے کے جھاڑو ساتھ
غزل کہتے مری ہانڈی سڑی

محبت گر نہیں تو صاف کہہ
مجھے تکتی ہو آنگن میں کھڑی

کٹی نعمان چھپنی بے کسی
سبھی کو گھر میں تھی اپنی پڑی



ڈاکٹر مرزا کلیم اللہ بیگ
حقل، تبوک

جھوٹ

جھوٹ بولنا بھی ایک آرٹ ہے۔ یوں تو دنیا میں سب جھوٹ بولتے ہیں لیکن پرفکٹ انداز میں جھوٹ جو سو فیصد سچ لگے کہنا سب کے بس کی بات نہیں۔ دنیا میں ہر کوئی یعنی باپ بیٹے سے شوہر بیوی سے بھائی بہن سے ڈاکٹر مریض سے جھوٹ بولتا ہے۔ ان کے علاوہ لیڈر عوام سے وکیل عدالت سے، دکاندار گاہک سے، مجاور زائرین سے، پجاری اپنے بھگتوں سے، مرشد اپنے مریدوں سے، عاشق اپنی معشوقہ سے جھوٹ بولتا ہے۔ عاشق کے مکالموں میں جھوٹ کی برقی رو دوڑتی رہتی ہے۔ تمہیں پھولوں میں رکھوں گا، تمہارے ساتھ ہی مروں گا۔ تمہیں دنیا کی ہر نعمت سے مالا مال کردوں گا، تمہارے بغیر میں ایک پل بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔ ایک سکنڈ بھی تمہیں چھوڑ کر کہیں جانے کو جی نہیں چاہتا۔ وغیرہ وغیرہ۔ اور جھوٹ کے اس جال میں پھنسنے والی معشوق تاحیات عاشق کے ساتھ بندھ جاتی ہے لیکن اب جنت کی حقیقت کھلنے لگتی ہے۔ پرانے لچھے دار مکالموں کی جگہ اب کہا جائے گا۔ "تمہیں جو حال میں رکھوں میرے ساتھ رہنا ہوگا۔ اگر میرے کہنے پر نہیں چلوگی تو دوسری عورت لاؤں گا۔ تمہارے پاس بغل میں بیٹھا رہوں تو یہ پیٹ کیسے چلے گا، چند سالوں کی تو بات ہے باہر جا رہا ہوں جلد سے جلد واپس آجاؤں گا، چٹھی لکھا کروں گا وغیرہ وغیرہ۔

ڈاکٹر مریض سے جھوٹ بولتا ہے "تمہیں تو خطرناک بیماری ہو گئی ہے۔ علاج طویل ہوگا" اور خواہ مخواہ مریض کو نرسنگ ہوم میں بھرتی کرے گا، بلا ضرورت ایکسرے، خون کا معائنہ کروائے گا اور لمبا چوڑا بل مریض کے ہاتھ میں تھما دے گا۔ "تمہارا بلڈ پریشر کافی بڑھ گیا ہے۔ دس دن تک انجکشن لینا ہوگا" اور علاج کے بعد دوبارہ معائنہ کرے گا اور کہے گا دیکھو اب نارمل ہے حالانکہ بلڈ پریشر تو شروع سے ہی تقریباً نارمل تھا۔ کسی سے کہے گا تمہیں آپریشن کروانا ہوگا۔ زخم خطرناک ہے بجلی کا علاج کرنا ہوگا ایک خاص دوا جو میں نے جاپان سے منگوائی ہے وہ دوں گا، تمہارا نزلہ ناک کے ذریعہ حلق میں معدہ کے ذریعہ پھیپھڑوں میں اتر گیا ہے، تمہارے دونوں گردے بیکار ہوگئے ہیں، تمہارا دل کمزور ہے اور کبھی

بھی ہارٹ فیل ہو سکتا ہے اور اس قسم کے کئی جھوٹ ہیں جو ڈاکٹر اپنے مریضوں سے کہتے ہیں صرف پیسہ بٹورنے کے لئے
لیڈی ڈاکٹر کو خاص طور سے جھوٹ بولنے میں آسانی ہوتی ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک تو زنانہ امراض اور شوہر
تحقیق کرنے سے رہا دوسرے پوشیدہ امراض جس کو مریضہ بھی نہیں سمجھ سکتی۔اس طرح ایک عورت دوسری عورت
بہ آسانی دھوکے میں ہتلار کھ سکتی ہے وہ بھی صرف پیسے کی خاطر، لطف یہ کہ ڈاکٹروں کے جھوٹ کو مریض کبھی بھی جھو،
نہیں مانتا۔

کبھی کبھی ڈاکٹر کو مریض کی بہتری کے لئے جھوٹ بولنا پڑتا ہے۔ مثلاً ایسا مریض جو انتہائی خطرناک مرض جیسے
کینسر میں ہتلا ہو تو ڈاکٹر کو چاہیئے کہ اس کو دلاسے دے اور جھوٹی تسلی دے تاکہ مریض کی امید بندھی رہے اور مر۔
بھی تو سکون سے مرے۔اس قسم کے جھوٹ میں ڈاکٹر کی ایک اعلیٰ شخصیت چھپی ہوتی ہے جس سے مریض کو نقصان نہیں
فائدہ پہنچتا ہے۔

وکیل کا جھوٹ بولنا تو ایک عالمی حقیقت ہے۔ جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ ثابت کرنا ہی تو اس کا پیشہ۔
جھوٹ اور سچ کی اس بحث کو انصاف کی ترازو میں تول کر فیصلہ دینا جج کا کام ہے۔وہی وکیل کامیاب ہوتا ہے جو جھو،
اس انداز میں بولے کہ سچ لگے اور سچائی کی اتنی دھجیاں اڑائے کہ وہ اپنی چمک کھودے۔

لیڈر اگر عوام سے جھوٹ نہ بولے، جھوٹے خواب نہ دکھائے تو اس کی قیادت کیسے پنپے گی۔یہ تو لیڈر کا پیدائشی
حق ہے کہ جتنا ہو سکے، جتنی بار ہو سکے، جس وقت ہو سکے جھوٹ بولتا جائے۔جتنا جھوٹ بولنے میں ماہر ہو گا اتنا ہی بڑا لیڈ
کہلائے گا۔آپ کے بچوں کے لئے نئے مدرسے، مفت تعلیم، مفت طبی سہولتیں، بچوں کو دوپہر کا کھانا اور چھوٹے بچوں
دودھ کی سپلائی فری، ہر خاندان کے ایک فرد کے لئے ملازمت، زراعت کرنے والوں کے لئے آدھی قیمت پر ٹراک
پولٹری فارم، ڈیری فارم کے لئے قرضے، غریبوں کے لئے سستے کپڑے اور اس قسم کے ہزاروں نعرے جھوٹے ہی تو ہو۔
ہیں۔الکشن کے قریب تو جھوٹ انتہا کو پہونچ جاتی ہے۔جیسے ہی الکشن جیت گئے جھوٹ کا رنگ مدھم پڑتا جاتا ہے۔اور چ
سالوں میں منسٹر کا بیان آئے گا کہ ہمارے ہاتھ میں جادو کی چھڑی تو نہیں ہے کہ آپ کے بچوں کے لئے نئے مدرسے فور
کھول دیں، علاءالدین کا چراغ نہیں کہ ہر خاندان سے ایک فرد کو نوکری دیں قارون کا خزانہ نہیں کہ ہر ایک کو پولٹر
فارم یا ڈیری فارم پر قرض دیا جائے۔ہم اپنی پوری کوشش کر رہے ہیں۔ نئی کمیٹیاں بنائی گئی ہیں جو ان مسائل کو
کرنے کی کوشش کریں گی۔اس طرح پانچ سال گذر ہی جاتے ہیں۔

اسلام علیکم آپ کہاں سے آئے ہیں۔ادھر آیئے پہلے اس پر چادر چڑھایئے اور نقدی اس بکس میں احتیاط کے سا
ڈالئے۔آپ کی ہر مراد پیر صاحب کے دربار میں سنی جائے گی، انشاء اللہ آپ کو پیاری سی لڑکی ہو گی، فوجداری کیس مہ
کامیابی ہو گی۔آئندہ جمعرات آپ یہاں نیاز کیجئے۔بکرے کا پکوان کا ہماری طرف سے پورا انتظام ہو گا۔یہ وہ کلمات ہیں
اکثر درگاہوں پر سنائی دیتے ہیں۔وہاں موجود روحانی ایجنٹ آپ سے سراسر جھوٹ بولے گا اور آپ کو جھوٹے دلاسے دے
کوئی یہ نہیں سوچتا کہ راست اللہ میاں سے کیوں نہ مانگیں؟ لیکن دراصل کچھ لوگوں کو دھوکہ کھانے کی عادت ہوتی۔
ہر مجاور کو دعویٰ ہے کہ وہ حضرت کے خاندان سے ہے اور صرف اس کو ہی حق پہونچتا ہے کہ وہ نذرانہ وصول کرے ا
یہ اسی کا حق ہے کہ آپ کا نام خاص دعا میں شامل کرے اور آپ کی مرادیں پوری کروانے کا وہی ایک روحانی ایجنٹ ہے

اور لوگوں کو اللہ پر بھروسہ نہیں ایجنٹوں پر بھروسہ ہے۔ کام ہو گیا تو کہتا ہے کہ فلاں حضرت کی وجہ سے مراد پوری ہوئی اور اگر نہیں ہوا تو کہے گا کہ اللہ کی مرضی، شائد میرے نذرانہ میں کچھ کمی رہ گئی تھی۔ بعض درگاہوں پر کہتے ہیں کہ پانی نہا کر کچے کپڑوں کے ساتھ حاضری دیں، فلاں درگار پر گوشت کھا کر نہ جائیں، فلاں درگاہ پر ناریل ضرور لے کر جائیں، اور فلاں درگاہ پر مرغ اور روٹی پکا کر لے جائیں کیونکہ حضرت مرغ شوق سے کھاتے تھے۔ بچارے ولی صفت جو بھی وہاں دفن ہیں انہیں کیا معلوم کہ ان کی موت کے بعد یہ مسخرے اس قسم کی باتیں پھیلا کر اپنے پیٹ کا انتظام کر لیں گے۔

ہمارے سماج میں مرشد بھی اپنا خاص مقام رکھتے ہیں۔ میرے ہاتھ سے دودھ کا پیالہ پی لو، میرے ہاتھ پر بیعت کرو، ہر ماہ ۲۶ تاریخ کو قوالی میں حاضری دو تم سیدھے جنت میں جاؤ گے۔ اللہ تعالیٰ کے پاس جب تمہارے کارناموں کا حساب ہوگا۔ میں تمہاری مدد کروں گا۔ میں تمہارے لئے واسطہ بنوں گا۔ ہم تو ایسے مرشدوں سے بھی واقف ہیں جو اپنی مریدن سے عشق فرمانے لگتے ہیں۔

دوکاندار اپنے گاہک سے جب تک جھوٹ نہ بولے اس کا پیٹ ہی نہیں بھرتا۔ قسم خدا کی اس ایٹم میں ایک پیسہ کا بھی فائدہ نہیں۔ بالکل نیا اسٹاک ہے صاحب، یہ مال کل ہی آیا ہے، اصلی گھی ہے جناب، کھانے کا نکلا ہوا تیل ہے، اپنے گھر کے بنے ہوئے پاپڑ، اصلی پوٹلے کا گوشت ہے، ابھی ابھی یہ مچھلی زندہ تھی، اصلی گھی میں بنے ہوئے لڈو ہیں وغیرہ وغیرہ اگر آپ تحقیق کریں اور ذرا اندر جھانک کر دیکھیں تو دکاندار کی ان باتوں کا پول کھل جائے گا۔

سچ تو یہ ہے کہ ہماری دنیا جھوٹ سے اور جھوٹ بولنے والوں سے بھری ہوئی ہے۔ ہم جانتے ہوئے بھی کہ کوئی جھوٹ بول رہا ہے خاموش تماشائی بنے رہتے ہیں۔ ٹوکتے نہیں روکتے ہیں کیونکہ ہم خود بھی اس جھوٹے سماج کا ایک حصہ ہیں۔

▲▲

احمد عبدالعلیم اختر
(ریاض)



ایم اے، ریاضی، ایم ایڈ (جامعہ عثمانیہ حیدرآباد) جامعہ عثمانیہ کی مختلف ادبی، سماجی اور ثقافتی تنظیموں سے وابستہ رہے۔ کچھ دن جامعہ کے دفاتر سے متلک رہے۔ ان دنوں جامعہ ملک السعود، سعودی عرب میں کوآرڈینیٹر ہیں۔ اردو اور انگریزی میں شعر کہتے ہیں۔ بزم اتحاد ریاض کے مشاعروں اور مختلف تقاریب کے انعقاد میں بیش بہا دلچسپی لیتے ہیں۔

جہاں پر امن ہنگامہ مچانا چاہیے
میں ہوں رہبر مجھ کو یوں دنیا چلانا چاہیے

اک بچارہ وقت کا مارا تھا میرا باپ بھی
میں نکما اک پسر اور تین تھیں بہنیں مری
بہنیں پڑھ لکھ گھر بسا کر ہو گئیں سب شادکام
باپ نے مجھ سے کہا تو لے لے رہبر کا مقام

باپ کے اس خواب کو سچ کر دکھانا چاہیے
میں ہوں رہبر مجھ کو یوں دنیا چلانا چاہیے

قوم کی تعمیر کا نقشہ بنانا رات دن
بے گھروں کو گھر دلا دینے کا جھانسہ رات دن
نوکری بیروزگاروں کو دلانے کے عوض
ٹھیکے کاروبار کے فورا چھڑانے کے عوض

رشوتوں کی شکل میں دولت کمانا چاہیے
میں ہوں رہبر مجھ کو یوں دنیا چلانا چاہیے

اک طرف ہے نعرہ اپنا سب ہیں بھائی بھائی کا
اک طرف ہے فرق اعلیٰ ذات ادنیٰ نائی کا
داخلوں میں بھی تحفظات کے چکر چلیں
نت نئے کالج کھلا کر رشوتیں ہم کیوں نہ لیں

چندے عطیے اینٹھ کر دولت بنانا چاہیے
میں ہوں رہبر مجھ کو یوں دنیا چلانا چاہیے

ہر جگہ ہر عالمی کھیلوں میں شرکت لازمی
ہوں کھلاڑی یا نہ ہوں شرکت میں عجلت لازمی
ٹیم کا بھی ہو سلکشن بس سفارش چاہیے
اور کپتانی کو بھی نوٹوں کی بارش چاہیے

کھیلنے والوں سے بڑھ کر کوچ جانا چاہیے
میں ہوں رہبر مجھ کو یوں دنیا چلانا چاہیے

****

اتلاف ذات

نام .... ہماری کہانی پڑھنے سے پہلے ہی آپ ہمارے نام سے واقف ہوگئے ہونگے۔ لہذا یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں۔ ویسے بھی نام۔ ناموروں کے ہوتے ہیں۔ ہم بے ناموں کا کیا نام۔ جو ماں باپ نے رکھ دیا اسی کو اپنالیا۔ ہم نے اپنے آپ سے اپنا کوئی نام نہیں رکھا۔ شائد اسی لئے کہ ابھی ہم اس قابل نہیں ہوئے۔

کتنی عمر ہے .... میری دادی جان نے بھی آج تک مجھے اپنی صحیح عمر نہیں بتائی کہتی ہیں "تمہارے دادا کے ذرا جلدی انتقال کر جانے سے جوانی میں بیوہ ہو گئی۔ غم بیوگی نے چند ایک بال سفید کر دئے ورنہ ابھی مری عمر بس کیا ہے۔" یہ بات ہر کوئی جانتا ہے کہ عورت کبھی اپنی صحیح عمر نہیں بتاتی تو پھر آپ جھوٹ سن کر کیا کیجئے گا۔

تعلیم .... لڑھکتے ڈھلکتے کچوے کی سی چال چلتے پچھلے سال ہم نے دسویں جماعت "شہنشاہی درجہ" جسے عرف عام میں "رائل گریڈ کہتے ہیں، میں پاس کیا اور اب اعلیٰ ثانوی کی دوسری سیڑھی پر ہیں۔ ہر لمحہ یہ ڈر لگا رہتا ہے کہ والدین ہمارے پیروں تلے کی یہ سیڑھی کھینچ کر کسی اور کے باورچی خانے کی جانب نہ لگادیں۔ جہاں روٹیاں تھاپنے اور صبر کا دامن تھامنے کے علاوہ تھالی کے بیگن کی طرح پورے سسرال میں لڑھکتے پھریں گے۔

اب آپ یہ بھی جاننا چاہیں گے کہ ہمیں لکھنے کا شوق کیسے پیدا ہوا ..... تو عرض ہے یہ شوق پیدائش کے ساتھ ہی پیدا ہوا تھا قبل اس کے یہ شوق ہمیں بالکل نہ تھا۔ پیدائش کے فوراً بعد لیڈی ڈاکٹر نے ہمیں الٹا لٹکایا اور کہا "رو" ہم اس کی اس ادا پر ہنس پڑے۔ ہماری ہنسی پر وہ بھی ہنسیں اور والدہ سے کہا "مبارک ہو آپ کے گھر ایک مسخری پیدا ہوئی ہے"۔ تھوڑی دیر بعد جب ہم اپنی والدہ کے ساتھ اسپتال کے بیڈ پر پڑے مضامین جدید کے نزول کا انتظ[illegible] تھے کہ والد صاحب نازل ہوگئے والدہ کو مبارکباد دی اور ہمیں گود میں لیکر پہلے پیار کیا پھر اپنا منہ ہمارے کان کے قریب لائے اور اذان دینی شروع کی۔ والد صاحب کی ریش مبارک ہماری گردن سے بار بار کچھ اس طرح ٹکراتی کہ باوجود ضبط کے ہمارے قہقہے نکل پڑے اور یہیں سے ہم نے قہقہہ لگانا سیکھا۔

خاندانی پس منظر .... ہمارے خاندان میں حرکاتی سکناتی مسخرے تو بہت ہیں لیکن لکھائی پڑھائی کرنے والا کوئی مسخرہ نہ تھا شائد اسی کمی کو پورا کرنے کے لئے زمین پر اتارا گیا ہے ہمیں۔

جب والدہ نے یہ کھاتہ دیکھا تو ان کے پیر چراغ پر پڑ گئے یعنی وہ چراغ پا ہو گئیں اور "دربار سرتلخی" میں ہمارا دفتر پیش کر دیا۔ والدہ چراغ پا۔ اور والد قہقہہ زار [illegible] سمجھئے یا جرا۔ والد صاحب جب بھی کسی بات پر خوش ہوتے تو پیٹھ پر اتنی شاباشی ملتی ہے کہ گویا [illegible]

لکھنے کی ترغیب کیسے ہوئی .... بھلا ہو ہمارے شجاع ماموں (شجاع الدین غوری صاحب) کا کہ جن کی جلی کٹی کڑوی کسیلی اور روز روز کی بھبکیوں (یہاں جان بوجھ کر ...... ہم نے ایک مرکب لفظ کا سابقہ چھوڑ دیا ہے) نے یہ مضمون لکھنے پر مجبور کر دیا۔ خواتین و حضرات ہوشیار یہ ہمارا پہلا ادبی پکوان ہے بدہضمی اور اسہال کے ہم ذمہ دار نہیں

"خود کردہ را علاجے نیست"

یہ بات غالباً ٹیگور نے کہی تھی کہ "دنیا میں آنے والا ہر نیا بچہ اسبات کا ثبوت ہے کہ خدا اپنے بندوں سے ابھی مایوس نہیں ہوا ہے۔" بالکل اسی طرح ہم بھی ابھی مایوس نہیں ہوئے ہیں۔ دنیا میں آنے والی ہر نئی لڑکی سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ اس کمی کو دور کر دے گی۔

لال مرچ

آسیہ نازلی
ریاض

بات بہت معمولی تھی۔ بات ہی بات میں بات کا بتنگڑ بن گئی، بات نہ بڑھتی اگر بات کو بڑھایا نہ جاتا اور میری بات کو اس نے باتوں میں اڑایا نہ ہوتا تو بات سے بات نہ نکلتی اور نہ بات اتنی بگڑی کہ معاملہ ہاتھا پائی تک پہنچتا۔ بات صرف اتنی تھی کہ ہم نے اپنے اجدادی کرایہ دار سے اپنے جدی پشتی مکان کے انخلاء کی بات کی۔ انتہائی ادب و احترام سے عرض کیا "جناب کی بارگاہ اقدس میں اس لئے باریاب ہوا ہوں کہ یہ بات عالیجاہ کے گوش گزار کر دوں کہ مجھ حقیر و تقصیر کی دختر نیک اختر "نجمہ اختر" اور داماد عزیز "عبدالعزیز" بسلسلہ انتقال ملازمت یہاں تشریف لا رہے ہیں۔ آپ جناب سے انتہائی مودبانہ گذارش ہے کہ حضور والا اس مکان کو جس میں کہ عزت مآب مع اہل و عیال و متعلقین مدت زمانہ سے قیام پذیر ہیں نقل مکانی کر جائیں تاکہ اس مکان میں ہم اپنی نور چشمی "نور نظر کو ٹھہرا سکیں"۔

موصوف ہماری بات پہلے تو صبر و تحمل سے سنتے رہے لیکن جیسے جیسے ہمارا مطلب ان پر واضح ہوتا گیا جبڑے سخت ہوتے گئے چہرے پر رنگ آتے اور جاتے رہے اور جب ہماری بات واضح ہو گئی تو ان کے چہرے نے رنگ پکڑنا شروع کیا پھر رنگ بدلنے اور بگڑنے شروع ہو گئے۔ انکی یہ بدلتی رنگت دیکھ کر ہمارا رنگ بھی فق ہو گیا۔ ہمارے اترے رنگ پر اس نے جو رنگ دکھانا شروع کیا تو ہم پر۔ تھرتھری، کپکپی لرزہ اور بدحواسی طاری ہوئی۔

خوف و دہشت کے ساتھ ساتھ اس شخص سے نفرت کراہیت اور گھن آنے لگی۔ وہ شخص جسے ہم کبھی باتمیز و شائستہ مہذب و مودب، شرافت و نجابت کا حامل سمجھتے تھے انتہائی بد زبان، بدکلام، بدگو، بدذات، بد دماغ اور بد مزاج، بد اخلاق اور ان سب سے بڑھ کر بدمعاش نکلا۔ اردو زبان میں جتنی خباثت ممکن تھی وہ سب کی سب ہماری شان میں استعمال کر ڈالی اور جو کم پڑ گئی تو علاقائی اور بین الاقوامی زبانوں سے بھی استفادہ کیا گندے اور بے لباس الفاظ کی ایسی جدید تکنیکی بندش کہ سننے والے کے کان سرخ ہو جائیں ہم کہ ٹھہرے پشتینی کم گو و کم سخن۔ فطرتاً حرب و ضرب۔ دھنگا مشتی دھول دھپہ کے فن سے ناواقف اور نہ ان میں استعمال ہونے والے آلات سے آگاہ۔ نوبت زبان و بیان سے دست بدست لڑائی تک پہنچ گئی وہ تو خیر گذری کہ پاس پڑوس نے دخل اندازی کی اور بیچ بچاؤ کر وا دیا ورنہ موصوف مکالمات سے مکا، لات پر اتر آتے۔ ہم میں لڑنے جھگڑنے کا حوصلہ تھا نہ تجربہ اپنا منہ لٹکائے شرم آلود چہرے لئے لشتم پشتم گھر پہنچے۔ اچھے خاصے کتابی چہرے کو "بک شیلف" میں تبدیل ہوتا دیکھ کر ہماری "لال مرچ" نے ہم سے کہا "آپ کے سوکھے ناریل جیسے چہرے پر لکھا ہوا صاف نظر آرہا ہے کہ کرایہ دار نے مکان خالی کرنے سے انکار کر دیا ہے" لہجہ وہی "مرچیانہ" جس کی دھونی لیتے ہوئے ایک عمر عزیز قہقہے لگانے کی آرزو میں کھانستے گزر گئی۔

پتہ نہیں کیوں شب عروسی جب ہم نے پہلے حجرہ عروسی میں لال رنگ کے عروسی جوڑے میں لپٹی لپٹائی اپنی اس عروسہ کو دیکھا تو بے اختیار ہمارے منہ سے نکلا تھا "لال مرچ" غالباً معجزے اسی طرح رونما ہوتے ہیں۔ جو ہماری زبان سے نکلا وہ آگے چل کر حرف بہ حرف سچ ثابت ہوا۔ شادی کے کچھ ہی عرصہ بعد سے ہم اس مشاطہ کی تلاش میں ہیں جس نے

مرچوں کے اس کھیت کو ہمارے نام ہبہ کرنے میں مرکزی کردار ادا کیا تھا۔ وہ ہمیں حبالہ عقد میں ٹانک کر نہ جانے کہاں غائب ہو گئی۔ ہمیں خاموش دیکھ کر اس شعلہ زن خو نے شعلہ بار آنکھوں سے گھورتے ہوئے کہا "اے! میں کہتی ہوں آخر کب تک یوں ہی کھڑے رہو گے۔ کچھ کرو گے بھی یا یوں ہی وقت گنوا دو گے۔ پولیس تھانہ جاؤ، کورٹ کچہری کا راستہ دیکھو۔ اور یوں کام نہ نکلے تو دو چار پہلوانوں کو بھجوا دو۔ جو کچھ بن پڑے کر ڈالو۔ مجھے لڑکی کے آنے سے پہلے مکان خالی چاہیئے"۔

"تم تو ایسے کہہ رہی ہو جیسے یہ کام ایسا ہی ہے جیسے چھت کا جالا صاف کرنا۔ پولیس تھانہ جاؤ تو سب سے پہلے رپورٹ لکھوانی پڑتی ہے اور رپورٹ مفت نہیں لکھی جاتی۔ کاغذ قلم کی قیمت اور ہیڈ محرر کا محنتانہ ادا کرنا پڑتا ہے ایک بار رپورٹ درج ہو گئی تو سمجھو کہ تم کو دوبارہ تھانے جانے کی ضرورت نہیں۔ تھانہ خود ہر روز یہاں آجایا کرے گا۔ صبح کے ناشتے سے لیکر رات کے ڈنر تک اور ڈنر کے بعد تھانیداروں کو گھر پہنچانے تک کا بار اٹھانا پڑے گا۔ اور پھر بے چارے تھانے والے یوں ہی بے کار تو نہیں بیٹھے ہیں کہ ادھر شکایت کی اور ادھر مکان خالی۔ انہیں تو سینکڑوں سیاسی، معاشی و معاشرتی مسئلے حل کرنے ہوتے ہیں۔ محلے اور بازاروں سے گزارہ الاؤنس وصول کرنا ہوتا ہے۔ چوروں اور ڈاکوؤں کو یہ بتانا ہوتا ہے کہ انہیں چوری کیا کرنی ہے اور ڈاکہ کب ڈالنا ہے۔ اغوا ہونے والوں کے متعلقین سے نان و نفقہ وصول کرنا ہوتا ہے۔ کوٹھوں اور بازاروں سے آئی ہوئی معزز خواتین کی مہمانداری کرنی ہے تو منشیات کا کاروبار کرنے والے معززین شہر کی آؤ بھگت۔ رہی کورٹ کچہری کی تو وہ کون سے "اا" ہیں۔ پیسہ کھلاتے جائیے، تاریخ بڑھتی رہے گی۔ یہ کالے کوٹوں اور سفید پتلونوں والے کونسے دل کے اچھے ہوتے ہیں۔

تن اجیارا من ہے کالا بھیس ہے تیرا بگلے جیسا
تجھ سے تو کاگا بھلا اوپر بھی کالا بھیتر بھی کالا

یہ لوگ مقدمہ جتوانے کی بازی میں گھر کی ایک ایک چیز کو داؤ پر لگوا دیتے ہیں۔
رہی بات پہلوانوں کی تو ایسا نہ ہو کہ انکی کسی حرکت سے ہم پر بلوہ اور اقدام قتل کا مقدمہ قائم ہو جائے، مکان تو وایک طرف جان بچانی مشکل ہو جائیگی"

"ارے میں خوب جانتی ہوں تمہارے حیلے بہانے دنیا میں کیا کچھ نہیں ہو رہا ہے۔ لیکن تم سے کچھ نہ ہوگا۔ اپنی بلا سے بوم بسے یا ہما رہے۔" اس HOT CHILLI SAUCE قسم کی گفتگو کو ہوئے کئی دن گزر گئے اور "لال مرچ" نے دوبارہ اس موضوع پر بات نہ کی۔ ہمارا تجسس اور اشتیاق بڑھتا جارہا تھا کہ یہ بحیرہ احمر اتنا ساکت کیوں ہے۔ طوفان کیوں نہیں اٹھتے، دھونی اور دھانس کے بادل برستے کیوں نہیں۔ ہم بذات خود اس موضوع کو چھیڑ کر بیل کو مارنے کی دعوت نہیں دینا چاہتے تھے۔ ایک دن اچانک اس نے کہا "جائیے اپنا مکان خالی ہو گیا ہے۔ چابیاں احمد بھائی کی دکان پر ہیں لیتے آئیے اور ہاں احتیاطاً گھر کے تمام تالے بھی فوراً تبدیل کروا دیں تاکہ کوئی اندیشہ نہ رہے۔"

مارے حیرت کے ہمارے منہ سے صرف اتنا نکلا "مکان خالی ہو گیا؟"۔

"جی ہاں خالی ہو گیا"۔

"وہ کیسے؟"۔

آپ کی طرح ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے تو مکان سے ہاتھ دھولیے ہوتے"

"مگر یہ معجزہ ہوا کیسے؟"

"پہلے آپ وہ کیجئے جو میں نے کہا ہے۔ تفصیل بعد میں سن لیجئے"

ہم دوڑے دوڑے گئے اور جتنا جلد ہو سکتا تھا سارا کام نپٹا کر پرانے گھر کی نئی چابیاں لئے گھر پہنچے تو "لال مرچ" کو اپنا منتظر پایا، چابیاں ان کے حوالے کیں۔

"اگر آپ واقعات بیان کرنے میں تھوڑی سی بھی دیر کئے تو سمجھئے آپ بیوہ ہو جائیں گی"

"میرے لئے کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا"۔

"مگر مجھے تو پڑے گا مرحوم ہم آپ سے محروم ہو جائینگے۔ اور سنا ہے اوپر "لال مرچ نہیں ہوتی"۔ "لال مرچ" وہ حیرانی سے ہمیں دیکھنے لگیں۔

"بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ۔ خدا کے لئے مکان خالی کرانے کا وہ طریقہ بتادو"۔

"فرمایا اس دن کی بحث و تکرار کے دوسرے ہی دن ہم نے شہر کے مختلف اخبارات میں مکان برائے فروخت کا اشتہار دیا۔ رابطہ کا پتہ بھائی جان کا دیا تھا۔ بھائی جان کو تاکید کر دی گئی تھی کہ مکان کے مول تول کی کوئی بات نہ ہو بلکہ اصرار اس بات پر ہو کہ خریدار پہلے بذات خود مکان کو خوب اچھی طرح اندر اور باہر سے دیکھ آئیں تب قیمت پر بات ہوگی۔

لہٰذا روزآنہ چند خواہش مند اصحاب مکان دیکھنے جانے لگے۔ کرایہ داروں سے تو تو میں میں ہونے لگی خریدار سمجھ گئے کہ مکان خالی کرانا مشکل ہے اور کرایہ دار سمجھ گئے کہ آرام و سکون کے سہانے دن بیت گئے۔ برے دن آنے میں دیر نہیں ہمارا مقصد بھی صرف اتنا ہی تھا کہ کرایہ دار سمجھ لیں کہ مکان کی بولی لگنے والی ہے"

ایک دن بیوٹی پارلر سے ہم نے خوب گہرا میک آپ کروایا۔ چادر اوڑھی چشمہ لگایا ایک خوب چم چم کرتی گاڑی کرایہ پر لی بھائی جان اپنے آفس سے ایک ڈرائیور کو جو حلیہ سے ڈرائیور کم ڈاکو زیادہ لگتا تھا لے آئے۔ اس نے اپنی سفید وردی پر ایک پستول نمایاں کر کے باندھ رکھ لیا۔ چھٹی کا دن تھا۔ صبح کے دس بج رہے تھے۔ شیر خان نے اطلاعی گھنٹی بجائی تو ایک لڑکا جس کی عمر ۱۲/۱۳ سال ہوگی دروازہ پر آیا۔ جیسے ہی اس کی نظر شیر خان پر پڑی اس کے چہرے پر خوف کے آثار نمایاں ہو گئے۔ میری طرف دیکھا تو کچھ حوصلہ ہوا۔ پوچھا "فرمائیے آپ کو کس سے ملنا ہے؟"

"جاؤ اپنے والد صاحب کو بولو مکان کا نیا مالک آیا ہے اور بات کرنا چاہتا ہے" خان نے بھاری رعب دار آواز میں کہا۔ تھوڑی دیر بعد ایک ایسا شخص جس کو جوانی چھوڑ رہی تھی اور بڑھاپا اپنا رہا تھا۔ اندر سے برآمد ہوا اور آتے ہی کہنے لگا "دیکھئے جناب آپ چاہے کوئی بھی ہوں مکان کسی صورت خالی نہیں ہوگا"

شیر خان آگے بڑھ کر کچھ کرنا ہی چاہتا تھا کہ میں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روکتے ہوئے کہا "نہیں شیر خان یہ شریف اور پڑھے لکھے لوگ ہیں محلے میں انہیں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ ایسے لوگوں کے ساتھ لڑائی جھگڑا دنگا فساد مناسب نہیں"۔ اس گفتگو کے دوران شیر خان مسلسل اپنی موچھوں کو تاؤ دیتا اور پستول کی پیٹی کو درست کرتا رہا۔ معلوم نہیں یہ اس شخص کی عادت تھی یا شیر خان کے وجود کا اثر کہ بار بار اس کی پتلون نیچے ہو جاتی اور وہ اسے اوپر اٹھا لیتا تھا ادھر میں نے محسوس کیا کہ دروازہ کی دونوں جانب بنی ہوئی کھڑکیوں کے پردوں کے پیچھے گھر کی جملہ خواتین جمع ہیں

میں نے اپنی آواز کو ذرا اونچا کیا اور کہا" مجید صاحب میں اس شہر کی معروف " نائیکا ہوں " لوگ مجھے میڈم حامید کہتے ہیں ۔ سرخ بتی والے ممنوعہ علاقہ کی حدود کے اندر ہم ناچنے گانے کا پیشہ کرتی ہیں ۔ یہ مکان چونکہ قدیم طرز کا بنا ہوا ہے ۔ ایسے مکانوں میں مجرا کرنے اور دیکھنے کا لطف ہی کچھ اور ہوتا ہے اسی سبب یہ مکان ہم نے خریدا ہے ہم آپ کو ایک ماہ کی مہلت دیتے ہیں کہ یہ مکان خالی کر دیں ۔ یہ آپ سے گذارش ہے ورنہ آپ جانتے ہیں ہم جیسی عورتوں کی پہنچ کہاں تک ہوتی ہے اس ڈرائیور ہی کو دیکھ لیجئے ۔ یہ ڈپٹی کمشنر صاحب کا خاص ڈرائیور ہے یس پی اور ڈی یس پی کا ہمارے ہاں آنا جانا لگا رہتا ہے ، ویسے بھی آپکا گھر بہو بیٹیوں سے بھرا ہوا ہے ۔ ہم جیسوں کا بار بار آپکے دروازے پر آنا اچھا نہیں ۔ محلے والے کچھ کا کچھ سمجھ گئے تو پھر کسی دن رات گئے آپ کے دروازے پر بھی " دستک " ہو سکتی ہے ، اچھا اب اجازت چاہونگی ۔ دو ایک روز سوچ لیجئے میں پھر آؤنگی ۔"

دو کے بجائے ہم چوتھے روز رات کو ۱۱ بجے اس طرح پہنچے کہ میرے ساتھ تین جوان لڑکیوں نے پشواز پہن رکھا تھا اور ڈھیر سارا میک اپ جوڑوں میں موتیا کے پھول سجے تھے اور ہاتھ میں کنگن ۔ لڑکوں نے تنگ پاجامہ مخملی صدری اور مخملی ٹوپی پہن رکھی تھی ایک کے ہاتھ میں سارنگی دوسرے کے طبلہ اور تیسرا ہارمونیم اٹھائے ہوئے تھا ۔ ہماری آمد کچھ اس طرح ہوئی کہ محلے کے چند دل پھینک قسم کے لڑکے بھی ہمارے ساتھ ہو لیئے ۔

بیل بجانے پر مجید صاحب ہی باہر آئے ۔ باہر کا منظر دیکھ کر ان کے ہوش اڑ گئے ۔ سکتے کا عالم ، زبان تالو سے جا لگی ۔ قبل اس کے کہ وہ کچھ بولتے میں نے کہا" مجید صاحب آج رات ہمیں سرکاری مہمان خانے کی خصوصی ضیافت میں چند مخصوص مہمانوں کے سامنے اپنے فن کا مظاہرہ کرنا ہے ادھر سے گزر رہے تھے سوچا آپ سے ملتے چلیں "۔

مجید صاحب حواس باختہ کھڑے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہے تھے ، دروازے کے پیچھے سے کسی خاتون کی آواز آئی " خدارا ۔ آپ تشریف لے جائیں مکان ہفتہ پندرہ دن میں خالی ہو جائیگا ۔ اور آپ دوبارہ تشریف نہ لائیں تو بڑی مہربانی ہوگی ۔ مکان خالی ہوتے ہی چابی ہم پاس پڑوس میں کسی کو دے جائینگے "۔

اور حسب وعدہ دس دن کے اندر اندر انہوں نے مکان خالی کر دیا"

" خیریت ہے انہوں نے تم کو پہچانا نہیں " ۔ پہچانتے کیسے " آپ نے کبھی ہم سے ان لوگوں کو ملوایا تھا "۔

ہم سوچتے رہے لال مرچ کے اس کارنامے کو کیا نام دیں ۔

▲▲

مصلح الدین سعدی

حیدرآباد (دکن) کے جانے پہچانے، شاعر، نقاد محقق اور ماہرِ اقبال ہیں ان کی ہمہ پہلو شخصیت حیدرآباد کے ادبی حلقوں کی روحِ رواں بھی رہی ہے ان کا وسیع مطالعہ، بسیط مبلغ علم بہت سے نوجوان ادیبوں اور شاعروں کے لئے خضرِ راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ پچھلے چند برسوں سے موصوف جدہ اور ریاض کے ادبی حلقوں میں مصدرِ فیوض بنے ہوئے ہیں۔ شہرت پسندی سے گریز اور گوشہ نشینی آپ کے مزاج کا خاصہ ہے۔

ادارہ

شگوفہ نامہ

ظرافت کی سوغات لایا شگوفہ
مزاحِ دکن کا ہے، تحفہ شگوفہ

دکن کیا، ہے گنگ و جمن کا سفینہ
خلیجِ عرب میں جو پہونچا شگوفہ

کہیں یوسفی کی مرقع نگاری
دلاور فگاری دل آرا شگوفہ

کہیں مجتبیٰ کے شگفتہ شتیلے *
یداللہ مہدی کے قد سا شگوفہ

یہ خامہ بگوشی، یہ لوتھر طرازی
ہے طالب نگاری کا نقشا شگوفہ

حمایت کی حاصل ہو جس کو حمایت
نہ ہو کیوں پھر اونچے سے اونچا شگوفہ

نہ ہو کیوں دماغ اس کا چوتھے فلک پر
مسیحا نفس انجم آراء شگوفہ

برابر چٹکتا چلا جارہا ہے
کمالی ہے یہ مصطفیٰ کا شگوفہ

تلفظ کے دلدل میں کیوں پھنس رہے ہو
شگوفہ کہو یا شِگوفہ، شُگوفہ

یہ زیر و زبر سے بھلا زیر ہوگا
شگوفہ بہ ہر حال ٹھہرا شگوفہ

یہ ننھا سا پودا بڑا سخت جاں ہے
ہو کیسا ہی موسم شگفتہ شگوفہ

خزاں کا نہ آیا کبھی اس پہ سایہ
نمونہ ہے فضلِ خدا کا شگوفہ

وہ جن کو نہیں مسکرانے کی فرصت
سنا ہے کہ ان کو بھی بھایا شگوفہ

شرارت ہے سعدی یہ عابد معز کی
کھلایا یہ صحرا میں اچھا شگوفہ

* مجتبیٰ حسین کے ایک معاصر نقاد نے ان کی مزاح نگاری کو شگفتہ شتیلے کہا ہے۔ اس استعارہ میں انفرادیت ہے اور معنویت بھی (م۔س)



سید عسکری حسن

مقام، حیدرآباد

تعلیم و تربیت حیدرآباد ہی میں ہوئی - ۱۹۶۲ء میں میٹرک پاس کیا اور اپنے چچا مرحوم جناب سرفراز علی مرزا کی سفارش پر (جو اس وقت مہتم تعلیمات تھے) پیشہ تدریس سے منسلک رہا۔ افسانے اور ڈرامے لکھے اور حیدرآباد ریڈیو اسٹیشن سے ۱۹۷۷ء تک بچوں کے لئے اردو پروگرام دیتا رہا۔ اور خود اپنی تعلیم بھی جاری رکھی - اس طرح اردو ادب سے عثمانیہ سے ایم - اے کرنے کا موقع ملا - ۱۹۷۷ء میں سعودی عرب آنے کا موقع ملا - ملازمت بھی بہت جلد مل گئی لیکن پیشہ ، تدریس کے ترک کرنے کا ملال آج بھی ہے -

وقت اور حالات نے اکاونٹنٹ بنادیا جس سے آج تک منسلک ہوں اور تادم تحریر ایک فرانسیسی کمپنی میں کام کر رہا ہوں - شاعری سعودی عرب ہی میں شروع کی اور بہت سی نظمیں اور غزلیں شمع دہلی اور دیگر جرائد میں شائع ہوتی رہیں - مزاحیہ رنگ میں ہمارے کرم فرما جناب شجاع صاحب کی ترغیب پر نظم لکھی ہے -

"نکو جی نکو جی اماں (دکھنی)

جب دیکھو جب لاٹے چالاں نکوجی نکوجی اماں
جج پو جج کرتے جاریں تم پن عادت ہے دیچ پرانی
ہوندے سیدھے باتاں بول کو کیوں میرا کنپا لڑکاریں
کون کسی کو یاد آتا ہے سب کہنے سننے کے باتاں
گانے کا جو شوق چرایا گھڑا لگا کو منہ کو بیٹھیں
بالاں کالے کرکو اب تم بچھڑوں میں کیوں شامل ہوریں
حسنؔ سدھر جاؤ تم اب ، آزو بازو جھانکنا چھوڑو

سٹے ہٹے ہوندے کاماں نکوجی نکوجی اماں
گالی گلوج اور جوتے لاتاں ، نکوجی نکوجی اماں
دھینگا مشتی ، دھوبی پچھاڑاں نکوجی نکوجی اماں
تیرے وعدے جیسے خاباں نکوجی نکوجی اماں
ہوما ہوم اور لمبے راگاں نکوجی نکوجی اماں
کیوں کرتیں سوتن کے باتاں نکوجی نکوجی اماں
کب تک نخرے کب تک لاڑاں ، نکوجی نکوجی اماں

بے دھڑک یوں نہ نکل جایا کرو چلمن سے
بے خبر آپ ہیں خود اپنے ہی جلوؤں سے حضور
لفظ " مسکہ " ہوا بدنام زمانے بھر میں
چاہنے والے تمہیں شمس و قمر کہتے ہیں
ہو جو خوش خلق ، ہنسے اور ہنسائے سب کو

سب کے سب آپکو اب جان جگر کہتے ہیں
چاہے محبوبہ ہو ، لیلیٰ کی طرح ہی کالی
یار لوگ اب اسے انگلش میں بٹر کہتے ہیں
عشق کے مارے اسے " رشک قمر " کہتے ہیں
ہم حقیقت میں حسنؔ اسکو بشر کہتے ہیں

محمود حیدرآبادی
(دمام)

میرا تعلق حیدرآباد کے سادات اور ادبی گھرانے سے ہے۔ دکنی زبان کے شاعر جناب علی صائب میاں مرحوم میرے پھوپی زاد بھائی تھے۔ تقریباً (۲۵) سال سے شاعری کرتا ہوں۔ ابوظہبی ریڈیو سے میرا انٹرویو اور کلام اکثر نشر ہوتا رہا۔ حیدرآباد میں کئی مرتبہ ٹی۔وی پر اپنا کلام سنا چکا ہوں۔

قطعات

رشوت ایک دستِ غیب ہے دیکھو
کیا بھیانک یہ عیب ہے دیکھو
کر رہے ہیں وصول نذرانہ
کیا مہذب فریب ہے دیکھو

○

اُلٹے سیدھے قافیئے شعروں میں کھپ جاتا کتے
شاعری کی غلطیاں گانوں میں ڈھپ جانا کتے
آج کے شاعر کے سر پہ بھوت ہے ہردم سوار
شاعری کیسی بھی ہو دیوان چھپ جاتا کتے

○

کسی کا ہاتھ ہو سر پہ تو جگ میں نام ہوتا ہے
نہیں تو اچھے سے اچھا بھی ہو گمنام ہوتا ہے
ترنم میں ردیف و قافیہ کو کون پوچھے گا
جو گاکر شعر پڑھ لے بس اُسی کا نام ہوتا ہے

○

جو شرافت سے چلے آگے کبھی بڑھتا نہیں
مار کھاتا ہے وہی جو کہ کبھی لڑتا نہیں
محفلوں میں دھوم میری اس لیے ہوتی نہیں
دوسروں کے شعر اپنے نام سے پڑھتا نہیں

صفدر حسین
(ریاض)

غزل
(پیروڈی)

غیروں پہ کرم، ہم سے ملاقات کرو ہو
کیا خوب مری جان مساوات کرو ہو

آنکھوں میں شرارت ہے نہ، باتوں میں حرارت
تم پیار کرو ہو کہ یہ خیرات کرو ہو

خود کر کے بھری بزم میں اظہارِ تمنا
تنہائی میں بے سود ہی ہیہات کرو ہو

لیلیٰ کے وہ لب ہیں نہ زلیخا کی وہ زلفیں
کس بات پہ تم فخرو مباہات کرو ہو

الفاظ کے پُرپیچ و حسین پردوں میں صفدر
تم شعر کہو ہو کہ خرافات بکو ہو

●●

انوار ابو سعد
(ریاض)



لیلۃ الکریلا

سنہ ۱۹۷۹ء کی بات ہے کہ ہم جب سعودی عرب کے دار الخلافہ شہر ریاض پہونچے تو شہر کے مشہور و معروف علاقہ "حارہ" میں وارد ہوئے۔ انہی دنوں ہمارے چند ساتھی بھی ہماری طرح تلاش معاش میں نکل آئے۔ یا یوں کہیں کہ ساتھی بن گئے، چونکہ سب کے حالات یکساں اور سبھی کے مقاصد ایک تو ساتھی بننا کوئی مشکل بات نہ تھی۔ انہی دنوں ہمارے ساتھ ایک یادگار واقعہ پیش آیا۔ قبل اس کے کہ واقعہ کی تفصیلات بیان کروں چاہتا ہوں کہ اپنے ساتھیوں کا مختصر تعارف کروادوں۔

سلیم صاحب بڑی دلچسپ شخصیت کے مالک ہونے کے ساتھ ساتھ خسرو بھائی کے ہم زلف یعنی میری زبان میں "ساڑو" ہیں۔ خسرو بھائی بڑے ہی ظریف انسان ہیں اور ریاض شہر میں ادبی محفلوں کے دلدادہ ہونے کی وجہ سے ایک بڑا دائرہ احباب رکھتے ہیں۔ انہی کے ایک دیرینہ دوست مدبر صاحب بھی ہمارے ساتھی ہیں۔ خسرو بھائی کی دوستی نے انہیں بھی ظرافت کی پڑیا چکھائی ہوئی تھی۔ تیسرے ساتھی معقول صاحب بڑے ہی خاموش انسان ہیں۔ سلیم صاحب اور مدبر صاحب خسرو بھائی کی پناہ میں، معقول صاحب اپنے کزن کی حفاظت میں اور ہم اپنے چچا بزرگوار کے سایہ عاطفت میں دن گذارنے لگے۔

ماحول کا نیا پن اور جداگانہ طرز معاشرت، ہر چیز نئی نئی، ہمیں اس ماحول سے واقفیت حاصل کرنے اور اپنے آپ کو اس میں جذب کرنے کے لئے ضروری تھا کہ جلد از جلد اطراف و جوار سے آگاہ ہو جائیں۔ اسی جستجو کی وجہ سے ہمیں حارہ کی مختصر سی تاریخ کا علم ہو گیا۔ یوں تو عربی میں حارہ کے معنے محلے کے ہوتے ہیں لیکن ہمارے حارہ (محلے) میں پاکستانی حضرات کی کثیر تعداد قیام پذیر تھی، چنانچہ اس کو حارہ پاکستانی کہا جانے لگا ورنہ یہ محلہ حارۃ الدفاع سے جانا جاتا (دفاعی اداروں کی قربت کی مناسبت سے) لیکن اس کا اصلی نام جو بلدیہ کی جانب سے دیا گیا ہے "المنتزۃ" ہے۔ اس محلے کو "وزارات" بھی کہا جاتا ہے کیونکہ یہ مختلف وزارتوں سے گھرا ہوا ہے۔ المختصر "حارہ" کے نام سے اردو دان اس گنجان علاقے کو پہچانتے ہیں۔

اتفاق سے ہم سارے ساتھی اسی "حارہ" کے مختلف گوشوں میں رہتے تھے، اور روزگار سے ابھی لگے نہیں تھے، معروفیت کوئی خاص نہ تھی، دھوپ اور گرمی کا بہانہ کافی تھا کہ اپنے اپنے گھروں میں ایر کنڈیشنر کی ٹھنڈی فضاء میں دن

گذارتے ۔ ایک شام ہم اپنی ہی غلط فہمی کا شکار ہوگئے ۔ "سورج بابو چھپ چکے اب کاہے کا ڈر" کہتے ہوئے موسم ٹھنڈا اور خوشگوار ہوگا سوچ کر سلیم صاحب اور مدبر صاحب سے ملاقات کے لئے چل پڑے ۔ موسم کا ہم کو ابھی کوئی خاص تجربہ نہیں ہوا تھا لیکن اس شام موسم ٹھنڈا ہرگز نہیں تھا تو خوشگوار کیسے ہوتا ۔ بہرحال جب سلیم صاحب کے ہاں پہونچے تو علیک سلیک اور سلام دعا کے بعد طئے پایا کہ معقول صاحب کے حال احوال معلوم کریں ۔ مدبر صاحب نے بھی حامی بھری ۔ چنانچہ معقول صاحب کے گھر کی طرف روانہ ہوئے ۔

یہاں سے سعودی عرب میں ہمارے تجربوں کی پہلی کڑی کی ابتداء ہوئی ۔ ہمارا یہ تجربہ یوں تو قارئین حضرات کے لئے دلچسپی کا باعث ہوگا لیکن ہمارے لئے یہ ایک یادگار واقعہ ہے ۔ معقول صاحب کا مکان زیادہ دور تو نہ تھا لیکن حارہ کے بیچوں بیچ ایک طویل اور معروف ترین گلی سے گذرنا پڑتا تھا ۔ آج کل اس گلی کا نام اپنے نگریوں نے "غیبت گلی" رکھ چھوڑا ہے ۔ اس گلی کی خاص خوبی یہ ہے کہ یہاں حیدرآبادیوں کے ساتھ ساتھ حیدرآباد کی ہر چیز دستیاب ہوجاتی ہے ، حتیٰ کہ اگر حیدرآباد میں کسی دوست کی خیر خیریت نہ مل رہی ہو تو اس گلی کا ایک چکر لگالیں تو ممکن ہے وہ دوست بہ نفس نفیس یہاں مل جائے ۔ اس بیچاری گلی کا نام بھی مناسب طور پر رکھا گیا ہے ۔ ہمارے نوجوان چھوٹے چھوٹے گروہوں کی شکل میں کھڑے خوش گپیاں ہانکتے رہتے ہیں ، خوش گپیاں تو صرف خوش فہم حضرات کا اعتقاد ہے لیکن ان خوش گپیوں میں کانا پھوسی کا عنصر غالب نظر آتا ہے ۔

خیر جناب اس غیبت گلی (جو کہ سنہ ۱۹۷۹ء میں اتنی منور اور پررونق نہیں ہوا کرتی تھی) سے گذر رہے تھے کہ ایک فارغ دل دوست اخلاص صاحب پر ہماری نظر پڑی ۔ یہ صاحب ایک بقالے یعنی دوکان سے نمودار ہو رہے تھے ۔ اخلاص صاحب ہماری طرف لپکے اور حال چال پوچھنے لگے ۔ ان کے ہات میں ایک چھوٹا پیکٹ تھا جس سے نکال کر وہ نمکین بادام و کاجو کھا رہے تھے ۔ فراغ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہماری جانب پیکٹ بڑھادیا ۔ ہم ابھی اپنا ہاتھ آگے کر ہی رہے تھے کہ ایک شناسا آواز میں سلام کی صدا آئی ، مڑکر دیکھا تو لطیف صاحب تھے ۔ اخلاص صاحب نے ان کی جانب بھی بادام کاجو بڑھادئے لیکن لطیف صاحب نے معذرت خواہانہ نظروں سے شکریہ ادا کرتے ہوئے انکار کردیا ۔ اخلاص صاحب نے کہا "بھئی تکلف نہ کریں چند ایک دانے کھالیں " لطیف صاحب نے فوراً کہا کہ نہیں بھئی میں نے ابھی چائے پی ہے اس لئے بادام یا کاجو نہیں کھاسکوں گا ۔ یہ بات کچھ عجیب لگی ۔ اخلاص صاحب نے بیچینی سے دریافت کیا کہ اس میں کیا حکمت ہوسکتی ہے ۔ لطیف صاحب نے بڑی سادگی سے وضاحت کی کہ چائے پینے کے بعد چار گھنٹے تک کوئی ثقیل چیز نہیں کھانی چاہیئے ورنہ بواسیر ہونے کا خطرہ ہوجاتا ہے ۔ اس بات پر اخلاص صاحب نے معصومیت سے بے ساختہ کہا کہ "بواسیر ہوجائے تو "مالش" اب چلیں کھا بھی لیں" ۔ یہ فقرہ سن کر لطیف صاحب کاجو بادام پر نظر ڈالنا درکنار سب سے اجازت لی اور چلتے بنے ۔ لیکن اخلاص صاحب کی یہ بات کہ "بواسیر ہوجائے تو مالش" ہمارے ذہنوں میں دھمکتی رہی اور سوچتے ہوئے آگے بڑھے کہ بواسیر کا علاج مالش کب سے ہوگیا؟ ہم پر یہ راز بعد میں فاش ہوا کہ عربی میں "مالش" کا مطلب "کوئی بات نہیں" یا Never Mind ہوتا ہے ۔ اس لفظ کو عرب اور عجم دونوں بلکہ انگریز بھی یہاں بہ کثرت استعمال کرتے ہیں ۔

بالآخر تینوں ساتھیوں نے معقول صاحب کے گھر پہنچ کر دستک دی ۔ کوئی جواب نہ ملا ۔ دو تین بار دستک دینے

کے بعد ہم نے دروازے کو آہستہ سے دھکیلا۔ دروازہ جیسے خوش آمدید کہتا ہوا کھل گیا۔ ہم اندر داخل ہوئے۔ معقول صاحب اپنے کمرے میں بند شائد مطالعہ میں مصروف تھے۔ ممکن ہے ایر کنڈیشنر کی آواز میں ہماری آہٹ بھی سن نہ پائے۔ معقول صاحب کی اس غفلت نے ہمیں شرارت پر اکسایا۔ ہم لوگوں نے برابر والے کمرے میں داخل ہوکر اندر سے دروازہ بند کرلیا۔ اب معقول صاحب کو پریشان کرنا ہمارا مقصد بن گیا۔ ہم لوگوں نے سامان کو ادھر ادھر کرنا شروع کردیا، ساتھ میں اونچی آوازیں بھی نکالنے لگے۔ اس پر معقول صاحب بلند آواز میں دریافت کرنے لگے کہ کون ہے، دروازے تک بھی چکر لگاکر دیکھ لیا لیکن ہم تینوں پر شرارت کی دیوی حاوی ہوچکی تھی اور ادھر معقول صاحب پر خوف و حیرانی کی۔ چند ثانیوں بعد وہ "حرامی، حرامی" (چور چور) چلاتے ہوئے اپنے فلیٹ سے باہر نکل گئے۔ ان کا اندازہ تھا کہ چند بدنیت لوگ خطرناک ارادوں کے ساتھ گھر میں گھس آئے ہیں۔ ہم موقع کو غنیمت جان کر باہر نکلے اور معقول صاحب کے کمرے میں داخل ہوگئے۔

تھوڑی دیر بعد معقول صاحب اوپری منزل سے اپنے مالک مکان کو بلالائے۔ مالک مکان پولس کی وردی پہنے ہاتھ میں ریوالور لئے (غالباً ابھی ڈیوٹی سے لوٹا تھا) معقول صاحب کے ساتھ سیدھے اس کمرے میں گیا جہاں کچھ دیر پہلے شرارت کا ڈرامہ چل رہا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ اس کی نظر ہم پر نہ پڑی۔ باوردی پستول بردار پولس والے کو دیکھ کر ہمارے طوطے تو کیا کراماً کاتبین بھی اڑ چکے تھے۔ اب وہ دونوں معقول صاحب کے کمرے میں آگئے۔ ہم نے سادگی سے اس انداز میں سلام کیا کہ جیسے ہمیں کچھ معلوم ہی نہیں۔ مالک مکان نما پولس والے کو کیا پتہ کہ ہم لوگ کون ہیں لیکن اسی لمحے معقول صاحب کے سوال "ارے آپ لوگ کب تشریف لے آئے؟" نے ہماری سانس کو سانس سے جوڑا اور ہماری جان میں جان آئی۔ ہم نے کوئی تاثر دئے بغیر اپنے آپ کو سنبھالا اور جواب دیا کہ ابھی ابھی آئے ہیں اور دروازہ کھلا پاکر اندر آکر آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ ہماری رسمی گفتگو گو کہ پولس والے کی سمجھ سے باہر تھی لیکن اس کو اطمینان ہوگیا تھا کہ "حرامی" ہم نہیں کوئی اور تھے اور اس وقت تک فرار ہوچکے تھے۔ ویسے اس خطرناک مالک مکان کی آنکھوں سے شک ضرور جھانک رہا تھا۔

معقول صاحب کا مددگار (لیکن ہمارے لئے عدوت) ایک انجان زبان (عربی) میں احتیاط کے متعلق ضروری ہدایات دیتا ہوا معقول صاحب اور ہم سب کو مع السلامہ (خدا حافظ) کہہ کر چلا گیا۔ اس کے ساتھ ہمارا شرارتی نشہ بھی رفو چکر ہوگیا۔

اس واقعہ کو اتنے برس ہوگئے لیکن ہم تینوں میں سے کسی نے بھی معقول صاحب کو معلوم نہ ہونے دیا کہ اصل حرامی کون تھے۔ (عربی زبان میں عام بول چال میں "حرامی" کا لفظ چور کے لئے استعمال ہوتا ہے)۔ اب اگر معقول صاحب کے دماغی کمپیوٹر کی میموری میں اس واقعہ کو لوڈ Load کیا جائے تو یہ جرات صرف اور صرف "شگوفہ سعودی عرب نمبر" کی ہوگی۔

عربی کا ایک مقولہ ہے "یوم عسل یوم بصل" یعنی کوئی دن شہد تو کوئی دن پیاز۔ خیر اس دن کا تو ہمیں اندازہ نہیں کہ آیا وہ دن شہد والا تھا کہ پیاز والا لیکن وہ رات کریلے کی طرح کڑوی ضرور گذری۔ ہمارے علم میں نہیں کہ کریلے کو عربی زبان میں کیا کہتے ہیں لیکن اس رات کو ہم نے اپنی زندگی کی "لیلتہ الکریلا" سے منسوب کرلیا ہے۔



...یدرآبادی

نام محمد شریف، تخلص شاہد، پیدائش حیدرآباد دکن، والد کا نام جناب حاجی شیخ حسین صاحب۔ والد انجینئر ہیں۔ ملازمت کے سلسلے ...ائچور کرناٹک اسٹیٹ میں مقیم رہے۔

میری ابتدائی تعلیم ضلع رائچور کے کانونٹ اسکول میں ہوئی، بی ایس سی (کیمیا) اور بی اے انگلش، کرناٹک یونیورسٹی دھارواڑ پھر فارسی کی ڈگری حاصل کی، اب کافی عرصے سے منسٹری آف ہیلتھ سعودی عربیہ میں فارمسٹ کی حیثیت سے ملازم ہوں۔ اہلیہ کا ہے جو منسٹری آف ہیلتھ، سعودی عربیہ میں ڈاکٹر ہیں۔

اسکول کے زمانے سے ادب سے بہت لگاؤ رہا ہے۔ کالج کے زمانے سے ہی انگلش کے ممتاز اخبار ٹائمز آف انڈیا سے سعودی عربیہ ...تک (۱۹۸۳ء) وابستہ رہا۔ کالج کے زمانے سے ہی سیاسی، سوشیل و کلچرل حلقوں میں بہت سرگرم رکن رہا۔ اپنے اسکول و کالج کا ...ملیٹ و اسپورٹس مین رہا ہوں۔

ضلع رائچور میں کانگریس پارٹی کا یوتھ پریسڈنٹ اور الامین آرگنائیزیشن کا سکریٹری رہ چکا ہوں۔ اس دوران رائچور میں کئی ...لولوں کی داغ بیل بھی ڈالی ہے۔

...لج کی تعلیم مکمل کرنے تک کالج ہاکی ٹیم کا کپتان تھا، کرناٹک اسٹیٹ میں کئی ہاکی اور بیڈمنٹن ٹورنمنٹ آرگنائیز کئے۔ کئی ...میں ممتاز ہاکی کھلاڑی کی حیثیت سے حصہ لے چکا ہوں۔

کالج کا کلچرل و اردو سکریٹری رہ چکا ہوں، اس دوران کئی مشاعرے منعقد کرائے اور انگلش و اردو ڈراموں میں حصہ لیا۔ شاعری ...نگلش میں ایک نظم سے ہوئی جو کالج میگزین میں چھپی تھی۔ اب سعودی عربیہ میں اردو کی خدمت کر رہا ہوں۔ بزم اردو الباحہ، ...بیہ کا سکریٹری ہوں۔ کئی مشاعرے اس بزم کے تحت کرواتا ہوں۔ مشاعرہ میں نظامت کے فرائض بھی انجام دیتا ہوں۔

زن ایک آئی تھی چیک اپنا کیش کروانے
وہ چیک تھا بھیگا ہوا اور سیاہی پھیلی ہوئی
کہا کلرک نے یہ چیک گیلا گیلا کیوں
تو بولی جب بھی وہ خط میرے نام لکھتے ہیں
تو ان کی آنکھوں سے اشکوں کی دھار بہتی ہے

(انگریزی سے ماخوذ)

نام: سعدیہ
ولدیت: محمد شجاع الدین خان غوری
تعلیم: اعلیٰ ثانوی

ذاتی دلچسپی کے بے شمار مشاغل، جسے عرف عام میں "ہابی" کہا جاتا ہے لوگ اختیار کرتے ہیں۔ میں نے دلچسپ لطائف، مزاحیہ اشعار اور طنز و مزاح کے ایسے اقتباسات جو پر لطف بھی ہوں اور نصیحت آموز بھی جمع کرنے کے شوق کو ہابی کے طور پر اپنایا ہے۔

اکتوبر ۱۹۹۱ء میں سعودی عرب آنے کے بعد میرا تعارف بہن "شگوفہ" سے ہوا تو اس کی خوش ذائقہ، خوش بیانی و خوش اسلوبی دیکھ کر میں بھی اس کی خوش گپیوں میں شامل ہو گئی تاکہ شگوفہ کے چاہنے والوں کی شگفتگی میں کسی قدر اضافہ ہو۔

کاک ٹیل

انتخاب از ==== سعدیہ غوری
ریاض

کونسل کی ممبری نہیں چاہتا۔ قوم کی لیڈری نہیں مانگتا۔ موٹر اور شملہ کی کسی کوٹھی کی تمنا نہیں۔ میں خدا سے اور اگر وہ سرے میں دینے کی قدرت ہو، تو اس سے بھی صرف ایک "ڈکار" طلب کرتا ہوں۔ چاہتا یہ ہوں کہ اپنے طوفانی پیٹ کے بادلوں کو حلق میں بلاؤں اور پوری گرج کے ساتھ باہر برساؤں یعنی کڑاکے دار ڈکار لوں۔ پر کیا کروں۔ یہ نئے فیشن والے مجھ کو زور سے ڈکار ہی لینے نہیں دیتے کہتے ہیں۔ "ڈکار آنے لگے تو ہونٹوں کو بھینچ لو اور ناک کے نتھنوں سے اسے چپ چاپ اڑا دو۔ آواز سے ڈکار لینا بڑی بے تمیزی ہے"۔

لوگو! میں نے بہت کوشش کی کہ چپکے سے ڈکار لینے کی عادت ہو جائے۔ ایک دن سوڈا واٹر پی کر اس بھونچال ڈکار کو ناک سے نکالنا بھی چاہتا تھا مگر کم بخت دماغ میں الجھ کر رہ گئی۔ آنکھوں سے پانی نکلنے لگا اور بڑی دیر تک کچھ سانس رکا رکا سا رہا۔ ذرا انصاف تو کرو۔ میرے آبا ڈکار زور سے لیتے تھے۔ میری اماں کو بھی یہی عادت تھی میں نے نئی دنیا کی ہم نشینی سے پہلے ہمیشہ زور ہی سے ڈکار لی۔ اب اس عادت کو کیوں کر بدلوں۔ ڈکار آتی ہے تو آنکھیں مچکا مچکا کر زور لگاتا ہوں کہ موذی ناک میں آجائے مگر ایسی بد ذات ہے نہیں مانتی، حلق کو کھرچتی ہوئی منہ میں گھس آتی ہے اور ڈنکا بجا کر باہر نکلتی ہے۔

ہائے میں پچھلے زمانے میں کیوں نہ پیدا ہوا۔ خوب بے فکری سے ڈکاریں لیتا۔ ایسے وقت میں جنم ہوا ہے کہ بات بات پر فیشن کی مہر لگی ہوئی ہے۔

(خواجہ حسن نظامی ــــــ "پیاری ڈکار")

****

اک روایت یہ بھی ہے لیلیٰ سے گھبراتا تھا قیس
منزلِ شادی سے گھبرا کر گزر جاتا تھا قیس

اک روایت یہ بھی ہے وہ بیاہ کے قابل نہ تھا
ورنہ لیلیٰ کو بھگا لینا کوئی مشکل نہ تھا

ک روایت یہ بھی ہے لیلیٰ کی ماں تھی بدچلن
ہ تو بننا چاہتی تھی خود بھی مجنوں کی دلہن

۔۔۔دلاور فگار، لیلیٰ مجنوں کی شادی"
ماخوذ۔۔۔"فی سبیل اللہ"

****

میں ان دنوں پٹیالہ میں نویں جماعت میں پڑھتا تھا، تو ایک رنگیں مزاج استاد سکھن لال نامی مجھے پڑھایا کرتے تھے۔ یہ استاد صاحب افیمی تھے اور باری باری لڑکوں سے افیم کی چسکی لیا کرتے تھے۔ ہر لڑکا اپنی باری آنے پر دو آنے کی فیم لا دیتا تھا ایک دن سکھن لال صاحب افیم کی چسکی لے کر عجیب ترنگ میں آئے فرمانے لگے، دیکھو لڑکو ایک مصرع لتا ہوں جو لڑکا دوسرا مصرع کہہ کر شعر پورا کرے گا اسے ایک چسکی معاف ہوگی۔ مصرع یہ تھا

واہ رے بے نظیر سکھن لالہ کیا زباں میں تیری طاقت ہے

۔ کے خاموش تھے، اچانک میرے منہ سے نکلا

لٹیاں بھی ہیں تیری لمبی سی ٹنگڑیوں میں بھی تری طاقت ہے
تو تو ہوتا کہیں کا چپراسی یاں پڑھانا تری حماقت ہے

رہ دبے دبے قہقہوں سے گونج اٹھا۔ سکھن لال زندہ دل آدمی تھا اس کے مصرعے کے جواب میں دو مصرعے حاضر تھے ش ہوا اور بولا ظفر علی کسی روز بڑا شاعر بنے گا۔

(مولانا ظفر علی خان)

****

سانولا چہرہ زلف کالی ہے ہونٹ پر بے پناہ لالی ہے
ہاتھ میں پاؤڈر کی تھالی ہے سو طرح رخ کی گوش مالی ہے
سرخ لب رخ کا رنگ گہرا ہے
الٹی بلبل کے مثل چہرا ہے

محمد یوسف پاپا" دیوار قہقہہ"

****

دو آدمی ایک کمرے میں بحث کر رہے تھے۔ بحث اتنی بڑھی کہ نوبت مار پیٹ تک پہنچ گئی۔ ایک نے دوسرے کو کارا باہر آؤ، وہاں تم سے نبٹوں گا۔ باہر آئے تو ایک مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا۔ دونوں عینکیں لگاتے ہوئے تھے جن کے ٹوٹ نے کا اندیشہ تھا۔ آخر طے پایا کہ یہ اتار دی جائیں۔ دونوں نے اپنا اپنا چشمہ اتارا اور لڑائی شروع ہو گئی۔ پڑھے لکھے گوں کی لڑائی تھی۔ دونوں نے مکے تان لئے اور ایک دوسرے کو خونخوار نظروں سے دیکھا پھر مکوں کی بارش ہونے لگی

مگر کسی کا گھونسا دوسرے پر نہیں پڑ رہا تھا۔ در حقیقت دونوں کی نظر اس قدر کم زور تھی کہ وہ صحیح نشانہ لے کر وار کر نہیں سکتے تھے۔ خاصی دیر مکا بازی ہوتی رہی۔ بالآخر ایک کے گھونسا لگ ہی گیا۔ وہ بڑے غصے سے دیکھنے والوں جانب مڑا اور چلا کر بولا! "لڑائی آپس کی ہے تماش بین اس میں حصہ نہیں لے سکتے"۔

ماخوذ۔ شگوفہ زار ۔۔۔ خواجہ عبدالہ

****

یارب تو مری سن لے یہ کہتا ہے سکندر — ضاحک کے اڑا دیوے کسی بن میں قلندر
گھر اس کے تولد ہوا اگر بچہ ۔ بندر — گلیوں میں نچاتا پھرے وہ شہر کے اندر
روٹی تو کما کھاوے کسی طرح مچھندر

****

قاضی فرازؔ احمد

الکبیر

شہرِ عرب میں گونجی صدا ہائے الکبیر — عالم تمام ہوگا شناسائے الکبیر
کام و دہن سے کام ہو حسنِ ثواب کا — کھانے کے بعد ہوں جو نوا ہائے الکبیر
کبر و غرور کیسے پسند آدمی کرے — جھک جائے کر کے جب وہ ثنا ہائے الکبیر
اِک خوانِ الکبیر طعامِ لذیذ کا — حکمِ خدا ہو جلوہ نما ہائے الکبیر
ذاتِ خدا کبیر ہے عالی مقام ہے
ہو جائیں سب فرازؔ شناسائے الکبیر

محمد اسلم[لہ]

چشم و چراغِ ہند ہیں اسلم سے بے نظیر — جن کی محبتوں میں ہوئے آپ ہم اسیر

لہ محمد اسلم ریاض برانچ کے جنرل مینیجر ہیں۔

جناب منیر پرویز
مہمان مدیر

پھر ملیں گے اگر خدا لایا ۔ (اداریہ)

اکتوبر کے مہینے میں مدیر شگوفہ سعودی عرب کے دورے پر آ رہے ہیں شگوفہ کے ایڈیٹر اوور سیز اور دوسرے مخلصین و قارئینِ شگوفہ ڈاکٹر مصطفےٰ کمال کو خوش آمدید کہتے ہیں۔

اکتوبر کا شمارہ سعودی عرب نمبر کے طور پر آپ کے ہاتھوں میں ہے اس نمبر کی اشاعت کی تحریک العطاوی پبلیشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز سے سعودی عرب میں شگوفہ کی نکاسی کے تسلسل کے طور پر ہوئی العطاوی کے مارکٹنگ منیجر جناب سید مسعود نے سعودی عرب میں شگوفہ کو عام کرنے کے لئے خاص طور سے دست تعاون دراز کیا ہے۔ مدیر شگوفہ کا ویزٹ ویزا بھی موصوف کی مساعی کا نتیجہ ہے، جس کے لئے ہم انکے بیحد ممنون ہیں مدیر شگوفہ کے دورۂ سعودی عرب کا پروگرام طئے ہوا تو یہ بھی خیال آیا کہ کیوں نہ اکتوبر کا ایک خصوصی شمارہ سوغات کے طور پر نکالا جائے، جسمیں صرف سعودی عرب میں مقیم ادیبوں اور شاعروں کی نگارشات شامل ہوں۔ یہ فیصلہ اگست کے آخری ہفتے میں ہوا وقت کم تھا لیکن آج کے تیز رفتار ترسیل کے دور میں یہ کام ناممکن بھی نہ تھا۔ تاہم وقت کی تنگی کے باعث ہر مرحلہ پر دقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔

شگوفہ کی یہ روایت رہی ہے کہ خاص نمبروں کے لیئے کسی معروف شخصیت کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں چنانچہ "سعودی نمبر" کی مہمان ادارت کے لئے شہر ریاض کی مشہور و معروف شخصیت بینکر اور شاعر جناب منیر پرویز کو دعوت دی گئی جنہوں نے ہماری درخواست قبول کر لی۔ انکی ادارت کا ثمر آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

ہم نے مزاحیہ ادیبوں اور شاعروں سے تعاون کی درخواست کی تھی سعودی عرب میں چند مشہور مزاح نگار رہتے ہیں جن میں نسیم سحر، اقبال شانہ، احمد راجہ، مرزا سلطان بیگ، سید یونس اعجاز، ناظر قدوائی، والد بشیر مرزا، نگار لکھنوی، سلیم مقصود اور ایڈیٹر اوور سیز شامل ہیں۔ ہم نے سنجیدہ ادیبوں اور شاعروں کو مائل کیا کہ وہ طنز و مزاح بھی لکھیں۔ ہمیں خوشی ہے کہ ہماری درخواست 'صدا بصحرا' ثابت نہیں ہوئی۔ ہم ان تمام تخلیق کاروں کے ممنون ہیں، ہم انھیں مزاح کے کاروان میں شامل ہونے پر مبارکباد دیتے ہیں۔

ہمیں خوشی ہے کہ ہمیشہ کی طرح شجاع الدین غوری صاحب کا دستِ تعاون حاصل رہا۔ شجاع صاحب کی انتھک محنت اور انکے مشوروں کے لئے ہم سراپا سپاس ہیں۔ شجاع صاحب کی مدد کے بغیر سعودی نمبر کی اشاعت ممکن نہ تھی۔

دیرینہ دوست اور ہمدرد جناب مصلح الدین سعدی نے اہل جدہ سے بعد اصرار تخلیقات حاصل کرنے میں خصوصی تعاون کیا۔ ہم انکے بھی ممنون ہیں۔ ریاض کے رئیس احمد، محمد اکرم علیم اختر اور عبدالرحمن سلیم صاحبان اور دمام کے علیم قریشی اور عاصم صدیقی صاحبان کا بھی بہ صمیم قلب شکریہ ادا کرتے ہیں جنہوں نے سعودی نمبر کی اشاعت میں حسب مقدور حصہ لیا۔

ہم اُن حضرات کے بھی شکر گذار ہیں جنہوں نے اشتہارات کے ذریعہ اس خصوصی شمارہ کی صورت گری کو ممکن بنایا۔ اس خصوص میں ابوالفاروق عبدالحمید، محمد اسلم، محمد عارف پولانی اور شوکت نعیم صاحبان کا ذکر ضروری ہے۔

ہمیں اس بات کا بے حد افسوس ہے کہ بعض تخلیقات تاخیر سے وصول ہونے پر اس خصوصی شمارے میں شامل نہ ہوسکیں۔ اُمید ہے کہ شگوفہ کے اس منفرد نوعیت کے شمارے کو پسند کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

ریاض ۲۹ ستمبر ۱۹۹۲ء

عابد معز
(ایڈیٹر اوور سیز)

نیک تمنّاؤں کے ساتھ

شوکت نعیم
و
فرزندان
شیراز نعیم اور وسیم نعیم

(ریاض)

آندھراپردیش ریاستی اقلیتی فینانس کارپوریشن

4-1-825/B ، سکنڈ فلور، لکشمی اسٹیٹ، عابڈز، حیدرآباد - ۱

حکومت آندھراپردیش کی جانب سے چلنے والا ادارہ جہاں ریاست سے تعلق رکھنے والے اقلیتی افراد، مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی، جین، بدھسٹ کو قرضہ جات کی فراہمی کی جاتی ہے۔ یہ قرضہ جات (۲) اسکیموں کے تحت دیئے جاتے ہیں۔

(۱) غربت ہٹاؤ اسکیم　　　(۲) خود روزگار اسکیم

(۱) غربت ہٹاؤ اسکیم: اس اسکیم کے تحت 10,000 ہزار روپے کی جملہ لاگت کے کاروبار کیلئے، جیسے کرانہ اسٹور، سیکل ٹیکسی، بک بائینڈنگ، ترکاری فروشی، اگربتی تیار کرنے کیلئے، میوہ فروشی وغیرہ وغیرہ کے لئے قرضہ جات دیئے جاتے ہیں۔ اس جملہ لاگت کا ۲۵ فی صد کارپوریشن سے دیا جاتا ہے اور اس کو (۴) آسان ماہانہ اقساط میں بہ شرح ۴٪ کے ساتھ ادا کرنا پڑتا ہے اور ماباقی بنک کے ذریعہ دلایا جاتا ہے اور اس اسکیم میں درخواست گزار کی سالانہ آمدنی 6,000 روپے سے کم ہونی چاہیئے۔

(۲) خود روزگار اسکیم: اس اسکیم کے تحت 2,00,000 لاکھ روپے کی جملہ لاگت کے کاروبار کے لیے جیسے چھوٹی صنعتیں، کسی بھی قسم کی تجارت، پرنٹنگ پریس، میڈیکل شاپ، زیراکس مشین کے لئے، آٹو رکشا، آٹو ٹرالی وغیرہ وغیرہ کے لیے قرضہ جات دیئے جاتے ہیں۔ اس جملہ لاگت کا (۲۰) فی صد کارپوریشن کی جانب سے بطور "مارجن منی" شرح سود ½ ۶ فی صد پر دیا جاتا ہے اور باقی رقم بنک سے دلائی جاتی ہے۔

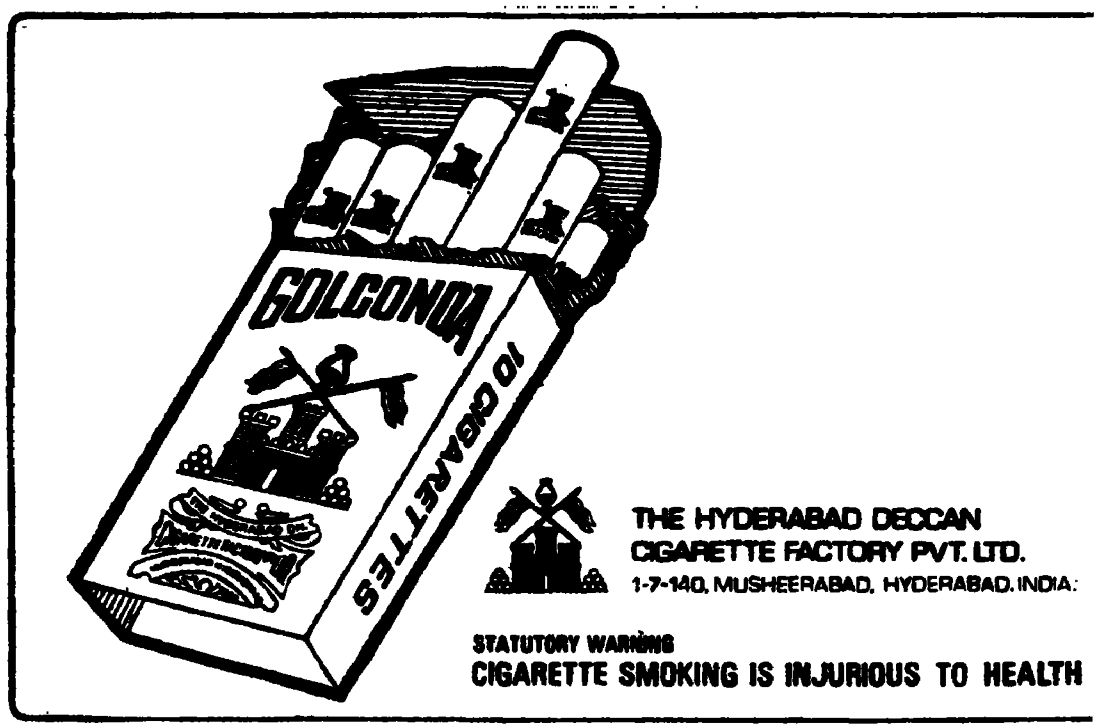
● یہ کارپوریشن تمام ریاست میں اب تک 41,890 افراد میں 6,98,59,000 روپے مارجن منی جاری کرچکا ہے۔ جس کی جملہ لاگت 29,51,64,000 روپے ہے۔

خواہشمند افراد مندرجۂ بالا پتہ پر رجوع ہوں۔

محمد لائق علی خاں
مینجنگ ڈائرکٹر



قرۃ العین حیدر کا ناولٹ — "چائے کے باغ"
اردو ادب میں کلاسک کا درجہ رکھتا ہے — اور
چائے کے باغوں سے ہماری منتخب کردہ چائے
ھائی ویا چائے
سرور اور لذت میں حرفِ آخر سمجھی جاتی ہے
ملنے کے صرف دو مقام


GOLCONDA
10 CIGARETTES
THE HYDERABAD DECCAN
CIGARETTE FACTORY PVT. LTD.
1-7-140, MUSHEERABAD, HYDERABAD, INDIA.
STATUTORY WARNING
CIGARETTE SMOKING IS INJURIOUS TO HEALTH

ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

مجلس ادارت:

ڈاکٹر عابد معز

اوورسیز کمیٹی:

سعید شوکت

ایس۔ ایم

غلام

محمد حمایت

صلاح الدین نیر

طالب خوندمیری

طابع و ناشر: طالب خوندمیری

پریس چھتہ بازار حیدرآباد

اِس تھیلی کے چٹّے بٹّے

(فہرست)

مالِ مفت (انشائیے)

بال کی کھال (تبصرہ)

چورن (منظومات)

یادِ رفتگاں

"شگوفہ" کا

آئندہ شمارہ

ممتاز مزاح نگار رشید قریشی

کے لیے وقف ہوگا۔

جناب رشید قریشی کی شخصیت وفن کا جائزہ
اور منتخب مضامین۔

قیمت ۶ روپے

ماہنامہ شگوفہ کا

سالنامہ

جنوری ۹۳ء کے دوسرے ہفتے میں شائع ہوگا۔

★ ملک کے تمام نامور مزاح نگاروں کی تخلیقات
★ آفسیٹ پر تصاویر
★ کارٹون، لطائف اور دیگر دلچسپیاں۔

سر

طالب خوندمیری

(سرورق کی نظم)

جسے کہتے ہیں سر ملکِ بدن کی راجدھانی ہے
جو اس خطۂ انساں پہ اسی کی حکمرانی ہے
کبھی پندار سا ہے اس میں، کبھی اس میں روانی ہے
اسی سے سرخوشی ہے، سرکشی ہے، سرگرانی ہے

اسی سر کی حدوں میں چشمۂ ادراک بہتا ہے
مگر کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہ خالی بھی رہتا ہے

کوئی سر بیضوی ہوتا ہے، کوئی گول ہوتا ہے
کسی کا سر بظاہر خوبصورت خول ہوتا ہے
کسی سر کی بناوٹ میں ذرا سا جھول ہوتا ہے
مگر کوئی بہت موزوں، بڑا انمول ہوتا ہے

کروڑوں میں کبھی کچھ سر نکلتے ہیں بڑے جید
یہی سر ہیں سی وی رامن اور سر اقبال و سر سید

کسی سر پر گھنے جنگل کی افزائش بھی ہوتی ہے
کسی پہ چار چھ بالوں کی پیدائش بھی ہوتی ہے
کسی سر کی کبھی جوڑے سے آرائش بھی ہوتی ہے
کبھی تو اس میں بنجر پن کی گنجائش بھی ہوتی ہے

کچھ ایسے سر بھی ہوتے ہیں جو کنگھیوں کو ترستے ہیں
کچھ ایسے بھی ہیں جن پہ رات دن اولے برستے ہیں

کبھی سر سے کھلونے کی طرح کھیلا بھی جاتا ہے
لغت میں تو لکھا ہے سر پہ جوتا بھی چلاتا ہے
یہ کہتے تھے کہ [illegible] بھی جاتا ہے
کہو تو یہ بھی کہتا ہوں کہ سر کھایا بھی جاتا ہے

کسی کو ضد ہے اپنا سر ہتھیلی پر سجانے کی
کسی کو فکر سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگ جانے کی

اسی سر میں کبھی تحقیق کا سودا سماتا ہے
کبھی اس کی رگوں کو فلسفہ بھی گدگداتا ہے
کبھی اس پر کسی مرحوم کا بھی بھوت آتا ہے
کبھی تو لوگ کہتے ہیں کہ یہ بھی گھاس کھاتا ہے

اسی سر کا کبھی ہر چیز پر کنٹرول ہوتا ہے
کبھی اس کی وجہ سے آدمی بغلول ہوتا ہے

کبھی اس کو جنونِ وصل کا آزار ہوتا ہے
جراثیمِ تعصب سے بھی یہ بیمار ہوتا ہے
پراگندہ خیالوں کا بھی اس پر بار ہوتا ہے
کبھی اس پر حماقت کا بڑا انبار ہوتا ہے

یہی وہ بوجھ ہے جس سے یہ عاری بھی نہیں ہوتا
مگر یہ پاؤں کی مانند بھاری بھی نہیں ہوتا

کوئی سر بے سبب دانشوری کا بوجھ ڈھوتا ہے
کوئی اپنی نسوں میں عاشقی کے بیج بوتا ہے
کوئی بیگانۂ ہنگامۂ ہستی بھی ہوتا ہے
کوئی تو عمر بھر کاندھوں پہ گہری نیند سوتا ہے

یہ غفلت کس لیے ہے کچھ اجاگر بھی نہیں ہوتا
یہ اپنے جسم پر موجود ہو کر بھی نہیں ہوتا

محبت کارفرما ہے اسی سر کے اشاروں پر
اثر انداز ہوتا ہے یہی انساں کے جذبوں پر
اسی سر کی بدولت دل بھی آتا ہے حسینوں پر
اسی سے نشتر ہوتے ہیں سہانے خواب آنکھوں پر

یہ جب تک آن ہے دنیا بڑی شاداب ہوتی ہے
اگر یہ آف ہو تو زندگی خود خواب ہوتی ہے

وجاہت علی سندیلوی

تکلّف سے بے تکلّفی تک

لندن ہو پیرس، بغداد ہو یا اصفہان، دہلی ہو یا لکھنؤ انسانوں ہی کی طرح مختلف شہروں کے منفرد صفات و خصائل بلکہ اپنا ایک مزاج بھی ہوا کرتا ہے۔ ایک ہی نوعیت کا واقعہ مختلف شہروں میں جداگانہ ردعمل پیدا کرتا ہے۔ کہیں 'بند' کا اعلان ہو جاتا ہے کہیں جلوس نکالا جاتا ہے۔ کہیں احتجاجی جلسہ ہوتا ہے اور کہیں مشاعرہ ہونے لگتا ہے۔ رفتہ رفتہ اسی مزاج کی بنا پر کوئی مخصوص اور منفرد خصوصیت کسی شہر کے ساتھ منسوب ہو ہی جاتی ہے۔ اور پھر یہی خصوصیت اس شہر کی شناخت اور طرۂ امتیاز بن جاتی ہے۔ یوں تو لکھنؤ اپنی زبان تہذیب، نفاست، نزاکت اور وضعداری کے لیے ہندوستان کیا ساری دنیا میں مشہور ہے لیکن امتدادِ زمانہ کے ہاتھوں ان نقوش کی آب و تاب اب کچھ مدھم پڑ گئی ہے اور لکھنؤ سے باہر اس کی مخصوص شناخت کا تکلف ہی سمجھا جاتا ہے۔ یہ وہ تکلف نہیں ہے جس کے متعلق استاد نے فرمایا تھا:

اے ذوق تکلف میں ہے تکلیف سراسر

وہ تکلف ہے جس کی نشان دہی حضرت داغ نے یوں کی ہے:

اے داغ تکلف ہے شرافت کی نشانی

ابھی حال ہی میں ایک برات کے سلسلے میں گورکھپور جانا پڑا۔ مرزا ظہیر لکھنوی بھی ہمراہ تھے۔ ناشتے کے دوران میزبانی کے فرائض انجام دیتے ہوئے ایک صاحب مرزا صاحب سے سموسے کھانے پر غیر معمولی اصرار کر رہے تھے "لیجیے بس ایک اور لیجیے۔" "میری خاطر لیجیے" مرزا صاحب ٹس سے مس نہ ہوتے اور برابر انکار کرتے رہے۔ آخر کچھ زچ ہو کر ان صاحب نے سموسوں کی [illegible] مرزا صاحب کی جانب بڑھاتی ہوئی پلیٹ کو میز پر واپس [illegible] آپ تو لکھنؤ [illegible] تکلف کر رہے ہیں" لکھنؤ کے بجائے مرزا صاحب نے [illegible]

کیوں کہ مرزا صاحب جب بھی اس انداز سے مسکراتے تو یہی بات کا تخیل ہوتا کہ ان کو غصہ آگیا ہے اور بالآخر وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ مرزا صاحب نے ان صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "اجی حضرت! تکلف میں نہیں بلکہ آپ جو اتنے سنگلاخ سموسے سے مجھ ناچیز کو زہر مار کروانا چاہتے ہیں۔ اگر ایسی ہی آپ کو میری صحت کی فکر ہے تو وہ اندر سے ہے حلوے کی قاب اور تلے ہوئے کاجوؤں کی پلیٹ جو آپ آڑ میں کیے ہوئے ہیں ان کو ذرا ادھر بڑھائیے اور

پھر دیکھیے اندازِ گل افشانیِ گفتار

مطلوبہ قاب اور پلیٹ کے مشمولات کا کیا حشر ہوا غالباً اس کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ ان کے ساتھ ہی وہ صاحب بھی جو مرزا کو تکلف نہ کرنے کی تلقین کر رہے تھے ایسے رفوچکر ہوئے کہ پھر نظر نہ آئے۔ قیام گاہ پر پہنچ کر ہم لوگوں نے مرزا صاحب سے کہا " مرزا آج تو آپ نے لکھنوی تکلف کا دامن تار تار کر ڈالا" مرزا صاحب نے سنی ان سنی کر دی اور اپنا پیٹ سہلاتے ہوئے بولے:

رہے اس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے
تکلف برطرف تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی

"پہلے آپ، پہلے آپ میں گاڑی چھوٹ گئی" کا مقولہ اب عام محاورت کے طور پر مشہور ہے اور لکھنوی تکلف کی ایک نادر مثال سمجھی جاتی ہے۔ دو حضرات جو لکھنوی تہذیب کے پروردہ تھے کمپارٹمنٹ کے دروازے تک پہنچ گئے لیکن حفظِ مراتب کے خیال سے اس میں داخل ہونے کے لیے ایک دوسرے سے سبقت کرنے پر کسی طور سے تیار نہ تھے اور اتنی دیر تک ایک دوسرے سے "پہلے آپ" "پہلے آپ" کہتے رہے کہ ٹرین چھوٹ گئی اور "پہلے آپ" اور "پہلے آپ" کی گردان ختم ہونے ہی کو نہ آئی۔ یقیناً یہ دونوں حضرات

گاڑی نکل چکی تھی، پٹری چمک رہی تھی

کا منظر دیکھ کر متاسف ہونے کے بجائے خوش ہوئے ہوں گے کہ ٹرین چھوٹ گئی تو کیا ہوا ٹرین تو روز آتی جاتی رہتی ہے لیکن اچھی بات تو نہیں گئی جو جا کر پھر کبھی واپس نہیں آتی۔

مرزا صاحب نے گردشِ لیل و نہار کا شکوہ کرتے ہوئے ایک دن "پہلے آپ" کی روایت غلط استعمال کیے جانے کا ایک نیا قصہ سنایا۔ مجو صاحب کے یہاں ایک مہمان آئے تو بس مہمان ہی ہو کر رہ گئے۔ دو تین ہفتے ہو گئے لیکن انھوں نے جانے کا نام ہی نہیں لیا جیسے اپنے گھر کا پتا بھول گئے ہوں۔ مجو صاحب کو ان کے قیام و طعام سے کوئی پریشانی نہیں تھی۔ الجھن تھی تو صرف اس بات کی کہ مہمان صاحب نے یہ معمول بنا لیا تھا کہ بلا ناغہ ہر رات کھانے کے بعد دو گھنٹے مجو صاحب کو اپنا کلام سناتے اور ہر شعر پر داد کے طالب ہوتے۔ اگر مجو صاحب اونگھ جاتے یا [illegible] تو ایک ہی شعر کو مسلسل اس وقت تک بلند سے بلند تر آواز میں دہراتے رہتے۔ جب تک مجو صاحب چونک کر "واہ صاحب واہ خوب کہا ہے" نہ کہہ دیتے۔ خواہ وہ عالمِ خواب سے [illegible] ایک روز مجو صاحب نے اپنے مہمان صاحب سے کہا کہ دولت کی گاڑی سے [illegible] کیا [illegible] مہمان صاحب یہ کہتے ہوئے [illegible] "ہاں [illegible]" [illegible]

[illegible]

مہمان ان پہلے آپ [illegible] مجو صاحب [illegible]

حاصل کر لیا۔ شریمتی جی ال دی اور سحر صاحب چیف مادم پر مسکراتے ہوئے رہ گئے۔ مہمان کو مدت ہوئی رخصت ہو گئے لیکن مرزا صاحب تاویلات حاشیہ آرائی کے حوالے سے بتاتے ہیں کہ سحر صاحب اب بھی حالات کو سوچتے ہوئے ایک دم سے بڑبڑانے لگتے ہیں۔ "واہ صاحب واہ خوب کہا ہے"۔ "آپ تو آسمان کے تارے توڑ لائے ہیں"۔ "مکرر ارشاد!"

یوں تو مرزا صاحب کے بچانوے فی صد مقولے ہمارے سر کے اوپر سے اُڑن طشتری کی طرح سے گزر جاتے ہیں یعنی ہم انھیں سمجھ ہی نہیں پاتے ہیں لہٰذا ان کے متعلق ہماری تائید، تنقید یا تنقیص کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لیکن ہم ان کے اس مقولے سے پوری طرح متفق ہیں کہ تکلف کرنے یا برتنے کو فنونِ لطیفہ میں شمار کیا جانا چاہیے۔ نااہل کے ہاتھوں یہ حماقت ندامت اور پھر عداوت کا پیش خیمہ ثابت ہوتا ہے لیکن جب کوئی فن کار اس کو ماہرانہ انداز سے استعمال کرتا ہے تو شائستگی و شگفتگی اور حسنِ مجلس کا باعث بن جاتا ہے:

بے جان بولتا ہے مسیحا کے ہاتھ میں

اکثر جب دو حضرات تکلفاً بے جا اصرار اور بے محل انکار پر اتر آتے ہیں تو کسی اچھے ٹینس میچ دیکھنے کا لطف آجاتا ہے۔ دیر تک گیند کی طرح تکلف اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر آتا جاتا رہتا ہے۔ اور بالآخر ان میں سے ایک کہتا ہے"۔ میں سمجھ رہا ہوں کہ آپ بے کار کا تکلف کر رہے ہیں"۔ اور دوسرا اپنی صفائی میں کہتا ہے" اجی حضرت تکلف میں نہیں آپ کر رہے ہیں"۔ مطلب یہ کہ ایک کہتا ہے "آپ جھوٹ بول رہے ہیں"۔ اور دوسرا جواب دیتا ہے" پہلے آپ یعنی اس بدعت کا آغاز تو آپ ہی نے کیا تھا"۔

یوں تو مجھے اپنے سبھی دوست عزیز ہیں حتیٰ کہ وہ بھی جو میرے گھر آتے ہیں تو ...... میرے لیے ایک چھوٹی قیامت بھی ساتھ لاتے ہیں۔

لیکن مجھے سب سے زیادہ عزیز وہ ہیں جو تکلف برتنا ویسا ہی ضروری سمجھتے ہیں جیسے پائجامہ یا پتلون پہننا۔ مثلاً کسی تپتی ہوئی دوپہر کو بابو گردھاری لال پسینہ پونچھتے ہوئے میرے غریب خانے پر نازل ہوتے ہیں تو میں پوچھتا ہوں

"کیوں صاحب ابھی کھانا تو کھایا نہ ہوگا آپ نے؟"

"جی نہیں میں گھر سے کھانا کھا کر چلا تھا" حالانکہ ان کا چہرہ اس کے خلاف چغلی کھاتا ہے۔

"تو پھر ایک پیالی چائے ہو جائے"

"جی نہیں میں نے چائے پینا چھوڑ دیا ہے"۔ جبکہ میں نے کل شام ہی کو انھیں کینٹین میں چائے پیتے دیکھا تھا۔

"اچھا تو پھر ایک گلاس شربت؟"

"ڈاکٹر نے شکر منع کر رکھی ہے"۔ معلوم نہیں پرسوں جو رس گلے وہ کھا رہے تھے ان میں شکر تھی یا نہیں؟

"اچھا تو اس گرمی میں آپ ایک گلاس ٹھنڈے پانی سے تو انکار نہیں کر سکتے؟"

"جی نہیں۔ شکریہ۔ حلق خراب ہے" حالانکہ ان کی آواز اس کے خلاف گواہی دے رہی تھی۔

"اچھا تو نمک ڈال کر نیم گرم پانی سے غرارہ ہی کر لیجیے"

"جب آپ کا اصرار ہے تو منگوا لیجیے"

گردھاری لال بے خیالی میں غٹ غٹ کر کے غرارہ کرنے کے بجائے پانی کو پی جاتے ہیں ... تکلف ...

اس کے بالکل برعکس؟ جب مجھے قربِ قیامت کی بشارت دینے اور اس کے متعلق میری اصلاح کرنے مولانا صاحب میرے غریب خانے پر نازل ہوتے ہیں تو ایک دوسری ہی قسم کا سماں بندھ جاتا ہے۔ لیکن اس وقت سوکھی چائے دائے نہیں چلے گی۔ سنا ہے حلوائی کے یہاں گلاب جامنیں اور تکے تلے جا رہے ہیں۔ انھیں بھی منگوائیے۔

اس چلچلاتی دھوپ میں آج شربت کیوں نہ پیا جائے؟" میں گلوگیر آواز میں کہتا ہوں۔

"خیال برا نہیں ہے۔ پہلے چائے، گلاب جامنیں اور تکے ہو جائیں پھر کچھ آم کھائے جائیں اور پھر شربت ملکی بوتل کا نہیں تازہ نیبو کا نوشِ جان کیا جائے۔" مولانا نے بڑی شگفتگی سے کہا۔

"لیکن اس وقت دھوپ میں جب چیل انڈا چھوڑ رہی ہے بازار کون جائے اور گلاب جامنیں، تکے آم اور نیبو کون لائے۔" میں مولانا کے پھیلائے ہوئے جال سے نکلنے کے لیے آخری بار پھڑپھڑاتا ہوں۔

"مجھے اپنے دوستوں کی سہولتوں کا ہمیشہ خیال رہتا ہے" کہہ کر مولانا نے قہقہہ لگایا اور بڑے وحشت ناک انداز سے کلّو! کلّو! کے نعرے لگائے اور کلّو ان کا ملازم ایک مہیب "جی جی" کہتا ہوا دروازے کی آڑ سے نکل کر کالے دیو کی طرح میرے سامنے کھڑا ہو گیا:

شامتِ اعمال ما صورتِ کلّو گرفت

اکثر بے جا اور سیدھا سادا تکلف، پیچیدہ بے تکلفیوں کا باعث بھی بن جاتا ہے۔ ہمارے دوست رحیم بخش ایک مرتبہ اپنی سسرال گئے اور کھانے کے لیے بلائے گئے تو انھوں نے محض تکلفاً یہ کہہ کر کھانے میں شریک ہونے سے انکار کر دیا کہ میری داہنی داڑھ میں بہت تکلیف ہے۔ ان کے خسر نے جب انھیں ایک مخصوص کرسی پر بٹھا کے ٹارچ سے ان کے کھلے منہ کے اندر بغور معائنہ کیا تو انھوں نے اس کو شفقتِ خسروانہ پر محمول کیا اور از راہِ سعادت مندی کچھ کراہ بھی دیے۔ ان کے فرشتوں کو بھی یہ خبر نہ تھی کہ ان کے خسر کسی زمانے میں ماہرِ دنداں بھی رہ چکے تھے اور اس زمانے کا کچھ سامانِ حرب و ضرب اب بھی تبرکاً گھر میں موجود تھا۔ پلک جھپکاتے ان کے خسر نے جیب سے نکال کر ایک ایسا آلہ ان کے منہ میں ڈال دیا کہ ان کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا اور ان کے دونوں قوی ہیکل سالوں نے آگے اور پیچھے سے دبوچ کر انھیں ایک ایسے آہنی شکنجے میں جکڑ لیا کہ ان کے لیے جنبش کرنا تو کیا سانس لینا تک دشوار ہو گیا۔ اب رحیم بخش کو بھی کچھ ہوش آیا اور خطرے کا احساس ہوا۔ انھوں نے حلق سے وحشت ناک آوازیں نکالنے کے ساتھ سر ٹکنے اور پھڑکنے کی بہت کوشش کی لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی تیر کمان سے نکل چکا۔ خسر صاحب نے پھرتی سے مطلوبہ داڑھ پر کوئی دوا لگائی اور پھر اپنے زنگ آلود زنبور کے چند ہی ماہرانہ جھٹکوں سے اُسے ہر قسم کے درد اور تکلیف سے ہمیشہ کے لیے آزاد کر دیا لیکن غالباً یہ رحیم بخش کی عقل داڑھ تھی۔ کیوں کہ اس کے نکل جانے کے بعد انھوں نے اس دن اپنی سسرال میں بڑی بے عقلی کی باتیں کیں:

خشک تکلفات کی ٹوٹ چکی تھیں سب جڑیں
چشمک بے دریغ تھی شکوۂ بے حجاب تھا

جی۔ ایم احمد خواہ مخواہ
(بمبئی)

ماہر موسمیات

کہتے ہیں کہ محکمۂ موسمیات کی جانب سے کی گئی پیشین گوئی کبھی غلط نہیں ہوتی۔ غلط موسم ہوتا ہے جو پیشین گوئی کے عین برخلاف اپنا رنگ بدل کر کسی کو محوِ حیرت اور کسی کو مبتلائے مصیبت کر دیتا ہے۔ اس محکمے کے متعلقہ حکام بھی بجائے خود اتنے غیر یقینی حالات سے دوچار رہتے ہیں کہ موسم کے بارے میں ان کی جانب سے کی گئی پیشین گوئی پر ایمان لانا اپنے آپ کو موسم کے رحم و کرم پر چھوڑنے کے برابر ہوتا ہے۔

پچھلے ہفتے کا ذکر ہے۔ دفتر جاتے وقت سوچا کہ محکمۂ موسمیات کے ماہر سے آنے والے ۲۴ گھنٹوں کے موسم کے بارے معلومات حاصل کرتا چلوں۔ دیکھا تو افسرِ موصوف سٹیلائیٹ سے تازہ موصولہ تصویر کو الٹ پلٹ کر دیکھنے میں اس قدر منہمک تھے کہ بہت دیر تک انھوں نے میری آمد کا نوٹس ہی نہیں لیا۔ مجبوراً مجھے گڈ مارننگ کہہ کر ان کے انہماک میں رخنہ اندازی کرنی پڑی۔ انھوں نے ایک نگاہِ غلط مجھ پر ڈالی اور پھر اس تصویر کے مطالعے میں غرق ہو گئے۔

میں نے کہا جناب عالی میں دراصل آج دن بھر کے موسم کے بارے میں آپ سے معلومات حاصل کرنے کی غرض سے حاضر ہوا ہوں۔" انھوں نے ہنوز تصویر پر نظریں جمائے ہوئے کہا۔ "ہو سکتا ہے ہلکی بارش ہو جائے۔ اور یہ بھی کہ گرج چمک کے ساتھ بوندا باندی کے امکانات بھی ہیں۔ کبھی کبھی اور کہیں کہیں موسلا دھار بارش بھی ہو سکتی ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بارش کے ساتھ تیز ہوا بھی چلے ـــــ یا سرے سے بارش ہی نہ ہو۔"

مجھے ہوش میں پا کر انھوں نے سلسلہ جاری رکھا۔ "دراصل بات یہ ہے کہ گزشتہ کل کی بہ نسبت آج علاقے میں بارش کا زور کم ہو رہا ہے۔ اس لیے اگر بارش ہوتی بھی ہے تو اس کے امکانات کو ٹالا نہیں جا سکتا۔" میں نے کہا "آپ بجا فرماتے ہیں۔ میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آج بارش ہوگی یا نہیں؟"

انھوں نے سٹیلائیٹ سے موصولہ تصویر پر ایک جگہ انگلی پھیرتے ہوئے کہا۔ "ہوا میں دباؤ کی مسلسل تغیرات

میں بڑھتی جا رہی ہے ۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہوا کا کم دباؤ (لا اقتصر) مدھیہ پردیش وسط بھر اور اس کے نواحی علاقوں میں چھا جانے کی وجہ سے وہاں ایک یا دو بار [illegible] بارش کے ساتھ تیز ہوا چلنے کے بھی واضح امکانات ہیں ۔"

میں لجاجت آمیز لہجے میں پوچھا ۔۔۔ جی! آپ نے بجا فرمایا ۔۔۔ لیکن میں تو صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آج بارش ہوگی یا نہیں ؟

انھوں نے مسکراہٹ آمیز لہجے میں یوں جواب سے سرفراز فرمایا ۔۔۔ "آپ نے اچھا سوال پوچھا ہے لیکن اس سوال کا جواب دینے سے قبل میں یہ چاہوں گا کہ آپ اس تصویر میں شمالی مہاراشٹر اور جنوبی کوکن پیچیدہ پریشانی ہے۔ اس کو بغور دیکھیں ۔۔۔ تو جناب! آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ مغربی مانسون شمالی گجرات میں داخل ہوا ہی چاہتا ہے ۔ حالاں کہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ وہ شمالی گجرات اور سوراشٹر کے کچھ علاقوں میں بہت آگے نکل گیا ہے اس سے آپ کو میگھالیہ اور میزورام اسٹیٹ کے موسم کے بارے ۔۔۔"

میں نے قطع کلامی کی ۔۔۔ "بہت بہت شکریہ ۔ فی الحال میگھالیہ یا میزورام جانے کا میرا کوئی ارادہ نہیں ہے ۔" کہنے لگے ۔۔۔ "تو پھر آپ یوں کریں کہ آج کے موسم کے بارے میں قطعی جانکاری حاصل کرنے کے لیے پچھلے پچاس برس کا ریکارڈ ایک نظر دیکھ ڈالیں ۔ گزشتہ سال کے مقابلے میں پیوستہ سال کا اوسط بہت زیادہ رہا اور امید ہے کہ یہ اوسط بھی پچھلے اوسط سے تجاوز کر جائے گا ۔ میرے خیال میں آپ کے لیے یہ معلومات غیر اہم نہیں ہیں ۔"

جواب دیا ۔۔۔ "جی نہیں! ایسی تو کوئی بات نہیں ۔۔۔ میں تو صرف آج کے موسم کے بارے میں ۔"

انھوں نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا ۔۔۔ "بھئی! آج کے موسم کے بارے میں ایک خاص بات بتانا تو میں بھول ہی گیا اور وجہ یہ ہے کہ خط استوا کے نیچے اور اوپر جو ایک فضائی خلا سہا سہا سا لیکن پھیلتا ہوا نظر آتا ہے ۔ ہو سکتا ہے اس کا اثر بھی آج کے موسم پر اضافہ ہو ۔۔۔ میرے خیال میں آپ اس فضائی خلا کے بارے میں یقیناً اور ضرور مزید جاننا چاہیں گے ۔۔۔"

میں ان سے اس استفسار کے بارے میں کچھ کہنے والا تھا کہ اچانک دیکھتے ہی دیکھتے اندھیرا سا چھا گیا ۔ کھڑکی سے باہر دیکھا تو کالے کالے بادل مست ہاتھیوں کی طرح جھوم جھوم کر چاروں سمت پھیل رہے تھے لہٰذا اس سے پہلے کہ ماہر موسمیات آج کے موسم کے بارے میں میرے سوال کے جواب میں مزید کچھ کہتے موسلا دھار بارش شروع ہو گئی ۔

ماہر موسمیات کے منہ سے نکل گیا "میرے خیال میں غالباً بارش ہو رہی ہے ۔"

اسی شام دفتر سے لوٹتے وقت بس کی قطار میں دیکھا کہ تقریباً سبھی مسافر برساتی اور چھتریوں سے لیس تھے ۔ اور بیچارے ماہر موسمیات اپنے نزدیک کھڑے مسافر کی چھتری میں پناہ لینے کی ناکام کوشش کر رہے تھے ۔

پھر اسی چشم گنہگار نے ایک ہفتہ بعد ماہر موسمیات کو چلچلاتی دھوپ میں چھتری ۔ رین کوٹ اور گم بوٹ سے آراستہ و پیراستہ بس کی لائن میں پسینے میں شرابور وحشت زدہ دیکھا جب کہ دیگر مسافر ان پر تعجب سے چلچلاتی دھوپ کا مزا لے رہے تھے ۔

پیشہ ور شاعر

کمال احمد رضوی

بزم میں آپ کی ہے توجہ کدھر
ان سے ملئے یہ ہیں شاعر پیشہ ور
ملک میں ہر طرف گھوم آئے ہیں یہ
خاص اُجرت پہ تشریف لائے ہیں یہ
اِن کی تانوں میں پوشیدہ ہے زندگی
ان کی آواز میں بجتی ہے بانسری
شعر ناقص سہی، بے معانی سہی
پردہ پوش ان معائب کی ہے نغمگی
گٹکری کا یہ ہوتا ہے دل پر اثر
سامعین اپنا خود پھوڑ لیتے ہیں سر
ویسے تازہ غزل بھی لکھاتے ہیں یہ
کم سے کم دس روپے تو گنواتے ہیں یہ
وہ غزل سال بھر تک سناتے ہیں یہ
پھر ہزاروں اسی سے کماتے ہیں یہ
ہر جگہ ایک ہی گت پہ گا کر چلے
اک نئی دو پرانی سنا کر چلے
کرتے ہیں لوگ ان کی ثنا و صفت
ہر جگہ ڈٹ کے ہوتی ہے مقبولیت
ان سے کہئے اگر لطف فرمائیے
بزمِ شعر و سخن میں چلے آئیے
یوں بصد ناز و نخوت یہ دیں گے جواب
مجھے آنا کرانے کو دونوں سے خطاب

"دعوت انگلینڈ و جاپان سے آئی ہے
ایک خلقت وہاں میری شیدائی ہے
دیتے ہیں وہ رقم بھی تو کافی مجھے
اس کی کرنی پڑے گی تلافی مجھے
جو وہاں جائے لاریب خوش بخت ہے
پھر یہ ہے فکر موسم بہت سخت ہے
کرتے ہیں آپ ضد تو نہیں جاؤں گا
آپ ہی کے یہاں میں چلا آؤں گا
جانفشانی کا کچھ بھی پانا ہے پھل
فیس کر دی ہے اِمسال میں نے ڈبل"
خط کتابت نے طے کر دیا مرحلہ
الغرض ڈیڑھ سو پہ ہوا فیصلہ
پہنچے اسٹیشن اس خاص تاریخ پر
لینے آئے تھے جو، اُن پہ ڈالی نظر
پھر بصد شانِ شاہانہ سب سے ملے
ٹیکسی میں لدے اور گھر آ گئے
بولے ٹھہروں گا میں شاعروں سے جدا
ان کی بک بک سنوں یہ کہاں حوصلہ
خیر کمرہ ریزرو اُن کو اِک کر دیا
جیسے اُلّو کا سب سے الگ گھونسلا
غسل فرما کے پھر ناشتہ کر لیا
بعد پھر جام پر جام چلنے لگا
کیتلیاں سگرٹیں پھر منگا لی گئیں
دیکھتے دیکھتے پھونک ڈالی گئیں

ناز جب سب کے سب ختم فرما گئے
مسخرے منّے بزم میں آ گئے
پاؤں پر پاؤں یوں رکھ کے بیٹھیں وہاں
جیسے ان کا ہے محکوم سارا جہاں
کام جاری رہا شعر ہوتے رہے
مے کے آغوش میں آپ سوتے رہے
کوئی مصرع یہ دہرائیں ممکن نہیں
برتری پر نہ لگ جائے دھبّہ کہیں
بارِ احساں کسی سر پہ کیوں لاد دیں
کسر شاں ہے کسی کو جو یہ داد دیں
اپنی باری پہ آئے بڑے ناز سے
اور تانیں اُڑائیں کچھ انداز سے
دیکھ کر رنگِ عشاق گھبرا گئے
داد لی، واپس اپنی جگہ آ گئے
جتنے شاعر ہیں غیرت سے خاموش ہیں
علم ہے اہلِ محفل غلط کوش ہیں
شاعری کس قدر اپنی بدنام ہے
شاعری میں گویّوں کا کیا کام ہے
جانتے ہیں کہ دریا اُتر جائیں گے
جب گلے نے دغا دی یہ مر جائیں گے
کچھ تو شرماؤ اے بانیٔ انجمن
تم کو لازم نہیں اتنی توہینِ فن
ذوقِ شعری کو خود اپنی رسوا کیا
تم نے ہی اِن گویّوں کو پیدا کیا
تم ہو قوّال و شاعر کے کیوں درمیاں
تم نہ پوچھو تو پھر ان کی ہستی کہاں
حامیٔ علم و فن قدر دانِ ہنر
ان سے بچتے رہیں شاعرِ پیشہ ور

اسمٰعیل آذر
(ککنگ)

پڑوسی کا حق

محلے کے مُلّا
میاں رحمت اللہ
عبادت سے غافل
نہ توبہ نہ تِلّا نہ کوئی نوافل
وہ پیرِ قلندر
شبستاں کے اندر
مسہری نہ "مچھوا" نہ "مرغا" نہ "پکھوا"
مزے میں بسر کر
پڑے سو رہے تھے
کہ مین ایک بج کر کچھ اوپر منٹ پر
اک ان کے پڑوسی — الف۔شین۔اختر
بچھونے سے اُٹھے پریشان ہو کر
وہ "گڈ نائٹ" والی
وہ مچھر بھگانے کی بتّی جو تھی زیرِ بستر
جھپٹ کر اٹھائی
پھر اس کو جلا کر وہ راحت ہے پائی
کہ اللہ اکبر

نتیجے میں مچھر کا اِک وفد اُڑ کر
میاں رحمت اللہ کے دولت کدے پر
اسی وقت آیا
انھیں کھٹکھٹایا
بچھونے سے ان کو اٹھا کر بٹھایا
تہجد پڑھایا

وحید اشرف
(دوبئی)

این۔ آر۔ آئیز

اب کی بکری عید (عید الاضحیٰ) میں اتفاقاً میرے کچھ بہت ہی قدیم دوست جو از قسم این۔ آر۔ آئیز تھے آئے ہوئے تھے۔ کوئی پانچ سال سے مجھ سے نہیں ملا تھا تو کسی نے پندرہ سال تک اپنی صورت نہیں دکھائی تھی اور کوئی اٹھارہ بیس سال سے منہ چھپائے ہوئے تھا۔ یہ دوست عام دنوں میں کدھر آتے تھے . . . . اور کدھر جاتے تھے پتہ ہی نہیں چلتا تھا۔ اب اتفاقاً سب اکٹھا جمع ہوئے تھے سوچا چلو موقع اچھا ہے بکری عید کی مناسبت سے ان دوستوں کو دعوت دے کر بکرا ہی بن جاؤں۔ میں نے اپنا یہ ارادہ اپنی بیوی پر ظاہر کیا۔ تاکہ وہ بھی خوش ہو جائے یہ سوچ کر کہ ہم بھی این۔ آر۔ آئیز کی چاپلوسی میں مرکزی و ریاستی حکومتوں سے کسی طرح پیچھے نہیں ہیں۔ حکومتوں کو زرِ مبادلہ اور سرمایہ کاری سے اور ہم کو ان کے قیمتی امپورٹیڈ تحفوں سے مطلب ہے اور بیوی کو بھی اڑوس پڑوس کی عورتوں پر رعب جھاڑنے کا موقع مل جائے گا۔ کہ ہمارے پاس این۔ آر۔ آئیز آئے تھے اور ان کو دیکھ کر رشک کرنے کے لیے دور دور سے لوگ آئیں گے اور ہماری ساکھ محلہ میں بنی رہے گی۔ پہلے تو بیوی نے عجیب سی نظروں سے دیکھا جیسے چہرے کی بجائے غلطی سے پیشانی پر گھاس اُگ آئی ہو۔ میرے منصوبے پر انہوں نے بڑا دانشمندانہ مشورہ دیا۔ عورتیں ہمیشہ دانشمندانہ مشورہ ہی دیتی ہیں کیوں کہ دانشمندی، عقل اور عقلمندی بھی مونث ہے صرف بیہودہ خیال کی طرح مذکر ہے جو کبھی پیدا نہ ہونے والا خواب ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ مشورہ مذکر ہے (لیکن مونث (دانشمندی و عقلمندی) کے بغیر محض نقصان رساں ثابت ہوتا ہے۔ اسی طرح میرا منصوبہ [illegible] ہونے کا [illegible] میں لگ گیا۔ انہوں نے کہا کہ دوستوں کو بلانے میں خرچ بہت ہوگا اور ان کو [illegible]

دیکھنے کے لیے آجانے والی معتبر خواتین کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ میں نے دل میں واہ واہ کہی۔ یہ ٹھیک ہے کہ سوشل میڈیا یعنی سماجی ذرائع ابلاغ یعنی محلے کی خواتین سے بھی نباہ نہیں کیا جا سکتا۔ اور اس کا بھی کیا بھروسہ کہ دوست اپنے ساتھ ہمارے لیے تحفہ لے آئیں۔ طے یہ ہوا کہ ایک دن ہم دونوں بغیر اطلاع ایک دوست کے پاس جائیں گے۔ اطلاع نہ دینے میں ایک خاص مصلحت تھی۔ چناں چہ ایک دن اچانک ہم دونوں بن سنور کر ہمارے ایک دوست سعودی این۔آر۔آئی کے گھر گئے۔ گھر کی ظاہری اور باطنی حالت میں نمایاں ترقی ہوئی تھی۔ ظاہری یعنی گھر کی آرائش نو رنگ و روغن، ڈیکوریشن، قیمتی پردے، فرنیچر، چوبیس انچ کا ٹی وی، امپورٹیڈ ویڈیو اور ڈیک وغیرہ وغیرہ اور باطنی حالت تین گادریج کی آہنی الماریوں میں پوشیدہ تھی۔ جس وقت ہم وہاں پہنچے دن کے گیارہ بج رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ دوست سو رہے ہیں۔ ان کی بیگم صاحبہ کچھ دیر ہمارے ساتھ بیٹھیں اور چلی گئیں۔ خاطر تواضع کے لیے دو دو مامائیں حاضر تھیں۔ مجھے بڑی شرمندگی ہوئی کہ بیوی کو نہیں لانا چاہیے تھا۔ پیسہ کی ریل پیل نے ہم دوستوں کے درمیان تکلف کی ایک دیوار کھڑی کر دی تھی حالاں کہ یہ وہ دوست تھا جو کسی وقت چارمینار (سگریٹ) میں حصہ دار ہوا کرتا تھا۔ ہم جانے کے لیے اٹھے ہی تھے کہ ہمارے دوست کی آنکھ اور بیڈ روم کا دروازہ کھلا اور مجھے دیکھ کر حیرت سے اس کا منہ بھی کھل گیا۔ بہر حال آنِ واحد میں میری شرمندگی اور احساس کمتری جاتی رہی اور تکلف کے اندیشہ کی دیوار بھی ڈھ گئی کیوں کہ اس کی خوشی کی بے ساختگی شدید تھی۔ خیر گھر واپس آنے تک میری فکر بڑھ گئی اور بیوی کی ذہنی حالت کافی خراب ہو گئی۔ میں ایک جنرل اسٹور چلاتا ہوں۔ معقول آمدنی ہے جس سے اپنا اور بچوں کا گزارا اچھا ہو جاتا ہے۔ سوچا کیوں نہ دکان بیچ کر قسمت کے پیچھے ہو لوں۔ ڈیڑھ پچاس ہزار تک مل جائے گا کچھ کم پڑے تو بیوی کے زیور ادھار لے لوں گا اور جب رات میں دکان سے واپسی کے بعد بیوی سے اپنے اس ارادہ کا ذکر کیا تو اس نے گلہ کیا کہ آپ ہمیشہ کہتے تھے کہ ہمارے خیالات نہیں ملتے۔ زمین آسمان کا فرق ہے آپ کو کیسے پتہ چلا کہ میں یہی سوچ رہی ہوں۔ یہ بڑا عجیب سوال تھا۔ یعنی اتنا اندازہ تو ہوا کہ میں نے ہوش مندی سے سوچا ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ ہوش مندی بھی موقت ہے خیر ہوا کرے۔

طے پایا کہ اپنی ہمت کے لیے اپنے سالے کو بھی ساتھ لے لوں اور یہ فیصلہ ہوا کہ ہم دونوں دوبئی کے این۔آر۔آئی بنیں گے۔ کیوں کہ دوبئی میں ہندوستان سے بھی زیادہ آزادی ہے جس کا فائدہ خواتین تنہا رات کے بارہ بارہ بجے تک شاپنگ کر کے اٹھاتی ہیں۔ این آر آئیز کی بھی دو قسمیں ہیں مجھے یہ بات میرے ایک دوست کے سسر صاحب سے معلوم ہوئی جن کے داماد ایک لاکھ روپے دے کر امریکہ گئے تھے جب میں نے انھیں مبارک باد دی کہ آپ کے داماد بھی ماشاء اللہ این۔آر۔آئی ہو گئے ہیں تو انھوں نے وضاحت کی کہ امریکہ کا این۔آر۔آئی میں نے حیرت سے پوچھا تھا کہ کیا امریکہ اور خلیج عرب کے این آر آئی میں فرق ہے تو انھوں نے بتایا کہ باہر ملک کے این آر آئیز نان ریسیڈنٹ انڈین Non Resident Indians کہلاتے ہیں اور امریکہ کے این آر آئیز ناٹ ریٹرن انڈین Not Return Indians کہلاتے ہیں [illegible] کہا تھا کہ گلف چلے جاؤ کم از کم دو سال میں تو آ سکتے ہیں۔ یہیں کا بنا مال ہے۔ [illegible] کو جا کر پانچ سال ہو گئے ہیں۔ آنے کے تعلق سے معلوم ہوا کہ ہندی زندگی کیلئے [illegible] گھر نے تمام فیصلوں کو قطعیت دے دی تھی۔ دوسرے دن صبح صبح میں نہا دھو کر نئے کپڑے [illegible] کیوں کہ پہننے

[illegible] لیے ہوتے جب گھر کے لوگوں کے [illegible] ناشتے کے لیے بیٹھا ہی تھا کہ کسی نے دستک دی۔ دیکھتے ہی [illegible] مرسے کے بعد ہمارے دور کے رشتہ دار بہت دور سے آئے تھے۔ نہایت انکساری سے مسکرا کر سلام کیا۔ میں حیران تھا کیوں کہ ہمارے گھر میں ماشاء اللہ سب خیریت سے تھے۔ خیر ان کو اندر لے آیا۔ دوران ناشتہ ادھر ادھر کی باتیں ہوئیں اور وہ اپنے رشتہ دار کرسی کو گھسیٹ کر نزدیک لے آئے [illegible] نے اپنے بچوں پر نظر دوڑائی کوئی بھی سن بلوغ کو نہیں پہنچا تھا انھوں نے آہستہ سے کہا: "سنا ہے آپ دو بچیاں بیاہنے ہیں۔" میرے ہاتھ سے گلاس چھوٹتے چھوٹتے بچا۔ سخت حیران ہوا کہ انھیں کیسے پتہ چلا کہ ہم میاں بیوی کے بیچ یہ باتیں رات کے دس گیارہ بجے کے درمیان ہوئی تھیں۔ بیوی ساتھ ہی تھیں باہر بھی نہیں گئیں۔ اور اب تک تاب ناک مستقبل کے خیالی حجرے میں آرام فرما رہی تھیں۔ مجھے اچانک یاد آیا جس وقت ہم گفتگو کر رہے تھے اسی وقت پڑوس سے ایک محترمہ اچانک ان کے بچے کے رونے کے سبب دودھ مستعار لینے آئی تھیں۔
میں ہندوستانی سوشل ذرائع ابلاغ کا قائل ہو گیا اور ارادہ کر لیا کہ دبئی جانے کے بعد مغربی اور امریکی لوگوں کو بھی قائل کر دوں گا تاکہ ان لوگوں کو پتہ چل جائے کہ ہمارا میڈیا بھی A.B.C، N.B.C اور B.B.C سے کسی طرح بھی پیچھے نہیں ہے۔

جب دکان جانے کے لیے باہر نکلا تو گھر میں ٹوٹنے والے حیرت کے پہاڑ کے ریزے گھر سے دکان تک پھیل گئے تھے۔ چبوتروں پہ بیٹھے ہوئے لوگ اٹھ اٹھ کر سلام کرنے لگے۔ سائیکل سے اتر اتر کر سلام کرنے لگے۔ حد ہو گئی۔ میرے گھر کے قریب والا گوالا میری کنجوسی سے نالاں ہو کر جب بھی تنگ راستہ سے گزرتا تھا تو خواہ مخواہ بھینس کو چھیڑتا تھا۔ اور وہ بد حواس ہو کر گوبر سے لتھڑی ہوئی دم رنگ میں بھیگے ہوئے برش کی طرح میرے اوپر جھٹکتی تھی لیکن خلافِ معمول جیسے ہی میں قریب گیا اس نے فوراً سلام کر کے بھینس کی دم پکڑ لی۔ خلافِ معمول روزانہ کی دکان کی بکری میں بھی اضافہ ہو گیا جس کا نتیجہ اچھا نہیں نکلا۔ تیسرے روز ہمارے محلہ کی ایک اور دکان کے مالک دندناتے ہوئے آئے اور غصہ میں کہا۔ "میں سب سمجھتا ہوں یہ تمہاری اوچھی چال ہے"۔

میں سخت حیران ہوا کہ انھیں صبح صبح کیا ہو گیا۔ انھوں نے الزام عائد کیا کہ میں نے یہ حرکت ان کے گاہک توڑنے کے لیے کی ہے۔ اور دھمکی دی کہ میں [illegible] ہیں۔ آپ اگر [illegible] بننے کا ارادہ ترک کرنے کا اعلان نہ کیا تو میرے حق میں اچھا نہ ہوگا۔

ایک دن طے پایا کہ ہمارے اس دوست کے پاس جائیں گے جو دبئی سے آئے ہوئے تھے۔ چھٹی کا دن تھا ہمارے دوست بھی حسبِ عادت اہلِ دکن گیارہ بجے تک سو رہے تھے۔ گھر میں ان کی ایک بارہ سالہ لڑکی اور دس سالہ لڑکا ہی نظر آئے۔ لگتا تھا ہماری آمد بچوں کو کھل رہی تھی۔ ایک عجیب اضمحلال اور بے کلی ان کے چہروں سے عیاں تھی۔ لڑکی کے تاثرات کو سمجھنا مشکل تھا کبھی غمگین نظر آتی تھی تو کبھی [illegible] کے بعد اس کا چہرہ غصہ سے متغیر ہو جاتا۔ میں [illegible] آپ دوستوں کے پاس آ کر [illegible] [illegible] ہو جاتا تھا۔ اور مجھے اچھا دیا کہ [illegible] [illegible]

دیکھا تو وہاں صرف غصہ ہی نظر آیا۔ غم کا دور دور تک پتہ نہیں تھا۔ چونکہ میں لڑکی کے پاس تھا میں نے اس کو اشارہ سے اپنے پاس بلایا اور سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے اس متغیر کیفیت کی وجہ پوچھی "کیا بات ہے کبھی تمہارے چہرے سے غم چھلکتا ہے تو کبھی غصہ یہ کیسی کیفیت ہے۔" تو جھٹ لڑکے نے کہا "باجی غم و غصہ کا اظہار کر رہی ہیں۔" میں نے دوبارہ اس کی وجہ پوچھی کہ غم کس بات کا اور غصہ کیوں؟ اس لڑکی کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس نے بڑے کرب سے کہا "پپا دوبئی گئے آٹھ سال ہو چکے ہیں اور ہم لوگ آٹھ سال سے ان سے ملے نہیں۔ سال دو سال میں ماہ دو ماہ کے لیے آتے ہیں۔ جب وقت ہم جاگتے ہیں یہ سوتے رہتے ہیں۔ اور جب ہم اسکول سے واپس آتے ہیں تو یہ آپ لوگوں یعنی اپنے دوستوں کے ساتھ ہوتے ہیں اور جب ہم سو جاتے ہیں تب یہ گھر آتے ہیں ماہ دو ماہ کی چھٹیوں میں چار آٹھ دن چھٹی کے ہوتے ہیں یہ بھی آپ لوگ لے لیتے ہیں۔" اور وہ رونے لگی۔ میں سخت بدحواس ہو گیا کہ کیسے سمجھاؤں کیا کہوں کیسے تسلی دوں۔ دفعتاً بڑے زور سے بیوی نے میرا ہاتھ دبایا اور اٹھ کھڑی ہو گئیں۔ میں کچھ سمجھ نہ سکا۔ جب ہم گھر آ گئے تو انھوں نے اپنا فیصلہ سنایا کہ ضروریات کی تکمیل اور آرام سے زیادہ دولت ہمیں نہیں چاہیے آپ کے این آر آئی بننے کی کوئی ضرورت نہیں۔ دوسری بار میرے دل سے واہ واہ کی صدا نکلی۔ دانش مندی کے بغیر مشورہ بے کار ہے یعنی مونث کے بغیر بہرحال مذکر کچھ بھی نہیں۔

●●

خادم حسین مجاہد (پاکستان)

ایک سے دو بھلے

جب ہم اس پر غور کرتے ہیں خواہ مخواہ قائل ہو کر رہ جاتے ہیں کہ بزرگوں کے ہر موقع کے لیے کچھ نہ کچھ کہہ کر رکھنے کی عادت اتنی بری بھی نہ تھی۔ ان کا اس عادت کی وجہ سے ہمیں کتنی آسانی ہے کہ ڈکشنری کھولی اور ہر موقع کے لیے ریڈی میڈ مقولہ حاصل کر لیا۔

بزرگوں نے بہت پہلے مختلف تجربات کے بعد یہ بتا دیا تھا کہ ایک سے دو بھلے۔ جب ہم نے ایک دوست سے اس بارے میں رائے پوچھی ... تو بولا کہ میں ابھی woman show دیکھ کر آرہا ہوں واقعی "ایک سے دو (Two women) بھلے ہی ہوتے ہیں۔ گو اس کی اس بات پر سر پیٹنے کی اچھی خاصی گنجائش ہے لیکن یہ بہر حال طے ہے کہ ایک سے دو بھلے ہی ہوتے ہیں۔ آج ہیر رانجھا، لیلیٰ مجنوں، سسی پنوں، شیریں و فرہاد، سوہنی مہینوال، رومیو جولیٹ، مرزا صاحباں، سہتی مراد اور سیتا رام وغیرہ عشق کے سمبل (Symbol) کے طور پر دنیا بھر میں اس لیے مشہور ہیں کہ وہ ہزار جتنوں کے بعد بھی دو دو ہی رہے ایک نہ ہو سکے۔ اگر ان سب کی شادیاں ہو جاتیں اور یہ ایک ہو جاتے تو زیادہ سے زیادہ یہی ہوتا کہ آبادی میں کچھ اضافہ کر کے گمنام مر جاتے نہ ہی آج فٹ پاتھ پر ان کے قصے بکتے نہ ہی اتنی فلمیں ان پر بنتیں اور نہ ہی یہ اتنے لوگوں کے روزگار کا ذریعہ بنتے۔ دوسری طرف اگر یہ سب معزز خواتین و حضرات، عاشق و معشوق نہ بنتے اور اکیلے اکیلے زندگی گزارتے تو نہ رانجھے کی بھینسیں چرانے کا بارہ سالہ تجربہ کا ذکر ہمارے ادب میں ہوتا نہ مجنوں کے صحرائے نجد کی پیمائش کا۔ فرہاد بھی دودھ کی نہر نکال کر مشہور ہونے کی بجائے شاید اپنا ڈیری فارم کھول کر گمنام زندگی گزار کر پرلوک سدھار جاتا۔ سوہنی بھی دریا کے سامنے گھڑا کشتی متعارف نہ کرا سکتی اور سسی بھی تھل میں زلزلے کا باعث نہ بنتی، مہینوال کے "رانجھا" کیا مشہور ہوتے نہ رانجھے کے چوری کھانے اور ونجھلی بجانے کا کہیں ذکر ہوتا۔ نہ رام سیتا کے پیچھے لنکا ڈھا کر تاریخ کا رخ بدلتا۔ اگر یہ سب لوگ تاریخ کے اوراق میں اور لوگوں کے دلوں میں زندہ ہیں تو دو ہونے کی وجہ سے ایک ہونے

کی صورت میں یہ ذرا بھی قابلِ ذکر نہ ہوتے۔

بزرگ اکثر اولاد کے بارے میں اس خواہش کا اظہار کرتے ہیں کہ "ایک ہو پر نیک ہو" لیکن یہ اتنا ہی آسان ہے جتنا کونسلر سے کام نکلوانا لہٰذا نوجوان نیک ہونے کا رسک لینے کی بجائے ہمہ وقت دو ہونے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ لیکن دو ہونے کے بعد وہ بار بار ایک ہوتے ہیں۔ جس سے گھر کی مردم شماری میں اضافہ ہونا شروع ہو جاتا ہے اور فیملی پلاننگ والوں کی مشکلات کچھ اور بڑھ جاتی ہیں۔ ایک ہونے کے نقصانات یہیں تک نہیں جب تک بندہ ایک ہوتا ہے وہ دو کے چکر میں شہر بھر کے ہر محلے کی ہر گلی کے ہر گھر سے خوار ہوتا ہے اور دو ہونے کے بعد اسے فائدہ یہ ہے کہ پھر وہ صرف اپنے ہی گھر سے خوار ہوتا ہے۔ اکیلے آدمی کی نگرانی اس کے والدین تو کیا پورا محلہ کرتا ہے جب کہ جو ایک نہ رہا ہو اسے خواہ مخواہ شریف تصور کر لیا جاتا ہے اور تو اور شادیوں کے فنکشن میں عموماً اکیلوں کو خواتین کے حصے سے دور رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے حتیٰ کہ انتظامیہ تک میں ان لوگوں کو رکھا جاتا ہے۔ جو دو ہو چکے ہوں، اکیلوں کو یہ "سہولت" حاصل کرنے کے لیے اچھی خاصی جدوجہد کرنا پڑتی ہے۔

ایک کے نقصانات اس قدر ہیں کہ ان کو ایک دم بتایا بھی نہیں جا سکتا۔ یہ تو مسلمہ حقائق ہیں کہ سو سو بیمار صرف ایک انار کے لیے ہو جاتے ہیں۔ کہے ایک تو بھرنا دس دس کو پڑتا ہے۔ ایک اینٹ کے لیے مسجد تک ڈھا دی جاتی ہے۔ ایک میان میں دو تلواریں تو رہ نہیں سکتیں۔ ایک مچھلی سارے جل کو گندہ کر دیتی ہے۔ ایک پاپی پوری ناؤ لے ڈوبتا ہے۔ ایک کہیں تو دس سنائی جاتی ہیں۔ ایک سر میں ہزار سودا سما جاتا ہے۔ تالی تک تو ایک ہاتھ سے بج نہیں سکتی اور ایک چنا چاہے وہ کتنا ہی سورما کیوں نہ ہو بھاڑ نہیں پھوڑ سکتا اور آج تو زمانہ ایسا ہے کہ ایک کو ایک کھائے جاتا ہے۔ ایک تو صرف ایک ہی ہوتا ہے۔ لیکن جب دو ایک ہو جائیں تو گیارہ ہو جایا کرتے ہیں۔

کِشت - مات

اعجاز وارثی
(سنبھل یوپی)

مائل بہ شکر اہلِ محلہ کے لب ہوئے
اک آفیسر قریب سے آباد جب ہوئے

عہدہ بڑا تھا نام کے تھے زیڈ۔ آر۔ شان
باقی ہر اعتبار سے بے تیر کی کمان

جس طرح نائیلون میں دھاگے کپاس کے
بیگم سدا بہار تھیں، شوہر پچاس کے

اک بیٹی بھی تھی شامل افراد خاندان
ماں باپ جس کو دیکھ کے رہتے تھے شادماں

ہمسایوں نے یہ سوچا اضافہ ہے سود مند
امکاں سکون و امن کے ہو جائیں گے دو چند

فتنہ فساد ہوں گے کہیں اور نہ شور و شر
موجود ہے نواح میں اک مرد با اثر

اُمیدوں، آرزوؤں کا گلشن شگفتہ تھا
آمادہ دشمنی پہ مگر بخت خفتہ تھا

اس خاندان کا مسئلہ اک قہر ہو گیا
تریاق جس کو سمجھے تھے وہ زہر ہو گیا

مشکل سے ایک ہفتہ ہی گزرا تھا خیر سے
نووارد اِک طرح سے نظر آئے غیر سے

مٹی ہوئی پلید حیا کے غلاف کی
پھلجھڑیاں چھوٹنے لگیں لاف و گزاف کی

حیراں تھے لوگ محترمہ کی زبان پر
جو مستقل عذاب تھی شوہر کی جان پر

بے مہری و تغافل و تنہائی کا گِلہ
فقدانِ التفات و پذیرائی کا گِلہ

بے کیف شاموں، بے مزہ صبحوں کا شکوہ تھا
جو گھٹ کے رہ گئیں اُن امنگوں کا شکوہ تھا

آخر برس پڑیں یہ بُری طرح ایک روز
آواز سے عیاں تھا قیامت کا کرب و سوز

شوہر سے بولیں کیسے نکمے بشر ہو تم
شادی سے میری بیٹی کی کیوں بے خبر ہو تم

اب کچھ نہیں سنوں گی، مجھے رشتہ چاہیئے
اکلوتی لاڈلی کے لئے لڑکا چاہیئے

کب سے میں کہہ رہی ہوں کرو بات طے کہیں
لیکن تمہارے کان پہ جوں رینگتی نہیں

ناگفتنی و سخت کلامی کا ساتھ تھا
کف در دہن میاں کے گریباں پہ ہاتھ تھا

خوش فہمیوں کی داد جو ہمسایوں کو ملی
میدانِ کارزار میں اِک بھیڑ لگ گئی

دستِ دراز سے جو میاں جی رہا ہوئے
بیچارگی کے لہجے میں یُوں لب کشا ہوئے

بیگم، مری تلاش میں کوئی کمی نہیں
یہ اور بات، بات ابھی تک بنی نہیں

کہنے کو یوں تو سیکڑوں لڑکے مجھے ملے
بدقسمتی سے جتنے ملے سب گدھے ملے

بیگم نے بات کاٹ کے فوراً کہا، سنو
شاید پرانی وضع تمہیں اپنی یاد ہو

ڈیڈی بھی میرے سوچتے رہتے تھے، اگر
کنواری ہی رہتی میں بھی بلاشبہ عمر بھر

فاتح کی حیثیت سے اٹھائے پھر اپنے ہاتھ
اِک چال ہی میں کہہ دیا ہو جیسے کشت۔ مات

آندھرا پردیش ریاستی اقلیتی فینانس کارپوریشن

4-1-825/B سکنڈ فلور لکشمی اسٹیٹ عابڈز۔ حیدرآباد۔ ۱۰

حکومت آندھرا پردیش کی جانب سے چلنے والا اِدارہ جہاں ریاست سے تعلق رکھنے اقلیتی افراد، مسلمان، سِکھ، عیسائی، پارسی، جین، بدھسٹ کو قرضہ جات کی فراہمی کی جاتی ہے، یہ قرضہ جات (۱۲) اسکیموں کے تحت دیئے جاتے ہیں۔

۱۔ غربت ہٹاؤ اسکیم　　۲۔ خود روزگار اسکیم

۱۔ غربت ہٹاؤ اسکیم : اس اسکیم کے تحت 10,000 ہزار روپے کی جملہ لاگت کے کاروبار کے لیے جیسے کرانہ اسٹور، سیکل ٹیکسی، بک بائنڈنگ، ترکاری فروشی، اگربتی تیار کرنے کے لیے میوہ فروشی وغیرہ وغیرہ کے لیے قرضہ جات دیئے جاتے ہیں۔ اس جملہ لاگت کا ۲۸ فیصد کارپوریشن سے دیا جاتا ہے اصل اس کو ۲۰ آسان ماہانہ اقساط میں بہ شرح ۴٪ کے ساتھ ادا کرنا پڑتا ہے اور مابقی بنک کے ذریعہ دلایا جاتا ہے اور اس اسکیم میں درخواست گزار کی سالانہ آمدنی 6000 روپے سے کم ہونی چاہیئے۔

۲۔ خود روزگار اسکیم : اس اسکیم کے تحت 2,50,000 روپے کی جملہ لاگت کے کاروبار کے لیے جیسے چھوٹی صنعتیں، گھریلو صنعتیں، کسی بھی قسم کی تجارت، پرنٹنگ پریس، میڈیکل شاپ، زیراکس مشین کے لیے، آٹو رکشا، آٹو ٹرالی وغیرہ وغیرہ کے لیے قرضہ جات دیئے جاتے ہیں۔ اس جملہ لاگت کا ۲۰ فیصد یا زیادہ سے زیادہ 40,000 روپے کارپوریشن کی جانب سے بطور "مارجن منی" شرح سود ۶½ فیصد پر دیا جاتا ہے اور اس کو (۳۰) آسان اقساط میں واپس کرنا پڑتا ہے اور باقی رقم بنک سے دلائی جاتی ہے۔

یہ کارپوریشن، تمام ریاست میں اب تک 44004 افراد میں 565,60,000 روپے مارجن منی جاری کر چکا ہے جس کی جملہ لاگت 32,55,13,000 روپے ہے۔

خواہش مند افراد مندرجہ بالا پتہ پر رجوع ہوں

محمد لائق علی خان
منیجنگ ڈائرکٹر

شکیل شاہ جہاں (کامٹی)

اَن ریزروڈ کمپارٹمنٹ

آپ نے ہوائی جہاز میں سفر کیا ہوگا۔ پانی کے جہاز سے بھی آپ کو واسطہ پڑا ہوگا۔ اسٹیٹ ٹرانسپورٹ اور پرائیوٹ بسوں میں بھی سفر کا لطف اٹھایا ہوگا۔ ٹرینوں میں بھی سفر کا موقع ملا ہوگا۔ لیکن ریزرویشن کے ساتھ اگر آپ نے انڈین ریلوے کی میل یا ایکسپریس ٹرینوں کے اَن ریزروڈ کمپارٹمنٹ میں طویل سفر نہیں کیا تو سارے سفر فضول، بے کار اور لاحاصل ہیں۔ سفر کا جو لطف اَن ریزروڈ کمپارٹمنٹ میں آتا ہے شاید ہی کسی اور جگہ میسر ہو۔ کمپارٹمنٹ میں بھائی چارگی، اخوت، مساوات، ایک دوسرے کے دکھ درد کو سمجھنے اور شریک ہونے کا جو عمل ہوتا ہے اس کی مثال ہماری پارلیمنٹ سے لے کر پورے ہندوستان میں کہیں نہیں مل سکتی۔ ہر شخص ایک دوسرے کی مدد اور سہارے کے لیے تیار رہتا ہے۔ کوئی کسی کے واسطے پانی مہیا کرتا ہے تو کوئی کسی کے واسطے اپنی سیٹ پر تھوڑی سی جگہ کا انتظام کرتا ہے۔ اگر ہمارے لیڈر صاحبان کو کچھ سیکھنا ہے تو وہ سکنڈ کلاس کے ان ریزروڈ کمپارٹمنٹ میں ضرور سفر کریں۔ مہاتما گاندھی کو بھی اس بات کا تجربہ تھا اسی لیے وہ ہمیشہ اسی کمپارٹمنٹ میں سفر کرتے تھے لیکن اب لوگ کہاں مہاتما گاندھی بن سکتے ہیں۔ ہاں گاندھی کے دیے ہوئے نعروں اور آدرشوں کو بھری سبھاؤں میں دہرا کر نادان جنتا کو دھوکا دے کر ووٹ ضرور حاصل کر سکتے ہیں۔

خیر بات سکنڈ کلاس کے ان ریزروڈ کمپارٹمنٹ کی چل رہی تھی۔ یہ کمپارٹمنٹ عام طور پر یا تو ٹرین کے سب سے پیچھے والا ڈبہ ہوتا ہے یا انجن سے لگ کر ہوتا ہے۔ اس سے اس بات کا انکشاف ہوتا ہے کہ ریلوے ڈپارٹمنٹ میں عام جنتا کی کیا اہمیت ہے جس طرح سرکاری دفتروں میں عام جنتا کا کوئی پرسان حال نہیں ہوتا اسی طرح ان کمپارٹمنٹ کے مسافروں کا بھی پرسان حال نہیں ہوتا۔ اس میں سوار مسافر اپنی حفاظت کے بلا خود ذمہ دار ہوتے ہیں۔ انھیں ٹکٹ لے کر بھی سیٹ نصیب نہیں ہوتا اور بنا ٹکٹ مسافروں کی طرح

سفر کرتے ہیں۔

ہمارا خیال ہے کہ اگر کسی مجرم کو سزا دینی ہے تو اسے سیکنڈ کلاس کے ان ریزروڈ کمپارٹمنٹ میں کسی لمبے سفر کے لیے سوار کر دو۔ آدھے سفر میں ہی وہ کہہ دے گا کہ جیل کی چار دیواری میں رہنا مجھے پسند ہے لیکن یہ سفر پسند نہیں۔

اس کمپارٹمنٹ میں لوگ زیادہ ہوتے ہیں اس لیے جگہ کم ہو جاتی ہے۔ یا جگہ کم اور لوگ زیادہ ہو جاتے ہیں۔ ہمارے ملک کی آبادی کا اندازہ اس کمپارٹمنٹ سے لگایا جا سکتا ہے۔ کالج کے پروفیسر سے لے کر رکشا چلانے والے تک سب کا حال ایک جیسا۔ جس کو جہاں جگہ ملی بیٹھ جاتا ہے۔ کمپارٹمنٹ والوں کی ترتیب نہیں ہوتی جیسے بھیڑ بکریوں میں بھیڑ بکریوں کی کوئی ترتیب نہیں ہوتی ہے ہوتا بھی یہی ہے جہاں جگہ کم اور لوگ زیادہ ہوں وہاں کوئی قانون کوئی قاعدہ اور کوئی ترتیب نہیں ہوتی۔ لوگ جو اور جیسا چاہتے ہیں کرتے ہیں۔ آج ہمارے ملک میں بھی ایسا ہی ہو رہا ہے۔ سارے قانون قاعدے اور ترکیب کتابوں میں بند ہیں۔ پارلیمنٹ سے لے کر سرکاری دفتروں تک ہر جگہ من مانی ہے۔ ہر آدمی اپنا قانون بنا کر اس پر عمل کر رہا ہے۔ یہ بات الگ ہے کہ اس کے اپنے قانون کے بہت سے نکات ہمارے ملک کے قانون سے مشابہ نکل جاتے ہیں۔

ٹرین اسٹیشن پر رکتی ہے۔ ٹھیلے اور خوانچے والے آواز لگانا شروع کر دیتے ہیں۔ اگر آپ ایک سموسہ یا وڑا ٹا (آلو بونڈا) خریدیں گے تو اس کو حلق کے نیچے اتارنے کے لیے دو گلاس پانی کی ضرورت پڑے گی۔ اب آپ اسٹیشن پر پانی کی تلاش میں نکلیں گے۔ سامنے بورڈ پر پینے کا ٹھنڈا پانی لکھا ہوا ہے۔ لیکن نل سے جو پانی دستیاب ہوگا معاف کرنا میرے پاس الفاظ نہیں ہیں کہ وہ پانی کیسا ہوگا۔ بہر حال پانی ہوگا آپ وہ پانی پیجیے کیوں کہ آپ کو صرف چند گھنٹے گزارنے ہیں۔ پوری زندگی نہیں اور میں سمجھتا ہوں یہی مقصد ہمارے محکمۂ ریلوے کا ہے۔ ریل میں لوگ چند گھنٹے گزارتے ہیں اس لیے ان کو کیوں کر زیادہ سہولتیں دی جائیں۔ پھر آپ سموسہ یا وڑا ٹا کھا کر فارغ ہوتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ ایک آدھ کپ چائے ہو جائے کیوں کہ ایک چائے والا مسلسل چلا رہا ہے۔ اس کی چلاہٹ کا بھی احترام کرنا ہے لیکن ہمارے ملک میں ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو بہت خاص کہلاتا ہے۔ جس پر عام جنتا کے چلانے کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ وہ لوگ اپنی دنیا، اپنی کرسی اور اپنی پالسی میں مگن رہتے ہیں صرف پانچ سال میں ایک مرتبہ ووٹ مانگنے نکلتے ہیں۔ الیکشن جیتنے کے بعد خاموشی اختیار کر لیتے ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ایسے ہی لوگوں کے ہاتھوں میں ہمارے ملک کی باگ ڈور ہے۔ یہی لوگ جمہوریت کے پاسبان ہیں دکھ ہوتا ہے عوام پر کہ وہ کس طرح اپنے پیدائشی حق کا استعمال کر کے اپنے جینے کے حق سے محروم ہو جاتے ہیں۔

بہر حال آپ چائے پیجیے اور وہ بھی برداشت کر کے۔ چائے کی قیمت بھی ادا کرنی ہے اور برداشت بھی کرنا ہے۔ یہی اسٹیشنوں کی چائے کی سب سے بڑی خوبی ہے۔

ایک بار میرا بیٹا بیمار ہو گیا۔ دوا پینے کے لیے وہ تیار نہ تھا۔

میں نے کہا۔ "چلو اسٹیشن کی چائے سمجھ کر پی جاؤ۔"

وہ پھر بھی دوا [illegible] پی گیا۔ پھر میری جانب [illegible] ہوئے بولا۔ "ڈیڈی! یہ دوا تو

[…]ستی کی چاہت سے بھی ہے۔

جمہوریت کی اصل تصویر آپ کو ان ریلوے ڈپارٹمنٹ میں دیکھنے کو ملے گی۔ لوگ کس طرح ایک دوسرے کے کام آرہے ہیں۔ ایک دوسرے کو جگہ دے رہے ہیں۔ ایک دوسرے سے محبت اور بھائی چارگی کا سلوک کر رہے ہیں۔ ہر مذہب اور ہر زبان کے لوگ […] اپنی اپنی زبانیں بول اور پڑھ رہے ہیں۔ نہ کوئی تکرار، کوئی بحث کوئی تصادم نہیں بلکہ ایک دوسرے کی زبان بولتے اور پڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ سب کچھ اس لیے ہو رہا ہے کیونکہ ان کے بیچ کوئی سیاست داں نہیں ہے۔ اور نہ ہی کسی فرقہ پرست پارٹی کا رہنما ہے۔ یہ ہے ہمارے […]ت کے سارے عوام ہیں جو بھولے بھالے ہیں جن کے بیچ کوئی تفرقہ نہیں ہے۔

اسمٰعیل ظریف
حیدرآباد

غزل

انہیں پا کر بھی کوئی شکوہ نہ پائے
گئے ٹکنی سکر کے دُکھ اُٹھائے

وہ آکر قبر پر شمع جلائے
جو باقی تیل تھا سر میں لگائے

سلامت وہ شفا خانے سے آئے
پھر ایک ننھی مصیبت ساتھ لائے

نکل بھاگی اُدھر بلّی کہیں سے
اِدھر دھوکا ہوا شاید وہ آئے

ہے گھر میں چاند تاروں کا نظارہ
بہت عرصہ ہوا چھت کو چھوائے

بُلاؤ فائیر برگیڈ کو بلاؤ!
قفس کی آنچ گلشن پر نہ آئے

غزل کہتے ہیں خونِ دل جلا کر
یہ مت سمجھو کہ ہم لکھوا کے لائے

ظریفؔ ہم نے سنا ہے آپ نے بھی
جوانی میں بہت سے گُل کِھلائے

ڈاکٹر راضی قریشی
گلبرگہ (کرناٹک)

چلو یونہی سہی

گھر میں ہے موجود ایٹم بَم ، چلو یونہی سہی
یعنی بَرہَم ہے بڑی بیگم ، چلو یونہی سہی
جب مِرا "شیخو" ہوا وابستۂ زُلفِ کنیز
میں بنوں گا "اکبرِ اعظم" چلو یونہی سہی
یہ مُختسر صاحب کی کوٹھی کا ہے بابُ الداخلہ
سَر ہے اِس چوکھٹ پہ اپنا خَم چلو یونہی سہی
میری ہر تنخواہ پہ اَبّا کا حق ثابت ہوا
یہ بھی ہے اِک MONTHLY ماتم چلو یونہی سہی
گرمیوں میں شہر گلبرگہ میں پھر اب کے برس
قطرہ قطرہ آب تھا زَم زَم ، چلو یونہی سہی
شاعروں کے حق میں بارش ہے نہ سردی ہے نہ دھوپ
ہے فقط اِک ہجر کا موسم ، چلو یونہی سہی
نوکری ملتی نہیں تو آؤ اسمگلر بنیں
کیوں نہ خوشیوں سے بدل دیں غم چلو یونہی سہی
وہ "الِف" سے "عِلم" لکھتا ہے ، یہی ہے اک اَلَم
ایک عالِم کا ہے یہ عالَم ، چلو یونہی سہی
ان دو پٹّوں کا کوئی مَصرف نہ تھا اِک عمر سے
آخر اِن سے بن گئے پرچم ، چلو یونہی سہی
اِک ادا سے کہہ دیا "GO" اور کھڑکی بند کی
گو کہ میں کہتا رہا COME COME ، چلو یونہی سہی
بد گمانی قدر راضیؔ ہم کو اب تک ہے عزیز
آؤٹ ڈیٹڈ ہو گئے ہیں ہم ، چلو یونہی سہی

مصطفیٰ ندیم خاں غوری (حیدرآباد)

نوٹ کا سفر

آج ہم آپ کو ایک ایسی کرنسی نوٹ کی داستان سناتے ہیں جو شاید اس وقت ریزرو بنک کے کسی نہاں خانے میں پڑی اپنے وجود کے تلف کیے جانے کی منتظر ہو۔ ایک ایسا بوسیدہ وجود جس کی کمر ٹوٹ کر ٹکڑے ہو گئی ہو اور جس میں کئی روزن در آچکے ہوں اور جس کی شناخت بھی دشوار ہو۔

اس نے اپنی کہانی کا آغاز کرتے ہوئے کہا کہ یہ ان دنوں کی بات ہے جب کہ کولار کی سونے کی کانوں سے ڈھیروں سونا نکال کر اس کی اینٹیں ترتیب دی گئی تھیں۔ یہ کوئی چالیس کیلو گرام سونا ہوگا مگر ریزرو بنک کو ایک سو کیلو گرام سونے کی قیمت کے مساوی نوٹ چھاپنے کا اختیار دیا گیا تھا۔ چنانچہ ناسک کے سرکاری پریس میں نوٹیں چھاپی گئیں اور کراری نوٹوں کی گڈیاں در گڈیاں ریزرو بنک کو پہنچا دی گئیں۔ وہاں سے انھیں ملک کے مختلف بنکوں کو روانہ کیا گیا۔ انھیں میں میں بھی ایک تھی۔ مخصوص خوشبو میں بسی پائیدار اور کراری نوٹ جس کے آگے تمام صفات ہیچ۔ بہرحال اسی آب و تاب کے ساتھ میری جلوہ نمائی ہوئی۔

بنکوں سے نکلی تو تجوریوں میں بند رہی اور جب تک تجوریوں میں قید رہی تب تک بے شکن رہی۔ لیکن باہر کی ہوا تو بہرحال لگنی ہی تھی پھر جیسے جیسے خزانوں، تجوریوں، کاونٹروں، پاکٹوں، جیبوں اور انگلیوں سے گزرتی رہی ویسے ویسے اس دنیا دار کی حقیقت کھلتی گئی۔ اور یہ بھی بھید کھلا کہ روپیہ سے دنیا چلتی ہے۔

سب سے پہلے مجھے اپنے بنک نے ایک بڑے ٹھیکہ دار کے حوالے کیا۔ میرے ساتھ لاکھوں روپیہ کے چھوٹے بڑے دیگر نوٹ بھی تھے۔ اس خوشی میں ٹھیکہ دار نے ایک پارٹی کا اہتمام کیا تھا۔ جس میں ایک رقاصہ نے اپنے حسن و فن کا رنگ جما دیا تھا۔ رقص و سرود کی یہ محفل رت جگا ثابت ہوئی۔ ٹھیکہ دار نے تو رقاصہ کی اوڑھنی چھونے تک کا ٹھیکہ لے رکھا تھا۔ وہ نوٹ لٹاتا رہا [illegible] رقاصہ کے فن کا [illegible] میں بکھرتے رہے

اس کے بعد وہاں بکھرے ہوئے نوٹوں کو چوم چوم کر اپنے فن کی قیمت جتاتے رہے۔ میری قسمت میں رقاصہ کی پازیب
نہ تھی سو میں بچ رہی۔ لیکن میں ان محنت کش مزدوروں کی دسترس سے بھی باہر تھی جن کی ادائیگی کے لیے یہ خطیر
رقم جاری کی گئی تھی۔ البتہ کچھ دن بعد ٹھیکہ دار نے مجھے اپنے بل پاس ہونے کی خوشی میں کسی طے شدہ نذرانے کے
طور پر حوالے کر دیا۔ پھر جیسے جیسے میں مقام بدلتی رہی مجھ کو بڑی اور اچھی بُری کہانیوں کا ایک سلسلہ چلتا رہا۔
نذرانہ وصول کرنے والے شخص نے میری قیمت پر مندر میں پھول اور پرساد چڑھانے والے سے مجھے ایک عبادت
گاہ کی تعمیر میں بطور چندہ دیا۔ عبادت خانہ تو بن گیا مگر عبادت کرنے والوں سے محروم رہا۔ عبادت خانہ کی تعمیر
کے دوران میں مزدوروں میں تقسیم ہو گئی۔ ایک مزدور کے گھر میں کچھ ہی دیر رہ پائی۔ مجھے کھانے کا تیل خریدنے
میں خرچ کیا گیا۔ تیل کی اس تین دن میں پہلی بار داغ دار ہوئی۔ لیکن پھر بھی میں چلتی رہی۔ اس دکان دار نے مجھے
منی آرڈر کر دیا۔ میرے ساتھ دس دس کے تین اور پچاس کا ایک نوٹ بھی تھا مگر پھر بھی ہم اسی شہر کے ڈاک
خانے میں رہے۔ البتہ منی آرڈر فارم دوسرے شہر چلا گیا۔ ڈاک خانے والوں نے مجھے کسی دوسری منی آرڈر
کے بدلے ایک بیوہ کو ادا کر دیا۔ اب کے میرے ساتھ سو روپیے کے دو نوٹ کا ایک اور دس روپیہ کا بھی ایک
نوٹ تھا۔ روپیہ وصول کرنے کے بعد بیوہ کو ریزگاری کی ضرورت پیش آئی۔ وہ مجھے دکان دکان لیے گھومتی رہی لیکن
کچھ سامان خریدے بنا اسے ریزگاری نہ مل سکی۔ مجبوراً اسے ایک پنساری سے کچھ سامان خریدنا پڑا۔

پنساری نے مجھے اپنے لڑکے کے حوالے کر دیا کہ وہ اسکول میں اپنی فیس داخل کر دے۔ لڑکے نے بجائے فیس داخل
کرنے کے اس رقم میں مزید روپیہ شامل کر کے کرکٹ کی ایک بیٹ اور بال خرید کر بھری پری سڑک پر وہ وہ
چھکے اور چوکے لگائے کہ کسی کی آنکھ پھوٹی تو کسی کا سر۔

اسپورٹس کی دکان پر مالک کی نظر بچا کر مجھے چرا لیا گیا۔ اور میرے بدلے سینما کا ٹکٹ خرید کر چوری
ڈاکے اور مار دھاڑ سے بھرپور فلم دیکھی گئی۔ عجیب اتفاق کہ جس شخص کی تحویل میں میں تھی اسے قتل کر کے روپیہ
لوٹ لیا گیا۔ ڈاکوؤں نے شراب پی کر مجھے جوئے میں ہار دیا مگر پکڑے گئے۔

جوئے خانے کے مالک بڑے شردھالو تھے انھوں نے چار دھام تیرتھ یاترا کر کے مجھے ثواب کے کام میں
صرف کیا اور میں ایک پنڈت جی کے پاس پہنچ گئی۔ اس طرح میں نے سارے دیش کی سیر کی۔ کہاں کہاں نہ پہنچی
چھوٹے سے چھوٹے گاؤں اور بڑے سے بڑے شہر کے رنگ ڈھنگ دیکھے۔ اس دوران مجھ پر کافی شکنیں آ گئی
تھیں۔ چار چار، آٹھ آٹھ تہوں میں سلوٹیں پڑتی جاتی تھیں۔ تیل کے داغ پر مزید میل جم گیا تھا۔ اب لوگ ناک بھوں
چڑھا کر مجھے قبول کرنے لگے۔

پنڈت جی نے اپنے پڑوسی مولانا کی لڑکی کی شادی کے موقع پر میرے ساتھ شگون کے طور پر ایک
روپیہ شریک کر کے آشیرواد کے ساتھ بطور نذرانہ بخشش کر دیا۔ میں مولانا کی جیب میں [illegible] کے ساتھ
کئی دن پڑی رہی۔ ایک دن مولانا سٹی بس میں سفر کر رہے تھے کہ ایک نوسکھیا جیب کترے نے ان کی جیب
پہلی بار سے مشق شروع کر دی۔ روپیہ تو بچ گیا لیکن جیب کترا پکڑا گیا تاہم [illegible]
[illegible] مولانا نے بڑی استادی سے [illegible]
[illegible]
[illegible] شاپ پر [illegible] کی خاطر داری کے طور پر مجھے پان والے کے حوالے کر دیا۔ اس نے

محبت میں اپنے گیلے ہاتھوں سے میری خستہ حالت [illegible] کے ساتھ مزید چونا لگا دیا۔ لیکن اچانک اسے خیال آیا کہ نوٹ اتنی ردی ہو چکی ہے کہ اس کا مزید چلنا محال ہے۔ اس نے لڑکے سے بحث کی کہ نوٹ چلنے والی نہیں۔ لڑکے نے فوراً الٹا سوال کر دیا تو پھر اسے چونا کیوں لگا دیا۔ غلطی ہو چکی تھی۔ وہ بے چارہ چپکا رہا اور لڑکا بنی ٹولی کے ساتھ پانی چباتے ہوئے فاتحانہ انداز سے چل دیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد پان والے نے مجھے بڑی احتیاط سے ایک بابوجی کو چپکا دیا۔ انھیں خیال بھی نہ رہا۔ کوئی دو تین روز بعد انھیں اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ سوچتے رہے کہ یہ نوٹ انھیں کس نے دی ہوگی۔ تنخواہ سے ملی یا پرچون کی دکان سے یا نہ جانے کہاں سے! آخر انھوں نے یہ طے کر لیا کہ شاید پرچون کی دکان ہی سے انھیں یہ نوٹ ملی ہوگی۔ چنانچہ وہ بنیے سے ریزگاری لینے کے لیے نکلے۔

بنیے نے انھیں دور ہی سے دیکھ کر ہانک لگائی۔ آؤ مالک آؤ۔ حکم کرو کیا سیوا کروں۔ بابوجی نے پس و پیش کرتے ہوئے مجھے نکالا اور ریزگاری کے طلب گار ہوئے۔ بنیے نے میرے بدلے مجھ سے بھی بدتر پانچ پانچ کے چار نوٹ بابوجی کو تھما دیے۔ اب ایک کی بجائے بابوجی کے پاس کئی بدترین بوسیدہ نوٹ آ چکے تھے جس کی وجہ سے ان کا چہرہ مزید لٹک گیا لیکن کیا کریں، گویم مشکل نہ گویم مشکل۔ دکان دار ان کی اس کشمکش کو محسوس کر کے اندر ہی اندر مسکرا رہا تھا۔

پرچون والے نے مجھے اسٹیٹ بنک روانہ کر کے نئی نوٹ بدلوالی، اسٹیٹ بنک نے مجھے ریزرو بنک روانہ کر دیا۔ میں اپنا سفر پورا کر چکی تھی۔ لیکن اس سفر کے دوران میں نے کئی قسم کے لوگ دیکھے ایسے لوگ جو لین دین میں سب سے بوسیدہ نوٹ سب سے پہلے ادا کرتے ہیں۔ یہ لوگ اس بدترین بلا سے جلد سے جلد چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ یہ اچھی چیز اپنے لیے رکھتے اور بری چیز اوروں کے حوالے کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ وہ لوگ بھی ملے جن کا مقصد حیات محض روپیہ ہوتا ہے اور وہ بھی جو روپیہ کو محنت سے کماتے ہیں اور سلیقہ سے خرچ کرتے ہیں۔ ایسے لوگ بھی جو روپیہ پیسے سے بے نیاز ہوتے ہیں۔ انھیں اس کی پرواہ ہی نہیں ہوتی اور کچھ ایسے لوگ جو روپیہ کے پیچھے دیوانہ وار دوڑ لگاتے ہیں لیکن پھر بھی انھیں روپیہ نصیب نہیں ہوتا۔

ایکٹر سے نیتا تک

مفلسؔ فاروقی

زور پہ ڈنڈے کے لیڈر بن گئے
ہم بھی آخر وارڈ ممبر بن گئے

آگئے چن کر منسٹر بن گئے
ہم مقدر کے سکندر بن گئے

بن گئے ذرے سے آخر آفتاب
یعنی قطرے سے سمندر بن گئے

ہوگئے بے مول سے انمول ہم
پہلے اک کنکر تھے گوہر بن گئے

آج آقا ہوگئے کل تھے غلام
بندہ تھے اب بندہ پرور بن گئے

فلیٹ میں ہیں، تھے کبھی فٹ پاتھ پر
پیر تھے کل آج ہم سر بن گئے

داؤ جب الٹا سیاست کا پڑا
دفعتاً صاحب پیشچر بن گئے

شان میں نیتا کی کویتائیں لکھیں
اور پل بھر میں سخنور بن گئے

دین اور ایمان کا سودا کیا
ننگے بھوکے صاحب زر بن گئے

کیا ہوا ہیرو نہ بن پائے اگر
یہ بھی کیا کم ہے کہ جوکر بن گئے

اچھی خاصی آدمی سی شکل تھی
دھن میں سب فیشن کی بندر بن گئے

رکھتے ہی رشوت کے زینے پر قدم
یہ کلکٹر وہ کمشنر بن گئے

دے دلا کر چپراسی بابو بن گیا
اور جو بابو تھے، افسر بن گئے

کیا عجب اک دن چھپے اخبار میں
جتنے ایکٹر تھے منسٹر بن گئے

نوکری کے چھوٹتے ہی گھر میں ہم
پچھلے برسوں کا کیلنڈر بن گئے

رات محفل میں پڑھی پہلی غزل
صبح وہ غالب کے ہمسر بن گئے

اے سیاست تیرے قدموں کے طفیل
ہم بھی مفلس سے تونگر بن گئے

چکرؔ نظام آبادی

میں مزے میں ہوں

گھر میں نہیں ہے آہ و فغاں میں مزے میں ہوں
لیڈر بنا ہوں جب سے میاں میں مزے میں ہوں

سرپنچ چنا گیا ہوں میں جس روز سے حضور
کس چیز کی کمی ہے یہاں میں مزے میں ہوں

دو بیویاں کماتی ہیں بنگلہ ہے ساس کا
سب کچھ ہے میرے پاس میاں میں مزے میں ہوں

بیٹے جو چار اُن کے کماتے ہیں گلف میں
کہتے ہیں اب جہاں میاں میں مزے میں ہوں

اب کے چناؤ میں میں بنا دیس کا ایک تاج
میں ماڈرن ہوں شاہجہاں میں مزے میں ہوں

پیچھے گری ہو وہ کہ ہو نیتا گری سبھی
چکر چلا چلا کے میاں میں مزے میں ہوں

فاطمہ تاج
(حیدرآباد)

نیند ہماری....

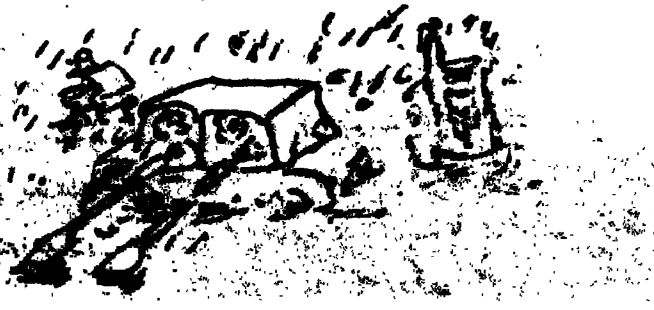
ہمیں اس بات پر بہت ناز ہے کہ ہم بہت گہری نیند سوتے ہیں، ہم عام لوگوں کی طرح "سرسراہٹ" سے جاگنے والوں میں نہیں بلکہ ہم تو ان بے جگر لوگوں میں سے ہیں جو نکسلائٹس اور پولیس کی گولیوں کے درمیان بھی سوئے رہتے ہیں، دھماکے ہمارے نزدیک اہمیت نہیں رکھتے اور نہ یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ رات کے سناٹے میں کوئی زوردار آواز سن کر گھبرا کر اٹھ جائیں اور سارے گھر والوں کو پریشان کر ڈالیں اور اتنی ذرا سی بات پر خوابوں کے حسین نگر سے دوڑے چلے آئیں۔

ہمارے پاس نیند بڑی فرصت سے آتی ہے اور وہ خوابوں کے رنگین پٹارے سے کئی خواب نکال کر ہمیں دیتی ہے اور ہم ان خوابوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنے میں منہمک ہو جاتے ہیں۔ ان خوابوں کے دامن رنگ برنگے ستاروں سے آراستہ ہوتے ہیں۔ ہم ستاروں کی اس خاموش دنیا میں بڑے سکون سے جمے رہتے ہیں جہاں روشنی دبے پاؤں چلتی ہوئی ہمارے قریب آجاتی ہے اور ہم روشنی کو دستک دے کر دوبارہ آنے کی تاکید کر کے رخصت کر دیتے ہیں۔ خاموشیوں کو توڑتی، اندھیروں کو چیرتی صبح ہمیں جگا دیتی ہے مگر ہم رات کے فسوں سے پھر بھی پیچھا نہیں چھڑا پاتے اور پھر مسلسل گھر والے سوال کرنے لگتے ہیں کہ آخر ہم ایسی نیند کیوں سوتے ہیں کہ حالات کی خبر ہی نہیں ہوتی!

ایک دفعہ ہمیں بتایا گیا کہ بازو کے میدان میں رات کو تعمیر کے لیے سرنگ لگایا گیا تھا کئی زوردار دھماکوں سے آس پاس کی بلڈنگیں دہل گئیں، لوگ زلزلہ سمجھ کر باہر نکل پڑے لیکن ہم ایسے کہ اداۓ بے نیازی سے سوتے ہی رہے اس وحشت میں بھلا کسے کسے پوچھتا؟ جب دھماکوں کی اطلاع پولیس اسٹیشن تک پہنچی تو پولیس نے آکر دھماکے رکوا دیئے اور لوگوں کی جان میں جان آئی۔ جب ہماری تلاش شروع ہوئی تو ہم اس [illegible]

سے اپنے پلنگ کے نیچے گر پڑے تھے لیکن نیند ڈوبی ہیں تھی گھر والے یہ سمجھے کہ ہم "گزر گئے" ہلکی ہلکی سسکیوں
کی لہریں زوردار ہچکیوں میں تبدیل ہو گئیں۔ ہم نے پھر بھی جنبش نہیں کی۔ نہ جانے کب ہمیں ہال کے وسط
میں اٹھا کر رکھا گیا۔ کسی "جہاں دیدہ" نے ہماری نبض اور دل کی دھڑکن محسوس کی اور نعرہ بلند ہوا کہ "ہم
زندہ ہیں" ہمارے گھر میں خوشیوں کے دریا ابل پڑے، روتے چہرے مسکرانے لگے۔ ہمیں بچوں نے بتلایا
تھا کہ ہم واقعی گزر نہ جائیں منہ پر خوب سارا ٹھنڈا پانی انڈیلا تو ہم جاگے، سب تالیاں بجا رہے تھے جیسے
کہ ہم نے "موت کے کنویں" میں چھلانگ لگا کر کوئی کرتب دکھایا ہو لیکن واقعی کرتب دکھانے کی گھڑی تو اب
ہمارے سر پہ تھی، ہمیں مردہ سمجھ کر ہمارے پاؤں کے انگوٹھے باندھ دیے گئے تھے۔ ہم نے اٹھ کر چلنے کی کوشش
کی تو دھڑام سے اوندھے منہ گر پڑے۔ توبہ توبہ ہماری جیسی ہستیاں گرنے کے لیے تھوڑی بنائی جاتی ہیں۔ ایسے
ہم تو وہ چیز ہیں جس سے پہاڑ ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتے ہیں۔ [illegible] ہم اوندھے منہ گر پڑے تھے
اور گر کر اٹھ بھی نہ سکے، ہماری ناک سے خون بہہ رہا تھا، ہمارا منہ زخمی ہو گیا تھا کیوں کہ دانت بھی اپنے
تھے اور ہونٹ بھی اپنے....... پھر پاؤں کے انگوٹھے کھول دیے گئے۔ ہم "شتر بے مہار" کی طرح
اس عمر رسیدہ خاتون کی طرف لپکے جن کی قیاس آرائی نے ہمیں مردہ قرار دیا تھا وہ خاتون گھبرا کر حمام میں
میں جا گھسیں اور اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ ہم نے جوش میں پلٹا کھایا تو ٹکرا گئے اپنے نامدار سے....
ہمارے بالوں کو انھوں نے مٹھی میں پکڑ کر جھٹکا دیتے ہوئے سخت لہجے میں کہا "ہوش میں آؤ".......
یہ جملہ بالوں کی گرفت سے زیادہ طاقت ور تھا ہم واقعی ہوش میں آ گئے کیوں کہ گھر کے سب چھوٹے بڑے
افراد ہمارا مذاق اڑا رہے تھے اور ہم اپنے بال اپنے نامدار سے چھڑانے کی کوشش میں مرے جا رہے تھے۔
خدا خدا کر کے حالات موافق ہوئے۔ دو تین گھنٹے بعد دھماکہ جیسی آواز نے ہمیں چونکا دیا۔ (ہم جاگ
رہے تھے نا اس لیے) حمام میں بند ہونے والی خاتون کافی دیر سے دروازہ پیٹ رہی تھیں۔ ہم نے غصہ
میں اس وقت دروازہ باہر سے بند کر دیا تھا۔ جب دروازہ کھولا گیا تو وہ پسینہ میں شرابور ہمارے اوپر
ہی آ پڑیں اور بے ہوش ہو گئیں۔ ہم دل ہی دل میں خوش ہوئے کہ اس خاتون سے انتقام لے ہی لیا جس
نے ہمیں "مردہ" قرار دیا تھا اگر واقعی ہمیں مردہ سمجھ کر زندہ درگور کر دیا جاتا تو ہم آج آپ کو اپنی نیند کے
بارے میں کیسے بتا سکتے ہ

**



گھر کے بُدّھو

آج کل ہمارا گھر سرپھٹول کا اکھاڑہ بن چکا ہے اور ہمیشہ کی طرح اس سرپھٹول کی ذمہ داری ہماری اکلوتی بیگم سنبھال چکی ہیں۔ ہمایوں کر بریانی کھاتے وقت دو تین آوارہ کنکر ایسے اٹک گئے جیسے رشوت نہ دینے پر کلرک آفس میں فائل اٹک جاتی ہے۔ سامنے ہی بیٹھی بیگم کی طرف دیکھ کر ہم نے کہا "کنکر بہت ہیں [illegible] شکایت کرنے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ ہم نے ٹی وی اناؤنسر کی طرح اپنے چہرے کو تمام جذبات سے [illegible] بھرپور کوشش کی تھی۔

"چاول میں کنکر اور ریت بہت تھی۔ آپ کو تو کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ عینک لگا کر بھی آپ اندھے کے اندھے ہی رہے۔ اناج والے تمھیں جو دیتے ہیں تم اٹھا لاتے ہو۔ تم جیسے عقل کے اندھوں کی وجہ سے یہ اناج والے چند برسوں میں لکھ پتی بن جاتے ہیں۔"

ہم نے آہستہ سے منہ سے کنکر نکال کر دسترخوان کے کونے پر رکھ دیا۔ دیکھ کر بیگم کا غصہ [illegible] پھٹنے لگا۔

"ایک آدھ کنکر پیٹ میں چلا جائے تو کچھ نہیں ہوگا۔ وہ مرد ہی کیا جو معمولی کنکر ہضم نہ کر سکے۔" ہم سب کچھ برداشت کر سکتے ہیں مگر کنکر ذات کی توہین نہیں۔ چنانچہ ہم نے داڑھ کے [illegible] کرنے والے دوسرے کنکر کو نکال باہر کرنے کے بجائے نگل لینا زیادہ مناسب سمجھا [illegible]

ہم سیاست دانوں کی طرح اس اصول پر متفق ہو گئے کہ "وہ کبھی عورت ہی تھی"

ہم دونوں نے انتہائی گرم جوشی سے مصافحہ کیا اور ڈرائنگ ٹیبل کی طرف بڑھ گئے۔ تنازعہ کو ختم کرنا چاہیے کیونکہ ہمیں زندہ رہنا ہے سیاست دانوں کے اسی اصول کو ہم نے [illegible] لیا ہے۔

سونے سے پہلے دعا مانگتے وقت ہمیں یہ بات کھٹکی کہ بیگم کی آنکھوں میں ضرور کوئی خرابی پیدا ہو چکی ہے اور یہ کہ آنکھوں کا معائنہ کروانا انتہائی ضروری ہے۔ تاہم ہم یہ طے نہیں کر پائے کہ اس موضوع کو کیسے چھیڑا جائے۔ بیگم کو ازل سے ہی عینک سے بیر ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ہم عینک لگانے کے بعد احمق دکھائی دیتے ہیں۔ تاہم بیگم کو کون بتائے کہ محلے کی اکثر خواتین کا خیال ہے کہ ہم عینک لگانے کے بعد کافی اسمارٹ اور دانشور لگتے ہیں۔

بریانی کے کنکر اور دوردرشن کے چھایا گیت کے تنازعے کو سامنے رکھ کر ہم نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ واقعی بیگم کی آنکھوں میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی ہے۔ ہم نے اپنی آواز میں ساری شوگر فیکٹری کی مٹھاس گھولتے ہوئے کہا "بیگم! تمہاری آنکھوں میں ضرور کوئی خرابی پیدا ہو گئی ہے۔"

"آپ کس بنیاد پر کہہ رہے ہیں"۔

ہم کیا جواب دیتے چپ ہو گئے۔ وکیل کی بیٹی سے شادی کرنے کا پرابلم یہی ہوتا ہے کہ وہ ہر بات کا ثبوت طلب کرتی ہے اور ایسا کرنا اپنی خاندانی روایت سمجھتی ہے۔ تاہم وہ کبھی کبھی ضرور یہ تسلیم کر لیتی ہے کہ عموماً ہم عقل روایتوں پر بلا سوچے سمجھے عمل کرتے ہیں۔ بیگم نے فاتحانہ انداز میں ہماری طرف دیکھا اور کہا "میں ذرا پڑوس کے یہاں جا رہی ہوں، مکان کا خیال رکھیے۔"

اور اسی وقت ہمیں ثبوت مل گیا۔ ہم نے چیخ کر کہا "واقعی تمہاری آنکھیں خراب ہو چکی ہیں۔" بیگم نے غصے سے گھور کر دیکھا۔ "تمہارے پاس ثبوت ہے؟"

بیگم کے چہرے پر حیرت کے آثار بخوبی دیکھے جا سکتے تھے۔ انھوں نے پیر پٹختے ہوئے کہا۔

"کہاں ہے ثبوت؟"

"پیر دیکھو"

"خود دیکھ لو"

"ایسا مت کرو"

"پیر دیکھیے ہیں"

"تم چپلیں تو میری ہیں" ہم نے وضاحت کی۔ آخرکار بیگم کو یہ احساس ہو ہی گیا کہ واقعی [illegible] آنکھوں کا معائنہ کروانے پر [illegible]

[illegible]

یہ صورتیں اور وقل جیسے سے کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے مسلسل استعمال کے لیے ایک عینک تجویز کی اور آنکھوں کے لیے ایک دوا۔ بیگم نے انتہائی معصومیت سے پوچھا "یہ آنکھوں میں ڈالنے کی دوا کب استعمال کرنی ہے عینک لگانے سے پہلے یا بعد میں؟"

ڈاکٹر کی دکان کے پڑوس میں عینک والے کی دکان تھی۔ عموماً ناتجربہ کار ڈاکٹر کے پڑوس میں تجربہ کار تاجر عینک کی دکان کھول لیتے ہیں۔ عینک کی دکان میں مختلف قسم کے فریم دیکھ کر بیگم کی آنکھیں چکا چوند ہو گئیں۔ وہ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھیں کہ کون سا فریم پسند کریں۔ آخر کار ایک فریم پسند آ ہی گیا۔ اور ہم نے اطمینان کی سانس لی۔ دکان دار نے ہمارے منتخب کردہ فریم کی نہ صرف قیمت بڑھا کر بتائی بلکہ وصول بھی کر لی۔ چوں کہ بیگم پہلی بار عینک خرید رہی تھیں۔ لہٰذا ہم نے دکان دار کی بد معاشی کو نظر انداز کر دیا۔

گھر پہنچتے ہی بیگم قدِ آدم آئینے کے سامنے کھڑی ہو گئیں۔ کافی دیر تک عینک لگا کر ہر پہلو سے اپنے آپ کو دیکھا اور اترا کر کہنے لگیں۔ "آج میری سمجھ میں آیا کہ عینک لگانے سے چہرہ کس قدر باوقار نظر آتا ہے۔"

عینک کا استعمال کرنے والوں کو احمق قرار دینے والی بیگم کی رائے میں خوش گوار تبدیلی دیکھ کر ہمارا دل خوشی سے باغ باغ ہو گیا۔ اور ہم نے کہا (آہستہ سے) صبح کا بھولا شام کو لوٹ آئے تو اسے بھولا نہیں کہتے۔

شریف اطہر (حیدرآباد)

ہم نے بھی وزیٹنگ کارڈ بنوایا

وزیٹنگ کارڈ اگرچہ اپنی جسامت و قامت کے اعتبار سے بہت معمولی سا لگتا ہے لیکن اگر آپ اس کی پراسرار حیثیت سے واقف ہوں گے تو آپ کو بھی ایک عدد وزیٹنگ کارڈ کی اتنی ہی ضرورت محسوس ہوگی جتنی کہ ایک ذی نفس کے لیے ہوا، پانی اور غذا کی۔ ہم وزیٹنگ کارڈ سے اسی روز روشناس ہوگئے تھے جب ہم نے کالج کی دنیا میں قدم رکھا تھا۔ ہمارے ایک عزیز دوست اپنے نام کا وزیٹنگ کارڈ اسی زمانے میں چھپوا چکے تھے۔ جب یہ اپنے نام کے ساتھ کالج کا نام دیکھتے تو خوشی سے پھولے جاتے تھے۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ اوائل عمر میں پڑنے والی بری عادتیں مشکل ہی سے چھوٹتی ہیں۔ ایسا ہی کچھ معاملہ ہمارے فاضل دوست کے ساتھ بھی ہوا انھیں تو جیسے وزیٹنگ کارڈ چھپوانے کا خبط سا ہو گیا۔ ان کی ساری کفایت شعاری جو بخل کی حد تک پہنچ گئی ہے وزیٹنگ کارڈ چھپوانے کے معاملے میں ہوا ہو جاتی اور یہ اپنی کمائی اس مد میں خرچ کرکے خوش ہو جاتے ہیں۔ کم نہیں سمجھتے تھے۔ جب وہ اپنا تازہ وزیٹنگ کارڈ لے کر ہمارے پاس آتے تو ہم ازراہ مذاق پوچھ لیتے بھائی یہ آپ کا کون سا وزیٹنگ کارڈ ہے تو کہنے لگے۔ جہاں تک میں سنبھال کر رکھ پایا ہوں یہ میرا ۹۲ واں وزیٹنگ کارڈ ہے۔ ہم سوچنے لگے کہ ایک شخص جس نے اپنی زندگی کی ۴۰ بہاریں بھی نہیں دیکھیں اپنے نام کے ۹۲ وزیٹنگ کارڈز رکھ سکتا ہے تو کیا ہمیں ایک عدد وزیٹنگ کارڈ رکھنے کا بھی حق حاصل نہیں ہے۔

چنانچہ ہم اپنے اس دوست کے گھر کی جانب نکل پڑے تو پتہ چلا کہ صاحب موصوف اپنے تازہ کارڈ کے سلسلے میں پرنٹنگ پریس کی جانب گئے ہوئے ہیں۔ ہم نے انھیں وہیں جا لیا۔ دریافت کرنے پر کہ...

[illegible] کی قیمت نہیں ہے۔ ہم نے مکان والوں کے گھر خالی کرنے کی اس مہم کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے بیٹے بھی ایک وزیٹنگ کارڈ بنوانے کا مژدہ سنایا تو اتنے خوش ہوئے کہ اپنی طرف سے [illegible] کر دیا۔ اگلے ہی روز تجربہ کو کام میں لاتے ہوئے ہمارے نام کا بھی ایک وزیٹنگ کارڈ چھپوا دیا۔ جب وہ ہمارے وزیٹنگ کارڈ کا پیک ہمیں سونپ رہے تھے تو ہماری عجیب کیفیت تھی اور پھر ہم نے جب اپنے نام کا کارڈ ہاتھ میں لیا اور اسے دیکھا تو ہمارے جسم میں خوشی کی ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ کپکپی سی ہونے لگی جیسے ہم نے اپنے نام کا وزیٹنگ کارڈ نہیں بلکہ برف کا ٹکڑا ہاتھ میں لے لیا ہو۔ اس طرح سے ہم بھی صاحبِ وزیٹنگ کارڈ ہو گئے تھے۔ ہم نے جب اسی تھرتھراتی ہوئی زبان سے ان کا شکریہ ادا کیا اور اپنا ایک کارڈ انھیں پیش کیا تو انھوں نے جواب میں اپنا تازہ کارڈ ہماری طرف بڑھاتے ہوئے حساب چکتا کر دیا۔ ہم نے اگلے ہی دن سے اپنے دوستوں کو اپنا وزیٹنگ کارڈ یہ کہتے ہوئے پیش کیا کہ "چلو اک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم دونوں" اس طرح تجدیدِ شکایات کی صورت نکل آئی تھی۔ سارے دوست احباب کو (بلکہ ان کو بھی جنھیں ہم کبھی کے فراموش کر چکے تھے) کے باوجود بہت سارے کارڈ بچے رہ گئے تو ہماری راتوں کی نیند یوں اچٹ گئی جیسے چوری کا سامان گھر میں رکھ لیا ہو۔ پھر ہمیں خیال آیا کہ اس بہانے اپنے عزیزوں، رشتہ داروں، دوستوں سے ملنے بلکہ وزیٹنگ کارڈ دینے کے سلسلے میں ترکِ ملاقات کچھ برا بھی نہیں ہے۔ اس طرح ہمیں اپنے ذوق کی تسکین کا سامان نظر آیا۔ اور ہم آنے والی چھٹی یعنی اتوار کے دن کے سراپا منتظر ہو گئے۔ آخر وہ دن بھی آگیا۔ ہم [illegible] اس [illegible] تک . . . . . سوئے رہنے کو اپنی دانست میں تو ایک ٹھاٹھ سے کم نہیں سمجھتے ہیں لیکن صبح صبح جب بیگم نے ہمیں نیند سے جگاتے ہوئے یہ خبر دی کہ کوئی صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں تو ہم نے اپنے سارے دوستوں کے نام گنوا دیے۔ جواب نفی میں ملا۔ ایسا نہیں ہے کہ ہمارے یہاں پردے کا چلن نہیں ہے پھر بھی ہماری عورتیں دروازہ کی اوٹ یا کھڑکیوں کی درز سے آواز دینے والے کے سراپے کا جائزہ لینے کو اپنا جائز حق سمجھتی ہیں۔ بیگم نے [illegible] حلیہ بتایا تو ہمیں کوئی شک نہیں رہا کہ کسی بندۂ خدا نے آخر ہمارا وزیٹنگ کارڈ استعمال کر ہی لیا ہے اور ہم سے ملنے شہر کی اس بستی میں آنے کی زحمت بھی گوارا کی۔ جہاں بلدیہ کا عملہ برسوں قدم نہیں رکھتا۔ نو وارد اپنی وضع قطع سے بہت ہی مہذب اور زمانہ شناس معلوم ہوتا تھا ہمیں ایک لحظہ کے لیے خود سے زیادہ اپنے وزیٹنگ کارڈ پر رشک آنے لگا۔ جس کی بدولت شہر کی معزز شخصیتیں بھی اب غریب خانے کا رخ کرنے لگی ہیں۔ رسمی [illegible] کے بعد جب ہم نے تشریف آوری کا سبب پوچھا تو جواب میں موصوف نے اپنے کوٹ کی اندرونی جیب سے ایک موٹی سی کتاب نکالی اور اگر ہم اپنی کرسی پر اپنے ہاتھوں کی گرفت مضبوط نہیں رکھ پاتے تو ایک طرف [illegible] ضرور ڈھلک گئے ہوتے وہ کوئی فلسفہ یا منطق کی کتاب نہیں بلکہ رسید بک تھی۔ اسے نکالنے کے دوران کہنے لگے کہ میں نابیناؤں کے ادارہ کا سفیر ہوں یہ ادارہ آپ جیسوں ہی کے تعاون سے چلتا ہے۔ ہمارے [illegible] کر دیں۔ ہماری آنکھوں کے سامنے بھی اندھیرا چھا رہا ہے۔ ہمیں بھی ان میں شامل [illegible] [illegible] وزیٹنگ کارڈ [illegible] ہم نے [illegible]

[illegible] بھی تو اپنے تعارف میں موصوف نے اپنا کارڈ ہمیں تھما دیا۔ معلوم ہوا [illegible]
گئے ہیں۔ لٹ لٹا ہوئے تو بتایا کہ وہ ہمارے سارے خاندان کا بیمہ کرانے کا عزم کر کے نکلے ہیں۔
انھوں نے کسی رٹے ہوئے طوطے کی طرح انشورنس کی ساری معلومات ہمارے گوش گزار کیں اور اس وقت تک ہمارا پیچھا نہیں چھوڑا جب تک کہ ہم نے اپنی زندگی کا بیمہ نہیں کروا لیا۔ ہم انھیں نپٹا کر اندر کی جانب جانے ہی کو تھے کہ ایک مولوی صاحب باریش بزرگ نے دعائیہ کلمات کہتے ہوئے کرسی سنبھالی۔ چونکہ بزرگ ہماری کمزوری رہے ہیں ہم نے اپنا غصہ ان پر ظاہر ہونے نہیں دیا۔ تب تک محترم مولوی صاحب نے سامنے رکھی ہوئی میز پر اپنے بیگ سے نکال کر لڑکیوں کی بیسیوں تصویریں پھیلا دیں اور کہنے لگے کہ میں پیامات لگانے والے ادارہ کا نمائندہ ہوں۔ آپ کے لیے بھی بہت معقول رشتے ہیں۔ پہلے آپ تصویریں دیکھ لیں اور اپنے لیے کوئی لڑکی پسند کر لیں۔

ماشاءاللہ سبھی کھاتے پیتے شریف گھرانوں کی تعلیم یافتہ باہنر لڑکیاں ہیں۔ ان میں سے کئی تو حفظِ ماتقدم کے تحت ملازمتیں بھی کر رہی ہیں۔ جہیز بھی اچھا لائیں گی۔ اور جوڑے کی رقم بھی ——— ہم نے بمشکل انھیں روکتے ہوئے کہا قبلہ آپ غلط جگہ پر آ گئے ہیں۔ میں نے شادی کرنے کی حماقت پہلے ہی کر ڈالی ہے۔ انھوں نے کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا تو پھر میاں اتنا خوب صورت وزیٹنگ کارڈ بتلانے کی کیا ضرورت تھی۔ ہم نے کہا قبلہ اس کی بھی معافی چاہتا ہوں مجھ سے نادانستہ طور پر یہ دوسری حماقت بھی سرزد ہو گئی ہے۔ اس سے پہلے کہ بیگم کا شک یقین میں بدل جائے ہم نے ان ساری تصویروں پر اچٹتی مگر حسرت بھری نگاہ ڈالتے ہوئے بیگ میں محفوظ کر دیں پھر انھیں رخصت کر کے اطمینان کا سانس لیا۔

بالوآڑکے

(اپیل پیپر)

جوتے

آج کل تو جوتے اپنی قیمتوں کی وجہ سے بجائے پیروں میں پہننے کے سروں پر لینے لائق ہو گئے ہیں۔ ایک جوڑ جوتا خریدنے کے لیے انسان کو کتنے ہی دن تک پلس مائنس کرتے ہوئے کاٹ کسر سے کام لینا ہوتا ہے تب کہیں وہ جوتے پانے لائق ہوتا ہے ...... جوتے خریدنے کے بعد انہیں سنبھالے رکھنے کے عجیب و غریب مراحل بھی اہل جوتے کے لیے پریشانی کا باعث ہوا کرتے ہیں۔ نامۂ محبوب کی طرح چھپانے اور ہتھیلی کے چھالے کی طرح سنبھالنے کے باوجود بھی انہیں چوری ہو جانے کی لت ہوتی ہے۔ اور یہ چوری ہو جاتے ہیں۔ اب کسی دوسرے جوتے کی دستیابی کا دار و مدار آپ کی جیب پر یا ...... پھر نزدیک پاس کے علاقے میں عبادت گاہ کی دستیابی اور نماز یا پوجا کے اوقات پر منحصر رہتا ہے۔ آج کل اچھے سے اچھے جوتے کھونے اور پانے کا ایک مستقل قابل بھروسہ مقام تقریب گاہوں کے ساتھ ساتھ عبادت گاہوں کو بھی گردانا گیا ہے۔

موجودہ زمانے میں جوتوں کی نک چڑھی قیمتوں نے اہل جوتا کے ساتھ عجیب سازش رچی ہے۔ پتہ نہیں وہ کون سا زمانہ تھا۔ جب جوتے انسانی پیروں کی حفاظت پر مامور ہوا کرتے تھے۔ جبکہ ہم نے تو آنکھ کھولی تب سے انسان کو جوتوں کی حفاظت ہی کرتے دیکھا ہے۔ اہل جوتا کو جوتوں کا چوکیدار ہی پایا ہے۔ جوتوں کے پرستار انسان ہی نہیں محکمے بھی ہوا کرتے ہیں۔ محکمہ پولیس تو ...... جوتوں کا سب سے بڑا فین واقع ہوا ہے۔ اس محکمے میں جوتوں کو اہل جوتا پر زبردست فوقیت دی گئی ہے۔ بلکہ جوتوں کی صحیح پرداخت کو پولیس قوانین میں خاص مقام حاصل ہے۔ جوتوں کی غلط دیکھ ریکھ اور ناقص تربیت پر پولیس ملازمین کے انکریمنٹ روک دیئے جاتے ہیں۔ پرموشن رک جاتے ہیں۔ گویا یہ محکمہ جوتوں پر ہی اپنی ایڑی چوٹی کا سارا زور صرف کر دیا کرتا ہے۔ اس لیئے ہمارا مشورہ ہے کہ محکمے کو جوتوں سے شغل فرمانے کے لیے کھلا چھوڑ دیا جائے اور لا اینڈ آرڈر کی ذمہ داری کسی دوسرے محکمے کے حوالے کی جائے۔ گذشتہ زمانوں میں سر کی پگڑی عزت کا استعارہ تھی۔ جسے پیروں میں رکھ کر [illegible] [illegible] [illegible]

[illegible] یہ ہے کہ آج کل یہ محاورہ شاعر کا سب سے بڑا ہتھیار بن جاتا ہے اور ایسے کئی محاورے ہیں کہ ...... اب دو تین
محاوروں میں [illegible] اپنی خصوصیات کی وجہ سے نوادرات میں شامل ہو چکی ہیں ...... اور جن کا مطلب یہی
کہ اگر ہم میں سے کوئی ایک وقت جوتا اور دال خریدنے کا ارادہ ظاہر کرے تو ...... یہ منہ اور مسور کی دال" کا قصہ
یہیں پہچانا جاتا ہے۔ اب چونکہ جوتے اور دال یہ دونوں اشیاء ہماری دسترس سے نکل چکی ہیں۔ اس لیے یہ
پیچھا اور ہاتھاپائی سے کوچ کر کے محاوروں میں پڑاؤ ڈال گئی ہیں۔

قدیم زمانے میں عورت کو "پیر کی جوتی" کہا جاتا تھا۔ شاید اس زمانے میں جوتیاں بہت ہی زیادہ ارزاں
تھیں اس لیے خواتین بھی اس محاورے کا خاص نوٹس لیا کرتی تھیں۔ فی الوقت زمانے نے جوتوں اور جوتیوں کی [illegible]
میں کروٹ بدلی ہے۔ اور نتیجہ میں عزت وقار ان کے ہاتھ آ گیا ہے تو اب ہماری خواتین اور ان کی انجمنوں کو چاہیے
کہ وہ متفقہ طور پر ہڑتالیں کر کے "پیر کی جوتی" والے محاورے کو از سر نو رائج کروائیں تاکہ "مرد" "عورت" کو
بھی قیمتی جوتوں ہی کی طرح سینت سینت کر رکھ سکیں۔ ان کی حفاظت کر سکیں۔ اگر ہماری خواتین خود کو "پیر کی
جوتی" ثابت کر کے اپنا قدیمی حق واپس لینے میں کامیاب ہو جاتی ہیں تو ...... اس بات کا قوی امکان ہے
کہ پھر خواتین کی زندگیوں میں مرد ہمیشہ پھول ہی پھول بکھیرتے رہیں گے بلکہ چار چاند بھی لگتے رہیں گے۔

جاڑے میں

...ین راز
(جہانہ)

اُن سے ہوئی تھی ایسے ملاقات جاڑے میں
پل پل پہ ہم کو سوجھی خرافات جاڑے میں

جو ہاتھ پاؤں سرد ہوں گھٹنوں میں درد ہو
مہمان کی ہو کیسے مدارات جاڑے میں

کمبل بھی مفلسی میں مرا چور لے گئے
لو بڑھ گئی ہیں اور بھی آفات جاڑے میں

ٹھنڈک سے اپنے ہونٹ ہیں سکڑے ہوئے جناب
اب سینک کر ہی ہوگی کوئی بات جاڑے میں

ہے پاس میں رضائی نہ گھر میں لگائی ہے
لمبی سیاہ کیسے کٹے رات جاڑے میں

اب گُل رُخوں کے گھر سے نکلنے کے دن نہیں
سونے پڑے ہیں پھولوں کے باغات جاڑے میں

ٹائی کا باندھنا بھی تو پھانسی سے کم نہیں
ہوتی ہیں کیسی کیسی خرافات جاڑے میں

سالی کا اغوا، ساس کی بے وقت پہ طلاق
ٹوٹے ہیں ہم پہ کیسے یہ صدمات جاڑے میں

خانہ خراب لیتے ہیں میخانے میں پناہ
اچھا ہے بند ہو نہ خرابات جاڑے میں

سر میں کمر میں درد ہے نزلہ زکام ہے
قدرت نے ہم کو بخشی ہیں سوغات جاڑے میں

دیپک کا راگ چھیڑیئے گر ہو سکے جناب
پگھلیں گے جو بھی سرد ہیں جذبات جاڑے میں

مسجد کا فرش سرد ہے مندر کا گھنٹہ سرد
کیسے کریں خدا سے مناجات جاڑے میں

کچھ نوجوان بولے یوں دولہے کے باپ سے
جن، وہسکی، پی کے ناچے گی بارات جاڑے میں

اس بار وزن بیوی کا کچھ اس لئے بڑھا
رتل کے پڑی تھیں کھلنے کی عادات جاڑے میں

کاجو چُرا کے دوست کی شادی سے آج ہی
لائے جناب رازؔ یہ سوغات جاڑے میں

غزل

...آنیز ناگپوری

ہم سے اب اکڑی ہوئی ہے زندگی
قرض میں جکڑی ہوئی ہے زندگی

کیا بجے سوسائٹی میں اب گجر
جب [illegible] ہوگئی ہے زندگی

اب [illegible] قائم ترا کیسے رہے
بند مٹھی کھل رہی ہے زندگی

[illegible] طرح نفرت کے چاقو چل گئے
ہر جگہ سے پھٹ گئی ہے زندگی

[illegible] خدا [illegible] سے توبہ کو بچا
[illegible] گرا کر کہہ رہی ہے زندگی

جسم کے [illegible] کا [illegible] پڑ گیا
خوبصورت [illegible] ہے زندگی

سعدیہ غوری (ریاض)

کاک ٹیل

یورپ سے آئے دن اس قسم کی خبریں موصول ہوتی رہتی ہیں کہ وہاں حد سے زیادہ طویل القامت انسانوں کی انجمن قائم ہوئی ہے یا پست قدبونوں نے اپنی جماعت کو منظم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور ان انجمنوں میں عام لوگوں سے لے کر بڑے بڑے معززین تک شامل ہیں۔ ہندوستان میں ابھی انجمن سازی اس نوبت تک نہیں پہنچی۔ لیکن کچھ مدت گزری میرٹھ میں ایک کانے صاحب نے ایک جدت فرمائی تھی وہ سن لیجیے:

ان یک چشم گل صاحب کو جو دل لگی سوجھی تو آپ نے چپ چاپ گھر بیٹھ کر شہر کے تمام کانوں کی ایک فہرست تیار کی۔ دیکھا تو ان میں بڑے بڑے معزز آدمی اور سرکاری افسر بھی شامل تھے۔ آپ نے الگ سب لوگوں کے نام دعوت نامے جاری کر دیے اور اپنے مکان میں کھانے پر مدعو کیا۔ یہاں تک کہ ہاتھ دھلوانے اور کھانا کھلانے پر جو آدمی مقرر کیے وہ بھی سب کے سب کانے تھے۔

وقتِ مقررہ پر کانوں کی بھرمار شروع ہوئی۔ جب تک صرف ایک دو تھے کسی کو چنداں خیال نہ آیا لیکن جب چالیس پچاس کانے جمع ہو گئے تو ایک دوسرے کو آنکھیں بلکہ آنکھ پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگے بعض کو اس ستم ظریفی پر غصہ بھی آیا لیکن وہ یہ سمجھ کر پی گئے کہ چلو اس مجمع میں کوئی ایسا شخص تو نہیں جو انھیں محض یک چشمی کی وجہ سے چشمِ حقارت سے دیکھے۔

جب تمام ہم چشم جمع ہو چکے تو کانا بہشتی کانے میزبان کے حکم سے کانے مہمانوں کے ہاتھ دھلانے لگا۔ کانا تو تھا ہی کہیں پانی کی دھار ایک معزز مہمان کے ہاتھوں کے بجائے اس کے کپڑوں پہ جا پڑی۔ اس نے تاؤ کھا کر بہشتی سے کہا: "ہوش میں آ، کیا آنکھیں پھوٹ گئی ہیں کیا؟" بہشتی نے برجستہ جواب دیا کہ "ہاں صاحب دونوں پھوٹ گئی ہیں۔ لیکن ایک میری تھی اور ایک آپ کی"۔

دو معزز یک چشم صاحب اس گستاخی کی تاب نہ لا سکے اور مارے غصہ کے بہشتی کے ایک جڑ دی۔ اس وقت بڑے چھوٹے کا کوئی سوال نہ تھا۔ سب کانے پوری مساوات کے ساتھ اس دعوت میں شریک ہوئے تھے۔ بہشتی نے بھی ترکی بہ ترکی ہاتھ سے جواب دیا۔ لپا ڈگی شروع ہو گئی۔ آخر کانوں نے بیچ بچاؤ کر دیا۔ اور کھانا کھانے لگے۔ ایک دوسرے کو دزدیدہ نگاہوں سے دیکھتے جاتے تھے اور قاعدہ ہے کہ کانے کی نگاہ یوں بھی دزدیدہ ہی ہوتی ہے۔

کرنا خدا کا کیا ہوا۔ کہیں شہر کے لوگوں نے اس عجیب و غریب دعوت کے متعلق سن گن پالی۔ انھوں نے کیا کیا، گیس کے تین چار بڑے بڑے ہنڈے روشن کر کے باہر گلی میں رکھ دیئے اور صدہا لوگ کانوں کی رخصت کا نظارہ دیکھنے کے لیے جمع ہو گئے۔ جب یہ کھانا کھا کر اپنے ہم چشم میزبان کا شکریہ ادا کر کے باہر نکلے تو ایک ہجوم استقبال کے لیے موجود تھا۔ بعض بدتمیزوں نے آوازے بھی کسے لیکن واحد العینوں کی یہ جماعت ایک ایک کر کے آنکھ چرا کر گزر گئی .... (افکار و حوادث ـــــ عبدالمجید سالک)

ہے بہت تکلیف دہ شاعر کی وہ جنس عجیب — جو سنانے کے لیے بے چین رہتا ہو غریب
اس کو اچھا کر نہیں سکتا کوئی کامل طبیب — شاعری کی جس کو بدہضمی ہو ہیضے کے قریب
چاہتا ہے سب سنا دوں جو کہوں اک سال میں
مبتلا ہے شاعری کے سخت تر اسہال میں

(ظریف لکھنوی)

سنا ہے سابقہ پنجاب کے علاقے میں چینی کی چیں بول گئی ہے اور مرکزی حکومت کا راوی چین لکھتا ہے۔ یعنی مرکز کی طرف سے اطلاع موصول ہوئی ہے کہ وہ جو ہم نے تمھیں دسمبر میں چینی دینے کا وعدہ کیا تھا وہ وعدہ بدستور موجود ہے لیکن چینی موجود نہیں ہے۔ اس لیے چین کی بنسی بجاؤ اور چیں بہ جبیں ہونے یا نکتہ چینی پر آنے کے بجائے چینی کا انتظار کرو کیوں کہ چینی ایک نہ ایک دن ضرور آئے گی۔ چینی کا آنا اسی طرح یقینی ہے جس طرح موت کا آنا یقینی ہے۔

ہم ہفتوں پہلے چینی خوروں کو مشورہ دے چکے ہیں کہ چائے میں چینی ڈالنے کے لیے چمچے کے بجائے ڈراپر کا استعمال شروع کر دیجیے اور مہمان کے لیے چائے بناتے وقت اس سے یہ نہ پوچھیے کہ آپ کتنے چمچے پسند فرمائیں گے۔ چینی سے بھرے ہوئے ڈراپر کو بڑی نزاکت کے ساتھ انگوٹھے اور انگشت شہادت سے تھام کر اور گردن کو ذرا سا خم دے کر استفسار فرمائیے۔ "آپ چینی کے کتنے ذرات استعمال کرتے ہیں؟" مہمان بڑا ہی بے تکلف اور منہ پھٹ ہو گا تو وہ ایک سو ذرات سے کیا آگے جائے گا۔ اور مژدہ ہو کہ چینی کے ایک سو ذرات سے [illegible] کا تو پیٹ بھی نہیں بھر سکتے۔

اس جاہل قاضی کا قصہ تو آپ نے سنا ہو گا جس کا باپ انتقال کر گیا تو دیہات کے لوگ اس کے پاس [illegible]

ترکیب یہ نکالی کہ ایک برتن رکھ دیا اور جب نیا چاند نکلتا اس نے برتن میں ایک مینگنی ڈال دی۔ دوسرے دن دوسری مینگنی شامل کر دی اور یہ سلسلہ چلتا رہا۔ جب کوئی اس سے چاند کی تاریخ پوچھنے آتا [illegible] لیتا، ہاتھ ڈال کر برتن میں پڑی بکری کی مینگنیاں گنتا اور تاریخ بتا دیتا۔

چند دن کے بعد جانے ایک بکری کو کیا سوجھی کہ وہ اس برتن میں بہت سی مینگنیاں بھر کر چلی گئی۔ شام کو کوئی دیہاتی چاند کی تاریخ پوچھنے آیا تو قاضی نے انگشتانہ ڈال کر ہاتھ ڈالا۔ اور پھر جیسے مراقبے میں چلا گیا۔ کافی دیر کے بعد حیران ہو کر بولا۔ "انتھا ونیں!" "انتھا ونیں کیسے؟" اور قاضی بولا: "یہ تاریخ بھی میں نے خدا کے خوف سے بتائی ہے۔ ورنہ میرے حساب سے تو آج چاند کی پانچسو بہتریں تاریخ نکلتی ہے۔"

دو مجھے چائے پینے والوں کے حساب سے چاہے انھیں کئی دنوں سے تین چار ہزار ذرات چائے کی ضرورت ہو مگر وہ بھی خدا کے خوف کے مارے ایک سو سے آگے نہیں بڑھیں گے۔ آزما کر دیکھ لیجیے۔۔۔۔۔۔۔

(حروف و حکایات - احمد ندیم قاسمی)

قیامت ہے کہ خود ناشتہ کم ہوتا جاتا ہے — نظامِ جسم کم کھانے سے برہم ہوتا جاتا ہے
جدائی میں مٹن کی یہ عالم ہوتا جاتا ہے — کہ روزِ عید بھی روزِ محرم ہوتا جاتا ہے
ہمارے روزگار سے یہ دولت تماشا کن — نصیبِ احمقاں مرغِ مسلّم ہوتا جاتا ہے
مجھے تیتر کھلا کر جان ڈالی جسمِ مردہ میں — ترے ہوٹل کا بٹلر ابنِ مریم ہوتا جاتا ہے

گرائے کوفتوں کے بم یہاں کس رشکِ ہٹلر نے
ہمارا پیٹ بھی قصرِ بکنگھم ہوتا جاتا ہے

علامہ حسین میر کاشمیری
نقوش کا طنز و مزاح نمبر

ایک شخص نے شملے میں آ کر ایک موقع پر جہاں خانساماں نہ ملتا تھا کہہ دیا کہ میں خانساماں گری جانتا ہوں۔ ایک صاحب بہادر نے اس کو نوکر رکھ لیا اور اول ہی روز فرمایا کہ انڈے کا بیل کر لاؤ۔ یہ بے چارہ کیا جانے کہ بیل انگریزی میں ابالنے کو کہتے ہیں۔ اس نے جانا صاحب بہادر فرماتے ہیں اس کا بیل بنا لاؤ۔ اب یہ حیران ہوا کبھی صاحب بہادر کے چہرے کو دیکھتا۔ کچھ پتہ تو نہیں لگے۔ اور کبھی اپنی طرف دیکھتا کہ میری سماعت میں تو فرق نہیں آگیا۔ بڑی دیر تک کھڑا ہوا سوچتا اور صاحب بہادر کو تکتا رہا۔ آخر گھبرا کر ہاتھ جوڑ کر کہہ دیا کہ "صاحب جی حضرت مجھ سے نہیں ہو سکتا انڈے کا بیل بنا دوں کسی اور کو بلا لیجیے۔ خانساماں گری تو میں جانتا ہوں مگر معجزہ کوئی اور جانتا ہوگا۔"

لطائف اودھ پنچ
نقوش کا طنز و مزاح نمبر

ایک شخص نے کسی سے پوچھا کہ آپ نے اتنی کم عمر لڑکی سے کیوں شادی کی؟ اس نے جواب دیا [illegible]
جناب جتنی [illegible]

بہ سلسلۂ گذشتہ

شہرِ دو قصّہ

مشتاق احمد یوسفی

کہ یہی ہے امتوں کے مرضِ کہن کا چارہ[6]

صاحب، ویسے تو دنیا میں ایک سے ایک Crackpot (سنکی) پڑا ہے، لیکن ملا عاصی کا "تو چیزِ دیگری" والا معاملہ ہے۔ ان کے ایک واقف کار کا بیان ہے کہ آخری واٹرلو کے بعد کھسک گئے ہیں۔ فرقہ ملامتیہ سے تعلق ہے۔ نماز اسطرح پڑھتے ہیں جیسے بعض مسلمان شراب پیتے ہیں۔ یعنی چوری چھپے۔ یہ وہی فرقہ ہے۔ جس سے حضرت مادھو لال حسین کا تعلق بتایا جاتا ہے۔ ایک صاحب بولے کہ وہ مسلمان تھے کب جو مرتد ہوتے۔"

کھل جا سم سم!

آپ ذرا گیس کیجئے وہ کیا کرتے ہیں۔ میں آپ کو دو منٹ دیتا ہوں۔ (آدھے منٹ بعد) جناب! وہ ٹیوشن کرتے ہیں۔ غریب لڑکوں کو میٹرک کی تیاری کرواتے ہیں۔ رات کو بارہ ایک بجے لوٹتے ہیں۔ پانچ چھ میل پیدل چلکر جانا تو کوئی بات ہی نہیں۔ کہتے ہیں "سواری سے نفس موٹا ہوتا ہے۔ سوائے گدھے کی سواری کے اسی لئے بنی اسرائیل کے پیغمبروں نے گدھے کی سواری کی ہے" [illegible] پڑھانے کا پیسہ ایک نہیں لیتے۔ کہتے ہیں وہ مشرق کی ہزاروں سال پرانی روایت ہے کہ پانی، نصیحت اور علم کا پیسہ ایک نہیں لیا جاتا۔ پیسہ لے لو تو یہ انگ [illegible] نہیں لگتے اور انجام ہمارا پیسہ بھی نہیں پچتا۔ آج تک ایسا نہیں ہوا کہ [illegible] عوض دیکر حاصل کئے ہوئے علم سے کوئی روحانی تبدیلی آئی ہو۔ سچی تبدیلی صرف کسی کی نظر سے آتی ہے۔ اور نظر کا کوئی [illegible] انہیں [illegible] گذر بسر کیسے ہوتی ہے۔ دستِ غیب تو ہو نہیں سکتا۔ اسلئے محض خدا اور اس کی رزاقی کے قائل [illegible] کہتے ہیں۔ فلسفہ کا پورا قصہ کھڑا کر لیا ہے۔ ملا عاصی نے۔ ہم جیسوں کے پلے تو خاک نہیں پڑتا۔ اب [illegible] بس ہے تو ہے۔ کون کہہ سکتا تھا کہ پڑھائی کے نام سے بھاگنے والا، پڑھانے میں اپنا ثانی [illegible] قائل ہے یا سمیرا [illegible] کہ اپنے ہاں جو لڑکے پڑھائی میں پھسڈی ہوتے ہیں وہ فوج میں چلے جاتے ہیں [illegible] ہوتے ہیں وہ کالجوں میں پروفیسر بن جاتے ہیں۔ جس سے بچا [illegible]

[illegible]

تو ایک زمانے میں ٹیچر بننے کی تمنا رکھتے تھے۔ خدا نے آپ پر بڑا رحم کیا دلی مراد پوری عمر ہونے دی۔ ویسے آپ کو حسنہ [illegible] نے بھی کئی برس ٹیچری کی ہے۔ دل کی بات پوچھئے تو حاصلِ زندگی بس وہی زمانہ تھا یاد آتا ہے۔

وال سے نکل کے پھر نہ فراغت ہوئی نصیب
آسودگی کی جان تری انجمن میں تھی

لیکن ایک بات ہے۔ سبھی کہتے ہیں کہ پڑھاتے بہت اچھا ہیں اچھا معلم ہونے کے لئے اچھا عالم ہونے کی شرط نہیں۔ کچھ عرصہ گورنمنٹ اسکول میں بھی پڑھایا لیکن محکمہ تعلیمات نے یہ پخ لگائی کہ تین سال کے اندر بی ٹی پاس کر دو ورنہ تنزلی کر دی گئی، تو یہ کہہ کر استعفیٰ دے دیا کہ "میں بے صبرا آدمی ہوں، تین سال اس واقعے کے انتظار میں نہیں گزار سکتا۔ میں نے ہمیشہ پاس ٹیچروں سے پڑھا اور ہمیشہ فیل ہوا!" اس کے بعد کہیں نوکری نہیں کی۔ البتہ نابیناؤں کے اسکول میں مفت پڑھا جاتے ہیں۔ لہجے میں میٹھاس ملائمت اور دھیرج بلا کا ہے۔ ہمیشہ سے تھا۔ الفاظ سے بات سمجھ میں آتی ہے۔ لہجے سے دل میں اتر جاتی ہے۔ جادو الفاظ میں نہیں لہجے میں ہوتا ہے۔ الف لیلوی خزانوں کا دروازہ ہر ایرے غیرے کے "کھل جا سم سم" کہنے سے نہیں کھلتا۔ وہ الہ دین کا لہجہ مانگتا ہے۔ دلوں کے قفل کی کلید بھی لفظ میں نہیں۔ لہجے میں ہوتی ہے۔ اپنی بات دہرا چکے، یا دوسرا الجھنے لگے تو ان کا لہجہ اور بھی ریشم ہو جاتا ہے لگتا ہے خالو دھ گلے سے اتر رہا ہے۔ ہر اچھے استاد کے لئے ایک بچہ بیٹھا ہوتا ہے جو ہاتھ اٹھا اٹھا کر اور سر ہلا ہلا کر بتاتا جاتا ہے کہ بات سمجھ میں آئی کہ نہیں۔ اچھے استاد کا پڑھانا بس اس بچے سے ایک مکالمہ ہے جو عمر بھر چلتا رہتا ہے۔ انھوں نے اس بچے کو بچہ ہی رہنے دیا۔

۷

وہ کمرہ بات کرتا تھا

حجرۂ جہاں نما

ملا عاصی سے اسی کمرے میں گھمسان ملاقاتیں رہیں جہاں پینتیس برس پہلے انھیں خدا حافظ کہہ کر پاکستان آیا۔ اس زمانے میں سبھی پاکستان کھنچے چلے آرہے تھے ——— زمین جائیداد بھرے پرے گھر لگے لگائے روزگار اور اپنے پیاروں کو چھوڑ کر۔ اسی کمرے میں مجھے گلے لگا کے رخصت کرتے ہوئے کہنے لگا "جاؤ سدھارو میری جان۔ تمہیں کو خدا کے سپرد کیا۔" آج بھی اتنا ہی تعجب ہوتا ہے کہ بھلا کوئی شخص تنہائی ہوش و حواس کیا چھوڑ سکتا ہے۔ کمرے میں وہی پنکھا اسی ڈگمگ ڈگمگ کڑے میں لٹکا، اسی طرح چرخ چوں کرتا رہتا ہے۔ مجھے جیسی بات کرنی ہوتی تو پنکھا چلتے ہی آندھی سی آجاتی ہے۔ اور کتابوں، دیواروں اور دری پر جمی ہوئی گرد کمرے میں اڑنے لگتی ہے جس سے مچھروں کا دم گھٹنے لگتا ہے۔ وہ پنکھا گرمی سے نہیں، مچھروں سے بچنے کے لئے چلاتے ہیں۔ مگر کم بیش [illegible] لئے نہیں کہ بجلی کی بچت ہوتی ہے۔ بلکہ چلانے سے پنکھا گھستا ہے۔ اس کی لاگت کم ہوتی ہے [illegible] برس [illegible] ہوگا۔ ان حسابوں کے مقدر میں [illegible] نے گنتی کے سانس لکھے ہیں۔ چنانچہ بیشتر وقت [illegible] تاکہ زندگی [illegible] جس دم [illegible] ہو جائے۔ [illegible]

[illegible] کی عمر بھی اسی طرح ورزش جاری ہے۔

ان کے کمرے میں گویا ایک عالم کی سیر ہو گئی۔ بجز جہاں بنا بیٹھے۔ ہر چیز ویسی کی ویسی ہی ہے بلکہ وہیں کی وہیں دھری ہے۔ یہ لگا مجھے تو ویسا لگا کہ مکڑی کے جالے بھی وہی ہیں جو چھوڑ کر آیا تھا۔ صرف ایک تبدیلی دیکھی۔ داڑھی پھر منڈوا دی ہے۔ چھا لگو گول کر گئے کہنے لگے، داڑھی اس وقت تک قابل برداشت ہے جب تک کالی ہو۔ کمرے کا نقشہ وہی ہے جو سن ۴۶ء میں تھا البتہ دیواروں پر چیکٹ چڑھ گیا ہے۔ صرف وہ حصے صاف نظر آئے جن کا پلاسٹر حال میں جھڑا ہے۔ بائیں دیوار پر سامنے دو فٹ اوپر چیاں پینتالیس سال پہلے میں نے پنسل سے بیکٹ کا حساب لکھا تھا۔ اس کی اوپر کی چار لائنیں ابھی تک نئی کی نئی ہیں۔ صاحب، پہلے میں ۱۹۲ پائی ہوتی تھیں اور ایک پائی آج کل کے پیسے کے برابر تھی۔ حیرت اس بات پر ہوئی کہ دیوار پر بھی حساب کرنے سے پہلے میں نے ۷۸۶ لکھا تھا! بقول آپ کے مرزا عبدالودود بیگ کے اس زمانے میں مسلمان لڑکے حساب میں فیل ہونے کو اپنے مسلمان ہونے کی آسانی دلیل سمجھتے تھے۔ حساب کتاب، بیج، بیوپار اور ہر وہ کام جس میں منافع کا ذرا بھی امکان ہو بنیوں بقالوں اور یہودیوں کا کسب تصور کیا جاتا تھا۔ مگر مجھے چکروتی ازبر تھی۔ پونا، سوایا اور ڈھائی کا پہاڑا اب تک یاد ہے۔ ان کا فائدہ وائدہ تو سمجھ میں خاک نہیں آیا۔ دراصل یہ لڑکوں کا پٹنا اور پٹانا نہیں بلکہ خود انھیں کو پیٹنے سمیت بننے کا ایک بہانہ تھا۔ مسلمان پر یاد آیا کہ یہ جو پانچ وقت ٹکریں مارنے کا گٹا آپ دیکھتے ہیں۔ یہ الحمدللہ پچیس چھبیس برس کی عمر ہی میں پڑ چکا تھا۔ میاں تجمل کی صحبت اور نیاز فتح پوری کی تحریریں بھی نماز نہ چھڑوا سکیں۔ آپ کو یقین نہیں آئے گا۔ تہائی بال بھی اسی عمر میں سفید ہو گئے تھے۔ خیر تو یہ کہہ رہا تھا کہ شیشم کی میز کے اوپر والی دیوار پر میٹرک کا فیئر ویل (الوداعی) پارٹیوں کے گروپ فوٹو لگے ہیں۔ متواتر پانچ سالوں کے۔ خدا خدا کر کے پانچویں سال ان کا بیڑا اس وقت پار لگا جب ان کا ایک ہم جماعت مسلمان مولوی بی اے کر کے انھیں انگریزی پڑھانے لگا۔ پانچوں میں وہ ہیڈ ماسٹر کے پیچھے کرسی کی پشت مضبوطی سے پکڑے کھڑے ہیں۔ مشہور تھا کہ وہ اس وجہ سے پاس نہیں ہونا چاہتے کہ پاس ہو گئے تو مانیٹری ختم ہو جائے گی۔ کالج میں مانیٹر کا کیا کام۔ ایک فوٹو سیپیا رنگ کا ہے۔ میں تو اس میں اپنا حلیہ دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔ یا اللہ! ایسے ہوتے تھے ہم نوجوانی میں کیسے کیسے ہوتے تھے لڑکے اس دن! تادم مرگ دوستی نبھانے، دکھی انسانیت کی خدمت کرنے اور ایک دوسرے کو تمام عمر ہر تیسرے دن خط لکھنے کے کیسے کیسے عہد و پیمان ہوتے تھے! میز پر ابھی تک وہی سبز بانات منڈھی ہوئی ہے۔ روشنائی کے دھبوں سے ۹/۱۰ نیلی ہو گئی ہے۔ بے اختیار جی چاہا کہ بقیہ ۱/۱۰ پر بھی دوات انڈیل دوں تاکہ یہ بد رنگی کسی طرح ختم ہو۔ چپراسیوں کی وردیاں بھی اسی بانات کی بنتی تھیں۔ سردی کڑاکے کی پڑنے لگتی تو کبھی کبھی اسکول کا چپراسی بشیر ڈانٹ کے ہمیں گھر واپس بھیج دیتا کہ میاں! اکوٹ لنگوٹ سے کام نہیں چلے گا۔ کمری، مرزئی (روئی کی واسکٹ) ڈانٹ کے آؤ۔ مگر خود گھر سے ایک پتلی سی مرزئی پہن کر آتا جو اتنی پرانی ہو گئی تھی کہ لوزاتی پیٹرن کے ڈوروں کے ہر خانے میں روئی کا علیحدہ گومڑا بن گیا تھا۔ لیکن یہ نیلام بکنی کھو پہن کر نہیں جاتا تھا۔ میں نے اس پر کبھی کوئی سلوٹ یا داغ نہیں دیکھا۔ چھٹی کا گھنٹہ اس طرح بجاتا کہ جیسے کلکٹر آگیا ہے۔

[illegible]کار چھوٹے آدمی

محلہ بلندی کی مسجد شہید پر مولانا شبلی کی "ہم کشتگان معرکہ کانپور ہیں" والی معرکۃ الآرا نظم ابھی تک اسی کیل پر

متعلق ہے جو اٹھو بکنے میں وہ مشہوری ہو گئی تھی۔ صاحب مجسں شخص نے کیں لکھ گئے مدت چھوڑا ہمیں جسے پا ۔۔۔ مجھ کو ۔۔۔ بہ کچھ بھی نہیں ۔۔۔ مجھے تو اس کی ملامت میں شبہ ہے۔ پاسے جو کسی چالاک آدمی سے ہوشیار رہنا چاہیے۔ اس کے بارے میں خواجہ حسن نظامی نے لکھا تھا کہ یہ ۔۔۔ مسجد ہے جس کے سامنے پہاڑ سے بزرگوں کی لاشیں تڑپ تڑپ کر گریں اور ان کی سفید داڑھیاں خون سے لال ہو گئیں۔"

نظم کے ترنم کا شیشہ بیچ میں سے ایسا ترخا ہے کہ مکڑی کا جالا سا بن گیا ہے میں نے کوئی پچاس برس بعد یہ پہلا نظم اور "بولیں اماں محمد علی کی جان بیٹا خلافت پہ دے دو" والی نظم پڑھی۔ کیا عرض کروں۔ دل پہ وہ اثر نہ ہوا۔ اس زمانہ اور دور ماقبل کے بعض کارنامے "ریشمی رومال والی تحریک، خلافت، جنگ بلقان (تعلیم، مرنے کا اگر چاہے تو جا)۔ بقا تعلیم نسواں اور سائنسی تعلیم کی شدید مخالفت جس میں اکبر الہ آبادی پیش پیش تھے، شاردا ایکٹ (کم عمری کی شادی پابندی کا قانون) کے خلاف مسلمانوں کا "بشمول مولانا محمد علی جوہر ایجی ٹیشن ——— یہ اور بہت سے ایسے ہی کارنامے کی خاطر کبھی جان کی بازی لگا دینے کو جی چاہتا تھا۔ اب کچھ عجیب سے لگتے ہیں۔ خلافت موومنٹ ہی کو لیجئے اس کی تو کافی پچھلے بھی کی۔ اس سے زیادہ جوشیلی ملک گیر منظم الٹی اور لاحاصل تحریک کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ مگر لوگ بڑے تھے۔ آج کل کارنامے تو بہت معقول اور بڑے ہیں۔ پر آدمی بہت چھوٹے ہو گئے۔ نشو دہی نے سودا کا شعر سنا دو سو سال گزرنے کے بعد بھی بالکل آج کا شعر معلوم ہوتا ہے۔

اثر سے ہیں تہی نالے تصرف سے ہیں دم خالی
نیستاں ہو گئے شیروں سے یا رب یک قلم خالی

چڑیا کی دسراہٹ

دیوار وہی ہے، وہی طغرے، وہی سبق آموز وصلیاں اور چارپائی بھی وہی جس کے سرہانے والے پائے پر عبدالمقید نے چاقو سے اس لونڈے کا نام کھودا تھا اور اسی سے انگلی میں شگاف لگا کر خون حروف میں بھرا تھا۔ آپ ابھی دل میں کہتے ہوں گے کہ عجیب آدمی ہے۔ اس کی کہانی سے طوائف خدا خدا کر کے رخصت ہوتی ہے تو لونڈا در آتا چلا آتا ہے۔ صاحب کیا کروں۔ ان گنہگار آنکھوں نے جو کچھ دیکھا وہی بیان کروں گا۔ آپ میری کلیات اٹھا کر دیکھ لیجئے۔ ان کی خود نوشت سوانح عمری پڑھیے۔ مصحفی کے دیوان دیکھئے۔ آپ کو جابجا اس کی طرف علانیہ اشارے ملیں گے۔ صاحب عورت کے بعد میں ۔۔۔ کرنے کا ۔۔۔ کوئی ۔۔۔ میں آکے پڑتا تھا۔ اب اس لونڈے کا کیا نام بتاؤں۔ کانگریس کے ۔۔۔ مشہور ہو گیا تھا۔ کرپشن میں نکالا گیا۔ ایک ڈپٹی سکریٹری کی بیوی سے شادی کر لی تھی۔ ڈسمس ہونے کے تین ۔۔۔ ایک ۔۔۔ کے ساتھ بھاگ گئی۔ اس زمانے کی جنسی ۔۔۔ کا آپ ۔۔۔ اس لیے کہ آپ اس وقت تک بالغ نہیں ہوئے تھے۔ بجا ہے ۔۔۔

محبت بھی اسی سے گوارا ہے
محبت کا ۔۔۔ ہے آتا ہے

صاحب! یقین جانئے عالم یہ تھا اس زمانے میں کہ عورت کا ایکسرے بھی دکھایا جاتا تو لڑکے اسی پر دل و جان سے عاشق ہو جاتے۔

روشندان میں اب شیشے کی جگہ گتا لگا ہوا ہے۔ اس کے سوراخ میں سے ایک چڑیا بڑے مزے سے رہی تھی۔ نیچے چھتری میں گھونسلا بنا رکھا ہے۔ اس کے بچے چوں چوں کرتے رہتے ہیں۔ ایک دن ملا عامی کہنے لگے کہ جب بڑے ہو کر گھونسلا چھوڑ دیں گے تو ہمارا گھر بہت سنسان ہو جائے گا۔ دھول سے دری کی لائنیں مٹ گئی ہیں۔ میاں تجمل حسین کے سگریٹ سے چالیس پینتالیس برس پہلے سوراخ ہو گیا تھا۔ وہ اب بڑھ کے اتنا بڑا ہو گیا ہے کہ اس میں سے تربوز نکل جائے۔ اس کے وسط میں دہلی ریلوے ویٹنگ روم اور ڈاک بنگلوں والا کتھئی رنگ کا ٹاٹ کا فرش کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے۔ میاں تجمل حسین کی عمر اس وقت کچھ نہیں تو تیس برس تو ہوگی۔ تین بچوں کے باپ بن چکے تھے۔ مگر بڑے حاجی صاحب (ان کے والد) کا ایسا رعب تھا کہ سگریٹ کی طلب ہوتی تو کسی دوست کے ہاں جا کر پی آتے تھے۔ حاجی صاحب سگریٹ پینے کا شمار آوارگی میں کرتے تھے۔ خود حقہ پیتے تھے۔ بائیسکوپ کا شمار بدمعاشی میں کرتے۔ چنانچہ میاں تجمل کو تنہا سینما دیکھنے نہیں جانے دیتے تھے۔ خود ساتھ جاتے تھے۔

دیکھئے میرے "چنانچہ" پر آپ پھر مسکرا رہے ہیں۔ صاحب لکھنؤ اور کانپور والے اگرچہ اور چنانچہ کثرت سے بولتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں لہٰذا بہت گاڑھا لگتا ہے۔ ارے صاحب۔ میں نے تو اس زمانے میں میموں کو "لہٰذا"، ہرچند، درانحالیکہ تک بکثرت بولتے سنا ہے۔

چھپکلی کی کٹی ہوئی دُم

چھت نہایت بوسیدہ، شہتیر دیمک زدہ، پنکھے کا کڑا گھستے گھستے چوڑی برابر رہ گیا ہے۔ میں بھی تو یہاں نہیں [illegible] بتانا مشکل ہے کہ ان تینوں میں سب سے پہلے کون گرے گا۔ ملاقاتی کو عین پنکھے کے نیچے بٹھاتے ہیں۔ اس غریب کی سارے وقت پنکھے پر جمی رہتی ہے۔ ایئرگن سے ملا نے چھت پر جہاں چھپکلی ماری تھی، وہاں چھرے کا نشان ابھی موجود ہے اور ہاں! چھپکلی پر یاد آیا۔ آپ کے اس دوست کو جس کا خط ہاسٹل کے لڑکوں نے چرا کر پڑھ لیا تھا، اس کی بیوی نے کیا لکھا تھا؟ ہندی میں تھا شاید۔

"جگت نرائن سری واستو نام تھا۔ نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ لکھا تھا رام کسم! تمہارے بنا راتوں کو ایسے تڑپتی ہوں جیسے چھپکلی کی کٹی ہوئی دُم!"

واہ اس تشبیہ کے آگے تو "ماہی بے آب" پانی بھرتی ہے۔ مگر آپ ایسے ناسٹلجیا زدہ لوگوں کے لئے [illegible] پر استعمال کرتے ہیں، یہ زیادتی ہے۔ یہ تو میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ ملا عامی کا ذریعہ معاش کچھ نہیں ہے۔ وہ کبھی [illegible] نہیں ہے۔ یہ [illegible] ہمیشہ [illegible] لیکن [illegible] نہیں غالباً [illegible] کی بات ہے ان کی والدہ [illegible] سے [illegible] کی منت [illegible] اجمیر شریف گئیں۔ وہاں کسی نے کہا کہ اماں، تم [illegible] بخش کے مزار پر حاضری دو [illegible] خود خواجہ اجمیری [illegible] پیدل [illegible] تھا سو وہ بھی [illegible] منت مانگنے [illegible] کے لئے [illegible] ریشمی چادر ساتھ لے گئی تھیں۔ اس [illegible] نہ جانے کیسے [illegible] آگ [illegible]

گئی۔ لوگوں نے کہا، جلالی وظیفہ الٹا پڑ گیا۔ صاحبِ جاہت والے ہو تو نذر قبول نہیں ہوتی۔ وہ رات انھوں نے بیت گزاری۔ صبح نمازِ فجر ادا کرتے ہوئے سجدے کی حالت میں وہ مجیب الدعوات سے جا ملیں۔ دمے اور قلب کا مرض لاحق تھا۔ لاہور ہی میں میانی صاحب قبرستان میں دفن ہوئیں۔

والدہ کے انتقال کے بعد ان کے گھر میں چولھا نہیں جلا۔ انھوں نے مکان کا بقیہ حصہ کرائے پر اٹھا دیا کرایہ دار نے پندرہ سال سے وہ بھی دینا بند کر دیا۔ سنا ہے اب الٹا ان کو گھر سے بے دخل کرنے کے لئے قا چارہ جوئی کرنے والا ہے۔ عمر کبھی چھہتر سال بتاتے ہیں۔ اور سال کے بعد وضاحتاً "شمسی" کا اضافہ کرتے ہیں تاکہ تسامح نہ ہو۔ شمسی پر یاد آیا کہ چھٹی جماعت میں میں نے ہجری کلاس میں قمری سال کو قمری سال اور لٹریچر کو لٹری پڑھا تو ماسٹر فاخر حسین نے بڑے زور قہقہہ لگایا اور اسی دن کے بعد سے مجھے بشارت لڑکا چڑ ہے کہنے لگے۔

محمد طارق
(کھولاپور)

تاخیر میں خیر

ہمارے سماج میں ہر کام میں تاخیر ہونا ایک عام بات ہے اور ہم اس کے اتنے عادی ہو چکے ہیں کہ اگر کوئی کام بالفرض ٹھیک وقت پر ہو جائے (ہوتا تو نہیں) تو یقین نہیں آئے گا۔ ایسا لگے گا جیسے ہم نے کوئی خواب دیکھا ہے..... اپنے یقین کی جانچ پڑتال کرنے کے لیے خود ہمیں اپنے کان مروڑنے پڑیں گے یا اپنے گال پر خود ہی طمانچہ رسید کرنا پڑے گا۔

آج تک جب ہماری عمر انتالیس سال کی ہو چکی ہے۔ ہمارا کوئی کام ٹھیک وقت پر نہیں ہوا۔ اس لیے ہمیں خود اپنے گال پر طمانچہ مارنے کی نوبت نہیں آئی۔ آپ اگر خوش قسمت ہیں تو آپ کے گال اس معاملہ میں اپنے ہی طمانچوں سے ضرور لال ہوئے ہوں گے مگر ہمیں یقین ہے کہ آپ کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا ہوگا کیوں کہ ہم اور آپ ایک ہی سماج میں رہتے ہیں۔ بھلے ہی ہمارے نام الگ الگ ہوں۔ ہمارے مذہب اور ذاتیں، ہمارے فرقے اور ہماری زبانیں مختلف ہوں۔ ہم آپس میں درندوں کی طرح لڑتے ہوں۔ تاہم ہمارا سماج تو ایک ہی ہے جہاں ہر کام میں دیر ہونا ایک عام بات ہے۔ دنگے، فساد، لوٹ کھسوٹ کے کام چھوڑ کر یوں کہ یہ کام ہمارے سماج میں ٹھیک وقت پر ہی ہوتے ہیں۔ باقی سارے کاموں کے لیے ہمیں انتظار کرنا پڑتا ہے۔ ہم اپنا ہر کام کرنے سے پہلے کام کی تاخیر سے ہونے والی اذیت سہنے کے لیے خود کو تیار کر لیتے ہیں۔ اور مسکرا مسکرا کر اذیتیں سہتے رہتے ہیں۔ کسی کام کے لیے دفتر پہنچے حسب روایت بابو صاحب لیٹ آئیں گے۔ پھر حسب عادت لیٹ آ کر کرسی پر تھوڑا لیٹ جائیں گے..... پھر جمائی لیں گے..... پھر گھڑی دیکھ کر انگڑائی لیں گے۔ اس کے بعد ہم سے دریافت کریں گے — کیا کام ہے؟ — ہم کام بتائیں گے۔ وہ حکم دیں گے سگریٹ پان لاؤ۔ ہم خادم کی طرح دوڑ کر ان کا حکم بجا لائیں گے۔ وہ پان کھا کر سگریٹ پھونکیں گے پھر گھڑی کی طرف دیکھ کر

کہیں گے۔ کل آنا۔ ہم مسکرا کر فرماں بردار غلام کی طرح سر ہلائیں گے اور واپس چلے جائیں گے۔ اس طرح وہ ہر روز ہمیں "کل" کہتے رہیں گے۔ یہاں تک کہ ان کے "کل کل" سے ہم "بے کل" ہو جائیں گے۔ تب ہم مجبور ہو کر لیکن مسکرا کر انہیں نذرانہ پیش کریں گے تب ہمارا کام ہو جائے گا۔

اس طرح ہم اپنے بہت سارے کام کروا لیتے ہیں۔ ہاں کرواتے دیر سے ہیں لیکن درست کرواتے ہیں۔ یہ نسخہ ہمارا سماجی نسخہ ہے۔ یاد رکھیے۔ اس نسخہ سے آپ ہر کام کی تاخیر دور کرنے کی کوشش کریں گے تو آپ کی خیر نہیں۔

جیسے منتری جی کا بھاشن فلاں جگہ گیارہ بجے ہے۔ حاضرین کی خدمت میں حاضر کرنے کے لیے یہ سماجی نسخہ غیر سماجی نسخہ بن جائے گا۔ اور کارگر نہیں ہوگا۔ منتری منتری جی ہیں۔ وہ آئیں گے۔ اپنے ٹائم پر جو گیارہ بجے کے بعد نہ معلوم کتنے بجے ہوگا۔

بعض جگہوں پر وقت پر جانا کسر شان سمجھا جاتا ہے۔ جیسے آپ کو کسی جلسہ کی صدارت کرنا ہے۔ اگر آپ وقت پر پہنچے تو لوگ کہیں گے۔ دیکھیے صدارت کے لیے کتنا ترسا ہوا ہے۔ اس لیے آپ دیر سے جائیے۔ لوگ آپ کا ہلالِ عید کی طرح انتظار کریں گے۔ تب آپ جلسہ میں نمودار ہوئیے۔ حاضرین آپ کو ہلالِ عید کی طرح دیکھیں گے شاید اس لیے منتری جی وقت پر بھاشن دینے کے لیے نہیں پہنچتے۔ اس میں ان کی شان ہے۔ اس شان کو ہم اور ہمارا سماج شان سے برداشت کرتا ہے۔

تاخیر کے معاملے میں برداشت کا عنصر ہم میں کچھ زیادہ ہی ہے۔ ٹرین لیٹ ہو جائے ہم برداشت کریں گے بس جلدی نہ آئے برداشت کر لیں گے۔ کسی چیز کا لائسنس چاہیے وہ اس وقت ملے گا جب ہماری زندگی کا لائسنس ختم ہو جائے پہلے گا۔ ہمیں اپنی ضرورت کی چیزیں ملنے میں تاخیر ہو کوئی بات نہیں۔ اگر ہم کسی ناانصافی پر عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائیں اور ہمارے پوتے پوتیاں اس معاملے میں انصاف کے لیے پریشان رہیں۔ ہم سہہ لیں گے۔ برخلاف اس کے ہم اُن معاملوں میں صبر کا کام نہیں لیں گے جن میں ہمیں برداشت سے کام لینا ہے۔ ہم "ہم" ہیں۔ آزاد ملک کے آزاد شہری۔ آزادی ہمارا پیدائشی حق ہے جو ہمارے آباؤ اجداد سے ہمیں وراثت میں ملا ہے۔ اس لیے ہمارے جذبات آزاد ہیں۔ ہمارے خیالات آزاد ہیں۔ ہم کسی بات کے پابند نہیں۔ پھر صبر و برداشت کے پابند کیوں رہیں۔

تاخیر کے بارے میں ہم میں برداشت کا عنصر اس لیے زیادہ ہے کہ ہم سوچتے ہیں کہ خدا جو ساری کائنات کا خالق و مالک ہے جس کے ایک اشارے پر سارا نظام درہم برہم ہو سکتا ہے۔ اس کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں تو پھر ہم انسان سے یہ کیسے امید رکھیں کہ دیر سے کام نہیں لے گا۔

اگر ہم ٹھنڈے دل سے سوچیں۔ غور و فکر کریں تو ہمیں اندازہ ہوگا کہ وہ لوگ جو کاموں میں تاخیر سے کام لیتے ہیں بالیٹ کرنے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ دراصل اس طرح وہ سماج کی بے کاری کو کنٹرول کر رہے ہیں۔ جب سب لوگ سارے کام وقت پر فراغت کرنا شروع کر دیں تو نہ جانے کتنے لوگ اپنے کام ختم کر کے سڑکوں پر بے کار گھومتے رہیں گے اور بے کاری کے تناسب میں دن بدن اضافہ ہوتا رہے گا۔ اس لیے ہمیں اور حکومت کو ان لوگوں کا

بال کی کھال (تبصرہ)

تبصرہ: ناوک حمزہ پوری

نام کتاب: تبسم زیر لب
مرتب: ڈاکٹر شیخ رحمٰن اکولوی
سائز: ڈیمائی؛ ضخامت: سو صفحات، قیمت: بیس روپے
پتہ: ماہنامہ شگوفہ، معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد - ۱

یہ ڈاکٹر شیخ رحمٰن اکولوی کی ساتویں کتاب ہے (یوں ظاہر ہے کہ وہ ہفت آسمان کی بلندی طے کر چکے ہیں اور ان کا نام سات سمندر پار پہنچ چکا ہے)

سبز رنگ کا سرورق اچھا لگا (مولوی ہوا نا) کتاب کا انتساب "خدائے قادر مطلق" کے نام ہے۔ جی خوش ہوا۔ ہمتِ مردانہ اسی کو کہتے ہیں۔ علامہ اقبال کی نظر میں "یزداں شکار" ایسے ہی لوگ ہوں گے۔ خدا کو ہنستے ہوئے دیکھنا تو دور کی بات ہنستا بھی نہیں۔ ان لطیفوں کی پیش کش سے خدا کو ہنسانے کی کوشش بجائے خود نادر ہے۔

مصنف نے اردو میں لطائف و ظرائف کے عنوان سے پانچ صفحات کا ایک بصیرت افروز مقالہ لکھا ہے۔ اس طرح ان کی یہ کتاب یعنی ساتویں کتاب ذہن کے چودہ طبق روشن کرنے کا موجب ہوئی اور پھر جیسے پیچھے پے لطائف کا دور شروع ہوا تو لگا کہ کتاب کا نام غلط رکھا گیا۔ نام تبسم زیر لب کے بجائے قہقہہ بر دوش ہونا چاہئے تھا۔

مگر قہقہوں کا وہ سیلِ رواں آیا کہ ساری سوچ دورچ کو بہا لے گیا۔ اور مجھ جیسے رونے بسورنے والے میاں کو جب گھر والی نے اچانک قہقہہ لگاتے دیکھا تو گھبرائی ہوئی قریب آئیں۔ میں تو جلال تو کا ورد کر کے پھونکیں مارنے لگیں۔ انھیں یہ گراں گزرا کہ میاں کا دماغ چل گیا ہے۔ پوچھنے لگیں کیا ہوا؟ کیا جی کرتا ہے؟؟ جواب دیا کہ ہوتا کیا ہے۔ رحمٰن نے اپنی کتاب بھیجی ہے۔ لو ذرا تم بھی پڑھ ڈالو۔ اور لطیفے دو لطیفے پڑھتے پڑھتے جب ان کی بھی بتیسی جھلکنے لگی تو یقین ہوا کہ میاں بیوی کی محنت ٹھکانے لگی۔ کتاب کا سرورق ڈیزائن کیا ہے عبدالرحمٰن صاحب کی بیوی فرحت نے۔

اس دورِ پر آشوب میں جب زندگی میں ہنسنے کے مواقع میسر نہیں آتے۔ آدمی جانور ہو گیا ہے۔ آپ غالباً واقف ہوں گے کہ آدمی اور جانور میں ایک واضح فرق یہ بھی ہے کہ آدمی ہنس سکتا ہے۔ ایسے میں یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ آپ اس کتاب کو خریدیں اور پڑھیں تاکہ آپ ہنس سکیں اور اپنے آدمی ہونے کا ثبوت مہیا کر سکیں۔

اداریہ

۱۷ر نومبر کو میں ایمبسی اسکول جدہ میں مدعو تھا۔ اکنامک فورم کے محمد باقر صاحب نے فون پر مدیر روزنامہ سیاست جناب عابد علی خاں کے سانحۂ ارتحال کی اطلاع دی۔ دل پر ایک بجلی سی گر پڑی۔ مجھے معلوم تھا کہ عابد علی خاں صاحب علیل ہیں اور آرام کر رہے ہیں۔ لیکن وہم و گمان بھی نہ تھا کہ یہ علالت مستقل آرام کا باعث ہو جائے گی۔ سہ پہر ہی سے ان کے انتقال کی خبر جدہ کے تمام اردو داں حلقوں میں پھیل چکی تھی۔ شام میں بزم اتحاد جدہ کے زیر اہتمام مدیر شگوفہ کے اعزاز میں منعقدہ تقریب میں ہر ایک کی زبان پر یہی ذکر تھا۔ سعودی گزٹ کے منیجنگ ایڈیٹر طارق غازی صاحب جلسہ کی صدارت کر رہے تھے اور روزنامہ منصف کے ایڈیٹر محمود انصاری صاحب مہمان خصوصی کی حیثیت سے شریک تھے۔ تمام مقررین نے اصل موضوع پر گفتگو سے قبل عابد علی خاں صاحب کو یاد کیا۔ میں نے مجھے دیئے گئے موضوع سے انحراف کرتے ہوئے جناب عابد علی خاں کی شخصیت اور کارناموں کا ذکر کیا۔

جس طرح حیدرآباد میں سورج کے طلوع ہونے کے ساتھ ہی اخبار سیاست کی روشنی پھیل جاتی ہے اسی طرح جناب عابد علی خاں ہماری مدنی زندگی کا محور و مرکز تھے۔ ان کے بغیر شہر حیدرآباد جس کی قدیم تہذیب و شرافت کا نہ صرف وہ حصہ اور نمونہ تھے بلکہ ان روایات کو باقی رکھنے کی مساعی میں وہ ہمیشہ پیش پیش رہے، ادھورا ادھورا سا ہے۔ ان کی شخصیت ہمہ جہت تھی۔ اردو زبان، صحافت اور ادب سے متعلق مسائل ان کی دلچسپی کے خاص موضوعات تھے۔ حیدرآبادی تہذیب و سیاست کے پیچ و خم سنوارنے میں وہ صبح شام مصروف و منہمک رہے۔ ان کا ہر فیصلہ دوررس نتائج کا حامل اور ان کا ہر قدم نپا تلا ہوتا تھا۔ ان کی کامیابی کا راز ڈسپلن اور انتھک محنت تھی۔ وہ بڑے منظم اور پروقار انداز میں اپنی تجاویز پر عمل پیرا ہوتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ معتبر اور باثر لوگوں کا انھیں ہمیشہ تعاون حاصل رہا۔ کسی بھی کام میں ان کی شمولیت کامیابی کی ضمانت سمجھی جاتی تھی۔ ادبی ٹرسٹ، اس کے مشاعرے، اردو گھر اس کی مثالیں ہیں۔ عابد علی خاں صاحب ابتداء ہی سے ترقی پسند خیالات کے حامل تھے۔ ان کی لچک دار پالیسی کے نتیجے میں "سیاست" بلا لحاظ مذہب و ملت تمام طبقات میں مقبول ہو گیا بلکہ ہندوستان میں اردو صحافت کی ترقی میں اسے سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ عابد علی خاں صاحب کو تمام حلقوں میں عزت کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ حکومت میں ان کی بات کا وزن تھا۔ اور عوام ان کی آواز کی قدر کرتے تھے۔ آزادی کے بعد یہ مقام بجز عابد علی خاں کسی حیدرآبادی نے حاصل نہیں کیا۔ ادارۂ شگوفہ ان کے انتقال پر جناب زاہد علی خاں، ڈاکٹر شاہد علی خاں، جناب مجیب حسین صاحب اور دوسرے اہل خاندان کے غم میں شریک ہے۔ خدا سے دعا ہے کہ مرحوم کو اپنے جوار رحمت سے نوازے (آمین)

● حیدرآباد کی زندہ دل شخصیت نامور مزاح نگار جناب رشید قریشی کا ۲۱ر نومبر کی شب اچانک انتقال ہو گیا۔ زندہ دلان حیدرآباد کی محفلوں کی روح رواں رشید قریشی اپنے طرز کے منفرد مزاح نگار تھے وہ لکھتے تو بستے اور پڑھتے سے بھی خوب تر انداز میں۔ وہ جہاں جاتے ظرافت کے پھول بکھر جاتے۔ محفل میں بیٹھے ہوں کہ راہ چلتے ت، کوئی اہم میٹنگ ہو یا سنجیدہ دفتری امور۔ رشید قریشی کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتے۔ یہاں تک حزن و ملال کے ماحول میں بھی ان کا انداز گفتگو ذہن کو شگفتگی بخشتا تھا۔ یوں سب کو ہنسانے والا بلا نوش روتا بسورتا چھوڑ گیا۔ شگوفہ کے دفتر کو رشید بھائی آخرت منزل کہتے تھے۔ اسی آخری منزل سے ہنسی کی بیش بہا دولت تقسیم کرنے والے رشید قریشی کے لیے دعا گو ہوں کہ اللہ ان کی تمام منزلوں کو آسان کردے (آمین)

شگوفہ کے آئندہ شمارہ کے ذریعہ ہم جناب رشید قریشی کو خراج عقیدت پیش کریں گے۔ شگوفہ کی وسیع اشاعت کے سلسلہ میں ہمارے مدیر اور سیز ڈاکٹر عابد معز کی دعوت پر میں ۶ر اکتوبر کو ریاض کے لیے روانہ اور ۵ار نومبر کو واپسی عمل میں آئی۔ سعودی عرب کے مختلف شہروں میں قارئین اور شگوفہ کے چاہنے والوں بڑے خلوص کے ساتھ مختلف نوعیت کی ادبی و غیر ادبی محفلیں منعقد کیں۔ میں ان تمام اداروں اور مخلصین بصمیم قلب ممنون ہوں جنھوں نے مجھے عزت بخشی اور اپنی محبتوں سے نوازا۔ جنوری کے سالنامے میں ان محفلوں تفصیل تصاویر کے ساتھ شائع ہوں گی۔ اس دورے کی وجہ سے نومبر اور دسمبر کے شمارے تاخیر سے شائع رہے ہیں۔

قارئین کرام کو ہم یاد دلانا چاہتے ہیں کہ زیر نظر شمارے سے شگوفہ کے سلور جوبلی سال کا آغاز ہو رہا ہے۔ یوں فخر کو اردو دنیا کے تمام طنز و مزاح نگاروں کا تعاون حاصل ہے تاہم بین الاقوامی سطح پر نئے حلقوں میں متعارف کرنے اور توسیع اشاعت کے کام کو آگے بڑھانے کے لیے سلور جوبلی سال کے آغاز پر اوورسیز کمیٹی تشکیل دی جا رہی ہے۔ جس میں جناب مصلح الدین سعدی، جناب شجاع الدین غوری، جناب سعید شوکت، ایس ایم حسینی اور جناب غلام نجم الدین نے شرکت سے اتفاق کر لیا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ان حضرات کی عملی دلچسپی کے نتیجے میں آئندہ ہم شگوفہ کو صوری اور معنوی اعتبار سے زیادہ بہتر انداز میں قارئین تک پہنچا سکیں گے۔ اس خصوص میں بین الاقوامی اردو رابطہ کمیٹی کے ڈاکٹر انور نسیم کی بھی خصوصی سرپرستی ہمیں حاصل ہے۔ خصوصی نمبروں کی اشاعت کے علاوہ بعض دوسرے پروجکٹس بھی پیش نظر ہیں جن کا متعاقب اعلان کیا جائے گا۔

● شگوفہ کی سالانہ خریداری میں آئندہ مہینے سے اضافہ کیا جا رہا ہے۔ اب سالانہ زر خریداری ۵۰ روپے

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

سلور جوبلی سال

ماہنامہ

شگوفہ

حیدرآباد

رشید قریشی کے نام

جلد ۲۵ شمارہ ۱۲ ڈسمبر ۱۹۹۲ء

ایڈیٹر: ڈاکٹر سید مصطفےٰ کمال

سرورق: طالب خوندمیری

کتابت: محمود سلیم۔ فضل محمد۔ محمد غالب۔

طباعت: دائرہ الکٹرک پریس چھتہ بازار حیدرآباد

ترسیلِ زر اور خط و کتابت کا پتہ:
۳۱۔ بیچلرز کوارٹرز معظم جاہی مارکٹ
حیدرآباد 500001 اے پی۔ (انڈیا)
فون آفس: 557716 ۔ مکان: 521064

فی پرچہ: ۶ روپے
زرِ سالانہ: ۷۵ روپے
بیرونی ممالک: ۲۰ ڈالر

اس تھیلی کے چٹے بٹے (فہرست)

ماہنامہ شگوفہ کا آئندہ شمارہ

سالنامہ ہوگا

- تمام نامور طنز و مزاح نگاروں کی تخلیقات
- کارٹون
- لطیفے
- مدیر شگوفہ کا دورۂ سعودی عرب۔ رپورٹ اور تصویریں
- ممتاز آرٹسٹ شکیل اعجاز کے بنائے ہوئے مزاح نگاروں کے کیریکچر۔

صفحات : ۱۲۰ دو رنگی ٹائیٹل قیمت دس روپے

رشید قریشی

(خود نوشت)

جو میں کہوں تو مری داستاں دراز نہیں

میں ۲۷ جون ۱۹۲۰ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوا۔ یہ سرکاری تاریخ پیدائش ہے اور اسی کو تسلیم کر لینے میں خیر ہے۔ کیوں کہ صحیح تاریخ کا افشا مفاد عامہ کے مغائر ہوگا۔ جامعی تعلیم کے لیے جامعہ عثمانیہ میں داخلہ لیا ابھی انٹرمیڈیٹ ہی میں تھا کہ ڈاکٹر زور نے کسی نہ کسی طرح میری ادبی صلاحیتوں کا اندازہ لگا لیا۔ یہ یقیناً ان کی شاگرد نوازی کی خورد بینی تھی کیوں کہ ممکنہ تحقیق و تشویق کے باوجود آج تک بھی مجھے پتہ نہ چل سکا کہ مجھ میں انشا پردازی کا کوئی سا جوہر ہے ——— والد صاحب چاہتے تھے کہ میں تحصیل دار بنوں اور اسی خدمت کے لیے مجھے گھوڑے کی سواری سکھانے کا انتظام کیا گیا تھا۔ اس بنا پر کہ امیدوار کو یہی ایک سواری سیکھنا ہوتا ہے۔ باقی سواریاں تو تحصیل داری خود سکھا دیتی ہے۔ اس غرض کے لیے جو گھوڑا دستیاب ہوا تھا اسے سوار کے مستقبل سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ دوڑتے دوڑتے ایک دم رک جاتا اور سوار کے لیے سوار رہنا مشکل ہو جاتا۔ تین دنوں کی مشق میں میں نے جو سواری سیکھی، وہ گھوڑے کی ایال کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اس کی گردن پر سوار ہو جانے تک محدود تھی۔ گھوڑے کی گلو خلاصی کے لیے ڈاکٹر زور نے یہ منصوبہ بنایا کہ میں تحصیل دار بننے کے بجائے مصنف بن جاؤں۔ انھوں نے مجھ سے افسانے لکھوائے، ان کے مجموعے کو "من کی دنیا" کا نام دیا اور ادارۂ ادبیات اردو سے شائع بھی کرا دیا۔ اسی طرح ایم اے (اردو) کی تکمیل کے بعد میں دوراہے پر کھڑا ہو گیا۔ دکن ریڈیو کا دروازہ کھلا اور میں وہاں ملازم ہو گیا۔ یہاں جھنجے بجا نہ پایا تھا کہ معتمدی تعلیمات کی ایک کرسی نے مجھے سمیٹ لیا۔ یہ کرسی بلند ہوتی گئی اور میں نائب معتمد کی حیثیت سے وظیفہ حسن خدمت پر سبک دوش ہوا۔ بے کاری نے بیماری کی صورت اختیار کر لی تو جناب بھارت چند کھنہ نے جناب عابد علی خاں صدر نشین مجلس عاملہ اردو اکیڈمی کو چارہ سازی پر آمادہ کیا اور اردو اکیڈمی میں ایڈمنسٹریٹو افسر کی جائداد پر میرا تقرر عمل میں آیا۔ آج تک بھی ایڈمنسٹریٹو افسر بنا ہوا ہوں۔

مزاح سے مجھے فطری لگاؤ ہے لیکن یہ لگاؤ صرف [illegible] کے فروغ میں صرف ہوتا۔ [illegible]

زندہ دلی سوچی تو انھوں نے مجھے بھی اپنی ٹولی میں شامل کرلیا۔ اس ضمن میں امام الفن (۱۹۸۲) مجتبیٰ حسین پیش پیش ہے۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ رشید بھائی آپ بے کھٹکے مزاح نگار بن جائیے۔ اس سے آپ کو کسی قسم کا کوئی ضرر نہیں پہنچے گا۔ لوگ ویسے بھی آپ پر ہنستے ہیں۔ میں مجتبیٰ حسین کی رہنمائی میں گمراہ ہوگیا اور مزاح کے میدان میں آگیا۔ یہاں مصطفیٰ کمال نے اپنی طنزناک مسکراہٹ سے میرا سواگت کیا اور میرے مزاحیہ مضامین کو "مزاج شریف" کے نام سے کتابی صورت دے دی —— مصطفیٰ کمال مجھے کبھی کبھی سرکس کے رنگ ماسٹر کے روپ میں نظر آتے ہیں۔ نظر نہ آنے والے برقی چابک کے زور پر مسکراتے مسکراتے ٹہلتے ٹہلتے، مزاح نگاروں سے مختلف کرتب کرواتے ہوئے۔ اب کبھی سنجیدہ نگاری کی لہر اٹھتی ہے اور کوئی ادب پارہ سرانجام ہو جاتا ہے تو وہ بھی مزاح کے گھاٹ اتر جاتا ہے۔ تاہم ایک اشرانگیز ڈرامہ "محبوب" میں نے لکھا جو اسٹیج پر پیش ہوا اور کتابی صورت میں بھی آگیا ہے۔ اس ڈرامے نے مجھے مزاح کے سمندر میں ایک جزیرہ پر کھڑا کر دیا ہے۔ گھریلو زندگی میں صرف ایک بیوی کا شوہر ہوں جو مزاحیہ یا حزنیہ کسی بھی قسم کی ادبی مصروفیت کو تضیع اوقات سمجھتی ہے اور سات بچوں (تین لڑکوں اور چار لڑکیوں) کا باپ ہوں۔ سارے بچوں کی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو چکا ہوں اور ہر ایک نے اپنی اپنی دنیا بنالی ہے۔ شکر ہے ان کی دنیا دل پر ابھی تک مزاح نگاری کے سانولے سلونے بادلوں کا سایہ نہیں پڑا ہے اور وہ سکھ چین سے ہیں۔

اب ایک آخری آرزو یہ ہے کہ ایک مزاحیہ ناول لکھوں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور ۔ ۔ ۔ ۔ مزاح سے تائب ہو جاؤں یا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جو بھی واقع ہو۔

OO (شگوفہ ہندوستانی مزاح نمبر)

۶ر دسمبر سے قبل کی صورت حال



رشید قریشی

گھوڑا جوڑا

خادم کے والد چاہتے تھے کہ خادم ڈاکٹر بنے۔ اُدھر وہ بہادر شاہ کا چلّہ بیٹھے اور اِدھر خادم ایک ہم جماعت لڑکی کے ساتھ کمبائنڈ اسٹڈی میں جُت گیا۔ نتیجہ اس کا یہ نکلا کہ خادم کے والد قبوص الحواریہ میں مبتلا ہو گئے اور خادم اسقاط نشانات کی پاداش میں اس ہاتھ لڑکی سے اور اُس ہاتھ ڈاکٹری سے محروم رہ گیا۔ اس ناکامی سے خادم کی امیدوں کا دم نکل گیا لیکن اس کے والد پست ہمّت نہیں ہوئے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ ان کے عنبر میں دم ہے اور یہ دعویٰ انھوں نے سچ ثابت کر دکھایا۔ انھوں نے خادم کو وٹرنری کورس میں داخلہ دلوا دیا اور جب خادم کمبائنڈ اسٹڈی کے بغیر امتحان میں کامیاب ہوگیا، بیٹیوں کے باپ اور شادی کار گھیراؤ کی مہم کے نقشے بنانے لگے۔ گھیراؤ۔ اس میں ایک غیر رد مانٹک ناشادیانہ سیاسی دباؤ کا رفر محسوس ہوتا ہے اس لیے دولہا کے شکار کے لیے یہ اصطلاح کچھ موزوں نظر نہیں آتی۔ یہ کہنا زیادہ حسب حال ہوگا کہ بیٹیوں کے باپ اور شادی کار خادم کے لیے کھڈّا کی تیاریوں میں لگ گئے۔ آپ تو جانتے ہوں گے کھڈّا ہاتھیوں کو پکڑنے کا قدیم طریقہ ہے۔ اس میں ہاتھیوں کو گھیر کر بانس بجاتے ہوئے ایک مضبوط حصار میں ہنکالاتے ہیں اور جب ناعاقبت اندیش ہاتھی اندر داخل ہو جاتے ہیں، اُوپر سے گرنے والا تقدیری دروازہ اُن کو ہمیشہ کے لیے فدوی بنا دیتا ہے۔

شادی کے بازار میں ڈاکٹر کی بڑی مانگ اور اونچا نرخ ہے۔ ڈاکٹر اگر حیوانات کا بھی ہو تو سر کے بال اور پلکوں پر چلتا ہے بلکہ حیوان ہو لیکن ڈاکٹر ہے تو بھی بزورِ نشتر گھوڑے جوڑے کی رقم ہتیاتا اور ایک پری زاد کو اپنی کنیزی میں قبول کرتا ہے۔ خادم کے معاملے میں خادم سے زیادہ اس کے والد دولہا تھے کیوں کہ خادم ایک سعادت مند اور احسان مند بیٹا تھا۔ سعادت مند اس لیے کہ والد کی طرف سے کسی بات کی روک ٹوک نہ تھی

احسان مند تھا اس لیے کہ اس کی والدہ کے انتقال کے بعد انھوں نے دوسری شادی کا قصد نہیں کیا تھا۔ جہاں بھی سلسلہ جنبانی ہوتی وہ اپنے ساتھ محلّے کے دو دوستوں ہم محکمہ، دو وظیفہ یاب، دو رشتہ داروں اور محلّے کی مسجد کے صاحب کو لازمی طور پر منسلک رکھتے۔ کہیں شام کی چائے کہیں عشائیہ اور ہر مقام سے اس نعرہ کے ساتھ اٹھتے' ہر اک مقام سے آگے مقام ہے اپنا۔ ایک پیام تو ایسا للچانے والا آیا کہ والد صاحب نے خادم کو پس پشت ڈال کر خود آگے بڑھ جانے کی ٹھان لی۔ لیکن اُن کے حق میں لڑکی والوں نے جہیز کی رقم نصف گھٹا دی تو وہ پیچھے ہٹ آئے اور خادم پر ایک اور احسان کر گئے۔ یہ نسبت سمنٹ کے سیٹھ دولت خاں کی بیٹی کی تھی۔ گھوڑے جوڑے کی رقم بیس ہزار، چالیس ہزار کا مکان، پچاس ہزار کا زیور، دھوم دھام کی شادی جس میں کسی نہ کسی وزیر کی شرکت یقینی، لڑکی کی وجاہت کے تعلق سے یہ معنّی اشارہ دیا گیا کہ وہ سو فیصد آدم زاد ہے اور شجرہ کی کسی شاخ پر بھی کسی دوسری جنس کا گھونسلا نہیں ہے۔ لڑکی کو دیکھنے کی بات پیش ہوئی تو کہا گیا کہ لڑکی کوئی دُم دار ستارہ نہیں اور یہ کہ دیکھنے ہی پر اصرار ہو تو جہیز میں مکان نہیں دیا جائے گا۔ خادم کے والد نے لڑکی کو دیکھنے کی تجویز واپس لے لی مگر مکان کے معائنہ پر اڑ گئے۔

خادم حیوانات کا ڈاکٹر سہی لیکن اس کا انسانی جمالیاتی ذوق پری وشوں کی تشخیص کرتا تھا۔ اپنی شریک زندگی کے تعلق سے اُس کا خانگی نظریۂ حُسن یہ تھا کہ وہ مدھو بالا کا اندازِ قد رکھے، گیتا بالی کی طرح غنچہ دہن ہو، نینا کی سنجیدہ نزاکت کا جواب ہو .... لیکن خادم کے والد کا مشورہ تھا یہ وہ کچھ نہیں، تم حیوانات کے آدمی ہو۔ تم کو تو ایسا سراپا سوچنا چاہیئے، ریگستان کی رانی کا قد، گلہری کا دہن، بیار بلّی کی سنجیدہ نزاکت اور دولت خاں کی بلکہ دولت کی بیٹی ....

خادم کی یہ بد قسمتی تھی کہ اس کے والد نے اس کی خیالی دُنیا میں کبھی جھانک کر نہیں دیکھا۔ ان کے قدم زمین پر تھے اور ان کی نظر میں بھی زمین بسا تھیں۔ زمین کہاں سونا اگلتی ہے، کہاں بنگلوں کو سربلند کرتی ہے کہاں موٹروں کو گھماتی ہے ..... اور ایسی زمین ان کو سیٹھ دولت خاں کے قبضہ میں مل گئی۔ انھوں نے سیٹھ دولت خاں کی بیٹی سے خادم کا رشتہ طے کر دیا۔ گھوڑے جوڑے کی رقم وصول کر لی۔ اب شادی کی تاریخ سے اُن کو دلچسپی نہ تھی۔ لیکن سیٹھ دولت خاں نے بذریعہ فرمانِ خسروی دوسرے ہی ہفتہ کے دوسرے دن شادی مقرر کر دی۔ برات کے تعلق سے خادم کے ایک دوست نے شاعرانہ نازک خیالی کو ایڑ لگائی۔ مشورہ تھا کہ گھوڑے جوڑے کی رقم گھوڑے پر سوار ہونے سے حلال ہوتی ہے اور حیوانات کا ڈاکٹر ہونے کے ناطے خادم کے لیے گھوڑے سے زیادہ نسبتی سواری کوئی اور ہو ہی نہیں سکتی۔

خادم نے سہم کر اپنے والد کی طرف دیکھا۔ گھوڑے کا علاج کرنا اور چیز ہے ..... گھوڑے پر سوار ہونا اور۔ خادم نے بچاؤ کا یہ پہلو نکالا کہ موٹر میں بھی گھوڑے کی طاقت ہوتی ہے اور امپالا میں تو اڑتیس گھوڑوں کی طاقت چھپی ہوتی ہے۔ لیکن اس دوست نے خادم کے والد کو سمجھایا کہ سیاہ اور پیٹرول پر کم از کم دو سو روپیوں کا خرچ بیٹھے گا..... اور گھوڑا ..... وہ مفت مہیا کر سکتا ہے۔ خادم کے والد نے حکم صادر فرمایا کہ دولہا گھوڑے پر برات کا سپہ سالار ہوگا ..... خادم کے دوست کو ہدایت ملی کہ وہ سیاہ گھوڑے کو ڈھونڈ نکالے جس پر وہ خادم کی والدہ کو بیاہنے گئے تھے۔ اب بے چارے وہ تاریخ کی گرد تو ہٹا نہ سکے البتہ محلّے والوں میں ایک کمہار

کا متوش ہو گیا۔ ہر جا پیر والا جانور گھوڑا نہیں ہوتا لیکن ہر ٹٹو گھوڑے کا بھتیجہ ہوتا ہے۔ خادم کا کوئی عقد مسنونہ نہیں ہو کرسی منگوائی گئی۔ کرسی پہ اسٹول رکھا گیا اور خادم بخارِ ارضی سے کرسی پہ اور کرسی سے اسٹول پہ پہنچا دیا گیا۔ ۔ ۔ ۔ اس بلندی پہ سے ٹٹو پست قد تھا اس لیے خادم کو صرف قدم رنجہ ہونا تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ڈرم دھم بولا۔ اور کاروانِ عقد حرکت آ گیا۔ اودے رنگ کے جد چپوری کوٹ پہ پیلا شملہ باندھے بیاندڑ کی مخلوق مریخ کے تازہ وارد وں کی ہیئت میں تھی لیک ڈرم بجانے والا اسی دنیا کا تھا۔ کیوں کہ اس غریب کے جسم پہ کوٹ نہیں تھا صرف بنیان تھا۔ بیاند بجنے لگا۔ برات ریڑھنے لگی۔ ٹٹو بھی براتیوں کے ریلے میں پیروں کو جنبش دیے بغیر آگے بڑھنے لگا۔ بیاند نے اپنی مہارت کی چیز چھیڑ دی غم دیے مستقل کتنا نازک ہے دل ۔ ۔ ۔ ۔ ہائے ظالم کے ساتھ ڈرم بجانے والے کی آستین پھٹ گر اس کی کلائی پہ اٹھ آئی۔ اور وہ آستین چڑھانے کے لیے رک گیا۔ اتنے میں دولہا کا ٹٹو اس کے پاس پہنچ گیا۔ ڈرم بجانے والے نے آستین کا غصہ ڈرم پہ نکالا اور اس دھماکہ کی ضرب لگائی کہ ٹٹو مراقبہ سے اچھلا۔ خادم کے ہاتھ کی سرخ دستی سے جھڑ اڑا۔ وہ تو کہیے خیر ہوئی، خادم نے بدحواسی سے کام لیا اور ٹٹو کے گلے کا ہار بن گیا۔ ورنہ عقد کی کارروائی ہسپتال میں انجام پاتی۔

دلھن کا گھر چاند تاروں کا میلہ تھا، موٹروں کا اڈہ تھا، مہمانوں کا چھتہ تھا۔ جب بارات پہنچی تو سب کی نظریں خادم کی طرف اٹھ گئیں۔ لیکن اسی وقت سیٹھ دولت خاں کے اشارہ پہ گھنگر بالا نے رقص شروع کر دیا۔ سب مہمان اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ خادم کو چاول پھنکوائی کے لیے بلا گیا تو ایک لحیم شحیم بلڈ پریشری رشتہ دار نے خادم کو ٹٹو کی بیٹھ پر سے اپنی گود میں اتار لیا لیکن دوسرے ہی قدم پہ وہ خادم پر ڈھیر ہو گئے۔ خادم کے والد نے اسے بلڈ پریشر کے دباپسے کشاں کشاں آزاد کیا اور پرستان کی طرف ڈھکیل دیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ خادم چست چالاک دلھن کی طرف بڑھنے لگا۔ کسی نے پکارا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ادھر نہیں ادھر ہے دلھن خادم کو ایک خوب صورت جوان مہمان لڑکی سے صرف دو قدم دور رک جانا پڑا۔ پینترا بدل کر جب وہ اپنی حقیقی دلھن کے مقابل جا کھڑا ہوا۔ اس کا چاول پھینکنے والا ہاتھ لرزنے لگا۔ خادم کے والد اس کے نزدیک پہنچ گئے۔ گھبراؤ نہیں بیٹا۔ شہسوار ہی لرزتے ہیں۔ گاما پہلوان بھی لرزے تھے۔ چلو پھینکو چاول۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دیوانے مت بنو۔ گھر میں چھ اَن بیاہی بہنیں بیٹھی ہیں اور جب خادم دلھا کی مسند پر آ بیٹھا، اس کے جبڑے بج رہے تھے اور آنکھوں سے حسین ساگر چھلک رہا تھا۔

قاضی صاحب نے فیس لے لی، مصری بادام سے اپنی تھیلی بھر لی اور ایجاب و قبول کا مرحلہ آ گیا۔ خادم نے ایک عالمِ بے بسی میں مسماۃ نزینہ بنت دولت خاں کو بعوض دو ڈھائی لاکھ مہر موجل اپنے عقدِ نکاح میں تین بار قبول کر لیا۔ مبارک بادیوں کا ہنگامہ شروع ہو گیا۔ سیٹھ دولت خاں اس وقت دنیا کا سب سے سبک دوش۔ سیماب شادماں باپ تھا۔ لیکن ابھی رخصتی باقی تھی۔ جلوے کی تیاری میں ڈاکٹر فیرینی فردوس پیش پیش تھیں کیوں کہ ان کے کالج کو سیٹھ دولت خاں کی طرف سے گرانٹ ملا کرتی تھی اور اس شادی کے لیے کالج میں رضاکارانہ دعا پڑھیا اور پیرا پڑھا کر رہی تھی۔ سیٹھ دولت خاں خادم کو لے کر زنانے میں گئے۔ ایک مہمان خاتون نے سرگوشی کی۔ دلہا تو گھوڑے کی شکل کا ہے۔ ڈاکٹر فیرینی فردوس نے خاموشی کی انگلی دکھائی۔ ششش۔ حیوانات کا ڈاکٹر۔ ۔ ۔ ۔ ۔ گھوڑا جوڑا۔ ۔ ۔ ۔ بڑی حسرتی بات بجلی بیکی روشنی کا فیوز اڑ گیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اندھیرے کی کھلبلی مچی۔ بجلی کے کاریگر اپنے کام پہ لگ گئے۔ بچے بلبلانے لگے لیکن روشنی اندھے کی بینائی کی طرح روٹھی رہی۔ سیٹھ دولت خاں نے پیٹرومکس منگوائے۔ لیکن ان کو پیٹرومکس کا

یا نظارہ گوارا نہیں ہوتا۔ مبارک گھڑی کو اندھیرے اجالے سے سروکار نہیں ہوتا اس لیے آرسی مصحف کی رسم اندھیرے ہی میں شروع کروائی گئی۔ دولت خاں کی رنگ کا منڈی کے ساتھ۔ دیکھو جو ستارہ چمک رہا ہے وہ پیشانی کا ٹیکہ ہے۔ دس ہزار کا اور دیکھو جو گردن کے پاس اجالا ہے وہ چمپا کلی ہے۔ چالیس ہزار کی۔ خادم نے ایک سفید چکنی حلوا آمد چیز بھی دیکھی جو ٹیکے اور چمپا کلی کے درمیان واقع تھی۔ خادم خوف زدہ اٹھ گیا۔ سیٹھ دولت خاں نے اپنی بیٹی کو بھی اٹھا دیا۔ جاؤ خوش رہو۔ واپسی کے لیے خادم کو ٹٹو سے چھٹکارا مل گیا۔ وہ موقع پا کر قدم پر دولتیاں جھاڑ کر قلعے کی طرف بھاگ نکلا تھا۔ . . . بیانڈ والے بھی اسے نہ ملے۔ ان کو چادر گھاٹ سے دولہا کے آگے چلنا تھا اور سیکل پر ڈبل سواری کے جرم میں پولس والوں نے سبھوں کو دھر لیا تھا۔ دلہن کی موٹر شادی کا بارات بجاتی خادم کو اس کے گھر لے آئی۔ . . . . خادم کے والدین دولت خاں کے بنگلے میں رک گئے۔ اس دن لاری والوں نے ہڑتال کر رکھی تھی اس لئے جہیز کے سامان کی فوری منتقلی ممکن نہ تھی، وہ دولہا کے باپ تھے اس لیے شادی کی رات کہیں بھی بسر کر سکتے تھے، وہ ایک آنکھ سوتے ایک آنکھ جاگتے صوفے پر دراز رہے اور جہیز کا سامان جیسے ان کی ہتھیلی پر جا رہا۔ دوسرے دن صبح خادم کے دوست مبارک باد دینے اس کے گھر پہنچے۔ کسی کے ساتھ تحفہ تھا۔ . . . . کوئی پھولوں کے ہار لایا تھا۔ . . . . . خادم نے مسکراتے ہوئے خیر مقدم کیا۔ جب چائے آئی تو سبھوں نے ایک زبان ہو کر نعرہ بلند کیا "دلہن بھابی کے ساتھ چائے پی جائے گی . . . . خادم ٹالتا ہی رہا لیکن دوستوں کا اصرار بڑھتا ہی گیا۔ اس اصرار کی اصل وجہ یہ تھی کہ وہ خادم کے انتخاب کا نظارہ چاہتے تھے۔ اور ان کو یقین تھا خادم کی جستجو میں خوب اور خوب تر کو چھوڑ کر آخر کار خوب ترین پر قابض ہو گئیں اور دوستی کی بنا پر ان کو حق پہنچتا ہے کہ وہ دلہن بھابی کے درشن مانگیں . . . . دوست دولہا کی قسمت پر رشک کریں ـــــ خادم با دل ناخواستہ اٹھا اور اندر چلا گیا۔ آنکھیں جلوہ جو رہا . . . . دلوں کی دھڑکن تیز تو تھا ہی انتظار کی سنسنی . . . . ساتھ . . . . کوئی . . . . . مدھو بالا کی قامت لیے۔ گیتا بالی کی غنچہ دہنی پر مسکراتا . . . نینا کی سنجیدہ نزاکت کو کشیدہ ابرو پر تولتا . . . . . آیا . . . . آیا . . . . چشم براہ ـــــ نگاہوں سے قدم بوسی کے لیے تیار . . . . کہ دروازہ دھڑکا پردے کو جنبش ہوئی۔ تہنیکا تمانہ چھڑ گیا!

پھلکے تری آنکھوں سے شراب

مہکیں ترے عارض کے گلاب

اور خادم کے پیچھے سمٹتی، لنگڑاتی اس کی دلہن نمودار ہوئی . . . . شراب سوکھ گئی، گلاب جھڑ گئے۔ ایک دوست نے آگے جھک کر دوسرے کو رازدار بنایا۔ دولہا میاں کو آنکھوں کا عطیہ دینا ہوگا۔ خادم نے اپنا سر تھام لیا۔ ایک اور دوست نے عینک درست کر کے ہونٹوں کو بھینچ لیا۔ یہ لیو ہتی کے دو دانت دکھانے کے ہوتیں ان کے چار دانت باہر ہیں۔ خادم کا سر کچھ اس طرح جھٹکے کھانے لگا جیسے برقی رو چھو رہی ہو۔ کسی نے آواز اٹھائی، دیکھو گلے میں جھریوں کے ہار بھی ہیں۔ خادم اب تک خاموش بیٹھا یہ تعزیتی تبصرے سن رہا تھا آخری جملے پر قندیل کی طرح بھڑک اٹھا . . . . . ارے زور سے بات کرو رے بھابی بہری بھی ہے۔ . .

دلہن نے مبہوت ماحول کی تڑپتی، تلملاتی مایوسی کو محسوس کیا اور پلٹ کر خادم کی طرف دیکھا۔ تبدیلی فضا کے لیے ایک شرمیلی مسکراہٹ اس کے دانتوں پر چمک گئی۔ سفید ترین نے پیلاری کا پہیہ گزر گیا جیسے بغیر باپ پیدا ہونے والے لڑکے کو خود اس کی والدہ نے پیدا ہوتے ہی چھوڑ دیا ہو جیسے . . . . . خادم چونک گیا۔ یہ مسکراہٹ اس سے پوچھ رہی تھی۔ نہیں جانتے تھے بھکاری کو پسند کرنے کا حق نہیں؟

رشید قریشی

آنا دلہن کا دیر سے

مَیں اور مولوی افتخار حسین ہم محلہ ہی نہیں، وظیفہ بھی ایک ہی بنک سے اُٹھاتے ہیں۔ ہمارے باہمی خلوص کا یوں اندازہ لگا لیجیے کہ میں اُسے افتی پکارتا ہوں اور وہ کرسی کرسی کی رٹ لگائے میرے پیچھے پڑا رہتا ہے۔

ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ میں اپنی ایک بھتیجی سے ملنے کے لیے جبلی چلا گیا اور وہاں مہینہ بھر ٹھیر جانا پڑا اور میں ایک مہینہ کا وظیفہ اٹھا نہ سکا۔ اس ایک غفتہ کے بعد جب میں وظیفہ لینے بنک پہنچا تو دوسرے وظیفہ یاب تو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ہی دیکھتے رہے لیکن افتی لپٹ گیا "کرسی تو زندہ ہے؟" "سچ مچ تو زندہ ہے؟" "قسم کھا تو زندہ ہے!" اور وہ قصائی کی طرح میری ہڈی بوٹی دبا دبا کر میرے زندہ ہونے کی جانچ کرنے لگا۔ ایک بار تو اُس نے میرے شرٹ کے اندر سے اپنے ہاتھ کو میرے آرپار گزارنے کی بھی کوشش کی۔ میں بلبلا اُٹھا "ارے یہ کیا کرتا ہے ظالم! یا میری پسلیاں توڑ ڈالے گا۔ میں تیری ہی طرح زندہ ہوں، بھوت ووت کچھ نہیں بنا"

افتی ہنس پڑا "ارے یار وظیفہ یابوں کو بڑی پابندی سے وظیفہ اٹھانا چاہیئے۔ ایک مہینہ بھی غیر حاضر رہے۔ دشمن تو بقید حیات رہتے ہیں۔ وظیفہ یاب ہی مرحومین کے گڑھے میں ڈھکیل دیئے جاتے ہیں" میں نے کہا: تمہارا خلوص ہے جو تم مجھے جیتے جی مرحوم دیکھ رہے ہو، اب یہ بتاؤ کہ تم کیسے ہو؟ کہنے لگا "خیریت سے ہوں لیکن اب صرف وظیفہ سے کام نہیں چلتا، تمھیں تو معلوم ہے صرف تنخواہ سے بھی کام نہیں چلتا تھا۔ سوچ رہا ہوں بے موٹر جو اپنا موٹر خانہ ہے اُسے ضروری مرمّت کے بعد کیوں نہ کرایہ پر اُٹھا دوں!"

میں نے کہا خیال تو اچھا ہے، لیکن میں پوچھتا ہوں جب موٹر ہی نہیں تھی تو موٹر گیاریج کیوں کھڑا کرلیا؟" فتی کا لہجہ مایوسانہ ہوگیا "ارے میاں میرا گیاریج ہی کیا، ساری دُنیا اُمید پر قائم ہے۔ اب میرے گیاریج میں موٹر نہیں تو یہ میری نادار نامرادی ہے ..." میں مسکرانے لگا "اچھا ہوا تم نے ایڈ ڈرم نہیں بنایا" افتی ہنس پڑا "تو تمھارا مشورہ ہے گیاریج کرایہ پر اُٹھا ہی دوں" میں نے پوچھا "کوئی کرایہ دار بھی نظر میں ہے یا وہ بھی موٹر کی طرح اُمید کی دھند میں کہیں چھپا بیٹھا ہے" افتی نے جواب دیا "نہیں وہ تو میری مٹھی میں ہے"

میں نے پوچھا "کوئی طالب علم ہے؟"

افتی نے ٹھنڈی سانس بھری "یہ کبوتر اب ٹکڑی سے ٹوٹ کر اکیلا کہیں نہیں اُترتا"

"تو پھر" "سرکس کا ایک کرتب کار ہے" "شیر کے منہ میں گردن ڈالنے والا"

افتی نے جواب دیا۔ "نہیں . . . . موت کے کنویں میں جلتا ہوا چھلانگ لگانے والا ہے"

میں نے کہا "ٹھیک ہے، سرکس کے ساتھ وہ بھی چلا جائے گا۔ اتارلو آسے، لیکن کرایہ پیشگی وصول کرلو"

افتی نے کہا "وہ تو میں کرچکا۔ پورے ایک ہزار روپے ایک مہینے کے بعد میری جیب میں ہیں۔ میں نے اس کی پیٹھ تھپکی۔

"بس اب بیٹی کی شادی بھی کہیں ٹھیک کر دو"

چند ہی دن بعد افتی میرے پاس آیا۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد شادی کا ایک رقعہ اس نے میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ افتی کی بیٹی کی شادی مقرر ہوگئی تھی۔ میں نے لڑکے کے بارے میں پوچھا تو بتایا گیا۔ بہت شریف، بہت کم سخن، بہت ادب شناس، معقول تنخواہ کی ملازمت . . . . لیکن . . ؟

"لیکن کیا؟" افتی نے کہا "بس ایک اتفاقی خرابی ہے، اس کی پہلی بیوی کا انتقال ہوگیا ہے، یہ دوسری شادی ہے"

میں نے پوچھا "کچھ مطالبے بھی ہیں یا" جواب ملا "بیس ہزار کا مطالبہ ہے لیکن میں اس کی ادائی چار قسطوں میں کردوں گا۔ پہلی قسط پانچ ہزار اور باقی پانچ پانچ ہزار کی تین قسطیں حسبِ سہولت۔ پہلی قسط میں ادا بھی کرچکا" میں نے سمجھایا "یہ قسطوں کا سودا کچھ مناسب نہیں ہوتا۔ بُری فطرت والے دوسری قسطوں کی ادائی کے لیے جھگڑے پر بھی اُتر آتے ہیں" افتی مسکرانے لگا۔ "بھائی صاحب لڑکا دیندار بھی ہے، کل ہی میں کچھ خریداریوں کے لیے اس کے ساتھ بازار گیا تھا۔ اسی دوران اذان کی آواز سنائی دی اور وہ میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچتا ہوا مجھے نماز کے لیے مسجد کے اندر لے گیا۔ اب اس کی خاطر جس طرح بھی بن پڑا، میں نے بھی نماز پڑھ لی" میں نے مبارک باد دی اور اپنی ڈائری میں شادی کی تاریخ وقت اور مقام کا اندراج کرلیا۔

میری یہ کمزوری ہے کہ میں اپنے کاموں میں سختی سے وقت کی پابندی کرتا ہوں۔ ایک بار میں تاریخ بھول جاؤں گا لیکن وقت کے تعلق سے میرے نزدیک تھوڑی سی بھی فروگزاشت جائز نہیں قرار پاتی، میری اس عادت سے چڑ کر افتی مجھے کبھی کبھی گھڑی کا کانٹا بھی کہہ بیٹھتا رہے۔

اب خود افتی کی بیٹی کی شادی ہو تو میں کس طرح وقت کا پابند نہ رہتا۔

ٹھیک وقت پر میں شادی خانہ کے سامنے کھڑا تھا۔ پھر جب میں نے اندر قدم رکھا، چاروں طرف سے چیخ و پکار شروع ہوگئی "ٹھیر جایئے، اجی رُک جایئے، ایسی بھی کیا جلدی ہے جناب، ٹھیریئے کہہ رہے ہیں نا، ٹھیریئے" میں پریشان ہوگیا پہلا خیال یہی تھا کہ شاید مہمانوں کے دعوت ناموں کی جانچ پڑتال کی جارہی ہے اور میں نے جیب ٹٹول کر دعوت نامہ نکال لیا۔ مقام کا نام پڑھ لیا اور مطمئن ہوکر پھر آگے بڑھا تو وہی شور "اجی رُک جایئے قبلہ . . ." کسی منچلے نے فقرہ سے آواز اُٹھائی۔

"ابھی تشریف ابھی نہیں آئی" اور ایک منتظم سا شخص، تیز تیز قدم اٹھاتا، میرے پاس پہنچ گیا "بے شک جناب آپ اس تقریب کے معزز مہمان ہیں لیکن مہمانوں کو ابھی داخلہ کی اجازت نہیں دی جاسکتی" میں نے کہا "یہ تو بھی

زیادتی ہے۔" اس شخص نے بے بسی کے لہجے میں کہا "کیا کریں صاحب ہم مجبور ہیں۔" میں سختی سے پوچھا "کیا میں پوچھ سکتا ہوں وہ کون سی مجبوری ہے جس کی بناء پر آپ اس INSULT کو ہم پر لاد رہے ہیں؟" وہ شخص مضبوط لہجے میں بولا "بھئی ابھی وہ WEL COME کا بیانر نہیں لگا ہے نا، جب تک یہ بیانر نہیں لگ جاتا، آپ کس طرح اندر آسکتے ہیں۔ آپ ہی سوچیے۔" میں نے پھر پوچھا "بیانر کہاں ہے؟" سیکل پر آتے ہوئے ایک شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نے کہا "دیکھئے وہ آرہا ہے بیانر۔" میں کچھ نرم ہوگیا۔ "تو اب میں کیا کروں، کیا گھر واپس چلا جاؤں؟" وہ شخص بہت شائستہ ہوگیا۔ "آپ کو تکلیف تو ہوگی، لیکن کچھ دیر اِدھر اُدھر چہل قدمی کر لیجئے۔"

آدھے گھنٹے کی فضول تھکا دینے والی چہل قدمی کے بعد شادی خانہ پر WEL COME کا بیانر لہراتا نظر آیا اور میں سینہ تانے شادی خانہ کے اندر داخل ہوا، اپنے ہی قدموں کی چاپ سے ویلکم ویلکم کا سُریلا نغمہ ابھرتا سُنائی دیا اور دور سے اسی منتظم نما شخص کی آواز آئی "ہاں! اب اندر آؤ ویلکم۔"

محفلِ عقد جم گئی تو ایک مہمان نے مجھ سے پوچھا "دلہن کے والد کون ہیں؟"

میں نے کہا "اس محفل میں آپ کو جو شخص سب سے زیادہ خوش نظر آئے، بس وہی دلہن کے والد ہیں۔ اور میں نے افتی کی طرف انگلی سے اشارہ کیا ــــ افتی کو واقعی میں نے اتنا خوش کبھی نہیں دیکھا تھا، یہاں تک کہ دولہا نے کسی نے پانی لانے کو کہا تو افتی خود اُس کے لیے پانی لے آیا اور جب تک وہ پانی پیتا رہا۔ افتی اُسے مسکراتا دیکھتا کھڑا رہا اور اس کے حلق کی جنبشوں سے ظاہر ہوتا تھا۔ پانی دُلہا پی رہا ہے اور پانی کے گھونٹ افتی کے حلق سے نیچے اُتر رہے ہیں۔ اتنے میں زنانہ سے ایک لڑکی باہر آئی اور افتی کو اندر بُلا لے گئی۔ کچھ دیر بعد افتی جو باہر آیا تو پریشان پریشان چہرہ پر ہوائیاں اڑتی ہوئیں اور پیشانی سے بار بار پسینہ پونچھتا ہوا میں اُس کے بازو جا بیٹھا لیکن میری موجودگی بھی اس کے لیے غیر محسوس بنی رہی۔ میں نے تسلّی کی خاطر کہا "ارے بھائی! اس میں اس قدر رنجیدہ ہونے کی کیا بات ہے۔ سُنا نہیں، ایک بار داماد بنوگے تو دو بار خسر بننا پڑے گا۔ یہ تو قانونِ فطرت ہے۔" افتی نے چونک کر میری طرف دیکھا "ارے بھائی تم ہو۔ وہ بات نہیں بھائی۔ پریشانی کی بات یہ ہے کہ دلہن ابھی تک نہیں آئی۔" میں نے پوچھا "تو پھر گئی کہاں؟" اندر کہہ رہے ہیں شاپنگ کو گئی ہے۔" میں نے کہا "میں آئسکریم کا دور چلا دیتا ہوں، پھر کوئی نہیں پوچھے گا دلہن کہاں ہے۔"

افتی نے کہا "بھائی اندر دُلہا والے دُلہن کو دیکھنے اور عقد کی کاروائی کو جلد نمٹا دینے کا تقاضہ کر رہے ہیں اور دلہن ہی کا پتہ نہیں۔" افتی اُٹھ کر پھر زنانہ میں چلا گیا۔ میری جان پہچان کے ایک صاحب میرے بازو آ بیٹھے "کیا بات ہے جناب دلہن ابھی تک نہیں آئی، کیا اس شادی سے ناراض ہے دلہن، ہم نے بھی سُنا ہے دلہا کی یہ دوسری شادی ہے۔" میں ان صاحب سے پیچھا چھڑانے کے لیے اپنی جگہ سے اُٹھا اور زنانہ کی طرف چلا گیا۔ وہاں کیا دیکھتا ہوں کہ افتی کی بیگم کونے میں مُنہ چھپائے رو رہی ہیں۔ میں نے کہا "بھابی یہ آپ ہیں؟" وہ آنسو پونچھتی ہوئی میری طرف پلٹیں "بھائی صاحب، اس خوشی کے موقع پر بھی رونا میری قسمت میں لکھا ہے۔

پوپی کہاں مر گئی، نہیں معلوم اور دُلہے والوں کا تقاضا یہ ہے۔ دلہن کو لاؤ، دُلہن ہے ہی نہیں تو میں کہاں سے لاؤں دُلہن کو۔ میں نے سمجھایا " بھابی بعض وقت کسی مشکل کو آسان کرنے کے لیے تھوڑی سی اُلٹ پھیر سے بھی کام لینا پڑتا ہے۔" افتی کی بیگم نے کہا " میں اُلٹ پھیر کا مطلب نہیں سمجھی بھائی "

" آپ کہتی ہیں نا کہ دلہن کی سہیلی سروری اس سے بہت ملتی جلتی ہے! اسی کو تھوڑی دیر کے لیے دلہن کی مسند پر بٹھا دیجیے" افتی کی بیگم میری بات کو سمجھ گئیں لیکن کہنے لگیں " بھائی صاحب وہ تو شادی شدہ اور چار بچوں کی ماں ہے" میں نے کہا " اس سے کیا ہوتا ہے؟ آپ اس کے چہرے پر میک اپ کا ہاتھ پھیر دیں اور دو چار گہنے پہنا دیں تو وہ پھر دُلہن بن جائے گی۔ دراصل بھابی اس وقت ہم کو دلہن سے سروری کی مشابہت سے فائدہ اٹھانا ہے مشابہت بھابی جب اپنا منتر پھونکتی ہے تو بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگا جاتے ہیں" " میں اُسے بلا لاتی ہوں آپ ہی اُسے سمجھائیے" بھابی اندر چلی گئیں اور میں اندیشہ مند ہو گیا کہ راستہ کے جس گڑھے پر گھاس پھونس ڈال کر اُسے ہم چھپانے چلے ہیں، اس میں ہمارا شکاری ہی کہیں نہ گر پڑے۔ سروری آئی تو میں نے دیکھا، جسم اس کا کچھ بھرا بھرا سا ہے لیکن چہرہ پر چمکتی شادابی کا نکھار سنہری دھوپ کی طرح چھپا رہا تھا۔ میں نے پوچھا " کیوں بیٹی پھر کچھ تیاری ہے" شرما گئی۔ میں نے کہا " یہ پانچویں بیٹی ہے یقیناً اس کے بعد بس۔ میں تم دونوں کا آپریشن کرادوں گا" سروری نے پوچھا " انکل آپ ان سے مل لیجیے نا۔ وہ بچوں کے ساتھ باہر ہی بیٹھے ہیں"

میں نے کہا " سروری تم بُرا مت ماننا، اس محبت سے تمہارے شوہر بچوں کو سنبھالتے ہیں کہ مجھے تو شبہ ہوا وہ بچوں کے باپ ہیں یا ....." سروری مسکرانے لگی " اب آپ اپنا مذاق رہنے دیجیے، کہئے آپ نے مجھے کیوں بلایا ہے"..... میں نے کہنا شروع کیا " سروری بیٹی! اس وقت ہم کو تمھاری مدد کی ضرورت ہے۔ دُلہن ابھی تک نہیں آئی ہے اور دُلہے والے طرح طرح کی باتیں پھیلا رہے ہیں۔ دلہن جہاں کہیں بھی گئی ہو، آئے گی ضرور لیکن اس کے آنے تک لوگوں کا منہ بند رکھنے کے لیے ہم نے سوچا ہے کہ کچھ دیر کے لیے تم اس کی جگہ دلہن بن کر بیٹھ جاؤ"

سروری کا منہ کھل گیا " دلہن !! میں !! چار بچوں کی ماں! اور پھر پانچواں بھی آنے والا ہے۔ میں کس طرح دلہن بن سکتی ہوں انکل"

میں نے کہا " اس میں بچے کہاں، بیچ میں آتے ہیں۔ تم تھوڑا سا میک اپ کرلوگی، دلہن کی ساڑی پہن لوگی اور دُلہن کے کچھ زیور بھی سجالوگی اور تمہارا جو ذاتی زیور ہے شرمیلی مسکراہٹ کا، اُسے اپنی فتح کے پرچم کی طرح لہراؤ تو دلہنیں تم پر سے واری جائیں گی، سنا تم نے!"

سروری سوچنے لگی اور میرا دل خوشی سے اُچھل پڑا، ہرنی ککڑی[1] کھاگئی " لیکن انکل..... اگر دلہن نہ آئے تو....." میں نے کہا " خدانخواستہ ایسا کیوں ہوگا۔ وہ آئے گی اور ضرور آئے گی" سروری کی پریشانی دُور نہیں ہوئی " خدانخواستہ انکل وہ نہ آئی تو..... آپ تو دیکھ ہی رہے ہیں، دُلہے والے دلہن کو لے جانے کے لیے کیسی گڑبڑ

---

[1] ککڑی میں کانٹا چبھو کر اسے کھیت میں ڈال دیتے ہیں۔ ہرن ککڑی کھاتا ہے اور شکاری کے ہاتھ لگ جاتا ہے۔

جا رہے ہیں "۔ میرا ذہن میری مدد کو آگیا، میں نے کہا "خدانخواستہ اگر ایسا ہوا تو میں آخیر وقت میں اعلان کر دوں گا۔ دلہن نے کنویں میں کود کشی کر لی ہے۔ گھوڑا جوڑا معاف اور شادی موقوف" سروری نے اطمینان کا سانس لیا، لیکن اس نے یہ شرط بھی لگا دی کہ اس کے شوہر سے بھی اجازت لے لی جائے ..." میں نے کہا "ٹھیک ہے، تم دلہن بنتی رہو، میں تمہارے شوہر کو بلا لاتا ہوں"

سروری کے شوہر اپنے بچوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے بیٹھے تھے۔ اپنے بچوں کے نام تو انھوں نے نہیں بتائے لیکن کسی کو وہ لالی پاپ، کسی کو لالی پاپا، کسی کو لالی پن اور کسی کو لالی پٹ پکارتے تھے۔ میں نے کہا "نیاز بھائی! سروری آپ سے کچھ بات کرنا چاہتی ہیں، بچوں کو میں دیکھتا رہوں گا آپ اس سے مل آیئے"۔ بولے "میں بچوں کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گا، میں جاؤں گا تو بچے بھی میرے ساتھ جائیں گے"۔ میں نے کہا "ٹھیک ہے آپ جو مناسب سمجھیں وہی کیجیے"۔ نیاز بھائی میری طرف دیکھ کر مسکرائے "ایسا ہی ہے تو آپ لالی پٹ کو گود میں لے چلیے"۔ غرض مند زبان نہیں ہلا سکتا۔ ہکلا بھی نہیں سکتا۔ اس لیے میں چپ چاپ لالی پٹ کو گود میں اٹھا کر نیاز بھائی کے ساتھ ہو لیا۔

سروری کا سامنا ہوا تو نیاز بھائی بوکھلا گئے۔ "میری سروری کہاں ہے؟"

"آپ کون ہیں؟" میں نے دیکھا گلابی ساڑی کے پلّو کی اوٹ میں سروری کا چہرہ تازہ گلاب کے پھول کی بہار دکھا رہا تھا اور کاجل لگی دنبالہ دار آنکھوں سے اجنبا جھانک رہا تھا اور افشاں کی چمک دمک کا تو یہ عالم تھا جیسے تاروں بھرا آسمان ٹوٹ کر پیشانی پر اُتر آیا اور ٹیکہ تو چار چاندوں کا ایک چاند بنا ہوا تھا۔ مجھے کچھ گھبراہٹ بھی ہونے لگی کہ اگر دلہا نے سروری کو دیکھ لیا تو زمین آسمان ایک کر دے گا۔ اور اُسے چھوڑے گا نہیں۔ سروری نے اپنے شوہر کو اسکیم کی پوری تفصیلات بتائیں اور آخر میں کہہ دیا کہ "میں اپنی سہیلی کے لیے جان بھی دے سکتی ہوں، اگر اس کی بھی ضرورت پڑ جائے تو"۔

نیاز احمد صاحب پریشان تھے۔ اُن کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اُن کا کون سا ردِّ عمل صورتِ حال کے مطابق ہوگا۔ تاہم انھوں نے گلوگیر آواز میں کہا "اگر دلہا کے گھر جا ہی رہی ہو تو چھوٹے "لالی پٹ" کو بھی ساتھ لیتی جاؤ۔ تمہارے بغیر وہ چین سے نہیں رہے گا"۔ سروری طیش میں آگئی "دلہا کے گھر جانے کا سوال تمہارے ذہن میں کس طرح کودا۔ یہ تو صرف موقتی دکھاوے کی اسکیم ہے اور پھر دلہن کے ساتھ بچے بھی جائے ایسا بھی کبھی ہوا ہے؟ بس چار بچوں میں دماغ آپ کا چوکڑی بھول گیا۔ اب جایئے غصہ دلا کر میرا میک اپ مت بگاڑیئے"۔

میں نیاز احمد صاحب اور بچوں کو لے کر باہر آگیا۔

افق کو دیکھا تو اس کے چہرے پر اطمینان کے آثار نمایاں تھے اور وہ ایک نوجوان سے سنجیدہ گفتگو میں مصروف تھا، میں اس کے نزدیک جا بیٹھا تو اس نے اس نوجوان کا مجھ سے تعارف کرایا۔ "یہی ہیں میرے گیارہ کے کرایہ دار سرکس والے"۔ نوجوان مؤدب کھڑا ہو گیا اور جھک کر سلام کرتا ہوا چلا گیا۔ اتنے میں زنانہ سے کچھ ایسی آوازیں بلند ہوئیں۔ دلہن آگئی دلہن آگئی۔ دلہن رو رہی ہے۔ دلہن دھاڑیں مار مار کر رو رہی ہے"۔ میں حیران کہ اگر اصلی دلہن آگئی ہے تو عارضی دلہن

سرودی دھاڑیں مار مار کر کیوں رو رہی ہے، سہیلی سے جدا ہونے کا اتنا تو غم نہیں ہوتا۔

اِدھر محفلِ عقد میں بھی ہلچل مچ گئی ــــ کیوں کہ ایک سب انسپکٹر پولیس، دو سپاہیوں کے ساتھ شہ نشین کے مقابل آکھڑا ہوگیا تھا۔ افتی تیز تیز میرے پاس آیا اور مجھے اپنے ساتھ شہ نشین تک لے گیا۔ وہاں سب انسپکٹر پولیس اور نوشہ کے درمیان بات چیت شروع ہوچکی تھی۔

سب انسپکٹر پولیس :ــ آپ ہی کا نام کریم الدین ہے؟

نوشہ : جی ہاں۔

سب انسپکٹر پولیس : یہ انتظام آپ ہی کی شادی کا ہے؟

نوشہ : جی ہاں۔

سب انسپکٹر پولیس : یہ آپ کی پہلی شادی ہے؟

نوشہ : یہ میرا خانگی معاملہ ہے۔

سب انسپکٹر پولیس : آپ کی پہلی بیوی کہاں ہے؟

نوشہ : اس کا شائد انتقال ہوگیا۔

سب انسپکٹر پولیس : تو یہ آپ کی دوسری شادی ہے!

نوشہ : اب آپ جو چاہے سمجھ سکتے ہیں۔

سب انسپکٹر پولیس : آپ کی کوئی بہن بھی ہے؟

نوشہ : جی، جی ہاں۔ ایک بہن ہے میری۔

سب انسپکٹر پولیس : اس کی شادی ہوچکی ہے؟

نوشہ : جی ہاں۔

شادی خانہ کی چھت پر پٹاخے چھوٹنے لگے تو، سب کی نظریں اوپر اُٹھ گئیں۔ چھت پر ایک دلہن بھی کھڑی نظر آئی اور اس کی چیختی ہوئی آواز بھی سنائی دینے لگی۔

دُلہن : معزز مہمانو! میرے بہی خواہو اور میرے بزرگو! اِدھر دیکھئے، میں دلہن، میں آصف جہاں۔ افتخار حسین صاحب کی بیٹی، میں آگئی ہوں۔ مجھے آنے میں کچھ دیر ہوگئی۔ کیوں کہ اپنی شادی کے لیے مجھے بھی کچھ تیاری کرنا تھا۔ میں اس دیر کے لیے معافی کی طلب گار ہوں۔ مجھے امید ہے آپ مجھے معاف کردیں گے۔

میں اپنے ماں باپ کی احسان مند ہوں کہ انھوں نے مجھے زیورِ تعلیم سے آراستہ کیا اور میری شادی کے لیے جہیز جوڑنے میں برسوں کی پس انداز کی ہوئی پونجی بھی لگادی۔ لیکن مجھے ان سے شکایت یہ ہے کہ [illegible] کے نام سے انھوں نے ایک ایسی رقم دینا قبول کرلیا جس کی ادائی ان سے کبھی بھی ممکن نہیں ہوسکتی اور پھر نہ [illegible] نہ دیکھا، نہ بھالا بس جو بھی مانگا گیا دے ڈالا۔ آپ کو حیرت ہوگی دلہن کے علاوہ بیس ہزار کی رقم [illegible] کی گئی اور علاوہ نے جہیز اور پہلی قسط کے طور پر پانچ ہزار بھی انھوں نے دے دیئے اور ایک دوسری حیرت کی بات یہ کہ لینے

ے نے یہ رقم اس خوشی سے جھپٹ لی جیسے کوئی نوٹوں بھرا پرس اُسے راستے میں پڑا مل گیا۔ ٹھیک ہے اپنا اپنا معاملہ ہے۔
میں مطالبہ کرتی ہوں کہ جو بھی میرا مہر مقرر ہو وہ مجھے آج ہی ادا کر دیا جائے اگر یہ رقم مجھے نہیں ملے گی تو میں عقد نامہ
اپنے دستخط ثبت نہیں کروں گی' نہیں ... نہیں ... ہرگز نہیں۔

ہو سکتا ہے اس جسارت پر مجھے سزا بھی دی جائے اور آج کل دلہنوں کے لیے جو سزا مروّج ہے وہ یہ ہے کہ انہیں
ندہ جلا دیا جاتا ہے لیکن سن لیجئے کہ میرا نام جل مرنے والی دلہنوں کی فہرست میں کبھی بھی شامل نہیں ہوگا کیوں کہ
نے اپنے لیے ایک ایسا لباس تیار کروالیا ہے جو مجھے آگ سے محفوظ رکھ سکتا ہے اور درحقیقت یہی میرا عروسی
لباس ہے۔ اُدھر سب انسپکٹر پولیس نے نوشہ سے بات چیت جاری رکھی۔

ب انسپکٹر پولیس : اب میری رپورٹ سنئے۔ آپ کے بہنوئی نے خودکشی کرلی اور آپ کی بہن کو جلی ہوئی حالت میں دواخانہ
شریک کرایا گیا۔ مرنے سے پہلے اپنے بیان میں آپ کی بہن نے اعتراف کیا ہے کہ اس کے کرتوت کی سزا اس کو ملی ہے۔

شہ : کیا میری بہن زندہ بچی ہے؟

انسپکٹر پولیس : آپ کی بہن اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ اب آپ یہ بتلائیے کہ آپ کی پہلی بیوی کا انتقال کس طرح ہوا۔

شہ : مجھے کچھ یاد نہیں انسپکٹر' مجھے پریشان مت کیجئے۔ میں پاگل ہوگیا تھا اور میں نے اپنے بہنوئی کے مطالبہ کی تکمیل کی خاطر
بہن کی مدد سے اپنی بیوی کو جلا کر مار ڈالا تاکہ میں دوسری شادی کرسکوں۔

ب انسپکٹر پولیس : بیوی کے قتل کے جرم میں میں آپ کو گرفتار کرتا ہوں آپ اسی طرح سہرا باندھے ہوئے پولیس اسٹیشن
ں گے یا دلہن کے والد کا بھیجا ہوا یہ سہرا ان کو واپس کردیں گے؟"

افتی نے پکارا "لے جاؤ انسپکٹر' اس قاتل مردود کو میری نظروں سے دور کردو۔ اس کے وجود سے انسانی جسم کے جلنے
بو اٹھ رہی ہے۔ اسے جہنم میں پھینک دو۔ سہرا سمیت" اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہا "کرسی ذرا دیکھنا قاضی صاحب کہیں
گئے نہ پائیں" اور اس نے سرکس کے کرتب باز کا ہاتھ پکڑ کر اسے مسند پہ لا بٹھایا۔

میں نے کہا "لوگوں کو گھر داماد ملتے ہیں' تم کو گراج داماد ملا ہے۔ مبارک ہو"۔

مسند نشین سرکس والے نے پندرہ سو کے نوٹ نکالے اور افتی کے ہاتھ میں تھما دیئے۔ "یہ گیاریج کا کرایہ ایک ہزار اور آج
سرکس کے کرتب کی فیس پانچ سو روپے۔ بس اسی قدر مہر میری طرف سے" افتی کے ہونٹوں پر ایک ایسی مسکراہٹ کھل اٹھی جیسے
بھی کہہ سکتے تھے اس پھول سے ایک جملہ ادا ہوا "کام بن گیا ہے تو کام چل جائے گا"۔ میں اس جملہ کی معنویت اور
ت پر غور کرتا بیٹھا تھا کہ نیاز احمد صاحب میرے قریب آئے "اجی جناب! آپ یہاں اطمینان سے بیٹھے ہیں۔ اُدھر سب کچھ
ہو گیا! سروری دلہن تو بنی لیکن دلہا کے گھر نہ جاسکی اور وہ مذکر ہلکان ہورہی ہے کہ اس کا سنگھار بے کار ہوا" ان
کی شکایت تھی۔ دلہن نے جب اتنی دیر لگا دی تھی تو ذرا کچھ دیر کرلیتی' اس کا کیا بگڑتا۔ اب جائیے سروری کو سمجھائیے اور
کیا ہے تو آپ مجھے بھی سفاری سوٹ کا کپڑا تحفہ دینے والے تھے۔

میں نے کہا "مجھے سب کچھ یاد ہے لیکن ایسی باتوں کو بھول جانا ہی بہتر ہے۔ رات گئی بات گئی۔ بات کے
دلہن گئی۔

▲▲

رشید قریشی

آئینہ
بڑھاپا
اور کبریٰ بیگم

کیا کوئی نئی بات نظر آتی ہے ہم میں
آئینہ ہمیں دیکھ کے حیران سا کیوں ہے

آئینے کو آئینہ دیکھنے والے میں نئی بات جو نظر آرہی ہے وہ یہ ہے کہ چہرہ کی جلد جگہ جگہ سے کٹ پھٹ کر جھریوں میں بدل گئی ہے اور سر کے بالوں کی چمکتی سیاہیاں بدرنگ بھوری پڑ گئی ہیں۔ جیسے بھونرے اڑ گئے اور ان کی جگہ بگلے بیٹھ گئے۔

اصولاً بوڑھوں کو آئینہ دیکھنا ہی نہیں چاہیے۔ اور جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے وہ حتی الامکان اس سے منہ چھپاتے بھی رہتے ہیں لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ خود آئینہ انھیں چوری چھپے دیکھتا اور ان پر ٹھٹے لگاتا پھرتا ہے۔ اب ذرا سی واقعہ کو لیجیے

ایک بزرگ کی نظر اتفاقاً ایک دوشیزہ کے دمکتے چہرے پر پڑ گئی۔ پہلی نظر چوں کہ جائز ہوتی ہے اس لیے یہ نظر کچھ زیادہ دیر ٹھہری بس غضب ہو گیا! ـــــ دوشیزہ کی آنکھوں پر لگی عینک کے رنگین شیشوں نے شور مچا دیا کہ لوگو دیکھو یہ بڈھا بری نظر سے گھور رہا ہے۔ اب وہ بزرگ کانپتے لرزتے یقین دلانا چاہتے ہیں کہ بوڑھی آنکھوں میں بری نظر کی سکت ہی نہیں ہوتی اور یہ کہ وہ عینک کے شیشوں میں اپنی صورت کے ساتھ ساتھ جنت کی اس حور کی جھلک دیکھ رہے تھے جو بہت جلد ان کے تصرف میں آنے والی ہے لیکن ان کے بیان کو کسی نے بھی قبول نہیں کیا اور یہ فیصلہ سنا دیا گیا کہ بڑے میاں کا جسم تو بوڑھا ہو گیا "دل ابھی تک جوان ہے"۔ بوڑھے جسم میں جوان دل کہاں؟ جسم بوڑھا تو دل بھی بوڑھا" البتہ جوانی کی یاد میں کبھی کوئی دھڑکن چنچل مچھلی کی طرح اچھل جاتی ہے اور پھر وہی بڑھاپے کا گندہ ٹھہرا ہوا پانی۔ اب اس اتفاق غیر محسوس، خیالی جوان مردی کو بھی مورد الزام ٹھہرایا جائے تو مایوس و مجبور معذور رہنے اور مرنے! جوان ہونے کے جتن نہ کریں تو کیا کریں۔ خود میں بھی اس بارے میں سنجیدگی سے غور کر رہا ہوں۔

ہوا یہ کہ میں ایک دن گھریلو فضا کی گھٹن سے گھبرا کر پھاٹک کے سامنے کرسی ڈال کر بیٹھ گیا۔ بھینسوں، بکریوں اور کتوں کو ذہنی اذیتوں سے محفوظ خوش و خرم دنیاداری کرتے دیکھ کر یک گونہ سکون مجھے حاصل ہو رہا تھا کہ ...... ایک لڑکی اپنے چھوٹے بھائی کو گھسیٹتی ہوئی میرے پاس پہنچ کر رک گئی۔ غصے سے اپنے دیدے پھاڑتی اس نے انگلی سے میری طرف اشارہ کیا اور چلّائی "اب سیدھی طرح اسکول چل ورنہ ...... دیکھ ..... یہ بڈھا تجھے پکڑ لے گا" ...... یہ بڈھا ...... یہ ..... میں بڈھا ...... میں پوری طاقت سے کھنکارا تھا اور وہ ہونکا پچکارتا، اڑیل بچہ ...... سہم کر یوں چپ ہو گیا جیسے میری کھنکار نے اس کے سارے آنسو قبض کر لیے۔ میرا سر کرسی سے اچھلا جیسے تلوار سے قلم ہو گیا ہو اور میں اپنے بغیر سر کے دھڑ کو گھسیٹتا ہوا گھر کے اندر چلا گیا۔ بستر پر گر کر میں نے وہ سارے آنسو جذب کر دیے جو اس نٹ کھٹ بچے نے روک لیے تھے۔ یہ مقام فضیلت مبارک ہو ...
... میں بڑبڑانے لگا ...... اب تجھے رونے والے ضدی بچوں کو ڈرانے کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے ...... مبارک ہو۔

"کس سے باتیں کر رہے ہیں جی آپ؟" بیگم نے پوچھا۔ میں نے جواب دیا ...... "تمہارے کان بجنے لگے ہیں۔ یہاں کون ہے جس سے میں باتیں کروں گا؟"

بیگم سرہانے آ بیٹھیں اور بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے شفقت آمیز لہجہ میں کہنے لگیں ...... میں شرمندہ ہوں جی۔ ان نواسوں، نواسیوں، پوتروں پوتریوں کو سنبھالتے سنبھالتے میں آپ میرے ذہن سے بالکل اتر جاتے ہیں ..... اور آپ اپنے سر کے بالوں پر استرا پھروا لیجیے، بہت سفید ہو گئے ہیں ..... میری بچپن کی ایک سہیلی نے آپ کو دیکھا تو مجھ سے پوچھا 'یہ تمہارے مرحوم خسر ہیں نا؟' سن رہے ہیں نا آپ ..... میں سب کچھ سن رہا تھا ...... لیکن میں رو رہا تھا ..... اور خشک آنسو رونے والا جواب دینے کی کوشش کرے تو چیخنے لگتا ہے۔ اس لیے میں دبکی مار گیا ..... جیسے سو گیا ....

دوسرے دن بیگم نے مجھے علی الصبح جگا دیا۔ کہنے لگیں اب آپ روز چہل قدمی کے لیے جایا کیجیے۔ میں نے سنا ہے ریس کورس کی طرف آپ کے جیسے کئی وظیفہ یاب بوڑھے چھڑیاں گھماتے ..... چہل قدمی کے لیے آتے ہیں ..... ان کی سنگت میں آپ کا وقت بھی دلچسپ گزرے گا اور صحت بھی اچھی ہو جائے گی اور ہو سکتا ہے یہ نکما بڑھاپا بھی دور ہو جائے۔ میں نے بیگم کی بات مان لی کیوں کہ اس طرح ان سے چند گھنٹے تو چھٹکارا میسر آ سکتا تھا۔ ایک دن میں چہل قدمی کے لیے نکلنے ہی والا تھا کہ بیگم نے رک جانے کو کہا ..... "دیکھیے ادھر بچوں کے لیے پتلا پانی دودھ ملتا ہے۔ وہاں مارکٹ کے پاس جو دودھ والا ہے وہ اچھا دودھ دیتا ہے۔ آپ یہ دودھ کی کیتلی اپنے ساتھ لیتے جائیں۔" میں حیرت سے بیگم کو گھورنے لگا تو انھوں نے سمجھایا ..... "اس میں مشکل ہی کیا ہے؟ جاتے جاتے کیتلی دودھ والے کو دیتے گئے اور آتے آتے دودھ بھری کیتلی لیتے آ گئے۔" بچوں کے خیال سے میں اس مشورہ پر کاربند ہو گیا۔ چند دن بعد بیگم نے کہا ..... "اب آپ تھیلی بھی ساتھ لے جایا کیجیے۔ اس طرح اصل پوٹے گوشت بھی آیا کرے گا۔" اس مشورے میں اپنے ذائقہ کا سامان تھا، اس لیے کیتلی کے ساتھ تھیلی بھی میرے ہاتھ میں آ گئی ..... اور دونوں ہاتھوں اور پاؤں سے میری چہل قدمی جاری ہو گئی۔ ایک بار ایسا ہوا کہ ایک ہاتھ

میں کہیں انڈے دوسرے میں گوشت۔ کی تھیلی لیے گھر لوٹ رہا تھا کہ میرے ایک بہی خواہ سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ اس نے میری یہ درگت دیکھی تو خبردار کیا کہ تھیلی اور کیبن کی سنگی ملازمت سے ہاتھ دھو ڈالو۔۔۔۔ ورنہ ۔۔۔ دیکھو۔۔۔۔ اِدھر بھی آٹے کی چکی بھی ہے ۔۔۔۔۔۔ لکڑیوں کی ٹال بھی ۔۔۔۔۔ بات میری سمجھ میں آ گئی اور میں نے بیگم سے ... دیا۔ اب میری چہل قدمی ختم ہوتی ہے کیوں کہ جس سڑک پر یہ چہل قدمی ہو رہی ہے۔ اس پر میرے ایک تیز قدم ہمقدم کو ہارٹ اٹیک ہو گیا اور اس واردات کی بنا پر اس سڑک کا نام ہی "دل بند روڈ" مشہور ہو گیا ہے۔

بوڑھے شوہر جن کی زندگی کا بیمہ نہیں ہوتا بہت احتیاط سے رہتے جاتے ہیں۔ ان کی بیماریوں کے مبہم اشارے بھی دور اندیش بیویوں کے حواس باختہ کر دیتے ہیں۔ میں چہل قدمی کو موقوف کر کے گھر بیٹھ رہا تو بیگم نے حکیم صاحب کو بلوا لیا۔

حکیم صاحب: آپ کیا بچپن سے بوڑھے ہیں؟

میں: جی نہیں۔ بچپن میں تو میں بچہ ہی تھا۔

حکیم صاحب: تو کیا جوانی میں بوڑھے ہوئے۔؟

میں: جی نہیں، جوانی میں تو بیگم صاحبہ لاتی ہوئیں۔

حکیم صاحب: تو گویا بڑھاپے سے آپ بوڑھے ہوئے ہیں

میں: جی۔۔۔۔۔۔ وہ تو ٹھیک ہے لیکن طب نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ بڑھاپا؟ بڑھاپے میں کہاں رہے۔؟

حکیم صاحب کچھ دیر سوچتے رہے۔ اس کے بعد پوچھ بیٹھے۔ "آپ علاج پر کتنا خرچ کر سکتے ہیں"

"میں نے جواب دیا ــــ اگر میرا بڑھاپا دور ہو گیا۔ میرے بال کالے ہو گئے تو میں گریجویٹی کی پوری رقم آپ کی نذر کر دوں گا۔۔۔۔۔" کہنے لگے: "میاں ــــ قلع قمع کے معنی ہی ہیں۔ بڑھاپا دفع۔۔۔۔ اور رہا بالوں کا کالا ہونا تو صرف اتنا کہوں گا کہ اگر میری دوا کسی سفید مرغ کو چالیس دن کھلائی جائے تو اکتالیسویں دن۔۔۔۔۔۔ ایک کالا کتا آپ کے سامنے حاضر ہو کر بانگ دینے لگے گا" میں اور ایک سفید مرغ۔۔۔۔۔ ہم دونوں ایک ساتھ حکیم صاحب کی گولیاں کھانے لگے۔

اس اثنا میں خبر ملی کہ میری ایک عزیزہ کبریٰ بیگم جو چالیس برس پہلے کراچی چلی گئی تھیں اب بیوہ اور اکیلی واپس آ گئی ہیں۔ یہ کبریٰ بیگم وہی تھیں جن سے میری شروع شروع کی جوانی نے پہلی پہلی محبت کی تھی اور ہو سکتا تھا کہ ہماری شادی بھی ہو جاتی لیکن میری بدقسمتی کہ محبت بھی ہوئی تو بخیل باپ کی بیٹی سے۔۔۔۔۔ اور آپ جانتے ہیں۔۔۔۔۔ پہلی محبت اندھیرا۔ دوسری محبت ٹھوکر اور تیسری محبت گڑھا ــــ میں اندھیرے میں ٹٹولتا رہ گیا۔ اور ایک پردیسی نے دو طرفہ شادی کا انتظام کر کے میری کبریٰ بیگم کا اغوا کر لیا۔ کبریٰ بیگم اب شاید میرے اغوا کے لیے آئی تھیں۔ کیوں کہ رات کے ۱۰ بجے چائے پینے کے لیے بلایا گیا تھا۔ میں نے سوچا ایسی دعوت کو ٹال جاؤں کیوں کہ حکیم صاحب کے علاج کو صرف ۳۰ دن ہوئے تھے اور تکمیل کے لیے ابھی ۱۰ دن باقی تھے

لیکن پھر ایک ترکیب ذہن میں آئی کہ ۱۰ گولیوں کی ایک گولی بنالی جائے اور کبریٰ بیگم کے ساتھ چائے پی ہی لی جائے۔ مثل مشہور ہے وقت مرد کی کمر توڑ ڈالتا ہے لیکن عورت کی صرف چوڑیاں توڑ سکتا ہے۔ کبریٰ بیگم دلہن تو نہ رہیں لیکن بیوہ بھی نظر نہ آئیں اور ایک خاص تبدیلی جو میں نے نوٹ کی وہ یہ تھی کہ جن آنکھوں سے بات بے بات آنسو ڈھلک پڑتے تھے اب وہاں ایک ابر سا چھایا رہنے لگا تھا۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد کبریٰ بیگم نے پوچھا "یاد ہے ...... مولسری کے پاس کا وہ ویران کمرہ ...... آپ ایک رات وہاں مجھے شیطان دکھانے لے گئے تھے ...... یاد ہے" میرا حلق سوکھنے لگا۔ "یاد ہے ......" کبریٰ بیگم کو پھر کچھ یاد آیا ......

"آپ مجھے کبو تو کہا کرتے تھے ...... اور میں آپ کو اتو" میں نے حسرت سے کبریٰ بیگم کی طرف دیکھا ...... اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ ان کی آنکھوں کا ابر ...... جھکتا جھکتا ...... میری طرف بڑھ رہا تھا ...... میں اس وقت گولی کا خیال آیا اور ایک جھٹکے سے میں نے اپنا منہ پھیر لیا۔ گولی کو منہ میں ڈال کر نگلنا چاہا تو ...... وہ کھسکی کھسکی حلق کے ابتدائی حصے تک گئی لیکن اندر سے نہ جانے کون سا دباؤ کارفرما ہوا کہ اچھل کر پھر منہ میں آگئی۔ زور لگا کر میں نے گولی کو حلق کی سمت دھکیلا اور دونوں ہاتھوں سے اپنا حلق پکڑ لیا۔ کبریٰ بیگم نے تشویش ناک لہجہ میں پوچھا "یہ آپ کو کیا ہو رہا ہے؟" میں چپ رہا۔ لیکن کہنا چاہتا تھا "کبو میرے منہ میں انٹرکان ٹی نینٹل گولی بال، ٹورنمنٹ منعقد ہو رہا ہے ...... مجھے گولی نگل جانے دے ...... پھر دیکھ کیا ہوتا ہے؟"

اچانک پیٹ کے پاتال سے ایک سائیکلونی ٹھسکا ابھرا۔ اس کو روکنے کی جان توڑ کوشش جو میں نے کی تو ...... غٹ سے ...... گولی حلق سے نیچے —— گولی کا حلق سے نیچے جانا تھا کہ ٹھسکے مخالف سمت اختیار کر گیا۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا پیٹ پکڑ لیا ...... اور تڑپ کر اٹھا تو بچہ بردار کنگرو کی طرح زقندیں بھرتا ...... یہ جا ...... کبریٰ بیگم کا دروازہ ...... وہ جا ...... اپنا باتھ روم ...... باہر سے بیگم نے حکم سنایا۔ اب اس حکیم کی دوا بند کر دیجیے۔ فائدہ وائدہ کچھ بھی نہیں الٹا پیچش لگ گئی۔ اس کے بعد ایک شادی میں کبریٰ بیگم سے دوبارہ ملاقات ہوئی۔ میں دلہن سے ایجاب و قبول کے لیے زنانہ میں گیا تو کیا دیکھتا ہوں کبریٰ بیگم دلہن پر سایہ کیے کھڑی ہیں۔ میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا "خیریت؟" اور ان کی طنز بھری مسکراہٹ نے جواب دیا ...... "میری خیریت پر مٹی ڈالو ...... تمہارا ٹھسکہ کیسا ہے بولو؟"

حکیم صاحب اپنی دوا کے اثرات کی تفتیش کے لیے آئے تو میں نے وہ اونگھتا سفید مرغ ان کے حوالے کر دیا۔ اور سارے علاجوں سے تائب ہو گیا۔ کیوں کہ یہ حقیقت اب مجھ پر دن سے نکلے سورج کی طرح روشن ہو گئی تھی کہ جو آدمی دوبارہ جوان بننا چاہتا ہے وہ بوڑھا بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔

رشید قریشی

ہم چلے وظیفہ لینے

پھاٹک سے باہر نکلے ہی تھے کہ بیوی نے آواز دی۔

"دیکھئے آج کے اخبار میں خبر ہے ایک ضعیف شخص نے چلتی بس میں سوار ہونے کی کوشش کی اور بس کے نیچے کچلا گیا۔ آپ کو خدا کا واسطہ، بس سے نہ جائیے۔ رکشا یا آٹو رکشا لے لیجئے" "کیا غضب ہے وظیفہ یاب کیا ہوئے ہم کہ اچانک ضعیف بھی ہوگئے اور دنیا بھر کے ضعیفوں کی موت ہم پر وارد ہونے لگی" ہم نے ایک شریر مسکراہٹ بیوی کی طرف پھینکی اور سینہ تانے دندناتے چل پڑے۔ چلتی ہوئی یا دوڑتی ہوئی بس میں سوار ہونے۔ لیکن بازو سے ایک خالی رکشا گذرا تو ہم نے اسے روک لیا۔ رکشا والے نے پوچھا "کہاں جانا ہے؟" ہم نے جواب دیا "موتی گلی" ـــــ رکشا والے نے کچھ اکڑ کر تصحیح کی "پنشن گلی" ہم نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ رکشا والے نے مستحکم لہجے میں کہا "کرایہ ۲ روپے ہوگا" ہمیں یاد ہے۔ ہم اکثر کرایہ چکائے بغیر رکشا میں بیٹھ جاتے تھے اور منہ مانگا کرایہ دے دیا کرتے تھے۔ اُس وقت جب ہم برسرِ خدمت تھے اب تو وظیفہ یاب گھوڑے سے گرے ہوئے سوار۔ اب ایسی سخاوتوں کی استطاعت کہاں؟ اب تو بچت ہی آمدنی ٹھہرے۔ ہم نے اپنی خفت کو چھپاتے ہوئے کہا "رکشا والے بھائی پنشن گلی تو یہیں ہے۔ تم دو روپے مانگ رہے ہو" رکشا والے نے پیڈل پر زور ڈالا۔ "یہیں ہے تو پیدل چلے جائیے رکشا کو کیوں تکلیف دیتے ہیں آپ۔" ہم نے لجاجت آمیز لہجہ میں کہا "کچھ کمی نہیں کروگے بھائی" اس نے ترحمانہ نظر سے ہمارا جائزہ لیا۔ اور کہنے لگا "آپ پنشن والے بے چارے ہیں اسلئے آپ سے ڈیڑھ روپیہ لوں گا" ہم نے اس رعایت کو غنیمت سمجھا اور رکشا میں سوار ہوگئے۔

مچھلی کمان کے پاس بھیڑ کی وجہ سے رکشا رک گیا تو وقت گزاری کے لئے رکشا والے نے پوچھا "آپ چونی کے ہیں، یا اٹھنی کے؟" رکشا والے کا سوال ہماری سمجھ میں نہیں آیا، ایک ناگوار پہلو جو کچھ روشن ہوا، ہم طیش میں آگئے "کیوں جی کیا مطلب ہے تمہارا؟" رکشا والا ہنسنے لگا "غصہ کی بات نہیں ہے صاحب۔ میں پوچھ رہا تھا آپ پچیس سال کی ملازمت کے بعد ہٹے ہیں یا پچاس سال کی عمر کو پہنچ کر۔ چونی پچیس، اٹھنی پچاس! ہے نا ٹھیک؟" ہم اپنی بدگمانی پر پشیمان ہوئے لیکن یہ احساس کچھ زیادہ دیر نہ رہا۔ ہم نے ہنسی پر قابو پاتے ہوئے کہا "یہ اچھی اصطلاح تم نے ایجاد کرلی ہے۔ لیکن پچپن والوں کے لئے بھی کوئی اصطلاح سوچ نکالو۔ آپ پچپن کے ہیں؟" وہ حیرت سے ہمیں گھورنے لگا۔ ہماری دھڑکنیں دھڑکتے دھڑکتے ناچ اٹھیں تامل ہو نا پڑا کہ مردم شناس رکشا والوں میں بھی نکل آتے ہیں۔ "آپ تو چالیس کے بھی نظر نہیں آتے" رکشا والے کا حقیقت

بنیاد تبصرہ تھا اور ہم دل ہی دل میں اسں سے فرمائش کر رہے تھے۔ پھر بول، پھر بول !!

"کیوں صاحب آپ چپ ہو گئے" ہم نے کہا "بھائی قصّہ یہ ہوا کہ ہم بچپن میں بہت شریر تھے اسلئے گھر والوں نے اسکول بھیجا۔ ہمارے ناعاقبت اندیش ماسٹر صاحب نے ہماری جسامت کا لحاظ کر کے ہماری عمر پانچ سال بڑھا کر درج کر دی اور ہم پچاس کی عمر میں پچپن کے قرار پائے" رکشا والے نے ہم پر ہمدردانہ نظر ڈالی اور رکشا چلانے لگا۔

موتی گلی میں داخل ہوئے تو بلدیہ کے پیشاب خانہ کی خوشبو نے خیر مقدم کیا۔ ہم نے سوچا یہ گلی نہ موتی گلی نہ پنشن گلی، یہ تو "لوٹھر گلی"[1] ہے۔ پنشن کے دفتر میں داخل ہوئے تو حشر کا سا منظر سامنے تھا، ہر شخص پریشان اور اس دھن میں دیوانہ کہ جلد سے جلد وظیفہ لے اور بھاگ کھڑا ہو، لوگ کسی کی تدفین کے بعد، قبرستان سے جس طرح کھسک جاتے ہیں۔ اچانک ہماری نظر ایک خار رسیدہ شخص پر پڑی۔ دراز زلفیں حنا آلود داڑھی، سرمگیں آنکھیں، ہم نے غور سے دیکھا تو پہچان گئے۔ وہ نورالدین تھا، آبکاری کا شہرۂ آفاق انسپکٹر۔ ہم شرمندہ تھے کہ ہم نے اُسے مرحوم سمجھ لیا تھا۔ اُس نے بھی ہمیں پہچان لیا اور لپٹ گیا" اچھا ہوا بھئی تم بھی آ گئے" ہم نے بھی جواباً خوشی کا اظہار کیا تو پوچھا گیا "کہیں اور ملازمت ڈھونڈلی ہے ؟" ہم نے بُرا مانتے ہوئے کہا "ملازمت، ملازمت، کیا زندگی ملازمت ہی کے لئے ہے۔ کوئی دوسرا اس کا مصرف نہیں" ہنستے ہوئے کہنے لگا "جس کی ابتداء ملازمت اُس کی انتہا ملازمت !" ہم نے بحث کو ختم کرنے کے خیال سے کہا "اچھا بھئی کوئی ملازمت راستے میں پڑی ملے تو اسے اٹھا لیں گے" پوچھا گیا "اب وقت کس طرح گذارتے ہو۔" ہم نے بے دلی سے کہا "بس گذر جاتا ہے" رازدارانہ انداز میں مشورہ دیا گیا "عقد ثانی کر لو" ہم نے بے بسی کے لہجہ میں کہا "اور عقد اول کو کیا کروں ؟" وہ ہمیں چھوڑ کر مجمع میں گم ہو گیا۔ عقد ثانی کا ذکر۔ اور یک لخت کی بھٹی سے ایک پری وش کی خراماں خراماں آمد، اور قیامت یہ کہ ہمیں دیکھ کر پہچاننے اور مسکرانے والی ! یہ ہمارے بچوں کے بچوں کے اسکول کی ہیڈ مسٹریس تھیں "ہلو مسز کٹورا ! آپ بھی یہاں ؟" جھینپ مٹانے کو بیاگ کھول کر کچھ ٹٹولنے لگیں "یہ دفتر والوں کے مظالم اب تو ناقابل برداشت ہو گئے ہیں۔ کل میری چالیسویں سالگرہ ہے اور دیکھئے انھوں نے مجھے ریٹائر کر دیا۔ لیکن میں یہاں سے عدالت جاؤں گی۔ کل شام آپ ضرور میرے ساتھ چائے پیجئے"۔ میں نے خوش دلی سے کہا "سالگرہ مبارک" اور دبی زبان میں وظیفہ کی بھی مبارکباد دے ڈالی۔ پچپن برس کا سن تر لاکھوں برس رہے۔

یہ کون ہے ؟ یہ کون ہے ؟

" ہلو سالومن، کیسے ہو ... . اپنے ہم جماعت کو پہچانا ؟"

سالومن چونک گیا ... . "اچھا ہوں، بہت اچھا ہوں" ہم نے سوال کیا "تم کب وظیفہ پر علٰحدہ ہوئے"۔ غمزدہ سالومن نے جواب دیا .... چار سال پہلے .... میرے ساتھ بڑی ناانصافی ہوئی ہے۔ میرے بڑے بھائی ابھی تک برسر خدمت ہیں لیکن مجھے ہٹا دیا گیا" ہم نے تسلّی دی۔ "سالومن، ملازمت کی عمر رشتوں کی پابند نہیں ہوتی۔ ہر شخص اپنی عمر کا انفرادی طور پر مالک ہوتا ہے۔ صبر کرو۔ سنو جو وقت سے پہلے ملازمت سے ہٹتا ہے اس کی عمر میں اضافہ ہوتا ہے" سالومن گیا تو شیخ شریف سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ اس کے بارے میں دفتر میں مشہور تھا کہ صرف اس کا نام شریف ہے۔ شیخ شریف نے ہمارا ہاتھ تھام لیا، آبدیدہ ہو گیا "تم بھی یہاں ؟ .... تم کیوں یہاں ؟" ہم نے کہا "اس منزل سے اور اس کے بعد کی منزل سے کس کو مفر ہے" ایک ٹھنڈی

---

1. لوٹھر گلی، نرمیندر لوتھر، اس وقت کے اسپیشل آفیسر بلدیہ۔

آٹھ بھر کر کہنے لگا۔ تین بچوں کی شادی کر چکا۔ تین بچوں کو گریجویٹ بنا چکا لیکن کوئی بچہ روزگار سے نہیں لگا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے ..... میں ہی روزگار سے لگا ہوا ہوں۔ تینوں بچے وظیفہ پر گھر بیٹھ گئے ہیں۔" ہم نے پوچھا "وقت کس طرح کاٹتے ہو" کہنے لگا "سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے۔ ہم ۱۰ تا ۵ دفتر میں رہنے والے اب یہ سارا وقت گھر کی نذر کرتے ہیں تو گھر والے ہمیں برداشت نہیں کر پاتے۔" ہم نے پوچھا "تو پھر کیا کرتے ہو؟ جواب ملا "بیمار دوستوں کی مزاج پرسیاں" مرنے والوں کی تجہیز و تکفین میں شرکت اور رشتے جوڑنا" ہم نے کہا "تم تو بڑے ٹھاٹ سے وظیفہ کے دن گزار رہے ہو" "ٹھاٹ کہاں بھائی۔ بیوی کو شکایت ہی رہتی ہے کہ اب بیکار وظیفہ کیوں لیا ہم نے۔ شادی کے بعد ہی وظیفہ لے کر گھر میں گھسے رہتے تو اچھا ہوتا؟" اتنے میں دو تین آدمی رکشا میں سے ایک ڈھانچہ کو اتار لائے۔ دفتر کا ایک شخص تصدیقِ حیات کے لئے آ گیا ..... جھریاں' ہڈیوں سے لپٹی ہوئیں ..... دھنسی ہوئی بے نور آنکھیں! گالوں کے اندر اتنے گہرے گڑھے جیسے منہ کے اندر دونوں ایک دوسرے سے مل گئے ہوں۔ اہلکار صاحب نے شناخت کے لئے ان کی تصویر دیکھی' دائیں آنکھ کے نیچے مسّہ کا نشان اور وہ مطمئن ہو گئے چہرہ کا پورا دائیں حصہ سیاہ ہو چکا تھا' وظیفہ یاب نے جھرجھری لی ..... زندگی تسلیم کر لی گئی۔ وظیفہ جاری ہو گیا۔ ہم حیران کھڑے رہ گئے۔ آندھی کا نام بھی زندگی اور ایک مضمحل سانس کا نام بھی زندگی۔ زندگی زندہ باد! ہم تھک کر ایک بنچ پر بیٹھ گئے۔ بازو والے صاحب مخاطب ہوئے۔ "جنابِ عالی! آپ کی رنگت غیر معمولی زرد نظر آ رہی ہے۔ یہ استسقاقِ جگر کی علامت ہے مجھے خدمت کا موقع دیجئے۔ انشاء اللہ آئندہ ماہ جب آپ وظیفہ لینے آئیں گے کوئی آپ کو پہچان نہ سکے گا" ہم نے کہا "محترم آپ کی تشخیص کا شکریہ لیکن ابھی ہم نے وظیفہ نہیں اٹھایا ہے" اتنے میں دفتر کی ملازمہ شادی بی ایک شانِ بے نیازی کے ساتھ ہمارے قریب پہنچ کر رک گئی۔ شادی بی کبھی شادی بی رہی ہو گی ـــ اب تو ببول کے درخت میں پھنسی ہوئی پتنگ کی طرح تار تار تھی۔ اس جلتر نے مژدہ سنایا۔ امام النساء بیگم صاحبہ نے آپ کو بلایا ہے۔ ہم نے اپنے حافظہ پر زور ڈالا۔ کہیں بھی امام النساء بیگم نمودار نہیں ہوئیں۔ پھر ہم نے سوچا شاید ہماری بیوی کی کوئی سہیلی ہوں گی اور اٹھ کر زنانہ حصّہ میں پہنچ گئے ـــــ شادی بی نے ہماری آمد کی اطلاع دے دی اور اسکرین کے پیچھے سے ایک دبیز حنا آلود ہاتھ ہماری طرف بڑھا۔ گلوری لیا ہوا۔ ہاتھ کو جھٹکا ہوا تو ہم نے گلوری لے لی۔ سرگوشی کے انداز میں پوچھا گیا "آپ نے اپنے کسی دوست سے اپنے عقد کی بات تو نہیں کہی؟ آج کل دوست ہی سب سے بڑا دشمن ہوتا ہے عقد ..... ہم لرز کر رہ گئے۔ وہ سرگوشی جاری رہی۔ "اگر یہ بات کسی کو معلوم ہو گئی تو میرا وظیفہ بند سمجھئے ـــ" شادی بی ایک اور صاحب کو لے آئی۔ ہماری طرف جھپٹتے ہوئے ڈانٹنے لگی کہ ہم خواہ مخواہ بنچ پر بیٹھ گئے۔ ہم نے معصومیت جتائی تو کہا گیا کہ امام النساء بیگم صاحبہ نے محمد نصیر الدین احمد بھائی کو بلایا تھا لیکن وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر کہیں گئے اور ہم ان کی جگہ بیٹھ گئے۔ شادی بی اس اٹھک بیٹھک سے لاعلم تھی۔ اس لئے اصل شخص کی جگہ ہم زنانہ حصہ میں پہنچ گئے۔ کڑوی گلوری کو تھوکتے ہوئے وہاں سے نکل گئے اور باہر کھلی فضا میں آ گئے۔ صحن میں دیوار سے لگا ہوا ایک شخص سانس کی ورزش کر رہا تھا۔ وہ تھا عبدالقوی وظیفہ یاب فزیکل انسٹرکٹر۔ وہ دوڑتا ہوا ہم تک پہنچا اور اس طاقت سے دونوں ہاتھ ہمارے شانوں پر اتار گیا جیسے ہمارا قد چھوٹا کرنا چاہتا ہو "ارے تم یہاں کیوں شاعر صاحب؟ بنک والوں کو مختار کر دو اور ان ہی سے وظیفہ لے لیا کرو یہ بوڑھوں اور بیماروں کا دفتر ہے۔ یہاں زندگی کا قدر دان کوئی نہیں۔ سب سالا جوان رہنے کے آرزومند' سب تا حیات برسرِ خدمت رہنے کے خواہاں۔ ارے ملازمت تو اس سانس کی طرح ہے جو سینہ میں رک جائے۔ کتنا ہی کوشش کی جائے یہ مقررہ وقت پر

اپنے آپ سینے سے باہر نکل جائے گی۔ لیکن یہاں ایک وظیفہ یاب ملیں گے جو اپنے آپ کو "بیوہ" سمجھتے ہیں۔ دوسرے ایک صاحب ہیں جو خودکشی کے منصوبے باندھتے رہتے ہیں۔

تیسرے ایک وظیفہ یاب ہیں جو دو دفعہ سرکاری اداروں میں جز وقتی طور پر کار گزار ہیں۔ ملازمت کی تنخواہ سے دگنی آمدنی ہو گئی ہے لیکن ان کو بھی سرکاری ملازمت چھٹنے کا دکھ ہے۔ کہتے ہیں تلوار چاہے کاٹھ ہی کا ہو، تلوار ہی ہوتا ہے اور ایک وظیفہ یاب ہیں جن کو یہ فکر مارے ڈالتی ہے کہ دفتر کو وہ اپنے ایک خاص ڈھب سے چلاتے تھے اور اب وہ نہیں ہیں تو دفتر کا جانے کیا حشر ہو؟ یہ سب سرکاری ملازم ہیں انسان کوئی بھی نہیں۔" ہم نے کہا "ایسا نہ کہو، یہاں وہ انسان نظر آتے ہیں جو اپنے پوشیدہ اور غیر مستعملہ اوصاف کو اجاگر کرنا چاہتے ہیں۔ ندامتوں کے ساتھ۔ اس فضول خرچ کی طرح جو اپنی بچی کھچی پونجی کو سود مند طور پر صرف کرنا چاہتا ہے دیکھنے والے ان کا ظاہر دیکھتے ہیں۔ ان کے باطن میں کوئی جھانکتا نہیں۔ دیکھئے ایک اسی وظیفہ یاب کو دیکھئے جب دفتر کی کرسی پر تھا۔ سلاموں کے جواب میں صرف انگلی اٹھاتا تھا۔ اب دونوں ہاتھوں سے سلام کرتا ہے۔ سر جھکاتا ہے۔ مسکراتا ہے۔ منہ کھولتا ہے یہ دکھانے کے لئے کہ اب زہر کے سارے دانت گر گئے ہیں۔

عبدالقوی فزیکل انسٹرکٹر سیٹی بجاتا ہوا، پنشن پےمنٹ انچارج کے کمرہ میں گھس گیا اور ہم اپنی باری کا انتظار کرنے لگے۔ پکارا گیا "کرامت علی" اور ہم نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھا کرامت علی وظیفہ کی رقم لینے کے لئے آگے بڑھا۔ چار سال پہلے ہم نے کرامت علی کو سپردِ خاک کیا تھا۔ اس کے ایک بھائی جو قبر میں اترے تھے۔ کرامت علی بنکر آرہے تھے۔ ہم جذبے لہجہ میں پکار اٹھے "ارے کرامت تو یہاں؟" کرامت کے بھائی سٹپٹا گئے اور پلک جھپکاتے بھوت کی طرح غائب ہو گئے۔ کرامت علی کا کچھ اور انتظار کیا گیا اور پھر پکارا گیا "محمود حسین!" ہم سے نہ رہا گیا "جناب یہ جو محمود حسین آپ پکار رہے ہیں ڈپٹی سکریٹری وظیفہ پر ہٹے ہیں۔ کچھ ہی دن پہلے آپ کے جیسے کلرک صاحب صاحب پکارتے ہوئے اس کے پیچھے پھرتے تھے۔ آج آپ اسے محمود حسین پکار رہے ہیں؟"

کلرک کا منہ ٹیڑھا ہو گیا، پیشانی پر بل پڑ گئے ــــ "اب صاحب، قبلہ، حضور پکارتا ہوں تو وظیفہ کی تقسیم مکمل ہوتے رات ہو جائے۔" ہم نے ادباً عرض کیا "وقت ہی بچانا ہے تو محمود حسین بھی کیوں پکارتے ہیں آپ 'محمود' ہی پکار لیجئے" کلرک ناراض ہو کر اٹھ گیا تو چند صلح پسند وظیفہ یابوں نے اسے پھر سے کرسی پر بٹھا دیا۔ خود محمود حسین نے ان سے ہماری طرف سے معذرت چاہی تو وظائف کی تقسیم پھر شروع ہوئی۔ ہماری باری آئی تو ہمارا نام تو زور سے پکارا گیا لیکن صاحب اس طرح کہا گیا جیسے دانت میں پھنسے گوشت کے ٹکڑے کو تھوک دیا ــــ

ہم وظیفہ کی رقم لیکر گھر پہنچے اور نوٹوں کا لفافہ بیوی کے ہاتھ میں تھما دیا "کون کہتا ہے وظیفہ یاب ہیں۔ دیکھو آج پہلی تاریخ ہے اور یہ وظیفہ نہیں۔ تنخواہ ہے تنخواہ!"

اگرچہ کہ ملازمت کی پہلی تاریخ کا سنگھار اور سواگت نہیں تھا لیکن بیوی نے خوشی کے اظہار میں بخالت نہیں برتی۔ وظیفہ کی رقم گننے کے بعد ڈوبتے لہجہ میں کہہ اٹھیں "یہ تو آج ہی ختم ہو جائے گی"۔

بیوی سچ کہہ رہی تھی تنخواہ مہینے کو سنبھالتی ہے اور وظیفہ صرف پہلی تاریخ کو۔ لیکن ہم نے ہماری سمجھدار بیوی کو سمجھا دیا ہے۔ اپنے شوہر کو وظیفہ یاب نہ سمجھو وہ، ایک ایسا نوجوان ہے جس نے (۸۰۰) روپئے ماہانہ تنخواہ پر اپنی ملازمت کا آغاز کیا ہے۔

••

رشید قریشی

مرزا فرحت اللہ بیگ

بمقابلہ

حکومت حیدرآباد

مرزا فرحت اللہ بیگ۔ اردو کے صاحبِ طرز جدت پسند اور خیال آفریں مزاح نگار تھے۔ ان کا ذوقِ مزاح ایک ایسا سرچشمہ تھا جس کو ان کی طبیعت کی جولانی ہر وقت لہروں سے آباد رکھتی تھی۔ سنہ ۱۹۳۶ء میں وہ سشن جج گلبرگہ تھے۔ ایڈیٹر نظام گزٹ (ہفتہ وار) کے اصرار پر انھوں نے "سفر زیرِ دفعہ ۱۸۰ ضابطۂ ملازمت" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا، یہ مضمون متذکرہ ہفتہ وار کی ۲ رتیر سنہ ۴۵ ف (مطابق ۲۵ رمئی ۱۹۳۶ء) کی اشاعت میں شائع ہوا۔

خدا بخشے سابق حکومت حیدرآباد اپنے ملازمین کے تعلق سے جہاں روادارانہ فیاض تھی وہیں ملازمین کی طرف سے تنقید یا تضحیک کے معاملے میں بہت حساس اور سخت گیر بھی تھی۔ ضابطۂ ملازمت کے دفعہ ۱۸۰ کے تحت ہر ملازم سرکار کو حج و زیارت کے لیے چھ ماہ کی رخصتِ خاص بہ عطائے سالم ماہوار پیشگی دی جا سکتی تھی۔ اس زمانے کے سفر کی دشواریوں اور وسائلِ سفر کی سست رفتاریوں کے پیشِ نظر یہ مدت مناسب اور ضروری تھی اور اس میں رقمی زادِ راہ کی کافی بہم رسانی بھی مضمر تھی لیکن مرزا فرحت اللہ بیگ کی مزاح نگاری کو حالاتِ سفر قلمبند کرنے کی تحریک ہوئی تو اپنے مضمون کی تمہید کے لیے انھوں نے اس دفعہ کو زیبِ داستاں بنانے کے لیے گھسیٹ لیا۔ ظاہر ہے کہ مرزا صاحب کی نیت اس دفعہ کا مضحکہ اڑانے پر مائل نہیں تھی اور اصل یہ بات تھی کہ وہ پوری صاف دلی سے اپنے مضمون کو ایک مناسب آغاز دینے کی خاطر جس کا ان کے سفر سے بھی تعلق تھا، اس دفعہ کو استعمال کرنے پر مجبور سے تھے ؛ خود ان کا طرزِ نگارش کہہ دے گی کہ وہ صرف ایک شگفتہ کیفیت پیدا کرنا چاہتے ہیں جو

اس دفعہ سے منسوب تو ہے لیکن منسلک نہیں۔ یہ اندازِ بیان سنگین اعتقادیت کے نزدیک ہرگز قابلِ معافی نہیں کیوں کہ وہاں مزاح کو مزاح کے رنگ میں نہیں دیکھا جاتا، سنجیدہ احتساب کی گرفت میں موردِ الزام ٹھہرایا جاتا ہے۔ شخصی احساسات اس نشتر کو خود آگے بڑھ کر اپنے اندر پیوست کر لیتے اور سازش کے لیے ایک بظاہر معقول بنیاد بنا لیتے ہیں۔

یہ مضمون سررشتہ معلومات عامہ حکومتِ حیدرآباد کی نظرِ احتساب سے گزرا اور اس کا تراشہ حسبِ ذیل تحریک کے ساتھ معتمد صاحب عدالت و کوتوالی و امورِ عامہ سرکارِ عالی کی خدمت میں روانہ کیا گیا۔

جناب کی توجہ منسلکہ منقطعہ اخبار نظام گزٹ مورخہ ۲۵ مئی ۱۹۳۶ء کی جانب سے منعطف کرائی جاتی ہے۔ اس مضمون میں مولوی مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب سشن جج نے دفعہ ۱۸۰ ملازمینِ سرکار کا مضحکہ اڑایا ہے۔ اصولاً یہ امر کسی ملازم سرکار کے لیے روا نہیں سمجھا جا سکتا کہ وہ بحیثیتِ ملازمت حکومت یا احکام قوانین حکومت کی نسبت تنقیدی مضامین شائع کرے۔ بالخصوص مضمونِ زیرِ بحث میں جو احکام سرکار کی بے وقعتی مترشح ہے۔ وہ قابلِ اعتراض ہے از راہ کرم موصوف کو اس بارے میں تاکید فرما دی جائے تو مناسب ہوگا۔

(مراسلہ سررشتہ معلومات عامہ سرکارِ عالی نشان ۱۲۷۲ واقع ۸-۹ ۱۳۴۵ف مطابق ۱۳ر جون ۳۶ء) یہ مراسلہ راست معتمد عدالت و کوتوالی و امورِ عامہ سرکارِ عالی کے پاس پہنچا، اس وقت نواب ذوالقدر جنگ بہادر اس عہدہ پر فائز تھے انھوں نے مراسلہ کی پشت پر یہ حکم صادر فرمایا:

"میں نے مضمونِ منسلکہ دیکھا نہایت نامناسب اور بازاری طرز کی عبارت ہے، ہائی کورٹ کو خاص طور پر توجہ دلائی جائے کہ ان کی معقول تنبیہہ ہونی چاہیے۔ اس ہدایت کے ساتھ آئندہ اس قسم کے مضامین شائع کرنے سے احتراز کریں۔"

حسب الحکم معتمد صاحب عدالت العالیہ سرکارِ عالی کے نام ہدایت جاری ہوئی۔

"نقل مراسلہ سررشتہ عامہ نشان ۱۲۷۲ واقع ۱۳ر جون سن ۱۹۳۶ء معہ نقل منسلکہ مرسل معہ نقل منسلکہ مرسل و ترقیم ہے کہ ہائی کورٹ کو خاص طور پر توجہ دلائی جاتی ہے کہ اس بارے میں مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب کو اس ہدایت کے ساتھ کہ آئندہ اس قسم کے مضامین کو شائع کرنے سے احتراز کریں، معقول تنبیہہ ہونی چاہیے۔"

حسبِ مسودہ قلمی معتمد صاحب بہادر، مراسلہ کے مسودے پر مددگار معتمد (جناب غلام پنجتن صاحب) نے اس ہدایت کا اضافہ کیا "دو روز انتظار کر کے جواب طلب کیا جائے۔"

مجلسِ عدالت عالیہ سرکارِ عالی نے مراسلہ نشان ۳۵۵ واقع ۹ر شہریور سنہ ۱۳۴۵ف (مطابق ۱۵ر جولائی سنہ ۱۹۳۶ء) معتمد صاحب کوتوالی و امورِ عامہ سرکارِ عالی کو حسبِ ذیل جواب ارسال کیا۔

... (۳۵۵) مورخہ ۹ر شہریور ۴۵ ... گزارش ہے کہ مرزا فرحت اللہ بیگ کو

ہدایت کر دی گئی ہے" عدالت عالیہ کا جواب بغرض حکم پیش کیا گیا تو معتمد صاحب بہادر نے حکم دیا شریک مثل رہے اور مددگار معتمد نے مثل داخلِ دفتر کر وادی اور شاید ایک مزاح نگار کی آزاد خیالی کو بھی دفتر کے محافظ خانے میں محبوس کر دیا گیا۔ ایک ظرافت نگار جو ملازم سرکار تھا مضمون آفرینی کی ایک لہر میں ایک معصوم سی گستاخی کا مرتکب ہوا۔ اس کی یہ شرارت قابلِ معافی تھی بلکہ پیار کے قابل تھی۔ لیکن حکومت حفظِ مراتب کی خشک رعونت میں مزاح کے لطف کو محسوس کرنے سے قاصر تھی۔ اس تنبیہہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ مرزا فرحت اللہ بیگ بہت محتاط ہو گئے اور فکر و خیال کی روایتوں کو بندشوں کا پابند کر دیا۔ حالات اور واقعات کو اپنا موضوع بنانے کے بجائے انھوں نے خالص ادب اور قدیم تاریخ کو اپنی صلاحیتوں کی آماجگاہ بنا لیا اور اس طرح ہمارا مزاحیہ ادب کئی دل چسپ خاکوں اور مسکراتی تحریروں سے محروم ہو گیا۔ ایک دور اپنے پہرہ داروں کی نگرانی میں قید رہا۔ ایک معاشرت اپنے نقابوں میں دفن رہی اور ایک مزاح اور ایک مزاح نگار جرأت اور ہتھیار سے لیس ہونے کے باوجود مصلحت سے سمجھوتہ کر بیٹھا۔ کیوں کہ وہ صرف مزاح نگار ہی نہیں تھا۔ ایک اعلیٰ ذمہ دار عہدہ دار بھی تھا۔ اگر حکومت اس مزاح کو برداشت کرنے کے لیے اعلیٰ ظریف ہو جاتی اور اس ظریفانہ شوخی کو نظر انداز کر جاتی تو اس کے اقتدار پر کوئی حرف نہ آتا لیکن مزاحیہ ادب کچھ اور شگفتہ تحریروں سے آراستہ ہو جاتا۔

مضمون کے آخر میں باقی آئندہ درج ہے، لیکن اس کی نوبت کبھی نہیں آئی۔ مضمون کی لطافت اور ظرافت کے تعلق سے دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ البتہ انداز بیان کے تعلق سے حکومت کے نقطۂ نظر کے سلسلہ میں اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھنا ہوگا کہ اس دور کے مزاج کو ثقافت کے کس معیار پر جانچا جاتا تھا۔

بہر حال داستانِ پارینہ کا یہ نقشِ ناتمام اپنی ناتمامی میں بھی فرحت اثر ہے ملاحظہ ہو:

(ماخذ۔ مثل صیغہ دفتر معتمد سرکار عالی عدالت و کوتوالی و امور عامہ بابتہ سن ۱۳۴۵ف)

سفر زیر دفعہ ۱۸۰ ضابطہ ملازمت

از

(مولوی مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب، بی اے سیشن جج گلبرگہ شریف)

اردو کا ایک مشہور شعر ہے کہ:

رات بھر خوب سی پی صبح کو توبہ کر لی
رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی

اس شعر کو نہ حقیقت سے تعلق ہے اور نہ مجاز سے بلکہ یہ دفعہ ۱۱۰ ضابطہ ملازمت کی توضیح ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے اس دفعہ سے فائدہ اٹھایا تھا۔ مضمون اچھا ہاتھ آ گیا نظم کر دیا۔ دفعہ مذکور حسب ذیل ہے:

"ہر ملازم سرکار کو ۱۲ ماہ کی رخصت خاص بغرض حج و زیارت بہ حلف تنخواہ سالم یا [illegible] دی جا سکتی۔"

ظاہر ہے کہ وہ کون سا حج اور کون سی زیارت ہے جس میں ۶ مہینے لگیں۔ اس لیے ہوتا یہ ہے کہ یہ لوگ پہلے ملازمت کی تھکن اتارنے ولایت جاتے ہیں، وہاں رنگ رلیاں مناتے ہیں اور واپسی میں دو ایک درگاہوں میں بھی جھانک آتے ہیں۔ اب اس مضمون کو اوپر والے شعر سے ملا کر دیکھیے، میرا کہنا سچ ہے یا جھوٹ۔

جب ضابطۂ ملازمت نے دل چسپی کی ایسی راہیں کھول دی ہوں تو کوئی وجہ نہیں کہ دوسرے اس سے فائدہ اٹھائیں اور میں نہ اٹھاؤں مگر اس کو کیا کیا جائے کہ یہاں کمانے والا ایک ہے اور کھانے والے بہت ہیں۔ بیوی کا ہونا تو ہر پہلے آدمی کے لیے ضروری ہے، اب رہے بچے تو اس اتصال سے ان کا عدم سے وجود میں آنا ایک لازمی امر ہے، امیر تو گہرے دریا ہوتے ہیں اس لیے شاخیں کم نکلتی ہیں، اب رہے غریب تو ان کے ہاں نیستی میں آٹا گیلا ہوتا ہے، اس لیے ان پایاب دریاؤں کی اتنی شاخیں نکلتی ہیں کہ خود ان کا پانی خشک ہو جاتا ہے۔ غرض میرے لیے دو مصیبتیں تھیں ایک بیوی کی اجازت دوسرے گھر اور ولایت کے دوہرے اخراجات کا انتظام، مگر یہ کام دو برس کی محنت اور خوشامد نے کسی نہ کسی طرح آسان کر دیا۔ پہلے تو میں نے روز بیوی سے آکر کام کی زیادتی اور صحت کی خرابی کا ذکر شروع کیا اور رفتہ رفتہ ان کو یقین ہو گیا کہ بیوہ بننے میں تھوڑی کسر رہ گئی ہے اس کے بعد اس بیماری کے سلسلہ میں علاج کا سلسلہ ملا دیا اور سینکڑوں ڈاکٹروں کی رائے کا حوالہ دے کر ثابت کر دیا کہ یہ مرض صرف ولایت جانے سے ہو سکتا ہے۔ اس کا جواب یہ ملا کہ تم ولایت جاؤ گے تو ہم کھائیں گے کیا۔ جس کے یہ معنی ہوتے کہ تم مر گئے تو گزارا کر لیں گے لیکن ولایت گئے تو کسی طرح ہمارا گزارا نہیں ہو سکتا۔ میں نے کہا بیگم پہلے پچاس ملتے تھے۔ جب گھر چلتا تھا، پھر سو ہوئے جب گھر چلا، اب تین سو مل رہے ہیں اور گھر میں وہی برکت ہے، دنیا اتنی ترقی کر رہی ہے۔ انسان کپڑوں کا ڈھکوسلا پھینک کر صحیح معنوں میں حضرت آدم کی اولاد بن رہے ہیں، کھانے پینے میں یہاں تک ترقی کی ہے کہ بناسپتی کھانے اور ٹھنڈا پانی پینے پر اتر آئے ہیں۔ تم بھی تھوڑے دن اسی الٹی گنگا میں تیر دو اور بجائے تین سو کے پچاس ہی میں گزارہ کرو۔ تمہارے اس ایثار سے ایک غریب کی جان بچ جائے گی۔ بھلا ایسی صحیح اور صاف منطق بیوی صاحبہ کی سمجھ میں کب آسکتی تھی، فرمانے لگیں کہ "جی ہاں! پچاس میں گزارا ہوتا تھا مگر تھے کون میں اور تم۔ خود ہی تو ان بچوں کی مصیبت تم نے مول لی اور خود ہی اب کہتے ہو کہ اس پچاس روپے میں سارا مہینہ کاٹو۔" اس روز میں نے اس سلسلہ کو زیادہ طول دینا مناسب نہ سمجھا، چند روز کے بعد پچاس پچیس کا اضافہ کر کے پھر تجویز پیش کی، یہ تجویز بھی نہایت سختی کے ساتھ نامنظور ہوئی۔ اس کے بعد سوائے اس کے چارہ نہ تھا کہ اور اضافہ کیا جائے۔ اور اس کے ساتھ ہی دہلی دکھانے کا بھی وعدہ کیا جائے یہ منتر چل گیا اور بالآخر صلح نامہ کی یہ شرطیں طے پائیں کہ بیوی صاحبہ اپنی کثیر العیالی کے ساتھ دہلی کی سیر کریں اور یہ کمترین ولایت کے مزے اڑائے اور واپسی میں مصر اور شام کی زیارتیں کر کے پکا مسلمان ہو کر "قفس ملازمت" میں پھر داخل ہو جائے۔

جب اس مشکل سے خدا نے نجات دی تو رخصت حاصل کرنے کی کارروائی شروع ہوئی اور بہت جلد مل گئی

ڈاکٹری سرٹیفکٹ اور پاسپورٹ حاصل کیے گئے۔ یورپی ملکوں کے علاوہ مصر، عراق، حجاز، شام، ایران غرض جتنے بھی ملک خیال میں آسکتے تھے سب پاسپورٹ میں درج کیے گئے۔ اتنا روپیہ تو تھا ہی نہیں کہ نئے کپڑے بنوائے جاتے اس لیے شادی کی دو شیروانیاں نکالی گئیں۔ ایک جامہ وار کی تھی اور دوسری کمخواب کی۔ یونس کے ہاں سے جرابیں جوتے، رومال، ٹوپیاں، سیفٹی ریزر، برش، کنگھا، صابن، ڈرایرز، اونی بنیان، سوئٹر الّا بلا۔ کوئی سو ڈیڑھ سو کا سامان لایا گیا لیکن اس کا خیال رکھا گیا کہ اس کو ہمارے ولایت جانے کی اطلاع نہ ہو اور رقم کی ادائیگی ہماری واپسی پر منحصر ہے۔ پرانے دو سوٹ کشتیا درزی سے درست کروائے اور ایکسلسیر کمپنی میں پریس کرائے گئے۔ رخصت منظور ہو گئی چھ ماہ کی پیشگی تنخواہ مبلغ اٹھارہ سو روپے مل گئی۔ اس میں سے چھ سو روپے بیوی کے حوالے کرکے ان کو معہ بال بچوں کے دہلی پارسل کر دیا گیا۔ باقی بچے بارہ سو روپے ان کو یاروں سے تین سو روپے قرضہ لے کر پندرہ سو کیا گیا۔ کک اینڈ کمپنی سے پی اینڈ او کا ٹورسٹ ٹکٹ بذریعہ رگھوناتھ مل بینکر خریدا اور باقی روپے کے سرکیولر نوٹ بنوائے اور یکم جولائی کو پونے چھ بجے شام کی گاڑی سے بمبئی روانہ ہوئے۔

بمبئی بہت سے لوگوں کی دیکھی ہوئی ہے، اس لیے اس کا حال لکھنے کی ضرورت نہیں، یہاں صرف دو روز رہ کر جہاز میں سوار ہوئے اور ہندوستان کو دور ہی سے سلام کرتے ہوئے ولایت کا رخ کیا۔ جہاز میں خود ہم پر کیا گزری اس کی اگر صراحت کی جائے تو یہ سفرنامہ حکیم جی کا مطلب ہو جائے گا اس کا حال میں بیان نہیں کر سکتا، یہ کیفیت میری انتڑیوں، معدے اور حلق سے پوچھی جائے کیوں کہ کئی روز تک اوع اوع، اوع اوع کا وظیفہ صبح سے شام تک پڑھنا پڑا۔ تب کہیں جا کر اس مصیبت سے نجات ملی[1]

ٹورسٹ کلاس انگریزی لفظ ہونے سے بہت بھاری بھرکم معلوم ہوتا ہے۔ لیکن عملاً دیکھا جائے تو وہی تھرڈ کلاس ہے۔ ریل کے تھرڈ کلاس میں ایک سہولت یہ ہوتی ہے کہ اس میں جتنے لوگ بیٹھتے ہیں وہ سب سمجھتے ہیں کہ ہم تھرڈ کلاس آدمی ہیں مگر جہاز میں یہ آفت ہے کہ صاحب لوگ سفر تو کرتے ہیں تھرڈ کلاس میں اور اپنے آپ کو سمجھتے ہیں فرسٹ کلاس۔ مرغیوں کے ڈبے میں بند ہو کر گردن اس لیے اتنی اونچی کرتے ہیں کہ مرغ نہیں شتر مرغ معلوم ہوں۔ خدا کسی ہندوستانی پر پی اینڈ او میں سفر کرنے کی مصیبت نہ ڈالے۔ بات کرنا اور ملنا ملانا تو کجا قریب میں کرسی بچھانے کی رواداری تک برتی نہیں جاتی۔ اگر خدانخواستہ آپ نے اپنی کرسی کسی صاحب بہادر کے پاس بچھا دی تو یقین رکھیے کہ وہ آپ کے بیٹھنے سے پہلے اپنی کرسی پر سے اٹھ کھڑے ہوں گے۔ غرض بندر سوئز تک پہنچنے میں جو قلبی تکلیفیں پہنچی ہیں وہ بیان نہیں ہو سکتیں۔ ایک

---

[1] کہا جاتا ہے کہ عربوں کے سوا عین کی آواز اور کوئی قوم صحیح طور پر حلق سے نہیں نکال سکتی۔ اگر جہاز پر کوئی اور آکر دیکھے تو معلوم ہو جائے گا کہ جہاز کے روانہ ہو جانے کے کئی دن بعد تک ہر قوم کا آدمی حرف عین کی آواز ایسی اچھی طرح سے نکالتا ہے کہ عرب بھی سن کر ششدر رہ جائیں۔

دن خیال آیا کہ ان واقعات کا ایک خط ٹائمز آف انڈیا کو لکھ کر سمندر میں کود پڑوں۔ سارا دن اسی سوچ میں گزارا کاغذ پنسل لے کر اپنی ملازمت کا حساب کیا کہ اگر اسی سوچ میں گزارا کاغذ پنسل لے کر اپنی ملازمت کا حساب کیا اور یہ حساب کیا کہ اگر میں اس وقت ڈوب مرا تو بیوی بچوں کو کیا پنشن ملے گی مگر پنشن کی کمی اور بال بچوں کی زیادتی نے ہمت توڑ دی اور "باہمیں مردمان بباید ساخت" پر عمل کرنا پڑا۔

سوئز کے بعد سے ذرا جہاز کی اس ہوا میں تبدیلی ہوئی۔ کبھی کبھار کسی صاحب نے ذرا سیدھے منہ بات بھی کر لی۔ کوئی کھوسٹ میم صاحب ہم کو دیکھ کر ذرا مسکرا بھی دیں۔ کرسیاں پاس سے اٹھنی ذرا موقوف ہوئیں اور بالآخر ہمارے حقوق میں یہاں تک توسیع ہوگئی کہ ڈک کے ایک کونے میں کھڑے ہو کر اس "اعلیٰ طبقۂ بنی نوع انسان" کا ناچ بھی دیکھنے لگے۔ ہاں صرف ایک صاحب بہادر اسی طرح "فرنٹ" رہے، یہ صاحب یوپی میں کسی جگہ "ملازم درجۂ اعلیٰ" تھے۔ اب پنشن لے کر "گھر" جا رہے تھے۔ بیوی مر چکی تھیں (اور ان کو مرنا بھی چاہیے تھا کیوں کہ ایسے شخص کے ساتھ رہ کر کوئی جی کیسے سکتا ہے) دو لڑکیاں ساتھ تھیں، بڑی تیز و طرار تھیں۔ ہر وقت ادھر ادھر خاوند کی تلاش میں بھٹکتی پھرتی تھیں۔ کئی صاحب بہادروں نے ان پر ڈورے بھی ڈالے مگر کانٹا خالی آیا۔ ان دونوں کی نگرانی پر ایک "عمر دراز آیا مقرر تھی"، آگرہ کی رہنے والی تھی، اس بے چاری کی وجہ تھی جواب تک یہ کم ترین بقید حیات ہے اور یہ مضمون لکھ رہا ہے ورنہ میرے "دخل فی الجنۃ" ہونے میں ذرا کسر باقی نہیں رہی تھی۔ یہ آیا بھی صاحب بہادر کی بہت خلاف تھی کہا کرتی تھی کہ "صاحب۔ خدا اس بڈھے کا ذکر نہ کرے۔ ہم لوگوں کو تو یہ آدمی سمجھتا ہی نہیں ہے۔ پندرہ روپے تنخواہ دے کر جانتا ہے کہ گویا مجھے خرید لیا ہے۔ ان بچوں کی محبت ہے جو اس کے ہاں پڑی ہوں ورنہ میں تو کبھی کی لعنت بھیج کر اس کے ہاں پڑی ہوں ورنہ میں تو کبھی کی لعنت بھیج کر اس کے گھر سے رخصت ہو گئی ہوتی۔ اس کی میم صاحب بڑی اچھی بیوی تھی۔ ہندوستانی بیویوں سے اس طرح ملتی تھی گویا وہ اس کی بہنیں ہیں۔ یہ بات اس موے کو زہر لگتی تھی۔ کوئی دن نہ جاتا تھا جو لڑائی نہ ہوتی ہو۔ آخر اس تکا فضیحتی سے بے چاری کو دق ہو گئی اور مر گئی۔ مجھ کو دیکھو میں نے اس کے لیے کیا کچھ نہیں کیا۔ اس کے بچوں کو پالا، سارے گھر کو سنبھالا، بیوی کی حیثیت سے اس کی خدمت میں نے کی۔ مگر اس موئے کے ذرا بھا دیں نہیں۔ اب بھی جو ساتھ آئی ہوں تو ان لڑکیوں کی زبردستی ساتھ آئی ہوں۔ نہیں تو ہمارے صاحب تو وہ ہیں کہ مجھے گنگا جی ہی میں ڈبو کر آتے۔ اس بڑھیا کی باتیں ایسی مزے دار ہوتی تھیں کہ گھنٹوں بیٹھا سنتا اور مزے لیا کرتا تھا! اور مزا کیوں نہ آتا۔ دوست کی بھلائی اور دشمن کی برائی سننے میں مزا آتا ہی ہے۔ سوئز سے گزرنے کے بعد جب مجھے معلوم ہو گیا کہ اب ہم آزادی کی دنیا میں ہیں تو میں نے بھی ان صاحب کو دق کرنا شروع کیا۔ جہاں وہ اپنی کرسی پر آ کر بیٹھے اور میں اپنی کرسی اٹھا کر وہیں پہنچا۔ ادھر میں بیٹھا اور ادھر وہ اٹھے۔ لیکن آخر جاتے کہاں، میں بھی ان کا ہمزاد بن گیا تھا۔ یہ کچھ نہیں سکتے تھے کہ ہما کھانے ڈک پر نہ آئیں۔ آخر میں نے ان کو زچ کر دیا اور ان کو مجبوراً ایک ہندوستانی کے پہلو میں بیٹھنا ہی پڑا۔ اس کے بعد میں نے ان کو [illegible]

کا ڈھنگ ڈالا۔ انھوں نے لڑکیوں کو ڈانٹا، بھلا لڑکیاں کب سننے والی تھیں ان کو ضد ہوگئی میں صاحب بہادر کا ہمزاد بنا تھا وہ میرا سایہ بن گئیں جہاں میں ڈگ پر آیا اور دونوں نے آکر گھیر لیا۔ بار دیگر وہ وہ قہقہہ ماریں کہ خدا کی پناہ۔ صاحب بہادر منہ سے تو کچھ نہیں کہتے تھے مگر دل میں قتل عمد یا خودکشی کی ضرورت تدبیریں سوچتے ہوں گے۔ طوفان سے رہا نہ گیا اور بینڈ زنی ہی پہ اتر گئے۔ چلو "خس کم جہاں پاک" اس کے بعد راستہ ذرا آرام سے گزرا، اور سترھواں روز تھا کہ ہم نے لندن میں نزول اجلال فرمایا۔ یہاں ہم نے کنجوسی کو اپنا رہبر اور دعوتوں کو اپنا مشکل کشا بنایا۔ آج اس کے پاس کھانا کھایا تو کل اس کے ہاں چلے گئے۔ اگر کوئی اللہ کا نیک بندہ نہ پھنسا تو "آئی تو روزی نہیں تو روزہ" یعنی ایک وقت کے کھانے پر چوبیس گھنٹے گزار دیے۔

میں نے لندن میں کیا کیا دیکھا اور کس طرح بیس دن گزارے اس کا ذکر میں یہاں نہیں کروں گا، کیوں کہ اس کا تعلق میرے پورے سفر نامہ سے ہے جو عنقریب شائع ہونے والا ہے اور اس کو فروخت کر کے میں اپنے اخراجات سفر نکالنا چاہتا ہوں۔ نہ میں یورپ کے سفر کی کوئی تفصیل اس مضمون میں بیان کروں گا۔ کیوں کہ ان واقعات کا ابھی سے چھپا دینا اپنے خریداروں کی تعداد کو کم کر دینا ہے۔ ہاں مختصر سے حالات لکھ دیتا ہوں تاکہ میرے سفر نامہ کا اشتہار بھی ہو جائے اور ایڈیٹر صاحب پر میرا احسان بھی رہے۔

جو لوگ یہ سوچ کر یورپ جاتے ہیں کہ وہاں آوارگی بہت ہے وہ سخت غلطی میں مبتلا ہیں، وہاں آوارگی مطلق نہیں ہے البتہ سوداگری بہت ہے اور ظاہر ہے سودا وہی لوگ خرید سکتے ہیں جن کے پاس پیسے ہوں۔ اس لیے ہم جیسوں کا بلا پیسے یورپ کا تماشہ دیکھنے جانا سخت بے وقوفی ہے اور واپس آکر یہ غل مچانا کہ یورپ میں آوارگی بہت ہے قطعاً سفید جھوٹ ہے۔ اب رہے پیسے ..... والے تو ان کے لیے یورپ ہی کیا ساری دنیا آوارہ ہے۔ یہ اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ انگلستان کی عورتیں ہندوستانیوں کو منہ نہیں لگاتیں۔ کیوں کہ یہ گھر کی بھیدی ہیں۔ جانتی ہیں کہ یہ نالائق تھوڑے بہت روپے لے کر یہاں آجاتے ہیں اور خالی پیٹ مونچھوں پر تاؤ دیتے ہیں لیکن یورپ کے دوسرے حصوں اور خاص کر فرانس میں ہر ہندوستانی "نواب" ہے۔ چاہے جیب میں کوڑی اور کھانے کو رزق ہو، فرانس کے مرد ہوں یا عورت وہ وہ آنکھیں مٹکا مٹکا کر اور ہاتھ نچا نچا کر باتیں کرتے ہیں، مزا آجاتا ہے۔ پیرس پہنچ کر مجھے معلوم ہوا کہ کسی غیر ملک میں جانا اور وہاں کی زبان نہ جاننا کیا مصیبت لاتا ہے مگر میں نے بھی وہاں والوں کو ایسا سبق دیا ہے کہ تمام عمر یاد کریں گے۔ میں نے سوچا کہ دنیا میں دو ہی میٹھی زبانیں ہیں، ایک فرانسیسی دوسری فارسی۔ فارسی میں جانتا ہوں۔ فرانسیسی میں نہیں جانتا۔ مٹھاس کے لحاظ سے گڑ اور شکر ایک ہی چیز ہیں۔ اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ فارسی کو فرانسیسی میں منتقل نہ کیا جاسکے۔ مجھے معلوم تھا کہ فرانسیسی میں ... حرف (Z) اور (S) کے ساتھ حرف کسی لفظ کے آخر میں آتا ہے تو وہ آواز نہیں دیتا۔ اس کے ... فرانسیسی کے دو تین الفاظ مثلاً لا (La) لی (Lee) بھی یاد تھے۔ میں نے ان تمام چیزوں ...

جاکر ایک زبان یعنی اور اشاروں کی مدد سے پوری طرح ہر بات کو سمجھانے کے قابل ہو گیا۔ مثال کے طور پر یوں سمجھیے کہ کسی سے یہ کہنا ہے کہ "میں بازار جاتا ہوں" اس کی فارسی ہوئی "می روم ببازار" کی "ر" گرا کر اس میں "لا" داخل کر دیا۔ اب یہ فقرہ فرانسیسی میں اس طرح ہوا "مولا باز" اور ہاتھ سے بازار کی طرف اشارہ کر کے ادھر قدم اٹھایا، پیچھے ہر سننے والا سمجھ گیا کہ یہ شخص بازار جا رہا ہے۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ اگر آپ بھی اسی طرح عمل کریں تو آپ کو ساری دنیا کے سفر میں کوئی دقت محسوس نہ ہو۔

فرانس کی صحبتیں کچھ ایسی دل چسپ تھیں کہ میری جغرافی خاک میں مل گئی۔ اور بلا وجہ میں قانون سے حاتم بن گیا۔ اس کا نتیجہ کیا ہوا یہی کہ جب میں بلٹی پہنچا تو "رہے نام سائیں کا" لیکن شکر خورے کو شکر خدا دے ہی دیتا ہے، جب کوئی شخص کسی نیک کام کے لیے اٹھ کھڑا ہوتا ہے تو غیب سے اس کی مدد ضرور ہوتی ہوتی ہے۔ (باقی آئندہ)

صورت حال کا غیر جذباتی اور بنظر غائر جائزہ لیں تو یہ حقیقت ابھرتی ہوئی سامنے آتی ہے کہ اس معاملہ میں یہ بات بھی نہیں کہ:

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے

مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب جب مسکراتے مسکراتے یہ کہہ گزرتے ہیں "وہ کون سی جگہ اور کون سی زیارت ہے جس میں اچھے لگیں، اس لیے ہوتا یہ ہے کہ یہ لوگ پہلے ملازمت کی شکل اتار سنے جاتے ہیں وہاں رنگ رلیاں مناتے ہیں۔ اور واپسی میں دو ایک درگاہوں میں بھی جھانک آتے ہیں" تو ان کا اشارہ جن لوگوں کی طرف تھا ان کا تعلق اعلیٰ عہدیداروں کے ایک روشن خیال طبقہ سے تھا اور جیسے مسکراتے پھولوں کی خاردار ڈالی سے انھوں نے ان کی سلامی اتاری تھی اس نے سچائی کے چہرے پر پڑے نقاب کو تار تار کر کے رکھ دیا، اور اسی رونمائی نے دفتری دنیا میں کھلبلی مچا دی۔ مرزا صاحب نے بھی [illegible] سے ناعاقبت اندیشی سے کام لیا کہ ایک آزاد مزاح نگار کی حیثیت سے وہ چاہے جتنے بے باک ہو جاتے، لیکن ایک عہدہ دار کی حیثیت سے سرکاری ضابطوں پر ان کی تنقید باغیانہ شوخی کی تعریف میں آگئی اور متعلقہ معتمد کو مضمون کے بارے میں رائے زنی کرنا پڑی "نہایت نامناسب اور باغیانہ طرز کی عبارت ہے"۔

مرزا فرحت اللہ بیگ کو ان کی ادبی کاوش کا یہ سرکاری انعام ملا تو وہ آئندہ کے لیے محتاط نہ ہو جاتے تو کیا اپنی قلم کو دھو کر لگا دیتے؟ حکومت ہر معاملہ میں فتح یاب نکلتی ہے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کے مقابلہ میں بھی اس کا پلہ بھاری رہا، لیکن انصاف پسندوں کا فیصلہ یہی ہوگا کہ قلم پر بندش لگانا، قلم کار کو حبس بے جا میں رکھنا ہے اور اس کے لیے حکومت جواب دہ ٹھیرتی ہے۔ البتہ یہ امر باعث [illegible] ہے کہ مرزا فرحت اللہ بیگ کی مزاح نگاری نے ندی کے پانی کی طرح ایک رکاوٹ سے رک کر [illegible] روانی کے لیے دوسری گزرگاہیں نکالیں۔ اس کے علاوہ صرف مستقل تنبیہ پر [illegible] تو مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب بہت [illegible] [illegible] انھوں نے [illegible] [illegible] کر [illegible] [illegible] [illegible] جس [illegible] آغاز ہوتا ہے اس کو ان [illegible] [illegible] [illegible] مضمون [illegible] کیا جا سکتا ہے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب [illegible]

رشید قریشی

ہوٹل

ہوٹل کا مالک : ارے دیکھ جانی، میر صاحب کی آنکھیں چھت کو لگ گئے۔ تو کب تک اپنی اجاڑ صورت کو آئینہ میں دیکھتا رہے گا۔ چل جلدی چائے دے میر صاحب کو۔

جانی : ابھی دیا مالک، ان آنکھوں سے نہ جانے کیا مصیبت آنے والی ہے۔ ایک دن ایک چھوٹی ہو جاتی ہے تو دوسرے دن دوسری۔

میر صاحب : (پہلو بدل کر چھت کو تکتے تکتے جھکتے کھلتے ہیں۔)

آج میرے طرف کی آنکھ چھوٹی ہے جانی۔۔

۔۔ بہت قہ والی ہوتا جانی، ذرا جلدی میرے جانی!

ایک گاہک : تو۔۔۔ تو۔۔۔۔ میں کہہ رہا تھا۔ کیا کہہ رہا تھا ہاں۔۔۔۔ میں کہہ رہا تھا۔۔۔۔۔ اپنے محبوب علی پاشا شکار کو ابراہیم پٹن گئے۔

دوسرا گاہک : محبوب علی پاشا دہانی اچھال کر گولی سے اڑاتیں۔۔۔۔۔ دہانی بن گیا ہونگا شیر۔

(ایک شخص۔۔۔ جس نے شملہ کے پیچھے سے اپنا چہرہ ڈھانپ رکھا ہے۔۔۔۔ داخل ہوتا ہے اور ایک کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔)

ایک شخص : ابراہیم پٹن کے شکار کا قصہ ہے۔ کہیے ہم بھی سنتے ہیں۔

ایک گاہک : ہاں کیا ہوا، شیر نکلا۔۔۔۔۔ ادھر اُدھر دیکھ کر ایسا دھاڑا کہ جنگل لرز گیا۔ مچان پر محبوب علی پاشا کے بازو رزیڈنٹ بیٹھا تھا۔ انیں بھی لرز گیا۔ انگریزی بھول کر داستان بجانے لگا اپنے محبوب علی پاشا، انھوں بھی ایک بخشے ہوئے، آزمانے کو بولے۔۔۔ ویل ڈن۔

دوسرا گاہک : ویل ڈن۔۔۔۔ یہ بات اپنے پلے نہیں پڑی۔

ایک گاہک : ارے اپنے پاشا انگریزی میں بھی فرفر ہیں۔۔۔۔ مطلب کیا بولے تو۔۔۔۔ ارے رزیڈنٹ دم ہے تو بندوق چلا۔

دوسرا گاہک : اچھا۔۔۔۔۔ یہ بات ہے؟۔۔۔ ہاں۔۔۔۔ پھر

ایک گاہک : جب رزیڈنٹ کانپتے ہاتھوں سے۔۔۔۔ بندوق چلایا۔۔۔ گولی شیر کے

پہنچے میں لگی۔ قلم پکڑنے والا ہاتھ کیا بندوق سنبھال سکتا......؟

دوسرا گاہک: اجی وہ ریذیڈنٹ کیا شکار کھیلنے آیا تھا ..... فقط شوق .... شیر اس کو بادشاہ کے بازو بیٹھا ہوا دیکھنا...... آگے بڑھو۔

ایک گاہک: شیر پھر دھاڑا اور غصے میں ریذیڈنٹ کے منہ پر تھوک دیا۔

ایک شخص: اچھا۔

ایک گاہک: منہ تو سو جوتے..... فقط تھوک دیا۔ اس کی جگہ میں رہنا تھا۔

دوسرا گاہک: چلو..... چلو..... قصہ ختم کرو.....

ایک گاہک: تو شیر لنگڑاتا ہوا (چل کر بتاتا ہے)۔ ... ایک جھاڑی میں جا چھپا۔

ایک شخص: ایسا ہوا؟

ایک گاہک: اجی ہاں.... ہاں.... میرا چشم دید سنا ہوا واقعہ ہے۔

ایک شخص: مجھے ذرہ برابر شک نہیں۔ آپ اپنا بیان جاری رکھیے۔

ایک گاہک: اب اس جھاڑی پر پتھر پھینکے، ہوا میں فائر کیے لیکن شیر باہر نہیں نکلا۔

دوسرا گاہک: (ایک شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) شیر کیا ان کے جیسا دیوانہ ہے جو سامنے آ کے بیٹھ جائے گا۔ اتنے میں سمجھ گیا محبوب علی پاشا تاک میں ہیں۔ جھاڑی سے باہر نکلا اور جان سے گیا۔

ایک گاہک: اجی اب سنو، کیا ہوتا ہے۔ اپنے سالم چاؤش ہیں نا؟

دوسرا گاہک: اجی وہی علی آباد کے دو جوروؤں والے سالم چاؤش۔

دوسرا گاہک: اسنے تو جوشیلا ہے جو جی میں آئے کر گزرتا ہے۔

ایک گاہک: تو سالم چاؤش اپنی بھرمار بندوق اچھالتے جھاڑی کی طرف لپکے۔

دوسرا گاہک: دو جوروؤں والا ہے شیر سے کیا ڈرتا نہیں۔

ایک شخص: محبوب علی پاشا پیچھے۔ سالم چاؤش کیا کرتا ہے یا کم بخت! لیکن سالم چاؤش اس دن شاید دونوں جوروؤں سے لڑ کر آئے تھے۔ گھس گئے جھاڑی میں۔ جھاڑی میں کچھ حرکت ہوئی تو محبوب علی پاشا ریذیڈنٹ کی طرف دیکھے۔ ریذیڈنٹ پھر کانپنے لگا اور کانپتے کانپتے پھر گولی چلا دیا۔ شیر کو تو کچھ نہیں ہوا۔ سالم چاؤش تڑپتے بلبلاتے باہر آئے۔

دوسرا۔ کیا اندھا تھا ریذیڈنٹ شیر میں سالم چاؤش میں تمیز نہ کر سکا!؟

ایک گاہک: ایسا نہ کہو..... سالم چاؤش کی لنگی سے کوئی بھی دھوکا کھائے گا۔

ایک شخص (ہنسنے لگتا ہے) پھر کیا ہوا.... بڑا مزے دار قصہ ہے۔

ایک گاہک: عربی زبان کی لغت میں کیا اللہ.... کسی چاؤش کو گولی مارو..... پھر دیکھو اس زبان کے فرآٹے۔

دوسرا گاہک: قصور سالم چاؤش کا ہے۔ محبوب علی پاشا کے حکم کے بغیر ان کو میدان میں نہیں آنا چاہیے تھا۔ شیخی کا مزا ہمیشہ کڑوا ہے نا؟

ایک گاہک : بالکل ٹھیک۔ لیکن جو ہوتا تھا وہ ہو گیا۔
ریذیڈنٹ کی گولی، سالم چاؤش کا شانہ توڑتی ہوئی نکل گئی۔

ایک شخص : محبوب علی پاشا نے کیا کیا؟

ایک گاہک : آپ کو دیکھو۔ محبوب علی پاشا کے بارے میں پوچھ رہیں۔ . . . . . کچھ جان پہچان ہے تمہے کیا؟

ایک شخص : ارے بھائی ہم غریبوں کا بادشاہوں سے کیا واسطہ؟

دوسرا گاہک : اجی ان کو مارو گولی۔ ہاں سناؤ . . .

ایک گاہک : اب پوچھے تو بولنا ہی پڑتا۔ محبوب علی پاشا بچارے مچان کے نیچے آئے۔ زخمی سالم چاؤش کو افسر جنگ کے حوالے کیے۔

دوسرا گاہک : سالم چاؤش بہت بپھرا ہوں گا۔

ایک گاہک : زخمی شیر کی طرح گرج رہا تھا۔ کہتا تھا مالک کی گولی ہوتی تو ہم خوشی سے دل میں رکھ لیتا لیکن ریذیڈنٹ نے امارا کاندا توڑا۔ ام بھی اس کے کاندے پر گولی مارے گا۔

دوسرا گاہک : اپنے محبوب علی پاشا کو تاؤ آ گیا ہوں گا۔ انوں اپنے لوگوں کا خون دیکھ کر آپے میں نیں رہتے۔

ایک گاہک : تاؤ کیا بول رئیں . . . محبوب علی پاشا پرزتا تا سوار ہو گیا۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ . . . . گھس گئے جھاڑی میں۔ جنگل کا سانس رک گیا۔ لوگوں کے دل دھڑکنے لگے۔ اتنے میں بندوق کی آواز آئی . . . . . دھن . . . . .

دوسرا گاہک : ارے جلدی بول بھائی!

ایک گاہک : اور محبوب علی پاشا۔ بندوق کی نال چمکتے مسکراتے . . . جھاڑی سے باہر آئے۔

ایک شخص : اور شیر؟

ایک گاہک : اب شیر کہاں میاں۔ شیر کی دم لگا

کے ہاتھوں میں تھی۔

دوسرا گاہک : میں نے سنا ہے، سرکار اب پکھال کو جا رہے ہیں۔

ایک گاہک : پاکھال سے پہلے میلورم جانے کی خبر ہے۔

ایک شخص : یہ محبوب علی پاشا، کیا جنگل کے بادشاہ ہیں۔ جب دیکھو شکار کو چلے۔ اس طرح سیر سپاٹوں میں رہیں گے تو رعایا کی خبر گیری کون کرے گا؟

(دوسرا گاہک اٹھ کھڑا ہوتا ہے . . . . . ایک شخص کو کھڑا کر کے اس کا گریبان پکڑ لیتا ہے۔ ایک شخص اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرتا ہے تو دوسرا گاہک ایک زوردار جھٹکہ دیتا ہے)

دوسرا گاہک : کون سے جنگل کے ہیں میاں آپ؟

ایک شخص : گریباں چھوڑ میرا، دور ہٹ۔

میر صاحب : (اپنی جگہ سے اٹھ کر موقعۂ واردات پہ آ جاتے ہیں)
کیا ارشاد فرمائے میاں آپ۔ محبوب علی پاشا، جنگل میں شکار کھیلتے رہے تو رعایا کی خبر گیری کون کرے گا؟ . . . آپ کو معلوم ہونا چاہیے میاں کہ انوں اپنی ریاست کا انتظام ایسا جمائے ہیں کہ انوں کہیں بھی رہو یہ کارخانہ چلتیچ رہتا۔ اب دیکھو آپ . . . . اللہ آسمان پہ ہے نا؟ بولو . . . . ہے . . . نا؟

ایک شخص : جی ہاں . . . اللہ آسمان پر ہے . . .

میر صاحب : اللہ آسمان پر ہے لیکن دنیا کے کاروبار چل رئیں یا نئیں . . . . بولو . . . ؟

ایک شخص : جی ہاں چل تو رہے ہیں۔

میر صاحب : تو بحث ختم . . . (پھر اپنی جگہ آ بیٹھتے ہیں)
ایک پیالی اور میرے بھائی . . . . کم شکر والی . .

دوسرا گاہک : بحث ختم نہیں ہوتی . . . بحث شروع ہوا

ہے ... اب سمجھا میں مطلب ان کے بولنے کا....
(چاقو نکالتا ہے) اپنی رگوں میں چار مینار کی
کھچڑی کا خون ہے۔ میرے محبوب علی پاشا کو کوئی
کچھ بولیگا تو انتڑیاں زمین پر گرا دوں گا....
(چاقو اونچا کرتا ہے)

مالک: (بیچ میں آجاتا ہے) ارے...... ارے یہ کیا جھگڑا ہے۔ ادھر آؤ.... میاں، میرے ساتھ آو.... میاں، میرے ساتھ.... ادھر لا رے تیرا چاقو (چاقو دوسرے گاہک کے ہاتھ سے چھین لیتا ہے) ... یہ جاہل لوگ ان کے منہ کیوں لگتے ہیں میاں.... سنو میں سمجھاتا ہوں .... اپنے محبوب علی پاشا شکار کو گئے تو فقط جنوروں کے پیچھے ہی نہیں پڑے رہتے.... جہاں جہاں جاتے ہیں۔ رعایا کی عرضیاں لیتے ان کی فریاد سنتے اور ظالموں کو سزا دیتے ہیں۔ اتنی بڑی سلطنت کے بادشاہ کو ایسا تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ شکار تو بہانہ ہے۔

ایک شخص: یہاں میری معلومات میں بہت بہت اضافہ ہوا۔ بہت شکریہ.... (جانے لگتا ہے)

جانی: شملہ والا.... کھایا نہ پیا۔

مالک: ابھی کدھر چلے میاں۔ یہ چاقو تو لیتے جاؤ....

ایک شخص: یہ چاقو میرا نہیں۔

مالک: لیکن آپ نے اٹھایا تھا نا....

ایک شخص: اچھا۔ اچھا!!

مالک: چاقو کی قیمت، پانچ روپے رکھ دیجیے۔

ایک شخص: پانچ روپے۔!!

مالک: چاقو کی نہیں.... آپ کی جان کی قیمت! ورنہ ذرا ادھر دیکھیے... (دوسرے گاہک کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ جو سینہ پھلائے ہوئے جھومتا رہتا ہے)... وہ چاقو کو آپ کے سینے میں اتارنے کے لیے کس قدر بے چین ہے....

ایک شخص: یہ لیجیے.... پانچ روپے.... (چاقو لے کر چلے جاتا ہے، دوسرا گاہک آگے آتا ہے)

دوسرا گاہک: مالک.... نکالو.... چاقو کے روپے۔

مالک: یہ لے.... جب تک محبوب علی پاشا ہیں عیش کر لے۔

دوسرا گاہک: (روپیوں کو چومتا ہے) مالک کے ہاتھوں سے دیتا ہے میرا محبوب!

(ڈرامہ "محبوب" ۱۹۸۳ء کا ایک باب)

رشید قریشی

چہ کنم

(ڈاکٹر حبیب ضیا کی کتاب گویم مشکل کا دیباچہ)

میاں بیوی، مسٹر رحیم الدین اور ڈاکٹر حبیب ضیا تیز تیز آئے اور ایسے سنجیدہ چہروں سے میرے سامنے بیٹھ گئے جیسے میں نے ہی ان کا رشتہ جوڑا۔ میں نے کہا "آپ دونوں شاید پکنک کے لیے گنڈی پیٹھ جاتے ہوئے ادھر چلے آئے ہیں۔" ڈاکٹر حبیب ضیا نے میرے سوال کے جواب میں کہا "جی نہیں پکنک نہیں، آپ سے مزاحیہ مضامین کے اس مجموعے کے لیے تعارف لکھوانے آئے ہیں۔" اور انھوں نے ایک ضخیم زرد بیاض میرے سامنے رکھ دی۔ آپ نے میری ہمت افزائی کی، میں نے یہ مضامین لکھے۔ اب یہ کتاب بن گئے ہیں۔ پڑھیے اور اپنے تاثرات کا اظہار کیجیے۔" میں نے "پڑھیے" کے تاکیدی لہجے کو نوٹ کیا۔ بیاض کا حجم دیکھا، سرورق پر کتاب کا نام دیکھا...... اور میرا بہت سارا ٹانکوں کا بخشا ہوا خون خشک ہو گیا۔ ڈاکٹر حبیب ضیا کے لیے "گویم مشکل" اور میں "چہ کنم"، ادھر مسٹر رحیم الدین کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھوٹنے لگی۔ "اس میں بعض مضامین ایسے ہیں جو میری فرمائش پر لکھے گئے ہیں۔" میں نے عاجزانہ لہجے میں کہا "وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن میں "چہ کنم" ہوں، لکھنے پڑھنے سے معذور ہو گیا ہوں۔ سر کے بال تک منڈوا دینے پڑے۔ اس کام کے قابل نہیں۔ آپ کی فرمائش پر مضامین لکھے گئے ہیں" میں مسٹر رحیم الدین کی طرف پلٹا "تو آپ ہی ان مضامین کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کر دیجیے..... مزاح ایک ندرت سے آراستہ ہو جائے گا۔"

ڈاکٹر حبیب ضیا نے پہلو بدلا اور فیصلہ کن انداز میں اعلان کر دیا:

"تو پھر کتاب شائع نہیں ہو گی۔"

اس دھمکی نے مجھے ڈھیر کر دیا، اور کوشش کے ارادے میں نے اپنے تعارفی مضمون کے لیے ڈاکٹر حبیب ضیا سے چند سوال کیے:

میں: مزاح آپ کی فطرت میں ہے یا آپ شوقیہ طور پر مزاح نگار بن بیٹھی ہیں؟

ڈاکٹر حبیب ضیاء: میں فطرتاً مزاح پسند ہوں۔ جب میں پڑھتی تھی تو کلاس میں مضمون لکھنا پڑتا تھا۔ ان میں جگہ جگہ مزاح کوند جاتا۔ جہاں بانو نقوی صاحبہ میری استاد تھیں۔ وہ ان جملوں پر پھڑک جاتیں۔ اور مجھ سے کہتیں ...... "یہ جوہر ہیں اسے چمکاتی رہو"

میں: لیکن آپ کے بارے میں آپ کے ہونہار شاگردوں کا خیال ہے کہ آپ کڑک ہیں اور پرنسپل کی طرح لکچر دیتی ہیں؟

(ڈاکٹر حبیب ضیا مسکرا کر چپ رہتی ہیں تو میں مسٹر رحیم الدین سے پوچھتا ہوں) آپ کا کیا تجربہ ہے؟ وہ بھی مسکرا کر چھت کی طرف دیکھنے لگتے ہیں) اچھا یہ کہیے آپ کے مضامین میں مشاہدات، حقائق اور ذہنی اختراع کا کیا تناسب ہوتا ہے؟

حبیب ضیاء: مشاہدات ۴۰ فی صد، حقائق ۴۰ فی صد اور خیال آرائی ۲۰ فی صد۔

میں: اس تناسب کی تحریروں میں وزن اور اثر دونوں ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر حبیب ضیاء: اب دیکھیے پڑھنے والوں کا کیا ردِ عمل ہوتا ہے۔

میں: آپ مضمون کس طرح لکھتی ہیں۔ ایک ہی نشست میں یا کئی نشستوں میں؟

ڈاکٹر حبیب ضیاء: میں سب سے پہلے موضوع کا انتخاب کرتی ہوں۔ اس کو ذہن میں رکھ کر متعلقہ مواد یہاں، وہاں سے جمع کرتی ہوں اور پوائنٹس کی شکل میں لکھ لیا کرتی ہوں اور جب سمجھتی ہوں کہ اب مفہوم بن سکتا ہے تو بس ایک ہی نشست میں لکھ ڈالتی ہوں۔

میں:۔ آپ کی تحریروں میں اتنی تیز رفتاری کیوں ہے؟ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کسی پہاڑ کی چوٹی پر تھیں اور وہاں سے جو کچھ بھی آپ کو نظر آیا اس کو سناتے ہوئے نیچے اتر رہی ہیں۔

ڈاکٹر حبیب ضیاء: میں سمجھتی ہوں کہ دوسرے مجموعے تک میرا اندازِ بیان زیادہ سلجھا سنبھلا ہو جائے گا۔

اس سوال کے جواب کے بعد ڈاکٹر حبیب ضیا اور مسٹر رحیم الدین چلے گئے اور میں سوچ میں پڑ گیا کہ اب کیا کیا جائے۔

آیئے پہلے کتاب کے مصنف سے ملیے۔

ڈاکٹر حبیب ضیا ایک خوش قامت دبلی پتلی خاتون ہیں۔ ان کی وہ تصویر جوان کی کتاب "مہاراجہ کشن پرشاد" کی زینت بنی ہے۔ اس ہرن کی آنکھیں دکھاتی ہے جس نے کوئی نشیلی چیز استعمال کر رکھی ہو۔ لیکن اب ان آنکھوں سے خون کی کمی کا عارضہ جھانکتا ہے۔ نہ جانے کیوں مزاح نے ان کے ساتھ ایسا برا سلوک کیا۔ ورنہ ہم نے تو عام طور پر یہ دیکھا جو ہنسا، ہنسایا موٹا ہو گیا۔ وہ جب مضمون سنانے کے لیے کھڑی ہوتی ہیں تو پہلے تھوڑا سا سٹپٹا لیتی ہیں۔ اس کے بعد شاید کوئی وظیفہ ہونٹوں ہی ہونٹوں میں جب لیتی ہیں اور پھر شروع ہوتی ہیں تو جیسے تیروں سے کرتب کروانے والا کوڑا کڑکنے لگا۔ ان کا پہلا مضمون جو میں نے زندہ دلانِ حیدرآباد کے ادبی اجلاس میں سنا" وہ تھا" بچہ باہر گیا ہے" مجھے حیرت تھی کہ ایک خاتون مزاح نگار کی طرح وہ اپنی سپاٹ تحریر سے ہنستی، مسکراتی فضا کو بوجھل

بنائیں گی۔ لیکن ان کے پہلے ہی جملے نے سب کو چونکا دیا۔ اور پھر جہاں جہاں انھوں نے چاہا حاضرین سے قہقہے وصول کیے۔ ادبی اجلاس کے اختتام پر میں نے ڈاکٹر حبیب ضیا کو ڈھونڈ نکالا اور ان کے پرلطف مضمون پر ان کو مبارک باد دی ان کے بازو ان کی بچی کھڑی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا:

کیوں بیٹی! آج کا سب سے اچھا مضمون کس کا تھا؟ بچی نے شرماتے ہوئے کہا "ممّاں کا . . . " میں نے پھر پوچھا،

"تم نے تالیاں تو خوب بجائی ہوں گی"۔

بچی کا معصومانہ جواب تھا "میں نے نہیں . . . . پاپا نے"۔

اس ملاقات کے دوران میں نے ڈاکٹر حبیب ضیا سے کہا:

"آپ میں مزاح نگاری کی صلاحیت ہے اس میدان میں آجائیے۔

ڈاکٹر حبیب ضیا اپنا مضمون خود ہی سنائیں تو ول نشینی دو دھاری تلوار کی کاٹ بن جاتی ہے۔ لیکن پڑھنے میں بھی ان کے مضامین کا اثر کچھ کم لطف انگیز نہیں ہوتا۔ کہنے کو تو وہ کہتی ہیں کہ وہ ہند و پاک کے بلند پایہ مزاح نگاروں سے متاثر ہیں۔ لیکن میرا یہ خیال ہے کہ ان کا انداز مزاح منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ دراصل وہ اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے بہ جہتی مشاہدہ کا کام لیتی ہیں اور پھر اپنی ذہنی استعداد مزاح سے ایک ایسا اسلوب اختیار کرتی ہیں جو خالص "حبیب ضیائی" ہے۔ اس حبیب ضیائی اسلوب میں نسوانیت کی جو نازک جھلکیاں نظر آتی ہیں وہ کہیں اور نہیں ملتیں۔ یہ ایک چوڑی فروش کی دکان کا منظر ہے:

"چوڑیوں کی دکان پر جاتے ہی عورتیں دکان دار کو ہاتھ دے دیتی ہیں۔ ہاتھ دینے کے محاورہ میں نہیں۔ اور جب عورت اپنا ہاتھ کسی کے ہاتھ میں دے دے تو ذہن خود بخود معنی و مفہوم متعین کر لیتا ہے۔ چوڑی فروش بھی ہاتھ دینے کے انداز خاص کی مناسبت سے اپنے آپ سے دور اور ہاتھ میں ہوئی کلائی سے قریب تر ہو جاتا ہے" (لاڑ)

گھریلو زندگی میں میاں بیوی اور ماما کا ایک مثلث بنتا ہے۔ اس میں جنگی اہمیت کے لحاظ سے ماما کا مورچہ مستحکم ہوتا ہے۔ وہ پہلے بیوی کی طرف بڑھتی ہے۔ اس کے قریب پہنچ کر اس کے اطراف گھیرا ڈالتی ہے۔ اور بیوی کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر میاں پر یلغار کر دیتی ہے:

نقشہ یوں ہوتا ہے:



ڈاکٹر حبیب ضیا نے "گم مشکل" میں ایسی ہی ایک صورت کو پیش کیا ہے:

"ایک دن اوپر کا کام کرنے والی بیا دہ [illegible] نے شہزادی آپا سے کہا "میں چوٹے کا کام سنبھالتی ہوں آپ ذرا [illegible] اس پر وہ بہت چراغ پا ہوئیں۔ کہنے لگیں۔ بڑی مشکل جو آپ ملیں نئے "گم مشکل" مگر وہ گم مشکل میں بیٹھ کر ہاتھ دھو ہی ہوں ڈکر سکتی

جب گھر میں ہو کر دھوتی ہوں تو کپڑوں پر چھینٹے اڑتے ہیں۔ اللہ نے مجھے اتنا دیا ہوتا کہ کسی کو لگا کر برتن دھلواتی۔" آخری فقرہ ہمارے دل میں نقش ہو گیا۔ شہزادی آپا کا یہ شاہانہ مزاح خطرناک لگا۔ اس فقرے پر جتنا سوچا اتنے ہی گہرے معنی نکلتے دکھائی دیے۔" اس فقرے کا معنوی تجزیہ صرف نسوانی دماغ کر سکتا ہے۔ . . . . کوئی مرد اس کی گہرائی تک نہیں پہنچ سکتا۔ لیکن قابلِ تعریف بات یہ ہے کہ شوہر کو سامنے نہیں لایا گیا۔ اسے اللہ کے پیچھے چھپا رکھا گیا ہے۔ مردانہ مزاح نگاری میں اس صورتِ حال کی ہیئت ترکیبی کچھ ایسی ہوتی:

ایک خاتون اپنی سہیلی سے ملنے آئی . . . . اسے اداس دیکھا تو خاتون نے وجہ پوچھی . . . . سہیلی نے روتے ہوئے کہا: آج کل کے شوہر بھروسے کے قابل نہیں . . . . . . میں شاپنگ کے لیے آئی تو کیا دیکھتی ہوں . . . . تمہارے دولھے بھائی . . . . . ماما کو اپنے بازو . . . . صوفے پر بٹھائے ہوئے . . . . ." خاتون نے سوال کیا "تو تم نے ماما کو نکال دیا نا؟" سہیلی بولی "ماما کو کیسے نکالتی، شوہر تو جیسے تیسے مل جاتے ہیں لیکن اچھی ماما کہاں ملتی ہے . . . ." "تو پھر کیا کیا تم نے؟" خاتون نے بے صبری سے پوچھا۔ سہیلی نے آنسو پونچھتے ہوئے جواب دیا "صوفہ وہاں سے ہٹا دیا۔"

ڈاکٹر حبیب ضیا نے بھی کہیں کہیں مردانگی کے جوہر دکھائے ہیں۔ "بچہ باہر گیا ہے" کا یہ ٹکڑا ملاحظہ کیجیے:

"بعض بچے شیخوں کی سی عادتوں میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ یعنی وہی ایک سے زیادہ بیویاں رکھنا، زیادہ سے زیادہ بچے پیدا کرنا، ٹی وی کی طرح بیوی ذرا پرانی ہوئی کہ اسے پھینک دینا اور خوب سے خوب تر مال" کی تلاش میں مارے مارے پھرنا۔"

ڈاکٹر حبیب ضیا خالص مزاح کے بھی قائل نہیں ہیں۔ وہ مزاح کی آڑ میں طنز کے نشتر بھی چلاتے ہیں۔ یہ چھوٹے ہتھیار اس چابک دستی سے سماجی ناسوروں اور انسانی کمزوریوں کو نشانہ بناتے ہیں کہ زخم بھی مسکرا اٹھتے ہیں۔

"ہمارے کوارٹر کے اوپر جو خاندان ہے وہ ایک مثلث پر مشتمل ہے۔ میاں، بیوی اور بچہ۔ دن میں کئی بار بالکنی اور کھڑکی سے مختلف چیزیں نیچے گرتی رہتی ہیں۔ ہم سر اٹھا کر بیکسی نرمی کے ساتھ احتجاج کرتے ہیں کہ نیچے ہمارے بچے کھیل رہے ہیں۔ سامان پھینکتے وقت ذرا خیال رکھا کیجیے تو اوپر والی اس سے بھی زیادہ نرمی بلکہ انتہائی عاجزی سے کہتی ہے: میرا بچہ چھوٹا ہے، کھیلتے کھیلتے پھینک دیتا ہے۔ ابھی اسے عقل نہیں۔" ایک دن ہم اپنے کمرے میں بیٹھے کچھ پڑھ رہے تھے کہ صحن میں کسی وزنی چیز کے گرنے کی آواز آئی۔ دوڑ کر دیکھا تو بچے کی ماں صحن میں پڑی تھی۔ سر اٹھا کر اوپر دیکھا تو بچے کے باپ نے شرمندہ ہوتے ہوئے کہا: "بچے نے پھینک دیا ہے، ابھی اسے عقل نہیں۔"

مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میری "جو کچھ تم" کی کیفیت اب [illegible] ہے اور یہ کہ میں نے ڈاکٹر حبیب ضیا کو متعارف

کرنے کا فرض بخوبی انجام دے دیا۔ اور مجھے یقین ہے کہ اس تعارف کی روشنی میں پڑھنے والوں کو اس مجموعے کے مضامین سے لطف اندوز ہونے میں کوئی مشکل نہیں ہوگی۔ پڑھیے، مسکرائیے، ہنسیے ...... اور مزاح نگار کو اس کے کمال کی داد دیجیے۔ کیوں کہ ملک بھر میں وہی تو ایک (خاتون) مزاح نگار ہے اور ڈاکٹر حبیب ضیا کو میرا ایک اور مشورہ ہے۔ وہ اپنی صلاحیتوں کو وسیع تر جولانگاہ میں "قلم رنجہ" ہونے دیں اور ایک مزاحیہ ناول لکھیں۔ اس مشورہ کے ساتھ ایک درخواست بھی ہے کہ قلم کی روانی صبا خرام رہے کیوں کہ مزاح کی کلیاں نرم جھونکوں میں کھلتی ہیں آندھی میں نہیں۔

●●



مجتبیٰ حسین

رشیدانِ قریش

ایک تعارف

رشید قریشی (جنھیں میں احتراماً رشید بھائی کہتا ہوں) کے بارے میں کچھ لکھنا میرے لئے بہت مشکل ہے پہلی مشکل تو یہ کہ وہ مجھ سے عمر میں کچھ بڑے ہیں۔ اور دوسری مشکل یہ کہ رشید قریشی صرف رشید قریشی نہیں ہیں بلکہ کئی "رشید قریشیوں" یا یوں کہئے کہ "رشیدانِ قریش" کا مجموعہ ہیں۔ ایک رشید قریشی تو وہ ہیں جو حکومت آندھرا پردیش کے محکمہ جنگلات کے اسسٹنٹ سکریٹری ہیں۔ (یہ بہت تھوڑے سے رشید قریشی ہیں) دوسرے رشید قریشی وہ ہیں جو اپنے مخصوص لطیفوں اور چٹکلوں کے ذریعہ ہمیشہ اپنے اطراف قہقہوں کی ایک قوسِ قزح تانے رہتے ہیں۔ اور بات بات پر دھاچوکڑی کا سا سماں باندھے رہتے ہیں۔ (یہ حد سے زیادہ رشید قریشی ہیں) تیسرے رشید قریشی وہ ہیں جو مزاحیہ مضامین لکھتے ہیں۔ اور اپنی شگفتہ تحریر کے ذریعہ اپنے قاری کے وجود میں طراوٹ اور نکھار کا ایک آبشار گراتے ہیں۔ چوتھے رشید قریشی ڈرامہ نگار ہیں۔ پانچویں رشید قریشی افسانہ نگار ہیں۔ چھٹے رشید قریشی وہ ہیں جو صبح کی اولین ساعتوں میں یاد الٰہی میں کچھ اس اہتمام سے غرق ہو جاتے ہیں۔ جیسے دنیا کی ساری عبادت گذاری ان پر ختم ہو رہی ہو۔ یوں لگتا ہے جیسے صبح والا رشید قریشی دن والے رشید قریشی کو بالکل نہیں جانتا۔ آپ ہی سوچئے جب ایک رشید قریشی خود دوسرے رشید قریشی کو نہیں پہچان سکتا تو پھر ایک انسان (یعنی) دوسرے انسان (رشید قریشی) کو کیسے پہچان سکتا ہے؟ اور ہاں ایک رشید قریشی اور بھی ہیں جو اپنی بیوی کی فرمائشوں (جو نہ کبھی پوری ہوتی ہیں اور جو نہ کبھی ختم ہونے پاتی ہیں) اور بچوں کی تعلیمی فیس (جو کبھی کبھار دیدی جاتی ہے) کے باعث ہمیشہ حیران اور پریشان رہتے ہیں۔

دیکھئے صاحب! رشید قریشیوں کی سات قسمیں تو میں نے ابھی گنوا دی ہیں۔ اب آپ ہی بتلائیے کہ میں اس "ہفت پیکر انسان" کے بارے میں بات کہاں سے شروع کروں اور اگر شروع کروں تو اسے کہاں ختم کروں۔ یوں تو میں نے ان کے روپ اور بہروپ دونوں دیکھے ہیں۔ اچھے لگے ہیں۔ بالکل چوں چوں کا مربہ ہیں۔ دفتر میں اسسٹنٹ سکریٹری کی کرسی پر بیٹھتے ہیں تو اپنے اطراف فائلوں کی ایک فصیل سی کھڑی کر لیتے ہیں۔ اس وقت ان کے چہرے پر کچھ ایسی سنجیدگی ہوتی ہے جو عموماً ہمارے ملک کے سرکاری ملازمین کے لئے لازمی صفت ہوتی ہے۔ وہ آندھرا پردیش سکریٹریٹ کے محکمہ جنگلات کے اسسٹنٹ

سکنڈری ہیں۔ اور یہ جو ہر سال آندھرا پردیش میں اسمبلی کا اجلاس ہوتا ہے تو اسے بہ پابندی منعقد کرنے کی ذمہ داری بھی ہوتے ہیں۔ یوں بھی وہ بڑے فقرہ دار آدمی ہیں۔ کہ ہر اجلاس کا ذمہ دار انہی کو بنا کر کے ان پر عاید کیا جا سکتا ہے۔ ملک میں ان کا کوئی قصور نہیں۔ قصور تو حکومت آندھرا پردیش کا ہے کہ اس نے "کنگل" کے آدمی کو جنگل میں پھنسا دیا ہے۔ میں ان کی دفتری شخصیت سے بہت کم واقف ہوں۔ لیکن میں نے انہیں جب بھی دفتر میں دیکھا بڑے انہماک کے ساتھ اپنے فرائض منصبی کو پورا کرتے دیکھا۔ فائیل کو اس انہماک و اشتیاق سے پڑھیں گے جیسے وہ فائیل نہ ہو کوئی جاسوسی ناول ہو۔ فائیلوں کو ادب کا درجہ رشید قریشی نے ہی عطا کیا۔ آندھرا پردیش سکریٹریٹ میں ان کا جو کمرہ ہے اس کی کھڑکیاں حسین ساگر جھیل کی طرف کھلتی ہیں۔ اور وہاں سے منظر کچھ اتنا دلفریب اور دلکش ہوتا ہے کہ کوئی بدذوق ہی اس منظر کو سامنے رکھ کر دفتر کی فائلیں دیکھ سکتا ہے۔ اب یہ ان کی شخصیت کا تضاد نہیں تو اور کیا ہے کہ جس منظر کے نظارہ سے شاعر شعر کہتا ہے، مصور تصویر بناتا ہے، وہ اس منظر کے روبرو نظریں جھکائے ریاست کے جنگلوں کی بربادی کا حال لکھتے ہیں۔ ایسے حسین منظر کی ایسی توہین شاید ہی کوئی کرسکے۔

ایک دن میں نے پوچھا تھا۔ اس دلکش منظر کے ایماء پر آپ کا بھی شاعری کرنے کو جی چاہتا ہوگا۔

بولے "کیا خاک شاعری کروں گا۔ یہ منظر تو میرے لیے وبالِ جان بن گیا ہے۔ جو کوئی بھی آتا ہے مجھ کو نظر انداز کرکے صرف منظر کو دیکھتا رہ جاتا ہے۔ اور پھر منظر سے نظریں ہٹا کر کہتا ہے۔ رشید صاحب! کیا حسین منظر ہے۔ بس ابھی ایک چائے منگوائیے۔ چائے کے بغیر اس منظر کا لطف نہیں آئے گا۔ آپ ہی بتائیے۔ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ منظر بھی دکھائیے اور چائے بھی پلائیے۔ اکثر لوگ تو میرے پاس صرف "پکنک" منانے آجاتے ہیں اور فرماتے ہیں۔ رشید صاحب! سارے شہر میں آپ کے کمرے سے بہتر کوئی اور "پکنک" اسپاٹ نہیں ہے۔

دفتر میں آنے والے دوستوں کی چائے کے علاوہ اور کیا عادتیں ہوتی ہیں۔ اس کے بارے میں میں کچھ بھی نہیں جانتا البتہ میں ان کی ذات کے اس پہلو سے بخوبی واقف ہوں جو بڑا منصور، بڑا بذلہ سنج، بڑا ظریف اور بڑا لطیفہ باز ہے۔ رشید قریشی لطیفوں کا "گشتی گودام" ہیں۔ سینکڑوں بلکہ ہزاروں لطیفے انہیں یاد رہتے ہیں بلکہ یہ بھی یاد رہتا ہے کہ کس کو کون سا لطیفہ کب سنایا تھا۔ رشید قریشی سے میرے مراسم دس سال پرانے ہیں مگر ان دس برسوں میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ انہوں نے ایک دفعہ سنایا ہوا لطیفہ مجھے دوبارہ سنایا ہو ورنہ میں نے ایسے بہت سے لطیفہ باز دیکھے ہیں جو دس برسوں سے ایک ہی لطیفہ بار بار اور مسلسل سناتے آرہے ہیں۔ رشید قریشی کی ذہانت کا یہ عالم ہے کہ پلک جھپکتے میں ایک نیا لطیفہ تصنیف کر دیتے ہیں اور لطیفہ سنا کر یوں انجان بن جاتے ہیں جیسے لطیفے سے ان کا کوئی تعلق نہ ہو۔ اور لطف کی بات یہ ہے کہ اپنے تصنیف کردہ لطیفے کے حقوق بڑی خوش اسلوبی سے دوسرے کے نام منتقل کر دیتے ہیں۔ آپ شاید یقین نہ کریں کہ ان کے لطیفوں کے سنگین نتائج کا سامنا مجھے کرنا پڑتا ہے ایک بار ایک سیاسی شخصیت کی ۶۰ ویں سالگرہ منائی جا رہی تھی۔ رشید قریشی نے فوراً لطیفہ گھڑا کہ جب ان صاحب کی ۶۰ ویں سالگرہ کی تیاریاں ہونے لگیں تو ان صاحب کی بیوی نے ان کے احباب سے پوچھا "آپ لوگ ان دنوں کس تقریب کی تیاریوں میں مصروف ہیں؟"

احباب نے کہا "ہم آپ کے شوہر کی ۶۰ ویں سالگرہ منا رہے ہیں۔"

اس پر بیوی نے کہا "آپ لوگ اب ان کی ۶۰ ویں سالگرہ منا رہے ہیں [illegible] تو شادی کی تاریخ سے ہی آپ کے [illegible] کی ۶۰ ویں سالگرہ منا رہی ہوں۔ مجھے ان کی ۶۰ ویں سالگرہ مناتے ہوئے پورے ۳ برس بیت گئے۔"

رشید قریشی نے یہ لطیفہ بنایا اور اسے میرے نام سے منسوب کرکے [illegible]

ہونے لگا۔ چند دن بعد وہ ۶۰ سالہ بزرگ مجھ سے ملے تو بڑے برہم ہوئے اور کہنے لگے : ایسے چھچھورے لطیفے میرے تعلق سے بناتے ہو؟ میں تو تمھیں اپنے بیٹے کے برابر سمجھتا ہوں۔"

اب میں سخت حیران کہ آخر یہ ماجرا کیا ہے؟ میں نے ان بزرگ سے بڑی منت سماجت کی کہ وہ لطیفہ مجھے سنائیں تاکہ میں اس لطیفہ کی ذمہ داری کو قبول کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں کوئی فیصلہ کرسکوں۔ ان بزرگ نے مجھے تخلیہ میں لے جاکر جھجکتے جھینپتے وہ لطیفہ سنایا اور پھر بڑی برہمی کے ساتھ کہنے لگے "تمھیں میرے خانگی معاملات میں مداخلت کرنے کی کیا ضرورت تھی؟" میں نے اس لطیفہ سے اپنی بے تعلقی کا اظہار کیا تو وہ اور بھی خفا ہوگئے اور بفضل تعالیٰ آج تک مجھ سے خفا ہیں۔

ان کی ڈانٹ ڈپٹ سننے کے بعد میں نے اس لطیفے کے سلسلۂ حسب نسب تک پہنچنے کی کوشش کی تو پتہ چلا کہ اس سلسلۂ حسب نسب کے اولین سرے پر لطیفہ کے جدِ امجد رشید قریشی بڑی متانت کے ساتھ کھڑے مسکرا رہے ہیں۔

اس سانحہ کے بعد سے جب بھی کوئی مجھ سے خفا نظر آتا ہے تو میں فوراً پوچھ لیتا ہوں "بھئی خفا کیوں ہو؟ کہیں تم نے کوئی لطیفہ تو نہیں سنا۔ تم یقین کرو کہ یہ لطیفہ میرا نہیں رشید قریشی کا ہوگا۔"

ایسے کئی لوگ ہیں جن سے میرے تعلقات بڑے خوشگوار تھے مگر اب ان تعلقات کے درمیان رشید قریشی کے لطیفے حائل ہوگئے ہیں۔ میں رشید قریشی سے کہتا ہوں۔ "رشید بھائی! خدا کے لیے اب لطیفوں کا سلسلہ بند کیجیے۔ جدھر جائیے آپ کے لطیفے میرا پیچھا کرتے ہیں۔ آپ کے لطیفے تو چلتے رہیں گے لیکن میرا سڑکوں پر چلنا پھرنا مشکل ہوجائے گا۔" مگر وہ نہیں مانتے اور چپکے سے کوئی تازہ لطیفہ تخلیق کرکے سماج میں چھوڑ دیتے ہیں۔

ایک دن میں نے ان سے کہا تھا "رشید بھائی! آخر آپ اپنے لطیفے میرے نام سے کیوں منسوب کرتے ہیں۔؟"
وہ بولے "بھئی! میں ایک باوقار اور باعزت آدمی ہوں۔ ایسے لطیفے اپنے نام سے کس طرح سنا سکتا ہوں ــــ؟"
آپ ہی انصاف کیجیے اس جواب کے بعد بھلا میں ان سے اور کیا کہہ سکتا تھا۔

رشید قریشی کو انواع واقسام کے لطیفے یاد ہیں۔ میرا دعویٰ ہے کہ اگر مسلسل لطیفے سنانے کا کوئی عالمی مقابلہ ہو تو رشید قریشی اس میں پہلا انعام حاصل کریں گے۔

ایک بار ہم دونوں کو بمبئی جانے کا موقع ملا۔ تین دن تک ہم ساتھ رہے اور اس سارے عرصے میں رشید قریشی نے لطیفے سنائے اور میں نے لطیفے سننے کے سوائے کوئی کام نہیں کیا۔

رشید قریشی کسی بھی محفل میں چلے جائیں گے تو فوراً اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنالیں گے اور اپنے اطراف مخصوص احباب کو جمع کرکے لطیفے سنانا شروع کردیں گے۔ ان کے لطیفوں کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ بالغوں کے لطیفے اور نابالغوں کے لطیفے۔ بالغوں کے لطیفے وہ صرف نابالغوں کو سناتے ہیں۔ (اس معاملہ میں ان کا استدلال یہ ہے کہ نابالغوں کو بالغوں کے لطیفے سنائے جائیں تو اس سے ان کے جلد بالغ ہونے کے امکانات کافی روشن ہوجاتے ہیں)

رشید قریشی فطرتاً مزاح نگار ہیں۔ ان کی فطرت، شوخی، شگفتگی، شرارت اور جوانی سے عبارت ہے۔ کبھی چپکے نہیں بیٹھیں گے۔ اسی شوخی و شرارت نے انھیں اب تک جوان رکھا ہے۔ اگرچہ عمر کی اس منزل کو پہنچ گئے ہیں جہاں آدمی اپنے آپ کو سمجھنے لگتا ہے مگر رشید قریشی اپنی عمر سے بے نیاز ہوکر زندگی کی طرف یوں لپکتے ہیں جیسے بچہ کسی کھلونے کو پکڑنے کے لیے لپکتا ہے۔ وہ کسی بھی قیمت پر بڑھاپے کا الزام اپنے سر لینا نہیں چاہتے۔ اپنے طرزِ عمل اور سرگرمیوں سے یوں ظاہر

کریں گے جیسے وہ اب بھی جوانی سے لبالب بھرے ہوئے ہوں۔ کسی کے حسن کا ذکر ان کے سامنے کیجیے اور پھر دیکھیے کہ ان کا چہرہ کس طرح نور سے دمک اٹھتا ہے جیسے پیتل کے کسی برتن کو خوب مانجھ کر تمتماتے ہوئے سورج کے سامنے رکھ دیا گیا ہو۔ اس قسم کا نور ان کے چہرے پر دو ہی صورتوں میں جھلکتا ہے۔ ایک تو کسی حسین کا ذکر سن کر دوسرے جب عبادت میں مصروف ہوں۔ حالاں کہ دونوں قسم کے "نور" میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ مگر ان کے "زمینی نور" پہ "آسمانی نور" کا اور "آسمانی نور" پہ "زمینی نور" کا گمان ہوتا ہے۔

بہ حیثیت مزاح نگار میں ان کی بڑی عزت کرتا ہوں۔ زبان ایسی پیاری شستہ اور لطیف لکھتے ہیں کہ بس مزہ لیتے جائیے۔ مگر مزاح سے کہیں زیادہ میں ان کی شخصیت کے "چنچل پن" سے متاثر ہوں۔ جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں رشید قریشی اپنی رات گزار کر صبح جب طلوع ہوتے ہیں اور عبادت میں مصروف ہو جاتے ہیں تو دنیا کا بڑے سے بڑا متقی اور پرہیزگار شخص بھی ان کی عبادت کے انہماک اور استغراق کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ میں انھیں بہت بڑا اداکار بھی سمجھتا ہوں) ایک انکشاف اور بھی کرتا چلوں کہ وہ بہت اچھے موسیقار بھی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ موسیقی سے وہ صرف عبادت کا کام لیتے ہیں بلکہ بعض اوقات تو ان کی موسیقی خود ایک عبادت معلوم ہونے لگتی ہے۔ کئی بار سفر میں ان کے ساتھ رہنے کا موقع ملا۔ پہلی بار جب سفر میں ساتھ ہوا اور رشید قریشی رات دیر گئے تک اپنے "بالغوں کے لطیفوں" کے ذریعہ دھما چوکڑی مچانے کے بعد سو گئے تو میں بھی اپنے کمرہ میں جاکر سو گیا مگر علی الصبح میرے کانوں میں بڑی سریلی آوازیں آنے لگیں۔ بڑی ہی پیاری اور دل کش آواز میں کوئی آیاتِ قرآنی کی تلاوت کر رہا تھا۔ اب میں کیسے سوچ سکتا تھا کہ یہ سریلی آواز رشید قریشی کی ہوگی۔ مگر میں نے بستر پر پڑے پڑے اپنے "ماحول" کا جائزہ لیا۔ اس ماحول میں "آیاتِ قرآنی" کی تلاوت کا دور دور تک کہیں کوئی امکان نہیں تھا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ رشید قریشی سے بھی میں اس "حرکت" کی توقع نہیں کر سکتا تھا۔ محض تجسس کی خاطر اپنے کمرے سے باہر نکل کر رشید قریشی کے کمرے پر نظر ڈالی تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ ایک مخصوص ٹوپی سر پر اوڑھے ہوئے جانماز پر بیٹھے ہیں۔ آنکھیں نہ صرف بند تھیں بلکہ ان بند آنکھوں سے آنسو بھی رواں تھے۔ میں کچھ ایسی حیرانی سے رشید قریشی کو دیکھتا رہ گیا جیسے چڑیا گھر میں کوئی بچہ پہلی بار شیر کو دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے۔ وہ بڑی رقت کے ساتھ نہایت سریلی آواز میں تلاوت کر رہے تھے۔ بڑی دیر تک عبادت میں مصروف رہنے کے بعد انھوں نے اپنے ہاتھ دعا کے لیے اوپر اٹھائے۔ پھر ایک دعا (جو غالباً ان ہی کی نظم کردہ ہے) بڑی سریلی آواز میں پڑھنے لگے۔ دعا پڑھتے جاتے تھے اور روتے جاتے تھے۔ اس دعا کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں وہ اپنے سارے گناہوں کی تفصیل گوشوارہ کی شکل میں پیش کرتے ہیں۔ اس منظوم دعا میں وہ اپنے آپ کو یوں ظاہر کرتے ہیں جیسے وہ دنیا کے گنہگار ترین انسان ہیں (حالاں کہ ایسا ثابت کرنے کے لیے کسی استدلال یا مثال کو پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے) اگر آپ ان کے گناہوں کی تفصیل سنہ وار مثالوں کے ساتھ جاننا چاہتے ہوں تو ان کی منظوم دعا سنیے جسے وہ انسانوں سے حتی الامکان روپوش رکھتے ہیں۔ صاحب دعا کیا ہوتی ہے اچھی خاصی "فردِ جرم" ہوتی ہے جسے ملزم اپنے آپ پر عاید کرتا ہے اور پھر خدا سے انصاف کا طلب گار ہوتا ہے آپ یقین کریں کہ اگر خدا کی بجائے کوئی پولس والا ان کی دعا سن لے تو کسی وارنٹ کے بغیر انھیں فوراً گرفتار کر لے۔

... اپنے گناہوں کو جس سلیقے سے وہ "یاد" رکھتے ہیں اس سلیقے سے شاید کراماً کاتبین بھی ان کے گناہوں کو قلمبند نہ کر سکیں۔ حالاں کہ گناہوں کی فہرست تیار کرنے کا فرض تو "کراماً کاتبین" کا ہوتا ہے تو خیر صاحب "اقبالِ جرم"

سے فارغ ہونے کے بعد وہ سجدہ میں گر گئے تو بس گرے ہی رہ گئے اور میں ان کے گناہوں کی تفصیل سن کر گم سم کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ بڑی دیر کے بعد سجدہ سے اٹھے تو چہرہ پر نور برس رہا تھا۔ مجھے عالم حیرت میں غرق دیکھا تو فوراً باہر نکل آئے اور آپ یقین کیجیے کہ آتے ہی کمرہ کے باہر میرے کھڑے رہنے کو بنیاد بنا کر ایک پھڑکتا دار بالغوں والا لطیفہ سنا دیا۔ اب میں حیران کہ یہ شخص جو ابھی ابھی بندگی، معصومیت، زہد و تقویٰ، شرافت، نیک نفسی اور خدا ترسی کا پیکر بنا ہوا تھا اچانک کیا سے کیا ہو گیا؟

میں نے کہا "آپ سے مشکل یہ ہے کہ آپ کی نیکی اور بدی کے درمیان کوئی حدِ فاصل نہیں کھینچی جا سکتی۔"

بولے "میاں! سچے اور مکمل انسان کی پہچان یہی ہے کہ اس کی نیکی کا حال خود اسے بھی نہ معلوم ہو۔ ہاں اسے اپنی برائیوں کی ضرور خبر ہونی چاہیے"۔

ان کی بندگی سے متعلق ایک دلچسپ واقعہ بھی آپ کو سناتا چلوں۔ چند برس پہلے حکومت کی جانب سے کسی سرکاری ٹریننگ کے سلسلے میں انھیں آندھرا پردیش کے ضلع محبوب نگر میں عالم پور بھیجا گیا۔ وہاں وہ ہر صبح ایک درگاہ میں پہنچ جاتے اور گھنٹوں عبادت میں مصروف رہتے۔ ان کے اس انہماک کو دیکھ کر درگاہ کے مجاور نے مشہور کر دیا کہ وہ صاحب درگاہ کے بلاوے پر آئے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارے عالم پور میں سرگوشیاں ہونے لگیں کہ ایک پہنچے ہوئے بزرگ شہر میں آئے ہیں، جس پر ان کا دل آئے بس اسی کے لیے دعا کرتے ہیں۔ اور پھر ادھر انھوں نے دعا کی اور ادھر اس شخص کی زندگی سنور گئی۔ ایک دن یہ علی الصبح درگاہ کے احاطے میں عبادت میں مصروف تھے کہ ایک جواں سال خوش جمال عورت ان کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ رشید قریشی نے دل ہی دل میں خدا کے آگے فریاد کی "اے خدا میرے تقوے کی ایسی کڑی آزمائش، ابھی تو پلکوں کی نمی بھی سوکھی نہیں۔ کچھ دیر بعد اس عورت نے اچانک ان کے پاؤں پکڑ لیے اور گڑگڑا کر بولی "حضرت قبلہ! میری مدد کیجیے۔ میری طرف دیکھیے۔ رائچور سے آئی ہوں۔ رشید قریشی کے پاؤں آنسوؤں سے بھیگنے لگے اور ان کے ہاتھ سے تسبیح چھوٹ کر نیچے گر پڑی۔ انھوں نے لرزتے استکراہ کے ساتھ عورت کو اپنے قدموں میں سے ہٹایا اور آگے بڑھنے لگے مگر کہنے والوں نے اس عورت سے کہہ رکھا تھا کہ یہ بزرگ اتنی آسانی سے کسی کے لیے دعا نہیں کرتے لہٰذا اس نے ان کا دامن بڑی مضبوطی سے پکڑ لیا اور بولی "حضرت قبلہ! میں آپ کو جانے نہیں دوں گی۔ میرا شوہر مجھ سے متنفر ہو گیا ہے۔ کسی طرح اس کے دل میں میرے لیے محبت پیدا کیجیے۔

رشید قریشی دامن چھڑا کر آگے نکلنے کی کوشش کرنے لگے تو وہ تقریباً زمین پر لیٹ گئی اور بولی "صاحب! ان قدموں میں آج میری جان نکل جائے گی اور ادھر اپنا سر زمین پر پٹخنے لگا۔

انھیں بہر حال اس عورت سے بالآخر جان چھڑانی تھی، لہٰذا انھوں نے جیب میں سے کاغذ کا ایک پرزہ نکالا اور اس پر اس عورت کے ناقدر شناس شوہر کے نام صلواتیں لکھ کر اس کے حوالہ کیا اور کہا "جو تم سے متنفر ہے میں متنفر اس منگلا کا کنگر کنگر متنفر۔ رات کو اسے اپنے پائنتی رکھ کر سو یا کرو۔

دو دن بعد رشید قریشی حسب معمول درگاہ گئے تو وہ عورت پھر موجود تھی۔ اب کی بار اس کے ہاتھ میں ایک تھالی بھی تھی۔ جیسے ہی رشید قریشی عبادت سے فارغ ہوئے۔ اس نے پھر ان کے پاؤں پکڑ لیے اور وہ تھالی جس میں تھوڑے سے چاول، پان اور سپاری کے علاوہ پانچ روپے بھی رکھے ہوئے تھے۔ ان کے آگے بڑھاتے ہوئے

بولی "حضرت قبلہ! آپ کی تعویذ سے میرے شوہر کے رنگ ڈھنگ ہی بدل گئے ہیں۔ اس لونڈی کا حقیر نذرانہ قبول کیجیے۔"

انھوں نے لاکھ منع کیا مگر وہ عورت نہ مانی اور رشید قریشی کو اپنے دامن میں چاول سمیٹ کر لے جانا ہی پڑا۔
اب جو ان کی کرامات کا چرچا شہر بھر میں ہونے لگا تو بالکل "ادارۂ اقوام متحدہ" بن گئے۔
کسی کی لڑکی اگر گھر سے بھاگ گئی تو وہ شخص بھاگا بھاگا اپنی فریاد لے کر رشید قریشی کے پاس پہنچ گیا ــــ کسی کے بچے نے دودھ پینا ترک کر دیا تو بچے کی ماں فوراً رشید قریشی کے پاس پہنچ گئی ــــ کسی لڑکی کی ساس نے اسے پیٹا اور وہ رشید قریشی کی امان میں پہنچ گئی ــــ سارے شہر میں چہل پہل سی ہو گئی اور یہ بڑے خشوع و خضوع کے ساتھ تعویذیں بانٹتے اور نذرانے قبول کرتے رہے۔

رشید قریشی کہتے ہیں کہ وہ دن ان کی زندگی کے حسین ترین دن تھے۔ ایک مرحلہ پر انھوں نے "تبدیلیِ پیشہ" کی بابت بھی سنجیدگی سے غور کیا تھا مگر صاحب اسی اثنا میں ان کی ٹریننگ ختم ہو گئی اور ایک دن اچانک "حضرت قبلہ" وہاں سے غائب ہو گئے۔ سارے شہر میں کہرام مچ گیا کہ حضرت ناراض ہو کر کہیں چلے گئے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر آج بھی اس شہر میں کسی کو معلوم ہو جائے کہ میں آندھرا پردیش کے سکریٹریٹ میں کام کرتا ہوں تو وہ لوگ مجھے زبردستی یہاں سے پکڑ کر لے جائیں گے۔

حال ہی میں میں نے سنا ہے کہ تلاشِ حق کے میدان میں رشید قریشی نے ایک قدم اور آگے اٹھایا ہے۔ وہ عبادت کے وقت گیروی رنگ کا لباس زیب تن کر لیتے ہیں اور یادِ الٰہی اور ذکرِ نبی میں استغراق اور انہماک کے لیے "ایکتارہ" کا سہارا لیتے ہیں۔ یہ میرا بائی کا راستہ ہے۔ دیکھنا ہے یہ تھکا ہوا "ایکتارہ سوار" کہاں تک پہنچتا ہے۔ میرا بائی تک بھی پہنچ پایا تو منزل زیادہ دور نہیں رہے گی۔

آپ ہی بتائیے میں ایسے شخص کے بارے میں کیا لکھوں جس کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں۔ ایک پہلو پر لکھنے کی کوشش کرتا ہوں تو دوسرا پہلو سامنے آجاتا ہے۔ دوسرے پہلو پر غور کرتا ہوں تو اس میں سے تیسرا پہلو سامنے نکل آتا ہے جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں رشید قریشی دراصل کئی "رشید قریشیوں" کا مجموعہ ہیں۔ اب آپ ہی بتائیے میں کون سے رشید قریشی پر لکھوں، کتنا لکھوں اور کہاں تک لکھوں۔ اس لیے میں مجبور ہو کر ان پر کچھ بھی نہیں لکھ سکتا۔ پھر رشید قریشی کے بارے میں لکھنا اس لیے بھی مشکل ہے کہ اگر وہ کسی بات پر مجھ سے ناراض ہو جائیں اور جوابی کارروائی کے طور پر کوئی سنگین لطیفہ میرے نام سے منسوب کر کے سماج میں پھیلا دیں تو پھر بتائیے میں کہاں کہاں منہ چھپاتا پھروں۔ نا صاحب! یہ مجھ سے نہ ہو سکے گا . . . . میں مجبور ہوں۔ میں ان کے بارے میں ایک جملہ بھی نہیں لکھ سکتا۔ کیا میری شامت آئی ہے جو ان پر خاکہ لکھنے چلوں؟

ہاں! میں اتنی دعا ضرور کرنا چاہتا ہوں کہ وہ اپنی شوخی، بذلہ سنجی اور ظرافت کے خزینے محفلوں میں ہنسی خوشی کی دولت بانٹتے رہیں اور ان کے دم سے محفلوں میں قہقہوں کا کاروبار چلتا رہے ــــ!

[[illegible] کی کتاب "[illegible]" کا مقدمہ]

سید ہاشم علی اختر
سابق وائس چانسلر علیگڑھ مسلم یونیورسٹی

رشید قریشی کی کتاب "مزاحِ لطیف" کا پیش لفظ

آج سے کوئی پچاس سال پہلے رشید قریشی جامعہ عثمانیہ میں میرے سینئر تھے اور اس وقت جامعہ عثمانیہ نے اُردو کی گنگا جمنی تہذیب کو اپنے عروج پر پہونچا دیا تھا۔ اُس عہد نے بہت سے شاعر، ادیب اور افسانہ نگار پیدا کئے تھے اور خود رشید قریشی نے اپنی جوانی کے ابتدائی دور میں رومانوی افسانوں کا ایک مجموعہ "من کی دنیا" شائع کیا تھا۔ لیکن ان سے ملنے والوں کے لئے رشید قریشی ایک ماہر لطیفہ گو تھے جو سنجیدگی کے ماحول میں بھی مزاح کا ایک پہلو نکال لیتے تھے۔ رشید قریشی کی تربیت جامعہ عثمانیہ کے تہذیبی اور تفریحی ماحول میں ہوئی۔ اُس زمانہ میں خوش مزاجی، بذلہ سنجی اور خوش فعلی کو لوازمہ حیات کی اہمیت حاصل تھی۔ لیکن اُس کا ایک خاص معیار اور ضابطہ اخلاق تھا۔ مزاح پھکڑ نہ بنے، ہنسی قہقہہ نہ ہو، آدمی مسخرہ نہ بن جائے۔ خوش مزاجی میں سوقیانہ پن نہ ہو۔

رشید قریشی کے مزاح کی بھی یہی کیفیت ہے۔ آپ اُن کے کسی مضمون کو پڑھیں گے تو آپ کو محسوس ہوگا کہ آپ ایک شریف آدمی کی شرارت دیکھ رہے ہیں۔ مزاح شریف کا اچھا نمونہ اُن کی یہ کتاب مزاحِ لطیف ہے۔

مزاح کا مبدا کوئی مزاح ساز سچویشن ہوتی ہے۔ اُن کی مزاح نگاری کی تکنیک یہی ہے بلکہ اُن کی ذہانت کی وجہ سے وہ اس قابل ہیں کہ ایسی سچویشن اُن حالات میں بھی پیدا کر لیتے ہیں جہاں دوسرے شخص کو مزاح کا کوئی موقع نظر نہ آئے۔

رشید قریشی کے ناقد یہ کہتے ہیں کہ رشید قریشی کا مزاح مضمونی یا بیانی مزاح نہیں، افسانوی یا ڈرامائی ہوتا ہے۔ جو لوگ خالص مزاح پسند کرتے ہیں، وہ اس تکنیک پر مسکراتے مسکراتے تیوری پر بل ڈال لیتے ہیں اور جو افسانہ پسند ہیں، وہ ان مقامات پر بھی مسکراتے رہتے ہیں جہاں آنسوؤں کی بارش ہوتی ہے۔ یہ اقتباس ملاحظہ ہو۔

"اس کا نام کنیز فاطمہ ہے لیکن تم اسے اپنی کنیز بنا لو۔ اس سے اپنا کھانا پکواؤ۔ اس سے اپنے کپڑے دھلواؤ۔ اس سے اپنا بستر بچھواؤ۔ اس سے اپنے جوتے صاف کرواؤ۔ اُسے صرف کھانا دو، صرف کپڑا دو۔ لیکن یا شیخ! اسے کبھی طلاق مت دو۔ کیونکہ تمہارے طلاق کے بعد تمہارے بھائی بند اسے باری باری بھنبوڑیں گے اور آخر میں گدھ اور چیلیں آئیں گی اور اسے سڑک پر سے اُٹھا لے جائیں گی۔ ایسا کبھی مت ہونے دو یا شیخ! میں تمہارے پاؤں پڑتی ہوں۔" (بردہ کھاوا)

زبانی سچویشن اور لفظی شوخی کی مثال۔

"وہ عورت ساڑی پہن کر میرے سامنے آ کھڑی ہوئی، پھول دار ساڑی اور چہرہ پر اُچٹتا پاؤڈر کا چھڑکاؤ۔

میں نے پوچھا "بہت دیر لگادی تم نے ؟" اس نے اپنے آپ کو دیکھا اور دیکھتے دیکھتے بجانے کن سوچوں میں کھو گئی ۔ اسی وقت میری آنکھوں میں موتیا کے پھولوں کا وہ باسی ہار پھر گیا جسے کچرے کی کنڈی میں پھینک دیا گیا تھا ۔ اس عورت کے اشارہ پر میں اس کے پیچھے گھر کے اندر گیا ۔ ایک نیم تاریک کمرہ کے بیچوں بیچ ایک لڑکی سرخ اوڑھنی سر پر ڈالے جھکی جھکی بیٹھی تھی ۔ عورت نے آگے بڑھ کر اس کا چہرہ میری طرف کر دیا ۔ ہونٹوں پر مستی کی سیاہی ۔ پیشانی پر آرائش کی روشنی ۔ آنکھوں میں بادل ۔ بادل میں بجلیاں میں اپنی جیب میں ہاتھ ڈالکر اندر ہی اندر نوٹوں کی گنتی کرنے لگا ۔ میں فی الوقت پانچسو روپے اور شادی کے دن پانچسو روپے دینا چاہتا تھا ۔ یکایک دلہن کی گود سے شیر خوار بچہ کی چیخ بلند ہوئی ۔۔۔ میں مبہوت کھڑا رہ گیا ۔ دلہن کی گود میں بچہ !! (چندہ مانگنے والے)

ادب میں مقصدیت کا نفوذ ہوا تو خالص مزاح ناپسندیدہ نظر سے دیکھا جانے لگا ۔ اور مزاح میں پھولوں کے ساتھ کانٹوں کو بھی ڈھونڈا جانے لگا ۔ رشید قریشی کو بھی یہ طرز اختیار کرنا پڑا ۔

نوجوانوں کی بے روزگاری کی طرف اس طرح اشارہ ہوتا ہے ۔

"میں سمجھتا ہوں ۔ وظیفہ مجھے نہیں میرے نوجوان بیٹوں کو ہوا ہے جو بیروزگار گھر میں پڑے رہتے ہیں ۔ میں ہی برسر خدمت ہوں اُن کو پالنے پوسنے کے لئے ۔" (ہم چلے وظیفہ لینے)

جس طرح شاعری میں ہر غزل مرصع نہیں نکلتی ، اسی طرح مزاح نگاری میں ہر مضمون پھلجڑی نہیں ہوتا ۔ "کبری بیگم" "ہم چلے وظیفہ لینے" "بَرد کھاوا" "دعوت کا مارا" "پانی - پانی" ایسے مضامین ہیں جو گلدستوں کی طرح سامنے آتے ہیں ۔ دوسرے مضامین ایسے سجے سجائے نہیں ۔ البتہ یہاں وہاں ضرور ایسی بجلیاں کوند جاتی ہیں جن سے مزاح کا سماں بندھا رہتا ہے ۔ ان ٹوٹی ہوئی بجلیوں کو دیکھئے "میں نے بیوہ کو دیکھا تو ایک عالم جنون میں سوچ بیٹھا ، کاش یہ بیوہ میری ہوتی ۔" (بہت پچھتائے صدارت کر کے)

بیوی :۔ صدر شوہر سے "آپ کا تو کچھ نہیں جائے گا ، میں بیوہ ہو جاؤں گی ۔" (سنو صدر کیا بولے)

رشید قریشی کے مزاح کی خوبی یہ ہے کہ یہ طبع زاد ہے لیکن میری رائے یہ ہے کہ مزاحیہ مضامین کی بنیاد اگر بیتی ہوئی وارداتیں ہوں تو اُن کا خزانہ خالی ہو جائے گا اور اب وہ نئی وارداتوں کے لئے عمر رفتہ کو کہاں کہاں آواز دیتے پھریں گے ۔ اس لئے میرا مشورہ ہے کہ وہ اب مزاحیہ مضامین لکھیں بلکہ اُن کے آڈیو بلکہ ویڈیو کیسٹ بنائیں ۔ میں یہ اس لئے تجویز کر رہا ہوں کہ ہمارے اُسی طالب علمی کے زمانے میں جب نظر حیدرآبادی کا پہلا مجموعہ کلام شائع ہوا تو ہم دونوں کے مشترک دوست ڈاکٹر حفیظ قتیل نے اس خبر کو سُنکر کہا تھا ۔ "کیا ترنم کے ساتھ"

اُس زمانے میں آڈیو اور ویڈیو کیسٹ ایجاد نہیں ہوئے تھے اور نظر کے کلام کو سنتے ہوئے لوگ اُن کے ترنم کے بغیر اس کا تصور نہیں کر سکتے تھے ۔ رشید قریشی کو جس کسی نے بھی کوئی لطیفہ یا واقعہ سناتے ہوئے دیکھا ہے وہ مجھ سے اتفاق کریں گے کہ ان کا مزاح پڑھنے سے زیادہ خود ان کی زبان سے سننے کا ہے ۔

۳۰ / جولائی ۱۹۸۹ء
وی سی لاج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

انیسہ سلطانہ

رشید قریشی

رشید قریشی ۱۷ رجون ۱۹۲۰ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ ان کے جدِ اعلیٰ عبدالرزاق کا شمار اولیائے کرام میں ہوتا ہے۔ وہ حضرت برہنہ شاہ کے دور میں برہان پور سے حیدرآباد آئے۔ رشید قریشی کے دادا سید عبدالغفار پربھنی کے تعلقدار تھے اور والد سید عبداللطیف صدر مدرس تھے۔ رشید قریشی نے ابتدائی تعلیم پرائمری اسکول کلواکرتی میں حاصل کی تو ساتویں جماعت کا امتحان محبوب نگر مڈل اسکول سے ۱۹۲۸ء میں درجہ اول میں کامیاب کیا۔ میٹرک کا امتحان بھی درجۂ اول میں مدرسۂ فوقانیہ میدک سے ۱۹۳۱ء میں کامیاب کیا۔ دینیات میں ریاست حیدرآباد میں سب سے زیادہ نمبر انہی کے تھے۔ میٹرک ہی سے ادبی زندگی کا آغاز ہو چکا تھا۔ اسکول میگزین "گلشن" کے ایڈیٹر بھی رہ چکے تھے۔ ۱۹۳۴ء میں انٹرمیڈیٹ کا امتحان کامیاب کیا۔ ڈاکٹر محی الدین زورؔ اور عبدالقادر سروری جیسے علم دوست افراد کی صحبت سے فیض یاب ہونے کا موقع بھی ملا۔ زورؔ صاحب کی خواہش پر ہی رشید قریشی نے انشائیے اور افسانے لکھے۔ ۱۹۳۸ء میں ان میں سے زورؔ صاحب نے سولہ مضامین منتخب کر کے "من کی دنیا" کے نام سے ادارۂ ادبیات اردو سے شائع کیے۔ "من کی دنیا" میں مضامین اور انشائیے کم افسانے زیادہ ہیں۔ ۱۹۴۰ء میں رشید قریشی نے بی اے کا امتحان کامیاب کیا اور میرٹ اسکالرشپ انھیں کو ملا۔ ۱۹۴۲ء میں ایم اے کا امتحان دیا۔ درجۂ اول سے کامیابی حاصل کی۔ ایم اے کے مقالے کا عنوان تھا "اردو مختصر افسانے کا ارتقا" جو ڈاکٹر زور کی نگرانی میں لکھا گیا تھا۔ ۱۹۴۳ء سے ۱۹۴۶ء تک بہ حیثیت مترجم ریڈیو اسٹیشن میں ملازمت کی۔ اس کے علاوہ بھی محکمۂ معتمدی تعلیمات میں منتظم کی حیثیت سے کام کر چکے ہیں۔ آندھرا پردیش کے اضلاع میں انھیں ٹریننگ کے لیے بھیجا گیا جہاں وہ ترقی کرتے ہوئے ڈپٹی سکریٹری ہو گئے۔ اسی عہدے پر وظیفے تک کام کرتے رہے۔ ۱۹۷۶ء سے اردو اکیڈمی

آندھرا پردیش میں ایڈمنسٹریٹیو آفیسر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔

رشید قریشی بہ یک وقت افسانہ نگار، ڈرامہ نگار، انشا پرداز، مزاح نگار اور لطیفہ گو ہیں۔ ان کے افسانوں میں فکر و شعور اور حقیقت نگاری کی بہ نسبت تصوریت کا رنگ زیادہ نظر آتا ہے۔ انھیں رومانی افسانے لکھنے میں کمال حاصل ہے۔ حسن و جمال کے شیدائی ہیں لیکن یہ حسن بعض ادیبوں اور شاعروں کی طرح صرف عورت ہی میں نظر نہیں آتا بلکہ چاندنی میں چھلکنے والی پھولوں سے لدی چنبیلی کی بیل میں، موسم گرما کی شفق آلود شام میں۔ کالے بادلوں کے قریب اڑتے ہوئے سفید بگلوں کی قطار میں اور معصوم بچے کی دلکش مسکراہٹ میں بھی نظر آتا ہے۔ یہی حسن پرستی ان کے افسانوں میں جگہ جگہ اپنا جلوہ دکھاتی ہے۔
رشید قریشی اچھے ڈرامہ نگار بھی ہیں۔ سنجیدہ اور مزاحیہ دونوں طرح کے ڈرامے لکھتے ہیں۔ کئی ڈرامے نشر بھی ہو چکے ہیں اور بہت سارے ڈراموں کو اسٹیج بھی کیا گیا ہے۔ ابتدائی ڈراموں میں "آنچل کے ستارے" اور "عورتوں کی عدالت" اسٹیج ہو چکے ہیں۔ ان کے ڈرامے زیادہ تر تاریخی موضوعات سے متعلق ہوتے ہیں۔ چند مقبول ڈراموں کے نام درج ذیل ہیں۔
"شاہ جہاں کی آخری رات" "قطب شاہ کی آخری رات" "قلی قطب شاہ" "ننھی سانولی" "گوتم بدھ" "تاناشاہ" اور "محبوب علی پاشاہ"۔ ڈرامہ قلی قطب شاہ کو گولکنڈہ کے نوانی محل میں پیش کیا گیا اور "محبوب علی پاشاہ" کو ایوان حالی موتی گلی میں اسٹیج کیا گیا تھا۔ یہ ڈرامہ "محبوب" کے نام سے شائع بھی ہو چکا ہے۔
رشید قریشی کو افسانہ نگار کا ذہن قدرت نے عطا ہوا تھا لیکن شروع ہی سے ان میں حسِ مزاح موجود تھی فطرت میں شوخی اور چلبلا پن ابتدا ہی سے ہے۔ بات بات پر قہقہے بکھیرنا فطرت ثانیہ بن گئی ہے۔ خود ہنسنا اور دوسروں کو ہنسانا ان کی زندگی کا عظیم مقصد ہے۔ یہی فطری مزاح جب ان کی تخلیقات پر غالب آنے لگا تو "مزاج شریف" جیسی تصنیف ہمارے سامنے آئی۔ رشید قریشی کا پہلا مزاحیہ مضمون "ٹانگنے والا" ہے جو "من کی دنیا" میں شامل ہے۔
رشید قریشی کی شوخی "مزاج شریف" کے انتساب میں بھی نظر آتی ہے، یہ انتساب شریک زندگی کے نام ہے جو درج ذیل ہے:

"اس حقیقت کو بظاہر مان لینے کی خوشی میں کہ ضرار تھا، شکایت یا انتقاماً جو بیوی نشانہ مزاح بنتی ہے وہ، وہ نہیں ہے کوئی اور ہے۔"

"مزاج شریف" کا مطالعہ کریں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رشید قریشی بسیار نویس نہیں ہیں بلکہ اس کے قائل معلوم ہوتے ہیں کہ جو کچھ ہو وہ انتخاب ہو۔ "مزاج شریف" بظاہر افسانوں کا مجموعہ نہ کہا جائے گا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس میں پندرہ مضامین ہیں۔ ایک ڈرامہ "تیس جان باز" اور ایک مزاحیہ انشائیہ "غالب کے پڑوسی" کے علاوہ بقایا تیرہ مضامین میں مزاح کو افسانے کے سانچے میں پیش کیا گیا ہے اور بات ہے کہ ان میں افسانویت کم اور مزاح زیادہ ہے۔ وہ کردار، واقعات اور برجستہ جملوں کے ذریعہ اپنی تحریروں میں مزاح پیدا کر دیتے ہیں۔
ان کے بارے میں ڈاکٹر حفیظ قتیل لکھتے ہیں:

"قہقہہ، لطیفہ اور قریشی ایک ہی شخصیت کے تین نام ہیں۔ ان کی باتیں سن کر حیرت ہوتی ہے۔ جو واقعات وہ سناتے ہیں ایسے واقعات صبح و شام ہم کو پیش آتے رہتے ہیں۔ ان کے

جن مضحک پہلوؤں پر قریشی کی نظر جاتی ہے ہمارا ذہن ادھر کبھی منتقل نہیں ہوتا"۔[1]

یہ بات بڑی حد تک صداقت پر مبنی ہے۔ رشید قریشی غیر اہم اور بہت ہی معمولی باتوں کو الفاظ کے جادو سے قہقہہ بر دوش بنا دیتے ہیں۔ اکبر الہ آبادی کی طرح وہ الفاظ کو کمپل نہیں بنا سکے لیکن وہ ایسے ساحر ضرور ہیں جو الفاظ کے ذریعہ اپنے مضامین میں سحر پیدا کر دیتے ہیں۔ انھیں اس کا احساس ہمیشہ رہتا ہے کہ مزاح کی سطح پست اور عامیانہ نہ ہو جائے۔ اس کوشش میں کہیں مزاح غائب ہو جاتا ہے۔ مثلاً ہارون الرشید کے زمانے میں" انھوں نے کچھ عربی نما اردو اور اردو نما عربی عبارت لکھ کر مزاح پیدا کرنا چاہا۔ یہ ایسی ہی کوشش ہے جیسی "المتبذی" میں عظیم بیگ چغتائی نے کی تھی۔ اخرج من الگرداب اور "اشدۃ لمی الرقص" جیسی ترکیبیں انھوں نے بھی وضع کرنا چاہیں۔ لیکن وہ زیادہ کامیاب نہ ہو سکے۔

"یا خلیفہ یا خلیفہ سہل روح القیض فی السمعات سہل عطاء الحیات
اتی سوداگران القدیم البغدادی واللہ سامان نادر وقیمتی واحد المطلبی
ھنا تبدیلی القلب بالقلب الکہنہ شائق واللہ تبدیلی الصحت الحمد للہ"۔[2]

رشید قریشی نے ہلکے پھلکے جملوں سے مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور پطرس کی تقلید میں ایسے موضوعات پر قلم اٹھایا ہے جہاں دل شکنی دل آزاری اور طنز کا امکان نہ ہو بلکہ صرف ہنسی ہنسی میں بہت سارے بے تکے پن سمجھ میں آ جائیں۔ مثلاً بیوی کی سہیلیاں، دوسری بیوی کا پہلا شوہر۔

رشید قریشی نے اپنی مزاحیہ تحریروں میں الفاظ کے مناسب استعمال کا بہت زیادہ خیال رکھا ہے وہ نفاست لفظی، روزمرہ اور محاورات سے بھی اپنی ظرافت کو چمکا دیتے ہیں۔ ان کا مزاح شائستہ اور پر لطف ہوتا ہے۔ مندرجہ ذیل اقتباس ملاحظہ ہو:

"ساس کا ماخذ سیاست ہے کیوں کہ سمدھا دیے کو نیچا دکھا کر داماد کو فتح کر لے اور پھر اس کو دواماً محکوم بنائے رکھنے کے جو حق اس کی کھوسٹ فراست کے تابع ہوتے ہیں چانکیہ کے احاطۂ فکر سے بھی باہر ہے اور جہاں تک سیاست کا تعلق ہے مغربی ساس مشرقی ساس سے بازی لے جاتی ہے کیوں کہ مغربی ساس کی سیاست میں جو سین ہے وہ پرٹی سین ہے اور شقاوت سے مستعار لی گئی ہے۔ اور غالباً اسی وجہ سے مغربی داماد زن مرید ہونے کے بجائے ساس مرید ہوتے ہیں"۔[3]

رشید قریشی کی تحریر میں موسیقیت، ترنم اور شیرینی موجود ہوتی ہے۔ ان کی عبارتیں خاصی رنگین ہوتی ہیں مثلاً:

"پینگوں کے سنگ سنگ پھولوں سے لدی ڈالیاں جھوم جھوم کر پھول برسانے لگیں۔ ایک اونچی ہوئی تو میرا رخسار تک چھو گئی۔ سنتور کا نغمہ رقص کرنے لگا ایک دبی دبی جھنکار اٹھی"۔[4]
(ایم فل کے مقالے سے اقتباس)

---

[1] رشید قریشی "مزاح شریف" جائزہ ڈاکٹر حنیف قتیل صفحہ۔
[2] رشید قریشی " ہارون رشید کے زمانے میں" صفحہ ۳۶
[3] " " " ساس صفحہ ۱۵۱
[4] " " " [illegible] " ۴۹

آندھرا پردیش ریاستی اقلیتی فینانس کارپوریشن

4-1-825/B سکنڈ فلور لکشمی اسٹیٹ عابڈز۔ حیدرآباد ــــ ۱۰

حکومت آندھرا پردیش کی جانب سے چلنے والا اِدارہ جہاں ریاست سے تعلق رکھنے والے اقلیتی افراد مسلمان، سِکھ، عیسائی، پارسی، جین، بدھسٹ کو قرضہ جات کی فراہمی کی جاتی ہے، یہ قرضہ جات (۲) اسکیموں کے تحت دیئے جاتے ہیں۔

۱۔ غربت ہٹاؤ اسکیم ۲۔ خود روزگار اسکیم

۱۔ غربت ہٹاؤ اسکیم :-

اس اسکیم کے تحت 10,000 ہزار روپے کی جملہ لاگت کے کاروبار کے لیے جیسے کرانہ اسٹور سیکل ٹیکسی، بُک بائنڈنگ، ترکاری فروشی، اگربتی تیار کرنے کے لیے میوہ فروشی وغیرہ وغیرہ کے لیے قرضہ جات دیئے جاتے ہیں۔ اس جملہ لاگت کا ۲۵ فیصد کارپوریشن سے دیا جاتا ہے اور اس کو ۲۰ آسان ماہانہ اقساط میں بہ شرح ۴٪ کے ساتھ ادا کرنا پڑتا ہے اور مابقی بنک کے ذریعہ دلایا جاتا ہے اور اس اسکیم میں درخواست گزار کی سالانہ آمدنی 6000 روپے سے کم ہونی چاہیئے۔

۲۔ خود روزگار اسکیم :-

اس اسکیم کے تحت 2,50,000 روپے کی جملہ لاگت کے کاروبار کے لیے جیسے چھوٹی صنعتیں، گھریلو صنعتیں، کسی بھی قسم کی تجارت، پرنٹنگ پریس، میڈیکل شاپ، زیراکس مشین کے لیے، آٹو رکشا، آٹو ٹرالی وغیرہ وغیرہ کے لیے قرضہ جات دیئے جاتے ہیں۔ اس جملہ لاگت کا ۲۰ فیصد یا زیادہ سے زیادہ 40,000 روپے کارپوریشن کی جانب سے بطور "مارجن منی" شرح سود ½۶ فیصد پر دیا جاتا ہے اور اس کو (۳۰) آسان اقساط میں واپس کرنا پڑتا ہے اور باقی رقم بنک سے دلائی جاتی ہے۔

یہ کارپوریشن، تمام ریاست میں اب تک 44004 افراد میں 565,60,000 روپے مارجن منی جاری کرچکا ہے جس کی جملہ لاگت 32,55,13,000 روپے ہے۔

خواہش مند افراد مندرجہ بالا پتہ پر رجوع ہوں۔

محمد لائق علی خاں
مینجنگ ڈائرکٹر

زرتاج رحمت
(سری نگر)

شفیق باپ

میرے والد مرحوم جناب رشید قریشی کا نام دنیائے ادب خاص طور پر طنز و مزاح کی دنیا میں محتاج تعارف نہیں ہے لیکن بہت کم لوگ اس بات سے واقف ہوں گے کہ جس طرح وہ ادبی حلقوں میں اپنی تحریر کی شگفتگی اور پُرمزاح گفتگو و بذلہ سنجی اور لطائف سے ہر دل عزیز تھے۔ اسی طرح وہ اپنی گھریلو زندگی میں بھی قدم قدم پر مسکراہٹیں اور قہقہے بکھیرا کرتے۔ ایک انتہائی زندہ دل اور حوصلہ مند انسان تھے جس محفل میں ہوتے۔ محفل کو اپنی شستہ اور پُرمزاح گفتگو سے زعفران زار بنا دیتے اسی لئے ہر محفل میں ہاتھوں ہاتھ لئے جاتے۔

جناب سید مصطفےٰ کمال صاحب ایڈیٹر "شگوفہ" کی تحریک پر ماہنامہ "شگوفہ" کے "رشید قریشی نمبر" کے لئے مضمون قلمبند کر رہی ہوں۔ اور محترم کمال صاحب کی خواہش پر اپنے والد کی نجی زندگی کے اسی پہلو پر روشنی ڈالوں گی۔ جناب رشید قریشی صاحب مرحوم کی اولاد ۴ لڑکیوں اور ۳ لڑکوں میں اس ناچیز کو اُن کی بڑی لڑکی ہونے کا شرف حاصل ہے۔

بابا ہم سب بھائی بہنوں کے لئے ایک نہایت شفیق باپ رہے ہیں اور ہماری ذہنی نشو و نما میں والد صاحب کا بڑا دخل رہا ہے۔ ہم سب کی تعلیم پر خاص توجہ دیا کرتے اور ساتھ ہی ساتھ ہماری حوصلہ افزائی کرتے کہ ہم ان سے اپنے مسائل پر بات کریں اور بڑی خندہ پیشانی سے ہماری روداد سنا کرتے۔ اس وقت محسوس ہی نہیں ہوتا تھا کہ ہم اپنے اصولوں کے پابند ایک باپ سے گفتگو کر رہے ہیں۔

بچوں کی صحت اور تندرستی کا بابا خاص خیال رکھتے تھے۔ روزانہ صبح ورزش اور سیر کی تاکید تھی۔ ایک عرصہ تک سب بچے صبح کی چہل قدمی میں بابا کا ساتھ دیتے تھے۔ اچھی غذا اور میوہ کھانے اور کھلانے کے شوقین تھے۔ مجھے یاد ہے کہ موز موسمبی درجنوں کے حساب سے لاتے تھے۔ بہترین آموں کے ٹوکرے ہم سب بچوں کیلئے لئے جاتے۔

جسمانی صحت کے ساتھ ساتھ کردار اور ذہنی و روحانی تربیت کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی اور دوسرے بزرگانِ دین کے حالاتِ زندگی خاص طور پر سناتے تھے۔ خود بھی نماز اور تلاوتِ قرآن کے پابند تھے اکثر

چھٹی کے دن جب سب موجود ہوتے مذہبی مسائل سے ہمیں واقف کرواتے ۔

بابا کو میں نے بہت کم غصے میں دیکھا ہے۔ جب کوئی خلافِ طبع بات ہو جاتی تو بس خاموش ہو جاتے ۔ غیبت سے ان کو سخت نفرت تھی کبھی کسی کی برائی نہیں کرتے تھے اور سننا بھی نہیں چاہتے تھے۔ اپنے والد، والدہ، بھائی بہنوں دوست احباب رشتہ دار سب سے بڑی محبت سے ملتے ہر شخص یہ سمجھتا تھا کہ اُسے ہی سب سے زیادہ چاہتے ہیں ۔

دعوتوں میں شرکت کے بہت شوقین تھے ۔ ایک دفعہ ایک دوست کے بیٹے کی شادی کا کارڈ آیا ۔ بابا نے سرسری طور پر پڑھا اور والدہ صاحبہ کے ہمراہ مقررہ دن شادی خانہ پہنچ گئے ۔ کافی دیر بیٹھنے کے باوجود دولہا دلہن ندارد بلکہ کچھ بسم اللہ کی تقریب کے انتظامات نظر آئے اور لوگ بھی ان کو مشکوک نظروں سے دیکھنے لگے ۔ جب کارڈ دوبارہ دیکھا تو پتہ چلا کہ شادی بے شک اسی تاریخ کو تھی مگر تروپتی میں اور ریسپشن دو دن بعد تھا (اسی جگہ) بہرحال کسی نہ کسی طرح گھر پہونچے بعد میں اس واقعہ کو دہرا کر بہت ہنستے تھے ۔

ہم جب بابا کو یاد کرتے ہیں تو جہاں آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے ہیں ۔ وہیں ان کی پُرمزاح باتوں اور لطیفوں کو یاد کر کے قہقہے ہونٹوں سے اُبلتے ہیں۔ خدا ان کو جنت الفردوس میں جگہ دے ۔ آمین

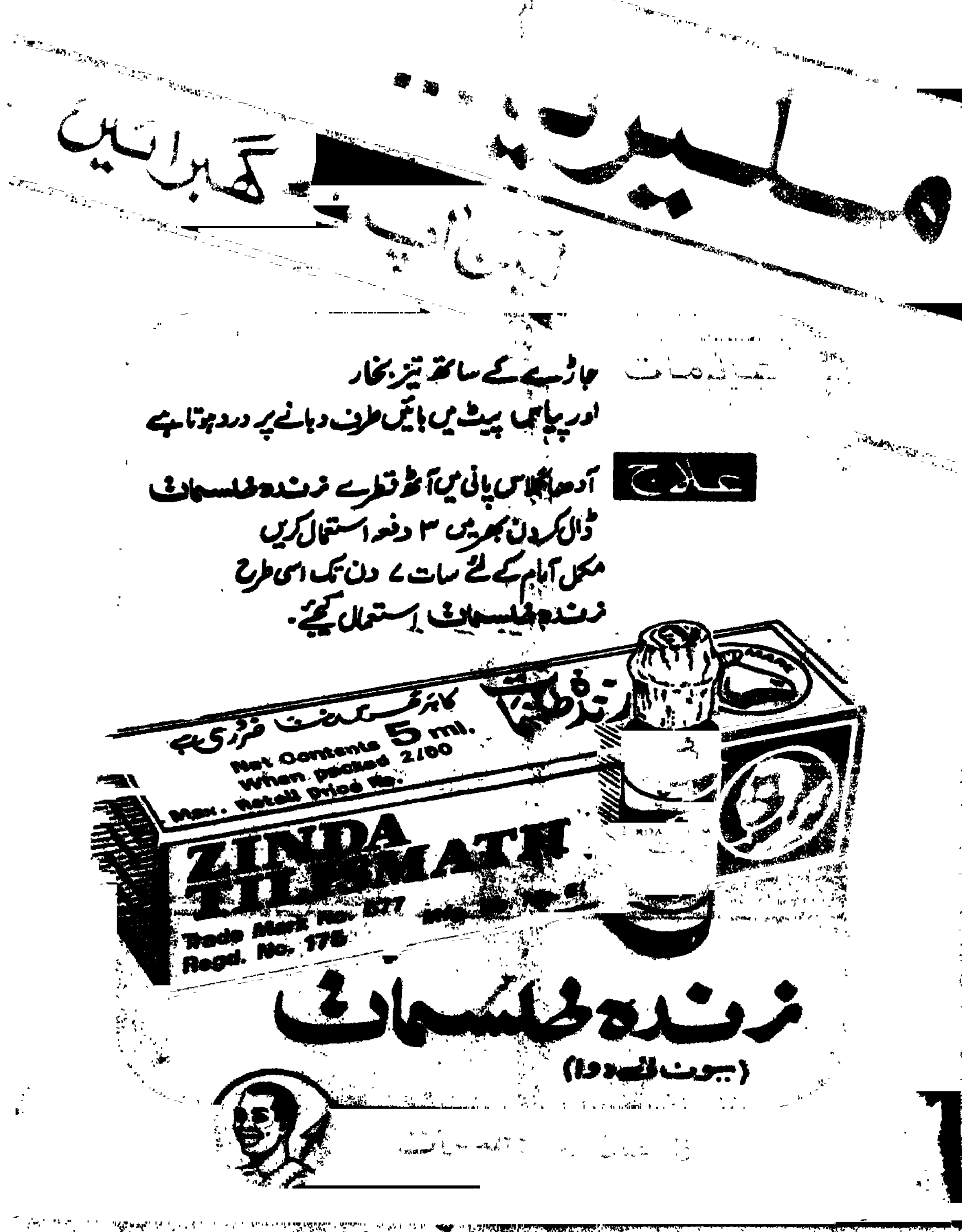
پھر ملیں گے اگر خدا لایا (اداریہ)

ہمارا یہ شمارہ نامور مزاح نگار اور زندہ دلانِ حیدرآباد کے سابق نائب صدر جناب رشید قریشی کے نام حقیر سا نذرانۂ عقیدت ہے ۔ ان کی تمام مطبوعات سے استفادہ کرتے ہوئے اس شمارے میں مضامین شریک کیے گئے ہیں ۔ نیز رشید قریشی صاحب کی صاحبزادی نے بھی ایک مختصر تاثراتی مضمون اس خصوصی شمارہ کے لیے عنایت کیا ہے۔ نت نئے موضوعات پر پھلجھڑیاں چھوڑنے والی مجسم ظرافت شخصیت رشید قریشی سے مجھے ہمیشہ شکایت رہی کہ وہ لکھتے کم تھے چلتے ہوئے جو باتیں وہ کہہ جاتے ان ہی کو یکجا کر لیا جاتا تو مزاح کا ایک خزانہ ہاتھ آتا لیکن افسوس کہ نہ تو رشید قریشی ہی نے اپنی لطیفہ گوئی کو قابلِ اعتنا سمجھا اور نہ کسی نے ان کے سارے ظریفانہ مواد کو اکٹھا کرنے کی زحمت گوارا کی ۔

بہرحال اس شمارہ کے ذریعہ رشید قریشی کی شخصیت اور فن کے اہم پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے ۔

● ۶ دسمبر آزاد ہندوستان کی تاریخ کا سیاہ ترین دن ہے جب کہ دستور کی پامالی اور سپریم کورٹ کی عدول حکمی کے ذریعہ ملک کی سیکولر و جمہوری روایات کو ملیا میٹ کر دیا گیا۔
ہم اس عظیم سانحہ کی سخت ترین مذمت کرتے ہیں ۔


قرۃ العین حیدر کا ناولٹ — "چائے کے باغ" —
اردو ادب میں کلاسک کا درجہ رکھتا ہے — اور
چائے کے باغوں سے ہماری منتخب کردہ چائے —
ھائی ویٹا چائے
سرور اور لذت میں حرف آخر سمجھی جاتی ہے
ملنے کے صرف دو مقام


گھبرائیں
جاڑے کے ساتھ تیز بخار
اور پیاس پیٹ میں بائیں طرف دبانے پر درد ہوتا ہے
علاج
آدھا گلاس پانی میں آٹھ قطرے زندہ طلسمات
ڈال کر دن بھر میں ۳ دفعہ استعمال کریں
مکمل آرام کے لئے سات ۷ دن تک اسی طرح
زندہ طلسمات استعمال کیجئے۔
5 ml.
Net Contents
When packed
Max. Retail Price Rs.
ZINDA TILISMATH
Trade Mark No. 577
Regd. No. 175
زندہ طلسمات
(یونانی دوا)